THE HAREEM

Feb.79

Rs. 1/-

ایڈیٹر

گذشتہ ۴۸ سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اردو میں ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے

نمبر (۲)

لکھنؤ

جلد (۵۷)

ماہنامہ

حریم

بیادگار
سید محمد سلیم اہیولوی مرحوم
و
شفیق النساء
بیگم سلیم اہیولوی مرحوم

ایڈیٹر و نگراں
نسیم اہیولوی

معاونین
شوکت جہاں بیگم عشرت اللہ
جانی بیگم ردولوی

فہرست مضامین ماہ فروری ۱۹۷۹ء

قیمت سالانہ

مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو ......

جب میرے پاس سال بھر کام دینے والی

موجود ہے جس میں دوازدہ بروج، تاثرات منازل فلکی، فالنامہ تاریخ اسرار و اقوال صلحاء، نعت پاک، عملیات قرآنی کے علاوہ بخشی کی تیار کردہ حسن افزا مصنوعات اور محافظِ صحت معیاری ادویات کی فہرست بھی موجود ہے۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل حسین طباعت کا یہ مرقع آج ہی قریبی اسٹاکسٹ سے خریدیے اگر آپ کے شہر میں دستیاب نہ ہو تو پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر براہِ راست ہم سے طلب فرمائیے۔

منیجر بخشی جنتری

پوسٹ بکس ۱۲۳۴۵ ، کلکتہ ۲۳

میں محسوس کرتا ہوں کہ اس وقت مسلم معاشرہ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ شادی بیاہ کے سلسلہ میں جہیز وغیرہ کے متعلق شرائط طے کرنے سے بھی زیادہ شرمناک یہ امر ہے کہ لڑکی کے حسن ظاہر کو بے حد دیکھا جا رہا ہے۔ لڑکی کا حسین ہونا گویا شرط اول ہے۔ اگر لڑکی قبول صورت نہیں تو وہ قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا ــــ کون نہیں جانتا کہ اس وقت مسلم خاندانوں میں لاکھوں لڑکیاں اس لئے کنواری بیٹھی ہیں کہ ان کے لئے بر نہیں ملتے۔ تعلیم تو اب اتنی عام ہو چکی ہے لڑکیوں کی کہ اس کی کمی کوئی محسوس نہیں کرتا کہ لڑکی تعلیم یافتہ نہیں۔ بلکہ اب تو اکثر ایسا دیکھا جاتا ہے کہ لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں کی تعلیم کم ہوتی ہے۔ نہ جانے کتنی ایسی شادیاں میں نے دیکھی ہیں کہ لڑکیاں ایم۔ اے۔ بی۔ اے اور بی۔ ایڈ وغیرہ کی ڈگریاں لئے ہوتی ہیں اور ان کے شوہر پرائمری اسکول یا انٹر ہوتے ہیں۔ اور لڑکی والے خاموشی سے ایسی شادیوں کو گوارہ کر لیتے ہیں ــــ بہر حال لڑکوں کی تین خاص خواہشات ہوتی ہیں۔ تعلیمی سند، جہیز اور نقد اور حسن وجمال۔

پہلی خواہش کے سلسلہ میں کسی بھی لڑکے کو کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی، اس لئے کہ اس کی تعلیم سے بھی زیادہ بھاری پلڑا لڑکی کا ہوتا ہے۔ جہیز، نقد رقم اور فرمائشات کے سلسلہ میں بھی اکثر والدین کسی نہ کسی طرح انتظام کر لیتے ہیں۔ لیکن تیسری خواہش کی تکمیل کسی کے بھی امکان میں نہیں ہوتی۔ لڑکی اگر حسین نہیں۔ مثلاً رنگ سانولا ہے۔ جسم سرو جیسا نہیں۔ بال، زلف بنگال نہیں، آنکھیں نرگس جیسی نہیں۔ ناک ذرا پھیلی یا چپٹی ہوگی۔ دانت موتیوں کی لڑیوں سے مشابہ نہیں، یا اور کسی طرح کی جسمانی کمی ہوگی تو پھر اولیں دونوں خواہشات کی تکمیل کے باوجود لڑکی کو پسند نہیں کیا جاتا۔

لڑکے والوں کی ماں، بہنیں گھر گھر جاتی ہیں۔ دعوتیں کھاتی ہیں اور لڑکی ان کے معیار کی حسین نہیں تو پلٹ کر جواب بھی نہیں دیتیں۔ لڑکیوں کے والدین دل مسوس کر رہ جاتے ہیں اور لڑکیاں بیچاری سوچنے لگتی ہیں کہ اللہ نے انھیں کیوں پیدا کیا۔ اور پیدا کیا تھا تو سراپا حسن کیوں نہ بنایا۔ وہ اپنے سے زیادہ اپنے والدین کے دکھ درد کو محسوس کرتی ہیں۔ لیکن کچھ نہیں کر پاتیں۔ والدین کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں اور وہ لڑکیاں اپنی ڈھلتی جوانی کا ماتم کرنے سے زیادہ اپنے ماں باپ کے محسوسات پر چھپ چھپ کر آنسو بہاتی ہیں۔

ذرا سوچئے کہ صورت شکل کا بنانے والا انسان تو نہیں، یہ تو اللہ کی دین ہے، وہ جسے جیسا چاہتا ہے خلق کرتا ہے، لیکن یہ اللہ کے بندے یعنی ہمارے نوجوان اور ان کے والدین ذرا بھی نہیں سوچتے کہ آخر اللہ کی یہ بندیاں کیا کریں۔ ان کا کیا قصور ہے کہ وہ کنواری بیٹھی رہیں۔ ان کا کیا گناہ ہے کہ انھیں بر نہ ملے، وہ کیسے اپنی زندگی گزاریں اور کیسے اپنے والدین کی فکروں کو دور کریں جو ان کے غم میں گھلتے رہتے ہیں۔

ہمیں یہ لکھنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا کہ یہ معاشرتی ناسور صرف مسلمانوں میں ہی ہے جن کا مذہب حسن اخلاق کا علمبردار رہا ہے اور اور جس کے پیغمبر صلعم نے ایثار وقربانی کی ایسی مثالیں پیش کی ہیں کہ تاریخ میں ویسی قربانیوں کا اور کہیں ذکر بھی نہیں ملتا۔ آپ نے اپنی عمر سے کہیں زیادہ عمر کی خاتون سے اسی لئے شادی کی تھی کہ لوگ دیکھیں اور تقلید کریں۔ آپ نے بیواؤں سے عقد کئے اور صرف اس لئے کئے کہ مسلمانوں کو ایسا کرنے میں تکلف نہ ہو۔ لیکن آج کیا ہو رہا ہے۔ اپنے معاشرے پر نظر ڈالئے رشتوں کا ذکر نہیں! ساٹھ برس کے مرد بھی شادی کرنا چاہتے ہیں تو سولہ سترہ برس کی لڑکی چاہتے ہیں اور وہ بھی حسین، اپنی عمر سے بڑی عمر کی لڑکی سے شادی کرنے کا ثواب کوئی تصور بھی نہیں کرتا۔ ایک بھی مثال شاید ہی آپ کو ایسی مل سکے کہ کسی ۲۵ سالہ نوجوان نے ۳۰ سالہ لڑکی سے شادی کی ہو۔ بیوہ لڑکیوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں اور اگر کسی نے رحم کھا کر کبھی لی تو وہ پچاس سالہ کے یا اور بھی لب گور مرد ہوں گے۔

اس کے برخلاف آپ ہندوؤں کے معاشرے کو دیکھئے عیسائیوں کی روایات پر نظر ڈالئے سکھوں کی شادیاں دیکھئے وہاں صورت شکل کا اتنا خیال نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہندو بھائیوں میں لین دین کا معاملہ چاہے جتنا سخت ہو لیکن حسن وجمال کی شرط ان کے یہاں نہیں لگائی جاتی۔ یہ لعنت صرف مسلمانوں ہی میں رچ بس گئی ہے اور اس کی وجہ سے لاکھوں لڑکیوں کی شادیوں میں روڑے اٹکتے ہیں۔

مسلمان خود میں مستیں پڑھتے ہیں اور کلوا کئی بار اٹکتے ہیں

جو ان کے رسول اکرم صلعم نے کی تھیں اور خوش ہوتے ہیں کہ وہ سنت نبوی کے پیرو ہیں لیکن افسوس کہ شادی بیاہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے کہ سنت نبوی کیا ہے۔

حیدرآباد اور بہار میں نہ جانے کتنے خاندان اس بدرسمی کے شکار ہیں کہ وہاں لڑکیوں کی شادیاں اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتیں جب تک کہ لڑکی والے مطلوبہ نقد رقم نہ ادا کریں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان روزہ نماز کے ساتھ ہی ان مسائل پر بھی عمل پیرا ہوں جو سنت ہوتے ہوئے بھی فرائض سے کم درجہ نہیں رکھتے، اس لیے کہ ان کو نظر انداز کرکے وہ اسلام کو تباہی و بربادی کی طرف لے جانے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ جس قوم کا معاشرہ خوش حال نہ ہو جس میں ۳۰-۳۵-۴۰-۴۵ سال کی لڑکیاں کنواری بیٹھی ہوں، اس معاشرہ کا کیا حال ہوگا۔ کیا ایسے گھروں میں مسکراہٹ دیکھی جا سکتی ہے۔ جن میں جوانی سے گزر جانے والی لڑکیاں کنواری بیٹھی ہوں۔ اور جن گھروں میں والدین شب و روز اسی فکر میں گھل رہے ہوں کہ کس طرح اپنی بیٹیوں کا بیڑا پار لگائیں، کہاں سے ان کے لیے بر لائیں

میں سمجھتا ہوں کہ صرف نماز پڑھنے، روزہ رکھنے، حج کر لینے اور زکوٰۃ دے دینے ہی سے ایک مسلمان عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اگر اس نے سنت نبوی کی وہ راہیں چھوڑ دیں جو معاشرے کے لیے از بس ضروری ہیں تو یہ فرائض بھی بیکار ہی ثابت ہوں گے۔ مسلمانوں کو ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور کرنا اور ان بدرسموں کے لیے جہاد کرنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ساری عمر عبادت و ریاضت میں گزارنے والے ایسے مسلمان سے جس کے باعث کسی لڑکی کی شادی نہ ہو سکی ہو، وہ مسلمان زیادہ رحمت الٰہی کا حقدار ہوگا، جس نے کسی ایک ایسی لڑکی کو اپنا لیا ہو جو حسن ظاہر سے کسی حد تک محروم ہو یا جس کے والدین اسے سونے میں تول کر کسی کو داماد نہ بنا سکتے ہوں۔

عبرتناک انجام

اس دور کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ شاہ ایران کو تخت و تاج چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ اسباب تو بہت کچھ ہیں، لیکن سب سے اہم سبب شاہ کی مغرب پرستی اور اسلام سے بیگانگی تھی۔ مذہب کے سلسلہ میں اصلاحات کا امکان ضرور ہے اس لیے کہ رسم و رواج نے بہت سی ایسی باتوں کو جنم دے دیا ہے جن کا تعلق مذہب سے نہیں، لیکن انھیں مذہب میں فرائض کے بمنزلہ درجہ مل گیا ہے، لیکن شاہ نے ایسی فروعات ہی کو نہیں، بہت سی اسلام کی بنیادی باتوں سے بھی اختلاف شروع کر دیا تھا، جنھیں معتقد، مذہبی شخصیتوں نے محسوس کرکے ان کے خلاف ایک طرح کا جہاد کیا۔ مثال کے طور پر شاہ چاہتے تھے کہ ان کے ملک کی خواتین یورپ و امریکہ کی طرح ماڈرن بن جائیں اور برقعہ و نقاب کو یکسر ختم کر دیں اس سلسلہ میں شاہ کی شدت پسندی یہاں تک تھی کہ جو عورت برقعہ میں دیکھی جائے اس کا برقعہ چھین کر نذر آتش کر دیا جائے

لاکھوں خواتین مغربی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود ہی برقعہ سے چھٹکارہ حاصل کر لیتی ہیں۔ جیسا کہ ہندوستان اور پاکستان میں ہو رہا ہے لیکن یہاں کروڑوں ایسی خواتین موجود ہیں جو اب بھی پردہ کی پابند ہیں اور دل سے اسلامی پردے کو پسند کرتی ہیں۔ یہی صورت ایران میں بھی تھی۔ وہاں تو ۹۹ فیصدی خواتین پردہ کرنا چاہتی تھیں، لیکن شاہ کو یہ بات پسند نہ تھی، اس لیے انھوں نے اس طرح کی باتوں کے لیے جبریہ صورت اختیار کی۔ جس نے بغاوت کی آگ بھڑکا دی مذہبی رہنماؤں نے اس آگ کو ہوا دی۔ شاہ نے طاقت سے عوام کے جذبات کی آگ کو سرد کرنا چاہا لیکن طاقت عوام کو نہیں دبا سکی۔ خصوصیت سے مذہبی جذبات کو دبانا کسی بھی طاقت کے بس میں نہیں، شاہ ایران کا یہ طرز عمل اصولی ضابطہ بادشاہت کے خلاف تھا اور اس کا یہی نتیجہ ہونا چاہیے تھا جو برآمد ہوا۔ پردہ کا حامی ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی شاہ ایران کے اس اقدام سے سخت تکلیف تھی کہ مسلمان حکمران ہو کر وہ ایسا کر رہے تھے جیسا کسی غیر مسلم حکمران نے بھی نہیں کیا۔

پرچہ نہ ملنے کی شکایت

خریدار بہنوں کو نوٹ کر لینا چاہیے کہ اگر کسی ماہ حریم ۱۰ تاریخ تک نہ ملے تو فوراً دفتر کو اطلاعی کارڈ لکھیں اس کے باوجود ۱۰-۱۲ روز میں مطلوبہ پرچہ نہ ملے تو دوبارہ شکایت لکھیں۔ اس لیے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرا پرچہ جو روانہ کیا جاتا ہے وہ بھی ڈاک میں گم ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی خریدار بہنیں پرچہ نہ ملنے کی شکایت کئی ماہ بعد کرتی ہیں جو مناسب نہیں۔ ایسی صورت میں شکایت کے ساتھ مطلوبہ پرچے کی قیمت بھی روانہ کیا کریں ورنہ تعمیل نہ ہوگی۔

بقیہ اداریہ
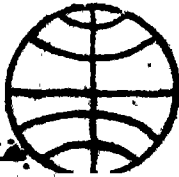
نیا سال مبارک کے ساتھ۔ پردہ اٹھتا ہے

برق آشیانوی عرف خانِ خانہ

درونِ خانہ سے بیرونِ خانہ تک

نوٹ:- یہ مضمون جنوری کے شمارے کے لئے موصول ہوا تھا، لیکن جنوری کا شمارہ سالنامہ تھا اور وہ خود اتنا ضخیم تھا کہ کوئی اور مضمون شریک کرنے کی گنجائش نہ تھی اس لئے فروری کی اشاعت میں شریک کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

جب خواتین نے رفتارِ زمانہ کی تیزی سے بھی زیادہ تیز رفتار کے ساتھ پردے سے باہر نکلنا شروع کر دیا تو راقم الحروف "برق آشیانوی" گھبرا کر خود پردے کے اندر چھپ گیا اور "خانِ خانہ" کے نام سے "درونِ خانہ سے بیرونِ خانہ تک" "خانِ خانہ" کا قہقہہ لوٹ کر بکھیرنے لگا۔ اور جو کچھ واقعات نظر سے گذرتے گئے سپردِ قلم کرتا چلا گیا۔ ایک وجہ تو یہ ہوئی، دوسری وجہ خانِ خانہ" کے پردے میں سے چھپ کر مضامین لکھنے کی یہ ہوئی کہ جب ہم نے "خواتین کا سال" کے عنوان سے مضمون لکھا تو اتفاقاً بیگم کی نظر اس پر پڑ گئی انھوں نے اس مضمون کو دلچسپی سے نہیں بلکہ تجسس کے ساتھ پڑھا۔ اس کے بعد ہمارے مضامین کے ایک ایک لفظ کو نہایت جستجو اور غور و خوض کے ساتھ پڑھکر ایک ایک لفظ پر بحث کرنے لگیں کسی عالم سے بحث کرنا آسان ہے لیکن کسی خاتون اور وہ بھی "خاتونِ خانہ" سے بحث کرنا آسان نہیں۔ ہم نے تنگ آکر ان سے کہہ دیا کہ لو اب مضمون لکھنا ہی بند کر دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہم خود بھی گھر کے اندر بند ہو جاتے ہیں۔ جب حریم کے کسی شمارے میں ہمارا مضمون نظر نہیں آیا تو انہیں ایک گونہ سکون ہوا۔ البتہ خانِ خانہ" کے مضامین نظر سے گذرے تو پڑھ کر ایک دن ہم سے دریافت کیا: "یہ جو خانِ خانہ" کے مضامین مسلسل حریم میں شائع ہو رہے ہیں، آپ نے پڑھے۔" ہم نے تجاہلِ عارفانہ سے (تجاہلِ عارفانہ اس لئے نہیں لکھا کہ ہم کوئی عارف یا صوفی نہیں ہیں۔ ویسے دعوت نسیم انہونوی صاحب کو بلکہ ساری دنیا کو دھوکے میں رکھنے کے لئے صورت شکل اور وضع قطع ضرور عارفانہ بنا رکھی ہے حالانکہ اویبانہ [illegible] ہوں

سے یعنی شاعری اور مزاح نگاری سے تو ابھی تک نہیں کی ہے) کام لیتے ہوئے کہا: "جی نہیں۔ کیوں کوئی خاص بات ہے کیا؟" کہنے لگیں۔ "آپ بھی برسوں سے مضامین لکھتے رہے ہیں لیکن ایک مضمون بھی ایسا نہیں لکھا جیسا کہ خانِ خانہ صاحب لکھتے ہیں۔" ہم نے کہا: "اگر اجازت ہو تو ہم جناب خانِ خانہ صاحب" کی شاگردی اختیار کر کے ان سے مضامین لکھنا سیکھ لیں۔" جواب ملا: "بس آپ کو تو بہانہ چاہئے پھر مضمون لکھنا شروع کرنے کا۔" میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی کیونکہ خانِ خانہ صاحب" کے مضامین بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔" ہم نے یہ سوچ کر کہ چلو مغالطہ میں رہ کر ہی سہی بیگم ہمارے مضامین کی درپردہ تعریف تو کر رہی ہیں، راز کو فاش نہ ہونے دیا۔ یہ سلسلہ ماہ مارچ ۱۹۷۸ء سے ماہ دسمبر ۱۹۷۸ء تک بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ چلتا رہا۔ بیگم اس خوش فہمی میں مبتلا کر ہم نے مضامین لکھنا چھوڑ دیا ہے اور ہم اس "صحیح فہمی" سے خوش کہ بالواسطہ بیگم ہمارے مضامین کی داد سے (دہشت سے نہیں) ہمیں سرفراز فرما رہی ہیں۔

ماہِ جنوری ۱۹۷۹ء کے ساتھ جب نیا سال شروع ہوا تو ایک بم پھٹ پڑا یہ بم لفافہ بم نہیں بلکہ کارڈ بم تھا۔ ہوا یہ کہ ایک ماہنامے کے ایڈیٹر صاحب کو یہ راز معلوم ہو گیا کہ "خانِ خانہ" کے نام سے برق آشیانوی نے حریم میں "درونِ خانہ سے بیرونِ خانہ تک" کے عنوان سے ہر ماہ پابندی کے ساتھ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ راز انھیں ہمارے ایک دیرینہ ملاقاتی کے ذریعہ معلوم ہو گیا جن کے سامنے ہم نے اپنا راز اس تاکید سے کہ کسی کو نہ بتایا جائے، فاش کرنے میں کوئی قباحت نہ سمجھی تھی۔ ایسا سمجھنا بھی ہماری نادانی تھی۔ اتنی عمر گذارنے کے بعد بھی ہمیں عقل

بہر حال جو کچھ ہوا ہم تو سمجھتے ہیں کہ اچھا ہی ہوا (خواہ بیگم کی نظر میں برا ہی کیوں نہ ہوا ہو) اب ہم نئے سال کے سلسلے میں کچھ عرض کرتے ہیں۔

۱۹۷۹ء جس کو لوگ نیا سال کہہ رہے ہیں اور ہم بھی برسوں سے اسی مغالطے میں رہے ہیں کہ ہر سال ایک نیا سال آتا ہے۔ لیکن سالِ حال جب ذرا آنکھ مل کر اٹھ بیٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ یہ سنہ تو ایک ہزار آٹھ سو اٹھتر سال پرانا ہو کر اُنّاسیواں سال شروع کر چکا ہے۔ اور لوگ اس کو "نیا سال" کا نام دے کر خود بھی دھوکے میں ہیں اور ہمیں بھی دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اِدھر ایک ہم ہیں کہ صرف ساٹھ (۶۰) سال کی عمر پوری کرنے کے بعد سے لوگ ہمیں ہر سال پرانے سے پرانا سمجھ کر از کار رفتہ قرار دینے کی کوشش میں ہیں۔ سرکار نے تو برسوں پہلے ہمیں ملازمت کے ناقابل سمجھ کر پنشن پر علحدہ کر دیا۔ حالانکہ اقتدار کی کرسیوں پر ہم سے زیادہ پرانے اور از کار رفتہ لوگ پورے ٹھاٹھ کے ساتھ نقلی دانت اور اصلی عینک لگائے "ابھی تو میں جوان ہوں" کا نعرہ لگا کر ڈٹے ہوئے ہیں۔ ہمیں تو یہاں تک اندیشہ ہے کہ کہیں اس نعرے کو قومی ترانہ قرار دے کر کسی خوش گلو سنگیت کار یا سنگیت کارہ سے گوا یا جا کر اس کا ریکارڈ سرکاری تقاریب کے موقع پر نہ بجوایا کریں۔ ہماری رائے میں کسی سنگیت کارہ سے ہی گوایا جائے تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ اب جو لوگ سنیما میں کسی فلم کے اختتام پر ترانہ سن کر احتراماً کھڑے رہنے کے بجائے تیزی سے اپنی منزل کی طرف اس تیزی سے بھاگتے نظر آتے ہیں جیسے گھوڑا اپنے تھان کی طرف، وہ اس ترانے کو بھی ایک فلمی گانا سمجھ کر اس سے محظوظ ہونے کے لئے نہایت صبر و سکون کے ساتھ کھڑے رہیں گے۔

غرض اب بھی اگر قارئین ۱۹۷۹ء کو نیا سال سمجھتے ہیں تو ان سے ہمدردی ہے اور ان سب کی خدمت میں عرض کرتے ہیں۔

"نیا سال مبارک"

"اقوال زریں"

مرسلہ: شازیہ حجازی

۱۔ علم جو ٹھیک طرح ہضم نہ کیا جائے وہ آفت ہے، غذا جو ہضم نہ کی جا سکتی ہو مصیبت ہے۔ غریب آدمی کے لیے سماجی ملاپ تکلیف دہ ہے۔ اور ضعیف آدمی کے لیے جوان بیوی عذاب سے کم نہیں۔

۲۔ کم ظرف آدمی کبھی دوسروں کو فائدہ نہیں پہونچاتا۔ ہوا کے جھونکوں سے درخت گرتے ہیں لیکن گرتے ہوئے درخت کھڑے نہیں ہو جاتے۔

۳۔ جو خواہشات کے غلام ہوتے ہیں وہ ساری دنیا کے غلام ہوتے ہیں۔ جو خواہشات کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں وہ ساری دنیا کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔

۴۔ بلند پایہ یا باہمت شخص کی خفگی چند لمحوں کے لیے ہوتی ہے۔ اعتدال پسند کی ایک یا دو گھنٹے کے لیے۔ کم ظرف کی دن رات کی۔ اور جو انتہائی کم ظرف ہوتا ہے وہ زندگی بھر کو اٹھا رکھتا ہے۔

۵۔ بدکردار عورت خلاف توقع حیا دار معلوم ہوتی ہے۔ کمایا ہوا پانی غیر معمولی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ دھوکے باز آدمی اکثر بااختیار ہوتا ہے۔ اور بدکار آدمی ہمیشہ میٹھی زبان رکھتا ہے۔

۶۔ حقیر آدمی جب خوش رہتا ہے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا اور جب غصہ میں رہتا ہے تو اس سے کسی کو نقصان نہیں پہونچتا۔ اس کی مثال اس گھاس جیسی ہے جو جلتی ہے تو نہ کوئلہ چھوڑتی ہے نہ راکھ۔

۷۔ اگر دشمن بھی آپ کے گھر آئے تو اس سے اچھا برتاؤ کرو کیونکہ سایہ دار درخت اس شخص کو بھی سایہ دیتا ہے جو اس کو کاٹنا چاہتا ہے۔

انتودے کے لئے

حکومت اترپردیش مصمم ارادہ رکھتی ہے

مندرجہ ذیل فیصلے اور منصوبے زیادہ کار آمد ہیں۔

- اس سال منصوبوں کے لئے مقررہ ۲۵ کروڑ روپیہ میں سے آٹھ کروڑ کی رقم صرف کی جائے گی۔
- ۲۷ پچھڑے ضلعوں میں ۳۱ سنٹروں کے چار پانچ سو مواضعات میں سب سے غریب خاندانوں کو چننے اور انھیں ترقی کے مواقع فراہم کیے جائیں گے۔
- ان خاندانوں کی ضرورت کے مطابق انھیں دودھ دینے والے جانور، بیل گاڑیاں، سلائی کی مشینیں اور مرغی پالنے کی سہولتیں دینے کے لئے پانچ ہزار روپیہ تک قرض دینے کی اسکیم۔
- رقم کی ایک تہائی مراعات کی شکل میں اور بقیہ آسان اقساط میں وصول کئے جانے والے قرض کی شکل میں دینے کا فیصلہ۔
- گاؤں میں ہریجنوں اور بے زمین لوگوں کے فلاح و بہبود کی نظر سے انتودے روزگاروں کے قائم کرنے کا فیصلہ۔ ہر ایک روزگار کی اکائی کے لئے گورنمنٹ کی جانب سے ایک لاکھ سے لے کر دس لاکھ روپیوں تک کی مالی امداد اور تکنیکی رہنمائی۔
- تخمیناً چالیس کروڑ روپیہ کے خرچ سے مجموعی شجر کاری کی اسکیم شروع کرنے کا فیصلہ۔

محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامّہ اترپردیش سرکار کے ذریعہ شائع کیا گیا

خلش

عفت موہانی

اس نے کروٹ لینے کی کوشش کی اور چیخ مار کر رہ گیا!۔

احساس بے بسی نے آنکھوں میں آنسو بھر دئے کہ وہ کسی کی مدد کے بغیر اب کروٹ بھی نہیں بدل سکتا!۔ سارا جسم اسے جہنم کی کسی بھٹی میں تپتا ہوا معلوم ہو رہا تھا جیسے رگ رگ پر ایک انگارہ رکھا ہوا ہو۔!

اپنی پلکوں کو جھپکا کر اس نے آنسوؤں کے ستارے جھٹکے اور بمشکل تمام آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش کو دیکھا!۔ رفتہ رفتہ اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے آرام دہ کمرے کے نرم مخملی بستر نہیں۔ کسی ہسپتال کے سرد و سفید بستر پر بینڈیج سے جکڑا پڑا ہے۔

اس کے ارد گرد سفید دیواریں تھیں۔ چھت میں پنکھا کاہلی سے گھوم رہا تھا۔ سرہانے ایک اونچی تپائی تھی۔ جس پر نہ جانے کیا کچھ دواؤں کا الم غلم ڈھیر تھا۔ وہ مخصوص بو جو ہسپتالوں میں عام ہے اور وہاں کے ورکرز کو محسوس نہیں ہوتی۔ ثاقب کے نتھنوں میں بری طرح بسی گئی تھی اور اس احساس کے ساتھ کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ اس کا فطری غصہ ابھر رہا تھا۔!

آس پاس سناٹا تھا!۔ معلوم نہیں یہاں بات چیت کرنے کی ممانعت تھی یا کسی کی آمد کا وقت نہیں ہوا تھا یا پھر اس نے سخت برہم ہو کر سوچا۔ سب لوگ مر چکے!۔

نہ جانے کب اسے یہاں پھینکا گیا ہے۔ اس نے بایاں ہاتھ اوپر کیا کلائی پر اس کی قیمتی گھڑی نہیں تھی!۔ اچھا تو وہ بھی اتار لی گئی۔!

کہیں کوئی گھڑی کوئی کلینڈر نہیں۔ تاکہ اسے اندازہ ہو سکتا آخر اسے یہاں پڑے پڑے کتنی صدیاں گزر چکی ہیں!۔ خدا غارت کرے۔ اس نے بے بسی کے عالم میں ہونٹ چبا ڈالے۔! اور چاہا کہ چیخ کر کسی کو آواز دے۔ لیکن بمشکل اپنا یہ جذبہ روکا! ڈیڈی کا ایسے سنگدل ہو گئے۔ ممی اتنی لا پرواہ نکلیں۔۔۔ کوئی اس کی خبر نہیں لیتا؟۔ انھیں اس وقت اس کے پاس موجود ہونا چاہئے تھا۔ کیا قہر ہے!۔

غصے کی آندھی اس کے دماغ میں چلنے لگی۔۔۔۔ اچھا ہو جاؤنگا تو اس غفلت کی سزا دوں گا۔! دفعتہً پھولدار پردہ بیچ سے شق ہوا اور ایک سفید پوش نازک اندام نرس بے آواز وارڈ میں داخل ہوئی!۔ اور جب تک وہ اس کے قریب نہ آ گئی وہ اسے دیکھنے سے قاصر رہا۔!

"ہیلو مسٹر ثاقب۔ اوہ تھینکس گاڈ۔ آپ کو ہوش آ گیا ہے۔ آپ یہ ڈوز پی لیجئے۔ میں ابھی سرجن احسان کو مطلع کرتی ہوں۔

جہنم میں گئے تمہارے سرجن ورجن۔" وہ غصے سے چیخ اٹھا مجھے یہ بتاؤ۔ میں کب سے یہاں پڑا ہوں۔ میری ممی ڈیڈی کوئی آئے کیوں نہیں۔؟"

چھوٹے سے قد کی خوبصورت بھولی بھالی نرس اس کے بھاری لہجے اور غصیلی آواز سے سہم گئی۔ اس نے اپنی نرم اور شیریں آواز میں جواب دیا" جی ہاں۔ وہ تو صبح دس بجے تک آپ کے پاس رہے تھے۔ بہت پریشان تھے انھیں سرجن احسان نے زبردستی گھر بھجوا دیا ہے"

"بہت اچھا کیا۔ اب تم بھی جاؤ۔ خبردار کوئی سرجن یا ڈاکٹر میرے پاس نہ آئے۔ میں تنہائی میں مرنا چاہتا ہوں" وہ بکتا چلا گیا۔

"مسٹر ثاقب۔ پلیز۔ یہ مت کہئے۔ یہ ڈوز آپ کے لئے بیحد ضروری ہے۔ منھ کھولئے پی لیجئے۔" آئی سے۔ شٹ اپ اینڈ گٹ آؤٹ" وہ گرج اٹھا۔ نرس کے ہاتھ سے پیالہ گرتے گرتے بچا۔ اس نے ایک خوفزدہ نظر عجیب و غریب وحشی بیمار پر ڈالی اور پھر کچھ کہے بغیر پردہ ہٹا کر باہر نکل گئی۔!

وہ پڑا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ کیا تیمار داری ہے صاحب۔ ماں باپ پلٹ کے پوچھتے نہیں۔ تیمار داری کے لئے ہسپتال کا عملہ رہ گیا ہے مجھے مر کر سب کو سزا دینی چاہئے۔ لیکن میں مرتا کیوں نہیں ہوں میرے اسکوٹر کی ایک زبردست ٹرک سے بڑی شاندار ٹکر ہوئی تھی۔ وہ بھی اندھا دھند آ رہا تھا اور میں بھی طوفان میل ہی تھا۔ ٹرک ایک بل ڈوزر کی طرح اسکوٹر سے ٹکرایا اور اس نے مجھے ہلکے پھلکے شٹل کاک کی طرح اچھال پھینکا تھا۔ خلا میں چکرا نے کھا کا سے ہزاروں منٹ کے برابر احساس تھا اس کے بعد یوں لگا تھا جیسے سیدھا سلگتے ہوئے تحت الثریٰ میں منہ کے بل جا گرا ہو۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا شعور اس کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ لیکن وہ خود تو سمجھ سکتا تھا کہ شاندار چوٹیں آئی ہوں گی۔ کیونکہ ہاتھ پاؤں۔ پسلیوں اور سر پر بندھے ہوئے متعدد بینڈیج زبان حال سے حادثے کی داستان سنا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ اسے یاد آیا کہ وہ شاید چار روز قبل اپنے ایک دوست کو سی آف کرنے جا رہا تھا۔ چونکہ اس کی روانگی میں بہت تاخیر ہو چکی تھی اس لئے اس نے اسکوٹر کو راکٹ کی رفتار سے چھوڑ دیا تھا۔ تو آج چار روز بعد اسے ہوش آیا ہے۔ اف!

اس نے کرب سے آنکھیں بند کرلیں۔

دفعتہً ایک بھاری اور گرم ہاتھ اس کی پیشانی پر آکر رکا! اس نے آنکھیں کھولیں۔ ایک بارعب مگر اور سنجیدہ چہرہ اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا!۔

اس نے اندازہ لگا لیا کہ یقیناً سرجن احسان ہوں گے! نرس کی بچی نے آخر انھیں اطلاع دے ہی دی!۔ اور ساتھ میں خود بھی تنی چلی آئی ہے۔!

"ہیلو ینگ مین!" وہ مسکرائے۔ اور اس کے ایک گال پر تھپکی دی۔ "اب خود کو کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

اس کی زبان پر بے حد تلخ جواب آیا تھا۔ لیکن اس نے بیحد خشک لہجے میں بولا: "اتنا بہتر محسوس کر رہا ہوں کہ خود سے کروٹ تک نہیں لے سکتا!۔"

یہ لہجہ بھی سرجن احسان کے لئے غیر متوقع تھا۔ بہر حال انھوں نے سنی ان سنی کر کے نرس سے کہا "مس اسما۔ پلیز۔ ہری اپ ڈوز اور انجکشن لے آؤ۔" نرس دوا کی ٹرے لے آئی تھی۔ شاید اس نے اس کے وحشیانہ سلوک کی شکایت سرجن سے کی تھی۔ تبھی انھوں نے اپنے سامنے اسے خوراک پلوائی اور انجکشن دلوایا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسما کے چہرے پر ایک پوشیدہ تبسم تھا جیسے اس کی شکست پر مسکرا رہی تھی۔ وہ غضبناک ہو گیا۔ لیکن کرنل احسان کی موجودگی میں کچھ بول نہ سکا۔!

"مجھے امید ہے کہ تم ہفتہ عشرہ میں اس قابل ہو سکو گے کہ کچھ چل پھر سکو!" کرنل احسان کہنے لگے: "مجھے تمھارے بچنے کی امید نہیں تھی۔ بہت خطرناک حالت تھی۔ تمھاری دو پسلیاں ٹوٹ گئیں ان میں چاندی کے جوڑ لگا دئے گئے ہیں ...... جب وہ آپس میں جڑ جائیں گے تب تم یقیناً آسانی سے کروٹ لے سکو گے!"

"کیا مجھے چار دن کے بعد ہوش آیا ہے؟" اس نے کسی ادب و احترام کے بغیر کرنل سے پوچھا۔

"یقیناً۔!"

"اس عرصے میں میرے والدین یا کوئی اور مجھے دیکھنے نہیں آیا۔؟!"

"میں نہیں جانتا کون آیا کون گیا۔ بہرکیف تمھیں دیکھنے بہت سے لوگ آئے تھے!" کرنل نے جواب دیا اور چونکہ اس قسم کے سوال و جواب ان کے شایان شان نہیں تھے۔ لہذا وہ نرس سے مخاطب ہو گئے: "تم ڈاکٹر ساگر اور ڈاکٹر سنہا سے کہو کہ ان کے بینڈیج تبدیل کر دیں۔ اور پھر مجھے انفارم کریں کہ زخموں کی کیا حالت ہے۔ تب میں ٹریٹمنٹ میں تبدیل کر سکوں گا"

"اوکے۔ سر۔" اسما نے سر جھکایا اور پھر کرنل کے پیچھے پیچھے وارڈ سے نکل گئی۔!

وہ بے بس تھا۔ ڈاکٹروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ان کے لئے تختۂ مشق۔ دونوں ڈاکٹر کچھ اس طرح اس کے کچے پکے زخم صاف کر رہے تھے اور ان پر دوائیں لگا رہے تھے جیسے ان کے ہاتھوں میں زندہ جسم نہ ہو۔ آپس میں وہ ہنس رہے تھے — انگریزی میں بکواس کر رہے تھے اور غالباً نئی نئی بیماریوں کے وزنی اور مشکل نام لے رہے تھے کہ اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ حالانکہ وہ بھی انگلش لٹریچر سے ایم۔ اے تھا!۔

بس وہ پڑا پڑا غم و غصے کی ملی جلی کیفیت سے یہ سوچتا رہا کہ اگر یہ تینوں ڈاکٹر اور نرس کبھی اس کے ہتھے چڑھ جائیں تو وہ ان سے کس نوعیت کا انتقام لے گا! ۔ ڈاکٹروں سے تو اسے نفرت تھی ہی ۔ لیکن نرس سے اسے گھن لگ رہی تھی۔ ان کا بھی کوئی کردار ہوتا ہے ہر قسم کے بیماروں سے ہنسنے بولنے سے انھیں عار نہیں۔ ننگے کھلے مرد اور عورت کے کسی قسم کے بھی آپریشن میں مرد ڈاکٹروں کو اسسٹ کرتی ہیں۔ پوسٹ مارٹم میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ سخت دل۔ بے رحم بے حس مخلوق۔ دنیا کی سب سے گندی گھناؤنی اور بے کردار صنف وہ ہرگز پسند نہیں کرتا تھا کہ کسی بھی نرس کے ہاتھ اس کے جسم میں لگیں۔

یوں بھی وہ ایک اکھڑ اکل کھرا مغلوب الغضب اور غصیلا آدمی تھا!۔ ہنسی تو اسے آتی ہی نہ تھی۔ خاندان بھر میں وہ سب سے زیادہ غصہ ور اور بد دماغ مشہور تھا!۔ اس نے کبھی کسی کا نہ تو ادب کیا نہ کسی کا رعب مانا۔ بس ماں باپ کا کچھ لحاظ کر جاتا تھا!۔ ورنہ پروفیسر صاحبان تک اس کی گستاخیوں سے بچنے کے لئے اس کے منھ نہیں لگتے تھے!۔ اس کا کوئی قریبی دوست نہ تھا۔ ایک تھا وہ چلا گیا تھا۔ صنف نازک سے اسے نفرت تھی!۔ اسکی دولت اور صورت سے متاثر ہو کر کئی لڑکیوں نے اس کا قرب چاہا تھا لیکن وہ ایسا سنگ راہ تھا کہ جو اس سے ٹکرا کے چلا، زخمی ہوا۔ اس کے چہرے سے ہی پتہ چلتا تھا کہ ہمیشہ کسی نہ کسی بات پر آپ ہی آپ بل کھا رہا ہو ۔۔ چھیڑتے ہی چڑھ دوڑے گا!۔ والدین اس کے مزاج سے نالاں تھے عزیزاقارب گریزاں۔ مگر اسے کسی کی پرواہ کیا تھی۔؟

اپنے چڑچڑے پن اور بد دماغی سے اس نے ڈاکٹروں کا ناطقہ تنگ کر دیا۔ شام کو اس کے ڈیڈی اور ممی اس کے لئے پھل، دودھ، ٹانک اور پھول لائے تو وہ ان سے الجھ پڑا۔

مجھے افسوس ہے ڈیڈی۔ آپ کے دل میں میری محبت نہیں رہی آپ اب آئے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے میں صبح گیارہ بجے سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں ۔۔ ممی بھی نہیں آئیں۔ اگر میں زخموں کی تاب نہ لاتا اور مر جاتا تو؟"

بیٹے ہم دیر تک تمھارے پاس بیٹھے رہے تھے۔!" ڈیڈی نے جواب دیا۔" اس وقت گئے جب ہسپتال کا وقت ہو چکا تھا تمھیں کیا خبر۔ یہ چار دن ہم پر کیسے گزرے ہیں۔" ممی نے کہا۔ ڈاکٹر سے اجازت لے کر ہم لوگ شب و روز یہیں رہتے تھے۔ اور دعا مانگا کرتے تھے!"

لیکن آج ہی چلے گئے۔ جب مجھے ہوش آنا تھا۔ ثاقب نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

خیر۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ برا وقت گزر گیا۔ میں کرنل احسان سے مل کر آ رہا ہوں۔ انھوں نے خوشخبری سنائی ہے کہ بس ہفتہ بھر اور تمھیں یہاں اور رہنا ہے۔ اس کے بعد تم گھر چل سکتے ہو۔" پروفیسر صاحب نے بیٹے کے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے کہا۔" میرا بیٹا بڑا بہادر ہے۔ کسی نہ کسی طرح یہ ایک ہفتہ بھی نکال ہی لے جائے گا۔

نہیں نہیں!" وہ بچوں کی طرح مچلا۔" میں ایک ہفتہ تو کیا۔ ایک دن بھی یہاں نہیں گزاروں گا۔ آپ کرنل صاحب سے پوچھ آئیے اور مجھے گھر لے چلئے۔

بیٹے اپنے پیچھے کیوں پڑے ہو۔" ممی بولیں۔" گھر پر وہ آسائیاں کہاں نصیب ہیں جو یہاں میسر ہیں۔"

" میں یہاں کی نرسوں کا محتاج بننا نہیں چاہتا۔" ثاقب نے کہا۔

اس میں محتاجی کی کیا بات ہے۔ یہ تو ان کا فرض ہے۔" پروفیسر صاحب اس کی افتاد طبع سے حیران تھے۔ اور یہ نرس بیچاری جو تمھارے لئے متعین ہے۔ یہ تو بیچاری بہت پیاری لڑکی ہے ممی نے کہا۔ ورنہ دوسری نرسوں کو دیکھا کہ وہ کسی سے سیدھے منھ نہیں بولتیں۔ کچھ پوچھو تو جواب نہیں دیتیں۔ لیکن یہ لڑکی کیا نام ہے اس کا۔ میں بھولتی ہوں۔ یہ تو اس طرح تمھاری خدمت کرتی ہے جیسے کوئی عزیز ہو تمھاری۔ بار بار تمھارا بخار دیکھتی تھی وہ۔ وہ کر تمھاری بدلتی ہوئی حالت کی خبر احسان صاحب کو کرتی تھی۔ نہ دن کو دن سمجھتی تھی نہ رات کو رات۔ میں تمھیں یہاں سے لے چلوں گی تو اسے اچھا سا انعام دوں گی۔!"

سب سے زیادہ مجھے اسی نرس سے نفرت ہے۔" ثاقب بولا۔ آخر یہ مسکراتی کیوں ہے۔ کیا اسے میری بے چارگی سے مسرت ہوتی ہے۔ یہ کیوں مجھ پر مہربان ہے۔ میں کون ہوتا ہوں اس کا؟"

" بیٹے۔ کسی کے خلوص و شفقت کا بدلہ اس طرح نہیں دیتے۔"

پروفیسر صاحب نے سمجھایا۔

میں کسی کے خلوص کا بھوکا نہیں۔" وہ جھنجھلایا۔

اتنے میں نرس آگئی۔ سفید ساڑی، سفید بلاؤز میں ملبوس۔ اس کے سڈول نازک بدن پر لباس یوں چپٹ گیا تھا کہ خوشنما جسم کی رعنائیاں نکھر آئی تھیں۔ سر پر نازک سا سفید سکارف بندھا تھا اور لمبے سیاہ بالوں کی دلکش چوٹی کمر سے نیچے جھوم رہی تھی اس کا شہابی رنگ اور دلآویز چہرہ دلوں کو موہ لینے والا تھا۔ گلابی مرطوب لبوں پر مسکراہٹ کھلی اپنے شناسا ہمدردوں کو دیکھ کر اس نے بڑے ادب سے مسکرا کر سر جھکا لیا اور ثاقب کی طرف مڑ گئی۔!

انجکشن۔ پلیز!۔

میرا سارا جسم چھلنی ہے۔ وہ درشتگی سے غرایا۔ مزید سوئیاں بھونکنا کہاں کی انسانیت ہے۔؟

مسٹر ثاقب۔ یہ آپ کے لئے ضروری ہے!" وہ بولی۔ اور سرنج کو چہرے کے برابر اٹھا کر دوا کی مقدار دیکھنے لگی۔

کوئی مرد انجکشن دینے کیوں نہیں آتا؟۔ اب کی وہ زیادہ پر نفرت لہجے میں بولا۔

کیا مطلب؟۔" وہ ہکا بکا تھی۔

کسی میل نرس کو بھیجو۔ ثاقب نے بے رخی سے کہا۔ "تمھیں مرد کا جسم چھوتے شرم نہ آتی ہو نہ سہی لیکن میں پسند نہیں کرتا کہ کسی عورت کے ہاتھ میرے جسم میں لگیں۔ جاؤ۔ جا کے اپنی بجائے کسی میل نرس کو بھیجو۔!

نرس نے اپنا نچلا لب دانتوں میں دبا لیا۔ دو لمحے چپ چاپ ثاقب کو تکتی رہی پھر سرنج ٹرے میں واپس رکھ کر وارڈ سے چلی گئی۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب نے کرنل احسان کی خوشامد کر کے انھیں اس بات پر راضی کر لیا کہ ان کے عضو و بیٹے پر کسی نرسنگ آرڈرلی کو متعین کر دیا جائے!۔ چنانچہ اب ایک سخت گیر بدمزاج اور تندخو میل نرس اس پر متعین تھا۔ جسے اپنے کام سے مطلب تھا۔ لیکن اس سے ثاقب مطمئن ہو گیا۔ !ایک خلش مسلسل سے نجات مل گئی!۔ اب وہ تیزی سے اچھا ہو رہا تھا!۔ اس نے اپنے پسندیدہ مصنف کے چند ناول منگوا لئے تھے اور اطمینان سے ان کے مطالعہ میں مشغول رہتا تھا!۔

اسے خیال تھا کہ شاید اس نے اپنے روحانی سکون کا سامان کر لیا تھا۔ لیکن اس کا اندازہ صحیح نہ نکلا۔ کیونکہ اس طرف اس نے اپنے مزاج میں ایک نئی تبدیلی محسوس کی تھی!۔ پہلے وہ مطالعہ کرتا تھا تو اس میں جذب ہو جاتا تھا اب وہ ورقوں پر ورق الٹتا چلا جاتا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ اس نے کیا پڑھا؟۔ نظریں سطروں پر ہوتی تھیں دماغ کہیں اور۔ اسے خوف محسوس ہوتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا دماغ بھی حادثے کی وجہ سے ماؤف ہو گیا ہے؟۔ اسے نئے نئے خیالات ستاتے۔ راتوں کو غیر مرئی شبیہیں آس پاس منڈلاتی نظر آتیں۔ جب کبھی رات کو اس کی آنکھ کھلتی اسے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ آنکھیں جھپکتے ہی وارڈ سے باہر بھاگ گیا!۔

اس نے نرسنگ آرڈلی سے شکایت کی۔ "تم ساری رات جاگتے نہیں ہو۔ میں بھیانک خواب دیکھا کرتا ہوں۔" نرسنگ آرڈلی نے بدتمیزی سے جواب دیا تھا۔ صاحب میرے جاگنے یا سو جانے سے آپ کے خوابوں پر کیا اثر پڑ سکتا ہے!؟۔"

بکو مت۔" اس نے اسے ڈانٹ دیا۔

اب ثاقب کو مسلسل شکایت رہنے لگی۔ اس کے کام رہ جاتے ہیں۔ کوئی نہیں سنتا!۔ اسے پیاس لگتی ہے۔ وہ ملازم کو آوازیں دیا کرتا ہے۔ لیکن وہ مردود سن کر بھی انجان بنا رہتا ہے۔ سردی میں کانپتا ہے۔ لیکن ملازم اتنا بھی نہیں کرتا کہ اس کے گرد کمبل دبا دے۔!

اس نے اس خبیث ملازم کی شکایت پروفیسر صاحب سے کر دی۔ چنانچہ وہ برطرف ہوا اور اس کی جگہ اس الو کے بیمار پر ایک بوڑھی بدشکل جہاں دیدہ نرس مقرر ہوئی۔! ثاقب کے پہلے ہی حکم پر اس نے اسے پھاڑ کھایا۔ ترش لہجے میں بولی تھی!۔

" مسٹر ثاقب۔ اپنے کو تمھارا جاسوسی والا بات اچھا ماتق نہیں رکھتا!۔ تم ایک کے بعد ایک نرس کو تنگ کرتا۔ اپن تمھارا نوکر نہیں۔ گورنمنٹ کا سرونٹ ہے۔ تم اپنے کو سلی آرڈر دئیں گا تو اپن بڑا صاحب سے تمھارا کمپلین کر دئیں گا۔! تم خاموشی سے ڈوڈھ پینا اور انجکشن لینا منگتا۔ تم بھلا مانگے۔ ایسا شور مچا کے گھر کر کے بھاگا ڈیوٹی میں تو مسٹر جنس نہیں

کرنا۔ سمجھ گیا؟۔

ثاقب یوں خاموش ہوا جیسے اس بڑھی دیوانی نے اسے تھپڑ ہی مار دیا ہو۔ اس نے اپنی گنگناتی بولی میں ایک کچر جھاڑ کے نہ صرف ثاقب کو دوا پلادی بلکہ بڑی بیدردی سے انجکشن بھی ٹھونس دیا۔ جس کی چبھن دیر تک اسے تکلیف دیتی رہی۔

"اے سنو۔ مسز جیکب۔؟" ثاقب نے ڈرتے ڈرتے کہا "وہ پہلے والی نرس مس اسما کہاں گئی؟۔" "انکی مسز جیکب نے انگریزی میں جواب دیا" اس نے کرنل احسان سے درخواست کرکے اپنا ٹرانسفر وکٹوریہ میٹرنٹی ہوم میں کرالیا۔ اس نے کرنل صاحب سے کہا تھا۔ تم نے اس کی سخت توہین کی تھی مسٹر ثاقب۔ اس نرسنگ ہوم میں کوئی تم سے خوش نہیں۔ بی کاز یو آر ناٹ اے جنٹل مین۔!"

وہ برا سا منہ بنا کر اپنے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

یہاں کوئی مجھ سے خوش نہیں۔ اس کے دل پر کسی نے گھونسہ مار دیا "بی کاز آئی ایم ناٹ اے جنٹل مین!۔

میں ایسا وحشی جنگلی اور گنوار کیوں ہوں۔؟۔ کیوں۔

اس نے کتاب پھینک دی جو فرش پر جا گری اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر بے حد تکلیف سے سوچنے لگا۔!

مجھ سے لوگوں کو دکھ پہونچے ہیں۔ میں سب کے لئے باعث اذیت رہا ہوں!۔

اور وہ بے چاری۔ نرس۔ اسماء جس کا پیشہ یہی تھا!۔ بیماروں اور دکھ کے ماروں کو دلاسہ تسلی دلاسے اور حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک جان بخش تبسم آدھی تکلیف دور کر دیتا ہے۔ اسماء کو اپنا فرض یاد تھا۔ اور وہ۔ سبھی بیماروں سے مسکرا کر ہنس کر خوش ہو کر گفتگو کرتی تھی۔ اسے اپنی ممی کا کہا یاد آیا۔ رات رات بھر تمہارے پاس جاگی تھی۔ تمہاری ذرا ذرا سی تکلیف کی خبر کرنل صاحب کو دی تھی۔ بہت اچھی مہربان، غمگسار اور ہمدرد لڑکی تھی۔ تم نے اس کا دل توڑ دیا۔!

کل اسے ہسپتال سے رخصت ہونا تھا۔ اس کے سارے زخم مندمل ہو چکے تھے۔ پروفیسر صاحب خوش تھے۔ وہ اسے دیکھنے آئے تو واپسی پر کہہ گئے کرنل سے کہ گھر جانا ہے

خوش ہو جاؤ۔!

مگر وہ خوش نہیں ہوا۔ وہ تو گھر جانے کے لئے بیتاب تھا ایک پژمردہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر چھائی اور معدوم ہو گئی۔!

ساری رات اس پر بڑے کرب کی گزری۔ وہ جاگتا رہا۔ شاید آج کوئی پر اسرار موہوم سی شبیہ اسے نظر آئے۔ شاید کوئی چہرہ اس کے چہرے پر جھک جائے۔ شاید کوئی ہاتھ اس کی پیشانی سے اس کا بخار دیکھے۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ صبح ہو گئی۔!

کرنل احسان اس کا آخری چیک اپ کرنے آئے!۔ اور ہمیشہ کی طرح مسکرا کر اس کے گال پر تھپکی دے۔ بالکل ٹھیک ہو۔ پروفیسر صاحب آئیں گے۔ گھر چلے جانا۔!

کیا میں اکیلا نہیں جا سکتا؟۔ اس نے ایک محتاج کی طرح گڑگڑا کر ان سے اجازت طلب کی۔

جا سکتے ہو۔ اتنی جلدی ہے گھر جانے کی؟" وہ مسکرا سکے تھے۔ لیکن وہ مسکرایا بھی نہیں۔ کرنل صاحب کے جاتے ہی وارڈ سے نکلا۔ اسے اپنے سامان کی کیا پرواہ تھی۔ اسے گیٹ کے باہر ٹیکسی کی اور میٹرنٹی ہوم کا پتہ بتا کر بڑی بے چینی سے راستہ کٹتا دیکھتا رہا!۔

خدا خدا کر کے ٹیکسی میٹرنٹی ہوم کے گیٹ میں داخل ہوئی۔ وہ اترا۔ حالانکہ اسے کمزوری کے مارے چکر آ رہے تھے!۔ لیکن وہ کسی طرح انکوائری سکشن میں پہونچ ہی گیا۔ اور ایک نرس کے ذریعہ مس اسماء کو بلا بھیجا

دو لمحے دو صدیاں بن کر گزرے اور پھر اس نے دیکھا کہ اسماء اس کے سامنے کھڑی تھی!۔ اپنے مخصوص سفید لباس میں لپٹی!۔

اسماء!۔ اس نے والہانہ انداز میں کہا۔

مسٹر ثاقب ... کیا مجھ سے پھر کوئی قصور ہوا ہے۔؟ اسماء نے کہا۔

نہیں۔!

تو پھر آپ۔؟

میں تمہیں لینے آیا ہوں!

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

تم دیکھ رہی ہو۔ میں زخمی ہوں۔ کمزور ہوں۔ ابھی مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ اور ——

"آپ ہسپتال سے کیوں چلے آئے؟"

"آج مجھے ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔!"

"تو پھر آپ۔ اپنے گھر جائیے۔ آپ چل پھر رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں آپ کے زخموں کو نقصان پہنچ جائے۔!"

اسمار۔" اس نے ادھر ادھر دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا وہ گھبرا رہی تھی۔! اس کی پلکیں فرط حیا سے بار بار اٹھ اٹھ کر گر رہی تھیں۔!

اسمار سنو۔ مجھے تمھاری ضرورت ہے۔

وہ طنزیہ مسکرائی: یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ثاقب صاحب۔ میں نرس ہوں۔ ایک ناقابل بھروسہ عورت۔ میں تمام مردوں سے ہنستی بولتی ہوں۔ بے شرم ہوں۔ مردوں کے جسم چھوتے مجھے حیا نہیں آتی۔ لیکن آپ آپ ایک شریف۔ بلند و برتر انسان ہیں۔ آپ کو بھلا مجھ ایسی عورت کی کیا ضرورت پڑ سکتی ہے۔ کیا آپ نے مجھے ستانے کا کوئی نیا ڈھنگ سوچا ہے۔!"

بس کرو۔ خدا کے واسطے بس کر دو۔" ثاقب نے اپنی گرفت اس کے ہاتھ پر تنگ کر دی۔ "تم جب سے یہاں آئی ہو۔ کسی نے راتوں کو جاگ کر مجھ پر کمبل نہیں اوڑھایا۔ کسی نے بار بار میری پیشانی چھو کر میرا بخار نہیں دیکھا۔ کسی نے مجھ پر جھک کر یہ نہیں دیکھا کہ میں سو رہا ہوں کہ تکلیف کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آتی۔ اسمار میں نے تمھارا دل توڑا ہے۔ اپنی بدمانی سے تمھیں اتنی اذیت دی ہے کہ تم نے اس ہسپتال میں رہنا بھی گوارہ نہ کیا۔ جہاں میں تھا۔

ثاقب صاحب۔ آپ گھر جائیے۔ میں پھر کبھی آپ سے ملنے آؤں گی۔!

تم جانتی ہو میں کتنا ضدی ہوں۔ دیکھو اسمار دیکھو۔ میں تمھارے سامنے اپنی ساری پٹیاں اور بینڈیج نوچ کے پھینک دوں گا۔ پھر نوچ ڈالوں گا اپنے سارے زخم۔ پھر وہ کبھی مندمل نہ ہوں گے۔!

یا خدا۔ آپ کیا چاہتے ہیں۔؟"

میرے ساتھ میرے گھر چلو۔!"

"مگر یہاں بھی تو بیماروں کو میری ضرورت ہے!" اسمار بولی۔

میں بھی تمھارا بیمار ہوں۔ اور مجھے بس تمھاری ضرورت ہے۔ آؤ چلیں۔!"

"لیکن میری ملازمت۔!"

کیا میری ہو جانے کے بعد بھی تمھیں ملازمت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ اسمار۔ میری تکلیف بڑھ رہی ہے میرے ساتھ چلو۔ جلدی چلو۔!!

اسمار اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔!!

جنت ارضی کی حور

نکہت شاہجہاں پوری
ایم-اے-بی-ٹی

ذکر اس وقت کا ہے جب دنیا میں انسان کا کوئی وجود نہ تھا ندی پہاڑ، جھرنے، دریا، وادیاں، جنگل، صحرا سب ویران اور خاموش تھے۔ چاند سورج بھی اپنے معمولی کے مطابق روزانہ کائنات کا چکر لگاتے ہوئے صبح سے شام اور شام سے صبح کرتے رہتے تھے۔ ہر طرف ایک پر ہول سناٹا طاری تھا۔

سارے مناظر ویران اور بے جان نظر آتے تھے۔ کوئی دلکشی نہ تھی اور اگر کچھ تھا بھی تو اسے عالم محسوسات میں لانے والا کوئی نہ تھا۔ اور پھر دنیا کو آباد کرنے کے لئے قدرت نے دنیا میں مرد و عورت کو اتارا۔ مرد و عورت دو مختلف سمتوں میں لامتناہی فاصلوں میں دور از دور اتارے گئے۔ کہتے ہیں کسی گناہ کی پاداش میں سزا کے طور پر ان کو زندگی اور دنیا کی کڑی سختیاں سہنے کو بھیجا گیا۔

انھوں نے جب دنیا کے بھیانک ماحول اور پرہول سناٹے ویرانی تنہائی کو دیکھا تو اپنی خطا پر بہت پچھتائے۔ آہ و زاری کی۔ برسوں سجدے میں معافی کی التجا میں گڑگڑا کر گزار دئے۔ عفو گناہ کے لئے توبہ و استغفار کرتے رہے۔ پھر آخر کار شان کریمی جوش میں آئی اور انھیں بخش دیا گیا۔

تو ذکر اس وقت کا ہے کہ جب قدرت کی نرم و نازک حسین ترین تخلیق "عورت" نے عالم وجود میں آ کر اس جہان میں اپنا پہلا اور مبارک قدم رکھا تھا۔ بڑا ہی حسین اور تابناک دن ہوگا وہ جب قدرت کی یہ حسین اور دلکش شاہکار عورت دنیا کے پرہول لق و دق وسیع و عریض دامن صحرا میں نمودار ہوئی ہوگی۔

میرے تصورات کی پرواز کہتی ہے کہ اس کی آمد پر کائنات کے ذرے ذرے نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا ہوگا ——— شاید بہتے ندیا نالوں کی روانی ایک لمحہ کے لئے تھم گئی ہوگی۔ وقت کی تیز رفتار نبض ٹھہر گئی ہوگی۔ پرکیف نشیلی بدمست بہاروں نے ساری فضا میں ایک سحر انگیز نشہ بکھیر دیا ہوگا۔ خود رو چمن کے گل بوٹوں نے لہرا لہرا کر جھوم جھوم کر سلام عقیدت پیش کیا ہوگا۔ گل و بلبل نے اس کے حسن دل نواز کی تعریف میں لطیف سرگوشیاں کی ہوں گی۔ خوبصورت پرندوں نے مسرت افزا چہکار سے فضائے بسیط میں شیریں نغمے بکھیرے ہوں گے گلستاں کے خوش رنگ پھولوں نے اپنی عطر بیز خوشبو کی سوغات فضاؤں میں تقسیم کی ہوگی۔ حسین نازک اور رنگین کلیوں نے پتیوں کے آنچل سے گردن اٹھا کر مسکراتے ہوئے قدرت کی اس حسین اور بے مثل صناعی کا استقبال کیا ہوگا۔ اور شاید بہاروں نے سبزہ زار پر فرش گل بچھا کر ستاروں کی انجمن میں ماہ تاباں کے زیر صدارت ایک رنگین مشاعرہ اپنی خاموش زبان میں ضرور کیا ہوگا۔

رات اپنے سیاہ اطلسی آنچل میں ہزاروں دل فریبیاں اور بے شمار سحر انگیز پرکشش جلوے لئے جلوہ فگن ہوئی ہوگی۔ پرکیف نشیلی بھیگی رات نے باد صبا کے ساز کے سرگم میں ڈوب کر آبشاروں کے بربط پر ایک سریلا نغمہ دھیمے سروں میں گایا ہوگا۔ پھر دھیرے دھیرے رات کا فسوں چھٹنے اور خمار ٹوٹنے لگا ہوگا۔ صبح کاذب اپنی تمام تر رعنائیاں لیکر جلوہ گر ہوئی ہوگی۔ نسیم صبح گاہی نے ہر چرند پرند کو تازہ دم مسرور و شاداں کر دیا ہوگا۔ آفتاب عالمتاب نے اپنی منور کرنوں سے سارے عالم [illegible] کی پاداش کی ہوگی۔ اور [illegible] والی شعاعوں کو بکھیر کر سارے کرہ ارضی کو بقعۂ نور بنا کر ایک ایک ذرے کو روشن اور منور بنا کر جنت ارضی کو [illegible] کی ہوگی [illegible] نے اپنا [illegible] رنگ سے کر اس کی [illegible] ہوگی۔ سبزے نے اپنا مخملیں فرش بچھایا ہوگا۔ [illegible] لی ہوگی

فلک بوس پہاڑوں اور شاداب وادیوں میں بادِ صبا نے اپنے دم ساز کے سرگم میں گم ہو کر ایک دلکش گیت گنگنایا ہوگا۔ وادیوں کی آغوش میں بہتے ہوئے آبشاروں چشموں جھیلوں اور جھرنوں نے چٹانوں کی ڈھلانوں پر بہتے ہوئے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے جلترنگ کے سحر فریب ساز نے مترنم آواز میں نغمات کی بارش کی ہوگی

قدرت کے حسین شاداب گل بوٹوں پر لہراتی سیمیں بدن بیلوں خوش رنگ نازک لچکیلی شاخوں پر شبنم نے سر خوشی و مستی کے عالم میں گلاب پاشی کر کے کائنات کے قدرتی چمن میں نمی مہک مہک خنکی اور تازگی بھر دی ہوگی۔ صحراؤں میں موروں نے ٹولیاں بنا کر حسین دائرے میں رقص بہاراں پیش کیا ہوگا اور گلزار مہک اٹھے ہوں گے۔ اور ان سب سے دور الگ بہت دور حضرت انسان قدرت کی تخلیق کی پہلی کڑی (آدمی) جس کو قدرت نے دنیا کی تمام چیزوں سے اعلیٰ اور افضل تر بنایا۔ اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا گیا۔ اور قدرت کی یہی اعلیٰ ترین جنس یعنی آدمی نے جب عالمِ آب و گل میں اتر کر آنکھیں کھول کر اس پر ہول عالم۔ ویرانے اجاڑ ویرانے لق و دق صحرا میں خود کو تن تنہا پایا ہوگا تب اس کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ وہ کتنا سراسیمہ حیران و پریشان ہوا ہوگا۔ اس ویرانگیٔ عالم کو دیکھ کر شاید بہت غمگین اور خوفزدہ ہوا ہوگا۔

وہ قدرت کے اس عتاب کو محسوس کر کے بہت رویا بڑی منت و زاری فریاد و التجا کی ہوگی۔ اور جب خطاؤں کے بخشے جانے پر کچھ چین راحت اور خوشی ملی ہوگی تو یقیناً اسے ایک ساتھی رفیق، ہمدرد اور شریک زندگی کی شدید تر ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ تب پھر کیا ہوا ہوگا"

قدرت اور شان کریمی کا دل بھر آیا ہوگا ایک بے کس مسکین اور مجبور انسان کی بے چارگی۔ پریشانی اور تنہائی کو دیکھ کر۔ اس کی تقصیر و خطاؤں کو معاف کر کے قدرت نے اسے ایک بہترین ساتھی ہمدرد۔ رفیق مونس و غم خوار شریک حیات کی شکل میں اس کی بہشت کی ساتھی اس کی ہمدم و ہمراز عورت کو اعلیٰ صفات اور عمدہ خوبیوں سے مزین کر کے اسے بخشا۔ عنایت فرمایا۔ اور جب دنیا کے اس پہلے اور بزرگ ترین عظیم مرد نے اپنی ہی پسلی سے پیدا کی گئی اس بے مثال حسین تخلیق کو جنت سے جدا ہونے کے بعد دوبارہ پایا ہوگا تو بارگاہِ خداوندی میں سر بسجود ہو کر سجدۂ شکر ادا کیا ہوگا۔ اس لازوال مسرت اور معجز ملن پر دو پیاسی روحوں نے ایک دوسرے کو خوش آمدید کہہ کر شاندار خیر مقدم کیا اور جشن مسرت منایا ہوگا۔

اداسیاں مٹ گئی تھیں۔ تنہائیاں ختم ہو گئی تھیں۔ افق پر خوشی سے دمکتا ہوا ایک نیا آفتاب نکلا تھا۔ کائنات کے اس پہلے اور مقدس جوڑے نے باہمی اشتراک محبت۔ وفا۔ خلوص قربانی اور اعتماد کے شیریں پاکیزہ و متبرک عہد و پیمان کر کے ایک دوسرے کو شوہر و بیوی کے رشتہ میں قبول کر کے اس پاکیزہ رشتے کی داغ بیل ڈالی ہوگی۔ فرشتوں نے اس پہلے اور مقدس جوڑے کو مسرت و شادمانی کی دعائیں دی ہوں گی۔ آسمان سے گال گھٹاؤں نے موتی لٹائے ہوں گے۔ شیطان غم اور غصہ سے انگارے اگل رہا ہوگا اور یہیں سے دنیا کے دو انسانوں نے زندگی کا مسرت افزا لیکن پر مشقت سفر شروع کر دیا ہوگا۔

آسمان کے بیکراں سائے میں رات دن کے مسلسل سفر کے ساتھ دو زندگیاں اپنے اعلیٰ دماغ اور چار ہاتھوں سے ترقی و تخلیقات اور تعمیر کی راہوں پر گامزن ہو گئی تھیں۔ ہر چیز کا راز آہستہ آہستہ معلوم ہوتا گیا ہوگا۔

رفاقت کے رشتے گہرے اور گہرے ہوتے گئے۔ ہمدردیاں پیار۔ قربانی اور عقیدتیں ایثار و رحم اور جذباتِ وفا نے انسانیت کے رشتے کو مضبوط تر کر دیا ہوگا۔ انسانی تخلیق آگے بڑھتی گئی ماں سے بیٹی اور بیٹی سے بہن بھائی باپ اور شوہر کے رشتوں کا جال پھیلتا گیا۔

ماں کی عظمت۔ بہن کا ایثار و خلوص بیٹی کے پر عقیدت پیار نے عورت کی برکت اہمیت اور تقدیس کا احساس دلایا ہوگا۔ ماں نے ممتا، قربانی پیار۔ بہن نے ایثار خدمت و خلوص اور بیٹی نے بے کراں جذبۂ عقیدت کا سبق ایک دوسرے سے وراثت کی شکل میں پایا ہوگا۔

بے مثال خوبیاں اور انوکھے روپ لیکر دنیا میں عورت

اور ابھر جاتی ہے۔ وہ اپنے حقوق و فرائض کو عمدہ اور بہتر طریقے سے انجام دینے کا سلیقہ رکھتی ہے وہ اپنے شوہر کی بہترین مشیر، سکریٹری اور رہنما ثابت ہوتی ہے۔

عمدہ تربیت اور اعلیٰ تعلیم لڑکی کو عقل و فراست کے نور سلیقہ و شعور کے زیور سے آراستہ کرتی ہے۔ دنیا کی یہ صنف نازک بے شمار خوبیوں اور صلاحیتوں کی مالک ہے۔ وہ خواہ کیسی بھی ہو۔ اچھی لگتی ہے اس کے وجود میں ایک گھنے اور ٹھنڈے سائے کی تازگی اور فرحت محسوس ہوتی ہے۔ ایک کم پڑھی لکھی اور ان پڑھ عورت بھی اپنی صنف وصفت کے لحاظ سے معصوم، سادہ لوح، بھولی اور پرخلوص ہوتی ہے۔ اس کی زندگی کا یہ پہلو بھی بڑا پرسکون اور دل آویز ہوتا ہے۔ مقدس کتابوں اور مذہبی رہنماؤں و دانشوروں کی رائے کی روشنی میں عورت کے چند پہلوؤں کو ملاحظہ کیجیے۔

(۱) دنیا تمام تر متاع ہے اور بہتر متاع ہے دنیا کی صالح عورت (رسول کریمؐ)

(۲) عورت اپنے شوہر کا نصف ہے (مہا بھارت)

(۳) جس گھر میں عورت دکھی رہتی ہے وہ گھر بہت جلد تباہ ہو جاتا ہے۔ (منوسمرتی)

(۴) عورت کی عزت نیک طبیعتیں ہی کرتی ہیں اور اس کی اہانت کمینے لوگوں کے سوا کوئی نہیں کرتا۔ (رسول کریمؐ)

(۵) اگر مرد سورج کی تپش اور حرارت ہے تو عورت چاند کی کرن اور نسیم صبح گاہی۔ (قاضی نذر الاسلام)

(۶) عورت مرد کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ (جان ملٹن)

(۷) عورت برکت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ (جے برڈ)

(۸) عورت گلاب کا پھول ہے اور اس میں خود داری کا ایک چھوٹا سا کانٹا لگا رہتا ہے۔ (ٹینی سن)

(۹) خوبصورت عورت آنکھوں کی مسرت ہے اور خوب سیرت عورت روح و دل کی۔ (افلاطون)

(۱۰) عورتوں سے حسن معاشرت سے گزران کرو۔ (قرآن پاک)

(۱۱) عورت کے دل کا فیصلہ ایک ایسی عظیم الشان طاقت ہے جسے سمندر کی تبار موجیں پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانیں ہیں کے زبردست زلزلے اور جلیل القدر بہادر فوجوں کے حملے بھی نہیں توڑ سکتے۔ اس کا دل ایک ایسا طلسم مخفی ہے جس کے بھید آج تک نامعلوم ہیں۔ (مولانا ابوالکلام آزاد)

(۱۲) جتنے بھی بڑے کام ہوئے ہیں ان سب کی پشت پر عورت رہی ہے۔ (لامارٹن)

(۱۳) اچھی بی بی بارہ ماسی بیل کی طرح ہوتی ہے وہ جس گھر میں آتی ہے اسے سدا بہار بنا دیتی ہے (جونسن)

(۱۴) مرد فتح کا بھوکا ہوتا ہے۔ عورت خود سپردگی کی۔ مرد لوٹنا چاہتا ہے اور عورت لٹ جانا (مہادیوی ورما)

(۱۵) مرد کی محبت اس کی زندگی کا حصہ ہوتی ہے مگر عورت کی محبت اس کی ساری زندگی (بائرن)

(۱۶) حسین عورت ہیرا ہے لیکن نیک عورت جواہرات کا خزانہ (شیخ سعدی)

(۱۷) عورتوں کا حق بھی تم پر ایسا ہی ہے جیسا تمہارا حق عورتوں پر (رسول کریمؐ)

(۱۸) لڑکیوں کی ہنسی آج اور پہلے بھی اس دھرتی کی دلکش آوازوں میں سے ایک ہے (ولی کوئنسے)

ان حقائق کے بعد بھی عورت کو اس کا حق پورا نہیں دیا گیا۔ اسکی معصومیت سے فائدہ اٹھا کر دنیا نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اسے جہالت کے اندھیروں میں بھٹکنے پر مجبور کیا۔ لڑکوں کی نسبت اس کی وقعت کم اور بیزاری زیادہ رہی۔ اسے مار ڈالا گیا۔ زندہ دفن کیا گیا۔ گھر کی لونڈیوں کی طرح رکھا گیا۔ اس سے خدمت لینا اپنا حق اور اس کا فرض مانا گیا۔ نت نئے مظالم اس پر توڑے گئے۔ گھر کے اہم رازوں اور مشوروں میں عورتوں کو کبھی شریک نہیں کیا گیا۔ اسے کمزور، سادہ لوح اور ضعیف العقل کہا گیا۔ گھر کی دولت کو صرف کرنے کا اسے حق نہیں دیا گیا۔ باپ کے گھر میں باپ و بھائیوں کی فرمانبردار و خدمت گزار رہی۔ شوہر کے گھر میں شوہر کے سارے خاندان کی باندی بنائی گئی۔

بے دریغ خدمتوں کے صلے میں جھڑکیاں طعنوں و کوسنوں سے نوازا گیا۔ ظالم شوہروں نے حیوانوں کی طرح سلوک روا رکھا اسے بے دریغ پیٹا گیا۔ اس کی بے بسی پر اسے آنسو بہانے کی بھی اجازت نہ تھی۔ دھیرے دھیرے بیداری آئی۔ صدیوں کے بعد عورت

نے اپنی اہمیت کو سمجھا۔ اور وہ بیدار ہوکر اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی علم و عمل کی روشنی میں جد و جہد کرکے اپنی ترقی کی راہوں کو ہموار کرنے کے لئے راہ میں آنے والے خارزاروں سے اپنے دامن کو بچاتی چھڑاتی وہ بڑھتی رہی بڑھتی رہی جہالت اور لاعلمی کے اندھیرے چھٹتے گئے اور امید کا روشن آفتاب چمک اٹھا۔

قرن ہا قرن کی جہالت کے تاریک پردوں سے نکل کر اس نے نئی آب و تاب سے ایک ترقی یافتہ اور مہذب ترین عورت کے روپ میں نیا جنم لیا۔ آج عورت دنیا کے تمام مہذب ممالک میں علم و فن میں مرد کے قدم بقدم شانہ بشانہ ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ گئی ہے اور اس نے ترقی کی بلند و بالا منزل کو چھو لیا ہے۔ اور پیچھے رہ جانے والی بہنوں کو انھیں بلندیوں کی طرف بڑھتے رہنے کے لئے پیغام عمل دے رہی ہے۔

اور اب آنے والا وقت یہ بھی بتا دیگا کہ عورت نے اپنی بہترین صلاحیتوں سے اپنی علمی قابلیتوں سے اپنی عقل سلیم اپنی شیریں کلامی اور نرم روی سے دنیا کو مسخر اور مسحور کرکے پوری دنیا کے دل و دماغ کو متاثر کر لیا ہے۔ اور حوا کی وہی سادہ لوح مکر ور اور ضعیف العقل بیٹی اپنے صحیح حقوق و فرائض کی ادائیگی کے لئے پوری طرح بیدار ہو گئی ہے اور یہی بیداری زندہ قوموں کی علامت ہے۔

وہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی جس کا نصف حصہ جہالت اور لاعلمی کی تاریکی میں پڑا ہو ہمیں اس نئی بیداری کا استقبال کرنا چاہیئے اور اپنے معاشرے کے اس تابناک روشن اقدام کو حوصلہ مندی سمجھداری اور وقت کی سچی مصلحت سمجھکر کھلے دل سے قبول کرنا چاہیئے۔ اتنا ہی نہیں ملک و قوم کی جڑوں کو مضبوط کرنے اور معاشرے کی اصلاح کے لئے اس نوبیدار طبقہ کو عزم اور حوصلہ جوش اور عمل کی دعوت دینا چاہیئے کیونکہ اس کی بہتری پر سماج، ملک و قوم کی بہتری کا انحصار ہے۔ اور یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ عورت مرد کا نصف بہتر ہے۔

انسانیت

صفیہ عاشی

کئی بار اس کی نظروں سے وہ اشتہار گزرا تھا۔ اور جب بھی وہ یہ اشتہار پڑھتا اس کے تن بدن میں ایک عجیب سی بے چینی کی لہر دوڑ جاتی اور وہ گھنٹوں کسی خیال میں ڈوب جاتا۔ اس اشتہار کی سرخی کچھ یوں تھی....

"ایک سندر اور نوجوان لڑکی آج مہینوں سے گردے کے درد کا شکار بنی بمبئی کے ہاسپٹل میں داخل ہے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اسے ایک تندرست گردے کی ضرورت ہے..... انسانیت کے ناطے ہم اپنے ملک کے لوگوں سے گزارش کرتے ہیں جنکے دل میں قربانی اور ایثار کا جذبہ ہو وہ اپنا ایک گردہ دان دے کر اس لڑکی کی زندگی بچالیں جس نے ابھی زندگی میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔

خدا کے لئے ہماری اس التجا پر غور کریں۔

نیچے اشتہار شائع کرانے والے کا نام پتہ بھی درج تھا.....

بار بار پڑھنے سے وہ پتہ اسکے ذہن میں محفوظ ہو گیا تھا۔ وہ متوسط طبقے کا ایک نوجوان تھا جو یتیم بھی تھا۔ دور اور نزدیک کا کوئی رشتہ دار بھی نہ تھا۔ ٹیوشن کے ذریعہ وہ اپنی روزمرہ کی ضروریات پوری کرتا۔ نہ کسی قسم کا شوق تھا نہ ہی کوئی باہری دلچسپی۔ تنہا پسند اور انتہا پسند طبیعت پائی تھی۔ جب یہ اشتہار اس کی نظروں سے گزرا تو اس کے دل میں کسی کے لئے کچھ کر گزرنے کا احساس جاگا۔ اور پھر اس احساس نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ وہ روپیہ کا انتظام کر کے بمبئی جا پہنچا لڑکی کے باپ سیٹھ شنکر لال نے اس کا مدعا جان کر اسے گلے سے لگا لیا اور پچیس ہزار معاوضہ کے طور پر اس کے سامنے رکھ دیئے وہ بے حد شرمندہ ہو کر بولا میری قربانی کا معاوضہ دے کر مجھے شرمسار نہ کیجئے سیٹھ صاحب میں صرف انسانیت کے ناطے آپ تک آیا ہوں۔ اور صرف یہی گزارش کرتا ہوں کہ آپ میرے علاج کا بندوبست کر دیں کیوں کہ میں علاج کے اخراجات برداشت نہ کر سکوں گا۔ سیٹھ جی نے بخوشی اس کی بات منظور کر لی

.... آپریشن ہوا اور وہ اسی اسپتال کے ایک وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ ایک مہینے بعد وہ لڑکی صحت مند ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔ جانے سے پہلے وہ اس سے ملی اور عقیدت سے اس کے پاؤں چھو لئے۔ وہ نہیں نہیں کرتا ہی رہ گیا.... ابھی اسے ایک ماہ اور اسی ہاسپٹل میں رہنا تھا، وہ مطمئن تھا اپنی اس بے مثال قربانی پر۔ لیکن ایک صبح اچانک وہ بے حد پریشان ہو اٹھا۔ جب اس کے معالج نے اس کے سامنے مزید علاج کے واسطے اور روپیوں کے بل اس کے سامنے رکھ دیئے۔ تب اسے معلوم ہوا کہ بل کا پے منٹ کرنا سیٹھ جی نے بند کر دیا تھا۔ وہ سکتے میں آگیا.... روپیہ نہ ہونے پر علاج بھی نہ ہو سکتا تھا۔ جبکہ اسے ابھی آرام کی سخت ضرورت تھی۔ بھیک کے لئے ہاتھ پھیلانا اسے گوارا نہ ہوا پھر بھی اس نے سیٹھ جی سے مل کر اس معاملہ پر بات کی تو سیٹھ جی نے بڑی رکھائی سے اسے جواب دے دیا۔ یعنی مزید علاج کا خرچ وہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہ سلوک اس کے لئے حیرانی کا باعث بھی تھا اور بے حد تکلیف دہ بھی... اتنے بڑے شہر میں اس کا کون تھا جو اس ظلم کی روداد سنتا یا کچھ روپیوں سے اس کی امداد کرتا۔ اس کی صحت بھی پہلے جیسی نہ رہ گئی تھی۔ دھیرے دھیرے ہی اسے اپنی جسمانی کمزوری پر قابو پانا تھا... لیکن اب کیا ہو کیسے ہو۔ ان سارے سوالوں نے اسے بے حد نڈھال کر دیا بالآخر وہ تھکا ہارا ہاسپٹل سے اپنا سامان لینے پہونچا۔ اسکے معالج کو جب اس حادثہ کا علم ہوا تو اس نے ازراہ ہمدردی اسے کچھ دن ٹھہرنے کو کہا اور اس کے منع کرنے کے باوجود اخبار میں ایک اشتہار دلوا دیا... کہ شاید اتنے بڑے ملک میں کوئی اور نیک انسان ایک بے غرض اور معصوم انسان کی جان بچالے

.....ایک صبح ایک نازک سی سوگوار سی آنکھوں والی لڑکی اس کا پتہ پوچھتی ہوئی اس کے وارڈ میں داخل ہوئی۔ اس نے پذیرائی کے لئے اٹھنا چاہا لیکن کراہ کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ایک بزرگ عورت بھی تھی۔ اس نے نرس سے کچھ دیر باتیں کیں اور خاموشی سے اسے دیکھتی ہوئی چلی گئیں..... بعد میں اسے معلوم ہوا کہ اس نو وارد لڑکی نے اس کے خرچ کا روپیہ ہاسپٹل میں جمع کرا دیا ہے..... وہ سارے دن اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسکی خودداری اسے ملامت کر رہی تھی کہ اس نے ایک لڑکی کا احسان اٹھایا۔ یہ بات اس کے لئے سوہان روح تھی۔ وہ اس سے واقف بھی نہ تھا۔ وہ تذبذب میں پڑا سوچتا رہا..... شام کو انہیں دونوں کو اپنے کمرے میں آتے دیکھ کر وہ چونکا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لڑکی نے بڑے پرخلوص انداز میں نمستے کی اور دونوں وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئیں وہ بھی اپنا درد دبائے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس کے دل کی بات اس کے زبان پر آگئی۔ وہ سارے دن یہی سوچتا رہا تھا کہ اس روپے کو واپس کر دے..... اسکی تمام باتیں سن کر لڑکی کے چہرے پر کرب کی لکیریں ابھر آئیں۔ اس نے ایک بار اس بزرگ عورت کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر اس سے مخاطب ہوئی..... وجے بابو۔ ایسا سوچنا آپ کو زیبا نہیں جب آپ کسی کی زندگی کے لئے اپنے جسم کا ایک خاص حصہ خوشی سے دان دے سکتے ہیں۔ جسے دے کر آپ پھر اسے پا بھی نہیں سکتے تو پھر یہ تو محض پیسہ ہے۔ ہاتھ کا میل۔ آیا اور گیا۔ اس کی اتنی فکر آپ کیوں کرتے ہیں۔ ہم تو اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ آپ جیسے انسان کی خدمت کا موقع ہمیں میسر ہوا..... لڑکی کے صاف اور شستہ انداز گفتگو سے وہ بے حد متاثر ہوا۔ کچھ کہنے کی اسے جرأت نہ ہوئی۔ اسے خاموش دیکھ کر لڑکی نے مزید کہا... میرا نام اندرا ہے۔ ایک کالج میں لکچرر ہوں۔ یہ میری ماں ہیں۔ ہم دونوں کا ایک دوسرے کے سوا دنیا میں اور کوئی نہیں۔ یوں کہنے کو دور نزدیک کے بہت سے رشتہ دار ہیں.....

وجے نے بے ساختہ اٹھ کر بزرگ عورت کے پاؤں چھو لئے چاہے محبت سے [illegible] بزرگ خاتون نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اگر [illegible] بول

نہیں سکتیں۔ اندرا نے بڑے جوش سے کہا اور نظریں جھکا لیں..... اچھا۔ اف۔ وہ حیرت اور غم کے ملے جلے انداز میں اس کی ماں کو دیکھنے لگا..... ماں آپ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھئے۔ وہ بے حد عقیدت سے جھک کر بولا۔ ماں صرف مسکرا دیں۔ اچھا وجے بابو۔ اندرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اجازت دیجئے۔ ہم صبح شام آپ کی خیریت جاننے آیا کریں گے

وہ بے تکلفانہ بولنے ہی والا تھا کہ اندرا کی شکایت بھری نظریں اس کی طرف اٹھیں اور وہ بے ساختہ خاموش ہو گیا۔

اندرا کی روح پرور باتوں اور سادگی نے وجے کے دل کو تقویت بخشی۔ ایک طمانیت بھرا احساس ہوا کہ اس کے دکھ سے رنجیدہ ہونے والا بھی کوئی ہے جو اسے فرحت بخشتا ہے۔ صبح و شام اس کی منتظر نظریں کمرے کے دروازے پر ٹک جاتیں اور جب اندرا مسکراتی ہوئی ماں کے ساتھ اندر داخل ہوتی تو اس کی ساری کمزوری دھل جاتی.....

لیکن یہ صبح شام کا آنا جانا اندرا کے قریبی رشتہ داروں کو بہت ہی کھل گیا۔ وجے نے محسوس کیا تھا کہ کچھ مشکوک چہرے اس کے وارڈ میں جھانکتے اور چلے جاتے..... لیکن اس نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہ دی لیکن ایک صبح اندرا کو اکیلے آتا دیکھ کر وہ کچھ پریشان سا ہو گیا کیونکہ اندرا کے چہرے پر خلاف معمول اس نے خاموشی پائی..... اس کی مسکراہٹ کے پیچھے کوئی درد سا چھپا وجے نے محسوس کیا۔ مگر نہ جانے کیوں وہ اس سے کچھ پوچھ نہیں سکا۔ اندرا نے بتایا بھی نہیں۔ لیکن دوسرے دن اس سے صبر نہ ہو سکا۔ ماں کیوں نہیں آئیں؟ وہ حیرانگی سے پوچھ بیٹھا۔

طبیعت نہیں ٹھیک ہے۔ اندرا نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

ارے تو مجھے تم نے کچھ بتایا ہی نہیں۔ وہ یکایک اٹھ کر بولا چلو میں چلتا ہوں.....

نہیں نہیں۔ وہ بے اختیار بول اٹھی۔

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ کیا بات ہے اندرا [illegible] کے قریب آ کر بولا [illegible] ہے؟؟

وجے بابو. اندرا کے لب کانپ گئے.... میں. میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں. پتہ نہیں آپ کیا خیال کریں. وہ رکتے رکتے بولی.. وجے خاموش کھڑا اسے تک رہا تھا... اندرا کا یہ گھبرایا سا انداز اس کے دل میں انتشار پیدا کر رہا تھا. اندرا نے کچھ دیر ٹھہر ٹھہر کر کہا. وجے بابو. آپ نے کہا تھا ماں سے کہ وہ آپ کو اپنا بیٹا سمجھیں.

ہاں کہا تو تھا. وہ الجھے ہوئے انداز میں بولا. تو پھر...

وجے بابو. ماں چاہتی ہیں کہ وہ یعنی آپ. آپ ہمیشہ کے لئے ان کے بیٹے بن جائیں.... تو کیا بیٹا نہیں ہوں ان کا. وہ یکایک ہنس پڑا. پھر سنجیدگی سے بولا اندرا میرا اس دنیا میں سچ پوچھو تو تم لوگوں کے سوا کچھ نہیں. پھر ماں نے آخر مجھے الگ کیوں سمجھا..

وجے بابو. وہ میرا مطلب ہے. داماد بھی تو بیٹا ہی ہوتا ہے وہ گھبرائی شرمائی سی یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی. اور وہ ہکا بکا سا وہیں کھڑا رہ گیا. یہ خیال یہ خوبصورت خواب اس نے بھی دیکھا تھا لیکن وہ خود کو کبھی اس کا اہل نہیں سمجھتا تھا. شاید اسی لئے ماں کی آنکھوں میں چھپی خواہش اور ان کے پیار کو وہ کچھ نہ پایا تھا لیکن آج. آج ان کی بے زبانی اندرا کے منہ کی زبان بن گئی تھی. خدا جانے یہ قسمت کا مذاق تھا. یا نصیب کا دین. وہ سارا دن اسی سے خیالات میں کھویا رہا.

حسب معمول شام کو اندرا پھر آئی. شرمائی ہوئی. محجوب سی کھڑی رہی بیٹھی بھی نہیں. گہری نظروں سے وہ بڑی دیر تک اس کے شرم آلود سرخ چہرے کو تکتا رہا.... اندرا. وہ اٹھ کر اس کے قریب آ کھڑا ہوا.... اتنا کچھ دیا ہے تم نے اور دینا چاہتی ہو. کبھی سوچا بھی ہے. تمہارے سامنے کھڑا یہ شخص یہ محرومیت کا مارا انسان اس کا اہل ہے بھی یا نہیں..... وجے بابو اندرا نے اضطراب بھری نگاہوں سے اسے دیکھا. یہ آپ کیا کہتے ہیں. آپ کی عظمت کے سامنے میری کیا ہستی. سچ تو یہ ہے کہ ازل سے جب آپ کو دیکھا بھی نہ تھا. صرف اشتہار کی زبانی آپ سے واقف ہوئی تھی. اس وقت سے میرے دل نے اس دیوتا کی پوجا کی ہے.... دنیا کے ہر انسان کی طرح مجھے بھی اپنی منزل کی تلاش تھی اور جب منزل میرے سامنے بنی تھی تو. میں نے سوچا اس سے دور کیوں رہوں. مجھے دنیا کی نگاہوں سے بچا کر اپنے دل میں چھپا لیجئے وجے بابو. میں دنیا والوں کے طعنے تشنے اب اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتی. کہیں میری پاکیزگی پر کوئی داغ نہ لگ جائے وجے بابو..... وہ سسک کر اس کے قدموں پر جھک گئی. اندرا.... وجے نے اسے تھام کر اپنے سینے سے لگا لیا. اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے نکل کر اندرا کی زلفوں پر جذب ہو گئے گویا اشکوں نے محبت کو خراج عبادت پیش کیا تھا....

انتخاب تعلیمات قرآن

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۹۱) مطلقہ عورتوں کو عدت گزارنے کے لئے تم اپنی وسعت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو. (سورہ طلاق)

(۹۲) اور طلاق شدہ عورتوں کے واسطے قاعدے کے موافق خرچ دینا پرہیزگاروں پر لازم ہے. (سورہ بقرہ)

(۹۳) اور اگر وہ (مطلقہ) عورتیں حمل والیاں ہوں تو حمل پیدا ہونے تک ان کو خرچ دو. (سورہ طلاق)

(۹۴) اور کسی پر زیادتی نہ کرو. بے شک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے. (سورہ بقرہ)

(۹۵) اور آپس میں خون نہ کرو. (سورہ نساء)

(۹۶) اور اگر بدلہ لو تو اس قدر جس قدر کہ تم کو تکلیف پہنچائی جائے اور اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کے واسطے (سورہ نحل)

(۹۷) اور ملک میں فساد نہ مچاتے پھرو (سورہ بقرہ)

(۹۸) اور اگر مسلمانوں کے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو. (سورہ حجرات)

(۹۹) بے شک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ امانت والوں کو امانتیں پہنچا دو. (سورہ نساء)

(۱۰۰) اور ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ. (سورہ حجرات)

(۱۰۱) اے ایمان والو اپنے عہدوں کو پورا کرو. (سورہ مائدہ)

(۱۰۲) اور اچھے کاموں کی نصیحت کیا کرو. (سورہ عصر)

ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر میں کالج جانے کے لئے باہر نکل ہی رہا تھا کہ پڑوس کے لڑکے واحتی نے آکر کہا: "بھائی جان! آپ کو صدیقی صاحب نام کے ایک آدمی تلاش کر رہے ہیں اور نیچے کھڑے ہیں۔"

"صدیقی! کہاں سے آئے ہیں؟ تم نے پوچھا نہیں۔"

"جی ہاں! وہ رانچی سے آئے ہیں۔"

رانچی کا نام سنتے ہی میرا ذہن ماضی کے دو سال پیچھے کی طرف لوٹ آیا جب میں وہاں رانچی کالج میں آئی۔ ایس۔ سی کا طالب علم تھا صدیقی صاحب میرے چچا کے دوستوں میں تھے اور وہاں ایچ۔ ای۔ سی میں کام کرتے تھے صدیقی جنھیں میں چچا ہی کہا کرتا تھا مجھے بہت مانتے تھے بہت ہی پرلطف انسان۔ بات بات پر قہقہے لگانا اور لطیفے سنانا انکی عادت تھی۔ انکی زبان پہ یہ شعر بار بار مچلا کرتا تھا۔

۔ اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ۔ رستے میں چاہے دوست یا دشمن کا گھر ملے

ویسے ان کی شخصیت بھی کافی اچھی تھی۔ بھرا بھرا بدن، گول چہرہ اوسط قد اور ان سب پر ہنستا مسکراتا چہرہ جو ان کی شخصیت کی دلکشی میں اور اضافہ کرتا تھا۔

میں نیچے ان کی پذیرائی کے لئے جا ہی رہا تھا کہ وہ مجھے بیچ ہی میں مل گئے۔ انھیں دیکھتے ہی مجھے ایک جھٹکا لگا۔ میں مبہوت بنا ان کو دیکھتا رہ گیا۔ دو سال پہلے کے صدیقی چچا میں اور اب کے صدیقی چچا میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ شاداب چہرے کی جگہ مرجھایا ہوا چہرہ صحت کافی گری ہوئی، ہر وقت مسکراتے ہوئے ہونٹوں کی ہنسی نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں صاف نظر آرہی تھیں ان کی زندگی نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھی سلام کے بعد میں انھیں کمرے میں لایا پھر باتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ "کہئے کیسا پتہ کس نے دیا؟" میں نے ان سے سوال کیا۔

"تمہارے دوست شفیع سے لیا" انھوں نے مختصر سا جواب دیا۔

"آپ یہاں کس کام سے آئے ہیں؟"

"ہاں! میرے بڑے بھائی صاحب کے کچھ کاغذات یہاں سکریٹریٹ میں آئے ہوئے ہیں۔ اسی سلسلے میں آیا ہوں۔"

صدیقی چچا ایک بات پوچھوں برا تو نہ مانیں گے؟ میں نے کہا۔

"بیٹے! میں سمجھ گیا تم کیا پوچھنا چاہتے ہو" انھوں نے کہا "تم یہی پوچھنا چاہتے ہو نا کہ میرے لبوں پر ہر وقت کھیلنے والی مسکراہٹ کہاں غائب ہوگئی؟ میری زندہ دلی کہاں گم ہوگئی؟ میری صحت کیوں گر گئی۔ میرے وہ لطیفے کہاں دفن ہوگئے؟ یہی سب پوچھنا چاہتے ہو نا۔"

"ہاں! میں یہی پوچھنا چاہ رہا تھا۔ یہ دھنسے دھنسے گال آنکھوں میں تیرتی دکھ کی پرچھائیاں، میں تو آپ کے اس روپ کو دیکھ کر حیران ہوں، جیسے ہی مجھے پتہ چلا کہ آپ آئے ہیں، میرے ذہن میں آپ کی پرانی تصویر، ہنستا مسکراتا چہرہ، بات بات پر قہقہے لگانے والا چہرہ، لطیفے سناتے ہوئے چچا کا چہرہ ابھرا تھا آخر ایسا کیوں؟"

"بیٹے ذہنی اور گھریلو پریشانیوں نے میرا یہ حال بنا دیا ہے" انھوں نے گول مٹول سا جواب دیا۔

"نہیں چچا بات کچھ اور ہے آپ مجھ سے اصلیت چھپا رہے ہیں" میں ان کے جواب سے مطمئن نہ ہوکر کہہ بیٹھا۔

"بیٹے تم جب سمجھ ہی گئے ہو تو سنو! نسیمہ نے نعیم سے شادی کر لی ہے۔"

"کیا! نسیمہ آپی نے نعیم سے شادی کر لی ہے" سن کر مجھ پر بجلی سی گر پڑی تھی میں حیرت سے ہونقا بیٹھا تھا۔ نسیمہ آپی صدیقی چچا کی بڑی بیٹی تھیں۔

"ہاں بیٹے! آج سے تین مہینے قبل۔

اور ایک بار پھر میں دو سال کے بعد واپسی کی گلیوں سڑکوں اپنے دوستوں اور صدیقی چچا کے گھر میں واپس آ گیا تھا۔ صدیقی چچا اور نعیم صاحب بہت ہی گہرے دوست تھے۔ جس وقت دونوں کو کمپنی کی جانب سے مکان الاٹ کیا جا رہا تھا اس وقت صدیقی چچا نے ہی ہمدردی کر کے نعیم صاحب کو اپنے بغل ہی کا فلیٹ دلایا تھا۔ دوستی ان دونوں میں ایسی تھی کہ جیسے رام اور کشن کی جوڑی۔ نعیم صاحب نسیمہ آنٹی سے بھی بہت کھل کر ملتے تھے اور آخر کیوں نہ ملتے؟ دوست کی بیوی جو ٹھہری۔ کھانا وغیرہ بھی سب ایک ساتھ ہی کھاتے۔ یار دوستوں کی محفل ہو یا پکچر کلبوں کی تفریح تینوں ایک ساتھ اکٹھا جاتے۔ چونکہ میں ان سے تھوڑا بے تکلف تھا اس لئے کبھی کبھار ان کو ٹوک بھی دیتا صدیقی چچا آپ نے جو نسیمہ آنٹی کو اپنے دوستوں میں متعارف کرایا ہے اور پارٹی وغیرہ میں بھی انھیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، اچھا نہیں کرتے ہیں۔ ہماری تہذیب اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ کہ عورت شمع خانہ کے بجائے شمع محفل بن جائے۔ ہر بات کی بھی حد ہوتی ہے اور اس حد سے تجاوز کرنا آپ کے لئے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ دوستوں کی دوستی اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے لیکن بیوی صرف شوہر کے لئے ہوتی ہے، اپنے بچوں کی ماں ہوتی ہے!"

لیکن انھوں نے میری بات یہ کہہ کر ٹال دی تھی" تم نعیم پر خواہ مخواہ شک کر رہے ہو۔ ارے اگر میں اپنی بیوی کو پارٹیوں میں لے کر نہ جاؤں۔ دوستوں سے متعارف نہ کراؤں تو لوگ مجھے دقیانوسی کہیں گے۔ اس جدید دور میں یہ سب بہت ضروری ہے بیٹا۔

تب میں نے کہا تھا" میں کسی پر شک نہیں کر رہا ہوں بلکہ میرے دل میں جو بات کبھی کبھی کھٹکتی ہے وہ کہہ دیتا ہوں کیونکہ عورتوں کی حد سے زیادہ آزادی انسان کے لئے مضر ثابت ہو سکتی ہے!"

کیا سوچ رہے ہو!" اچانک ان کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"میں ان پرانی باتوں کو سوچ رہا تھا جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ نسیمہ آنٹی کو دوستوں سے متعارف کرانا، پارٹیوں میں لیجانا ٹھیک نہیں ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ عورت کی حد سے زیادہ آزادی ٹھیک نہیں ہوتی ہے لیکن آپ نے میری باتوں کو ہنس کر ٹال دیا تھا ساتھ ہی میرا مذاق بھی اڑایا تھا اور کہا تھا کہ آج کل تو یہ ضروری ہے۔ اگر میں ایسا نہ کروں۔ تو میرے دوست مجھے دقیانوسی کہنے لگے۔" لیکن اب آپ اپنی غلطی محسوس کر رہے ہوں گے۔ اب آپ کو لوگ کیا کہتے ہوں گے؟ وہی دوست اب آپ پر طنزیہ جملے کستے ہوں گے"!"

ہاں بیٹے! اس وقت تو میری عقل پر جدید فیشن کا پردہ پڑ گیا تھا کاش اس وقت میں نے تمھاری بات مان لی ہوتی تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ لیکن ایک بات بتاؤ غلطی کس کی تھی؟"

صرف آپ کی۔ کیونکہ اگر آپ چاہتے تو نسیمہ آنٹی کو اپنے دوستوں سے روشناس نہ کراتے تو یہ نوبت نہ آتی اگر وہ آپکی اس بات کو ماننے سے انکار کرتیں تو آپ شوہرانہ حکم صادر کر دیتے کیونکہ جب ناخدا ہی کشتی کو منجدھار میں چھوڑ دے تو بیچاری کشتی کا کیا قصور ہے؟"

"ہاں! میں اب اپنی اس غلطی پر پچھتا رہا ہوں۔

"کاش آپ اس غلطی کو بہت پہلے محسوس کرتے۔ اب پچھتاوت کا ہوت ہے جب چڑیا چگ گئی کھیت!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ••

وہ بھی وہی تھی

شہناز
حیدری ویاوی

راشد جب ہوٹل میں داخل ہوا تو سخت پریشان تھا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے اسے اطلاع ملی تھی کہ اس بار بمبئی میں کسٹم پولیس کا انتظام بہت سخت ہے۔ لہٰذا وہ ہوشیار رہے۔ اگر ایک دن پہلے یہ خبر معلوم ہو جاتی تو اسے کچھ پروا نہ تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر راشد نے دروازہ بند کر کے اپنے سوٹ کیس کو کھولا۔ اس میں رنگ برنگ کے کپڑے جگمگاتی ہوئی تسبیحیں اور ڈھیر سارے خوبصورت خوبصورت سامان بھرے پڑے تھے۔ لیکن راشد کی پریشانی کا سبب وہ چار گھڑیاں تھیں جو اس نے ناجائز طور پر خریدی تھیں۔

ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد راشد نے نوکری کے لئے دوڑ دھوپ بھٹکنا شروع کر دیا لیکن نوکری کے لئے تو سفارش اور رشوت کی ضرورت تھی۔ بے چارے راشد کے پاس ایک آدھ سفارش تو ضرور تھی لیکن افسروں کی مٹھی گرم کرنے کو پھوٹی کوڑی نہ تھی

اس کے محلے میں حاجی عبدالستار صاحب بڑے دولت مند اور معزز آدمی رہتے تھے۔ بڑے بڑے وزیروں سے ان کی دوستی تھی۔ ان کے یہاں چائے، چمڑے، روئی اور پھلوں کی تجارت ہوتی تھی۔ وہ راشد کے دور کے رشتے دار بھی تھے۔ جس وقت وہ غریب تھے راشد کے والد نے ان پر بڑے بڑے احسانات کئے تھے لیکن جیسا کہ لوگوں کا قاعدہ ہے۔ امیر ہو جانے کے بعد حاجی صاحب نے ان کے احسانات کو حرف غلط کی طرح مٹا ڈالا اور اب ان سے دور کا بھی واسطہ نہ رہ گیا تھا۔ لیکن ایک دن راشد ہمت کر کے ان سے ایک سفارشی خط لینے پہونچا تو خلاف معمول حاجی صاحب بڑی محبت سے پیش آئے اور بڑے غور سے اس کی داستان سنی مسکرائے اور کہنے لگے "بیٹا چار دن سے تم نوکری کی تلاش میں ہو لیکن اب تک نہ ملی میرے خیال میں سے بہت اچھا ہو کہ تم دو وقت کی سوکھی روٹی کی خاطر تھیں مل جائے گی

"اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ بڑی نوکری تو ملنی محال ہے"۔ راشد بے چارگی سے بولا۔

"اگر تم مناسب سمجھو تو میں تمھیں ایک مشورہ دوں"۔ حاجی صاحب اس کی طرف پھلوں کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے بولے۔

"ضرور، ضرور۔ آپ بزرگ ہیں جو کہیں گے میری بھلائی کے لئے کہیں گے"۔ راشد مؤدب ہو کر بیٹھ گیا۔ اس دن راشد کو معلوم ہوا کہ حاجی صاحب کے یہاں چائے اور چمڑے کا کاروبار کے علاوہ کچھ "خاص کام" بھی ہوتے ہیں یعنی سونا جواہرات ہیرے اور قیمتی دواؤں وغیرہ کو ادھر سے ادھر کرنا۔ حاجی صاحب نے اسے اپنے اس "خاص کام" میں ہاتھ بٹانے کو کہا۔ کیونکہ اس میں ہیر پھیر کے لئے ذہین حاضر دماغ نوجوان ہی کی ضرورت ہوتی ہے"۔

راشد جو کالج کے زمانے میں ایک آدرش وادی نوجوان تھا۔ یہ مشورہ سن کر گھبرا گیا۔ تو وہ بڑے سکون سے بولے "دیکھو غور کر لو اگر تمھیں دنیا میں ایمانداری سے رہنا ہے تو پہلے ہسپتال جا کر اپنا معدہ نکلوا لو۔ کیونکہ بھوک احساس رکھ کر اس زمانے میں سچ بولنا ناممکن ہے۔ ایماندار بھی رہ گئے۔ اور روٹی بھی مانگ گئے۔ یہ تو ممکن نہیں ہے" راشد کے سامنے اس کی ماں اور چار چھوٹے چھوٹے بے سہارا بھائی بہنوں کے بھوک سے مرجھائے ہوئے چہرے آ گئے۔ اور اس نے فوراً یہ مشورہ قبول کر لیا۔ اس بات کو چار سال گذر چکے تھے۔ بھائی بہن انگلش اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ اور بوڑھی ماں اطمینان سے عبادت کرتی رہی تھی۔ اس دوران وہ کئی بار پھیرے لگا کر امریکہ، عرب جانے کہاں کہاں جا چکا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ کام میں ماہر ہو گیا تھا۔ حاجی صاحب نے اسے خاص طور پر وہاں بھیجا تھا کہ وہ حج کرے اتنی پاک اور مقدس سرزمین پر اسے جاتے ہوئے ڈر لگا۔

لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ راشد تیسری بار بنگال کا سفر کرنے آیا تھا۔ اس بار اس نے بالکل نئے فیشن کی چار گھڑیاں دیکھیں۔ ان میں سے دو کے ہندسے ہیرے کے بنے ہوئے تھے۔ اور دو گھڑیاں پلاٹینم کی تھیں۔ اور ان کے ڈائل بے حد خوبصورت اور چمکدار تھے۔

شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ حاجیوں کو لے کر جانے والا جہاز صبح تین بجے چھوٹنے والا تھا۔ اسی وقت اسے کوڈ ورڈ میں تار ملا کہ کسٹم چیکنگ کا انتظام سخت ہے۔ راشد پریشان تھا۔ اس نے اس وقت ہوٹل چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا کاؤنٹر پر جا کر اس نے بل ادا کیا اور سوٹ کیس اٹھا کر باہر نکل گیا جدہ بندرگاہ پر خوب چہل پہل تھی۔ صدہا مسافر روانگی کے لئے یہاں جمع تھے۔ راشد ادھر اُدھر ٹہلنے لگا ابھی تک وہ اس مسئلے کو سلجھا نہ سکا تھا کہ ان قیمتی گھڑیوں کو کیسے لیجائے گا۔ ٹہلتے ٹہلتے اچانک اس کی نظر ایک ہندوستانی بوڑھی عورت پر پڑی۔ جو میلے کچیلے پرانے کپڑے پہنے دائیں ہاتھ میں گٹھری اور بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹی سی لاٹھی لئے جھک کر چل رہی تھی "اف یہ فقیر لوگ تو رات کو بھی جان نہیں چھوڑتے" راشد کا دھیان اس کی طرف چلا گیا۔ اتنے میں وہ بڑھیا اس کے پاس پہونچ گئی "بوڑھی ماں پر کچھ رحم کر دو بیٹے۔ اس کی آواز میں بڑی بے کسی تھی راشد نے جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ اس نے بڑھیا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ایک ذرا اندھیرے سے کونے میں پہونچ کر اس نے اس بوڑھی عورت سے بات کی۔ اسے بھی اسی جہاز سے ہندوستان جانا تھا۔ اس نے اس بڑھیا سے کہا "ماں میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں۔ جو کہو گی دوں گا تمہیں بیچاری بڑھیا بڑی نیک تھی" بولی ہاں بیٹا ضرور کہو"۔ راشد نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ماں میرے پاس یہ چار گھڑیاں ہیں میرا سامان ذرا زیادہ ہے۔ ان گھڑیوں کو تم اپنے ہاتھ میں باندھ لو۔ میں بمبئی پہونچ کر تم سے لے لوں گا۔

باندھ دو بیٹا۔ بھلا یہ بھی کوئی کام ہے۔ بڑھیا نے بڑے پیار سے کہا۔ اور راشد نے اس کے دونوں ہاتھوں پر دو دو گھڑیاں باندھ دیں۔ اور کرتے کی آستین نیچے کھینچ دیں۔ اور اس کے ہاتھ میں کوئی رقم تھماتے ہوئے بولا مگر کسی سے کہنا نہیں ورنہ بڑی مشکل ہوگی۔

"ارے نہیں بیٹا میں کیوں کہنے لگی تم اطمینان رکھو" بڑھیا نے روپوں کو گٹھری میں ڈالتے ہوئے کہا۔

راشد اب مطمئن تھا۔ اس نے ایک نظر اس کے کپڑوں پر ڈالی۔ بڑھیا کے کپڑے اس قدر ڈھیلے ڈھالے۔ لبادہ نما تھے کہ کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر تاکید کی دیکھو کسی سے کہنا نہیں۔ بیٹا میں بالکل نہیں کہوں گی تم ڈرتے کیوں ہو"

جہاز وقت مقررہ پر روانہ ہو گیا۔ ڈک کلاس کا معائنہ کرتے ہوئے راشد نے دیکھا کہ ایک موٹے سے حاجی صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ آنکھیں بند اور ہونٹ ہل رہے تھے۔ ان کے بغل میں ایک انیس بیس برس کا لڑکا بیٹھا ہوا تھا جو کچھ گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ راشد نے گھوم کر پیچھے دیکھا تو دو عورتوں کے ساتھ ذرا سی جگہ میں وہ بڑھیا بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ راشد اطمینان سے بیٹھ گیا۔ جب جہاز بمبئی پہونچا تو اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ واقعی اس بار چیکنگ بے حد سخت تھی۔ کسٹم ہونے لگا تو راشد نے دیکھا کہ موٹے حاجی صاحب کے پاس سے لاکھوں روپیوں کا سامان برآمد ہوا۔ انھیں روک لیا گیا۔ بہت سے مسافروں کے بعد بڑھیا کی باری آئی تو راشد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بڑھیا نے چاروں گھڑیاں اتار کر ہاتھ میں لے لی تھیں اور ادھر ادھر دیکھ کر گویا کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ کسٹم افسر نے گھڑیاں دیکھ کر پوچھا بڑی بی تم ادھر ادھر کیا دیکھ رہی ہو۔ بڑھیا نے کہا۔ حضور ایک آدمی مجھے یہ گھڑیاں دے کر کہنے لگا، میں ابھی آتا ہوں کچھ سامان جہاز پر رہ گیا ہے لے آؤں۔

کیا تم اسے پہچانتی ہو۔ کسٹم افسر نے دریافت کیا۔

بیٹا! وہ سامنے آ جائے تو پہچان لوں گی۔

راشد لائن میں کھڑا کانپ رہا تھا۔ بڑھیا پر اسے غصہ آ رہا تھا۔ لیکن اس نے دل میں طے کر لیا تھا کہ انکار کر جائے گا۔

گھڑیاں اپنے قبضے میں کر کے کسٹم افسر نے بڑھیا کو نکال دیا۔ راشد کی باری آئی تو وہ صاف بچ گیا۔ لیکن قیمتی گھڑیوں کے جانے کا اسے بے حد صدمہ تھا۔ باہر نکلا تو بڑھیا، جیسے

اس کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ اس نے اشارے سے راشد کو بلا کر کہا

"بیٹا! مجھے مسافر خانے تک پہونچا دو۔"

راشد نے اسے برا بھلا کہتے ہوئے کہا: "تم نے گھڑیاں اتار کیوں لی تھیں۔ میری ہزاروں کی گھڑیاں ضبط ہو گئیں۔"

بڑھیا نے کہا۔ بیٹا ایسا نہ کرتی تو میں پھنس جاتی۔ یہ کسٹم والے نہ جانے میرے ساتھ کیا کرتے۔ تم مجھے مسافر خانے لے چلو۔ پریشان نہ ہو اللہ جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔ اس کی مصلحتیں کون سمجھ سکتا ہے۔

راشد نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا۔ کسٹم والے، اگر گھڑیاں اس کے پاس سے نکلتیں تو اسے بھی نہ چھوڑتے۔ اس نے ٹیکسی کی اور بڑھیا کو ساتھ لے کر مسافر خانے پہونچ گیا۔ اور وہاں کمرے میں داخل ہو کر بڑھیا نے کہا۔ بیٹا تم گھڑیوں کا افسوس نہ کرو۔ اس سے بھی اچھی چار گھڑیاں میں تمھیں دیتی ہوں۔ یہ کہہ کر بڑھیا نے اپنی گٹھری کھولی۔ تو راشد حیران رہ گیا۔ اس میں دو سو کے قریب نہایت قیمتی گھڑیاں تھیں۔

بڑھیا نے کہا۔ تمھاری گھڑیاں اس طرح میں نہ دے دیتی تو شاید کسٹم والے میری گٹھری بھی دیکھ لیتے۔ تم نے گھڑیاں نہ دی ہوتیں تو میں انھیں میں سے چند نکال کر دے دیتی تاکہ کسٹم والوں کو مجھ پر شبہ نہ ہو۔

حریمی دسترخوان

کھانا پکانے کے فن پر ادارہ حریم کی مرتب کردہ یہ کتاب بہت عرصہ قبل سالنامہ حریم کی شکل میں شائع ہوئی تھی اور اتنی پسند کی گئی تھی کہ اس وقت سے اب تک اس کے متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

حریمی دسترخوان میں ہر طرح کے معمولی اور دعوتی کھانے وغیرہ پکانے کی ترکیبیں پوری تفصیل کے ساتھ سمجھا کر لکھی گئی ہیں اور اسی وجہ سے یہ کتاب اکثر لڑکیوں کو جہیز میں دی جاتی رہی ہے۔

ہر گھر میں حریمی دسترخوان ہو تو بڑی آسانیاں ہوتی ہیں۔ کچھ نہ جاننے والیوں اور سب کچھ جاننے والیوں کی ہمدرد و مشیر

قیمت مجلد۔ چھ روپیہ پچھتر پیسے

لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ

اس گرانی کے زمانے میں غریب لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بڑا ہی دشوار ہو گیا ہے۔ شادیاں شادیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ لچکے ٹھپے سے کپڑوں کو چمکانے اور بھڑکانے والی چیزیں بھی اتنی گراں ہو گئی ہیں کہ ان کا خریدنا آسان نہیں رہا۔ ایک دوپٹہ کے لئے معمولی سا لچکا بھی لیا جائے تو بیس پچیس روپیہ سے کم میں نہ آئے گا۔

پتلی سی کرن بھی آنچل میں لگائیے تو بیس روپیہ میں آئے گی۔ شادیوں کے دسیوں جوڑوں کے لئے یہ سب لیا جائے تو سینکڑوں روپیہ صرف ہو جاتا ہے پھر شادی بیاہ پر ہی منحصر نہیں خواتین اور لڑکیاں عام دنوں میں لچکے لگے دوپٹے استعمال کرتی ہیں۔ سورتی بیلیں اور چھپا ٹکلی وغیرہ۔ لگا کر دوپٹے اور ساریاں پہنتی ہیں۔

ان مشکلات کا حل ساختہ انوں نے یوں نکالا ہے کہ اسٹیل کا سامان تیار کر دیا اور ایسا کہ چاندی سے زیادہ دلکش اور بھڑکیلا یہ کبھی نہیں کہ استعمال سے کالا پڑ جائے یا خراب ہو جائے اور دام نسبتاً بہت ہی کم۔ ٹانکوں کے ستارے سنہرے نشانات کو ماند کرتے ہیں۔ یہ اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ ایک تولہ میں کثیر تعداد چڑھتے ہیں ان کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اس طرح کا تمام سامان .... آپ کو

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ ہر ماہ ایک ایسی خبر شائع ہوتی ہے جو ولادت، شادی اور غمی سے متعلق ہو۔ خبر مختصر سے مختصر اور صاف صاف لکھی جائے اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور ممبر خریداری کے ساتھ روانہ کی جائے۔ جو خبریں ۲۰ کے بعد دفتر میں آتی ہیں وہ دوسرے ماہ شائع ہوتی ہیں۔ خبر کی اشاعت میں کتابت وغیرہ کی غلطی ہو جانے کا ذمہ دار دفتر نہیں ہو سکتا۔ البتہ ملنے پر غلطی کا اعلان دوسری اشاعت میں کر دیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

ولادت اطفال کی خبریں

● فریدہ واحد (بنسور) میری پیاری بھابی فرزانہ آفتاب (کراچی) کی زندگی کو پر بہار بناتے ہوئے اللہ پاک نے انھیں ایک فرزند عطا کیا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ عمر خضر پائے اور اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے (کاش پیدائش کا دن تاریخ بھی لکھ دیا ہوتا۔ ادارہ)

● مسرت فاطمہ فیض الرب (دربھنگہ) "میری چھوٹی باجی انجمن آرا اور بہنوئی محمد فخر الاسلام کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے ۱۰ر جنوری ۷۹ء بروز بدھ بوقت ۳ بجے دن ایک چاند سی گڑیا عطا فرمائی۔ نام مرجبین عرف گنی رکھا گیا۔

● درشہوار د باندرہ۔ بمبئی) "میرے حقیقی دیور محمد سلیم و عشرت احمد (نام صحیح پڑھا نہ جا سکا) کے گلشن حیات میں بہار لاتے ہوئے اللہ پاک نے پہلی بار دو پھول کھلائے۔ دونوں کے نام شاداب و فضیل احمد رکھے گئے۔ میری دلی دعا ہے کہ دونوں صاحب نصیب ہوں اور فخر خاندان بنیں۔

● رفعت رحمانی (شیوپوری) "اللہ پاک نے میرے شوہر سمیع اللہ رحمانی صاحب اور میری زندگی کو پر بہار بناتے ہوئے پہلی بار ۲۰ر دسمبر ۷۸ء بروز بدھ بوقت ۱۰ بجے دن ہمیں ایک ننھی سی کلی عطا فرمائی۔ — نام نادی رحمانی رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر نوح بخشے اور صاحب نصیب کرے۔

● حوالی بہار خاں (رتناگری) "میرے بھائی شمشیر خاں صاحب اور بھابی صاحبہ کے گلشن حیات میں پہلی بار ۱۸ر نومبر بروز پیر اللہ پاک نے ایک ننھی سی گڑیا عطا فرمائی۔ خدائے پاک اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب بنائے۔

● آر عشرت آرا، وشنو داشاہین (آمبور) "میری پیاری بہن ریحانہ تاج و بہنوئی نثار الرحمن آمبوری صاحب کے گھر پہلی بار ۳۰ر دسمبر ۷۸ء کو ایک ننھی منی پری کا جنم ہوا۔ خدا سے دعا ہے کہ نومولود کو عمر خضر عطا فرمائے اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

● قمر جہاں خانم انور خاں (راجپوری) "میری چچازاد بہن سلطانہ اور بھائی جمیم کے گلستان میں ۲ر جنوری ۷۹ء کی شب میں گیارہ بجے دو پھولوں کے بعد ایک کلی کھلی۔ نام میں نے شبیلہ رکھا۔ اللہ سے دعا ہے کہ میری بہن کا چمن حیات ان پھولوں سے سدا مہکتا رہے۔

● نشاط سلیم (دربھنگہ) "میری پیاری بہن صوفیہ اور بھائی جمال کے گلشن حیات میں ۲۰ر دسمبر ۷۸ء کو دو کلیاں ایک ساتھ کھلیں۔ خدا کرے ان کی خوشبو سے ہماری بہن اور بہنوئی کا باغ زندگی ہمیشہ مہکتا رہے اور بچیاں والدین کے زیر سایہ پروان چڑھیں (آپ نے ۱۵ پیسہ کا ایسا ٹکٹ بھیجا ہے جو استعمال نہیں ہو سکتا۔ براہ کرم آئندہ خیال رکھیں۔ ادارہ)

● زبیدہ بتول۔ صفورہ عفت۔ ناصرہ جبرہ (آمیٹھی) "میری بہن

صبیحہ یاسمین اور بھائی محمد منور سادات صاحب کے چمن حیات میں بروز اتوار بتاریخ ۷ر اگست ۱۹۷۹ء ایک پھول کھلا۔ نام محمد انظار الحق عرف شادات قرار پایا۔ اللہ پاک ہمارے بھانجے کو عمر نوح بخشے، فخر خاندان بنائے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔ (دوسری خبر مارچ میں چھپے گی اس کے لیے ٹکٹ روانہ فرمائیں)

● رضوانہ نسرین (ارکلگوڈو) میری خالہ قمر النسا ریحدین صاحبہ خریدار حریم کے گلشن حیات میں اللہ تعالیٰ نے ۸ر جنوری ۱۹۸۰ء بروز پیر بوقت ۱۰ بجے شب ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ نومولود والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

● مس فرزانہ زیدی (بہٹ۔ سہارنپور) "میری اچھی باجی عذرا اور عزیز بہنوئی منظور عالم صاحب کو اللہ پاک نے پہلی بار ۱۷ر دسمبر ۱۹۷۹ء کو ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا، نام فیصل سعید قرار پایا۔ اللہ پاک عمر دراز بخشے اور فخر خاندان بنائے۔

پیغامات نشاط

● حریم کی قدیم خریدار اور سرپرست محترمہ بہن میمونہ بی بی صاحبہ غلام محی الدین صاحب سرکوٹ (رینونی۔ افریقہ) نے اطلاع دی ہے کہ ان کے فرزند امان اللہ غلام محی الدین سرکوٹ سلمہٗ کی شادی خانہ آبادی۔ عزیزی زینب بی بی سلمہا (بنت عبدالرحمٰن صاحب چپل) کے ساتھ ۱۴ر دسمبر ۱۹۷۹ء مطابق ۲۵ محرم الحرام ۱۴۰۰ھ بروز منگل بوقت ساڑھے گیارہ بجے دن رینونی ٹاؤن ہال میں حسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک اس جوڑی کو سلامت رکھے اور ساری دنیا کی خوشیاں انھیں بخشے۔ نسیم انہونوی۔ عزا اللہ بیگم انہونوی

● ایم۔ این عظیم صاحب (لکھنؤ) کی پارہ جگر عزیزی شائستہ سلمہا کی شادی محسن صاحب کے ساتھ ۳۰ر دسمبر ۱۹۷۹ء کو بعد مغرب ولاڈمین کالج لکھنؤ میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ افسوس کہ میں اپنی صحت کی خرابی کے باعث شرکت نہ کر سکا۔ نسیم انہونوی

● مسز صبیحہ ہاشمی (ڈاکسیرہ) "میری رشتے کی بہن گلناز تبسم دختر جناب [illegible] (ہیڈ ماسٹر [illegible] ایل ٹی سی۔ ترچی) کی شادی ڈاکٹر [illegible] اللہ صاحب ([illegible] ہاسپٹل۔ یو۔کے) کے ساتھ ۲ر دسمبر ۱۹۷۹ء بروز اتوار بمقام [illegible] بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک اس جوڑی کو سلامت اور ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔

سہرا بتقریب شادی خانہ آبادی

عزیزی خالد رضا سلمہٗ خلف جناب سید محمد مشفق صاحب (آئی۔ اے۔ ایس ریٹائرڈ) لکھنؤ

یہ شادی میری عزیز سہیلی فوزیہ (دختر نیک اختر جناب یمین احمد ہاشمی صاحب) کے ساتھ ۲۴ر دسمبر ۱۹۷۹ء کو انجام پائی تھی

مسز نجم السحر منصور۔ بمبئی

عجب بہار عجب بانکپن کا عالم ہے
سکوں نواز حسیں انجمن کا عالم ہے
جدھر نگاہ اٹھاؤ چمن کا عالم ہے
نظر میں نوشۂ گل پیرہن کا عالم ہے

نظر نواز جو خالد رضا کا سہرا ہے
گل شگفتہ کی مانند سب کا چہرہ ہے

فضائے جشن طرب آج کس قدر ہے حسیں
ہے جام شوق بھی سہرے کے عکس سے رنگیں
دعائیں نوشہ کو دیتے ہیں حضرت یاسیں
ہوئی ہے مشفق عالی جناب کی تسکیں

ہر ایک پھول پہ طارق رضا نچھاور ہیں
ہر ایک غنچہ پہ ناطق رضا نچھاور ہیں

سرور دل کو ہے کیفیت مسرت سے
ہیں پھول سہرے کے واقف ادائے الفت سے
نگاہیں اٹھتی ہیں سہرے پہ کس محبت سے
نصیب ہوتا ہے سہرا دراصل قسمت سے
قبولیت کا شرف پھولوں کی دعا کو ملا
حیات بخش اثر ماں کی التجا کو ملا

ضیا نواز ہوئے بزم پر ضیا کے چراغ
جلائے آج تو عابد نے بھی وفا کے چراغ
دلوں میں آج ہیں روشن عجب ادا کے چراغ
[illegible] جو ہیں پیار کی ضیا کے چراغ

[illegible] حسب [illegible]
ہیں [illegible] خدا آج [illegible] خاتون

نفس نفس کو سکون و سرور حاصل ہے
امید و ذوق فردوس، گوشۂ دل ہے
تجلیوں میں نہائی ہوئی سی محفل ہے
مہ و نجوم کا اک سلسلہ مقابل ہے

جمال نوشۂ رنگیں ترا جواب نہیں
یہ اور کیا ہے اگر حاصل شباب نہیں

ہے وجہ ناز یہ تحریک بزم آرائی
نہ ہو سکا اب کبھی احساس شام تنہائی
عجب ادا سے مقدر نے لی ہے انگڑائی
یہ کہہ رہی ہے ہر اک برگ گل کی رعنائی

کسی پہ جب کرم کردگار ہوتا ہے
تو پھول پھول مجسم بہار ہوتا ہے

سرور و کیف سا قلب و نظر پہ طاری ہے
یہ لمحہ وہ ہے کہ جو عمر بھر پہ بھاری ہے
بروئے کار جو سہرے کی سحر کاری ہے
فضائے جشن طرب صرف نغمہ باری ہے

چھیڑا ہے ساز تمنا پہ نغمۂ شادی
مرے عزیز مبارک ہو خانہ آبادی

پیش کردہ:۔ راشد صدیقی

● قدسیہ شاہین (درگاہ بیلا۔ ویشالی) میری پھوپھی زاد بہن عمرانہ خاتون کی شادی عبد السلام (فرزند دار و غہ ابو الکلام صاحب مرحوم) کے ساتھ ۲۸-۲۹ نومبر ۱۹۷۸ء کو بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اس جوڑی کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

● درخشاں احمدی ناز (آمبور) ہماری پیاری باجی قمر سلطانہ (دختر جناب چچا عبد الجلیل صاحب) ابن عبد اللطیف صاحب بی۔اے (فرزند جناب نانا مولانا عبد الرحمٰن صاحب) کے ساتھ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۸ء بروز اتوار بہ مہربانی اللہ پاک بخیر و خوبی انجام پائی۔

● سن نسیم بہار (چمپا بائی۔ درنگر) میری چچا زاد بہن فضیلت بہار (بنت سید محمد مبارک سلام صاحب) کی شادی سید محمد قیس الرب (پسر سید محمد خلیل الرب مرحوم۔ بلاسپور) کے ساتھ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۸ء بروز جمعہ بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک میری پیاری بہن نوشہ بھائی کی ازدواجی زندگی کو خوش گوار بنائے۔

● شاہین ناز صاحبہ (جے نگر۔ بنگلور) میری عزیز خالہ زاد۔ ایم طاہرہ فرحت بانو بی۔اے (بنت جناب ایم جعفر محی الدین صاحب۔ ٹمکور) کی شادی جناب محمد امام خاں صاحب بی کام۔ ایل ایل بی (ابن جناب محبوب خاں صاحب۔ میسور) کے ساتھ انجام پائی۔ اللہ پاک اس جوڑی کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

● رفیق احمد خاں صاحب غوری لکھنؤ کے فرزند خالد سلمہٗ کی شادی ناہید سلمہا کے ساتھ بمقام علی گڑھ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اس سلسلہ میں غوری صاحب نے اپنے اعزہ اور احباب کو ۹ جنوری ۱۹۷۹ء کو ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ اللہ پاک مبارک کرے۔ نسیم ابنوی۔

انتقال پر ملال کی خبریں

● انتقال پر ملال کی بعض خبریں ایسی ہوتی ہیں کہ ان پر اپنے تو اپنے پرائے بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہتے۔ اسی طرح کا المناک حادثہ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر دلاور حسین صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر زولوجیکل گارڈن لکھنؤ کے داماد غیاث الدین احمد کاظمی ہے جو ۷ اردسمبر ۱۹۷۸ء بروز جمعرات تقریباً ۳ بجے دن کار کے ٹرک سے ٹکرا جانے کے باعث اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مرحوم ڈاکٹر دلاور حسین کے برادر حقیقی جناب تجمل حسین صاحب سپرنٹنڈنٹ سنٹرل ایکسائز کانپور کے فرزند تھے اور انجینئرنگ پروجیکٹ انڈیا، نیو دہلی سے وابستہ ہو کر بصرہ (عراق) میں پروجیکٹ انجینئر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ کمپنی کے چیرمین محمد فضل صاحب مرحوم کو اتنا چاہتے تھے کہ انھوں نے کوشش کر کے میت اور داماد صاحب کی بیٹی بچیوں کو ذریعہ ہوائی جہاز پالم ہوائی اڈے پر پہنچایا، جہاں سے میت مع لواحقات بیواں، سیتاپور مرحوم کے آبائی وطن پہنچی اور چار بجے شب میں سپرد خاک کی گئی۔

مرحوم کی عمر ۳۶ سال کی تھی اور اکتوبر ۱۹۷۳ء میں شادی ہوئی تھی یادگار میں ۲ لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی ہے۔ اللہ پاک ڈاکٹر دلاور صاحب اور دوسرے تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت میں جگہ دے۔ شریک غم نسیم ابنوی۔

● نعیمہ بیگم (دہلی) "افسوس میری پیاری بھتیجی عزیزہ بیگم ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئی۔ مرحومہ کی عمر صرف سولہ سال تھی

شادی کے انتظامات ہو گئے تھے مگر ہم سب یہ خوشی دیکھنے کے بجائے اسکی دائمی جدائی کے غم میں مبتلا ہو گئے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہم سب کو صبر عطا فرمائے اور مرحومہ کو جنت میں جگہ دے۔ (خیر نہ مکرا نتہائی صدمہ ہوا۔ جوانا مرگ پر کون ہے جو افسوس نہ بہائے۔ میں آپ سب کا شریک غم ہوں۔

نسیم انہونوی

محمد منظور عالم صاحب (ریٹائرڈ جج پٹنہ) میرے چھوٹے بہنوئی سید شاہ اصغر حسین صاحب ایڈوکیٹ پٹنہ ہائی کورٹ کے چھوٹے صاحبزادے سید شاہ ماجد حسین ۷ر دسمبر ۸۸ء کی صبح مسجد میں نماز فجر ادا کرنے کے بعد چہل قدمی کرنے گاندھی میدان گئے اور وہیں بس سے ٹکرا کر ایسا کچلے کہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس حادثہ جانکاہ سے سارا خاندان اندوہ گیں ہے۔ اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

بقیہ پسندیدہ اشعار صفحہ ۳۳

- یہ پھول اپنی لطافت کی داد پا نہ سکا
  کھلا ضرور مگر کھل کے مسکرا نہ سکا

مرسلہ:۔ نسیم جہانگیر (جنجرہ روڈ)

- پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
  مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

مرسلہ:۔ ذوسلوا احمدی ناز (رامپور)

- دل میں یادوں کی طرح آنکھ میں آنسو کی طرح
  تم مرے پاس رہو پھول میں خوشبو کی طرح

مرسلہ:۔ آر عشرت سلطانہ دخشندہ خانم (امبیٹا)

- انسان کی طرح ہر پھول کی قسمت بھی جدا ہوتی ہے
  کوئی سہرے میں پرویا جاتا ہے، کوئی تربت پہ چڑھایا جاتا ہے

مرسلہ:۔ خالدہ نعیم شمسی (پیلی بھیت)

- جس شاخ نے آغوش میں کلیوں کو کھلایا
  اس شاخ نے پھولوں کے جنازے بھی اٹھائے ہیں

مرسلہ:۔ ماجدہ نسرین لاری (کانپور)

- کسی نے پھول کو تربت پہ مسکرا دیکھا
  سنا ہے پھول بھی ہنستے ہیں مسکرانے سے

مرسلہ:۔ زینب ... (...)

- مسکرا کر دیکھ لو تم اک نظر یا مصطفیٰ
  پھول ہو جائے مرا زخم جگر یا مصطفیٰ

مرسلہ:۔ عشرت فاطمہ عنبر مکرب (دھنگہ)

- آپ بیجا کر رہے ہیں حسن پر اتنا غرور
  میں نے دیکھے ہیں چمن میں پھول مرجھائے ہوئے

مرسلہ:۔ مس گلزار جہاں ایم۔ اے بی ایڈ (دعا میرد)

- پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
  پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

مرسلہ: فیضل امام ملک (چوادہ ...)

- ہر پھول کی قسمت میں کہاں ناز عروساں
  کچھ پھول تو کھلتے ہیں مزاروں کے لئے بھی

مرسلہ:۔ وصونا نہ نسرین (رادکلگوڈ)

نوٹ:۔ بعض بہنیں کئی کئی ناموں سے اشعار علیحدہ علیحدہ روانہ کر دیتی ہیں۔ بعض بہنیں خریداری ختم ہو جانے کے بعد بھی پرانا نمبر لکھ کر اشعار روانہ کر دیتی ہیں جو مناسب بات نہیں (ادارہ)

<u>بقیہ تعلیمات قرآن</u>

(۱۰۳) اے ایمان والو! تم پر اپنی جانوں کی فکر لازم ہے (سورہ مائدہ)
(۱۰۴) اور وہ لوگ کہ جب کچھ کھلا گناہ یا برا کام اپنے حق میں کر بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ کو یاد کریں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ (سورہ آل عمران)
(۱۰۵) اور دستور کے موافق عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔ (سورہ بقرہ)
(۱۰۶) اور عورتوں (بیویوں) کے ساتھ اچھی گزران کرو۔ (سورہ نساء)
(۱۰۷) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو اور اپنے واسطے آگے کی تدبیر کرو۔ (سورہ بقرہ)
(۱۰۸) سو جو عورتیں نیک ہوتی ہیں اطاعت (مردکی) کرتی ہیں۔ (سورہ نساء)
(۱۰۹) اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو (سورہ مائدہ)
(۱۱۰) اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔ (سورہ نساء)

(۱۱۱) اور اپنے دین کی بات میں مبالغہ نہ کرو۔ (سورہ نساء)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ ایک شعر شائع کیا جاتا ہے، بشرطیکہ شعر موزوں، معیاری اور ہمارے عنوان کے تحت ہو۔ مارچ کے لئے عنوان ہے "کانٹے" اور اپریل کے لئے "گوہر"۔ جو اشعار ۱۰ تاریخ تک دفتر میں وصول ہو جاتے ہیں وہی شائع کئے جاتے ہیں اس سلسلے میں کوئی خط کتابت نہیں کی جاتی۔

- زندگی پھول کی پتی سے کہیں ہلکی ہے مگر
  اکثر اوقات یہ ایک بارگراں ہوتی ہے

  مرسلہ:۔ عمرانہ عراقی (پیردلی۔ بڑا گاؤں)

- پھول پر مرتے ہیں بھونرے اور پتنگے شمع پر
  سب نے میری زندگی سے سیکھ لیں قربانیاں

  مرسلہ:۔ صولیہ منظور (ٹلگو۔ جمشید پور)

- چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغام حیات
  باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرام حیات

  مرسلہ:۔ رفیعہ یاسمین (بیلا سیتا مڑھی)

- پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
  حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

  مرسلہ:۔ زبیدہ واجد (منسور)

  مرسلہ:۔ سحر افروز (لکھنیاں)

- ازل سے پھول لیتے آتے ہیں احسان شبنم کا
  نہ ہوگا ان میں ذوق خود طرازی عمر بھر پیدا

  مرسلہ:۔ عبد الصمد ایم شبنم (کارڈار)

  مرسلہ:۔ قمر جہاں خانم (درا جیپوری)

- میں نے آنکھوں سے لے لیا اس کو
  پھول جو دست باغباں سے گرا

  مرسلہ:۔ پرنس مرتضیٰ (دھنباد)

- راز حیات و موت کا اظہار کر گیا۔ مرسلہ:۔ تبسم جہاں
  غنچہ چٹک کے پھول بنا اور بکھر گیا۔ (دربھنگہ)

- تم مہک ڈھونڈھتے پھرتے ہو کس گلشن میں
  پھول کو اپنی ہی خوشبو سے جہاں پیار نہیں

  مرسلہ:۔ نشاط زرین (اجین)

- آج کل کے دست ہیں کاغذ کے پھول
  دیکھنے میں خوشنما بوئے وفا کچھ بھی نہیں

  مرسلہ:۔ عذرا فریدی (امروہہ)

- یہ میرے اشک بار نگاہوں کی دین ہے
  کچھ پھول جو کھلے ترے دامن کے آس پاس

  مرسلہ:۔ فیروزی تسیم (لکھنؤ)

- دیکھ لیں آپ گلستاں ابھی مے خانہ بنے
  آنکھ جس پھول پہ ڈالیں وہی پیمانہ بنے

  مرسلہ:۔ مسز تسیم عزیز (کھاگلپور)

- ہر شاخ گل ہے خار سے پیوستہ اس قدر
  ہنستا پڑا ہے پھول بھی بے بسی کے ساتھ

  مرسلہ:۔ نجمہ حافظ (منگلور)

- آج تک اس کی محبت کا نشہ طاری ہے
  پھول باقی نہیں خوشبو کا سفر جاری ہے

  مرسلہ:۔ رضیہ سلطانہ (اعظم گڑھ)

- غنچوں کے مسکرانے پہ کہتے ہیں ہنس کے پھول
  اپنا کرو خیال ہماری تو کٹ گئی

  مرسلہ:۔ شاہین بانو (امراوتی)

(بقیہ اشعار صفحہ ۱۰۳ پر)

درجہ دے کر اس کی پرستش کرنا اپنا نسلی فرض سمجھتی تھیں کہ دادی نانی مردوں کے ظلم و ستم سہہ کر اپنی جنت خریدی تھی ان نے ہمیشہ شوہر کے قدموں پر سجدہ کیا تھا لہٰذا وہ بیچاری بھی اس میں اپنی نجات سمجھتی تھیں کہ شوہر خواہ جائز بات پر ناراض ہو یا خواہ مخواہ ہی کالا ان دکھائے۔ وہ خاموش ہی رہیں۔ لہٰذا انھوں نے بڑے لاڈ پیار اور شفقت سے ہر وہ بات میں کیا۔

"مگر اب تو ڈالر ہیں نے اس کے کیے ہیں۔ جیسے سب اولاد پلی بڑھی ہے۔ ویسے ہی وہ بھی پلا بڑھا ہے۔ اب اس کی فطرت ہی یہ بن گئی ہے تو میں کیا کروں ؟"

"پہلے کچھ کہ تم نے اسے اس سلسلہ میں سمجھایا تھا کہ نہیں ؟" شعیب صاحب بولے۔

وہ چپ ہو رہیں۔

"بس یہی تو کردار ہے تمھارا اس کے ساتھ۔" شعیب صاحب نے گرم لہجے میں کہا: "ہرگز میری مشکلات اس کے سامنے رکھ کر تم نے اسے نہیں سمجھایا ہوگا کہ باپ کی بات تمھاری بھی عزت ہے۔ لہٰذا ان کی مرضی پر سر جھکا دو۔"

صالحہ بیگم کی کبھری نگار سے برداشت نہ ہوئی۔ اس نے بھی کچھ اونچی آواز میں کہا: "اجی جانے یہ طے ہے کہ ایز دانی کی ہرگز نہ سنیں گے۔ آپ ہی کیوں نہ سمجھائیے۔"

"میں اگر سمجھاؤں گا تو بس یہ سمجھ لو کہ ایک وار میں دو ٹکڑے ہوں گے۔" انھوں نے کہا اور کھڑے ہو گئے: "اگر اس نا خلف نے چوں چرا کی تو میں برداشت نہ کر سکوں گا۔ اس کے بعد یا تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ یا پھر میں۔"

"میاں سنو تو۔ اچھا میں بھی نہیں لگتا کہ وہ لڑکی جو بیوہ ہے۔ ایک بچے کی ماں ہے۔ ایسے خاندان سے لائی گئی ہے۔" پانا کر وہ کچھ کہنے چلی تھیں کہ شعیب صاحب ان کی طرف گھوم گئے اور بیحد تلخ لہجے میں بولے۔

(باقی)

"یہ دھنڈار مکان بھلا ایک لاکھ سے کیا کم ہوگا ؟" رابعہ نے در و دیوار پر نظریں گھما کر پوچھا۔

"ابھی پچھلے سال فرنیچر کے کارخانے والے موسیٰ میاں اس کے اسی ہزار دے رہے تھے۔ مگر ابا جی نے مکان فروخت کرنا منظور نہیں کیا۔ دراصل یہ مکان اماں نے بڑے شوق سے خریدا تھا۔ بس وہ بیوی کے مرنے کے بعد ان کی چیز جیتے جی جدا کرنا نہیں چاہتے!"

"اوں ! یہ کیا بڑھاپے کا عشق ہے۔" رابعہ نے تنک کر کہا۔ "مکان بکے رقم ملے تو کچھ ان کے ننھے پوتوں ہی کے کام آئے۔"

"اب انھیں کون سمجھائے۔"

"میں سمجھاؤں ؟؟" بے حد مستعدی سے رابعہ نے کہا۔

"میں سمجھا چکا ہوں۔ مگر وہ کسی کی نہیں سنتے۔" رحمٰن نے کہا: "ایک مرتبہ خفا ہو کر کہنے لگے تھے کہ اس طرح مکان کے پیچھے پڑو گے تو میں کسی یتیم خانے کے نام کر جاؤں گا۔"

"تو پھر میں حنا کو سمجھاتی ہوں وہ دوسری شادی پر آمادہ ہو جائے"

رابعہ نے ایک طرف سے مایوس ہو کر دوسری طرف سے آس لگائی: "وہ راضی ہو جائے تو کم از کم پون لاکھ تو ملیں گے۔ یہ تو مجھے پکا یقین ہے۔ بڑے میاں پچیس ہزار تمھاری بہن کی شادی میں لگا کے پچاس ہزار تمھیں ضرور دے دیں گے۔ سوچو اگر ایسا ہوا تو پھر مجھے وہ پانچ لڑیوں کا چندن ہار ضرور دینا۔ کب سے ترس رہی ہوں۔"

"ہاں ہاں ضرور لے لینا۔ میں خود سوچ رہا ہوں کہ دس بیس ہزار دکان میں لگاؤں۔"

"میں جاؤں حنا کے پاس:" رابعہ نے سرگوشی میں کہا۔

خبردار کوئی ایسی بات نہ کہنا جس سے وہ مشکوک ہو جائے: رحمٰن نے
تاکید کی۔ اے واہ۔ تم نے مجھے عقل کی پاگل سمجھا ہے کیا؟!

رحمٰن نے باپ سے مل کر انہیں سمجھایا کہ ان کا منشا انھوں نے غلط سمجھا ہے۔
وہ حنا کے بدخواہ نہیں ہیں۔ لیکن خان صاحب بھی ان کے باپ ہی تھے۔ اخبار
پڑھتے رہے اور بس ہوں ہاں کر کے انہیں بڑھا دیا۔

رابعہ نے بڑی دلسوزی سے حنا کے پاس آئیں۔
وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی پنج سورہ پڑھ رہی تھی۔ مسہری پر اس کا بچہ سو
رہا تھا۔ پاس کی تپائی پر ایک فرسودہ سا برقی پنکھا رکھا ہوا سرسرا رہا تھا۔ کمرے
کی فضا غمناک اور اداس تھی۔

آہٹ سن کر حنا نے رخ پھیرا۔ پنج سورہ کو آنکھوں سے بوسہ دے کر الماری
پر رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

آداب بھابی: اس نے مدھم آواز میں کہا۔
اور جواب دینے کے بجائے رابعہ اس کا چہرہ تکتی رہ گئیں۔ عجیب سا جلال و
جمال تھا اس کے چہرے پر۔ جیسے غم کی فراوانی نے نکھار دیا تھا۔ پیشانی سے
واقعی کرنیں پھوٹتی معلوم ہو رہی تھیں۔ آنکھوں میں حیا اور عصمت کا ایسا
نور کہ نظر ٹھہرنا مشکل۔ سفید پاکیزہ لباس میں لپٹی سادگی و دلفریبی کی
مجسم تصویر۔ رابعہ مرعوب ہو گئیں۔

بچے نہیں آئے آپ کے ساتھ۔ بھابی: حنا نے پوچھا۔
رابعہ مسہری کے پیچھے سرہانے تکیہ پر چڑھ کر بیٹھتی ہوئی بولیں: اسکول گئے
ہیں صبح۔ اور افوہ۔ سو کو میں لاتی نہیں ان کی خالہ کے پاس چھوڑ آئی
ہوں۔ ارے اجیرن کر دیتے۔ بات کرنے نہ دیتے۔!"

دے دو لہ۔ یا کسی سے بے لوث ساس جیسا بزرگ کی خفگی کا کون سا بھلا ہے [illegible]
اور خرم۔ سن لو۔ اور تم سب بھی سنو۔ کہ انسان کے لیے اس کی عزت یا [illegible]
اور آن سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ چاہے جان چلی جائے مگر آن [illegible]
یہی بات کہی ہے: "آپا ذاکرہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ خرم کا [illegible]
دہقانی لہجے پر بے ساختہ ہنسی آگئی۔ لیکن شعیب صاحب کا لہجہ [illegible]
دونوں طرف تائید کرتی ہیں۔ یا تو مجھے قائل کرنے کی کوشش کیجئے یا پھر اس کو
آپ نہیں سمجھ سکتی کہ میں کتنی الجھنوں میں گرفتار ہوں۔ یہ جو اکھاڑ پچھاڑ ہو رہی
ہے۔ یہ مجھے پسند نہیں ہے۔ لیکن میں اتنا بے حیا نہیں کہ کسی کے تقاضے
کے بعد بھی خاموش رہے جاؤں۔ میرے لیے اپنی عزت بڑی چیز ہے۔ چاہے
گھر کے اندر ہم روٹی نمک کے ساتھ کھا لیں۔ لیکن باہر ہماری آن بان شوکت
ویسی ہی رہنی چاہیئے جیسے کہ ہمیشہ سے تھی۔!"

اور کیا؟" آپا نے کہا۔

اچانک شعیب صاحب خلاف توقع صالحہ بیگم کی طرف پلٹ پڑے: یہ
سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔ تم نے اس لڑکے کو اپنے بے جا لاڈ سے
اس قدر سرکش، خودسر اور گستاخ بنا دیا ہے کہ اب وہ تمہاری تو کچھ حقیقت
ہی نہیں سمجھتا۔ بلکہ مجھے بھی انگوٹھے پر مارتا ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ میں آنکھیں بند
کیے بیٹھا رہتا ہوں۔ کسی کے کرتوت مجھے نظر نہیں آتے۔ لیکن میں اندھا نہیں
ہوں۔ سب کے اعمال دیکھتا رہتا ہوں۔ باہر بیٹھے بیٹھے میں نے سب سنی ہے
اس کی بکواس۔ وہ ظالم لڑکی کے کانوں سے بالیاں اتروا لے گیا اور تم کچھ نہ
بگاڑ سکیں اس کا! یہی رعب ہے تمہارا اس پر؟

صالحہ بیگم بے چاری ان عورتوں میں تھیں جو ہمیشہ مرد کو ان داتا اور دیوتا

میرا کوئی ذریعہ نہیں بھابی۔ تو پھر میں کہاں سے ذریعہ پیدا کروں"۔

رابعہ نے اسے گھیرا: "میں تو کہتی ہوں کہ جو کھیل تمہاری قسمت نے تم سے کھیلا تھا۔ وہ انجام کو پہونچا۔ تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ میں تو مشورہ دیتی ہوں کہ تم اب اپنے ابا کی مرضی پر دوسرے عقد پر حامی بھر دو۔ بے چارے بچے کے لیے بھی گزربسر کا سامان ہو جائے"۔

ان کی نظروں میں پچاس ہزار کے نوٹ پھرنے لگے اور گلے میں جگمگاتے چندن ہار کا بوجھ محسوس ہونے لگا۔ بے حد اضطراب اور اشتیاق سے وہ حنا کا جواب سننے کی منتظر ہوئیں۔

لیکن وہ بدستور ٹھنڈی اور غیر جذباتی آواز میں بولی: "اب ایسا نہیں ہوگا بھابی۔ عورتوں نے ہمیشہ قسمت کے کھیل کو خاموشی سے انگیز کر لیا ہے۔ بہت سی عورتیں ایک بچے کے سہارے ساری عمر کاٹ دیتی ہیں۔ پھر مجھے بھلا کیا چاہیے کہ میں خواہ مخواہ اباجی کی مرضی پوری کروں"۔

رابعہ نے دانت پیسے مگر اخلاق و محبت سے بولیں: "نہیں نہیں۔ وہ تو پوری کرنی ہوگی۔ کیونکہ بے چارے اباجی گردوں کے درد کے مریض ہیں۔ ابھی اس دن دیکھا نہیں کہ دورے میں مسلسل دو گھنٹے بے ہوش پڑے رہے تھے۔ میرے ایک ماموں ہیں۔ ان کا بھی یہی حال تھا۔ ایک مرتبہ گردوں کا درد ہوا اور دو ایک لمبی ہچکیوں کے اٹھتے ہی خود بھی دنیا سے اٹھ گئے۔ بیوی باپ کا سہارا کوئی سہارا نہیں۔ بھائی بھاوج کے پاس رہتے تمہاری نوجوانی کو دیمک لگ جائے گی۔ یہ زندگی اور عمر اس لیے نہیں کہ غارت ہو۔ تمہیں ابھی دنیا میں رہنا، بچے کے لیے جینا اور بڑا ہونا ہے۔ سو میری بات مان لو۔ اور حامی بھر کر اباجی کی راتوں کی نیندیں سوارت ہوں۔ وہ تو تمہاری فکر میں روز بروز آدھے ہوئے جا رہے

ہیں لے کے بھجوا دوں گی"۔ نگار نے پکارا۔

"میرے پاس دوسری رکھی ہیں لے لینا"۔ ناصرہ نے کہا۔ "مگر ابھی نہیں۔ ایز دبھیا کو سخت غصہ چڑھا ہے۔ وہ پھر لے لیں گے۔

بھابی مجھے بالیاں دے دیجئے۔ میں اپنے پاس رکھ لوں گی"۔ نگار خوش ہو گئی۔

"چلو میرے ساتھ۔ میں ابھی دیئے دیتی ہوں"۔ ناصرہ مسکرائیں۔

"سچ سچ ایسا کلیجہ پانی ہوا جا رہا ہے"۔ آپا ذاکرہ نے ہونٹ سکوڑے۔ "ایک ایک کے بدن سے زیور اتروا لیے"۔

"اب اس تذکرے کو جانے دیجئے آپا"۔ صالحہ بیگم نے کہا۔

ناصرہ رانی کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ خرم اور کفیل بھی اٹھ گئے عورتیں باتیں کرتی رہیں۔

رات کے کھانے پر خرم نے شعیب صاحب سے تذکرہ کیا کہ ناصرہ خاں صاحب کے یہاں جانا چاہتی ہیں۔ شعیب صاحب اپنی بہو سے بے حد محبت کرتے تھے۔ سوچے سمجھے بغیر جھٹ سے اجازت دے دی۔ بلکہ کچھ خوش ہو کر بولے۔

"میں سوچ رہا تھا کہ روپیہ آخر کس کے ذریعہ بھجوانا چاہیئے۔ اب انشاءاللہ دلہن دے آئیں گی"۔

"اباجان۔ کچھ کہنا ہے مجھے آپ سے"۔ ناصرہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "شعیب صاحب نوالہ بناتے بناتے رک گئے اور ہمہ تن منتظر ہو گئے۔

"اباجان۔ کیا میں خان صاحب سے یہ نہیں کہہ سکتی کہ روپیہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ اب وہ ازخود سے دستبردار ہو جائیں"۔

کم نہیں ہو؟" خرم نے ناگوار لہجے میں کہا: "آخر وہ پنجے جھاڑ کر اسی بے چارے کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟"

"امی میں تو ضرور دوں گی۔ خالہ صاحب سے" نگار نے وحشت بھرے لہجے میں کہا: "ایسا تو نہیں ہے کہ کہیں کوئی بڑی بیماری ہو لڑکی کو۔ اور وہ اسے زبردستی ہمارے خاندان میں ڈھکیلنا چاہتے ہوں۔ کم ازکم میں اور بھائی جا کے لڑکی کو تو دیکھ آئیں"

"ضرور جاؤ۔ کل ہی جاؤ" خرم نے فوراً تائید کی۔ "لیکن میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ تم لوگ اس معاملہ کا تذکرہ کرو۔"

"اگر موقع دیکھنا تو خان صاحب کو یہ سمجھا دینا کہ ابرو موم کی ناک یا تر لقمہ نہیں ہے۔ اس کی بدمزاجی کو بڑھا چڑھا کر بیان کر دینا۔ تاکہ وہ حضرت اپنے ارادے سے باز آئیں" کفیل نے کہا۔

"ہاں یہ تو بہت اچھی ہے" آپا ذاکرہ نے کہا: "انکار ادھر سے ہوگا تو شریف میاں بھی مجبور ہو کے اپنی ضد سے ہاتھ اٹھا لیں گے۔ ورنہ یہ تو وہی مثل ہوگی کہ مدعی سست گواہ چست۔ کہو تو میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں۔!"

نامیہ اور نگار نے صالحہ بیگم کی طرف دیکھا۔ انھوں نے کچھ اشارہ کر دیا۔ چنانچہ نامیہ نے حیرت سے کہا۔

"پھر بھی اماں آپ بزرگ ہیں۔ آپ کا فی الحال جانا مناسب نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ یہ سمجھیں آپ بات پختہ کرنے آئی ہیں۔"

"بات تو تو نے پتے کی کہی ہے دلھن" آپا ذاکرہ نے سر ہلا کر تعریفی نظر سے نامیہ کو دیکھا۔ صالحہ بیگم کے چہرے پر اطمینان جھلک اٹھا۔

"امی، میری بالیاں" ربی ٹھنکی

ہیں۔ ابھی مجھ سے یہی کہہ رہے تھے کہ اگر حنا کا بوجھ سر سے اٹھ جائے تو شاید کچھ روز اور جی لوں"

"ابا جی اب بوجھ سمجھنے لگے ہیں۔ مجھے؟" حنا کی خوشنما آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے "وہ نہ سمجھیں تو کیا؟ تم خود سمجھدار ہو۔ اپنے باپ کی فکروں کو کم کرنا تمھارا فرض ہے" رابعہ نے کہا۔

"میں کیا کروں بھابی" حنا کے آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے "میں بہت منحوس ہوں۔ پہلے اپنی نحوست سے میں نے ایک بھرے گھر کو تباہ کیا۔ اب مجھے گوارا نہیں کہ میں پھر ایک بار انہی الجھنوں میں پڑوں۔ خدا نے اولاد دی ہے خدا ہی اس کو پروان چڑھائے گا۔ نہیں بھابی۔ ابا جی سے آپ کہہ دیجئے مجھے محنت مزدوری کر کے اپنا بار آپ اٹھانا منظور ہے۔ لیکن میں دوسرا نکاح ہرگز نہیں کروں گی"

اور وہ منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

رابعہ کو سخت طیش تھا۔ یہ ضدی چھوکری اپنی ہٹ دھرمی سے کام بگاڑے گی لیکن وہ کسی قسم کی سختی اس پر نہیں کر سکتی تھی۔ حنا روتی رہی۔ رابعہ اپنی پیچ میں گم رہی۔ انھوں نے حنا کو سمجھایا منایا بھی نہیں۔ اور نہ حنا کی سمجھ میں آیا کہ وہ جو اس سے کسی قسم کا ربط نہیں رکھتی تھیں۔ آخر کیوں اس کی بہبودی اور مستقبل کے فکر میں پریشان ہو رہی ہیں۔!

خان صاحب بیٹے اور بہو سے ناراض تھے۔ انھوں نے ان دونوں کو کسی طور پر بھی رات کے کھانے کے لیے نہیں پوچھا۔ سر شام ہی وہ چلے گئے۔ تب خان صاحب حنا کے پاس آئے۔ وہ اندھیرے کمرے میں بیٹھی اس طرح گم تھی کہ اسے خان صاحب کے پاؤں کی آہٹ تک محسوس نہ ہوئی۔ جب انھوں نے

گئے۔ اب وہ تھی اور اس کی خالی دنیا۔ جہاں ارمان آرزدوں کا ذکر کیا۔ وہاں تو حسرتیں تک مردہ اور بےجان تھیں۔!

اس نے کبھی اپنی ذات کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی کہ اسے بنائے رکھنے کے لیے جد و جہد کرتی!۔ لیکن فی الحال تو وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہی تھی۔ کیا انجام ہوگا اس کا؟! اباجی نے کیا سوچا ہے۔

شعیب صاحب کے یہاں آناً فاناً وہ انقلاب آیا تھا۔ جس نے ایک سرے سے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ کسی کو امید نہیں تھی کہ اس قدر ان کی بعید ترین کوششیں پوری ہوں گی! صلح کی درخواست دیتے ہی عدالت میں پہلی پیشی پر مقدمہ خارج ہو گیا اور انھیں نصف رقم مل گئی۔ رہائشی مکان انھوں نے رہن رکھ دیا۔ یعنے اب وہ اپنے ہی مکان میں کرایہ پر رہتے تھے!: بہو کا زر و زیور فروخت کر دیا گیا۔ صالحہ بیگم نے انھیں کے نام کا زیور اتار رکھا تھا وہ تک بک گیا۔ سات ہزار خرم نے دے دیئے۔ کچھ قرض کفیل نے اٹھایا اور اس طرح ادھر ادھر سے کو خوت اکٹھا کیا!۔ سب تباہ ہوئے۔ مگر شعیب صاحب کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔ نہ ہی کسی کی مجال تھی کہ ان کی مرضی کے سامنے ہونٹ ہلا سکتے۔

ان لوگوں پر کوئی اثر تھا یا نہیں۔ یہ تو وہی لوگ جانتے تھے لیکن ایزد تو بھوت بن گیا تھا۔ یہ تمام اکھاڑ پچھاڑ اس کے نزدیک غیر فطری

اور محض حماقت تھی۔ انسان جب جان بوجھ کر گڑھے میں گرنا چاہے تو اسے کون روک سکتا ہے۔ ان دنوں وہ گھر پر تھا اور سارے حالات اس کی نظروں کے سامنے گزر رہے تھے۔ اسے اپنے باپ کی اس انتہا پسندی پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ جب وہ گھر سے باہر ہوتے تھے تو وہ ان کے سامنے خوب چیخا چلایا تھا۔ اس نے بڑے بھائی اور بڑی بہن کا بھی لحاظ نہیں کیا۔

صالحہ بیگم حسرت سے اس کی شکل دیکھا کیں۔

بس اب بھیک مانگیں گے ہم لوگ: وہ دھاڑ رہا تھا: ایک دن انشاء اللہ وہ نوبت آئے گی کہ سڑک پر جھونپڑی ڈالنا پڑے گی۔ حماقت کا انجام یہی ہے۔ آخر کیا ہے کہ آپ کے والد نے ایسا کام کیا: اس نے کفیل سے کہا: گویا ان کے والد اس کے والد نہ تھے۔ پھر اس کی تقریر بے ربط ہونے لگی: کیا کوئی تحریری ثبوت تھا کہ شعیب صاحب پر کیا واجب الادا ہے۔ یا پھر وہ خود ہی بیوقوف بنے ہیں۔ ارے گھر میں اتنے بہت سے دانشمندوں کا مجمع ہے۔ کسی نے انھیں مشورہ نہیں دیا۔؟

وہ کسی کی سنیں بھی تو: اسے اپنی بکواس میں حق بجانب کچھ کر آہستہ سے صالحہ بیگم بولیں۔ ٹھیک کہتے ہے: آپا ذاکرہ نے بے حد ٹھنڈی سانس لے کر چپکے سے کہا: جس کے درد ہوتا ہے وہی چیختا ہے۔ کسی اور کو کیا پڑی ہے۔ واہ:

آج سب کے بدن خالی دیکھ رہا ہوں: ایزد نے کھا جانے والی نظر سب پر ڈال کر کہا: امی بھابی۔ کیا چوڑیاں تک اتروا لیں صدر خاندان نے۔ اچھا تو اب باقی زیور اتروا رہا ہوں۔ اسے رہنا

The Hareem Lucknow Feb. 1979 (Phones : 44559-45334) Regd. No. LW/NP 32

THE HAREEM

Mar.79

Rs. 1/-

ایڈیٹر

پردے کے سلسلے میں یہ بحث تو بہت پرانی ہے کہ چہرہ چھپا رہنا چاہئے یا نہیں۔ اکثر حضرات نے پردہ کے سلسلہ میں چہرہ کو نہ چھپانے کے جواز پیش کئے ہیں اور اسی بنیاد پر ہماری اکثر بہنیں برقعہ پہننے کے باوجود چہرہ کھلا رکھتی ہیں۔

ہم اس سلسلے میں کئی بار لکھ چکے ہیں کہ چہرہ ہی سب سے زیادہ حسن و جمال کا مظہر ہوتا ہے اس لئے اگر پردہ اسی لئے ضروری سمجھا گیا ہے کہ حسن دوسروں یعنی نامحرموں کی نظروں سے چھپا رہے تو پھر چہرہ کا کھلا رہنا سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ جسم تو بہرحال دوسرے ملبوس سے چھپا رہتا ہی ہے۔ برقعہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اس کا نقاب چہرے پر بھی پردہ ڈال دیتا ہے۔ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ پھر صرف نقاب ہی سر سے باندھ لیا جائے مکمل برقعہ پہننے کی کیا ضرورت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اکثر خواتین باریک اور خوشنما لباس استعمال کرتی ہیں اس لئے ان کی جسمانی ساخت اور لباس کی دلکشی بھی نامحرموں کو متوجہ کر سکتی ہے۔ برقعہ تمام تر لباس اور جسم کو چھپا لیتا ہے۔ اور اس کے فوائد میں یہی چیز نہیں جو اوپر بیان کی گئی ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ اگر عورت کا لباس معمولی ہے یا میلا کچیلا ہے تو برقعہ اس عیب کی بھی پردہ پوشی کرتا ہے۔ بلا پردہ خواتین کیا سوال ہے کہ اچھا لباس پہننے اور بناؤ سنگار کئے بغیر گھر سے باہر نکل جائیں۔ انھیں یہ خیال آتا ہے کہ کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔ لیکن برقعہ پہننے والی خواتین کو چونکہ اس کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ جس طرح بھی گھر میں بیٹھی ہوں برقعہ پہن کر باہر چلی جاتی ہیں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ بناؤ سنگار میں صرف ہونے والا وقت بچتا ہے بلکہ لباس میں بھی کفایت ہو جاتی ہے۔ گھروں میں عورتیں سب ہی خانہ دار بیگمات معمولی لباس استعمال کرتی ہیں، صرف تقریبات میں جانے یا باہر نکلنے ہی کے لئے اچھے ملبوس کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر یہ ضرورت صرف دو ایک لباس سے ہی پوری نہیں ہو جاتی بلا برقعہ باہر نکلنے والی کو متعدد ملبوس حسب حیثیت بنوانے ہیں تاکہ دیکھنے والے یہ نہ محسوس کر سکیں کہ ان کے پاس کل ایک دو لباس ہیں۔

اس لئے برقعہ جہاں ایک طرف بد نگاہوں سے بچنے کے لئے سپر کا کام دیتا ہے، وہیں اس کے استعمال سے ملبوسات کا خرچ بڑی حد تک کم ہو جاتا ہے۔

بہرحال میں نے بات شروع کی تھی اس بحث پر کہ برقعہ کے استعمال میں نقاب سے چہرے کو چھپانا ضروری ہے یا نہیں، لیکن یہ بحث اس وقت چھڑی تھی جب برقعہ کو یکسر بیکار چیز نہیں سمجھا گیا تھا۔ اب تو سرے سے برقعہ کو ہی غیر ضروری بلکہ ایک فرسودہ اور جہالتی لباس قرار دے کر یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ عورت کو بھی مردوں ہی کی طرح بے حجابی سے نکلنا چاہئے۔ اور یہ تحریک اپنی ظاہری کشش کے باعث بڑی تیزی کے ساتھ زور پکڑ رہی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ہی خواتین زور و شور کے ساتھ اسے لبیک کہہ رہی ہیں۔ اور وہ دن شاید زیادہ دور نہیں جب برقعہ یکسر ختم ہو جائے گا۔ اور ہماری خواتین مغربی خواتین کی طرح بالکل آزاد اور بالکل بیباک ہو جائیں گی۔

پردہ کے سلسلے میں، میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں لیکن یہ بات میں نے کبھی نہیں لکھی تھی کہ پردہ کرنے کے سلسلہ میں ہماری مسلمان بہنوں کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ فریضۂ حج ادا کرنے کے سلسلے میں عورتوں کے لئے ضروری بتایا گیا ہے کہ وہ کسی محرم مرد کے ساتھ جائیں۔ مرد کا اس فریضہ کی ادائیگی کے سلسلے میں ساتھ ہونا حفاظت کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ قید صرف حفاظت ہی کے لئے ہوتی تو کسی بھی مرد کے ساتھ حج کیا جا سکتا تھا۔ محرم کی قید ضروری نہ ہوتی۔ لیکن محرم کی شرط ثابت کرتی ہے کہ ایسا ہی مرد ساتھ ہو جس کے سامنے عورت آ سکتی ہو کیا اس سے بڑی کوئی شہادت اور پردہ کے سلسلہ میں ہو سکتی ہے۔ کیا جا سکتی ہے بے پردگی اس کی تاویل کر سکتے ہیں کہ کیوں محرم مرد کا ہی ساتھ ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ محرم اور نامحرم کا تصور سب ہی بہنوں کو معلوم ہوگا پھر بھی لکھ رہا ہوں کہ محرم وہ ہوتے ہیں جن سے کبھی بھی شادی نہ ہو سکتی ہو۔ جیسے باپ، چچا، دادا، نانا، سگے بھائی وغیرہ اور نامحرم وہ جن سے شادی جائز ہو سکتی ہو۔ اس کا دوسرا واضح مطلب یہ ہے کہ جن افراد سے شادی جائز ہو ان کے سامنے آنے کی اسلام نے ممانعت کی ہے۔ اور جن سے [illegible]

دیلی سبزیوں کا پانی والا اچار

اشیاء: عمدہ ولائتی لال گاجر، چھوٹے لمبے بینگن۔ ہری سیم نا پانچ پانچ سو گرام ہری مرچ لمبی والی۔ ۵۰ گرام۔ زیرہ سفید چائے کا ایک چمچہ پسا ہوا۔ رائی پسی ہوئی چائے کا ایک چمچہ۔ سرخ مرچ پسی ہوئی نصف چائے کا چمچہ۔ نمک اندازے سے

ترکیب:۔ گاجر کو چھیل کر اندر کا سخت حصہ نکال دیں اور چار چار لمبی پھانکیں بنا لیں۔ اسی طرح بینگن کی لمبی پھانکیں بنائیں مگر سرے پر جڑی رہیں۔ سیم کو بھی ایک طرف سے کھول کر دیکھ لیں اور بیج نکال دیں۔

ہری مرچوں کو بھی اسی طرح چاک کریں کہ سرا جڑا رہے۔

سب ترکاریوں اور مرچوں کو دھو کر کسی صاف مٹکے یا پتیلی میں پانی اور نمک ڈال کر اچھی طرح ابالیں۔ پانی اتنا ہو کہ سبزی اچھی طرح گل جائے اور آدھا پانی باقی رہے۔ اس کے بعد پتیلی کو اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر مرتبان میں ملا کر رائی زیرہ اور سرخ مرچ ڈال دیں۔ یہ اچار ۱۵-۲۰ روز تک خراب نہیں ہوتا اور بہت لذیذ ہوتا ہے۔ مرتبان میں رکھنے کے دو تین روز بعد استعمال کریں۔

مرسلہ۔ اختر النساء بیگم سید واحد حسین (کھر، گجرات)

مرچ کی پھلکیاں

ہری مرچ موٹے قسم کی جو کڑوی نہیں ہوتی۔ ۱ گرام۔ بیسن ۱ گرام۔ [illegible] اور نمک حسب خواہش۔ [illegible] ایک عدد۔ سرسوں کا یا کوئی تیل [illegible]

[illegible]

انڈے کی پھلکیاں

دیسی مرغی کے انڈے پانچ عدد۔ بیسن ۱۰ گرام۔ پیاز ۲۰ گرام ہری مرچ حسب خواہش۔ نمک حسب ضرورت۔

انڈوں کی زردی سفیدی پھینٹ لیں۔ بیسن کو بھی تھوڑا پانی ملا کر پھینٹیں اور پھر انڈوں کو اسی میں ملا دیں۔ پیاز کے لچھے کاٹ کر دھوئیں ہری مرچ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں اور پھینٹے ہوئے بیسن میں ملا کر کڑوے تیل یا ڈالڈا میں تل لیں اور ہری دھنیا کی چٹنی لگا لگا کر کھائیں کافی لذیذ ہوں گی۔

مرسلہ:۔ ناظرہ خاتون (دہلی)

حریمی دسترخوان

کھانا پکانے کے فن پر ادارہ حریم کی مرتب کردہ یہ کتاب بہت عرصہ قبل سالنامہ حریم کی شکل میں شائع ہوئی تھی اور اتنی پسند کی گئی کہ اس وقت سے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

حریمی دسترخوان میں ہر طرح کے عمدہ اور مزیدار کھانے بنانے پکانے کی ترکیبیں پوری تفصیل کے ساتھ سمجھا کر لکھی گئی ہیں اور اسی وجہ سے یہ کتاب اکثر لڑکیوں کو جہیز میں دی جاتی ہے [illegible]

قیمت مجلد

[illegible]

[illegible]

تاریک سفر (ریڈیائی ڈرامہ)

برق آشیانوی

افرادِ تمثیل

۱۔ ہمایوں .. .. مغل شہنشاہ ہند
۲۔ کامران .. .. ہمایوں کا بھائی
۳۔ شاہ حسین ارغون .. .. کامران کا خسر
۴۔ شاہ حسین ارغون کی بیٹی .. .. کامران کی بیوی
۵۔ داروغہ قید خانہ .. .. .. —
۶۔ فرماں بردار شاہی .. .. .. —
۷۔ محافظ .. .. —

پہلا ایکٹ

(مغل شہنشاہ نصیر الدین محمد ہمایوں کا بھائی کامران تیسری مرتبہ حکومت سے غداری اور شہنشاہ ہمایوں کے قتل کی سازش کے الزام میں ماخوذ اور قید خانہ میں بند ہے۔ داروغہ قید خانہ کامران کی نگرانی کر رہا ہے۔)

کامران :۔ پروردگار .... میں کب تک ان سلاخوں میں جانور کی طرح بند رہوں گا (ٹھنڈی سانس لے کر) نہ معلوم اس مرتبہ ہمایوں کیا فیصلہ کرے!

داروغہ :۔ حضور دیکھئے وہ فرماں بردار آرہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ ہو چکا ہے اور فرماں بردار عالم پناہ کا فرمان لیے آرہا ہے۔

کامران :۔ کیا کہا۔؟ فیصلہ ہو گیا ...؟ میرے مقدر کا فیصلہ ....؟ فرماں بردار آرہا ہے۔؟ داروغہ۔ تم جانتے ہو ہمایوں رحم دل ہے۔ اس کی رحمدلی کا ڈنکا ساری دنیا میں بج رہا ہے۔ اس نے ضرور مجھے معاف کر دیا ہوگا .... میں نے پہلے بھی دو مرتبہ اس کے قتل کا منصوبہ بنایا لیکن ناکام ہو کر گرفتار ہوا۔ ہمایوں نے دو مرتبہ معاف کر دیا۔ اب تیسری بار بھی اس نے مجھے معاف کر دیا ہوگا۔ (فرماں بردار کے آنے کی آواز دور سے قریب تر ہو جاتی ہے۔)

داروغہ :۔ حضور! فرماں بردار حاضر ہو چکا ہے۔

کامران :۔ داروغہ! فرماں بردار کو میرے سامنے لے آؤ۔ (فرماں بردار روبرو آجاتا ہے)

داروغہ :۔ حضور! فرماں بردار آپ کے سامنے حاضر ہے۔

کامران :۔ کہو فرماں بردار کیا فرمان لے آئے ہو۔

فرماں بردار :۔ حضور! مشیرانِ سلطنت کے اجلاس نے آپ کے بارے میں فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ عالم پناہ اس فیصلہ سے بے حد رنجیدہ ہیں۔ عالم پناہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ عالم پناہ نے ہر مشیر سلطنت کے آگے بنفس نفیس اپنا دامن پھیلا کر آپ کی زندگی کی بھیک مانگی۔ عالم پناہ کو کسی نے آج تک کسی سے کوئی التجا کرتے ہوئے نہیں سنا۔ آج عالم پناہ نے منت و عاجزی کی انتہا کر دی لیکن عمائدین نے عالم پناہ کی ایک نہ سنی۔ ....

کامران :۔ اور میری موت کا فیصلہ صادر کر دیا۔

فرماں بردار :۔ جی نہیں حضور۔ عالم پناہ کو اس حد تک تو کامیابی ہوئی کہ حضور کی جان بخش دی گئی۔

کامران :۔ یعنی میری موت کا حکم صادر نہیں ہوا۔ یعنی یہ کہ میں زندہ رہوں گا .... شکر ہے خداوندا .... تیرا شکر ہے .... اب میں ہمایوں پر اپنی جان قربان کر کے اپنے سابقہ اعمال کی تلافی کر دوں گا۔ اب میری جان ہمایوں پر کسی بھی موقعے پر قربان ہو سکے گی۔ میں ہمایوں کے قدموں پر سر رکھ کر اپنے ...

کی معافی مانگ لوں گا۔ اور کہوں گا....

فرماں بردار:۔ لیکن حضور، جو فیصلہ صادر فرمایا گیا ہے وہ سزائے موت سے بھی بدتر ہے۔

کامران:۔ کیا کہا۔؟ سزائے موت سے بھی بدتر ہے؟ کیا مطلب۔؟ کیا باقی تمام زندگی اسی طرح مجھے سلاخوں کے پیچھے ایک پنجرے میں جانور کی طرح بسر کرنی ہوگی۔؟

فرماں بردار:۔ جی نہیں۔ اس سے بھی بدتر۔

کامران:۔ فرماں بردار۔ جلد بتاؤ۔ ایسی کونسی عبرت ناک سزا ہے۔ جو سزائے موت سے بھی بدتر ہے... عمر قید سے بھی بدتر۔ جلدی بتاؤ۔ فرماں بردار۔

فرماں بردار:۔ حضور، مشیران سلطنت نے فیصلہ کیا ہے کہ حضور کی آنکھیں نکال دی جائیں۔؟

کامران:۔ (چیخ کر) آنکھیں نکال دی جائیں۔؟ آنکھیں نکال دی جائیں۔؟ یہ فیصلہ ہوا ہے اور ہمایوں نے منظور کر لیا۔؟ ہمایوں جس کو ساری دنیا رحمدل کہتی ہے۔ اس ہمایوں نے۔؟

فرماں بردار:۔ حضور، یہ فیصلہ بھی عالم پناہ کی مرضی کے خلاف ہوا ہے۔ .... عالم پناہ نے تو متعدد بار اس بات کی کوشش کی کہ حضور کامران کو ایک آخری موقعہ دے کر آزاد کر دیا جائے لیکن عمائدین سلطنت اس بات پر اڑ گئے کہ اب کوئی موقعہ نہ دیا جائے۔

کامران:۔ (ایک لمبی آہ بھر کر) آہ۔ تو اب کامران اندھا ہو جائے گا۔؟ اس سے تو بہتر یہی تھا کہ کامران کی زندگی کا چراغ ہی بجھا دیا جاتا۔ آنکھوں کی روشنی چھین کر مجھے دنیا کے ایک عظیم غار میں ڈھکیل دیا جائے۔؟

فرماں بردار:۔ حضور مجھے حکم ملا ہے کہ حضور اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں کوئی خواہش ظاہر فرمائیں تو وہ عالم پناہ کے گوش گذار کر دی جائے۔

کامران:۔ کہہ دو کہ کامران کی خواہش ہے کہ اس کی گردن اڑا دی جائے۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں اور وہ ٹکڑے کتوں اور چیلوں کو کھلا دیے جائیں۔ لیکن اسے [illegible] ذلت اور [illegible] کی زندگی کے عذاب میں مبتلا کیا جائے۔

فرماں بردار:۔ حضور۔ فیصلے میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ البتہ کچھ اور ارشاد ہو تو عالم پناہ کی خدمت میں عرض کر دیا جائے گا۔

کامران:۔ فیصلہ تبدیل نہیں ہوگا۔.... تبدیل نہیں ہوگا.... فیصلہ.... تو خیر ہمایوں کو میرا یہ پیام پہنچا دو کہ اپنے بھائی کی آنکھوں میں دہکتی ہوئی سلاخیں دھنسا کر اس کو اندھا کر دینے کے بعد در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے یہاں نہ رکھا جائے بلکہ مکہ معظمہ بھیج دیا جائے تاکہ باقی زندگی وہیں بسر ہو سکے۔

فرماں بردار:۔ حضور کا ارشاد عالم پناہ کی خدمت میں پیش کر دیا جائیگا۔

کامران:۔ یہ بھی کہنا کہ پہلے مجھے اپنے خسر شاہ حسین ارغون کے پاس روانہ کیا جائے جہاں سے میں اپنی رفیقۂ حیات کو لے کر مکہ معظمہ روانہ ہو سکوں۔

فرماں بردار:۔ حضور کا یہ ارشاد بھی اعلیٰ حضرت کے گوش گذار کر دیا جائے گا۔.... حضور اور کچھ ارشاد فرمائیں گے۔....؟

کامران:۔ اور کچھ نہیں کہنا ہے۔

دوسرا ایکٹ

(کامران پالکی پر سوار اپنے خسر شاہ حسین ارغون کے محل کے قریب پہنچ چکا ہے۔ پالکی لے جانے کی آواز)

کامران:۔ محافظ۔ ابھی کتنی دور ہے محل۔؟ سفر سے طبیعت بہت اکتا گئی ہے۔

محافظ:۔ حضور۔ شاہ حسین ارغون کا محل نظر آنے لگا ہے۔.... وہ دیکھئے۔ اونچی اونچی دیواریں محل کی.....

کامران:۔ مجھے دیواریں دکھا رہے ہو محافظ۔؟

محافظ:۔ اوہ۔ حضور مجھے معاف فرمائیں۔ میں رو میں کہہ گیا۔ میں بھول ہی گیا تھا کہ.......

کامران:۔ (بات پوری کرتا ہے) کامران اندھا ہے۔

(کچھ دیر پالکی لے جانے کی آواز)

محافظ:۔ حضور، سنبھلئے۔ اب محل کے دروازے میں داخل ہو گئے ہیں۔ اب حضور میرے ساتھ [illegible]۔

کامران:۔ نہیں میں اترنا نہیں چاہتا۔ پہلے اطلاع کرواؤ کہ بدنصیب کامران حضرت شاہ حسین ارغون اور اپنی رفیقۂ حیات سے ملنے

آیا ہے۔

محافظ:۔ جو حکم حضور۔ (محافظ جاتا ہے۔ کچھ دیر کی موسیقی۔ شاہ حسین ارغون اندر آتا ہے)

شاہ حسین ارغون:۔ ہمایوں نے تمہیں یہ سزا دی ہے ؟ اور پھر اپنے آپ کو رحمدل بھی کہتا ہے۔ ؟ سبحان اللہ خوب رحمدلی کا ثبوت دیا ہے اس نے۔

محافظ:۔ حضور۔ مشیران سلطنت کے آگے عالم پناہ نے دامن پھیلا کر حضور کامران کی جان بخشی اور باعزت رہائی کی بھیک مانگی لیکن مشیران سلطنت کے فیصلے کے آگے عالم پناہ کی ایک نہ چلی مشیران سلطنت نے بڑی بے باکی کے ساتھ اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور عالم پناہ کو بے بس کر دیا۔

شاہ حسین:۔ اچھا تو ہمایوں بے بس ہو گیا ؟ ___ شہنشاہ ہمایوں بے بس ہو گیا۔ ؟ اور یہ سلوک کیا ہے اپنے بھائی کے ساتھ۔ ؟

کامران:۔ قبلہ گاہی۔ میرے مقدر میں جو کچھ لکھا تھا وہ تو پورا ہو چکا۔ اس پر کسی قسم کی ردکے زنی سے فائدہ نہیں۔

شاہ حسین:۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کامران کہ تم ایک بہادر کی موت مرو گے۔ گرفتار ہو کر اس انجام کو نہ پہنچو گے۔ خیر جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب آؤ۔ چلو باقی ماندہ زندگی یہیں بسر کرو۔

کامران:۔ قبلہ گاہی۔ میں نے طے کیا ہے کہ سیدھے مکہ معظمہ جاؤں۔ ...... سارے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔

شاہ حسین:۔ مکہ معظمہ جاؤ گے۔ ؟ سارے انتظامات بھی مکمل ہو چکے ہیں۔؟

(کامران کی بیوی آتی ہے)

بیوی:۔ ہائے یہ کیا ہو گیا ہے انہیں۔ ؟ یہ آنکھیں کس نے نکالی ہیں۔

شاہ حسین:۔ بیٹی یہ کام اس رقیق القلب شہنشاہ نے کیا ہے جس کو اپنی رحمدلی پر ناز ہے۔ جو ایک کیڑے کو بھی کسی عذاب میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن اپنے بھائی کی آنکھیں نکال کر اس کو ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔

کامران:۔ قبلہ گاہی اب وقت بہت کم ہے۔ میں صرف اس لئے حاضر ہوا [illegible] رفیقۂ حیات کو اپنے ساتھ لیتا جاؤں۔

شاہ حسین [illegible] بیٹی کو تمہارے ساتھ در بدر ٹھوکریں کھانے اور بھیک مانگ کر زندگی بسر کرنے کے لئے نہیں بھیج سکتا۔

کامران۔ میری زندگی کا اگر کوئی سہارا رہ گیا ہے تو وہ صرف میری رفیقۂ حیات ہے میں کسی دوسرے سہارے پر تو شاید چند روز بھی زندہ نہ رہ سکوں گا۔

شاہ حسین۔ تم زندہ رہو یا ٹھوکریں کھا کھا کر دم توڑ دو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن میری بیٹی تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی ..... ہاں تم چاہو تو یہاں رہ سکتے ہو۔

کامران۔ مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی کہ آپ ایسا جواب دیں گے میں یہاں اپنی منحوس صورت لے کر رہنا نہیں چاہتا۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ سیدھے مکہ معظمہ چلا جاؤں اور زندگی کے باقی ایام وہیں بسر کر لوں یہاں صرف اپنی شریک حیات کو لینے آیا تھا۔ ورنہ یہاں بھی نہ آتا۔ میں پھر ایک بار کہتا ہوں کہ میری شریک حیات کو میرے ساتھ کر دیا جائے۔

شاہ حسین۔ میں ایک ہزار بار بھی وہی کہوں گا جو میں نے ایک بار کہا ہے میری بیٹی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔

کامران۔ میں اپنی رفیقۂ حیات کی زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ اس کا فیصلہ کیا ہے۔

بیوی۔ ابا جان نے جو کچھ دیا ہے وہی میرا بھی فیصلہ ہے میں ایک اندھے کی لاٹھی بن کر رہنا نہیں چاہتی میں نے محلوں میں آرام و آسائش کے ساتھ پرورش پائی ہے۔ اب تمہارے ساتھ ٹھوکریں کھا کر بھیک مانگ کر زندگی نہیں گزار سکتی۔ یہاں رہو تو شاید تمہارا ساتھ دے سکوں۔

کامران:۔ یہ تم کہہ رہی ہو بیگم ۔ ؟

بیوی:۔ ہاں شاہ حسین ارغون کی بیٹی کہہ رہی ہے۔

کامران:۔ زندگی میں پہلی بار تمہاری زبان سے ایسے کلمے سن رہا ہوں۔ تم اتنی جلدی بدل جاؤ گی۔ میں یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ اگر خواب میں بھی ایسا خیال آتا کہ تم یہ جواب دو گی تو میں ہرگز یہاں نہ آتا۔

بیوی:۔ وقت بدل جاتا ہے حالات بدل جاتے ہیں۔

[illegible]:۔ دنیا کی ساری [illegible]

سے یہ کہتی ہیں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے کہ تاریکی
میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انسان سے۔

شاہ حسین :- کامران میں پھر ایک بار کہتا ہوں کہ تم یہیں نہ جاؤ۔۔۔

کامران :- میں ایک ہزار بار بھی وہی کہوں گا جو میں نے ایک بار کہا ہے۔

شاہ حسین :- اچھا تو جاؤ تاریکی کی دنیا میں ٹھوکریں کھانے کے لیے۔ آنکھوں کے ساتھ تمہاری عقل بھی اندھی ہو گئی ہے۔

کامران :- محافظ! چلو اب چلیں۔

(پالکی اٹھا کر لے جانے کی آواز)

تیسرا ایکٹ

(بندرگاہ۔ کامران جہاز پر سوار ہو رہا ہے۔)

کامران :- محافظ تم مجھے جہاز پر سوار کر کے واپس چلے جاؤ۔ مجھے خدا کے سپرد کرو۔ اب میں اپنی تاریک دنیا میں ایک تاریک سفر شروع کرتا ہوں۔ جس سہارے پر زندہ رہنا چاہتا تھا وہ تو چھوٹ گیا۔۔۔ جانے بیگم کو کیا ہو گیا۔ بیگم نے میرے ساتھ اب تک جیسی زندگی بسر کی ہے اس سے تو یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ آج وہ ایسا جواب دیں گی۔۔۔۔

محافظ۔۔۔ اس دنیا میں سب ممکن ہے۔ بھائی بھائی کی آنکھیں نکال سکتا ہے، بیوی شوہر کو ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ کر محلوں میں عیش و عشرت کی زندگی گزار سکتی ہے۔ محافظ! اس دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں۔۔۔ یہ انسان کی بھول ہے جو وہ کسی بات کو ممکن اور کسی بات کو ناممکن سمجھ لیتا ہے۔

(ایک آواز) جیسے کوئی آ کر کامران کے قدموں پر گر جاتا ہے،

بیگم :- میرے قدموں پر کون آ پڑا ہے۔۔۔ ہائے۔۔۔؟

کون ہے جس نے اپنا سر میرے قدموں میں ڈال دیا ہے؟ کون ہے جس کے آنسوؤں سے میرے پاؤں تر ہو رہے ہیں؟

وہ قدموں پر گر کر [illegible] ۔۔۔ قدموں سے سر [illegible] نہیں۔۔۔ [illegible]

یہ نازک انگلیاں اور انگلی میں پھنسی ہوئی انگوٹھی۔۔۔ یہ سب میری جانی پہچانی ہیں۔ یہ اسی طرح میرے قدموں میں اس وقت بھی آ پڑی تھیں جب میں اپنے بھائی ہمایوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے کے ارادے سے روانہ ہوا تھا۔۔۔ اس وقت بھی انہی انداز سے تم نے مجھے اپنے ارادوں سے باز رکھا جانے کی التجا کی تھی۔۔۔ لیکن افسوس۔۔۔ میں نے تمہاری التجا کو ٹھکرا دیا تھا۔۔۔ ہوں۔۔۔ اب کیا کہنے آئی ہو بیگم۔۔۔ اٹھو۔ تم نے شاہی محلوں میں آرام و آسائش سے پرورش پائی ہے۔ تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ایک اندھے گداگر کے قدموں میں گر کر اپنا شاہی وقار کھو دو۔ اٹھو۔ بیگم۔ اٹھو۔ اور سیدھے شاہی محل کی طرف روانہ ہو جاؤ۔

بیگم :- میرے سرتاج۔ سب سے پہلے آپ مجھے میرے اس رویے کے لئے معاف فرمائیں۔ جو ابا جان کی موجودگی میں میں نے اختیار کیا تھا۔ اگر میں ہلکا سا ارادہ بھی آپ کے ساتھ چلنے کا ظاہر کر دیتی تو یقین تھا کہ وہ مجھے سنگ وحشت کی دیوار۔ و فادار آہنی سلاخوں کے پیچھے اس وقت تک کے لئے بند کر دیتے جب تک یہ جہاز روانہ نہ ہو جاتا۔ مجھے صرف ابا جان کی موجودگی کی وجہ سے انکار کرنا پڑا۔ وہ شاہ حسین ارغون کی بیٹی تھی جس نے انکار کیا تھا اور یہ شہزادہ کامران کی بیوی ہے جو آپ کے قدموں میں پڑی ہے۔ اس کے بعد سے اب تک میں کانٹوں پر لوٹتی رہی ہوں اب یہاں آ کر آپ کے قدموں میں گر کر التجا کر رہی ہوں کہ مجھ کو ان کی سیج بطور [illegible] رہی ہوں۔ جانے دیجئے آپ کی آنکھیں نکالی گئیں میری نہیں۔ میں عمر بھر آپ کی آنکھیں بن کر رہوں گی۔

کامران :- اے خدا تو نے میری آنکھوں کی روشنی چھین لی ہے اگرچہ میری دنیا تاریک ہے اور میں جس سفر پر روانہ ہو رہا ہوں اس کو تاریک سفر سمجھ رہا تھا لیکن اب اس سفر میں روشنی ہی روشنی ہوگی۔۔۔ چلو بیگم۔ جہاز روانہ ہونے میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔

(پالکی اٹھانے کی آواز)

[illegible]

اردو ہے جس کا نام

صالحہ عابد حسین

داغ نے تو یہ اپنے لئے کہا تھا لیکن ہر اردو والا اس پورے شعر کو 'اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ، ہندوستان میں دھوم ہماری زبان کی ہے' کو بڑے فخر سے پڑھتا ہے! لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ مصرعہ پوری طرح صادق آتا ہے عورتوں پر اس لئے کہ مادری زبان۔ بچہ ماں سے سیکھتا ہے۔ ماں کی پیار بھری باتیں سن کر جو غوں غاں وہ کرتا ہے وہ اس زبان سے تعلق لے کر کرتا ہے! ماں۔ نانی۔ دادی یا کھلائی سے اسی زبان میں لوریاں سنتا اور میٹھی نیند سو جاتا اور شاید خواب میں یہی پیاری آوازیں' پیارے بول سنتا ہوگا۔ ورنہ وہ سوتے میں مسکراتا کیوں ہے!

پھر تتلا تتلا کر اپنے مخصوص انداز میں اکھڑے اکھڑے لفظوں میں اس زبان کو ادا کرنا سیکھتا ہے۔ پھر فقرے بدلتا ہے۔ پھر مربوط گفتگو کرنے لگتا ہے۔ وہ زبان جس میں ماں کے پیار کی گھلاوٹ اس کے دودھ کی سی شیرینی ہوتی ہے اسی میں ماں سے پہلا سبق لیتا ہے اور پھر اس زبان کو باپ کی شفقت' استادوں کی محنت جلا دیتی ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ وہ اس میں اپنے فن کو سموتا۔ شعر تخلیق کرتا ہے۔ افسانے اور ناول لکھتا ہے تنقید و تبصرہ کرتا ہے۔ انقلاب لانے کے لئے اسی زبان میں نعرے لگاتا ہے زبان تو انسان کا وہ سب سے بڑا ہتھیار ہے جس کے بغیر وہ تہی دست و بے یار و بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے! یہ بات ہر زبان بولنے والے کے لئے یکساں ہے۔ دنیا کے ہر بچے کی زبان وہی ہوتی ہے جو اس کی ماں کی ہوتی ہے! اردو اس وقت بھی کروڑوں لوگوں کی زبان ہے۔ یہ ٹھیک ہے اس کو لکھنے اور پڑھنے والوں میں مسلمان زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود لاکھوں ہندو، سکھ اور عیسائی اس شیرینی اور دلکش زبان کو آج بھی بولتے ہیں پھر سنتے ہیں لکھتے ہیں۔ کتنے ہی شاعر اردو میں شعر کہتے ہیں۔ کتنے ہی نقاد تبصرہ اور تنقید کرتے ہیں مضمون نگار مضمون لکھتے ہیں۔ اڈیٹر رسالے اخبار نکالتے ہیں۔ آج بھی انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے ہیں جو ہزاروں گلوں سے نکلتے اور لاکھوں دلوں تک پہنچتے ہیں!

پھر کیا وجہ ہے کہ اردو زبان خطرے میں ہے اس کا مستقبل محفوظ نہیں؟ اس کے بولنے والے نہ سہی لکھنے پڑھنے والے کم ہو رہے ہیں؟ اردو میں سینکڑوں کتابیں چھپ رہی ہیں۔ اچھی سے اچھی معیاری سے معیاری بھی معمولی بھی اور گھٹیا بھی۔ مگر پڑھنے والے نہیں ملتے کتابیں نہیں بک سکتیں۔ نئی نسل میں اچھے فن کار کم پیدا ہو رہے ہیں۔ دلی میں جو اردو کی جنم بھومی ہے۔ خسرو۔ اردو کے سب سے پہلے شاعر اور سب سے بڑے محسن کا مسکن رہی ہے۔ یوپی جس نے ہزاروں ادیب و شاعر پیدا کیے ـــ جہاں اردو پلی بڑھی پروان چڑھی وہاں اردو تیزی سے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ کیوں۔ کیوں آخر؟

لوگ کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ اردو کو اس کا جائز حق نہیں ملا۔ اس کو قانونی زبان یو۔پی اور دلی اور بہار میں اب تک نہیں بنایا گیا اسکولوں میں آسانی سے اردو پڑھائی نہیں جا سکتی ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ ایک سبب اردو کے غیر یقینی مستقبل کا یہ بھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اردو کو حکومت کی سرپرستی حاصل نہیں رہی۔ کم سے کم جتنی کی وہ حقدار تھی اتنی نہیں ملی۔ یہ بھی بالکل ٹھیک ہے لیکن پھر بھی اسی دلی میں انجمن ترقی اردو ہند ہے۔ اسی دلی میں اردو بورڈ ہے جہاں سے ہزاروں کتابوں کی اشاعت ہو رہی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا' بچوں کی لغت سائنس کے مختلف شعبوں کی کتابیں' ادب اور علم سے متعلق کتابیں چھاپی جا رہی ہیں گھوڑی

جا رہی ہیں، مگر اردو کا مستقبل غیر محفوظ ہے۔ یو۔پی میں اردو اکیڈمی ہے اور کبھی اردو اکیڈمیاں قائم ہو رہی ہیں۔ مصنفین اور ادیبوں کو انعام مل رہے ہیں۔ طالب علموں کو امداد دی جاتی ہے۔ کتابت کے اسکول کھل رہے ہیں۔ اس سب کے باوجود اردو کا مستقبل غیر محفوظ ہے!

کبھی آپ نے سوچا۔ اے میری بہنوں۔ کبھی تم نے چند منٹوں کے لئے اس پر غور کیا کہ یہ کیوں ہے؟ اور اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟۔

میں کہوں گی اس کی ذمہ دار آپ ہیں۔ میں ہوں۔ ہر اردو جاننے والی ماں ہے (اور یقیناً باپ تو ہے ہی) جس کے بچے اردو نہیں پڑھ رہے ہیں۔

اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہم کیا کریں۔؟ اردو پڑھانے کے بعد اس کا مستقبل آخر کیا ہوگا۔ اردو کی ایک مشہور ادیبہ نے جو اردو زبان کی ہر طرح سے مرہون منت ہیں۔ کھلے بندوں یہ کہا کہ اپنے بچوں کو اردو پڑھا کر ہم کیا کریں؟ یہ ایک دو نہیں ہزاروں اردو والوں کا جواب ہوتا ہے۔ اپر مڈل کلاس اور اپر کلاس کے بچے انگریزی اسکولوں میں انگریزی سیکھتے ہیں۔ متوسط اور غریب خاندانوں کے بچے ہندی پڑھتے ہیں۔ میں سینکڑوں ایسے لڑکے لڑکیوں کو جانتی ہوں جو ماں باپ، ساس سسر کو اور اکثر بہن بھائی کو، یا شوہر بیوی کو خط نہیں لکھ سکتے کہ ایک ہندی نہیں جانتا دوسرا اردو نہیں جانتا۔

اگر اس بات کو تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے (اگرچہ لاکھوں ہندی اور ہزاروں انگریزی پڑھنے والے بھی بے کار یا بیروزگار ہیں) کہ اردو پڑھا کر روزگار نہیں ملے گا۔ اور یہ بھی مان لیا جائے کہ اردو پڑھانے کی آسانیاں نہیں ہیں یا جہاں یہ نام ہے کہ اردو پڑھائی جاتی ہے وہاں اچھے استاد استانیاں نہیں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے اسکولوں میں اردو میڈیم پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے؟۔ عذر معقول ہے۔ پھر بھی اگر آپ زیادہ اصرار کریں اور کہیں اچھا بچوں کو گھر پر تو اردو پڑھائیے تو جواب ملتا ہے۔ (زرا بگڑ کر) بچہ غریب ہندی پڑھے کہ نہ سیکھی زبان ہے، انگریزی پڑھے کہ اس کے بغیر سوسائٹی میں اور دنیا میں جگہ نہیں ملتی اور اور ایک اور زبان کا بوجھ ڈال دیا جائے۔ اس کے جواب میں بس منہ دیکھ کر رہ جانا پڑتا ہے کہ کوئی جتلا کر ہم جتلائیں کیا!

اردو جو مادری زبان ہے۔ جس کا اُسے صرف رسم الخط سیکھنا پڑتا ہے جس کو بچہ بولتا ہے، سنتا ہے، معنی مطلب سمجھتا ہے اس کا بوجھ پڑے گا؟ اس کا پڑھنا اور سیکھنا دشوار ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

اس موقع کے لئے کہا گیا ہے!

میں مانے لیتی ہوں کہ اسکول میں اردو نہیں پڑھائی جاتی، حکومتیں سہولتیں نہیں دیتیں۔ اچھے استاد نہیں ملتے۔ آپ مجبور ہیں انگریزی یا ہندی پڑھانے پر۔ لیکن آپ گھر پر بچے کو اردو کیوں نہیں پڑھاتیں؟

میں نہیں سمجھتی کہ کوئی بھی اردو والے گھرانے میں ایسا ہوگا جس میں ماں یا خالہ، یا نانی دادی یا باپ یا چچا کوئی نہ کوئی ایک فرد بھی اردو نہ جانتا ہو۔ اپنے بچے کو آپ دو سال تک گر اردو پڑھا دیں تو وہ فر فر کتابیں پڑھ سکتا ہے۔ اچھی طرح لکھ سکتا ہے۔ اردو سمجھ سکتا ہے! اگر ہم اپنی زبان کی سلامتی کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتے تو پھر سچ مچ اردو کے لئے گہری قبر کھود دینی چاہئے۔ جس زبان کو عورتیں بولنا، لکھنا، بچوں کو پڑھانا چھوڑ دیتی ہیں وہ جلدی مٹ جاتی ہے۔ پنجاب میں سو برس سے زیادہ عرصے تک صرف عورتوں کی وجہ سے پنجابی زبان زندہ رہی کہ مرد بس اردو پڑھتے بولتے اور لکھتے تھے مگر عورتوں نے پنجابی زبان اور گورمکھی رسم الخط سے ہاتھ نہیں اٹھایا اور اس کی بدولت وہ باقی رہی۔ سوئٹزرلینڈ میں آج بھی ہر بچہ تین زبانیں سیکھتا ہے۔ جرمن فرانسیسی اور اطالوی زبان (جن میں سے ہر ایک بڑی مشکل اور کامکل زبان ہے) تو اردو پڑھنے والے بچے کیا اتنے نہیں ہیں کہ وہ خود اپنی ہی زبان نہیں سیکھ سکتے؟ صدیوں سے ہمارے یہاں بچوں کو قرآن شریف عربی زبان میں بہت کم سنی سے ہی پڑھایا جاتا رہا ہے (صد حیف کہ یہ رواج بھی اللہ کے ساتھ اب کم ہوتا چلا جا رہا ہے) اور جاننے والے جانتے ہیں کتنا کٹھن ہوتا تھا بغیر معنی مطلب سمجھے قرآن پاک کا پڑھنا۔ مگر چونکہ یہ مقدس مذہبی فریضہ ہے اس لئے پڑھنا ضروری ہے پڑھنا ضروری ہے۔ اور آج اردو کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ پڑھنا پڑھانا مشکل ہے؟ آج بھی کچھ لوگ ہندی پڑھیں انگریزی پڑھیں کوئی تیسری زبان پڑھیں مگر کوئی فرد پڑھے

ہیں تمام مسلمان بوہرہ میمنی گجراتی زبان سے واقف ہوتی ہے کہ وہ ان کی مادری زبان ہے، لیکن اردو والے۔ اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھا سکتے۔ کیوں بھائی اسی لئے تو نہیں کہ ہم خود تن آسان ہیں، آرام طلب ہیں۔ بے حس اور بے پرواہ ہیں۔ دوسروں کو الزام دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں ہم صرف حقوق چاہتے ہیں اپنا فرض ادا کرنا نہیں جانتے؟

کوئی شک نہیں کہ بچوں کو اردو پڑھانا سکھانا ماں باپ دونوں کا فرض ہے۔ لیکن اگر باپ یہ فرض نہیں ادا کر سکتا اور صرف کسی پر الزام رکھ کر اپنے نفس کو دھوکا دے لیتا ہے اور اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتا ہے تو آپ یعنی ماں کیا کرینگی؟ خاموش ہو کر بیٹھ رہیں گی۔؟ نہیں۔ ماں کا فرض باپ سے بڑھ کر ہے۔ باپ بچوں کے مستقبل اور زبان کے مستقبل دونوں کو قربان کر دے۔ مگر ماں نہیں کر سکتی۔ نہیں کرنا چاہئیے! آپ کسی نہ کسی طرح دن رات میں ایک گھنٹہ اپنے بچے یا بچوں کو اردو پڑھانے کے لئے نکال لیجئے اور اسی سلسلے میں اس کی ذرا سی پرواہ نہ کیجئے کہ کون کیا کہتا ہے۔ اس لئے کہ اپنی زبان نہ سیکھنے والے بچوں کا ذہن اچھی طرح نشو و نما نہیں پا سکتا، دماغی صلاحیت پوری طرح نہیں ابھر سکتیں۔ ان میں کوئی اچھا شاعر اچھا ادیب، اچھا مصور، اچھا ایڈیٹر، نہیں نکل سکے گا۔ ان میں ہمیشہ اپنی زبان کو اسی طرح اپنی ذات کو گھٹیا سمجھنے کا جذبہ موجود رہے گا۔ وہ احساس کمتری میں مبتلا رہیں گے اور غلط طریقے سے برتری کا اظہار کریں گے۔ اگر آپ نے اپنے بچوں کو ان کی زبان نہ سکھائی تو اردو کے قتل کا الزام آنے والی نسلیں آپ پر تو رکھیں گی ہی اپنے بچوں کے ذہنوں کو شل کرنے کا سبب بھی آپ ہی ہوں گی۔ یاد رکھئیے جو بچے اپنی زبان اچھی طرح جانتے ہیں وہی دوسری زبانیں اچھی سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر نیو کی اینٹ ہی ٹیڑھی ہوگی تو دیوار آسمان تک ٹیڑھی جائے گی؛ نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اردو جاننے والو تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔ آج اردو کے ادیبوں، شاعروں، فنکاروں کا یہ فرض ہے کہ ہم صرف نعرے بازی ہی نہ کریں اور بڑی بڑی باتوں سے قوم کو نہ بہلائیں بلکہ ایسی ٹھوس بنیاد اردو کی ڈالیں کہ ساری طاقتیں مل کر بھی اردو کو ختم نہ کر سکیں۔ ہمارے اردو بولنے اور جاننے والوں کا، اردو کے قدردانوں کا، اردو کے پرستاروں کا اردو کے نام لینے والوں کا اور ان میں بھی سب سے زیادہ ماؤں کا یہ فرض ہے کہ وہ اردو کو زندہ رکھیں کس طرح؟ اس طرح کہ بچے اردو پڑھیں سیکھیں اور بولیں ورنہ کتابیں عمارتوں اور کتب خانوں میں دفن رہیں گی، اکیڈمیاں اور بورڈ مرحوم ہو جائیں گے۔ انجمنیں اپنی موت مر جائیں گی اور دنیا میں یہ کہانی باقی رہ جائے گی کہ اردو ایک بڑی دلکش، سہل، رواں سلیس زبان تھی۔ جس کی شیرینی اور حلاوت دلوں کو فرحت بخشتی تھی جس کا ترنم کانوں میں رس گھولتا تھا، جس کا حسن آنکھوں کو بھاتا تھا، جس میں شعر و ادب کا لازوال خزانہ تھا مگر وہ خود اپنے پرستاروں کے ہاتھوں وقت کی گہرائیوں میں دفن ہو گیا اور اس مرحوم زبان کا نام اردو تھا۔

بھی رشتوں کا تانتا بندھ گیا تینوں بہنیں ایک سے بڑھ کر ایک حسین تھیں۔ عذرا کے حسن کے چرچے گھر گھر ہونے لگے سانچے میں ڈھلا ہوا جسم سرخ و سفید رنگت، کالے سیاہ لہراتے ہوئے بال، ہرنی کی سی معصوم آنکھیں ہر ایک کو اپنی طرف مائل کر لیتیں۔ جب کبھی کوئی نیا رشتہ آتا، حمیدہ بیگم نے صاف صاف لڑکے والوں سے کہہ دیا کہ "دیکھو بہن! میرے پاس صرف تین خوبصورت بچیاں ہیں جہیز دینے کو کچھ نہیں ہے۔" پیسں کر رشتے والے ایسے رفو چکر ہوتے جیسے گدھے کے سر سینگ۔ وقت گزرتا رہا، رشتے آتے رہے ٹلتی رہی اسی میں لڑکیوں کی عمریں بڑھتی رہیں اور عذرا کے گھنے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں چاندی کے تار جھلملانے لگے۔ جوان لڑکیوں کا بوجھ ماں باپ کی چھاتیوں پر معمولی نہ تھا اس فکر میں کھانا پینا چھوٹ گیا۔ رات رات بھر نیند نہ آتی ٹھنڈی سانسیں بھرتے بھرتے سحر ہو جاتی۔ وہ میاں بیوی جنھوں نے ہر دکھ کو بھی محبت کے سائے میں ہنس ہنس کر جھیل لیا تھا۔ بے حد چڑچڑے ہو گئے تھے بات بات پر دونوں میں جھگڑا رہنے لگا۔ وہ حمیدہ جس نے کبھی شوہر کو ایک لفظ نہ کہا تھا اب تو ہر بات پر جھنجھلاتی اور شوہر کو طعنے دیتی کہ ساری عمر کلرکی کرتے رہے کبھی ترقی کرنے کی کوشش نہ کی دور کیوں جاؤ ہماری پڑوسن ہی کو دیکھ لو اللہ ماری تن پر کپڑا نہ پاؤں میں جوتی تھی اب سونے میں پیلی ہو رہی ہے۔ یہ سب آسمان سے نہیں گرا اس کے میاں کی محنت کا نتیجہ ہے۔" شوہر بیچارہ کیا جواب دیتا ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو جاتا۔ ایک دن دبی زبان سے بولے حمیدہ بیگم ہمیں چاہیے کہ جہیز بل سے فائدہ اٹھائیں۔ ہم جیسوں کے فائدے کے لیے ہی تو گورنمنٹ نے یہ سب کیا ہے۔

حمیدہ بیگم جل کر بولیں بس بس! رہنے دو ہمیں اس بل سے کچھ فائدہ نہیں پہونچا۔ ہمیں تو الٹا نقصان ہوا جہیز بری اور دعوتیں سب کچھ اسی طرح ہو رہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے علی الاعلان دیا لیا جاتا تھا اب چور دروازے سے ہوتا ہے یعنی ایک ہفتہ قبل جہیز اور بری کا تبادلہ ہو جاتا ہے پھر بے فکر ہو کر شاندار دعوت طعام دیتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں کچھ دیا لیا ہی نہیں۔ تمام رقم صرف دعوت پر خرچ کی ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ دولہا والے نقد رقم کا مطالبہ کرتے ہیں۔ تاکہ قانون کی زد سے بچے رہیں ہم جیسوں کی تو اور بھی مصیبت آ گئی۔ ایک ایک کپڑا جوڑ جمع کر کے چند جوڑے بنا لیتے تھے کچھ پرانے برتنوں کو قلعی کرا کے کچھ کاٹ کباڑ اور سجا بنا کر جہیز سجا دیا اب نقد مطالبے نے اور بھی جان ضیق میں کر دی۔ شوہر حیرت زدہ سے بیوی کی صورت تک رہے تھے۔ بڑے افسردہ لہجے میں بولے واقعی حمیدہ! آج کل لین دین اسی طرح ہو رہا ہے میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک معاشرہ خود نہ چاہے کوئی قانون اسے برائیوں سے نہیں روک سکتا اب حکومت بیچاری کیا کرے گھر گھر جہیز اور بری تو جا کر نہیں جھانک سکتی۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جسکو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ایک دن کا ذکر ہے کہ بوا بشیرن کلے میں پان دبائے آ موجود ہوئیں حمیدہ نے بوا کو ادب سے سلام کیا تو انھوں نے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں پھر اپنی سانس درست کرتے ہوئے اپنے ملیجے سفید برقعے کو اتار کر چارپائی کی پائنتی پر رکھ دیا اور اطمینان سے اس پر چڑھ کر بیٹھ گئیں اور بولیں! "اری بہو بیگم! میں کہوں ہوں! یہ بچیوں کا بیاہ نہ کرنے کی ہو کیا کنوارا کوٹھے چڑھانے کا ارادہ ہے؟" حمیدہ بیگم خون کا گھونٹ پی کر سنجیدگی سے بولیں۔ "بوا کیسی باتیں کرتی ہو" کسی ماں کو بھی اپنی جوان بیٹیاں بٹھائے رکھنے کا شوق نہیں ہوتا میں تو آج سے دس سال پہلے بیاہ چکی ہوتی مگر لڑکے والوں کے دماغ اتنے اونچے ہیں کہ جہیز میں کار کوٹھی فرج اور ٹی وی سے کم بات نہیں کرتے اور جبکہ جہیز کا معیار اتنا اونچا ہو تو ہم غریبوں کو کون پوچھتا ہے۔ بوا تم ہی کوشش کرو جیسے ہم ہیں ویسے ہی اوسط گھرانے کا رشتہ مل جائے تو بہتر ہے دو چار ہزار تو ہم کہیں نہ کہیں سے کر دیں گے مگر بوا۔ اس سے زیادہ کی ہمت نہیں! بیٹیاں بھی ایک نہیں تین بیاہنی ہیں۔ اب تو سب ہی برابر کی نظر آتی ہیں۔" بوا بشیرن بڑی رازداری کے انداز میں حمیدہ بیگم کے نزدیک ہو کر بیٹھ گئیں اور بولیں بہو بیگم! آج تمھیں ایسا رشتہ بتاؤں گی جو ساری عمر مجھے دعا دو گی ایک ریٹائرڈ تحصیلدار ہیں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ صاحب جائداد ہیں چار لڑکے تو خیر سے جوان ہیں پانچویں بیٹی بھی خیر سے یہی کوئی چودہ برس کی ہو گی ماں باپ کی آنکھوں کا تارہ تھی بڑے ناز و نعم میں پلی بڑھی! بی بی مقدر کا کیا کیا جائے جب سات برس کی تھی تو ماں کا انتقال ہو گیا اگر تم کہو تو آج شادی کرا دوں

ان کو ایک کوڑی کا جہیز نہیں چاہیئے" حمیدہ بیگم کا چہرہ اتر گیا اداسی سے بولیں لیکن بوا! تحصیلدار صاحب کی تو عمر بہت ہو گی۔؟

بوا بولیں۔" اے لو بہو بیگم کی باتیں سنو! لڑکے کی عمر کا کیا دیکھنا ساٹھا پاٹھا! ایک ذرا سی داڑھی ضرور ہے"

بوا! ایک بات بتاؤ بیوی کو مرے کئی سال ہو گئے تو انھوں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔!؟

کیا بتاؤں بہو! یہ بھی ایک مزے دار بات ہے کل کی بچی زیبا باپ سے کہتی ہے اگر ابو آپ نے شادی کی تو میں مر جاؤں گی۔ چودھویں صدی ہے چودھویں صدی! ورنہ ہم تو اپنے باپ کے آگے بولنا بھی نہیں جانتے تھے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ زیبا لاڈ میں بگڑ گئی ہے۔ اس کو یہ وہم ہے کہ آنے والی اس کے باپ کو بھی چھین لے گی۔ تحصیلدار صاحب بیوی کے مرنے کے بعد سے بہت ہی چپ چپ رہا کرتے تھے اب دوستوں نے بہت سمجھایا کہ شادی کر لو اس طرح ویران زندگی کیسے کاٹو گے لیکن شادی ایسی خاتون سے کرنا جو زیبا کو ماں کا کھویا ہوا پیار دے سکے۔ اس بات پر وہ بمشکل شادی پر رضا مند ہوئے ہیں"

یہ سن کر حمیدہ بیگم بولیں! اچھا بوا سوچ کر اور ان کے ابو اور دادی سے مشورہ کر کے ہفتہ عشرے میں جواب دوں گی۔

حمیدہ بیگم نے جب میاں سے اس رشتہ کا ذکر کیا تو وہ دل تھام کر رہ گئے لیکن مرتا کیا نہ کرتا! اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا تمام رات میاں بیوی نے رو کر کاٹی! ماں کی آنکھوں میں عذرا کا بچپن گھومنے لگا۔

اس دن اس کے ابو نے باہر سے آکر خبر سنائی کہ کلو نائی نے بڑھاپے میں دھوم دھام سے شادی کی ہے سارے محلے اور برادری کو کھانا دیا ہے۔ عذرا وہیں کھیل رہی تھی جھٹ بولی، امی امی! ابو جھوٹ بولتے ہیں کلو نائی کے تو داڑھی ہے کہیں بڈھوں کی بھی شادی ہوتی ہے" امی میرے لئے اچھا اچھا سا منا سا دولہا لانا میں بڈھے سے شادی نہیں کروں گی

حمیدہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی! ہائے میری لاڈلی میں وعدہ پورا نہ کر سکی تیرے لئے تیرے جوڑ کا دولہا نہ ڈھونڈ سکی۔ میری بچی مجھے معاف کر دینا میں بہت مجبور ہوں۔ یہ کہتے کہتے ان کی ہچکی بندھ گئی میاں نے اٹھ کر پانی پلایا ڈھارس دلائی جب خوب رو چکیں تو کہیں جا کر آنسو تھمے۔

پندرہ دن بعد عذرا کے ہاتھ پیلے کر دئے گئے۔ شریف کی بیٹی تھی کچھ مجبوری کچھ والدین کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا۔ لیکن سب سے زیادہ الجھن یہ تھی کہ میں اپنی سوتیلی اولاد کو خوش بھی رکھ سکوں گی یا نہیں؟ خاص کر وہ زیبا کے لئے سخت پریشان تھی کیونکہ وہ باپ کی لاڈلی اور سب سے چھوٹی تھی۔ عذرا نے دل میں تہیہ کر لیا کہ خواہ مجھے تن من دھن کی بازی ہی لگانی پڑے لیکن زیبا کا دل جیتنا ہے میں اسے سہیلی بنا کر پیار دوں گی میں اسے اولاد سمجھ کر ممتا دوں گی۔ میں اسے چھوٹی بہن سمجھ کر چاہوں گی۔ انھیں خیالات کے تانے بانے بنتے سارا راستہ گزر گیا اور پھولوں سے لدی پھندی امارہ سسرال کی حویلی کے سامنے جا کر رک گئی۔ ڈومنیوں نے سہرے گائے نندوں نے راستہ روکا اور بھائی سے نیگ لیا۔ پھر دلہن کو اس کے سجے سجائے کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ عذرا کو بیٹھے ابھی کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ اسکو کسی کے پیروں کی آہٹ سنائی دی اور وہ زیادہ جھک کر بیٹھ گئی۔ اس کے کانوں میں آواز آئی زیبا بیٹی ان سے ملو یہ تمھاری چھوٹی امی ہیں۔ تم انھیں آداب کرو یہ تمھیں مجھ سے بھی زیادہ پیار کریں گی اتنا کہہ کر تحصیلدار صاحب کو خود احساس ہوا کہ عذرا شرما رہی ہے تو وہ کہنے لگے اچھا میں چلا جاتا ہوں پھر یہ تم سے باتیں کریں گی "یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

عذرا نے بے جھجک زیبا کے سامنے اپنا گھونگھٹ پلٹ دیا گویا وہ دلہن نہیں واقعی زیبا کی ماں تھی۔ کچھ کہنا چاہا لیکن زبان میں سکت نہ تھی جو کچھ اس سے کہتی۔

زیبا کچھ دیر بیٹھی عذرا کا منہ تکتی رہی اس کے بعد کھڑی ہو گئی اور بولی "آپ میری چھوٹی امی ہیں۔؟"

" ہاں ہاں زیبا میں تمھاری چھوٹی امی ہوں۔ اس میں کیا شک ہے" عذرا نے بمشکل کہا! "اچھا تو چھوٹی امی! اب میں سونے جاتی ہوں۔ صبح میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاؤں گی مجھے چائے بنانی آتی ہے اچھا خدا حافظ! چھوٹی امی"

عذرا نے بھی خدا حافظ کہا۔

صبح صبح گھر کے تمام لوگ اٹھ بیٹھے۔ گھر میں بڑی رونق تھی ہر ایک کی خواہش تھی کہ دلہن کے کمرے میں جایا جائے جب بھی

کسی بی بی نے دلہن دیکھنے کی خواہش کی تو تحصیلدار صاحب نے کہہ دیا کہ رات ان کے سر میں درد تھا۔ وہ سو رہی ہیں۔ تحصیلدار صاحب کی بہن بیچ میں بول اٹھیں "نہیں بھیا! وہ جاگ رہی ہیں تھوڑی دیر ہوئی تو زیبا چائے دے کر آئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ چھوٹی امی نے مجھ سے خوب باتیں کیں! دراصل آپ بھابی کی ناز برداری کر رہے ہیں"

تحصیلدار صاحب نے صفائی پیش کی "ماں یہ سچ ہے کہ جب زیبا ان کے پاس گئی تھی تو وہ جاگ رہی تھیں۔ چائے پی کر آنکھ لگ گئی ہے۔" سب خواتین اپنا سا منہ لے کر واپس چلی گئیں۔ ایک نے تو یہاں تک کہا "کوئی نہیں سو رہا سب بڑھاپے کے چونچلے ہیں۔" جب دن کے دس بج گئے اور عذرا بیدار نہ ہوئیں تو تحصیلدار صاحب کو بھی کچھ اچھا نہ لگا۔ زیبا سے کہنے لگے "بیٹا! اپنی چھوٹی امی کو جا کر جگا دو سب لوگ باتیں بنا رہے ہیں"

زیبا باپ کی بات سن کر قہقہے لگانے لگی پھر کچھ رک کر بولی "ابو اب چھوٹی امی کبھی نہیں جاگیں گی" یہ سننا تھا کہ وہ دیوانہ وار کمرے کی طرف لپکے۔ پیچھے پیچھے تمام مہمان بھی کمرے میں گھس آئے۔ تحصیلدار صاحب نے دروازے سے ہی عذرا عذرا چیخنا شروع کر دیا اتنے میں نند نے بھابی کو جھنجھوڑ ڈالا..... مگر وہاں رکھا ہی کیا تھا...... عذرا تو سرد پڑی ہوئی تھی وہ زور سے چلائیں "بھیا! دلہن بھابی تو ختم ہو گئیں"..... واقعی دلہن بھابی تو آرام سے سو رہی تھیں ان کا مہندی لگا سرخ چوڑیوں سے بھرا ہاتھ مسہری سے نیچے لٹک رہا تھا۔ مانگ میں افشاں چمک رہی تھی بال البتہ چہرے پر بکھر گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بدلی کی اوٹ سے چاند جھانک رہا ہے اور عذرا سہاگ کے سرخ جوڑے میں سکون سے سو رہی تھی۔ البتہ منہ سے کچھ جھاگ نکل رہے تھے۔ تحصیلدار صاحب ایک نظر میں سب کچھ سمجھ گئے۔ وہ بری طرح دہاڑے "بیٹی تو نے یہ کیا..... کیا! میری غلطی کی سزا اس معصوم کو کیوں دی۔؟" زیبا نے کوئی جواب نہ دیا وہ صرف دیوانہ وار ہنسے جا رہی تھی۔

تحصیلدار صاحب نے کئی تھپڑ بھی مارے مگر زیبا پر کچھ اثر نہ ہوا [illegible] کوشش تھی کہ اب کیا ہونے والا ہے! ان کا تو [illegible] ماتم ہو گیا۔ ایک تو ہنستی بستی دلہن یوں اچانک چھوڑ کر چلی گئی دوسرے بیٹی کے لئے پھانسی کا پھندہ نظر آ رہا تھا۔ شدت غم سے انھوں نے زیبا کو سینے سے لگا کر کہا "بیٹی تم یہ بات ہرگز نہ کہنا کہ تم نے چائے میں اپنی امی کو زہر دیا ہے ورنہ پولیس تمھیں لے جائے گی۔ میں کہوں گا زہر میں نے دیا ہے"

زیبا تو پاگلوں کی طرح قہقہے لگائے جا رہی تھی۔

شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ منٹوں میں یہ خبر آگ کی طرح تمام محلہ میں پھیل گئی کہ زیبا نے دلہن کو چائے میں زہر دے دیا۔ عذرا کی امی ابو کو بھی خبر ہو گئی وہ غریب پاگلوں کی طرح دوڑے چلے آئے۔ باپ اور بہن بھائی تو عذرا کی لاش سے چمٹ چمٹ کر رونے لگے مگر ماں نہ روئی اور ٹکٹکی باندھے کافی دیر عذرا کی لاش کو تکتی رہی عورتوں نے حمیدہ بیگم کو رلانے کی بڑی کوشش کی مگر وہ سکتے کے عالم میں خاموش بیٹھی رہیں۔ اتنے میں بوا بشیرن کو بھی عذرا کی ناگہانی موت کی خبر مل گئی وہ روتی پیٹتی جنازے میں شرکت کے لئے پہنچ گئی۔ جیسے ہی حمیدہ بیگم کی نظر بوا بشیرن پر پڑی تو انھوں نے فاتحانہ انداز میں بوا کو پاس بلایا۔ بوا نزدیک پہنچ کر زور زور سے بین کر کے رونے لگی مگر حمیدہ بیگم بالکل نہ روئیں اور بولیں "تم روتی کیوں ہو میں تو بہت خوش ہوں کیونکہ میں نے عذرا کے لئے اتنا سارا جہیز بنا لیا ہے کہ اب میں اپنی عذرا کی ایسی دلیسی جگہ شادی نہیں کروں گی! بوا تم بھی کان کھول کر سن لو میری بچی کے لئے کسی شہزادے کا رشتہ لانا کیونکہ تم دیکھ چکی ہو کہ میری عذرا کسی شہزادی سے کم نہیں ہے [illegible]۔ ہیں! تیری کیا بات [illegible] ستو تم سب چل کر میری عذرا کا جہیز دیکھو میں نے ہر چیز دی ہے کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی تم لوگوں نے آج تک ایسا جہیز نہیں دیکھا ہوگا" حمیدہ بیگم کی باتیں سن کر تمام عورتیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ایک بڑی بی بولیں "ہائے بیچاری کا دماغ الٹ گیا ہے غریب کہہ رہی ہے کہ جہیز نہ ہونے کی وجہ سے عذرا کی موت واقع ہوئی ہے اگر جہیز ہوتا [illegible] پہلے سے بیاہی جاتی" ابھی عورتوں کی [illegible] پولیس آ گئی اس سے پہلے کہ پولیس [illegible] زیبا [illegible]

[illegible]

تحصیلدار صاحب [illegible]

[illegible] زہر میں نے دیا ہے [illegible]

نہ آیا کہ کیا چکر ہے اور کون سچ بول رہا ہے اسی وجہ سے وہ باپ بیٹی دونوں کو لیگئے۔ تھانے پہونچ کر زیبا نے بتایا کہ زہر میں نے دیا ہے ابو میری خاطر جھوٹ بول رہے ہیں۔ جب میں سات برس کی تھی تو میری امی شدید بیمار ہوگئی تھیں۔ چونکہ میں انتہائی لاڈلی اور ضدی لڑکی تھی۔ اپنی بیمار امی کو اتنا ستاتی تھی کہ وہ رونے لگتی تھیں۔ ایک دن میں نے امی کو بہت تنگ کیا تو وہ دکھ سے بولیں! بیٹی جب میں مرجاؤں گی تو تمھیں قدر ہوگی کیوں کہ میرے مرنے کے بعد تمھارے ابو دوسری شادی کرلیں گے پھر سوتیلی ماں آکر تمھیں بتائے گی اپنی ماں اور دوسری ماں میں کتنا فرق ہوتا ہے یہ سن کر میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور کہنے لگی۔ پیاری امی آپ ہرگز نہ مریئے ورنہ سوتیلی اماں مجھے مار ڈالیں گی۔ اب میں آپ کو کبھی تنگ نہ کروں گی۔ اگر کبھی خدا نہ کرے ایسا ہوا کہ سوتیلی امی آئے تو میں اس کے پیٹ میں ابو کا شکاری چاقو گھونپ دوں گی۔ نہیں تو بندوق سے مار دوں گی۔ مگر مقدر کا لکھا پورا ہوا میری پیاری امی مجھے روتا چھوڑ کر چلی گئیں۔ میری پھوپھیوں نے امی کے انتقال کے بعد کئی بار کوشش کی کہ میرے ابو شادی کرلیں لیکن وہ تیار نہ ہوئے اور میں نے بھی یہی کہا کہ ابو آپ ہرگز شادی نہ کیجئے گا ورنہ میں مرجاؤں گی کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ میں اپنی سوتیلی امی کو ضرور مار دوں گی اس کے بعد مجھے پھانسی ہوجائے گی۔ آج امی سے کیا ہوا وعدہ پورا ہوگیا۔

تحصیلدار صاحب بیٹی کی باتیں سن کر زار و قطار رونے لگے زیبا کے بیانات اور شہادتوں کی بنا پر تحصیلدار صاحب کو اسی وقت چھوڑ دیا گیا۔ میت پوسٹ مارٹم کے لئے جاچکی تھی۔ شام تک ایک رشک قمر کا جسم ایسی ہیئت میں آیا کہ دیکھنے والوں [illegible] دوسرے اپنے تو اپنے پرائے بھی آنسو بہانے لگے۔ کل ہی شام کو سرخ جوڑا پہنے دلہن بنکر رخصت ہوئی تھی۔ کل بھی سب رو رہے تھے لیکن رونے میں وہ کرب نہ تھا جو آج تھا جب وہ سفید جوڑا پہنے اس طرح رخصت ہورہی تھی کہ پھر کبھی واپس آنے کی امید نہ تھی۔ حمیدہ بیگم اپنے حواس میں نہ تھیں۔ نہ جانے انھیں کہاں کی طاقت آگئی تھی کہ سب کے پکڑنے پر بھی وہ اپنے کو چھڑا کر میت کے ساتھ باہر نکل گئیں۔ اور قہقہہ لگا کر بولیں۔ کون کہتا ہے کہ میں جہیز نہیں دے سکی۔ دیکھو اے دنیا والو کیا شاندار جہیز میں نے دیا ہے۔ اور پھر وہ بے ہوش ہوکر اس طرح گریں کہ پھر ہوش نہ آسکا۔

تصنع یہ تکلف

زینب رحمٰن

آج کل کے سماج میں یہ ایک فیشن سا بن گیا ہے کہ ہر کوئی کہتا ہے "ہم کو بناوٹ سے نفرت ہے ہم سادگی پسند ہیں اور کسی سے غیریت نہیں برتتے" وغیرہ وغیرہ مگر یہی سب کہنے والے قدم قدم پر تصنع برتتے ہیں تکلف کرتے ہیں اور دوسرے مصلحت آمیز کا سہارا لیتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ میں ہمیشہ یہ سوچتی ہوں لیکن کسی نتیجہ پر پہونچنا مشکل ہی نظر آتا ہے۔ آج سوچا ہے کہ اپنے سارے خیالات آپ سب کے سامنے پیش کروں یقیناً اکثر بہنیں اسی طرح سے سوچا کرتی ہوں گی کیونکہ سبھی کو روزمرہ زندگی میں تصنع و تکلف کا سامنا کرنا ہی ہوتا ہے۔

شادی کے شروع میں جب میں کسی کے گھر جاتی یا میرے گھر مہمان آتے تو لوگوں کا تکلف و تصنع دیکھ دیکھ کر مجھے بہت کوفت ہوتی تھی۔ مثلاً آپ کے پاس مہمان بیٹھے ہیں اور آپ ان کے لیے چائے وغیرہ کا انتظام کر رہی ہیں تو مہمان خاتون بہت اصرار سے آپ کو چائے کے لیے منع کر دیں گی لیکن اگر آپ ان کی بات مان لیں تو دوسرے دن سارے محلے میں خبر ہو جائے گی کہ آپ بے حد کنجوس ہیں اور آپ کو خاطرداری کے اصول معلوم تک نہیں۔ میں اپنے شوہر سے اکثر بحث کرتی تھی کہ لوگ صاف بات کیوں نہیں کرتے بلاوجہ تکلف اور بناوٹ سے کیوں کام لیتے ہیں؟ وہ کہتے کہ یہ تو دنیا کا دستور ہے سب سے اچھے تعلقات رکھنے کیلئے یہ سب کرنا ہی پڑتا ہے۔ بہرحال میں سوچتی کہ میں تصنع سے ہمیشہ گریز کروں گی اور سادگی و صاف گوئی کو کبھی نہ چھوڑوں گی مگر اب کئی سال گزر جانے پر مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں بھی کبھی تکلف تصنع اور بناوٹ سے کام لیتی ہوں اور شاید اسی وجہ سے میرے اپنے ہمسایوں اور دوسرے جان پہچان والوں سے اچھے تعلقات برقرار ہیں۔

تصنع و تکلف کئی طرح اور کئی درجوں کے ہوتے ہیں جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں، تھوڑا بہت تکلف اور بناوٹ اچھے تعلقات نباہنے رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ کیونکہ دنیا میں ہر شخص کے اپنے خیالات ہوتے ہیں اپنی پسند ہوتی ہے جو دوسروں کے خیالات و اصولوں سے الگ ہوتی ہے اگر سب لوگ ہمیشہ صاف گوئی سے کام لے کر ایک دوسرے کی تنقید ہی کرتے رہیں تو لڑائی جھگڑے کبھی ختم نہ ہوں گے، اسلئے اگر ہم کو کسی کا طور طریقہ ناپسند ہے تو زبان سے نہ کہنا ہی بہتر ہے بلکہ اگر کبھی تذکرہ ہو بھی جائے تو تنقید سے گریز کرنا چاہیئے۔ ہاں اگر کوئی سچے دل سے ہم سے مشورہ کرے اور ہم جانتے ہوں کہ ہماری سچی تنقید سے وہ ناراض نہ ہوگا بلکہ مستفید ہوگا تو ایسی صورت میں صاف گوئی مناسب ہے۔

خاطرداری و مہمان نوازی میں بھی کسی قدر بناوٹ و تکلف ضروری ہے۔ مثلاً اگر کوئی مہمان آپ کے گھر کھانے پر رک جائے تو آپ صرف دال روٹی نہ بنا کر رہیں گی بلکہ ایک دو سالن اور کچھ میٹھا بھی تیار کر لیں گی حالانکہ مہمان سے یہی کہیں گی کہ کوئی تکلف نہیں کیا اور سادہ روزمرہ کا ہی کھانا ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس حد تک تکلف و تصنع سے کام لیتے ہیں کہ طبیعت الجھ جاتی ہے۔ اور لطف یہ کہ یہی لوگ کہیں گے کہ انھیں بناوٹ سے نفرت ہے اور وہ سادگی پسند ہیں ایسا بے انتہا تصنع نقصان دہ بھی ثابت ہوتا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اس سے ہمیشہ گریز کرنا چاہیئے۔ مثال کے طور پر آپ کسی کے گھر مہمان گئی ہوں اور آپ کا چھوٹا لڑکا ڈرائنگ روم کی سجاوٹ کی چیزوں کو چھیڑنے لگے تو آپ اسے ٹوکیں گی اسی وقت اگر میزبان کہنے لگے "ارے بچے کو نہ روکئے اسے کھیلنے دیجئے جو مانگتا ہے دے دیجئے بچے تو چیزیں توڑتے ہی ہیں کوئی حرج نہیں کھیلنے دیجئے جو بھی چاہے اٹھاؤ" وغیرہ وغیرہ۔ تو ظاہر ہے بچہ اور زیادہ شرارت کرے گا اور آپ شرمندہ ہونگی اور خود میزبان دل ہی دل میں آپ کے بچے کو بدتمیز اور نہ جانے کیا کیا کہیں گی۔ میرے خیال میں ایسا تکلف بیجا ہے۔ میزبان کو چاہیئے کہ وہ بچے کو کوئی کھلونے یا بسکٹ ٹافی وغیرہ دے دیں اور اس کا دھیان بٹا دیں۔ اگر اس کی ماں اسے ٹوکے تو خود خاموش رہیں تاکہ وہ ماں کی بات سنے اور سمجھے بلکہ اگر ماں باپ نہ ٹوکیں تو خود میزبان کو نرمی سے بچے کو کچھ کہنا چاہئے

غرض تصنع و تکلف سماجی زندگی کا ایک ضروری عنصر ضرور ہیں مگر ان کا استعمال صرف اسی قدر ہونا چاہئے کہ لوگوں کے تعلقات ایک دوسرے سے ٹھیک رہیں اور لڑائی جھگڑوں کی نوبت نہ آئے لیکن بے انتہا تصنع و تکلف سبھی کے لئے مضر اور تکلیف دہ ہوتا ہے اس لئے اس سے گریز کرنا چاہئے جہاں تک ممکن ہو سادگی اور صفائی قلب کو اپنانا چاہئے ساتھ ہی اخلاق عاجزی اور انکسار کا بھی خیال رکھنا چاہئے وہی انسان ہر دلعزیز بن سکتا ہے جو کبھی بھی اپنی گفتگو یا حرکات سے کسی کو نہ رنج پہونچائے نہ تکلیف دے۔ ● ● ●

انتخاب تعلیمات قرآن

(۱۰۳) اور برے کاموں سے منع کیا کرو اور اس سلسلے میں تجھ پر جو مصیبت واقع ہو اس پر صبر کیا کر (کیونکہ) یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔ (سورہ لقمان)

(۱۰۴) اور آپ (رسول اللہ) اپنی خطا کے لئے معافی مانگتے رہئے اور سب مسلمان مرد اور عورتوں کے لئے بھی۔ (سورہ محمد)

(۱۰۵) اور اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو (سورہ بقرہ)

(۱۱۵) اور دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو (سورۂ شوریٰ)

(۱۱۶) اے ایمان والو یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو (اسی نے) اپنے رسول پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر جو پہلے نازل کی تھی۔ (سورۂ نساء)

(۱۱۷) نماز کو قائم رکھو۔ (سورۂ بقرہ)

(۱۱۸) اور زکوٰۃ دیا کرو۔ (سورہ بقرہ)

(۱۱۹) تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسے کہ تم سے اگلوں پر فرض کیا گیا تھا (سورہ بقرہ)

(۱۲۰) [illegible] کے واسطے لوگوں کے ذمہ [illegible] کے گھر کا حج کرنا جو [illegible] طرف راہ چلنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ (سورۂ آل عمران)

(۱۲۱) جہاد کو تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو گراں ہے (سورہ بقرہ)

(۱۲۲) بے شک نماز مسلمانوں پر اپنے مقررہ وقتوں پر فرض ہے۔ (سورۂ نساء)

(۱۲۳) اے ایمان والو! جب نماز کے لئے اٹھو تو اپنے منہ کو اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو اور اپنے سر کو مل لو (یعنی تر ہاتھ مار کر مسح کر لو) اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لو۔ (سورہ مائدہ)

(۱۲۴) اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کی اذان ہو تو اللہ کی یاد کو دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ (سورۂ جمعہ)

(۱۲۵) زکوٰۃ جو ہے سو وہ حق ہے فقرا اور محتاجوں کا (سورۂ توبہ)

(۱۲۶) رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا سو جو کوئی تم میں سے اس مہینہ کو پائے تو اس میں ضرور روزے رکھے۔ (سورہ بقرہ)

(۱۲۷) تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیویوں سے مشغول رہنا ہونا حلال قرار دیا گیا ہے۔ (سورہ بقرہ)

(۱۲۸) آپ (رسول اللہ) سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ (خیرات) کریں فرما دیجئے کہ جو اپنے خرچ سے بچے۔ (سورہ بقرہ)

(۱۲۹) اگر خیرات ظاہر کر کے دو تو اچھی بات ہے اور اگر اس کو چھپا کر فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ (سورہ بقرہ)

(بظاہر اللہ تعالیٰ کے ان ارشاد میں تضاد پایا جاتا ہے مگر درحقیقت تضاد نہیں ہے۔ ظاہر کر کے خیرات دینے کی ہدایت اس لئے کی ہے کہ دوسروں کو رغبت ہو اور چھپا کر دینے کی ہدایت اس لئے دی ہے کہ جسے دیجائے وہ شرمندگی نہ محسوس کرے۔ مختصر یہ کہ دونوں صورتیں بہتر ہیں موقع اور مصلحت کو مدنظر رکھ کر کسی ایک کو ترجیح دے جائے)

نسیم انہونوی

(۱۳۰) اے ایمان والو احسان جتا کر خیرات ضائع مت کرو۔ (سورہ بقرہ)

(۱۳۱) اور ہم نے ہر امت کے واسطے قربانی مقرر کر دی ہے تاکہ وہ ان چوپاؤں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو دیئے تھے سو تمہارا اللہ ایک ہی ہے تو تم ہمہ تن اس کے ہو کر رہو۔ (سورہ حج)

(۱۳۲) اور [illegible] (سورۂ [illegible])

(۱۳۳) اے ایمان والو [illegible] (سورۂ [illegible])

(۱۳۴) اور [illegible] (سورۂ [illegible])

(۱۳۵) [illegible] عادت [illegible] (سورۂ [illegible])

مولانا محمد علی جوہر

جگن ناتھ آزاد

معزز خواتین حضرات:

بزم فروغ اردو جموں کے منتظمین کا میں تہ دل سے شکرگزار ہوں کہ انھوں نے مولانا محمد علی جوہر صدی تقاریب کے اس افتتاحی اجلاس کی صدارت کا اعزاز مجھے بخشا۔ اسوقت اپنی کم مائگی اور صدی تقاریب کے منتظمین کی طرف سے اپنی عزت افزائی کے پیش نظر یہی عرض کرسکتا ہوں کہ ؎

گرچہ خردیم نسبتے است بزرگ
ذرہ آفتاب تابانیم

حضرات غالباً یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اپنے عظیم رہنماؤں، فن کاروں، ادیبوں اور شاعروں کو فراموش کرنے میں ہم اہل ہندوستان اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس ضمن میں کتنے ہی بڑے بڑے نام لئے جا سکتے ہیں۔ جنھیں یاد رکھنے سے ہم اپنے وقار میں اضافہ کرسکتے ہیں لیکن ہم نے انھیں فراموش کردیا۔ قومی رہنماؤں میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، شاعروں میں جناب درگا سہائے سرور، نادر کاکوروی، صحافیوں میں منشی دیانرائن نگم، محمد باقر غالب دہلوی، تمثیل نگاروں میں آغا حشر کاشمیری اور نانک پرشاد طالب بنارسی اور کتنے ہی اور نامور اہل قلم اور رہنما سرزمین ہندوستان نے ایسے پیدا کئے ہیں جن پر کوئی بھی ملک اور کوئی بھی قوم فخر کرسکتی ہے۔ لیکن ہم نے ان کے انتقال کے بعد انھیں کبھی بھول کے بھی یاد نہیں کیا۔ اسی جموں ہی کی بات کیجئے۔ کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ چودھری خوشی محمد ناظر جن کی نظم "جوگی" کے اکثر اشعار ایک زمانے میں ہندوستان بھر میں بچے بچے کی زبان پر ہوتے تھے۔ اسی جموں کی سرزمین کے ایک نامور فرزند تھے۔ کیا ہمیں یہ معلوم ہے کہ محمد دین فوق اور مولوی محمد دین اسی ریاست جموں و کشمیر کے اہل قلم تھے۔ صف اول کے اہل قلم یہ لوگ اگر ہندوستان میں نہیں کسی اور ملک میں پیدا ہوئے ہوتے تو آج ان پر اعلیٰ پیمانے کے تحقیقی کام ہو چکے ہوتے۔ اور ان کے نام پر بڑی بڑی لائبریریاں کھل چکی ہوتیں۔ لیکن ہم لوگوں نے انھیں حرف غلط کی طرح اپنے حافظے کی لوح سے مٹا دیا۔ اور تو اور ہم نے تقریباً بیس برس تک علامہ اقبال کو یاد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ تو خدا بھلا کرے چند سرپھرے لوگوں کا جنھوں نے اس نام کو سینے سے لگائے رکھا۔ اور آخرکار اقبال صدی تقاریب کی تجاویز اور اس سلسلے میں اقبال کی صحیح تاریخ پیدائش پر بحث و تحقیص ملک کے طول و عرض میں اقبال کی یاد کو زندہ کرنے کا بہانہ بن گئیں اور ہم اس قابل ہوئے کہ دوسرے ملکوں کے ادیبوں اور شاعروں کو اپنا منہ دکھا سکیں۔

لیکن اس وقت یہ میرا مقصد صف اول کے ان رہنماؤں اور اہل قلم حضرات کی فہرست گنوانا نہیں ہے۔ جنھیں ہم نے زیب طاق نسیاں بنا رکھا ہے۔ بلکہ انھیں فراموش شدگان میں سے صرف ایک عظیم شخصیت کا ذکر کرنا مقصود ہے اور یہ وہ عظیم شخصیت ہے جس کی یاد منانے کے لیے آج ہم آپ سب بزم فروغ اردو کی دعوت پر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس موقع پر میں پھر یہی بات عرض کروں گا۔ کہ خدا بھلا کرے ان اہل وطن کا جنھوں نے کل ہند محمد علی صدی تقاریب کمیٹی قائم کی اور ہم سب لوگوں کو اپنے فرض کا احساس دلایا۔

معزز حاضرین! مولانا محمد علی ایک کثیر الجہت شخصیت تھے۔ ہمارے صف اول کے قومی رہنما تو تھے ہی شاعر بھی تھے اور کتنے ہی بڑی چھوٹی شہرت رکھنے والے شاعروں سے اچھے شاعر، صحافی تھے اور ایسے صحافی جنھوں نے صحافت کو پیشے کے طور پر نہیں بلکہ مشن کے طور پر اختیار کیا۔ مقرر تھے اور ایسے کہ ہزاروں کے مجمع پر چھا جایا کرتے تھے۔ وہ زمانہ لاؤڈ سپیکروں کا

زمانہ نہیں تھا۔ محمد علی کی زبان پر لاؤڈ اسپیکر تھے۔ جب تقریر کرتے وقت وہ جوش میں آتے تھے تو ان کا گلا رندھ جاتا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے، لیکن تقریر کا سیلاب نہ تھمتا تھا۔

اور تقریر اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں لاجواب کرتے تھے۔ ان کا قلم بھی دونوں زبانوں میں خوب چلتا تھا نہ جانے ہم لوگ ان کی اردو تقریروں کی قدر کر سکے یا نہیں، لیکن جب انھوں نے "کامریڈ" کلکتے سے نکالا تو اکثر انگریزوں نے محمد علی کی انگریزی دانی کی تعریف کی لارڈ ہارڈنگ کو تو شاید اس لئے "کامریڈ" کا انتظار رہتا ہوگا کہ وہ محمد علی کے سیاسی خیالات براہ راست ان کے اخبار سے جاننے کے خواہش مند ہوں گے لیکن لیڈی ہارڈنگ اس لئے اس اخبار کی منتظر رہا کرتی تھیں کہ انھیں محمد علی کی انگریزی پسند تھی ان کی انگریزی دانی کی بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ علی گڑھ کالج کے پرنسپل مارسین ان کی زبان دانی کے مداح تھے۔ لارڈ منٹو اور برطانوی وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے اکثر ان کی انگریزی دانی کی تعریف کی آکسفورڈ میں وہ آکسفورڈ سوسائٹی کے سکریٹری انگریزی میں بے مثل مہارت کی وجہ سے بنے

انگریزی میں انھوں نے آخری تقریر بلکہ اپنی زندگی کی آخری تقریر گول میز کانفرنس لندن میں کی جس میں انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے لئے آزادی لینے آیا ہوں یا تو وطن کے لئے آزادی لے کر وطن واپس جاؤں گا۔ اور یا اپنی جان یہیں دے دوں گا اور اپنے عہد کو انھوں نے سچ کر دکھایا۔

مجھے یہاں ان کا ۱۹۱۹ء کا شعر یاد آرہا ہے۔ انتقال سے پندرہ برس قبل کیا حقیقت ان کے دل پر منکشف ہورہی تھی۔ غالب کے ایک مصرعے میں تصرف کرتے ہوئے اپنی ایک غزل میں کہتے ہیں۔

یوں بچ سکو مواخذ حشر سے تو ہاں
مارا دیار غیر میں ہم کو وطن سے دور

حضرات ان کی شاعری کا ذکر آگیا ہے تو ایک بات اس سلسلے میں عرض کروں گا اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ ابھی تک محمد علی کی شاعری پر کسی نے جم کے کام نہیں کیا۔ اور شاید اسی وجہ سے اردو کے ممتاز شاعروں میں بالعموم ان کا نام نہیں لیا جاتا۔ لیکن اگر محمد علی جوہر کے کلام کا انتخاب کیا جائے تو ایسے اشعار جو ہماری اردو غزل کیلئے باعث افتخار سمجھے جائیں۔ خاصی تعداد میں نکلیں گے۔ ہماری اردو غزل کی تاریخ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں شعراء ایسے گزرے ہوں گے جن کا ایک شعر بھی آج کسی کو یاد نہیں ہوگا لیکن ہندوستان میں اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والا شاید ہی کوئی

شخص ایسا ہو جس نے محمد علی جوہر کا یہ شعر نہ سنا ہو

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

یہ شعر ہماری علامتی شاعری کی ایک بہت خوبصورت مثال ہے جس میں اسلام اور حسین خیر اور نیکی کی علامت کے طور پر آئے ہیں اور یزید علامت بدی کے طور پر۔ کربلا کا واقعہ تاریخ عالم میں ایک ہی ہوا ہے لیکن محمد علی جوہر نے یہاں "کربلا کے بعد" کہہ کر واقعہ کربلا کو جو معنوی وسعت عطا کردی ہے وہ تا ابد معرکہ حق و باطل میں حق کا ساتھ دیتی جائے گی۔

معزز حضرات! بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ موت انسان کو اعزاز بخش دیتی ہے۔ اپنی زندگی میں انسان کی قدر نہیں ہوتی، لیکن محمد علی جوہر قربانیوں اور خلوص کی بنا پر انسانیت کے اس مرتبے پر فائز تھے کہ وہ اپنی زندگی میں ہمارے ادب العالیہ کے جز بن گئے ہماری اونچے پائے کی شاعری کا موضوع بن گئے کوئی اہم اور قابل ذکر شاعر اپنے کسی ہم عصر کے متعلق آسانی سے اپنے قلم کو جنبش نہیں دے گا۔ اہم اور قابل ذکر شاعروں کے کلام میں صرف اپنے اسی ہم عصر کا نام جز کلام بنے گا۔ جس سے وہ شعراء واقعی متاثر ہوں گے۔ مولانا محمد علی کی عظمت اور مقبولیت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوگی کہ ان کا ذکر خیر صفی لکھنوی اقبال، ظفر علی خاں، تلوک چند مرحوم، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور یحییٰ اعظمی کے کلام میں جگمگا رہا ہے۔ ظفر علی خاں کی نظم کے چند اشعار دیکھئے۔

دل کش فضا وطن کی محمد علی سے تھی
رنگینی اس چمن کی محمد علی سے تھی
ہیں زندہ جس سے عہد کہن کی روایتیں
رونق اس انجمن کی محمد علی سے تھی
زنداں کو جس نے مطلع انوار کر دیا
تابانی اس کرن کی محمد علی سے تھی

تلوک چند مرحوم کی نظم "ہمزاد" ان کی حیثیت دوستی محمد علی کی گرفتاری پر ان کی والدہ محترمہ کے جذبات پر مشتمل ہے۔ حفیظ جالندھری کی نظم "ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح" مسکا ذیلی عنوان ہے، مولانا محمد علی کی وفات پر جوش ملیح آبادی کی نظم "رحلت محمد علی" مجھے جوش صاحب کے کسی مجموعہ کلام میں نظر نہیں آئی، شاید میری نظر سے چوک ہوگئی ہو لیکن جان نثار اختر کے مرتب کئے ہوئے "ہندوستان ہمارا" میں موجود ہے۔

اقبال نے محمد علی کے متعلق دو نظمیں کہی ہیں، ایک تو "بانگ درا" میں شامل ہے۔

* "اسیری" اس نظم کے متعلق ہم سیاست اور ادب کو گڈمڈ کرنے والے کچھ بھی کہیں دراصل اقبال نے یہ نظم ۱۹۱۹ء میں کہی جب مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی قید فرنگ سے آزاد ہوئے اور امرتسر میں ان کے اعزاز میں ایک عوامی جلسہ منعقد ہوا۔ علامہ اقبال اس جلسے میں شریک ہوئے تھے اور انھوں نے خود یہ نظم جلسے میں پڑھی تھی۔ یہ نظم مختصر سی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ محمد علی اور اقبال دونوں کی یاد میں یہ نظم آپ کے سامنے پیش کروں۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
مشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

اور اس موضوع پر اقبال کی دوسری نظم فارسی میں ہے یہ محمد علی کا مرثیہ ہے۔ میرے نزدیک یہ نظم فارسی کا ایک شاہکار ہے۔ معلوم نہیں اقبال نے اسے اپنے کسی فارسی مجموعہ کلام میں کیوں نہیں شامل کیا۔ یہ نظم بھی بہت مختصر ہے صرف پانچ اشعار پر مشتمل ہے اور اسی میں اپنی بات ختم کر رہا ہوں۔

یک نفس جان نزار او قید اندر فرنگ
تا شرر بر ہم زنیم از ماہ و پروین درگذشت
اے خوشا مشت غبار او کہ در جذب حرم
از کنار اندلس او از ساحل بربر گذشت
خاک قدس او را بہ آغوش تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زان راہے کہ پیغمبر گذشت
گاہ چو گیری بہ سوزش آں خاکے کہ پاکان زنگ بود
بندۂ کو از تیر اسود و احمر گذشت
جلوہ او تا ابد باقی بہ چشم آسیاست
گرچہ آں دزنگاہ خاور دزخاور گذشت

تیسرے شعر میں اشارہ ہے اس مقدس سرزمین کی طرف جہاں انتقال کے بعد محمد علی دفن ہوئے۔

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ محمد علی نے ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس لندن میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ "ہندوستان کے لئے آزادی لینے آیا ہوں یا تو وطن کے لئے آزادی لے کے واپس جاؤں گا اور یا اپنی جان یہیں دے دوں گا" اور اس دعوے کو انھوں نے سچ کر دکھایا۔ اور سچ بھی اس حد تک کہ موت لندن میں ہوئی اور نعش بیت المقدس میں دفن ہوئی۔ اپنے دعوے کے مطابق وہ آزادی لے بغیر ہندوستان واپس نہیں آئے۔

اب حضرات موجودہ صدی تقاریب کے دوران میں ہمارے لئے لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ محمد علی نے ہندوستان کے لئے اپنی جان دے دی۔ ہندوستان نے محمد علی کے لئے کیا کیا؟

رباعیات

فیروز نظامی

دل نور سے خالی ہے زمانہ آباد
تجھ مجھ کی برائی سے فسانہ آباد
اللہ رے مسلمانوں کا بگڑا ہوا حال
مسجد ویران، چائے خانہ آباد

کل اور نہ فرصت ہو تو پھر کیا ہوگا
اتنی بھی نہ مہلت ہو تو پھر کیا ہوگا
ہر روز نماز ٹالتے ہو کل پر
کل روز قیامت ہو تو پھر کیا ہوگا

نئی صبح

صولت اقبال

صبح کب کی ہو چکی تھی۔ ہر شے بیدار ہو رہی تھی۔ زندگی کے ہنگامے انگڑائیاں لے رہے تھے۔ ہر وہ شے جو کچھ ہی دیر پہلے رات کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اب اس کے تسلط سے آزاد ہو کر روشنی کے دائرے میں آ چکی تھی وہ بھی بہت دیر پہلے بے ہوشی کی دنیا سے نکل آیا تھا لیکن ابھی تک سونے جاگنے کی کیفیت میں آنکھیں بند کئے پڑا پانی کے گرنے کی آواز کو بغور سن رہا تھا "ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ"۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا تہمینہ اور وہ کسی پہاڑی مقام کے کسی خوبصورت سے کاٹیج کے "ڈرائنگ روم" میں آتشدان کے سامنے بیٹھے باہر گرنے والی بارش کے شور کو سن رہے ہوں۔ ہاں ایسا ہوا بھی تو تھا۔ تبھی اس نے اس کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے دھیمے سے پوچھا تھا۔

"ٹھنڈ تو نہیں لگ رہی"

"ہاں" تہمینہ نے شرمگیں انداز میں اس کی ... دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"تو میری جان یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو"

اس نے اسے بازوؤں سے تھامتے ہوئے گرم بستر میں ڈھکیل دیا تھا۔

اس رات کی صبح اور آج کی صبح میں کتنی مماثلت تھی۔ اس دن بھی وہ یونہی کب سے آنکھیں بند کئے غسلخانے میں گرنے والے پانی کی آواز کو بغور سن رہا تھا لیکن اس دن اسے کسی پہاڑی مقام کی کسی کاٹیج کا خیال نہیں آیا کیونکہ اس وقت وہ خود اسی کاٹیج میں موجود تھا۔ جب کچھ ہی دیر بعد تہمینہ نہا کر نکلی تھی تو عادل کے چہرے پر شریر سی مسکراہٹ دیکھ کر شرم سے سرخ ہو گئی تھی۔ عادل نے اس کا دامن کھینچ کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا اور مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

ایسی خوبصورت مسکراہٹوں کے تبادلے کرتے کرتے کئی سال بیت گئے پہلے پہل تو ان کے دلوں میں کوئی خیال نہ آیا لیکن بالآخر تہمینہ تھک گئی اب جب بھی عادل اس کی طرف مسکرا کر دیکھتا اس کے چہرے پر سایہ سا ابھر جاتا ... پانی کے گرنے ... کے لئے چھت کو گھورنے لگتی ... عادل ... پانی ... پر گرتا تو اس کا ذہن بھی وہی آواز ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ ... اسی بات کا ... اور ابھی

رہگذاروں پر قدم سے قدم ملا کر چلتے پندرہ برس بیت گئے۔

کن انکھیوں پر چاندی کے تاروں کو سجائے عادل جب بھی اس کی طرف محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتا تو وہ دل مسوس کر رہ جاتی اور ادھیڑ عمری کی طرف مائل تہمینہ ان دنوں کو کبھی بھلا نہ پاتی جن کی خوبصورتیوں نے اسے کوئی نشانی عطا نہ کی تھی۔

ماضی کی بھول بھلیوں سے نکل کر وہ حال کی دنیا میں لوٹ آیا۔ پانی گرنے کی آواز بند ہو چکی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک اسے وقت گزرنے کا احساس دلا رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ منہ ہاتھ دھو کر جب وہ باہر نکلا تو تہمینہ اس کے لئے چائے لئے کھڑی تھی۔ وہ ایک کافرادا کے ساتھ اس کے قریب جا کر چائے تھامتے ہوئے اس کے کان میں بولا

"صبح بخیر جانم" یہ خاص انداز یہ خاص الفاظ وہ خاص موقع پر ہی استعمال کرتا تھا۔

"عادل، عادل آپ ایسے مت کیا کریں" تہمینہ نے کانپتے ہوئے ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" عادل نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنی تہی دامنی کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے" تہمینہ اس کے بازو سے لپٹ کر بری طرح رو دی۔ پھر اسے چپ کرانے میں عادل کا کتنا ہی وقت لگ گیا۔

"اس طرح نہیں روتے جان۔ خدا کی مرضی میں ہمارا کیا دخل" وہ سمجھاتے ہوئے کہتا۔

بس اب چپ ہو جاؤ ورنہ میں بھی رونے لگوں گا" بظاہر وہ مسکراتے ہوئے کہتا لیکن یہ تو وہی جانتا ہے کہ اس کے دل پر کیسی کیسی قیامتیں گذر جاتی تھیں

اور کچھ دن یونہی بیت گئے تہمینہ کچھ دنوں سے کچھ زیادہ ہی ... سی رہنے لگی تھی۔ نہ جانے ہر وقت کیا سوچا کرتی۔ ہر وقت یوں لگتا گویا کسی کا انتظار ہے۔ یا پھر خود اس کا کہیں جانے کا ارادہ ہے۔

"عادل کیا بات ہے۔ شام ہو گئی۔ رات ہو گئی آج کیا دن ہے۔ کیا ہوا ہے"۔

عادل پریشان ہو گیا۔

"تہمینہ متعجب ہو کہا گیا ہے؟" وہ سست اور کام چور بھی بہت ہو گئی تھی — عادل اسے سمجھاتا۔

"اپنے آپ کو مصروف رکھا کرو جان۔ بے کار سوچیں پریشان کرتی ہیں۔"

لیکن وہ خالی خالی نظروں سے اسے تکتی رہتی۔ کبھی ہونٹوں کو جنبش دیتی جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو لیکن پھر خاموش ہو جاتی۔

جب اور بہت سے دن بیتے تو تہمینہ میں پھر تبدیلی آنے لگی اب وہ پہلے کی طرح مطمئن اور پر سکون نظر آنے لگی۔ عادل کو حیرت تھی کہ یہ چکر کیا ہے لیکن تہمینہ کی طرف سے خوش بھی تھا کیونکہ وہ اس سے بے حد محبت کرتا تھا انسان کبھی نا امید نہیں ہوتا وہ اندھیرے کے بادلوں میں بھی روشنی کی کرن تلاش کرتا رہتا ہے اور عادل بھی ایک انسان تھا۔

مارچ کی ایک خوبصورت اور سہانی سی صبح کو جب وہ سو کر اٹھا تو پانی گرنے کی اس کی پسندیدہ آواز آ رہی تھی، اور جب تھوڑی دیر بعد تہمینہ نہا کر نکلی تو عادل کے ہونٹ عادت سے مجبور ہو کر مسکرانے کے لئے وا ہونے ہی لگے تھے کہ ایک دم اسے تہمینہ کا وہ پژمردہ چہرہ یاد آ گیا جس نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ تہمینہ کمرے میں آ کر اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی لیکن اسے آج وہ مسکراہٹ نظر نہ آئی جس کی وہ متلاشی تھی۔ عادل جانتا تھا کہ تہمینہ کیا ڈھونڈھ رہی ہے لیکن وہ اسے کسی قسم کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔" آخر تہمینہ خود ہی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اور نہایت پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

"آپ مسکراتے کیوں نہیں۔؟"

"تم جانتی ہو!" عادل نے ملائمت سے جواب دیا۔ "مگر وہ" تہمینہ نے مسکراتے ہوئے سر جھکا لیا۔ پھر اس کے کان کے قریب منہ لے جاتے ہوئے بولی۔

پندرہ برس بعد خدا نے ہماری سن لی ہے عادل"

اور عادل یوں بیٹھا تھا جیسے اسے اس بات کی سمجھ ہی نہ آئی ہو۔ اور دوسرے ہی لمحے چیختے ہوئے بولا۔

"کیا واقعی"

تہمینہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنا چہرہ اس کے سینے میں بھینچتے ہوئے اک پر مسرت قہقہہ لگایا۔

پندرہ برس تک مصنوعی مسکراہٹوں سے وہ تہمینہ کو دھوکہ دینے کے بعد آج حقیقتاً مسکرا رہا تھا

موسم کی مرہم

ڈاکٹر اشرف جہاں ۔ پٹنہ

آسمان پر سیاہ بادل گھر آئے ــــ پھر برسات آگئی لاکھوں حسن اور رعنائی لئے ہوئے "شبیہ" اپنی کھڑکی پر کھڑی کھڑی سوچتی رہ گئی ــــ بادل چھا گئے ــــ ہوائیں آہستہ آہستہ نرم نرم سپنے جگانے لگیں۔ اف!۔ اس کا بچپن۔ بادل چھاتے ہی وہ آنگن میں اتر جاتی اور ہواؤں کی تیزی کے ساتھ اس کے پیر اور ہونٹ حرکت پذیر ہو جاتے تھے لیکن ایک دن یکایک پیر رک گئے ــــ اس دن ــــ بارش زوروں کی ہو رہی تھی۔ موسلا دھار بارش ــــ اور اسی اندھیری رات میں وہ لاوارث ہو گئی ــــ یتیم تو تھی ہی ــــ ماں کا نازک سہارا بھی ٹوٹ گیا۔

رات گذر گئی ــــ .....

اور جب صبح کی چمکیلی دھوپ اس کے آنگن میں پھیل گئی۔ تو ناصر کو اس پر رحم آگیا ــــ وہ یوں ہی ایک لڑکی کو اپنی شاندار حویلی میں لے آتا تو زمانہ نہ جانے اس پر کتنے کیچڑ اچھالتا ــــ اس لئے وہ اس کی بیگم بن کر اس کی شاندار حویلی میں آگئی ــــ اگرچہ وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی ــــ لیکن اس وقت شباب نے اس پر اپنی بھرپور نظر نہیں ڈالی تھی۔ اور ناصر وہ تو شباب کی آخری منزلوں پر تھا۔

لیکن ناصر سے بیاہے جانے پر شاید اسے اپنی جوانی کا احساس ہونے لگا اور یہ احساس آہستہ آہستہ شدید ہونے لگا کہ شدید تر ــــ

اور آج کی برسات نے تو اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ آسمان پر بادل چھاتے گئے۔ بادل نے جب آسمان کو اپنی آغوش میں لے لیا تو ہلکا ہلکا روشنی سے بھرپور اندھیرا چھا گیا۔ کتنا حسن تھا اندھیرے میں نا جانے سے بھرپور اندھیرا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اس کے جسم کو گدگدانے لگیں۔ ناصر نے تو صرف اسے بیاہ کر اس کوٹھی میں بٹھا دیا تھا۔ اسے کیا معلوم کہ برسات کے دن کیا غضب ڈھاتے ہیں۔

شبیہ کمرے سے [illegible] [illegible] بھیگی ہوائیں گلاب سے مہکی [illegible] شبیہ نے محسوس کیا جیسے [illegible]

ان ہواؤں سے بجھ جانے کے لئے بے چین تھا۔ اور اسے بجھ جانے سے عجیب سی لذت سے سرشار جھوم رہا تھا ــــ

وہی لذت جس کے لئے وہ بے چین تھی۔ ناصر نے اس کے لئے آسائش کی ہر شے مہیا کر دی تھی لیکن شبیہ سوچا کرتی کہ وہ ہر لمحہ بے چین کیوں رہتی ہے۔

بوندیں ایک ــــ دو ــــ اور پھر لگاتار ــــ پیاسی دھرتی پر گرنے لگیں۔ سوندھی سوندھی مہک فضا میں پھیل گئی۔

اندھیرا گہرا ہوتا گیا۔

آج دھرتی کی بیقراری دور ہو گئی۔ تب ہی تو خوشی کی خوشبو فضا میں پھیل گئی ہے۔ یکایک شبیہ کے ذہن میں احساس کی ایک لہر دوڑ گئی ــــ مجھ میں اور دھرتی میں کیا فرق ہے ــــ؟ دھرتی بھی تخلیق کی تمنا میں تڑپتی ہے اور میں بھی۔ دھرتی پر بہار کی بوندیں پڑیں ــــ وہ سیراب ہو گئی ــــ اب اس کے جسم اور اس کے سینے کو روندا جائے گا۔ وہ کرب سے کراہ اٹھے گی لیکن اس کرب میں بھی لذت ہے۔ اس لذت میں درد ہے اور بیج جب اس کی کوکھ میں پڑ جائیں گے تو ــــ اس کے سینے سے رس مانگ کر کونپل بنیں گے۔ پھر پودے بنیں گے اور سبز سبز پودوں سے دھرتی لہلہا اٹھے گی ــــ اور پھر اس کے پودے اسے چھپا لیں گے ــــ شبیہ نے انگڑائی لی ــــ کاش اس پر بھی دھرتی جیسا سلوک کیا جاتا ــــ ننھے ہاتھ اس سے جینے کا حق مانگتے اس کے سینے پر ہاتھ مار مار کر وہ اس چھپے ہوئے خزانے سے سیراب ہوتے جس میں زندگی ہوتی ہے ــــ وہ تخلیق کے کرب سے آشنا ہو جاتی۔ کتنا حسین ہوتا ہے کرب۔

تخلیق ـ سب کچھ وہ محسوس کیا کرتی۔ جسے کی [illegible] کا کتنا معنی [illegible] گرم [illegible] ہے ....

بارش تیز ہو چکی تھی [illegible] شبیہ بالکل بھیگ گئی تھی۔ وہ [illegible]

برآمدے میں آ گئی۔

ابھی دو ہی دن قبل کی تو بات ہے ۔ وہ ایسے ہی بھیگ گئی تھی تو ناصر کی لمبی کار کوٹھی میں داخل ہوئی ناصر فوراً کار سے اتر پڑا۔

"ارے تم بھیگ کیوں رہی ہو ــــ ؟" اور اس نے بانہوں کا سہارا دیا اور کمرے میں لے آیا۔

نہانے کا ایسا بھی کیا شوق ہے تم کس قدر نازک ہو ٹھنڈ نہ لگ جائے تو؟ کپڑے تبدیل کر لو ــــ اس نے اس کی مسلسل خاموشی پر کہا۔

اور وہ کپڑے تبدیل کرتے ہوئے سوچنے لگی۔ ناصر کیا تم مرد نہیں ہو ۔میرے شوہر ہوتے ہوئے تم مجھے اس نظر سے کیوں نہیں دیکھتے جس سے ایک مرد ایک عورت کو دیکھتا ہے ۔

شبینہ انھیں خیالوں میں کھڑی تھی ۔ بارش ختم ہو چکی تھی کچھ اجالا سا پھیلنے لگا تھا۔ اس کے بھیگے کپڑے جا بجا سوکھ گئے تھے یکایک اس نے اپنی گردن میں کسی کے سانسوں کی گرمی محسوس کی اس نے پلٹ کر دیکھا شوکت (ناصر کا پرائیوٹ سکریٹری) اس کے بالکل قریب تھا۔

"آج صاحب بزنس کے کسی ضروری کام کے سلسلے میں بمبئی چلے گئے شوکت کہہ رہا تھا۔ شبینہ محسوس کر رہی تھی کہ دھرتی بے حد پیاسی ہے۔ اس کے سر میں آہستہ آہستہ درد ہو رہا تھا۔ شوکت بار بار اسکی مزاج پرسی کر رہا تھا کیونکہ صاحب کا حکم تھا۔ وہ جب بھی آتا اسکے اتنا قریب آ جاتا کہ شمع پگھلنے لگتی ــــ شبینہ سوچتی رہ جاتی کہ شمع پگھل کیوں رہی ہے۔

دن گزرتے رہے دسمبر کی سرد رات میں وہ آتش دان کے قریب بیٹھ کر ناصر کا انتظار کر رہی تھی ناصر حسب دستور کافی رات گئے آیا۔

"اوہ تم جاگ رہی ہو"

"تم سے مجھے کچھ ضروری باتیں بھی کرنی ہیں"

قاعدے کے مطابق وہ بولتا رہا اور شبینہ خاموش رہی۔

کھانے کے بعد ناصر کچھ دیر تک سگریٹ کا کش لیتا رہا۔

"آخر شبینہ نے پوچھ ہی ڈالا آپ کو ضروری باتیں کرنی تھیں۔؟

آں! ہاں: ناصر چونک پڑا۔

"تمھیں معلوم ہے نا میری ماں کی شادی حالات کے ہاتھوں ایک پنچ انسان سے ہو گئی تھی وہ عمر بھر تڑپتی رہیں۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔

میں نے تمھیں جب اس دلدل میں گرتا دیکھا تو بچانا چاہا میری عمر اور تمھاری عمر میں کافی تضاد تھا ــ میں سوائے نکاح کے اور کون سا راستہ اختیار کرتا۔ تاکہ تمھاری حفاظت ہو سکے اور بہت سوچنے کے بعد میں نے یہی کیا۔ اب میں نے تمھارے لئے۔ تمھارے مطابق لڑکا ڈھونڈھ لیا ہے۔ اسے سب کچھ بتا بھی دیا ہے ۔

جانتی ہو کون ؟۔

ڈاکٹر حامد ــــ تم تو اس سے مل بھی چکی ہو۔

میں نے اسے یقین دلایا ہے کہ تم مریم کی طرح پاکیزہ ہو۔ وہ نکاح صرف تمھاری حفاظت کے لئے تھا ــ اور جانتی ہو حامد میری باتوں پر یقین کرتا ہے ۔میں تمھیں طلاق دے کر اس سے بیاہ دوں گا۔

ناصر بولتا جا رہا تھا اور شبینہ کو ساری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی ــــ نہ جانے ناصر اور کیا کیا کہتا رہا لیکن اگر اس نے دوسرے لمحہ سے سنبھال نہ لیا ہوتا تو وہ فرش پر آ رہتی۔

تبصرات

سیرت طیبہ

مولف قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی ــــ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۳۴۴۔ مجلد مع پلاسٹک کور رنگین دیدہ زیب، کتابت طباعت اچھی۔ قیمت صرف دس روپیہ جو موجودہ گرانی کے دور میں نہایت مناسب کہی جا سکتی ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ علمیہ۔ قاضی دائرہ۔ میرٹھ۔

سیرت نبوی پر اردو ایک دو نہیں درجنوں کتب لکھی جا چکی ہیں۔ جن میں شبلیؒ کی سیرت النبی کو سب سے زیادہ شہرت ملی، لیکن وہ اپنی ضخامت اور قیمت کے سبب ہر گھر میں خریدی اور پڑھی نہیں جا سکتی اس لئے سیرت نبوی صلعم پر دوسری چند مختصر اور جامع کتب نسبتاً زیادہ فروخت ہوتی ہیں۔ انھیں کتب میں سیرت طیبہ کا بھی شمار ہے جس کا پہلا ایڈیشن [illegible]ء میں شائع ہوا تھا۔ نیا ایڈیشن جو زیر نظر ہے [illegible]ء میں شائع ہوا ہے۔

مولف نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ابتدا میں اسکی ابتدا یوں ہوئی کہ تاریخ ملت کے نام کے تحت اس کے تین حصے ہائی اسکول طلبہ کے لئے مرتب فرمائے تھے جو اسی اعتبار سے آسان تھے اونچے درجے کے طلبار کے لئے وہ کتابیں مناسب نہ تھیں آپ نے سیرت طیبہ کے نام سے اس کتاب کو مرتب کر کے اس میں اسلام سے پہلے عرب کی حالت پر ایک باب قلمبند کر کے رسالت مآب صلعم کی ولادت باسعادت سے لے کر وفات حسرت آیات تک کے حالات نہایت ہی اختصار لیکن تفصیل کے ساتھ ۱۲ ابواب میں مرتب فرماتے ہیں۔ طرز تحریر شگفتہ اور دلوں میں اتر جانے والا ہے۔ نبی کریم صلعم کے حالات زندگی کا علم حاصل کرنے اور اپنے بچوں کو معلومات بہم پہنچانے کے لئے اس مقدس کتاب کو ضرور حاصل کریں۔

مثنوی مولانائے رومؒ

(دفتر ششم بے خاتمہ)

ترجمہ از مولانا قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی۔ ناشر سب رنگ کتاب گھر دہلی ۶۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ قیمت پچیس روپیہ کتاب کے حسن طباعت، کاغذ اور جلد کے اعتبار سے اس زمانہ میں بہت ہی کم ہے جس کا سبب شاید یہ ہے کہ کتاب حکومت ہند کی وزارت تعلیم و ثقافت کی مدد سے طبع ہوئی، ورنہ گرانی کے اس دور میں ایسی کتاب پچاس روپے میں بھی بکے تو سستی ہے۔

حریم میں مثنوی مولانا رومؒ کے ابتدائی دفاتر پر اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ الحمد للہ کہ یہ چھٹی اور آخری جلد بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ کر شائع ہو گئی، جس کے لئے مولانا قاضی سجاد حسین صاحب مولف و مترجم اور ارباب سب رنگ کتاب گھر دہلی قابل ستائش ہیں۔ ہزاروں کتابیں چھپا کرنے سے صرف چند اگر ایسی شائع کر دی جائیں تو زمانہ انھیں کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔ مثنوی مولانا روم قصص پر مشتمل ہے جو عبرت انگیز اور نصیحت خیز ہیں۔ فارسی کی اس عدیم المثال منظوم کتاب کو سلیس اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کر کے مترجم و مولف نے ایک بہت ہی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، مثنوی کا پورا اسیٹ ہر صاحب ذوق کی لائبریری کی زینت بننا چاہیے۔

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریم کے سالانہ خریداروں کی مرسلہ ہر ماہ صرف ایک ایسی خبر شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی اور غمی سے متعلق ہو۔ خبر صاف صاف اور مختصر سے مختصر الفاظ میں لکھکر پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور ... کے ساتھ اس طرح روانہ کیجائے کہ ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے ورنہ ایک ماہ بعد چھپے گی۔

(ادارہ)

ولادت اطفال

● میرے محترم دوست مختار احمد صاحب لکھنؤ کی صاحبزادی فرزانہ خاتون زوجہ مشتاق حسین سلمہ کے گلشن حیات میں اللہ تعالیٰ نے دوسری بار بتاریخ ۲۰ دسمبر بروز جمعہ بوقت ۱۱ بجے دن ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔ آمین نسیم انہونوی۔

● نیرہ شاہین، سہالہ نسرین (آسیور) ہماری آنٹی ریحانہ تاج اور انکل ثناء الرحمن صاحب کے گلشن حیات میں بروز اتوار بتاریخ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۹ء بوقت شب دس بجکر سترہ منٹ پر ایک کلی مسکرائی۔ نام روبینہ نوشین قرار پایا۔ خدا سے دعا ہے عمر درازہ پائے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

● کے اقبال احمد، کے جمیل احمد، خدیجہ ترنم، صدیقہ شبنم، سعیدہ پروین (آسیور) ہمارے بڑے بھیا بشیر احمد اور بھابی فردوس اختر کے گلشن حیات میں ۱۳ جنوری ۱۹۶۰ء بروز ہفتہ بوقت شام ایک فرزند تولد ہوا۔ نام محمد ابراہیم قرار پایا۔ دعا ہے کہ بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

● آسمہ (چکمنگلور)، ۲۰ جنوری ۱۹۶۰ء بروز جمعہ بوقت سحر پہلی بار میری بھتیجی نسرین بانو اور افضل قریشی کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے ایک پھول کھلایا۔ نام کاشف قرار پایا۔ اللہ پاک اسے نیک و صالح بنائے اور عمر طویل بخشے۔

● نزہت حبیب (جبلپور) میری چچازاد بہن چھوٹی اور بہنوئی چھوٹے صاحب کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے ۱۶ دسمبر ۱۹۵۹ء بروز منگل بوقت ۱۰ بجے صبح ایک ننھی سی کلی کھلائی پیار کا نام جنید اقرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ عمر طویل پائے اور صاحب نصیب ہو۔

● شانو مبین (کلکتہ) میری منجھلی پھوپھی بیگم ثریا شعیب کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹی اور ایک بیٹے کے بعد تیسری بار یوم چہارشنبہ ۳ جنوری ۱۹۶۰ء ایک چاند سا منا عطا فرمایا۔ نام شیراز ربانی رکھا گیا ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نومولود اپنے والدین اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے

● روبینا پروین" میری منجھلی آپا انجم پروین اور نوشے بھائی عبدالرحیم کے چمن حیات میں ۱۰ جنوری ۱۹۶۰ء بروز اتوار اللہ پاک نے ایک گڑیا عطا فرمائی۔ نام نہمیدہ ناہید رکھا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عمر طویل بخشے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

● رابعہ ممتاز (انگول) میرے بھیا محمد شفیق الرب اور بھابی انجم افشاں کے گلشن حیات میں ۲۵ جون بروز اتوار بوقت ۴ بجے صبح اللہ پاک نے ایک ننھی کلی کھلائی۔ نام رقیہ انجم قرار پایا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ بچی اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے اور صاحب نصیب ہو۔

● درسلا طاہرہ بانو (آسیور) میری چاند خالہ عائشہ صدیقہ منگی و انکل عثمان باشاہ کے گلشن حیات میں ۹ جنوری ۱۹۶۰ء بروز منگل بوقت سات بجے صبح اللہ پاک نے ایک گڑیا عطا فرمائی۔ نام آمینہ کوثر رکھا گیا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اپنے والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور فخر خاندان بنے۔

● عابدہ بیگم (چھندوارہ) میری بیٹی شہناز پروین اور داماد عبدالسلام قریشی کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے پہلی بار ۱۰ دسمبر ۱۹۵۹ء بوقت دس بجے ایک چاند سا فرزند عطا فرمایا۔ نام شرجیل اور پیار کا نام باشا قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے۔ نیک اور صالح بنائے

● زبیدہ بتول۔ ذکیہ سلطانہ (آسیور) میری ماموں زاد بہن انیسہ انجم اور بشیر احمد صاحب کے چمن حیات کو پر بہار بناتے ہوئے اللہ پاک نے ۱۵ جنوری ۱۹۶۰ء بروز چہارشنبہ بوقت ۳ ساڑھے بجے صبح پیارا سا ننھا عطا فرمایا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک تمہیں کو دونوں جہان کی شادمانی و کامرانی نصیب کرے۔

● منیرہ شاہین۔ نبالہ نسرین (آسیور) [illegible]

فرزانہ پروین اور عطائی احمد پاشاہ کے گلشن حیات میں ۵ فروری ۱۹۷۹ء بروز پیر دس بجکر دس منٹ پر دن میں ایک کلی مسکرائی۔ نام رومانہ انجم قرار پایا دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پرورش پائے اور شاد و خرم رہے

● نگار پروین (آسیور) میرے ماما خلیل احمد کا نام۔ نانی ام سلمیٰ صاحبہ خریدار حریم کے گلشن حیات میں۔ ۲ فروری ۱۹۷۹ء بروز ہفتہ پہلی بار ایک کلی کھلی۔ نام شازیہ آفرین رکھا گیا۔ دعا ہے کہ یہ کلی میرے ماما مامی کے گھر کو ہمیشہ معطر رکھے۔

پیغامات نشاط

● برادر عزیز چودھری شبیر احمد صاحب گیٹ ملک گنج لکھنؤ کی صاحبزادی سعدیہ سلمہا کی شادی محمد احمد سلمہ (پسر جناب محمد شعیب صاحب لکھنؤ کے ساتھ ۲۵ فروری ۱۹۷۹ء مطابق ۲۷ ربیع الاول ۱۳۹۹ھ کو بمقام بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ میں بوقت ۱۱ بجے دن بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ سعدیہ سلمہا اپنی سسرال میں ہمیشہ سب کی آنکھوں کا تارہ بن کر پر مسرت زندگی گزار دیں۔ آمین۔ نکاح کے بعد شبیر احمد صاحب نے اپنے اعزہ، احباب اور معززین کو شاندار لنچ دیا۔

نسیم انہونوی و عزالہ بیگم

● حریم کی قدیم سرپرست اور پرستار بہن تہذیبہ خانم انصاری زوجہ عبدالعزیز انصاری صاحب کے فرزند دلبند ابو مصلح سلمہ اور دختر نیک اختر نجم الصباح سلمہا کی شادیاں عزیزہ شاہین فاطمہ سلمہا (بنت رفیع الدین قریشی مرحوم) و محمد طاہر خان سلمہ (ابن جمال الدین خان صاحب) کے ساتھ اور بہن طاہرہ بیگم انصاری زوجہ جناب عبدالقدیر انصاری بمبئی کے فرزند ابوالاعجاز سلمہ و دختر نیک اختر فوزیہ سلمہا کی شادیاں رخشندہ سلمہا (بنت منظور احمد خان صاحب) و مرزا سرور بیگ (فرزند مرزا معین الدین بیگ صاحب وکیل) کے ساتھ بالترتیب ۹ فروری ۱۹۷۹ء کو بعد مغرب بمقام صابو صدیق اسکول میدان دہانی کلہ بمبئی میں بحسن و خوبی انجام پائیں۔ اس موقع پر بمبئی کے صدہا معززین گھرانوں کی خواتین اور افراد نے شرکت کی۔ اللہ پاک چاروں جوڑیوں کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

نسیم انہونوی و عزالہ بیگم

● [illegible] صاحب [illegible] کی دختر نیک اختر [illegible] خاتون سلمہا کی شادی [illegible] سلمہ [illegible] صاحب لکھنؤ کے

ساتھ ۳ فروری ۱۹۷۹ء کی شب میں بمقام حضرت گنج لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک یہ شادی مبارک کرے۔ نسیم انہونوی

● ذوالفقار علی (آسیور) میری خالہ جان عزیزہ کوثر (بنت تولے عبدالہادی صاحب مرحوم) کا عقد نکاح چچا عبدالرزاق صاحب کے ساتھ بروز اتوار بتاریخ ۱۱ فروری بوقت ۱۰ بجے دن بمقام جامع مسجد بحسن و خوبی انجام پایا۔ بارگاہ الٰہی میں دعا ہے کہ دولہا دلہن ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

● خورشید شفیع (شموگہ) ہماری سالی رفعت شبینہ (دختر نیک اختر جناب محمد اسماعیل عرف بابا) کی شادی محمد فیض اللہ عرف سلیم کے ساتھ ۲۵ فروری ۱۹۷۹ء بروز اتوار ملت ایجوکیشن سوسائٹی شموگہ میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ بہن بہنوئی دونوں کو مبارک ہو۔

● محمد عالم صاحب کی صاحبزادی فاطمہ سلمہ کی شادی ابن ایم اکبر حیات قادری۔ گامگار پیلس۔ بکری براواں۔ نوادہ) کے ساتھ ۳ فروری ۱۹۷۹ء کی شام کو خانقاہ بہار شریف میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم انہونوی

● صوفیہ خاتون (کانپور) میری بھتیجی نجم السحر سلمہا (دختر جمیل احمد صاحب) کی شادی فیروز عالم صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی (پسر جناب ڈاکٹر عبید اللہ صاحب) کے ساتھ ۴ مارچ ۱۹۷۹ء بروز یکشنبہ بفضل تعالیٰ خیر و خوبی کے ساتھ حلیم مسلم ڈگری کالج کانپور میں انجام پائی۔

● ڈاکٹر حامد احمد صاحب (گیا) کی صاحبزادی طلعت صاحبہ کی شادی ابرار سلمہ (فرزند دلبند جناب مقبول حسن صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی ایس۔ پی۔ رانچی) کے ساتھ ۲۵ فروری ۱۹۷۹ء کی شام کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم انہونوی

● میرے محترم دوست و کرم فرما جناب مختار احمد صاحب ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پی۔ ایم۔ جی آفس لکھنؤ کے فرزند دلبند عزیزی شکیل احمد سلمہ کی شادی ثریا مظفر سلمہا (بنت سید مظفر حسین صاحب کراچی) کے ساتھ [illegible] بوقت [illegible] بحسن و خوبی انجام پائی۔ [illegible] مختار صاحب نے ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ اللہ پاک دولہا دلہن کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔ آمین۔

انتقال پرملال کی خبریں

● نہایت افسوس کے ساتھ بھائی عطاء الرحمٰن صاحب پٹنہ نے یہ خبر تحریر کی ہے کہ ان کے بھائی حکیم ضیاء الرحمٰن صاحب انچارج طبی (یونانی) دواخانہ مدھیپور ضلع سہرسا) قلبی دورہ پڑنے سے ۱۹؍جنوری ۷۹ء کو اچانک رحلت فرما گئے۔ پس ماندگان میں پانچ لڑکے اور مرحوم کی بیوہ ہیں۔ حکیم صاحب مرحوم عرصہ سے ضیق النفس میں مبتلا تھے۔ عطاء الرحمٰن صاحب ریٹائرڈ ایگزیکیوٹیو انجینیر صاحب کے صاحبزادے خورشید سلمہ کی شادی میں میں پٹنہ گیا تھا زیادہ تر میں مرحوم ہی کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ اس لئے کہ ہم دونوں ہی سانس کے مریض تھے۔ ان کی عمر انتقال کے وقت ۵۸ سال تھی۔ لیکن کافی ضعیف نظر آتے تھے۔ اللہ مغفرت کرے اور مرحوم کے تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ نسیم انہونوی۔

● عائشہ حامد (اوٹاکمنڈ) افسوس کہ میری چاچی حوا بائی صاحبہ ۱۶؍جنوری ۷۹ء بروز منگل بوقت ڈیڑھ بجے بچوں کو روتا تڑپتا چھوڑ کر انتقال فرما گئیں اور اس کے تین ہی روز بعد یعنی جمعرات کی شب میں ایک بجے ہماری پیاری دادی اماں جیانی فاطمہ بائی صاحبہ ہم سب کو چھوڑ کر دار فانی سے رحلت فرما گئیں۔ اللہ پاک ہم سب کو صبر دے اور مرحومین کو جنت میں جگہ دے۔

● نشاط سلیم (دربھنگہ) بہت افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ ہمارے چچا محترم جو ہمارے خسر بھی تھے ۵؍دسمبر ۷۸ء بوقت ۹ بجے صبح اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم گذشتہ دو سال سے ذہنی و جسمانی پریشانی میں مبتلا تھے۔ والدین کے انتقال کے بعد چچا مرحوم کا سایہ عاطفت اس طرح قائم رہا کہ ہم نے اب اپنے تئیں یتیم سمجھا۔ اللہ پاک ہمیں صبر دے اور چچا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

● شمس النساء بیگم (کلکتہ) افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میری عزیز بہن نیازیہ بیگم خریدار حریم، درد شکم میں مبتلا ہو کر اسپتال میں داخل ہوگئیں آپریشن ہوا اور اس کے تین روز بعد صبح ان پر بے ہوشی طاری ہوگئی اور اسی حالت میں ۳۰؍جنوری ۷۹ء کی صبح اپنے والدین اور بہن بھائیوں کو روتا تڑپتا چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہوگئی۔ مرحومہ بڑی سلیقہ مند، ملنسار اور خلیق تھیں۔ ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہر آنکھ اس جوانامرگی پر اشکبار تھی۔ اللہ سے دعا ہے کہ میری بہن کو جنت میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر کرنے کی طاقت عطا فرمائے (خبر پڑھ کر میرا دل بھر آیا۔ آنکھیں نم ہوگئیں۔ متعلقین کا کیا حال ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ اپنی اس عزیز بھانجی کے انتقال کا مجھے بے حد افسوس ہوا۔ نسیم انہونوی۔

● صفیہ یعقوب (اوٹی) بڑے ہی افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میری دادی اماں جیانی فاطمہ بائی صاحبہ ۱۸؍جنوری ۷۹ء بروز جمعرات بوقت ایک بجے شب اس دار فانی سے رحلت فرما گئیں اللہ پاک انھیں جنت میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

یاد ماضی

یکم فروری ۷۸ء کو فریدہ واجد فریدہ صاحبہ کی پانچ سالہ لڑکی قدسیہ سرور اسکول سے گھر آتے ہوئے لاری سے کچل کر موقع پر ہی ہلاک ہوگئی۔ اس کے تاثر نے بہن فریدہ واجد سے یہ چند شعر کہلائے ہیں۔ نسیم انہونوی۔

پھر مرے دل میں یہ کیسا درد پیدا ہوگیا
پھر مجھے بیٹھے بٹھائے آج یہ کیا ہوگیا
جسم مرا پھنک رہا ہے کیسا ہے یہ سوز غم
اشک خوں برسا رہی ہے کیوں مری یہ چشم نم
پھر میری نظروں میں ہے تاریک دنیا آج کیوں
پھر رہی وقف الم میری تمنا آج کیوں
اور کب تک مامتا کی یہ محبت کا جنوں
کب تلک تجھکو جلائے گا یہ سوز اندروں
کوندتی آتی نظر ہیں چار جانب بجلیاں
آسماں ہے یا کہ ہے یہ میری آہوں کا دھواں
یاد ماضی یا خدا میرے لئے ہے اک عذاب
حافظے سے چھین لے یا پھر تو دے سینے کی تاب
اے فریدہ کیا ہوا کیوں غیر حالت ہوگئی
قدسیہ کی یاد کیا آئی قیامت ہوگئی

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ صرف ایک ایسا شعر شائع کیا جاتا ہے جو ہمارے عنوان کے تحت ہو۔ موزوں سنجیدہ اور معیاری ہو۔ اپریل کے لئے عنوان ہے گرہ اور مئی کے لئے "رفتار"

کانٹے بھی ہم سمیٹیں گے گلشن کے باغباں
ہم وہ نہیں کہ پھول چنے اور نکل گئے

مرسلہ رعنا کوثر (چین پٹن)

مری حیات میں کانٹے بکھیرنے والے
خدا کرے تری پھولوں پہ زندگی گذرے

(مرسلہ :۔ بی عظمت ترنم (رامپور)

مری راہوں میں کانٹے ہیں میری منزل ہے شعلوں میں
کوئی کیوں باندھتا ہے اپنا دامن میرے دامن سے

مرسلہ :۔ باجرہ نسرین لاری (کانپور)

کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیئے
کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیئے

مرسلہ :۔ شاہدہ خاتون (بلسیا بیگو سرائے)

یہی کانٹے تو کچھ خود دار ہیں صحن گلستاں میں
کہ شبنم کے لئے دامن کو پھیلایا نہیں کرتے

مرسلہ :۔ زرینہ حبیب (بستی)

ظرف کی بات ہے کانٹوں کی خلش دل میں لئے
لوگ ملتے ہیں تر و تازہ گلابوں کی طرح

مرسلہ :۔ زہیدہ فضلی (رامپور)

آبلہ پا ہوں چارہ گری کے لئے
مری راہوں میں کانٹے بچھا دیجئے

مرسلہ :۔ رضوانہ صدیقی (کانپور)

کانٹے بھی ہم سمیٹیں گے گلشن کے باغباں
ہم وہ نہیں کہ پھول چنے اور نکل گئے

مرسلہ :۔ عرانہ عراقی (سرودی گراگاؤں)

اپنی تقدیر میں اسے دوست نہیں گل چینی
چمن، راہوں، کہسار و بیاباں کانٹے

مرسلہ :۔ فریدہ حسن (دربوگھر سنتھال پرگنہ)

اللہ اللہ کیا جگہ ہے دیار رسول بھی
کانٹے بھی جس جگہ کے پیارے ہیں پھول بھی

مرسلہ : مس شاہدہ بانو (رحیم آباد سمستی پور

زندگی کی راہ میں کانٹے بھی ہیں پتھر بھی ہیں
ان ہی میں سے تم گزر جاؤ تو کوئی بات ہو

مرسلہ :۔ شاذیہ بخاری (   )

کانٹے بھی چمن کی زینت ہیں کانٹوں سے یہ نفرت کیا معنی
اے باغ کے مالی ہوش میں آ۔ تو ہین بہاراں ہوتی ہے

مرسلہ :۔ زبیدہ بتول (رامپور)

مرسلہ :۔ گورسے نیلوفر نسرین (جبلپور)

ہر چند راستے میں کتنے کانٹے بچھے ہوئے
جس کو تری طلب تھی گزرتا چلا گیا

مرسلہ :۔ نسیم عزیز (رہری پورہ بھاگلپور)

نوٹ :۔ بار بار لکھنے کے باوجود اکثر بہنیں اشعار اس طرح روانہ کرتی ہیں کہ دفتر میں ۲۰ ر کے بعد پہنچتے ہیں اور شائع نہیں ہو پاتے۔ اکثر بہنیں ناموزوں اشعار لکھ دیتی ہیں اس لئے شائع نہیں ہو پاتے اکثر بہنوں نے کانٹے کے بجائے کانٹوں پر اشعار بھیجے تھے جو شائع نہ کیے جا سکے۔ (ادارہ)

وجہ تاخیر

فروری کا حریم ۱۵ ر کے بجائے ۲۳ ر کو روانا ہو سکا۔ اس لئے کہ جس پریس میں حریم چھپتا ہے اسمیں ڈی۔ سی۔ بجلی ہے اور یہ بجلی روزانہ ایک دو گھنٹے سے زائد کے لیے نہیں آتی۔ حکومت چاہتی ہے کہ پریشان ہوکر لوگ اے۔ سی۔ بجلی حاصل کریں اسی باعث پرچے اب بروقت مشکل ہی سے نکل سکتے ہیں۔ (ادارہ)

پہلا
جلدی
نہیں
دوسرا
ابھی
نہیں
تیسرا
کبھی
نہیں
مستقبل میں
ماں اور باپ بننے
والوں کے لیے
نیک مشورہ
اپنے نزدیکی فیملی پلاننگ سینٹر، پرائمری ہیلتھ سینٹر
یا گرام سواستھ سہائک سے جو آپ کو ضروری
صلاح اور ساز و سامان فراہم کرسکتے ہیں
آج ہی رابطہ قائم کیجیے
76/514

"یہ آپ کہہ رہی ہیں تعجب ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ سب ہی ایک طرف سے اس کے مؤید اور میرے مخالف ہیں۔ آپا افسوس ہے کہ آپ نے اسلاف کے سنہرے اصول فراموش کر دیے ہیں۔ کیا یہ بات گناہ ہے۔ جس کے لیے میں بضد ہوں"

"تم تم ہو۔ اور وہ۔ وہ۔ ابھی کچے ذہن کا لڑکا ہے" آپا گڑگڑائیں۔

"کچھ نہیں۔ یہ سب بیکار ہے تاویلیں ہیں" شعیب صاحب نے کہا "کہنا زمانے کی باتیں۔ وہ مسلمان ہے۔ جسے فطری طور پر مذہبی ارکان مذہبی فرائض معلوم ہوتے ہیں"

ان کے جانے کے بعد سب لوگ بلند آواز میں گفتگو کرنے لگے۔

صالحہ بیگم نے گلوگیر لہجے میں کہا "آپ نے دیکھا آپا کہ وہ لیے دے کے بس مجھ ہی پر اڑ پڑتے ہیں۔ الٹی مت فرو ان کی ہے کہ خواہ مخواہ لڑکے کے گلے پر چھری پھیر رہے ہیں۔ اسے مجبور کر رہے ہیں اور الزام مجھ پر ہے کہ میں اسے سمجھاتی نہیں۔ ارے کوئی لڑکا آج کل کے زمانے میں ایسی باتیں سمجھتا بھی ہے! میں نے اسے بہکایا ہو تو مجھ پر بجلی گرے"

"ارے کیا فضول باتوں پر آپ آنسو بہاتی ہیں امی" کفیل نے کہا "اب تو جو کچھ ہونا ہے وہ ضرور ہو گا۔ کیونکہ رقم بہر حال خان صاحب کو روانہ کی جائے گی۔ تھوڑی سی ایزد کی قربانی کی۔ ابا جان دے ہی چکے ہیں۔ لہٰذا اب دعا کیجئے کہ سب کام بخیر انشاءاللہ اچھے ہوں۔ اور بس۔ آپ نہ ابا جان سے بحث کر سکتی ہیں نہ ایزد کو سمجھا سکتی ہیں"

"امی اگر فرمائیے تو ہم بھی رخصت ہوں" خرم نے پوچھا "چار روز ہو چکے یہاں آئے ہوئے"

"واہ میاں" آپا ذاکرہ بولیں "ابھی سے کیا رخصت ہو گے۔ گھر کی حالت دیکھ رہے ہو۔ تم سے بڑی مضبوطی ہے۔ کل شاید ناہید جائے خان صاحب کے یہاں۔ نگار کا ساتھ جانا ضروری ہے۔ ہفتہ بھر اور یہیں رہو۔ کیا حرج ہے"

"ہاں یار۔ آفس وہاں سے بھی جاتا ہے۔ آفس یہاں سے بھی جاتا ہے" کفیل نے کہا۔ "کیا میں نگار تم لے کے جاؤں گی؟" ناہید نے بے مروتی سے [illegible] اچھا۔

"نہیں ابا جی۔ خدا کی قسمت۔ لیکن وہ سسرال والوں میں سبک تو نہ ہو گی۔ کوئی اسے طعنہ تو نہ دے گا کہ اس کے باپ نے نامناسب شرط لگا کر اسے زبردستی اس گھر میں ڈھکیلا ہے"

"تو پھر تم کوشش کرو کہ اپنے گھر میں اس کا انتظام ہو جائے"

"ہاں ابا جی۔ یہ ٹھیک ہے"

"تو پھر میں لکھ دوں گا۔!"

"ابھی کیوں نہ لکھ دیجئے"

"دس پندرہ منٹ کر سیدھی کروں بیٹی۔ بیٹھے تختہ ہو رہی ہے۔ اس کے وہ حکیم صاحب کے پاس جاتے آتے بہت تھک گیا ہوں"

"ہاں لیجئے۔ میں کہنا بھول گئی" آمنہ نے کہا "ہماری اماں جان کا خیال تھا کہ آپ کا پرشن کرا لیجئے۔ اس سے بھی اکثر فائدہ ہوتا ہے"

"میں بھی یہی سوچتا ہوں"

"کیا دوا ہے آپ کی۔ لائیے میں کھلا دوں"

"اب تم اپنے گھر جا رہی ہو!"

"کیا ابھی بات ہے شوہر کو حرارت ہو رہی ہے۔ میں جب آئی ہوں تب سو رہا تھا۔ اب جاگ گیا ہو گا۔ ۔ ۔ میں پھر آؤں گی۔ ابا جی۔ مگر آپ انہیں خط ضرور لکھ دیجئے۔ اور سوچ بچار کے مجھ پر کسی قسم کا بار مت ڈالیے۔ جو کچھ ہو گا۔ اچھا ہی ہو گا"

خان صاحب نے ایک لمبی آہ بھری۔ اور کچھ نہ بولے۔

آمنہ چلتے چلتے بولی "میرے خیال میں ابا جی۔ خدا سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہیں کیوں کاٹ" (باقی آئندہ)

"بھابی! آپ کے لیے ایک بہترین چانس ہے۔" خرم نے کہا۔ "پچھتر ہزار آپ کے ہاتھ میں آ رہے ہیں۔ بس اطمینان سے کسی اچھی جگہ کا ٹکٹ کٹا لیجئے۔ یہ کفیل صاحب آپ کو کہاں سے رہے ہیں!"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔ خرم بھیا۔" نامیہ نے ان کی بات ان سنی کر کے کچھ اور کہنا چاہا تھا مگر خرم نے شرارت سے مسکرا کر سنجیدگی سے کہا۔

"ڈر کی کوئی بات نہیں۔ آپ فرمائیے تو میں ساتھ چلوں۔ جہاں آپ چلیں۔"

"توبہ اللہ۔ میں یہ نہیں کہہ رہی تھی۔" نامیہ نے کہا۔ "میں تو اس لیے ڈر رہی ہوں کہ بھلا میں کیسے رقم لے جا کے دوں گی انہیں۔"

"رقم دینا نہیں ہے۔ بھابی۔" خرم نے کہا۔ "یہ کہیے کہ رقم دے مارنا ہے ان کے منہ پر۔"

"میں تو ہرگز نہیں جاؤں گی۔" صالحہ بیگم خفا تھیں۔ "وہ جانیں ان کا کام جانے۔ اب میں تماشہ دیکھوں گی۔ باپ بیٹے کا اور گھر کا۔"

"میں دے آؤں گی۔ واہ۔ یہ کون سا بڑا کام ہے۔" آپا ذاکرہ نے کہا۔

"پھر بھی اماں۔ وہ پانچ ہزار دبالیں گے اور کہہ دیں گے کہ آپ نے رکھ لیے۔ تو پھر یہ کہاں سے لائیں گی آپ۔" خرم نے کہا۔

"واہ کیا مجھے گنتی نہیں آتی۔" آپا نے برا مانا۔ "پچھتر تک۔"

"جی نہیں۔ پچھتر ہزار تک۔" کفیل نے کہا۔

"[illegible] نہیں دے آتے۔" نامیہ نے کفیل سے کہا۔

"میں ان کا محرم ہے آج تک نہیں ہوں۔" کفیل بولے۔

"اور میں تو شاید وہ ڈر ہی رہی ہوں۔" نامیہ نے خفا ہو کر کہا۔

"میں دے آتا ہوں۔" شارق بولا۔ "اور ایک زبردست جھاڑ بھی پلاتے آتا ہوں کہ یاد کریں خان صاحب کے بچے بھی اور تھی!"

چاہے جو بھی کہو۔!"

"اب رقم انہیں واپس کر دیجئے۔"

"یہ تو میں سوچ بیٹھا ہوں کہ رقم میں حنا کے بیاہ کی [illegible]

شعیب صاحب کو بالا بالا یہ رقم واپس مل جائے گی۔"

"تو کیا اب طے ہو چکی حنا کی شادی کی تاریخ؟" آمنہ نے پوچھا۔ "تاریخ لینے وہ لوگ آئے تھے؟"

"یہ تو پھر شعیب صاحب نے چھوڑ دیا ہے۔" خان صاحب بولے۔ "جب چاہیں تاریخ مقرر کر کے انہیں اطلاع دے دوں۔"

"تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"یہ تمام باتیں تم سے کہہ کر رائے طلب کرنے والا تھا۔"

"میری رائے یہ ہے ابا جی کہ آپ کے رقم لینے کے بعد لڑکی کے لیے کہنا نہایت عیب اور ہلکے پن کی بات ہے۔ آپ لکھ دیجئے شعیب صاحب کو۔ حنا کی بات آپ نے کبھی اور پکی کر دی ہے۔"

"پھر حنا کا کیا ہوگا؟ فرض کرو کہ میں ختم ہو جاؤں [illegible]

ابا جی کیسے وہم کرتے ہیں آپ! خدانخواستہ کیوں آپ [illegible] لگے؟ اگر اللہ نہ کرے تقدیر میں یہی ہے تو ہم ابھی زندہ ہیں۔ آپ نے پہلے [illegible] یا کہ ہم حنا اور خود کو یوں ہی بے سر و سامان چھوڑ دیں گے۔ یا بھائی جان کے حوالے دیں گے کہ لیجئے اب اس سے برتن منجھائیے۔"

"تو پھر اب تم کیا کہتی ہو؟"

"لکھ دیجئے شعیب صاحب کو۔ ہم نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔"

"یہ سوچا اور [illegible] کہ حنا کو اس گھر کا سا گھر پھر نہ ملے گا۔"

اب کیا ہے: وہ جھلا کر مڑا۔

کل اماں اور بھابی باورچی خانے میں بیٹھ کر آپ کی باتیں کر رہی تھیں۔ وہ میں نے سنی ہیں: زیتون نے قابلیت بگھاری۔

کیا باتیں کر رہی تھیں؟:

آپ کی شادی کی۔ ہی ہی ہی۔

دانت بند کر۔"

وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ ایزد اسے گھورتا ہوا بولا۔ اب یہ بتا کہ باتیں کیا تھیں:

زیتون نے ڈرتے ڈرتے کہا: میں نے ساری باتیں نہیں سنیں۔ آپ پہلے سے کہہ دیتے تو میں جی لگا کے سنتی اور سب کہہ دیتی! میں نے صرف یہ سنا کہ اماں کہہ رہی تھیں بڑے صاحب آپ کو اپنی ضد پر قربان کر رہے ہیں اور بھابی بولیں کہ ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنے بھیا کی بچی سے آپ کی نسبت لگائیں۔ مگر اب آپ کی شادی خان صاحب کی لڑکی سے ہو جائے گی:

ہچھ: ایزد پھنکارا:

چھوٹے بھیا، بڑے صاحب نے اتنے بہت سارے روپے اماں کو دیے تھے:

"اب تم بھاگ جاؤ:"

زیتون بھاگ آئی۔

ایزد کی نظریں سڑک پر تھیں اور دماغ کہیں اور تھا۔

اسے بری طرح یاد آ رہا تھا کہ کس طرح اس نے ایک لڑکی سے زک اٹھائی تھی۔ اور اب بھی بدلے اور انتقام کا خیال اسے اکسا رہا تھا کہ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔

چند گھنٹے پہلے اس پر آوازے کسے گئے تھے۔ آخر وہ کیوں اس قدر ذلیل ہو رہا تھا۔

وہ اپنے دل و دماغ پر قابو کیوں نہیں رکھ سکتا!۔

کیا ہوا اگر ان کا بچہ بھی ہے: رعنا بولی۔

اچھا بس۔ لڑکیاں یاپاں پر پڑھا نہیں کرتیں: نگار نے ڈانٹ دیا۔ وہ منہ بنا کر رہ گئیں۔ گھر پہونچنے تک وہ حنا ہی کے سلسلے میں گفتگو کرتی رہیں۔

آمنہ مہمانوں کے جانے کے بعد پھر خان صاحب کے پاس آ گئی۔ وہ اب کرادر ہے تھے۔

ابا جی۔ کیا درد بڑھ گیا ہے: اس نے پوچھا۔ اور پھر چہرے سے ڈاڑھی کو دیکھنے لگی۔

اب یہ درد جان لے کے ٹلے تو بھلے ترا آ سکے بیٹی: وہ اچانک رونے لگے۔ آمنہ سراسیمہ ہو گئی۔

کیا بات ہے ابا جی: اس نے اپنے آنچل سے باپ کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بھی گلوگیر ہو گئی: آپ کچھ بیمار ہے ہیں لگ سے۔؟"

"میرا ضمیر مجھ سے کہہ رہا ہے۔ بیٹی میں بہت بڑی کینگی کا مرتکب ہوا ہوں: انھوں نے بھاری آواز میں کہا اور پھر دوبارہ آمنہ کے استفسار پر من وعن سارے حالات اس سے کہہ دیئے۔

داستان کے ختم پر آمنہ نے اپنے جذبات دبا کر کہا: مگر ابا جی یہ بات کچھ ایسی نہیں ہوئی۔ آپ کی پوزیشن اتنی اچھی ہے۔ شعیب صاحب بھی نیک نام آدمی ہیں۔ آپ دونوں دوست کہلا رہے ہیں۔ انھوں نے آپ کے اس مطالبہ پر آپ کے متعلق کیا سوچا ہوگا۔ حنا کی شادی آج نہیں تو کل کہیں نہ کہیں ہو ہی رہتی:

کیسے ہو رہتی۔ آمنہ: خان صاحب نے کراہتے ہوئے لہجے میں کہا: تم اپنے گھر میں رہتی ہو تمھیں کیا خبر کہ میں اس سلسلہ میں کیا کچھ کرتا رہتا ہوں۔ خاندان والوں نے حنا کو جتنی باتیں سنائی ہیں وہ تم سے پوشیدہ نہیں۔ اسلم کے والدین نے اسے بزقدم منحوس، نامبارک کہہ کے ذلت سے نکال باہر کیا۔ حتیٰ کہ اپنے مرحوم لڑکے کی نشانی تک اپنے گھر میں رکھنا گوارا نہ کی ان دو سال کے عرصہ میں یہ تک نہیں پوچھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا:

The Hareem Lucknow Mar. 1979 ([illegible] : 44559-45334) Regd. No. LW/NP 32

نسیم انہونوی

Price/-12

THE HAREEM
Apr.79
Rs. 1/-
ایڈیٹر

لمعات

یو۔این۔آئی کی ایک خبر حال ہی میں ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوئی ہے، جس کا عنوان ہے "ایران میں عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق" اور خبر کے متن کا یہ ٹکڑا قابل غور ہے۔

"مسٹر آیت اللہ روح اللہ خمینی نے آج کروروں ایرانی عورتوں کے دلوں میں پیدا شدہ دہشت کو دور کرنے کے لئے یہ اعلان کیا ہے کہ اسلامی جمہوریہ میں بھی عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے مسٹر خمینی نے مزید کہا کہ اسلام اس بات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ خواتین بھی مردوں کی طرح تمام معاملات میں حصہ لیں۔"

ہمیں خمینی صاحب کا یہ اعلان پڑھ کر حیرت ہورہی ہے۔ یا تو یہ خبر ہی غلط ہے یا پھر ہم اس اعلان کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہیں اس لئے کہ جہاں تک میں نے اسلامی لٹریچر اور تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اس میں اسلام نے اس طرح کی حوصلہ افزائی عورتوں کی کہیں نہیں کی ہے کہ خواتین بھی مردوں کی طرح تمام معاملات میں حصہ لیں۔ رسول خدا صلعم کے دور حیات میں بس یہی ایک مثال ملتی ہے کہ بعض جنگوں میں خواتین نے نرس کی حیثیت سے کام کیا ہے یا بعض حالات میں دشمنوں پر ڈنڈے برسائے ہیں۔ لیکن یہ واقعات بھی ان جنگوں کے ہیں جب مسلمانوں کی تعداد بہت محدود تھی اور انھیں غیر معمولی تعداد کے دشمنوں سے جنگ کرنا پڑتی تھی۔ بعد میں یہ صورتیں بھی تاریخ کے صفحات میں نظر نہیں آتیں۔ مردوں کی طرح کے تمام معاملات میں حصہ لینے کی حوصلہ افزائی ہمیں تو کہیں نظر نہیں آتی۔ مردوں کی طرح کے معاملات کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ عورتیں [illegible] بنیں، [illegible] بنیں، کلرک بنیں۔ اسٹینو بنیں، پولیس میں بھرتی ہوں۔ پائلٹ بنیں۔ موٹر ڈرائیونگ کریں۔ انجینیر بنیں۔ ڈاکٹر بنیں اور اسی طرح کے تمام دیگر مشاغل میں حصہ لیں۔۔۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ خمینی صاحب تو بے پردگی کے سخت خلاف ہیں [illegible] شاہ ایران کو معزول کرانے کے سلسلے میں ایک زبردست حربہ بنایا تھا انھوں نے ۔۔ اور یہ ساری ہی باتیں بے پردگی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ بے پردگی کے ان کے خلاف کی بات ڈھکی چھپی نہیں۔ حال ہی میں ایک خبر آئی ہے کہ ایک لاکھ پڑھی لکھی خواتین نے مظاہرہ کرتے ہوئے نعرہ لگایا ہے کہ ہم پردہ نہیں کریں گے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح کی مساوات خمینی صاحب عورتوں کو کیسے دے سکیں گے۔ اسلام نے جس مساوات کا اعلان کیا ہے وہ تو ایسی کہی جا سکتی ہے۔ جیسے کسی شخص کی جائداد میں کھیت و باغات بھی ہوں اور عمارتیں بھی۔ اس کے دو لڑکے ہوں، ایک کو کھیتی و باغبانی سے دلچسپی ہو اور دوسرے کو تعمیری انجینیری سے اور وہ اپنی جائداد اس طرح تقسیم کردے کہ کھیت و باغ، کھیتی و باغبانی سے دلچسپی رکھنے والے کو دے، اور عمارتیں اس کو جسے انجینیری سے دلچسپی ہو۔

اللہ پاک نے عورت و مرد کو مختلف صلاحیتیں بخشی ہیں اور انھیں صلاحیتوں کے تحت ان کے فرائض بھی تفویض کیے ہیں۔ مرد چونکہ قوی رکھتا ہے کہ نڈر ہو کر باہر نکل سکتا ہے اور مختلف کاموں میں لگ کر دولت پیدا کرتا ہے تاکہ اسے بیوی کے حوالے کردے اور بیوی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر گھریلو فرائض سے عہدہ برآ ہو۔ مرد باہر کی دنیا کا بادشاہ ہے اور عورت گھر کی ملکہ۔ اس طرح دونوں کو حکمرانیاں بخشی ہیں۔ اکثر لوگ شکوہ کرتے ہیں کہ مرد عورتوں کو گھروں میں قید کر کے ان پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ بلاشبہ ایسے مرد بھی ہیں بلکہ بکثرت ہیں، لیکن ایسی عورتیں بھی ہمیں نظر آتی ہیں جو اپنے گھریلو زندگی سے متعلق فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی برتتی ہیں۔ مانتا ہوں کہ ان کی تعداد کثیر نہیں قلیل ہوتی ہے، لیکن ہوتی ہے۔ یہاں پر ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے احکام کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا اس نے کسی موقع پر بھی عورت پر ظلم کرنے کی ہدایت کی ہے۔ لہٰذا اس وقت تک کہ عورت اپنی صنف [illegible] کو مرد کی [illegible]۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ [illegible] اور [illegible] ہوں ہے یہ

چاہیے کہ وہ اپنی عفت و عصمت کو اس کی امانت سمجھ کر اس کی حفاظت کریں۔ مجھے کہیں یہ نہیں نظر آیا کہ [illegible] کی اجازت [illegible] وہ آوارہ گردی کرتا پھرے۔ [illegible] کے تحت ایسی ناشائستہ حرکتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس [illegible] روکنے کے لئے اسلام نے دو قوانین بنائے جو بڑی حد تک اس کا سدِ باب کر سکتے ہیں۔ ایک پردہ دوسرے زناکاری کی عبرت انگیز سزا۔ لیکن افسوس کہ سزا کا قانون تو صرف اسلامی شرعی حکومت میں ہی بن سکتا ہے۔ اس لئے اس کا نفاذ تو ہو نہیں سکتا، البتہ پردہ کیا جا سکتا ہے اور وہ بڑی حد تک معاشرہ کو پاکیزہ رکھ سکتا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے ہم مسلم خواتین کو مشورہ اس لئے نہیں دیتے کہ اس سے مردوں کی آوارگی کا سدِ باب ہو جائے گا، بلکہ اس لئے پردہ کرنے کو کہتے ہیں کہ اس سے وہ اپنے تئیں مردوں کے شر و فساد سے بڑی حد تک بچا سکتی ہیں۔ لیکن یہ مشورہ انھیں کے لئے ہو سکتا ہے جو عفت و عصمت کی اہمیت کا اندازہ رکھتی ہوں۔ ان کے لئے مطلق نہیں جو اس کی قدر و قیمت مغربی خواتین کی طرح نظروں سے گرا چکی ہیں۔

ایک بھانجی کا خط ـــــ بمبئی کی ایک بھانجی صاحبہ نے ایک خط بلا نام و پتہ مجھے لکھا ہے۔ نام و پتہ نہ دینے سے ہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کے دل میں چور ہے اور جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس کے غلط ہونے میں انھیں بھی شبہ ہے، خط فضل امام ملک صاحب کے افسانے "ایک بھتاوت" پر ایک طرح کی تنقید ہے۔ "مصنف نے افسانہ اپنی عقل کو طاق پر رکھ کر لکھا ہے۔ شاید انھوں نے اپنا ہی کوئی تجربہ بیان کیا ہے" ۔۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ساری دنیا کی عورتیں ویسی ہی ہیں، جیسا انھوں نے اپنی کہانی میں خاکہ کھینچا ہے بے پردہ عورت کا۔ شاید بیچارے آجکل کی دنیا میں نہیں جی رہے ہیں۔ صدیقی چچا کی بیوی پردے کی رو بہی رہتیں تو بھی وہی گل کھلا سکتی تھیں۔ میں پردے کی مخالفت نہیں کرتی۔ مگر کوئی دوسروں پر اپنے خیالات کیوں لادے۔ انسان اپنے اعمال کا خود مالک ہوتا ہے۔ کسی کی نیکی سے دوسرے کو جنت نہیں مل سکتی۔

ماموں جان! آخر میں آپ سے کہنا یہ ہے کہ آپ کو بھی بے پردہ والیاں کھیلوں اور [illegible] میں ناچتی نظر آتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایسے ٹھکانوں پر جاتے کیوں ہیں [illegible] کیا

صورت [illegible] ہے جہاں بے پردہ لڑکیاں شرمناک کام کرتی نظر آتی ہیں۔ [illegible] نہیں خواتین بھی بے پردہ رہ کر شریفانہ زندگی [illegible] رہی ہیں۔

آپ [illegible] صرف [illegible] لوگ [illegible] سڑک پر آنکھیں کھول کر [illegible] نظر آجاتا ہوگا کہ ان لڑکیوں پر زیادہ جملے یا غالباً مطلب آوازے چھوڑے جاتے ہیں جو پردہ دار ہوتی ہیں۔ آپ اس جگہ یہ ضرور فرمائیں گے کہ لوگوں کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہاں میں ان بہنوں سے معافی مانگ لینا چاہتی ہوں جو پردہ کرتی ہیں۔ مجھے صرف اسی وقت برا لگتا ہے جب پردہ مردوں کی طرف سے زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"

پیاری بھانجی: تمہارے خط سے صاف ظاہر ہے کہ تم پردہ پسند نہیں کرتیں اور تم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تمہارا تعصب عیاں ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ فضل امام نے اپنا ہی کوئی تجربہ بیان کیا ہے۔ یہ تو ایک کلیہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہی تجربات بیان کرتا ہے۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ان کی کہانی میں کہیں یہ بات نہیں لکھی گئی کہ تمام ہی عورتیں جنھیں شوہروں کی طرف سے آزادی حاصل ہو ایسی ہی ہو جائیں گی۔ میں نے بھی کبھی یہ نہیں لکھا کہ تمام بے پردہ عورتیں خدانخواستہ خراب کردار کی ہو جاتی ہیں۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ پردہ میں رہتے ہوئے بھی کبھی کبھی اسی طرح کے واقعات رونما ہو جاتے ہیں، جیسے بے پردہ پھرنے والیوں کے ساتھ ہوتے ہیں لیکن یہ میں ضرور کہوں گا کہ لغزشوں کا امکان بے پردگی کی حالت میں زیادہ ہے اور پردہ کی صورت میں کم۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ اس کی دولت لوٹ لی جائے، لیکن چور اور ڈاکو موقع ملے تو کب چھوڑنے لگے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ چوری اور ڈکیتی کے علاوہ بھی لوگوں کا مال متاع غائب کرنے کے دوسرے بھی طریقے ہیں [illegible] کی جو سر راہ کی جاتی ہے۔ اکثر ٹھگ رقم اور زیور کو دو چند بنا دینے کا دھوکا دے کر لوگوں کو بیوقوف بناتے اور ان کی رقمیں ہڑپ کر لیتے ہیں۔ وغیرہ۔

عورتیں مردوں کی نگاہوں میں بھی دولت ہی کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں لوٹنے کے لئے وہ دنیا کے کرم [illegible] دکھا دکھا کر لوٹ لیتے ہیں اور [illegible]

مردوں کے قریب میں آتی رہی ہے۔ یہاں آپ غور کریں کہ اگر کئی کے واقعات اس وقت ہوتے ہیں جب کوئی باہر نکلتا ہے۔ بھلا چھپا کر کسی کو اس وقت لوٹا جا سکتا ہے، جب اس کا موقع ملے۔ اور موقع اس وقت مل سکتا ہے جب عورت آزادی کے ساتھ باہر نکلے۔ آپ نہیں جانتیں کہ مرد کا سب سے زیادہ پسندیدہ مشغلہ یہی ہے کہ وہ عورتوں کو تباہ کرتا رہے۔ کیا آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ پنجرے میں بند رہنے والی چڑیاں ان چڑیوں سے زیادہ محفوظ رہتی ہیں جو آزاد فضا میں اڑتی رہتی ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ آزادی قید کے مقابلہ میں بہتر ہوتی ہے، لیکن خطرات ہوتے ہیں تو اکثر لوگ ضمانت پر اپنے کو آزاد کرا لینے سے جیل کی حوالات میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر آزادی میں خطرہ ہو تو قید اس سے بہتر بھی جا سکتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ نظریہ عورتوں کے لئے بہتر ہے اور اسلام نے اسی لئے عورتوں پر ہر طرح کا احترام کراتے ہوئے انھیں پردے میں رہنے کی تلقین کی ہے۔ خود ہمارے رسول اکرم صلعم نے فرمایا ہے کہ عورتیں شیشہ کی شکل ہیں۔ اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ واقعی عورتیں ایسی ہی نازک ہوتی ہیں، جیسے شیشہ اور اسی لئے انھیں اسی حفاظت سے رکھنا چاہئے جس طرح شیشے کی چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ اور پردہ ایک طرح کی حفاظت ہی کا نام ہے۔ ایک واعظ تقریر کرتے ہوئے لوگوں کو شراب پینے سے منع کرتا ہے حالانکہ وہ شراب نہیں پیتا۔ سگریٹ نہ پینے والا ایک ڈاکٹر مریض کو سگریٹ کے مضر اثرات بتا کر سگریٹ پینے سے روکتا ہے۔ ایسے واعظ و ڈاکٹر سے یہ سوال تو نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کو کیسے معلوم کہ یہ چیزیں مضر ہیں۔

میں نینی تال جاتا ہوں تو بوٹ ہاؤس کلب جھیل کے کنارے ایسی جگہ بنا ہے، جہاں رقص کرتے ہوئے لوگ اس طرح نظر آتے ہیں کہ ان پر نظر پڑ ہی جاتی ہے۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ میں ایسے کلبوں میں جا کر دیکھتا ہوں کہ کیا ہوتا ہے۔ ڈانسر کلب پر کیا ہوتا ہے اسے تو سب ہی دیکھتے ہیں۔ میں بھی دیکھتا ہوں اس لئے کہ آنکھیں بند کر کے چلنا مشکل نہیں۔

بہن تم پردہ پسند نہیں کرتیں تو نہ کرو۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک بات [illegible] اس معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ میں [illegible] کی اصلاح کے لئے لکھتا ہوں۔ میری [illegible] عمل کا خواہ [illegible] ہو سکتا ہے [illegible] خطرات سے

آگاہ کرتا ہوں۔ لیکن زبردستی نہیں کرتا، نہ کر ہی سکتا ہوں اس لئے تمہارا یہ کہنا غلط ہے کہ پردہ مردوں کی طرف سے زبردستی ٹھونسا جاتا ہے جو شاید میری ہی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

میری پیاری بھابی! میں سمجھتا ہوں کہ پردہ مردوں کی طرف سے زبردستی نہیں ٹھونسا جاتا، بلکہ اس کی طرف سے زبردستی اتارا جاتا ہے۔ اس لئے کہ صدہا ایسی لڑکیاں میرے علم میں ہیں جو شادی سے قبل سخت قسم کا پردہ کرتی تھیں، لیکن شادی کے بعد بے پردہ ہو گئیں۔ یقیناً یہ بے پردگی ان کے شوہروں کی طرف سے لائی جاتی ہے جو مغرب زدہ ہو کر بیویوں کے ساتھ پھرنے میں شان سمجھتے ہیں۔ اس لئے تم اس سلسلے میں مردوں کو مطعون نہ کرو۔ بلکہ ان کا شکریہ ادا کرو کہ وہ صنف نازک کو بے پردہ کر کے اسلامی روایات کی دھجیاں اڑاتے ہیں اور اسی طرح کا وہ مرد بھی تھا جو فضل نام کے افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔ مجھے ایسی بہت ہی معزز بیویوں کو میں بھی جانتا ہوں جو آج اپنے شوہروں کو چھوڑ کر دوسرے غیر مذہب کے شوہروں کے ساتھ رہتی ہیں۔ اور یہ صرف اسی لئے ہوا تھا کہ شوہر صاحبان اپنی آزاد خیالی اور ترقی پسندی کے باعث اپنی بیویوں کو کلب لے جاتے تھے جہاں وہ ان کے دوستوں سے متعارف ہو کر ان سے دلچسپیاں لینے لگی تھیں۔

"وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ"

شاہین خان (پوسہ)

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی بصیرت کائنات کے ذرے ذرے سے اپنی شاعری کے لئے خام مواد فراہم کر لیتی ہے۔ اس فلسفی شاعر نے انسان اور انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے تقریباً ہر موضوع کو اپنایا اور ہر موضوع ان کی شاعری میں ایک اہمیت رکھتا ہے۔ انسانی عظمتوں کے اس علمبردار نے ہندوستان میں عموماً اور مسلم قوم میں خصوصاً اس بات کو محسوس کیا کہ عورت کو آج تک اس کا صحیح مقام حاصل نہ ہو سکا۔ یا تو اسے ایک حقیر مخلوق سے تعبیر کیا گیا یا کمزور مخلوق سے لیکن اقبالؔ عورت کے وجود کی عظمت اور تقدس کو اچھی طرح جان چکے تھے۔ لہٰذا یہ ان ہی کے قلم کا اعجاز ہے کہ آج یہ

"وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ"

جیسی ہمہ گیر سچی اور آفاقی حقیقت ہمارے سامنے ایک موضوع کا رنگ اختیار کر رہی گی۔ آیئے ہم دیکھیں کہ شاعر کا یہ شعر کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔

عورت کی اہمیت، عظمت اور ضرورت کا ذکر نہ صرف قرآنِ پاک میں بلکہ بے شمار مذہبی کتابوں اور احادیث میں بھی ہوا ہے۔ فطرت نے عورت کا خمیر محبت، ہمدردی، خوش خلقی، ایثار، جذبۂ خدمت اور ماحتا جیسے بے مثال جذبات سے تیار کیا ہے۔ خوش خلقی، ایثار، ہمدردی یہ سب ایسے اوصاف ہیں جو خدا کے اوصاف سے قریب تر ہیں۔ ظاہر ہے۔ جس کا خمیر خدائی اوصاف سے تیار ہوا ہوگا وہ ہستی کبھی عظیم اور لائقِ ستائش ہو سکتی ہے۔

اس دنیا کی نیرنگیاں انسان ہی کی بدولت قائم ہیں اور انسان ایک عورت ہی کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ عورت ہی ہے جو بے شمار صعوبتیں، پریشانیاں اٹھا کر بچے کو جنم دے کر اس کی پرورش کرتی ہے۔ بچے کی پرورش کے ساتھ ساتھ اسے اپنے شوہر کی خدمت کا بھی خیال ہوتا ہے یہی عورت مختلف صورتوں میں اپنی محبت تقسیم کرتی ہے۔ کبھی بیٹی بنکر کبھی بہن کی صورت میں کبھی بیوی بنکر اور کبھی ماں کی حیثیت سے۔

عورت کی تخلیق کا مقصد صحیح معنوں میں اس وقت پورا ہوتا ہے جبکہ وہ ماں کا مقدس مقام حاصل کر لیتی ہے۔ پھر عورت صرف محبت کرنے تک ہی محدود نہیں رہ جاتی ہے بلکہ گھر کا سارا انتظام صحیح معنوں میں اسی کے دم سے ہوتا ہے۔ مرد کا کام صرف محنت کر کے ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا ہوتا ہے۔ جبکہ عورت تمام امورِ خانہ داری انجام دیتی ہے۔ بچوں کی تربیت اور پرورش کا بار بھی اسی کے کاندھوں پر ہوتا ہے۔ گھر میں اگر بچے یا شوہر بیمار ہو تو دن بھر کی تھکی ہاری عورت کبھی زبان پر حرفِ شکایت نہیں لاتی۔ اپنی راتوں کی نیند کو حرام کر کے بیمار کی تیمار داری کرتی ہے۔ عورت کا جذبہ اس قدر پختہ اور فطری ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے شفاخانوں میں مریضوں کی نگہداشت اور تیمارداری کے لئے بھی عورتیں ہی لازم رکھی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ عورت کی محبت کی حدیں کہیں نہ کہیں انجانے طور پر ممتا ہی کے جذبات سے جا ملتی ہیں جو سب پر حاوی ہوتا ہے۔

عورت حسن پرست بھی ہوتی ہے لیکن وہ صرف جسمانی حسن کا ہی خیال نہیں رکھتی بلکہ وہ چاہتی ہے کہ اس کا مکان بھی خوبصورت ہو اس طرح دنیا کے ایک انتہائی محدود حصے کو گویا وہی حسن بھی عطا کرتی ہے۔

بچوں کو ایک اچھا نیک و نامور شہری بنانے میں بھی عورت بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ماں ہی راتوں کو اپنے بچوں کو نیک، بہادر، ہونہار انسانوں کی کہانیاں سناتی ہے تاکہ چھوٹی چھوٹی عمروں ہی میں ان کے دماغ اور ذہن بہترین اثر قبول کریں اور وہ بھی ان کی کہانی کے کرداروں کی طرح بنیں۔ ممتا کا تقاضہ ہے

تحریک آزادی کو کامیاب بنانے کے لئے "ورثہ" کا ہتھیار اپنی ماں سے ہی لیا تھا ـــــ اسی طرح پنڈت نہرو کی ماتا سروپ رانی کا کردار اور مجاہدین آزادی محمد علی اور شوکت علی (برادران) کے نام سے تاریخ میں موسوم ہیں ان کی والدہ "بی اماں" کا کردار اپنے بیٹوں کی مجاہدانہ زندگی میں منعکس ہو کر انگریزی کی کہاوت ہے۔

"A hand that rocks the Cradle rules the world"

اس کہاوت سے ماں کے روپ میں عورت کی عظمت و اہمیت مسلم الثبوت ہے۔ سچ ہے آغوشِ مادر ہی طفل کے لئے مکتبِ اوّل ہے۔ علامہ اقبال نے بھی کہا ہے۔ ؎

آغوشِ مادر جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

اچھی باتیں

۱۔ نفس کو کسی چیز میں مشغول رکھو ورنہ نفس تم کو ایسے کاموں میں مشغول کردے گا جو کرنے کے قابل نہیں۔
۲۔ سوسائٹی میں آپ کی حقیقی پوزیشن وہی ہے جس کا اظہار لوگ آپ کی غیر حاضری میں کرتے ہیں۔
۳۔ یہ تمہاری غلطی ہے جو تم غیروں کو اپنی تکلیف کا موجب سمجھتے ہو غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ خود تمہارے افعال تمہاری برائی کا باعث ہیں۔
۴۔ کمزور انسان موقعوں کے انتظار میں رہتے ہیں۔ لیکن باہمت انسان خود موقع پیدا کر لیتے ہیں۔
۵۔ جب تک تیرا اترانا اور غصہ کرنا باقی ہے اپنے آپ کو اہل علم میں شمار نہ کر۔
۶۔ خواہشات کی پیروی کرو گے تو راہ راست سے بھٹک جاؤ گے۔
۷۔ عورت زندگی کی کشتی پاؤں میں زنجیر کا ل ہے۔
۸۔ تم غلامی سے تنگ جاؤ گے (؟) تم سے ٹک جائے گی۔

مرسلہ ۔ سلمیٰ ذیشانہ
مجر محمد ۵۵۶۱

حصولِ علم ضروری ہے بچوں کے لئے
اسی کے دم سے سنورتی ہیں دختران قوم
اسی کے فیض سے کھلتا ہے گلستان قوم
اسی کے شوق سے بڑھتا ہے مرد و زن کا وقار
اسی کی موج سے آتی ہے زندگی پہ بہار
ہے علم ہی سے منور جہاں کی پیشانی
فضائے دہر میں پھیلی ہے اس کی تابانی
بہائے علم ہی در اصل اک خزانہ ہے
اسی کی ضو سے درخشاں رخ زمانہ ہے
در اصل ملتی ہے انساں کو علم سے تہذیب
اسی کے فیض سے بنتے ہیں عالم اور خطیب
اسی کے ذوق سے ملتی ہے طاقت گفتار
اسی کے فیض سے بنتے ہیں شاعر و فنکار

جو علم ہو تو زمانے میں ہوتی ہے عزت
اسی کے شوق سے ملتی ہے دہر میں شہرت
متاعِ علم سے انسان بنتا ہے عاقل
اسی کے فیض سے ہے تیسر ہوتی ہے حاصل
ضیائے علم سے مٹتی ہے جہل کی ظلمت
اسی سے ملتی ہے ہم کو زندگی کی عظمت
اسی کے فیض سے حاصل خدائی ہوتی ہے
اسی کی ضو سے خدا تک رسائی ہوتی ہے
حصولِ علم ضروری ہے بچوں کے لئے

حریمی دسترخوان

سیخ کے کباب

کبابوں میں سیخ کے کباب نہایت لذیذ ہوتے ہیں، شاید اس لئے بھی کہ انھیں تیار کرنے میں کافی دشواریاں ہوتی ہیں۔ اول تو اس کے لئے دو سے کی تقریباً سہت موٹی سلاخیں ہونی چاہئیں جو ایک سرے پر نوکدار بنائی گئی ہوں۔ انہیں رکھنے کے لئے ایک اڈا بھی لوہے کا ہونا چاہئے جس میں دو ستون ہوتے ہیں اور ان میں ایسے آنکڑے لگے ہوتے ہیں جن پر سلاخوں کو کباب لگا کر رکھا جاتا ہے اور نیچے کوئلے دہکا کر رکھے جاتے ہیں۔ سیخوں کو برابر گھماتے رہتے ہیں تاکہ گرمی ہر سمت پہنچے اور نیچے کی سیخ اوپر اور اوپر کی نیچے کرتے رہنا بھی ضروری ہوتا ہے، اس لئے کہ نیچے کی سیخ کو زیادہ گرمی ملتی ہے اور اس کے بعد والی کو اس سے کم اور سب سے اوپر والی کو سب سے کم، اس لئے یہ عمل برابر جاری رکھا جاتا ہے۔

ایک دوسرا طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی لوہے کا ۳-۴ انچ گہرا تسلہ ہو جس میں کوئلے رکھے جاسکیں اور تسلے کے اکھے ہوئے کناروں پر سلاخیں رکھ کر کھا سکیں۔

سامان: قیمہ ۵۰۰ گرام باریک کچری کھانے کا ۱ چمچہ۔ دارچینی [illegible] ٹکڑا۔ زیرہ چائے کا ایک چمچہ۔ [illegible] ۱ عدد۔ کالی مرچ بارہ [illegible] [illegible] عدد۔ [illegible] حسب خواہش۔ جائفل ایک کالی مرچ کے برابر [illegible] ایک دو [illegible] بالکل تھوڑی سی۔ سرخ مرچ حسب [illegible] چائے کا ایک [illegible] کم و بیش۔ ۶۔ دھنیا ایک گڈی۔ [illegible] ہری مرچ [illegible] گھی یا ڈالڈا حسب ضرورت پیاز بڑی ایک۔ لہسن پسا ہوا۔ چائے کا ایک چمچہ۔ کچا پپیتا پسا ہوا چائے کا ایک چمچہ۔

کچری اور گرم مسالہ پیس کر باریک کرلیں اور [illegible] پسا پپیتے کے ساتھ ملا کر ایک گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔ پیاز کے لچھے کاٹ کر گھی یا ڈالڈا میں سرخ کرلیں اور اسے بھی قیمہ میں ملالیں۔ ہری مرچ باریک کاٹ لیں، زیرہ بھی بھون کر پیس لیں اور قیمہ میں ملا دیں۔ نمک اور سرخ مرچ بھی ضرورت کے مطابق ملا کر شامل کریں۔ پھر قیمہ کو سیخوں پر تقریباً ۸ انچ میں اس طرح لپیٹ دیں کہ قیمہ کی دبازت زیادہ نہ ہو تاکہ آسانی سے سنک کر تیار ہو جائے۔ اگر اس طرح آپ نہ بنا پائیں اور قیمہ گرنے لگے تو پھر قیمہ کی موٹی تہہ سیخوں پر لگا کر باریک تاگے سے اس طرح لپیٹ دیں کہ قیمہ گرنے نہ پائے۔ اس کے بعد جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کبابوں کو انگاروں پر گھما گھما کر سینکیں اور ایک کپڑے میں سرسوں ذرا سا صاف کپڑا باندھ کر گھی کا بالکل ہلکا ہلکا پچارہ دیتی رہیں۔ گھی اتنا ہی لگائیں کہ ٹپکنے نہ پائے۔

کباب تیار ہو جانے پر کسی صاف بڑے پتے یا چپاتی میں لے کر آہستہ سے سیخ سے نکال لیں اور ہرے دھنیے کی چٹنی ڈال کر یا پیاز کے لچھے اور پودینہ کے پتے ملا کر ان کے ساتھ نوش فرمائیں۔ کھانے سے پہلے تاگے کو آہستگی سے علیحدہ کرلیں۔ دو چار بار پکا کر پریکٹس کیجئے۔ پھر آپ بھی آسانی کے ساتھ سیخ کے کباب تیار کر لیا کریں گی۔

مرسلہ: نجمہ [illegible] سیتاپور

بقیہ اندرون خانہ ——— صفحہ ۱۸ کا

مولانا کے فتوے کی وجہ سے ہو گیا تھا۔ لیکن آپا صاحب نے یہاں پوسٹروں کا ذکر کر کے ہمیں دوسرے اور بالکل نئے درد سر میں مبتلا کر دیا۔ جب ہم نے اپنے دوسرے درد سر کا ذکر آپا جان سے کیا تو انھوں نے پوری خاموشی کے ساتھ فرمایا ——— میاں تم بھی کچھ دنوں کے لئے مولانا نے موصوف کے ساتھ اسی اسپتال کی سیر کر آؤ تو انشاء اللہ تمہیں بھی صحت ہو جائے گی اور آئے دن محلے بھر کے درد کو اپنے سر میں منتقل کر لینے کی بیماری جاتی رہے گی۔

بدگمانی کی سزا

از
رضیہ بٹ

مسز لنڈا براؤن نے سگریٹ کے لمبے لمبے دو تین کش لئے اور بقایا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ بالوں میں انگلیاں الجھاتے ہوئے اس نے ہاتھ کانوں پر رکھ کر سر کو سہارا دیتے ہوئے اسے جھکا لیا۔ کتنی دیر وہ کہنیوں کو گھٹنوں پر ٹکائے ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھی رہی۔

پینتیس سالہ لنڈا اوپر والی منزل کے پچھواڑے والے کمرے میں ایک گدے دار کرسی پر بیٹھی تھی شیشے کی دیوار سے سمندر کا منظر بڑا خوبصورت لگتا تھا۔ اس کمرے کے سامنے چھوٹا سا چھجہ تھا جس کی ریلنگ سنہری تھی اور ننھے ننھے پھولوں والی سرسبز بیلیں اس پر چڑھی تھیں یہاں دو تین ایزی چیئرز پڑی رہتی تھیں سمندری ہواؤں سے لطف لینے کے لئے کبھی کبھی لنڈا یہاں بیٹھا کرتی تھی شیشے کا سلائیڈنگ ڈور کمرے اور چھجے کے درمیان تھا جو اس وقت بند تھا۔

لنڈا نے گرین پینٹ پر نیلے پیلے اور گلابی پھولوں والا بلاؤز پہن رکھا تھا وہ کرسی پر نیم دراز تھی۔ اس کی بھوری مائل نیلی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اس کا چہرہ سرخ و سپید ہونے کے باوجود کسی طور پر ہشاش بشاش نہیں تھا۔ وہ اس وقت خاصی پریشانی کے عالم میں تھی کمرے کی خوبصورت چیزوں کی بے ترتیبی بھی اس کی پریشانی کا اظہار تھی۔

اسے ان دنوں مالی پریشانیوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہ پریشانیاں کسی حد تک خود ساختہ بھی تھیں۔ مسز لنڈا براؤن کا میل جول جن لوگوں سے تھا وہ مالی لحاظ سے ان سے کہیں برتر تھے ان کے ساتھ برابری تو وہ کر نہیں سکتی تھی لیکن کرنے کی کوشش مسلسل کیے جاتی تھی براؤن حقیقت پسند انسان تھا اور ان دونوں میں لڑائی جھگڑے کا باعث یہی بات بنتی تھی۔ لنڈا نے حدود کے اندر رہنا اور اخراجات کرنا سیکھا ہی نہ تھا اسی وجہ سے وہ مالی طور پر کبھی پرسکون نہ ہوئی تھی اس کی سہیلی یا دوست کوئی نئی چیز خریدتے تو وہ اپنی خواہش کو دبا نہ سکتی۔ اس چیز کو خریدنے کے لئے اس کے پاس پیسے ہوتے تو فوراً جا کر لے آتی اور اگر نہ ہوتے تو اس کے لئے اتنا تردد کرتی اتنے چکر چلاتی کہ بے چارہ براؤن پریشان ہو جاتا اسی طرح اس نے کئی ملنے والوں سے چھوٹے چھوٹے قرضے لے رکھے تھے بنک سے بھی روپیہ لیا ہوا تھا اور کئی چیزیں جو قسطوں پر خریدی ہوئی تھیں ان کا پیسہ بھی سر پر تھا۔ اس نے تین ایوننگ ڈریس بھی بنوائے تھے جو بیش قیمت تھے ان کا پیسہ بھی ادا کرنا تھا۔

اسے پانچ ہزار ڈالر کی سخت ضرورت تھی۔ ایک ہزار ڈالر اور بھی چاہیئے تھا لیکن اس ایک ہزار کے خرچ کو پانچ سات دن ٹالا بھی جا سکتا تھا۔

اسے فون پہ فون آ رہے تھے۔ بہانے کرتے کرتے وہ خود بھی اکتا گئی تھی۔ مسز موریس نے تو اپنے دو سو ڈالر کے لئے صرف کل تک کی مہلت دی تھی۔ ٹیلر کا تقاضا بھی کل شام تک پیسے ادا کرنے کا تھا۔ اس نے جس بدتمیزی سے یہ تقاضا کیا تھا لنڈا کا خون کھول رہا تھا لیکن قصور تو اس کا اپنا تھا۔ یا براؤن کا۔ جس نے وعدے کے مطابق پیسے نہیں بھیجے تھے۔

براؤن اچھا بھلا اسی شہر میں کام کرتا تھا لیکن لنڈا کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے اسے کسی بہتر ملازمت کی تلاش تھی اس کے ایک دوست نے اسے اسٹیٹ بلا بھیجا تھا۔ یہاں اس کی قابلیت اور صلاحیت کو پنپنے کے بہت زیادہ مواقع تھے وہاں اس نے دو ماہ کام کیا تھا لیکن لنڈا کے تقاضے پھیلتے جاتے تھے۔ براؤن ڈھیروں پیسے کمانے کے لئے کسی عرب ملک میں کام کرنے والی امریکن کمپنی میں ملازم ہو گیا تھا وہاں اسے اتنا پیسہ ملنے کی توقع تھی کہ وہ لنڈا کی جگمگاتی خواہشوں کو پورا کر سکے۔ اسے [illegible] کر بہت کچھ پس انداز کیا جا سکتا تھا۔

براؤن وہاں جا چکا تھا اور تقریباً ڈیڑھ ماہ سے وہاں کام کر رہا تھا۔ پیسہ کمانے کے لئے وہ مشین کی طرح کام کر رہا تھا۔

لیکن لنڈا کو اس کی طرف سے ابھی تک کوئی رقم موصول نہ ہوئی تھی۔ براؤن کی اتنی زیادہ تنخواہ کا سن کر ہی اس نے اپنے لئے

بیش قیمت ایوننگ ڈریسز بنوا لئے تھے اور خود بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔
اب تو سارا وقت منصوبے بنانے ہی گزرتا تھا۔ اپنے اس دو منزلہ گھر کو وہ جنت ارضی بنانا چاہتی تھی۔ اپنے دوستوں اور ملنے والوں میں خصوصی شان سے رہنا چاہتی تھی۔ اونچے اونچے گھرانوں سے دوستی کا خواب بھی پورا ہونا تھا اور بڑے بڑے فنکشنز میں جانا اور خود فنکشن منعقد کرکے لوگوں پر اپنی امارت کا رعب جمانا بھی اس کی سوچوں کا خوش کن حصہ تھا۔

لیکن

آج تو وہ پانچ سو ڈالر کے لئے سخت پریشان تھی۔ اسے براؤن پر بے طرح غصہ آرہا تھا اور اب تو مایوسی کے عالم میں وہ سوچ رہی تھی کہ براؤن نے اس سے جھوٹ بولا ہے جھانسہ دیا ہے اتنی تنخواہ کا فریب دے کر وہ کہیں روپوش ہوگیا ہے۔ جب سے وہ گیا تھا اس کے صرف دو خط اسے ملے تھے جس میں اس نے اپنی مصروفیت کا کھل کر حال لکھا تھا اس نے تو یہاں تک لکھا تھا کہ لنڈا کے لئے وہ اتنی محنت کر رہا ہے کہ اپنا ہوش ہی نہیں۔ سانس لینے کی بھی فرصت نہیں۔ وہ اس کو ہزاروں ڈالر بھیجا کرے گا جنھیں خرچ کرنے پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔

"ہونہہ"

لنڈا کے نتھنوں سے ایک پھنکار سی نکلی اور کرسی کے ہتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ اٹھنے لگی، براؤن پر اسے بے طرح غصہ آرہا تھا جھوٹا، فریبی اور مکار لگ رہا تھا۔ یقیناً وہ اسے جھانسہ دے گیا تھا حالانکہ وہ ایسا نہیں تھا۔

وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

اب کیا ہوگا۔ کل مسز مورس آن دھمکے گی اور ٹیلر تو بد تمیز ہے ہی۔

ان کو پیسے کہاں سے دوں گی؟

اس نے پریشان نظریں کمرے پر ڈالیں شاید اندازہ کرنا مقصود تھا کہ کون سی چیز ایسی ہے جسے بیچ کر پانچ سو ڈالر اکٹھے کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اتنے عرصے میں چیز بیچنا ممکن کہاں تھا۔ کباڑی کے پاس لے جانے والی چیز ہی کونسی تھی۔ اس نے تو آدھا مول بھی نہ دینا تھا اور پھر بیکار چیز بکنا کیسا تھا۔ پیٹ بھی بیچنے سے ہلکی ہوتی۔ اگر کسی ملنے والے یا سہیلی کو اس بات کا پتہ چل جاتا تو لنڈا کے لئے مرنے کا مقام تھا۔

وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ ذہن مفلوج سا ہوگیا تھا۔
براؤن کو دل ہی دل میں بے شمار گالیاں دے رہی تھی اسے یوں لگ رہا تھا گر اس شخص کے لئے اس کے سینے میں نفرتوں کے سمندر کھول رہے ہیں۔ محبت تو جیسے اس سے کبھی تھی ہی نہیں۔ حالانکہ دونوں کی یہ محبت کی شادی تھی۔ اور تین سال سے [illegible] بھی رہی تھی۔

اس نے سوچا ٹیلر کو فون کرے اور وہ ڈریس جو اس نے شوق سے بنائے ہیں بیچنے کے لئے کہدے یوں ٹیلر کا تقاضا چند دن آگے ہوسکے گا لیکن فون کی طرف بڑھتے ہوئے مسز مورس کا چہرہ نظروں میں گھوم گیا اور وہ فون پر ہاتھ رکھ کر سوچ میں ڈوب گئی۔

سو اچانک کال بیل ہوئی۔

لنڈا نے فون سے ہاتھ اٹھا لیا۔

بیل پھر ہوئی۔

لنڈا کھڑکی کی طرف آئی تاکہ نیچے دیکھ سکے کہ کون دروازے پر بیل دے رہا ہے لیکن دروازے پر کھڑے شخص کا صرف کندھا ہی نظر آیا اس نے نیا گرے سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ کوئی ملنے والا ہی ہوسکتا تھا۔

لیکن لنڈا نے قدم اٹھاتے ہوئے سوچا۔

اس وقت کون آسکتا ہے۔ دوپہر کے تین بجنے والے تھے۔

وہ کمرے سے باہر آئی اور پھر لکڑی کے قدرے جھولتے ہوئے موسمی بیلوں سے لدے زینے پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی وہ نیچے اتر آئی۔

وہ بے طرح پریشان تھی۔ اس کا دل کسی بھی ملنے والے یا دوست کو خوش آمدید کہنے کو نہیں چاہ رہا تھا نہ ہی وہ اس وقت کسی کے لئے کافی یا چائے بنانے کے موڈ میں تھی۔ معذرت کرکے باہر ہی ٹال دینے کا ارادہ کرکے وہ بیرونی دروازے تک آئی۔

اور

دروازہ کھول دیا۔ باہر ایک مرد کھڑا تھا جس نے گرے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔

"ہیلو"

مرد نے خوشگوار انداز میں کہا۔

"ہیلو"

وہ بے دلی سے بولی

"میرا نام رابرٹ ہیسٹنگز ہے"

مرد مسکرا دیا۔

"ہوگا"

وہ رکھائی سے بولی: "میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں مسز براؤن ہوں۔"

"میں براؤن کا دوست ہوں۔ اور آپ سے ملنا ہے۔"

لنڈا نے اس کے سراپا پر ایک نگاہ ڈالی۔ چالیس بیالیس سال کا صحت مند اور کسی حد تک خوبصورت آدمی اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں اور وہ بڑی پسندیدہ نظروں سے لنڈا کو تک رہا تھا۔

"براؤن نے آپ کا ذکر کبھی نہیں کیا۔"

وہ بے پناہ تنفر سے بولی۔

رابرٹ نے غور سے لنڈا کو دیکھا۔

"آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں۔"

"آپ نے کچھ کہنا ہے۔"

لنڈا بولی۔

"آپ مجھے اندر بیٹھنے کے لئے نہ کہیں گی۔ میں دور سے آیا ہوں براؤن سے میری دوستی مہینہ بھر سے ہے۔ ہم دونوں ایک ہی کمپنی میں کام کرتے ہیں۔"

لنڈا براؤن کے نام ہی سے چڑ گئی۔ اس نے شوہر کی خیریت دریافت کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ بیزاری سے بولی: "آئیے۔"

وہ دروازے کے پٹ کو پکڑے پکڑے ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ رابرٹ اندر آ گیا۔

نچلے حصے کے خوبصورتی سے آراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہوئے اس نے بڑی گہری نگاہ لنڈا پر ڈالی۔

لنڈا بھی سامنے ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ رابرٹ گھاگ سا آدمی تھا۔ فوراً ہی بھانپ گیا کہ لنڈا پریشانی اور مایوسی کے عالم میں ہے۔ کچھ براؤن کے الفاظ بھی مدد ثابت ہوئے اس نے رابرٹ کو بتایا تھا کہ لنڈا پیسے نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہوگی۔

لنڈا کا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ تو بات تک کرنے کی روادار نہ تھی۔ اخلاقاً بیٹھنا پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر بیزاری کی چھاپ بڑی واضح تھی۔

"مسز براؤن"

چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد رابرٹ بولا۔

لنڈا نے اپنی گہری سنہری مائل نیلی آنکھیں اٹھا کر مستفسرانہ اسے دیکھا۔

"لگتا ہے آپ مالی طور پر پریشان ہیں۔"

"ہاں"

لنڈا نے سر صوفے کی پشت پر ٹکاتے ہوئے گہری سانس لی۔

"آپ کا اتنا خوبصورت گھر ہے قیمتی چیزیں ہیں۔ آسائش کی ہر شے یہاں موجود ہے۔ ایسی صورت میں مالی طور پر پریشان ہونا بے معنی سا لگتا ہے۔"

"یہ پریشانی میرے شوہر نے دی ہے۔"

وہ غصے سے پھنکاری۔

"اس نے مجھے بہلا دیا تھا کہ میں جتنے ہزار روں ڈالر بھیجوں گا لیکن ڈیڑھ ماہ ہوگیا ہے اس نے کچھ نہیں بھیجا۔ اسے تو معلوم بھی تھا کہ میرے پاس کوئی رقم نہیں اور میں کام بھی چھوڑ رہی ہوں۔"

"آپ کو کتنی رقم کی ضرورت ہے۔"

وہ ہمدردی جتاتے ہوئے بولا۔

"پانچ سو ڈالر تو کل صبح تک درکار ہیں۔"

وہ ہمدردی سے مرعوب ہو کر آہستگی سے بولی۔

"کل پانچ سو ڈالر۔"

وہ بڑے تمسخر سے مسکرایا۔

لنڈا نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

"ہاں مسز براؤن۔ یہ کوئی اتنی بڑی رقم نہیں جس کے لئے آپ اس قدر پریشان ہیں۔"

"مجھے اتنی رقم کل صبح تک چاہیئے۔ ورنہ بڑی بے عزتی ہوگی۔"

"اگر یہ رقم میں آپ کو دے دوں تو۔"

"کیا!!"

"آپ اس قدر حیران کیوں ہیں۔ میرے لئے یہ رقم معمولی ہے۔"

"آپ یہ رقم مجھے دے سکتے ہیں۔"

"بالکل۔"

"سچ۔"

"یقین کریں"

"اوہ — آپ تو — آپ تو میرے لئے فرشتہ رحمت ثابت ہوئے"

وہ زور سے ہنسا — لنڈا نے ٹھٹھک کر اس کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہا۔

خوش ہو جائیے مسز براؤن؟

وہ بولا۔

"میں یہ رقم آپ کو ابھی دے سکتا ہوں"

"مجھے یقین نہیں آرہا"

یقین دلا دوں۔ ہوں"

رابرٹ نے مسکراتے ہوئے کوٹ کے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالا — اور سو سو ڈالر کے کچھ نوٹ باہر نکال لئے

لنڈا ان نوٹوں کو گرسنہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

آپ پانچ سو ڈالر مجھے دے دیں گے؟

اس نے بے تابی سے پوچھا۔

یہ رقم مجھے کل صبح دینی ہے ایک ہزار ڈالر اور بھی چاہئیں لیکن ان کے لئے میں فکر مند نہیں۔ شاید جب تک براؤن پیسہ بھجوا ہی دے۔

رابرٹ نے پانچ نوٹ لنڈا کی طرف بڑھا دئیے۔

لنڈا نے لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا — رابرٹ نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ مسکراتے ہوئے صوفے سے ٹیک لگا لیا اور بولا۔

میں اکثر لوگوں کی پیسے سے مدد کرتا رہتا ہوں۔ لیکن اس کے لئے کچھ شرائط بھی ہوتی ہیں۔

جی۔ میں سمجھی نہیں۔

شرائط۔ اس کا مطلب آپ نہیں سمجھتیں"

سمجھتی ہوں۔ لیکن شرائط کس قسم کی؟

میں بتاتا جاؤں گا"

"مثلاً"

مثلاً یہ کہ پیسے لینے سے پہلے مجھے کافی پلائیں"

"اوہ —"

لنڈا پہلی بار ہنسی۔ اس کے خوبصورت دانت رابرٹ کو نظر آ گئے۔

"— ابھی کافی بنا کر لاتی ہوں مسٹر رابرٹ ہینگز — سوری یہ فرض میرا تھا اور مجھے بہت پہلے آپ کو کافی آفر کرنا چاہئیے تھی"

وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

اور

رابرٹ صوفے پر نیم دراز ہو کر دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے کوئی منصوبہ بنانے لگا۔

لنڈا براؤن اسے بہت پسند آئی تھی۔ اس کی سبزی مائل نیلی آنکھوں میں پریشانی سے جو سرخی اتر آئی تھی وہ بہت پرکشش تھی۔ اس کا گداز اور خوبصورت جسم بھی مقناطیسی کشش رکھتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد لنڈا کافی بنا لائی۔ اس نے کافی شیشے کی گول میز پر رکھ دی۔

وہ جھک کر اٹھی تو اس کے کھلے گریبان کو رابرٹ نے گرسنہ نظروں سے دیکھا۔

کافی کا مگ لنڈا نے رابرٹ کی طرف بڑھایا۔

"شکریہ"

رابرٹ نے کہتے ہوئے دس ڈالر کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا"

لنڈا نے حیرانگی سے پوچھا۔

"بس میری عادت ہے رکھ لو"

چند لمحوں کے تذبذب کے بعد لنڈا نے نوٹ لیا۔

رابرٹ مسکرایا۔ مگ سے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا

میرے قریب بیٹھو تو میں تمہیں پچاس ڈالر دوں گا"

لنڈا نے حیرانگی سے اسے دیکھا اس قسم کے آدمی سے اس کا پالا کبھی نہیں پڑا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

"کیا تم بہت امیر ہو"

"ہاں — کافی امیر ہوں۔ اس وقت میری جیب میں تقریباً پچاس ہزار ڈالر ہیں اور یقین کرو۔ یہ سارے ڈالر اپنی بیوی کے نذر کر دوں تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا"

لنڈا کچھ دیر متذبذب رہی۔ لیکن پھر اس نے سوچا اس کے قریب بیٹھنے میں کیا مضائقہ ہے اتنے ڈھیر سارے پیسے اسے مل جائیں تو اس کی کتنی پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں۔ اور وہ اپنی ذات کو خوش کرنے کے لئے کتنی فراخدلی سے خرچ بھی کر سکتی ہے۔

"لاؤ پچاس کا نوٹ"

لنڈا نے ہنس کر کہا

"یہاں بیٹھو"

"تو"

وہ دھم سے اس کے قریب بیٹھ گئی، ہنستے ہوئے بولی۔

"سودا نقد ہونا چاہیئے"

"میں خود نقد کا قائل ہوں"

اس نے پچاس کا نوٹ لنڈا کو دے دیا۔

دونوں باتیں کرنے لگے لنڈا اب اس عجیب و غریب ہونی والے شخص میں دلچسپی لینے لگی تھی پریشانی کے بادل چھٹ گئے تھے امید کا جگمگاتا چہرہ نظر آنے لگا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ رابرٹ باتیں بھی تو بڑی دلفریب کر رہا تھا۔ اس کے بہلنے کا انداز بھی بڑا خوبصورت تھا دونوں بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔

تم میرے پاس بیٹھی ہو گیا میں تمہیں چھو سکتا ہوں"

رابرٹ نے بڑی نشیلی نظروں سے لنڈا کو دیکھا۔

"تمہارا اس بھری بدن چھونے کی آرزو مجھے بے چین کر رہی ہے اس ننھی سی خواہش کے لئے میں تمہیں سو ڈالر دے سکتا

لنڈا نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ تذبذب کے کئی لمحے بیت گئے۔

"کیوں؟"

رابرٹ نے نظروں نظروں ہی میں پوچھا اور جیب سے سو ڈالر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لے لنڈا کے لئے یہ آزمائش کا کڑی تھی۔

وہ کئی لمحے سوچتی رہی پھر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ آخر حرج بھی کیا ہے پھر براؤن سے تو اس وقت اُسے نفرت اور بیزاری بھی محسوس ہو رہی تھی رابرٹ اُسے اچھا دوست اور مخلص ساتھی نظر آ رہا تھا۔

اس نے خواہش نظروں سے رابرٹ کو دیکھا اور پھر بولی

"مجھے صرف چھو لینے کے لئے تم سو ڈالر دے رہے ہو"

"ہاں"

"عجیب آدمی ہو"

"میرا جی چاہتا ہے"

"تو چھو لو"

"شکریہ"

رابرٹ نے سو ڈالر کا نوٹ اسے دیتے ہوئے اپنا بازو اس کے کندھوں کے گرد لے جاتے ہوئے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بڑا جذباتی ہو رہا تھا لنڈا کا ضمیر اُسے ملامت کر رہا تھا رابرٹ کی نیت بد نظر آ رہی تھی۔ لیکن پیسے کی کشش نے اس کی آنکھوں کے آگے پردہ کر دیا تھا اور وہ ضمیر کی آواز دبائے جا رہی تھی۔

کیا میں تمہیں پیار کر سکتا ہوں"

رابرٹ رسیلے اور نشیلے انداز میں لنڈا پر جھکتے ہوئے بولا۔

جیب سے پانچ سو ڈالر نکال کر اس نے لنڈا کے ہاتھ پر رکھ دیئے وہ کچھ جھجکی یہ حرکت غیر شریفانہ تھی، وہ براؤن کی بیوی تھی لیکن ان ساری سوچوں پر پانچ سو ڈالر کے کڑکڑ کرتے نوٹوں نے پردہ ڈال دیا۔

رات گہری ہو کر آ رہی تھی۔ لنڈا اور رابرٹ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے رابرٹ نے اسے شہر کے بہترین ہوٹل میں کھانا کھلایا تھا۔ مہنگی شراب پلائی تھی شاندار کھانا کھلایا تھا اور اس کے ساتھ پانچ سو ڈالر لنڈا کو پیش کئے تھے۔

"یہ کیوں"

لنڈا ابھی اس کی جیب خالی کرنے پر تلی تھی نوٹ بے تابی سے پکڑتے ہوئے بولی۔

تم نے میرے ساتھ آنے اور کھانا کھانے کی تکلیف کی ہے۔ مجھے خوشی دی ہے میں بدلہ چکانے کا عادی ہوں"

رابرٹ اس کی کمر کے گرد ہاتھ لے جاتے ہوئے بولا

لنڈا نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی۔ ہاں مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔

"کہیں یہ سب پیسے تم واپس تو نہ لو گے"

"اوہ بالکل نہیں یہ تمہارے ہیں۔"

"شکریہ"

لنڈا نے مسکرا کر کہا وہ اس وقت تک رابرٹ سے کوئی ڈیڑھ ہزار ڈالر بٹور چکی تھی۔ ابھی رابرٹ کی جیب میں ساڑھے تین ہزار ڈالر تھے اور انھیں ہتھیانے کے لئے وہ رابرٹ پر زیادہ مہربان ہونے کی کوشش کر رہی تھی

گھوم پھر کر دونوں گھر واپس آ گئے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر وہ کافی دیر تک میوزک سنتے رہے رابرٹ تو سر دھنتا رہا۔ اور

لنڈا پانچ ہزار ڈالر کو خرچ کرنے کے پلان بناتی رہی۔
"مسٹر براؤن"
رابرٹ نے ایک مسحور کن انگڑائی لی۔
"ہوں"
"سونے کا کیا پروگرام ہے؟
تم کہاں سونا پسند کرو گے؟"
"تمہارے ساتھ"
رابرٹ نے لنڈا کی گردن میں بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔
"اوہ نہیں"
وہ کچھ گھبرا گئی۔
"تین ہزار ڈالر"
وہ معنی خیز مسکراہٹ ہونٹوں میں دباتے لنڈا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔
وہ چپ ہو گئی۔
رابرٹ نے تین ہزار ڈالر نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیئے۔
وہ گھبرائی گھبرائی نوٹوں کو دیکھنے لگی۔ وہ سر کو نفی میں بھی ہلائے جا رہی تھی۔
رابرٹ پیار بھری باتیں کرنے لگا۔ وہ چپ رہی۔
رابرٹ نے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔
"تم بہت حسین ہو مائے ڈارلنگ کاش میرے پاس اس وقت تیس ہزار ڈالر ہوتے"
"تم سب مجھے دے دیتے"
"بالکل"
"تم جیسا آدمی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا"
"اب دیکھا ہے تو خوش ہونا"
لنڈا نے سر جھکا لیا اور خاموش رہی۔ خاموشی کو نیم رضامندی سمجھتے ہوئے رابرٹ نے پوچھا۔
"کہاں ہے تمہارا بیڈ روم"
"وہ"
لنڈا نے بے جان سی آواز میں کہا۔
اس کا سارا جسم سن ہو رہا تھا۔ رابرٹ اسے لیکر اندر چلا گیا۔ تین ہزار لنڈا کے ہاتھ میں تھے۔

اور
پھر
رات گزر گئی۔
صبح رابرٹ نے بیڈ ٹی لی۔ اور جانے کے لئے تیار ہو گیا۔
"ناشتہ نہیں کرو گے"
لنڈا بستر میں پڑے پڑے تساہل سے بولی۔
"نہیں۔ مجھے ضروری کام سے جانا ہے"
وہ بولا۔
"پھر کب آؤ گے"
لنڈا نے تکیے میں منہ دیتے دیتے پوچھا۔
"جب بھی جیب میں دس ہزار ڈالر ہوئے ضرور آؤں گا"
اس نے جھک کر لنڈا کو پیار کیا اور پانچ سو ڈالر تکیے پر رکھتے ہوئے بولا۔
"بہت بہت شکریہ میں نے ایسی عورت اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی"
لنڈا پانچ سو ڈالر مٹھی میں لیتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔
"یہ کس خوشی میں دیئے"
"اتنا اچھا وقت گزارنے کے"
لنڈا خوشی سے سرشار ہو گئی۔
وہ چند لمحے کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر گھڑی دیکھی اور بولا۔
"اچھا خدا حافظ"
لنڈا کھڑی ہو گئی۔ پھر دروازے تک اسے چھوڑنے آئی
جب وہ گیا تو لنڈا اسے دور تک جاتا دیکھتی رہی۔ وہ بھی مڑ مڑ کر ہاتھ ہلاتا رہا۔
لنڈا واپس کمرے میں آئی۔ ادھر ادھر پڑے نوٹ سمیٹے اور سامنے میز پر ترتیب سے رکھتے ہوئے شمار کرنے لگی پورے پانچ ہزار تھے۔
خوشی سے وہ بہکنے لگی۔ صوفے کی پشت سے سر لگا کر وہ کتنی ہی دیر رنگین رنگین سے سپنے دیکھتی رہی۔ خمار بھی خمار تھا ایک ہی کیف تھا۔
لیکن

جب وقت گزرنے لگا۔ کیف و سرور کی کیفیت ٹوٹی تو اپنے فعل پر اسے ندامت محسوس ہوئی پیسے کی خاطر اس نے براؤن سے بیوفائی کی تھی۔ براؤن جو اس کا جانثار قسم کا شوہر تھا اور جو صرف اس کی خاطر کمانے کو سونے دور گیا تھا عرب کے گرم ریگستانوں میں چلچلاتی دھوپ اور جھلسا دینے والی گرمی میں دن رات ایک کر کے پیسہ کمانے گیا تھا۔

اس نے صوفے کی پشتی پر سر رکھ دیا اور ندامت کے دو آنسو اس کے ہاتھ کی الٹی ہتھیلی پر پھیل گئے۔

سارا دن اس کی طبیعت پژمردہ اور پریشان رہی لیکن جب مسز مورس اپنے پیسے لینے کے لئے زور زور سے پاؤں پٹختی آ پہنچی تو اس کے تقاضے سے پہلے ہی اس نے دو سو ڈالر اس کی طرف نخوت سے پھینک دیئے۔ پھر ٹیلر کا قرضہ بھی اس نے چکا دیا اور اپنے خوبصورت ایوننگ ڈریسز بھی گھر لے آئی۔ ان سب باتوں نے اسے فراغت اور تسکین کا احساس دلایا تو ذہن پر چھائی پژمردگی اور ندامت کی دھول دھل گئی۔

اسی ہفتے اس نے بڑی فراخدلی سے باقی پیسے بھی خرچ کر ڈالے بہت سی ضروری اور غیر ضروری اشیاء خرید لائی اور ان چیزوں کی نمائش کے لئے اپنے دوستوں کو پر تکلف دعوت بھی دے ڈالی۔

صبح جب وہ اپنا گھر ٹھیک کر رہی تھی۔ اسے براؤن کا خط ملا۔ خط کو اس نے کھولنے سے پہلے ہاتھوں سے جانچا۔ لفافے میں کاغذ کے سوا کچھ نہیں تھا بے زاری سے اس نے خط کھولا اور اس کی نگاہیں سطور پر رینگنے لگیں۔

خط پڑھتے پڑھتے وہ چونکی۔ کاغذ اس کے ہاتھوں میں کانپنے لگا۔ اس کی سبزی مائل نیلی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں اس کا سنہری رنگ فق ہو گیا اس سے کھڑا نہ رہا جا سکا۔ ایک چیخ نما آہ کے ساتھ وہ تیورائی۔ اور صوفے پر گر گئی خط اس کے ہاتھ سے چھٹ گیا۔ اور قالین پر جا گرا۔

خط

جس میں براؤن نے پیار و محبت کی پرخلوص باتوں کے بعد لکھا تھا۔ میں نے [illegible] نامی شخص کے ہاتھ تمہیں پانچ ہزار ڈالر بھجوا دیئے ہیں۔ وہ میرا ساتھی ہے اور چھٹی پر جا رہا تھا۔ ڈاک کے ذریعے بھیجتا تو تمہیں دیر سے ملتے۔ تمہیں [illegible] اس کے ہاتھ بھجوا دیئے ہیں امید ہے تم [illegible]

لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ

اس گرانی کے زمانے میں غریب لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بڑا ہی دشوار ہو گیا ہے۔ شادیاں شادیوں ہی کی طرح ہوتی ہیں۔ لچکے ٹھپے سے کپڑوں کو چمکانے اور بھڑکانے والی چیزیں بھی اتنی گراں ہو گئی ہیں کہ ان کا خریدنا آسان نہیں رہا۔ ایک دوپٹہ کے لئے معمولی سا لچکا بھی لیا جائے تو بیس پچیس روپیہ سے کم میں نہ آئے گا۔

پتلی سی کرن بھی آنچل میں لگائیے تو بیس روپیہ میں آئے گی۔ شادیوں کے دسیوں جوڑوں کے لئے یہ سب لیا جائے تو سینکڑوں روپیہ صرف ہو جاتا ہے پھر شادی بیاہ پر ہی منحصر نہیں خواتین اور لڑکیاں عام دنوں میں لچکے لگے دوپٹے استعمال کرتی ہیں۔ سورتی بیلیں اور چھپا چمکی وغیرہ۔ لگا کر دوپٹے اور ساریاں پہنتی ہیں۔

ان مشکلات کا حل سائنسدانوں نے یوں نکالا ہے کہ پلاسٹک کا سامان تیار کر دیا اور ایسا کہ چاندی سے زیادہ دلکش اور بھڑکیلا یہ بھی نہیں کہ استعمال سے کالا پڑ جائے یا خراب ہو جائے اور دام نسبتاً بہت ہی کم۔ نائلون کے ستارے سنہرے ستاروں کو ماند کرتے ہیں۔ یہ اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ ایک تولہ میں لاتعداد چڑھتے ہیں ان کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اس طرح کا تمام سامان - - - آپ کو

ہند پاک کرکٹ ٹسٹ کے بارے میں ایک مولانا کا فتویٰ

برقؔ آشیانوی عرف خانے خانہ

درون خانہ سے بیرون خانہ تک

ملک کے ایک ماہ نامے میں ایک نہایت ہی اہم بلکہ مہتم قسم کی خبر ہماری نظر سے گذری۔ جس سے ہم ایک پریشانی میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ وہ خبر یہ ہے کہ سنہ ۱۹۷۸ء کے اواخر میں پاکستان میں کھیلے جانے والے ہند پاک کرکٹ ٹسٹ سے متعلق پاکستان کے ایک مولانا نے یہ فتویٰ صادر فرمادیا ہے کہ جتنے لوگوں نے یہ ٹسٹ دیکھا ہے وہ سب دائرۂ اسلام سے خارج ہیں گویا ان تمام لوگوں کو اسلام کے "دودھ" میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا گیا ہے۔ ہم بھی آئے دن فتاویٰ صادر فرماتے رہتے ہیں۔ اگرچہ ہم نہ مولوی ہیں نہ مولانا اور نہ ہی کوئی سند یافتہ عالم، بلکہ ادیب ہیں اور ادب میں بھی مزاح نگاری ہمارا خاص موضوع ہے البتہ صورت شکل وضع قطع ضرور مولانا کی بنا رکھی ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی ایک فتویٰ صادر فرمادیا تھا کہ جو لوگ ہوائی جہاز سے سفر کرکے حج کو جاتے ہیں ان کا حج قبول نہیں ہوتا۔ لیکن اس فتوے پر لوگوں نے ہمارا مذاق اڑانا شروع کردیا تو ہم نے صاف کہدیا کہ بھائی ہم ایک مزاح نگار ہیں اور ہماری اکثر باتیں مسخرے پن کی ہوتی ہیں اس لحاظ سے ہمارا فتویٰ بھی ایک قسم کا مزاح یا مسخرہ پن ہے آپ لوگ اس پر سنجیدگی سے کیوں غور کرتے ہیں۔ غرض مزاح نگاری ایک ایسی ڈھال ہے جس سے ہم اپنی کسی نامعقول بات کو سنبھال لیتے ہیں۔ لیکن پاکستان کے مولانا کے بارے میں ہمیں اچھی طرح یقین ہے کہ وہ کوئی مزاح نگار نہیں ہیں۔ البتہ فتویٰ نگار ضرور ہونگے جبھی تو انھوں نے متذکرہ صدر فتویٰ صادر فرمادیا ہے۔ اور اس شاندار فتوے پر انھیں ہم مفتی اعظم مان لینے کے لئے تیار ہیں۔ اس لئے کہ ویسے ہندوستان اور پاکستان میں ایک سے ایک بڑھ کر عالم اور مفتی موجود ہے لیکن یہ دیکھ کر بڑا افسوس بلکہ دلی رنج ہوا کہ اس باریک نکتے کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں کی حالانکہ مذہب اسلام کا یہ نہایت اہم مسئلہ ہے۔ جس پر دین و ایمان کا کلی انحصار ہے۔ دنیائے اسلام کو پاکستان کے مولانائے موصوف کا شکر گذار ہونا چاہئے بلکہ ایک سپاسنامہ شکر گذاری اُن کی خدمت میں پیش کرنا چاہئیے کہ انھوں نے اس اہم مسئلے کو نہ صرف اٹھایا بلکہ اٹھا کر اس زور سے زمین پر پٹکا کہ مذکورہ کرکٹ ٹسٹ دیکھنے والے سارے مسلمان دائرۂ اسلام سے یکلخت خارج ہوگئے اور ہونا بھی چاہیئے۔ بھلا ان نادان لوگوں کو ایسا عظیم بلا عظیم تر گناہ کرنے کی جرأت کیسے ہوئی کہ ہند پاک کرکٹ ٹسٹ دیکھیں۔ ہمارا جہاں تک خیال ہے غلطی ٹسٹ دیکھنے والوں کی نہیں ہے بلکہ دنیائے اسلام کے سارے علما و مشائخین پر اس کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ تیس چالیس ہزار مسلمان ایک گناہ عظیم کے مرتکب ہو رہے اور وہ ہیں کہ ایک کرکٹ ٹسٹ دیکھنے والے تماشائی کی طرح خاموش یہ تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ تمام گنہگار ایک مولانا کے ہاتھوں اپنے کیفر کردار کو پہنچ کر دائرہ اسلام سے خارج ہوگئے۔ جب یہ ذمہ داری ہند و پاک کے علما و مشائخین پر رکھی جائے گی تو سب اپنی اس کم مائگی کا اعتراف کرلیں گے ان کی نظر ایک نازک اور بال سے باریک مسئلے کی طرف نہیں گئی سو اس مسئلہ کا تفصیلی جائزہ لیا جائے یا پھر سیاسی زبان میں اس کی چھان بین کی جائے تو یہ بات آئینہ کی طرح صاف نظر آجائے گی کہ پاکستان کے مولانائے موصوف بھی خود اس ذمہ داری سے نہیں بچ سکتے۔ اس لئے کہ انھوں نے اپنا فتویٰ کرکٹ ٹسٹ شروع ہونے سے پہلے صادر نہیں فرمایا ورنہ ہی کھلے بندوں اس امر کا اعلان فرمایا کہ جو بھی مسلمان کرکٹ ٹسٹ دیکھے گا وہ دائرۂ اسلام سے خارج کردیا جائے گا۔ جس کا پورا اختیار مولانائے موصوف کو ہی حاصل تھا۔ غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ خود مولانائے موصوف کا مقام دائرۂ اسلام میں کہاں ہے۔ آیا اس اسٹیڈیم کے اندر ہے جہاں ٹسٹ کھیلا گیا یا اس کے باہر ہے۔ ہمیں تو یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ خود بھی ٹسٹ دیکھنے والے گناہ گاروں کے ساتھ دائرۂ اسلام سے باہر نکلے

ہیں۔ بہرحال یہ مسئلہ تو علمائے ناواقف اور مولانائے واقف (واقف مرادآبادی نہیں) سے متعلق ہے اس پر ہم اپنی رائے کو قطعیت نہیں دے سکتے۔ البتہ ہمیں اب اپنی فکر سر پر سوار ہو گئی ہے اس لئے کہ سارے جہاں کا درد ہمارے ہی سر میں ہے آپ کہیں گے کہ اصل مصرعہ میں سر کے بجائے "جگر" کا لفظ ہے تو عرض ہے کہ ہم اپنے جگر سے نہیں بلکہ سر سے سوچتے ہیں۔ اور جب بہت زیادہ سوچتے ہیں اور پریشان ہو جاتے ہیں تو ہمارے سر میں درد ہوتا ہے جگر میں نہیں۔ جس کے نتیجہ میں ہم خود لوگوں کے لئے دردِ سر بن جاتے ہیں۔ دنیا کے کسی گوشے میں کسی فرد یا جماعت کو کسی قسم کا درد ہوتا ہے تو ہمارے سر میں بھی شدید درد ہونے لگتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے دنیا کے کسی غیر ترقی یافتہ ملک کو درد ہونے لگتا ہے تو امریکہ، روس یا چین کے سر میں درد ہونے لگتا ہے اور یہ تینوں ممالک میں سے کوئی نہ کوئی [illegible] ڈاکٹر پہنچ جاتا ہے اور ایسا علاج کر دیتا ہے کہ مرض اور مریض دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ غرض جب دوسروں کو درد ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں ہمارے سر میں درد ہونے لگتا ہے اور وہ اپنے سر کو چھوڑ کر ہمارے سر کو دوا لگاتے ہیں اس لئے کہ جیسے ہی ہمارے سر کو دوا لگائی جائے ان کے سر کا ہی نہیں بلکہ جس قسم کا بھی درد ہو کم ہو جاتا ہے۔ درد کی ایک خاص قسم بھی ہے اور وہ ہے قوم کا درد۔ یہ قوم کے ہمدردوں کو ہوتا ہے لیکن یہ لوگ ہمارے سر میں دوا نہیں لگاتے بلکہ براہ راست قوم کے سر میں لگاتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم سیاست سے ہمیشہ کنارہ کش رہے جس کی وجہ سے ہمارے سر میں دوا لگانے سے قوم کے درد میں مبتلا مریضوں کو آج تک فائدہ نہیں ہوا۔

بات سے بات نکل گئی اور بہت دور تک نکل گئی چنانچہ اس کو پکڑ کر واپس لاتے ہیں۔ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہم بہت پریشان ہیں۔ اس لئے کہ ہم مسلمان ہیں اور وہ بھی پکے نہیں بلکہ پکے مسلمان [illegible] اس [illegible] ہیں کہ نہ جانے کس گھڑی کفر کے درخت سے کچے پھل کی طرح گر پڑیں۔ [illegible] کی بات علیحدہ رہی لیکن ابھی تک [illegible] اسلام کے درخت پر لٹکے ہوئے ہیں اس لئے [illegible] ٹسٹ دیکھنے والوں [illegible] سر پر سوار ہو گئی ہے [illegible]

ہمیں نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی اور [illegible] انکار کر دیا ہے بالکل مختلف ہیں۔ ہمارے سر پر سوار ہو گئی ہیں جس کی وجہ سے ہماری راتوں کی نیند اور دن کا آرام حرام ہو گیا ہے۔ فکر [illegible] سے [illegible] تک یہ مسئلہ اس لئے پھیل گیا ہے کہ یہ صرف ٹسٹ دیکھنے والوں تک محدود نہیں رہا بلکہ عشق پیچاں کی بیل کی طرح پھیل کر کئی اور لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ کیونکہ مولانائے موصوف نے تو صرف ٹسٹ دیکھنے والوں کے بارے میں فتویٰ صادر فرمایا ہے۔ ان لوگوں کے ایمان کے بارے میں کچھ ارشاد نہیں فرمایا جن گنہگاروں نے ٹیلی وژن پر اس ٹسٹ کو دیکھا ہوگا۔ ایسے گنہگار تو ساری دنیا میں ملیں گے۔ اس کے علاوہ وہ لوگ بھی اس مسئلے سے دوچار ہیں جنہوں نے دن بھر [illegible] لے کر ریڈیو کے سامنے زانوئے ادب یوں تہہ کئے بیٹھے سن رہے تھے جیسے کوئی اپنے پیر و مرشد کے سامنے بیٹھا اپنی عاقبت کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہو یا کوئی لیڈر نجومی کے سامنے بیٹھا انتخابات کے موقع پر اپنی ہار یا جیت کے بارے میں دریافت کرتا ہو۔ نہ جانے کیوں مولانائے موصوف کی تیز نظر ان گنہگاروں کی طرف نہیں گئی۔ اسی طرح ٹسٹ کو ٹیلی وژن پر دیکھنا یا ریڈیو پر کامنٹری سننا بھی تو گناہ عظیم ہے کیونکہ جب کسی چیز کا دیکھنا گناہ ہے تو اس کا حال بھی پورے خضوع و خشوع کے ساتھ سننا بھی گناہ ہے۔

اب ہم مولانائے محترم سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا فرماتے ہیں مولانا ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ٹیلی وژن پر ٹسٹ دیکھا اور ریڈیو پر کامنٹری سنی۔ اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان گنہگاروں کو کیا سزا ملنی چاہیے۔ ہمارے ناقص خیال میں ٹیلی وژن پر ٹسٹ دیکھنے والوں کی سزا تو وہی ہونا چاہیے جو اسٹیڈیم میں جا کر دیکھنے والوں کو صادر فرمائی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ ان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا جانا چاہیے۔ رہا ان لوگوں کا مسئلہ جنہوں نے ٹسٹ کا آنکھوں دیکھا حال کانوں سے سنا۔ ہمارے ناقص خیال میں کانوں سے کیا ہوا گناہ آنکھ سے کئے ہوئے گناہ سے کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ آنکھوں کی بصارت کے بغیر انسان چل پھر نہیں سکتا تو کانوں کی سماعت کے بغیر [illegible] چل پھر سکتا ہے [illegible] ٹسٹ کے علاوہ [illegible] ہم ان گنہگاروں کے بارے میں مولانائے موصوف کے فیصلے کے منتظر ہیں [illegible] سزا ملنی چاہیے۔ [illegible]

پیش کرنے والوں کے علاوہ کئی اور لوگ بھی ہوجاتے ہیں (ارادی یا غیر ارادی طور پر) مثلاً صاحبزادے ریڈیو کو فل والیوم کی حد تک آن کرکے کامنٹری سن رہے ہیں جس کی آواز ان کے معصوم والدین کے کانوں میں بھی داخل ہوجاتی ہے۔ والدین پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ صاحبزادے گھر میں اتنا بڑا گناہ کررہے سن لیتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا غم کھائے جارہا ہے کہ اس صف میں تو خود ہم بھی آگئے ہیں۔ اس لئے کہ لڑکپن اور جوانی میں ہم نے بھی کرکٹ کھیلا ہے لیکن پاکستان میں ٹسٹ نہیں کھیلا کیونکہ اس زمانے میں پاکستان نے جنم نہیں لیا تھا بلکہ ابھی بطن مادر ہندستان ہی میں تھا۔ البتہ پیدائش کے آثار نمودار ہوچکے تھے۔ اب بھی جب کان میں کامنٹری کی آواز پڑتی ہے تو گوش بر آواز بلکہ ہمہ تن گوش ہوکر سننے لگتے ہیں۔

اس کے بعد اُن لوگوں کا نمبر آتا ہے جو بازار سے گذرتے ہیں تو اُن کے کانوں میں کرکٹ ٹسٹ کی کامنٹری غیر ارادی طور پر داخل ہوتی رہتی ہے۔ یہ بیچارے تو مفت میں گناہ گار ہوجاتے ہیں۔ اس لئے کہ بازار میں ہر دوسری دوکان سے ٹسٹ کے "آنکھوں دیکھا حال" کی آواز زبردستی کانوں میں داخل ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو کم از کم اتنا بھی شعور نہیں کہ باہر نکلتے وقت کانوں میں روئی ٹھونس لیں۔ ہم نے تو صرف بازار کا ذکر کیا ہے۔ اب تو نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ہم بالکل بے گناہ اپنے گھر میں بیٹھے ہیں کہ پڑوسی کے گھر سے کرکٹ ٹسٹ کی کامنٹری سنائی دے رہی ہے مطلب یہ کہ گناہ ہمارے کانوں میں ٹھونسا جارہا ہے۔ اگر اسی کے علاج کے طور پر ہم کانوں میں روئی ٹھونس لیتے ہیں تو یہ مشکل آن پڑتی ہے کہ بیوی چلا چلا کر کہہ رہی ہیں کہ کھانا میز پر لگا دیا گیا ہے، کھا لیجئے۔ اور ہم ہیں کہ "آسمان جنبد زمین جنبد، برق صاحب نمی جنبد" کے مصداق اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہیں لیتے۔

آخر میں اس مسئلے کے نہایت ہی اہم پہلو کی جانب مولانائے موصوف کی توجہ مبذول کروانا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ اس گناہ کی اولین ذمہ داری دیکھنے والوں سے زیادہ خود کرکٹ کھیلنے والوں پر آتی ہے۔ اگر وہ چند بے ایمان مسلمان ٹسٹ ہی نہ کھیلتے تو یہ ہزاروں دیکھنے والے اور کروڑوں سننے والے معصوم مسلمانوں کا ایمان نہ بگڑتا۔ چنانچہ ہم مولانا سے ان مسلمانوں کے بارے میں کسی موزوں ومناسب فتوے کے طالب ہیں جنھوں نے خود کرکٹ کھیل کر دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کو دائرۂ اسلام سے خارج کردیا۔ اس سلسلے میں ہم اپنی ناقص رائے مولانا کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ "اگر حضور" "قدر زہے عز و شرف" ہماری رائے یہ ہے کہ جن مسلمانوں نے کرکٹ ٹسٹ کھیلا اُن تمام کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دینا چاہیئے۔ لیکن پھر ایک مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے۔ کھیلنے والے یہ عذر کریں گے کہ اس میں اُن کے قصور سے زیادہ ان لوگوں کا قصور ہے جنھوں نے اس ٹسٹ کا انتظام کرکے نہ صرف ہمارا ایمان بگاڑ دیا بلکہ دیکھنے اور سننے والوں کے ایمان کو بھی خطرہ میں ڈال دیا۔ یہ عذر ایک حد تک قابل سماعت ہے۔ اس کے ساتھ ہی ذمہ داری پاکستان کی حکومت کے سر آجاتی ہے جس نے اس ٹسٹ کی اجازت دی۔ ہم مولانا سے گذارش کرتے ہیں کہ حکومت کے بارے میں کوئی فتویٰ صادر فرمادیں کیونکہ اس سارے فساد کی جڑ حکومت پاکستان ہے جس نے بھارت کی ٹیم کو دعوت دیکر کرکٹ ٹسٹ کا انتظام کیا۔ اور اس میں مسلمان کھلاڑیوں کو کھیلنے کا حکم دیا۔ جس کے نتیجے میں نہ صرف پاکستان بلکہ ساری دنیائے اسلام کا ایمان خطرے میں پڑگیا ہے۔

اس تمام بحث کو ہم نے جب ملّا جبر الیہود کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے پوری گفتگو سن کر کہا ـــــ "میاں ہٹاؤ بھی ـــــ کس فضول بحث میں پڑے ہو۔ اس کا حل تو نہایت آسان ہے۔ وہ یہ کہ مولانائے موصوف کو کچھ عرصے کے لئے مینٹل ہاسپٹل MENTAL HOSPITAL میں شریک کروادیا جائے اور مکمل آرام لینے کی ہدایت کی جائے تو انشاء اللہ بہت جلد صحت یاب ہوجائیں گے"۔ کچھ دیر رک کر ملّا جبر الیہود نے کہنا شروع کیا ـــــ "ادھر میں ایک دوسرے مسئلے پر غور کررہا ہوں۔ وہ یہ کہ بازاروں میں تو عریاں پوسٹر لگائے جارہے ہیں ان کو دیکھ کر ہر مسلمان کا ایمان خطرے میں پڑجاتا ہے۔ جب مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ کیا گیا کہ عریاں پوسٹر دیکھنا گناہ ہے تو دیکھنے والوں نے یہ کہہ کر ہمارا منھ بند کردیا کہ ـــــ "ملّا صاحب پہلی نظر غیر ارادی طور پر پڑجاتی ہے جو کوئی گناہ نہیں ہے"۔ یہ جواب دیکر پہلی نظر کو اس قدر طول کردیتے ہیں کہ پوسٹر کا پورا جغرافیہ پڑھ لینے کے بعد جب نظر بھرجاتی ہے تو پھر دوسری نظر ڈالنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی جو گناہ ہے"۔ مولانائے موصوف کے بارے میں ملّا جبر الیہود کا فیصلہ سننے کے بعد ہمارے سر کا ایک دادا تو کم ہوگیا جو کرکٹ ٹسٹ کے بارے میں

(باقی آئندہ)

پردیش کے چاروں طور ترقی کے مصمم ارادے

مختلف مسائل کو حل کرنے میں سب کا اشتراک

نئی حکومت کے ذریعہ عمل میں آنے والے مخصوص کام

- پورے پردیش میں قانون کا احترام کرانا۔
- پردیش کے ۶۰ لاکھ بے روزگاروں کے لئے روزگار فراہم کرنا۔
- گاؤں میں کھیتی پر منحصر لوگوں کے لئے متبادل روزگار کے ذرائع فراہم کرنا۔
- بڑے روزگاروں کو فروغ دیتے وقت اس بات کا خیال رکھنا کہ معاون روزگار زیادہ تعداد میں کامیاب ہو سکیں، جس سے روزگار کی سہولتیں فراہم کی جا سکیں۔
- گاؤں میں چھوٹے چھوٹے روزگار سنہی روزگاروں کے فروغ کی کوشش کرنا۔
- کھیتی اور صنعتی پیداوار بڑھانے کی مسلسل کوشش کرنا۔
- گاؤں میں صنعتوں اور ٹیوب ولوں کو زائد سے زائد بجلی فراہم کرنا۔
- گاؤں میں پینے والے پانی کا معقول انتظام کرنا۔
- تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں پُرامن فضا میں تعلیم کے لئے سازگار ماحول پیدا کرنا۔ خلاف ورزی میں قانونی کارروائی کرنا۔

شائع کردہ

محکمہ اطلاعات و نشریات ———— اترپردیش

9-78

گیارہ توپوں کی سلامی

گلزار نگار

لڑکے کا باپ۔ صاحب! واقعی آپ کی لڑکی صورت اور سیرت کے اعتبار سے ہزاروں میں ایک ہے۔ اس پر علم و عقل خانگی، شعور اور سلیقہ سب ہی کچھ ہے ماشاء اللہ۔ اور آپ نے بہت اچھا کیا کہ کلام مجید کی قرأت اور تفسیر سکھائی۔ لڑکے کی ماں کو یہ رشتہ بہت پسند ہے۔ انھوں نے برادری والوں کو بتانے کے لئے دریافت کیا ہے کہ آپ جہیز میں کون کون سے زیورات دے رہے ہیں؟۔

لڑکی کا باپ۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں غریب آدمی ہوں۔ ایک تولہ سونے کی بالیاں دے دوں گا۔ اور وہ بھی اس کی مرحومہ ماں کی۔

لڑکے کا باپ۔ بہت ہے اب کہاں پرانے زمانے کی چیزیں نصیب۔ اس دور میں خالص سونا ہوتا تھا۔ مگر کانوں میں ایک تولہ سونے کی بالیاں اس وقت رونق دیتی ہیں جب گلے میں دو تولے کا ہار بھی ہو۔

لڑکی کے باپ نے کہا۔

آپ کہتے ہیں تو میں کوشش کروں گا۔

لڑکے کے باپ نے کہا۔

دنیا میں سب کچھ کوششوں سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

جی ہاں کوشش ہمت اور حوصلہ بڑی چیز ہیں۔

ہمت مرداں مدد خدا۔ اور جب آپ ہار کے لئے کوشش کریں گے تو لگے ہاتھ دو تولہ کنگنوں کے لئے بھی کوشش کر لیجئے۔ اس میں آپ ہی کی عزت اور نیک نامی ہے۔ بھلا آپ کی لڑکی اور صرف کانچ کی چوڑیاں پہن کر آئے۔

لڑکی کا باپ۔ کیا علم کا زیور کوئی کم ہے؟

لڑکے کا باپ۔ جی نہیں۔ ماشاء اللہ بہت ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ اس زیور کی قدر کرنے والے بہت کم ہیں اور وہ بھی مشرقی علم کی۔ اگر آپ ماڈرن سوسائٹی کو شکست دینا چاہتے ہیں تو سونے کے زیورات سے دیں۔ ایک گلے کا ہار، ایک دو تولے کا ہار اور دو تولے کا کنگن بہت خوب رہے گا۔ اور یہ آپ کی ہمت و مردانہ کے آگے کچھ مشکل نہیں۔ اللہ پر بھروسہ کر کے آج ہی آرڈر دے دیں۔ رقم کا انتظام بھی ہو جائے گا اور ہاں فرنیچر کا کیا خیال ہے؟

لڑکی کا باپ۔ بستر سمیت ایک مسہری دے رہا ہوں۔

لڑکے کا باپ۔ بہت بڑی بات ہے اور ڈرائننگ ٹیبل کے ساتھ آپ کتنی کرسیاں دے رہے ہیں؟

لڑکی کا باپ۔ میں نے ابھی غور نہیں کیا۔

لڑکے کا باپ۔ آج کل بیڈ روم اور ڈرائنگ روم کے فرنیچر کے کئی درجن ڈیزائن نکل آئے ہیں۔ کوئی بات نہیں اگر آپ نے اپنی مصروفیات میں ابھی تک ڈیزائن کا انتخاب نہیں کیا۔ کل میرے ساتھ مارکیٹ چلئے۔ وہاں ہم ایک رائے پر متفق ہو جائیں گے اور وہاں ایک ڈریسنگ ٹیبل بھی لازمی ہے۔ آج کل کی لڑکیوں کا مزاج آپ جانتے ہی ہیں۔ ہر لڑکی اپنا ڈریسنگ ٹیبل الگ رکھتی ہے۔ اور اپنا سامان آرائش بھی۔

لڑکی کا باپ۔ معاف کیجئے گا۔ میں غریب آدمی ہوں اور . . . .

لڑکے کا باپ۔ آج کل غریبوں کے لئے فرنیچر خریدنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ میں ایک ایسی دکان سے آپ کی بات کرا دوں گا۔ جہاں سے آسان قسطوں پر چیزیں ملتی ہیں۔ آپ صرف چوتھائی قیمت دیکر ایک اسٹامپ کاغذ لکھ دیجئے گا اور بس۔ انشاء اللہ خیر سلا۔ لڑکے کی ماں نے یہ بھی پوچھا ہے کہ دولہا کے نکاحی جوڑے کے لئے آپ نے کتنی رقم رکھی ہے؟

لڑکی کا باپ۔ تین سو۔ اگر آپ فرمائیں گے تو ساڑھے تین سو کر دوں گا؟

لڑکے کا باپ۔ بہت کم ہے۔ اس میں تو اچھا کیا شلوار

کبھی تیار نہیں ہوگا۔ آج کل درزی ایک سوٹ کی سلائی چار پانچ سو روپے لے رہا ہے۔ بہرکیف آپ کو نقد روپے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ لڑکے کے ہمراہ مارکیٹ چلے جائیے گا —— آپ بل ادا کر دیجئے گا۔ وہ اپنی پسند کا تمام ضروری سامان خرید لے گا۔ اگر روپے کی ضرورت ہو تو میں آپ کے مکان پر بینک سے قرض لے لوں گا۔

لڑکی کا باپ۔ بھائی صاحب! میں ایک فقیر اور درویش آدمی ہوں۔ درویش پسند ہوں۔ اور آپ سے درویش نوازی کی توقع رکھتا ہوں۔

لڑکے کا باپ۔ جی ہاں! ہمارے آباؤ اجداد بھی درویش تھے۔ مگر اب زمانے کے نئے نئے تقاضے درویشی کو بدل رہے ہیں۔ ہم لوگ آپ ہی کی عزت اور نیک نامی کے لئے یہ تھوڑے بہت مختصر سامان کے لئے کہہ رہے ہیں۔ درحقیقت آپ خود عقل مند ہیں اور زمانہ شناس ہیں۔ اور ہاں! لڑکے کی ماں پوچھ رہی تھی کہ آپ لڑکے کو کتنی سلامی دے رہے ہیں۔

لڑکی کا باپ۔ جی بس۔ یہی گیارہ توپوں کی سلامی۔

کیا آپ کو علم ہے کہ

لکھنؤ کس لئے مشہور ہے

اگر نہیں تو ہم آپ کو بتاتے ہیں

لکھنؤ اپنی مخصوص تہذیب اور مشرقی تمدن کے لئے مشہور ہے۔ جس کا کہیں جواب نہیں گو یہ تہذیب اب زمانے کے ہاتھوں رفتہ رفتہ مٹ گئی ہے پھر بھی ہاتھی لاکھ گھٹے تب بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ گری حالت میں بھی ایک نمونہ ہے۔ لکھنؤ کے مٹی کے کھلونے اور پھل وغیرہ جو دیکھنے والوں کو متحیر کر دیتے ہیں اصل اور نقل میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

آصف الدولہ جن کے متعلق مشہور تھا جس کو نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ، کا مشہور تاریخی امام باڑہ ریزیڈنسی ماہی چھن صاحب کی کوٹھی، بوٹانیکل گارڈن، بنارسی باغ، زندہ عجائب گھر، چھتر منزل، قیصر باغ۔ ریوڑیاں جسے کھٹیاں بھی کہتے ہیں۔ عطریات اور چکن کا کام اور ان سب سے زیادہ زردوزی، کامدانی اور بادلہ وغیرہ کے کاریگر جن کا کام سارے ہندوستان میں مشہور ہے اور ان کاریگروں کا بہترین کام۔

رونق دکنی
سیمابی

میں کہ دکھیاری ہوں

میں کہ دکھیاری ہوں، ایسی نہ کوئی بات کرو:
کیوں برانگیختہ آخر مرے جذبات کرو!

سچ سہی، تم وہی خالد ہو، وہی میں انجم
یاد ہے آج بھی جب ہم نے کیا تھا بی۔ اے
ہاتھ میں ہاتھ لیے دی تھی مبارک بادی
میں نے محسوس کیا ہاتھ میں ہلکا سا دباؤ
شرم سے میں نے پھر آنکھیں نہ ملائیں تم سے
دل کی دھڑکن جو بڑھی، رخ پہ پسینہ آیا
تم نے پیغام محبت دیا ایسے میں مجھے
لٹ جو آوارہ تھی، انگلی سے سنواری تم نے
ہم نے باندھا تھا بصد آرزو پیمانِ وفا
میں تھی ایمانِ وفا، تم تھے مری جانِ وفا
یعنی مستقبل رنگیں میں تھے ہم تم گم صم
نام اللہ کا، لو، ضائع نہ اوقات کرو
میں کہ دکھیاری ہوں، ایسی نہ کوئی بات کرو

روز آنے لگے میرے لئے پیغام کئی
تجھے ہر لمحہ جو پیمانِ وفا کا تھا خیال
میں نے ٹالا انہیں، اور تم نے پذیرائی کی
لڑکی والوں کے تھا جانب سے جو سامانِ جہیز
ریڈیو گرام، فریج اور نیا فرنیچر
ساتھ نقدی کے تھا فہرست میں اچھا سکوٹر
حرص کے قدموں میں تم جھک گئے بے چون و چرا
طوطا چشمی سے لیا کام، وفا بھول گئے
مجھ سے منہ موڑ لیا، راستہ کترانے لگے
گیسوئے کبر رخِ وقت پہ لہرانے لگے!
دل کو تھامے ہوئے میں نے سہے آلام کئی
اب نہ پھر کوشش تجدیدِ ملاقات کرو
میں کہ دکھیاری ہوں، ایسی نہ کوئی بات کرو

اور کس دھوم سے پھر نکلی تمہاری بارات
تم تھے پھولوں میں لدے شان سے گھوڑے پہ سوار
روشنی میں وہ جھلکتے ہوئے رنگیں ملبوس
گونج شہنائی کی، وہ خویش و اقارب کا ہجوم
ذرا یاد تمہیں، سب ہی "انجم" کا دیار
میں نے دیکھا بھی جھروکے سے یہ شادی کا جلوس

تم تھے بزدل میری جانب نہ اُٹھائیں آنکھیں
اس طرح ٹوٹ گیا باب تمنا کا طلسم
تھی جو مقصود مجھے سعیٔ حاصل کی پرکھ
ہوگئی وہ بھی بالآخر حق و باطل کی پرکھ

جاں گسل تھی بخدا کتنی یہ تلخیٔ حیات
رات کو دن نہ کرو، دن کو نہ اب رات کرو
میں کہ دکھیاری ہوں، ایسی نہ کوئی بات کرو

ہوئی ماں باپ کو پھر فکر میری شادی کی
مندمل اب بھی ہوئے تھے نہ دلِ زار کے زخم
بے وفائی سے لگی ذہن کی وہ ٹھیس کہ بس!
انتقاماً نہ سہی، فرض کو دے دی ترجیح
بَرجو آیا سرِ تسلیم جھکایا میں نے
چارہ کار ہی اب کیا تھا بھلا میرے لئے
سادگی سے ہوئے شادی کے ادا سارے رسُوم
میری خوابیدہ تمناؤں نے لی انگڑائی
نیک طینت میرا شوہر تھا جواں سال بھی تھا
خوش وضع اور خوش اخلاق تھا خوش حال بھی تھا

اور اُدھر فکرِ مشیت کو تھی بربادی کی
کیوں بھلا شکوۂ نیرنگیٔ حالات کرو
میں کہ دکھیاری ہوں، ایسی نہ کوئی بات کرو

یہ مشیت ہی کی برکت تھی ہوئے دونوں شکار
سایۂ شوہرِ مشفق سے ہوئی میں محروم
چند ہی دن میں لیا بیوی نے بھی تم سے طلاق
حاصلِ زر کی ہوئیں کوششیں ساری بیکار
اور تم آگئے پھر شادی کا پیغام لئے
کہو خالد! اس حماقت کا بھی تک ہے کوئی؟
لٹ جو آوارہ تھی وہ آج بھی آوارہ سہی
کشش آگیں سہی یہ جسمِ جواں سال میرا
ذہن اور دل میں مگر جذبِ بغاوت کیوں ہو
میں انھیں کی ہوں، امانت میں خیانت کیوں ہو

ذات عورت کی بس اک بار ہی کرتی ہے پیار
دل جو باغی ہے اسے رُوکشِ حالات کرو
کیوں نہ اپنے غلط اقدام سے نادم ہوکر
دلِ آوارہ کو مجبورِ مناجات کرو
میں کہ دکھیاری ہوں، ایسی نہ کوئی بات کرو
کیوں برانگیختہ آخر میرے جذبات کرو؟

رشیدہ مجھ سے کہنے لگی "اگر تم سمجھتی ہو کہ وہ ایک اچھا شوہر ثابت ہو سکتا ہے تو بہتر تھا کہ تم اسے پسند کرتی ہو۔ اس کی گود میں بات ڈال کے تو صاف صاف کہہ دو کہ تم اس سے محبت کرتی ہو۔"

میں نے کہا "توبہ کرو، تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ کیا تم وہ قصہ بھول گئیں جب اس سے میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں تو وہ دیر تک بے باؤں پسار کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے اس طرح بیٹھنے پر مجھے کوئی اعتراض نہ تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا "میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔ میرے ساتھ یہیں سڑک پر بیٹھو اور یہی کہتی رہو کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔" میں نے کہا تھا "تمہارا میرا کون سا خون کا رشتہ ہے کہ ہر وقت بھلے میں یہ محبت جتاتی رہوں۔ میں کبھی کہ تم اچھے شوہر ثابت ہو گے۔ اس لئے میں نے یہ بات کہہ دی تھی۔ لیکن تم اتنے کم ظرف نکلے کہ ایک ہی جملہ سن کر اپنی اصلیت پر آ گئے۔ تمہاری عادتیں کھل کر میرے سامنے آ گئی ہیں۔ اس لئے میں اب کہتی ہوں کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ مجھے جانے دو۔ میں نے پہلے ہی تمہیں کہہ دیا تھا کہ تمہارا میرا خون کا رشتہ نہیں ہے کہ میں تمہاری بری عادتوں کو سہوں۔ آنکھوں دیکھی مکھی کون نگلتا ہے۔"

وہ ایک اچھا شوہر ہے

شمیم اختر

رشیدہ، تمہاری یادداشت تمہاری عمر کی طرح ڈھل رہی ہے۔ تمہیں یاد ہی نہیں رہا کہ اس نے مجھے کیسا ستایا۔ اس میں قصور اس کا نہیں۔ میری غلطی ہے۔ ذرا کسی بچے سے کہہ کے دیکھو کہ تم اس سے محبت کرتی ہو، اول تو وہ فوراً اس بات پر یقین کر لے گا۔ اپنے بارے میں کوئی خوش کن بات کی صحت پر شبہ کرنے کی اسے کیا ضرورت ہے۔ اس کے بعد وہ تمہاری ایک نہ سنے گا۔ تمہیں ہر طرح سے ستائے گا۔ وہ سمجھتا ہے کہ تم اس سے محبت کرتی ہو۔ اس کے بغیر رہ نہیں سکتیں۔ اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی ہو۔ ان خود ساختہ مفروضات کے بل پر وہ تمہارا جینا حرام کر دے گا۔ من مانی کرے گا اور تم سے اپنی ہر ضد منوا کر رہے گا۔ یوں سمجھو کہ وہ ہر ایسی حرکت کرے گا جس سے تمہارا امتحان ہے۔ وہ اپنے ہر عمل سے یہ پرکھنا چاہے گا کہ آیا تم واقعی اس سے محبت کرتی ہو۔ جیسے جیسے اس کا یقین پختہ ہوتا جائے گا۔ وہ اتنی ہی شدت سے بے رحمی اور سنگدلی کے ساتھ تمہیں آزمائے گا۔

رشیدہ بولی "بزرگوں نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ لڑکیوں کی شادی کم عمری میں کرنی چاہئے جب لڑکی کی عمر تیس سال ہو جائے اور وہ غیر شادی شدہ ہو تو شادی جیسے سادہ سے کام کو انجام دینے میں بڑا رنگ دیتی ہے۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں لڑکی کی شادی کر دو تو تمہاری عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ تین چار بچوں کی ماں بن چکی ہوتی ہے جن میں سے ایک بچے کو تو تم دیکھیں جوان ہی سمجھو۔ شوہر کے علاوہ وہ اس کی آمدنی پر بھی ایسی عورت کا مکمل کنٹرول ہوتا ہے۔ اپنا اپنے کے اشارے سے وہ شوہر سے ہر کام لیتی ہے۔ لیکن تم ہو کہ تیس سال کی ہو گئی ہو لیکن ابھی تک نا تجربہ کار ہو اور اس فلسفے میں الجھی ہوئی ہو کہ کون سا مرد اچھا شوہر ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں سوچتیں کہ اچھے شوہر سے کیا کہنا چاہئے۔ شادی کے بعد شوہر سے کس قسم کی گفتگو کرنی چاہئے۔ کیا شوہر سے ہر معاملے پر بحث کے بجائے کوئی مشاورت رکھنا ہے۔ اگر تم میری بات کا برا نہ مانو تو کہوں کہ تمہاری مثال بھی بچے سے مختلف نہیں ہے۔"

"ماں سے بڑھ کر ایک بچے کو کون چاہے گا۔ لیکن وہ کبھی اپنے بچے سے یہ نہیں کہتی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ تجربہ ملا کر یہی گر سکھاتا ہے کہ تم اپنے آپ کو کنٹرول کر دیکھو۔ تم تیس سال کی ہونے کو آئی ہو۔ مجھے علم ہے کہ تم میرے اس جملے پر اعتراض کرو گی۔ تم اصرار کرو گی کہ تم مجھ سے دو سال چھوٹی ہو لیکن میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے دو سال بڑی ہو۔ جب میں تم کو اپنی عمر کے پیمانے سے ناپتی ہوں تو تمہاری عمر تیس سال بنتی ہے اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ عمر چاہے اٹھائیس سال ہو یا تیس۔ خود کو ٹٹولو تو پتہ چلتا ہے کہ اپنی ذات میں آج بھی وہ ننھی سی بچی موجود ہے جس کو طرح طرح کے خوف گھیرے رہتے تھے۔ اسی طرح مردوں کی ذات میں بھی ننھا بچہ موجود تھا۔ جیسے چاہنے کے باوجود ماں یہ نہیں بتاتی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ تمہاری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس جملے کا ... میں پوشیدہ ننھے بچے سے یہ کہہ دوں کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں تو دوسرے ہی لمحے میں وہ مجھے سر کے بل کھڑا کر دے گا۔"

میں نے کہا "میں تمہاری باتوں کا برا نہیں مانتی۔ تم مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہو۔ عمروں میں دو سال کا فرق کوئی کم نہیں۔ میں دوسروں کے تجربے سے سبق سیکھنے کی عادی ہوں۔ کیا تم بھول گئیں کہ ایک بار گھبرا کر تم نے فیصلہ کیا تھا کہ اس طرح اکیلے زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ بغیر سوچے سمجھے کسی سے بھی شادی کرلی جائے۔ تم خوش نصیب تھیں کہ بچ گئیں۔ ورنہ جلد بازی میں کیے ہوئے اس فیصلے کے ہاتھوں زندگی بھر روتی رہتیں، شادی سے پہلے ہونے والے شوہر کے ساتھ چند ڈھکی چھپی ملاقاتوں میں تم کو پتہ چل گیا تھا کہ شادی کے بعد مسلسل عذاب میں زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ تنہا زندگی گزارے۔ بجائے میرے خیال میں فوری فیصلہ کرنے سے بہتر ہے کہ زندگی کے اس پہلو پر فلسفیانہ انداز میں غور کرلیا جائے"

رشیدہ کے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ اسے میری بعض باتیں ناگوار گزری ہیں۔ لیکن اس کی ناراضگی سے مجھے کوئی پریشانی نہ ہوئی کہ ہم دونوں کے تعلقات کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کو سخت سست سناتے رہتے تھے۔ اس سے ہماری دوستی پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ میں نے لائبریری سائنس میں ایم۔ اے کیا تھا۔ تھا وہ ایم۔ ایڈ کرنے کے بعد ایک اسکول میں پڑھاتی تھی اور پرنسپل بننے کی امیدوار تھی۔ میں ایک پبلک لائبریری کی انچارج تھی۔ ہماری ملازمتوں کو تقریباً دس برس کا عرصہ ہو چکا تھا۔ حالات کچھ ایسے رہے کہ بروقت ہماری شادی نہ ہو سکی تھی۔ اسے کی گھریلو الجھنیں تھیں۔ ان کو پس پشت ڈال کر وہ شادی نہ کرسکی۔ میرے لئے ایک اچھا رشتہ آیا تھا لیکن لائبریری سائنس میں ڈپلومہ لینے کیلئے میں لندن چلی گئی مجھے اس کے لئے وظیفہ مل گیا تھا۔ ہم دونوں کی عادت ایسی تھی کہ گزرے ہوئے واقعات پر پشیمان نہیں ہوتے تھے۔ اپنے گھر والوں کی امداد کرکے رشیدہ مطمئن تھی۔ اسے اس بات کا قطعاً افسوس نہ تھا کہ ان کی وجہ سے وہ بروقت شادی نہ کرسکی تھی۔ میں بھی اس بات سے خوش تھی کہ کچھ عرصہ ملک سے باہر گزار آئی تھی۔ اس سے میرے تجربے اور مشاہدے میں اضافہ ہوا تھا۔

میں اور رشیدہ جب مل کر بیٹھتے اور باتوں باتوں میں اپنی شادی کے موضوع پر آتے تو بے جھجک ایک دوسرے سے اپنے دل کی بات کہتے تھے۔ تب ہم اپنی بہنوں، ماؤں اور جاننے والیوں کی ازدواجی زندگی کو بھی زیر بحث لاتے تھے ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ شادی معاشرتی زندگی کا ایک قرینہ ہے جس میں دو مکمل شخصیتوں کو ایک اسائنمنٹ زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ یہی اس کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔ بچوں کی پیدائش سے پہلے میاں بیوی کی دلچسپیاں ایک دوسرے کی ذات تک محدود ہوتی ہیں۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کی خوبیوں کو سراہنے کی بجائے اس کی خامیوں پر نگاہ رکھتا ہے۔ عموماً یہ اس وقت ہوتا ہے جب ایک فرد کا دوسرے سے مقابلہ ٹھہرتا ہے۔ میاں بیوی بھی زندگی بھر ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہر فریق اپنا اچھائیاں، اور دوسرے کی بُرائیاں اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے گھریلو تنازعے پیدا ہوتے رہتے۔ بچوں کی پیدائش کے بعد عورت کی ذمہ داری اس لحاظ سے بڑھتی ہے کہ اسے بچوں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے۔ مرد ان سب کا پیٹ بھرنے کے فکر میں اپنی خوبیوں اور بیوی کی خامیوں کے چکر سے آزاد ہو جاتا ہے یوں زندگی کی گاڑی چلتی رہتی ہے

جب ہم عائلی زندگی کو اسی سرچ کے اس آئینے میں دیکھتے ہیں تو ہم سوچتے کہ چونکہ زندگی میں کچھ اور کرنے کو نہیں رہا۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم دونوں بھی اس معاشرتی ضابطے کو اپنا لیں۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میری اور رشیدہ کی عمر اتنی ہوگئی تھی کہ ہمارے عزیزوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب ہماری شادیاں نہیں ہو سکتیں۔ مدد پیار کا کوئی عزیز رانڈ ہو جاتا ہے تو کوئی بڑی بوڑھی ہماری حالت پر ترس کھاتے ہوئے اس کے سامنے دوسری شادی کے لئے ہم دونوں میں سے کسی ایک کا نام تجویز کرتی وہ اسے پانچ چھ بچوں کی دیکھ بھال کا واسطہ دیتے ہوئے ہم سے شادی پر مجبور کرتی تھی۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ جب اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آتا تو ہم اسے ایک دوسرے کو سناتے۔ اس سے لطف اندوز ہوتے اور معاشرتی تقاضوں کے

آفاق ایک ایسا نوجوان تھا جس کے والدین پرانی تہذیب کے دلدادہ تھے لیکن خود اس نے انگریزی تعلیم حاصل کی اور اس کے خیالات اپنے والدین سے مختلف تھے پھر بھی وہ اتنا خودسر نہ تھا کہ والدین کے فیصلوں سے اختلاف کرسکتا اس کی شادی خاندان ہی کی ایک سیدھی سادی لڑکی سے کردی گئی جو اس کے تصورات کے خلاف تھی۔

انجام کیا ہوا؟ نسیم انہونوی کا یہ ناول پڑھکر ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایک اصلاحی دلچسپ اور سبق آموز ناول ہے قیمت پانچ روپیہ

مطابق اپنی ڈھلتی ہوئی عمر ہو جاتے۔

لیکن جسمی مذاق چند لمحوں کا ہوتا ہے۔ اس کے سہارے زندگی نہیں گزر سکتی۔ ان حالات میں یہی ممکن تھا کہ ہم دونوں اپنے طور سے اپنے لئے شوہر پیدا کریں۔ پبلک لائبریریوں کے معائنے کے لئے جو شخص انسپکٹر کے طور پر انفسر ہو کر آیا تھا، اس کے بارے میں، میں نے رشیدہ سے کہا کہ وہ ایک اچھا شوہر ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی آستین کا ایک بٹن ٹوٹا ہوا تھا۔ اس نے کف کو سیفٹی پن لگا کر بند کر رکھا تھا۔ مگر اس کے جوتے پالش سے خوب چمک رہے تھے۔ اگر مجھے پہلے سے علم نہ ہوتا کہ ہمارا نیا انسپکٹر غیر شادی شدہ ہے تو میں کہتی کہ وہ ایک بڑا اچھا شوہر ہے جس نے اپنی بیوی کو اتنی ڈھیل دے رکھی ہے کہ وہ اس کے کپڑوں کے ٹوٹے ہوئے بٹن ٹانکنے پر توجہ نہیں دیتی۔ وہ اپنے جوتے خود پالش کرتا ہے۔ یقیناً اس کی بیوی بھی اس وقت اپنے جوتے اس کے سامنے لا کر رکھ دیتی ہوگی۔ لیکن مجھے ایسی باتیں سوچنے کی ضرورت پیش نہ آئی کیونکہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ہمارا نیا انسپکٹر غیر شادی شدہ ہے اور اس کا نام حامد ہے۔

مجھے اکثر و بیشتر حامد صاحب سے واسطہ پڑتا تھا۔ محدود رقم میں لائبریری کے لئے کتابوں کی خریداری کا کام میرے ذمے تھا۔ میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے مل کر ان کی رائے لیتی ان کے مطالعہ سے زندہ اشاعتی اداروں کے نام حاصل کرتی اور لائبریری کے لئے کتابیں خریدا تی میں غیر ملکی کونسل خانوں سے بھی رابطہ رکھتی تھی تاکہ میری لائبریری کے لئے کچھ کتابیں وہاں سے بطور عطیہ مل جائیں۔ حامد صاحب کے آنے کے بعد جب میں نے کتابوں کی خریداری کی فہرست تیار کی تو بازار کا رخ کرنے کے بجائے میں ان کے دفتر چلی گئی۔ ان کا رویہ میرے ساتھ ایسا تھا کہ جیسا کہ اس تعلق میں ایک مرد کا ایک عورت کے ساتھ ہونا چاہئے۔ انھوں نے میرے لئے چائے منگوائی۔ میں نے ان کے سامنے کتابوں کی فہرست رکھی جو میں لائبریری کے لئے خریدنا چاہتی تھی۔ چونکہ یہ کام ان کے فرائض سے خارج تھا۔ اس لئے وہ اس بات پر بہت خوش ہوئے کہ میں ان سے مشورہ مانگنے آئی ہوں۔ باتوں باتوں میں میں نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ یہ میری نادانی ہوتی۔ اگر میں ان جیسے علم دوست آدمی سے مشورہ کئے بغیر لائبریری کے لئے کتابیں خرید لاتی۔ انھوں نے مزید چند کتابوں کے نام مجھے لکھوائے جو کہ پہلے سے ہی لائبریری میں موجود تھیں۔ میں نے ان سے کہا: "مجھے سخت شرم ہے کہ آپ جیسا باذوق آدمی کر رہا ہے۔ میں کیا کہتی بے وقوف ہوں کہ مجھے ان کتابوں کی خریداری کا خیال نہ آیا۔

غرض کہ جب میں حامد صاحب کے دفتر سے نکلی تو وہ میرے رویے سے بڑے خوش تھے جب میں چلنے لگی تھی تو انھوں نے کہا: "مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ جو انسان کی پہچان رکھتے ہیں۔"

لائبریری کے متعلق مختلف امور پر میری اور حامد صاحب کی ملاقات ہوتی رہتی تھی لیکن اب ان ملاقاتوں میں دوستی کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ اکثر یوں بھی ہوتا کہ میں گھر سے شامی کباب یا اسی قسم کی کوئی نعمت طلب ڈش بنا کر لاتی اور حامد صاحب کو فون پر جاتی کہ فلاں چیز کھانی ہے تو تشریف لے آئیے۔ وہ کھانے کے وقفے میں چلے آتے۔ ہم دونوں مل کر کھانا کھاتے دنیا بھر کے موضوعات پر گفتگو کرتے سیاست ہو یا معاشرت، سماجی اقدار ہوں یا روایات ہم جس موضوع پر بحث کرتے تھے۔ آخر میں یہی ثابت کرتی تھی کہ ہر معاملے میں حامد صاحب کی رائے افضل ہے وہی ٹھیک کہتے ہیں اور وہی معاملات کو بہتر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حامد صاحب کے دل میں میری عزت بڑھتی جا رہی تھی۔

رشیدہ کی موجودگی میں ایک بار میری تاریخ پیدائش کا ذکر آیا تھا۔ میں اس بات کو بھول گئی تھی۔ لیکن حامد صاحب کو وہ تاریخ یاد رہ گئی۔ وہ اس روز میرے لئے ایک تحفہ لائے۔ چونکہ ہم دونوں کے درمیان ایک صحت مند دوستی قائم ہو چکی تھی۔ اس لئے میں نے ان کے تحفے پر کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ دل کھول کر اس کی تعریف کی۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک شام قبل بازار میں خریداری کرتے وقت میری نگاہ ایک سوئٹر پر پڑی تھی۔ میں نے یہ سوچا کہ حامد صاحب کے لئے خرید لیا کرو، موسم سرما میں اپنے لئے سوئٹر کی خریداری کی زحمت سے بچ جائیں گے۔ ان کے سوئٹر کا بنڈل میری میز کی دراز میں تھا۔ میں نے جب ان کو بنڈل دیا تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ انھوں نے اسی وقت صرف ایک جملہ کہا: "تم بڑی اچھی ہو۔"

جب وہ آپ سے تم پر اتر آئے تو رشیدہ مجھ سے کہنے لگی "حامد صاحب کو یقین ہو گیا ہے کہ تم ان سے محبت کرتی ہو۔"

میں نے کہا: "اس میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن میں نے ایک بار بھی زبان سے اس بات کا اظہار نہیں کیا اور نہ کبھی ظاہر کروں گی۔"

رشیدہ بولی: "اور جو انھوں نے کہا کہ [illegible]"

میں نے کہا: "میں بات کو مذاق میں اڑا دوں گی۔ ہنس کر کہہ دوں گی کہ آپ تو مجھے بڑے برے لگتے ہیں۔"

میں نے حامد کو دیکھ کر شک ہی کہا تھا کہ وہ ایک اچھے شوہر ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ یقیناً ایک اچھے شوہر ہیں۔ انھوں نے کبھی تقاضہ نہیں کیا کہ میں ان سے کہوں کہ مجھے ان سے محبت ہے۔ ہر شریف شوہر کی طرح وہ گھر آتے ہیں کھانا مانگتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر وہ کھانا مانگنے سے پہلے پوچھ لیتے ہیں کہ آج کیا پکا ہے۔ کھانا کھا کر اخبار پڑھتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں میری عائلی زندگی بڑے سکون اور اطمینان سے گذر رہی ہے میں اکثر سوچتی ہوں کہ جو شوہر گھر آ کر یہ نہیں پوچھتے کہ آج کیا پکا ہے۔ کھانا نہ دو۔ یا اخبار پڑھ کر فوراً سو نہیں جاتے۔ وہ بیویوں سے کیا کہتے ہیں اور جب اخبار پڑھ کر نہیں سوتے تو کیا کرتے ہیں۔؟ میرے شوہر کو آج تک اتنی فرصت نہیں ملی کہ وہ بیٹھ کر میری خامیاں شمار کرے۔ اگر خامیاں تلاش کرنے بیٹھو تو کون ایسا شخص ہوگا جو ان سے خالی ملے گا۔ • • •

رُباعیات

فیروز نظامی

اللہ کا عبد امتیازی ہوگا
غازی ہوگا، یہ کوئی غازی ہوگا
محشر میں سبھی بے خوف چلا جاتا ہے
دیکھو تو ذرا بڑھ کے نمازی ہوگا

یوں ان کے سہارے پہ جیا کرتے ہیں
ہم کہتے ہیں حال، وہ سنا کرتے ہیں
موسیٰؑ تو گئے طور پہ ان سے ملنے
ہم روز مصلّے پہ ملا کرتے ہیں

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال پر ملال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر سے مختصر الفاظ میں صاف صاف لکھی گئی ہو۔ طباعت میں کسی غلطی کا دفتر ذمہ دار نہ ہوگا۔ البتہ اطلاع ملنے دوسری اشاعت میں اس کی صحت کا اعلان کر دیا جائے گا ایک سے زائد خبر روانا کرنے کی صورت میں یہ ضرور لکھیں کہ پہلے کون سی خبر شائع کی جائے۔ خبر پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کے ساتھ اس طرح بھیجی جائے کہ ۲۰ تاریخ سے قبل دفتر میں وصول ہو جائے (ادارہ)

ولادت اطفال کی خبریں

- نمبر 5999۔ آپ کے بہنوئی کا نام خبر میں پڑھا نہیں جا سکا
- مس عذرا پروین (رحیم آباد۔ سمستی پور) میرے چچا زاد بھائی ڈاکٹر شکیل رضا اور بھابی آسیہ شکیل کے چمن حیات میں اللہ پاک نے ۸ فروری ۷۹ء بروز جمعرات بوقت ۱۲ بجے شب ایک پھول کے بعد ایک کلی عطا فرمائی۔ نام ترنم قرار پایا اللہ پاک عمر طویل بخشے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔
- قدسیہ شاہین (درگاہ بیلا۔ ویشالی) میری خالہ زاد بہن ریحانہ قائم اور بہنوئی قاسم صاحب (ٹاٹا نگر۔ جمشید پور) کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے پہلی بار ۱۴ جنوری ۷۹ء بروز سوموار ایک پھول کھلایا، اللہ پاک سے دعا ہے کہ اسے عمر خضر بخشے اور صالح بناتے ہوئے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔
- شاہین بانو (امراوتی) میرے بڑے بھائی مظفر احمد اور بھابی رضیبن کے گلشن حیات میں پہلی بار ۴ فروری ۷۹ء بروز منگل بوقت صبح تقریباً ½ ۲ بجے ایک پھول کھلا۔ نام منظر احمد قرار پایا۔ اللہ پاک میرے بھتیجے کو عمر نوح بخشے فخر خاندان بنائے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔
- زبیدہ (آکبور) میری ماموں زاد بہن انیسہ انجم اور بہنوئی بشیر احمد کے چمن حیات میں پہلی بار ۱۰ بروز چہارشنبہ بتاریخ ۱۰ جنوری ۷۹ء ایک ستارہ طلوع ہوا۔ نام عزیز احمد عرف پپو قرار پایا۔ بارگاہ الٰہی میں ملتجی ہوں کہ یہ ننھا ستارہ ہمیشہ روشن و تابناک رہ کر خاندان کا نام روشن کرے۔
- سلطانہ، شبانہ و ثروتانہ نازلی (پرنام ہٹ) میری چھوٹی آنٹی تاج بیگم و انکل شبیدار صاحب (نام ٹھیک پڑھا نہ جا سکا) کے چمن حیات میں خدائے لایزال نے تیسری مرتبہ یکم مارچ ۷۹ء بروز جمعرات بوقت ۱۲ بجے دوپہر بمقام گریانم، ایک ننھا منا چاند سا فرزند عطا فرمایا۔ نام دستگیر عرف جنید احمد رکھا گیا۔ دعا ہے کہ نومولود والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- روبینہ پروین (چاک رحمت۔ دربھنگہ) میرے بھائی اقبال عمر اور بھابی فرحت اقبال کے باغ دلکشا میں اللہ پاک نے پہلی بار ۲۵ فروری ۷۹ء بروز اتوار بوقت ۸ بجے شب ایک چاند سا منا عطا کیا۔ نام مخدوم حارث رکھا گیا۔ اللہ پاک عمر طویل دے اور صاحب نصیب بنائے۔
- طیبہ خاتون (آکولہ) میری تایا زاد بہن معصوم جبیں و بہنوئی اقتدار احمد کے گلشن حیات میں بہار لاتے ہوئے اللہ پاک نے ۱۸ فروری ۷۹ء یوم اتوار بمقام کلکتہ، پہلی بار ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا۔ پیار کا نام سیفی قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے اور فخر خاندان بنے۔
- حوا بائی عبد الرزاق (یسین) میرے بھائی محمد اسمٰعیل اور بھابی اختری بیگم کو اللہ پاک نے پہلی بار ۲ فروری ۷۹ء

بروز سنیچر بوقت ۹ بجے صبح ایک ننھی منی گڑیا عطا فرمائی۔ نام انیسہ بیگم رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر دراز عطا فرمائے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

پیغامات نشاط

- میرے مرحوم دوست عبدالحق خاں صاحب (لکھنؤ) کے پوتے اور انعام الحق خاں صاحب ایڈوکیٹ (اوناؤ) کے فرزند دلبند عزیزی اکرام الحق سلمہ ایڈوکیٹ (کانپور) کی شادی خانہ آبادی ۱۱ر مارچ ۱۹۹۰ء کی شب میں نورچشمی فرزانہ سلمہا (دختر نیک اختر جناب مرزا حافظ عبدالقدیر صاحب۔ چمن گنج کانپور) کے ساتھ بصد شان و شوکت انجام پائی۔ ۱۲ر مارچ ۱۹۹۰ء کو انعام الحق سلمہ نے اس سلسلہ میں ایک شاندار دعوت بمقام اناؤ دی۔ جس میں بیشتر وکلا، حکام اور معززین نے شرکت کی۔ اللہ پاک اکرام الحق سلمہ اور فرزانہ سلمہا کی جوڑی کو سدا خوش و خرم رکھے۔ آمین۔

  نسیم انہونوی

- میرے عزیز دوست سعید اللہ صاحب عرف دولھا میاں (لکھنؤ) کی صاحبزادی صفیہ سلمہا کی شادی شاہ کرم عطا فاروقی (فرزند شاہ سراج عطا صاحب مرحوم) کے ساتھ ۸ر مارچ ۱۹۹۰ء کی شب میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ صدہا معززین شہر نے شرکت کرکے تقریب کو رونق بخشی اللہ مبارک کرے۔

  نسیم انہونوی

- نزہت مجیب (جتوارپور) میری چچا زاد بہن رضیہ شاہین عرف نوشی کی شادی سید مولانا محمد امجد مدنی (فرزند جناب محمد معین مدنی صاحب مرحوم) کے ساتھ ۲۱ر جنوری ۱۹۹۰ء بمقام دیوبند بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ میری نوشی کو زندگی کے ہر موڑ پر خوشیاں ہی خوشیاں نصیب کرے۔

- انجم پروین (کانپور) میری بھانجی آسیہ سلمیٰ بنت محمد سلیم صاحب۔ چمڑے والے) کی شادی خلیل احمد ایڈوکیٹ بداؤں کے ساتھ بمقام فردوس مینشن رجبی روڈ۔ کانپور ۲۰ر مارچ ۱۹۹۰ء بروز بدھ بخیر و خوبی انجام پائی۔ خدا سے دعا ہے کہ دونوں ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

شاہین پروین و نفیسہ کوثر (اونم پاڈی) ہماری اپی شہناز زوجی (بنت جناب سی۔ او۔ عبدالشکور صاحب) کی شادی، ایس عبداللہ بادشاہ (فرزند جناب ایس عبدالقادر صاحب مرحوم) کے ساتھ ۱۱ر مارچ ۱۹۹۰ء بروز اتوار بمقام مدراس بحسن و خوبی انجام پائی۔ خدائے تعالیٰ دونوں کی ازدواجی زندگی کو دنیا کی ساری مسرتوں سے بھر دے۔

- صفیہ ناظم، عشرت احمد، ناہید احمد (پٹنہ سٹی) ہماری منجھلی آپا حریم کی پرانی خریدار انور جہاں زینت صاحبہ ایم۔ اے (دختر جناب جمیل احمد صاحب۔ ایم۔ ایل۔ اے۔ پٹنہ) کا عقد نکاح مقصود عالم صاحب ایم۔ ایس سی (پسر جناب محمود عالم صاحب، مکیس۔ پنڈین) کے ساتھ ۸ر جنوری ۱۹۹۰ء بروز اتوار بوقت ۴ بجے سہ پہر بمقام پٹنہ بحسن و خوبی انجام پائی جس میں معززین شہر نے شرکت کی۔ اللہ پاک اس جوڑی کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

- اے شیخ محمود عرف غوث پاشا، بانی گوہر پریس و بکڈپو، مدراس کے فرزند دلبند ایم رؤف احمد سلمہ کا عقد سعید النساء سلمہا دختر نیک اختر جناب عبدالرزاق صاحب، انچارج گورنمنٹ ڈپو۔ مدراس) کے ساتھ بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔

  (نسیم انہونوی)

- مس زہرہ (بہار شریف) میری بڑی بہن فاطمہ صاحبہ کی شادی اکبر حیات قادری صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (فرزند جناب احمد حیات صاحب قادری کے ساتھ ۳ر فروری ۱۹۹۰ء کو بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک اس جوڑی کو سدا شاد و خرم رکھے۔

- نمبر ۵۵۷۹۔ منگنی کی خبر شائع نہیں ہوتی۔ شادی کی ہوتی ہے
- نمبر ۱۰۲۵ ٹکٹ کے ساتھ روانہ کریں۔
- صالحہ بیگم عاشی (آمبور) میری باجی حسینہ بیگم ایم اے (لکچرر۔ ایس۔ آئی۔ ٹی ویمنس کالج۔ مدراس) دختر جناب محبوب خاں صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی تحصیلدار۔ [illegible] کی شادی جناب محمد اے۔ آر شریف ایم۔ ایس سی (پسر جناب محمد فضل اللہ صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر۔ ایلور) کے ساتھ ۱۵ر فروری ۱۹۹۰ء بمقام رام نگر [illegible] پور، بحسن و خوبی

انجام پائی۔ اللہ پاک دولہا دلہن کی زندگیوں کو پربہار رکھے۔

انمول نصیحت

منجانب پدر شفیق چیا۔ عبد الجلیل مادر مہربان اہلیہ عبد الجلیل۔ آمبور بوقت رخصتی نور سلطانہ جلیلی سلمہا بعد نکاح پر فلاح و جشن شادی با عبد اللطیف سلمہ بی۔ اے۔ بتاریخ: ۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء بروز یکشنبہ بمقام شہر آمبور۔

جان پدر و روح مادر! قانونِ قدرت اور حکم الٰہی کے عین مطابق آج تم ہم سے رخصت ہو رہی ہو۔ جس کا ہمیں بے پناہ افسوس، لیکن جتنا ہمیں الم و ملال ہے اس سے کہیں زیادہ شادمانی بھی ہے کیونکہ آج ہم حکم مشیت الٰہی کے مطابق تمہیں وداع کر رہے ہیں۔ بیٹی! تم جانتی ہو کوئی لڑکی تا زیست اپنے والدین کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ چاہے والدین اپنی بیٹی کے لئے ہیرے کا محل ہی کیوں نہ بنوا سکیں اور سونے کے نوالے کھلا سکیں، ایسا ہوتا تو شہنشاہوں کی لڑکیاں کیوں بیاہ کر رخصت کی جاتیں۔ یہ قانون قدرت ہے بیٹی کو لڑکی میکے سے رخصت ہو کر سسرال کا گھر بسانا پڑتا ہے اور وہی اس کا اصلی گھر ہوتا ہے۔

عزیز از جان بیٹی! ازدواجی زندگی حسین تر گزارنے کے لئے یاد رکھو کہ نکاح دو زندگیوں کا حسین و مستحکم بندھن ہے جو مرتے دم تک نہ ٹوٹنا چاہیے۔ یہ باہمی محبت، اخلاص اور ایثار کا سنگم ہے جس کی موجیں ہمیشہ ایک دوسرے سے ہمکنار رہتی ہیں۔ ہوائے زمانہ لاکھ مخالف ہو، بحرِ زندگی میں کیسے ہی طوفان کیوں نہ اٹھیں، لیکن انھیں جدا نہ ہونا چاہیئے۔

پیاری بیٹی! ہم نے تمہارے لئے جو گھر منتخب کیا ہے اپنی سمجھ اور عزیز و اقارب کے مشورے سے کیا ہے۔ ہم نے ان کے اخلاق، محبت اور شرافت کو حتی الامکان پرکھ لیا ہے۔ اب تم اپنے حسن و اخلاق اور نیک سیرتی سے نا آشنا گھر کی فضا سے مانوس ہو جانا۔ ہر ایک کے ساتھ نہایت ہی خوش اسلوبی سے پیش آنا۔ لختِ جگر! یاد رکھو کہ عورت کے وقار کی جگہ اس کے شوہر کا گھر ہے شوہر کا گھر بیوی کا اپنا گھر ہوتا ہے۔ اس لئے تعلقات کی خوشگواری اور ازدواجی زندگی کی کامیابی کے لئے بیوی کا معاملہ فہم، نیک خلق اور خوش مزاج ہونا لازمی ہے میاں بیوی کی محبت کا قیام باہمی وفا و احترام کی بنیاد بنتا ہے شوہر اپنی بیوی کے لئے قابلِ اعزاز سرپرست اور لائق شکوہ تحسین رہنما ہے۔

نورِ نظر! تم محبت اور خدمت سے شوہر کے دل کی ملکہ بننا۔ خاوند کو اپنا بادشاہ سمجھنا۔ تم اپنے اخلاق و عادات اور تدبیر و کردار سے ایک نیک اور وفادار بیوی بن کر دکھانا تاکہ دونوں کی زندگی سکون و راحت کا گہوارہ بن جائے۔

پارۂ جگر! ازدواجی تعلقات کو مستحکم و خوشگوار بنانے میں تمہارا ہی بیشتر اور زیادہ حصہ ہے۔ یہ ایک اہم ذمہ داری ہے۔ جس کی تکمیل صرف بیوی کی ذات ہی سے ہو سکتی ہے۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ ازدواجی زندگی کو جنت بنانے کا سہرا بیوی کے سر ہوتا ہے۔ مثل صادق ہے اگر بیوی نیک ہو تو دنیا ہی کا گھر جنت کا نمونہ ہوتا ہے۔ اگر بیوی بد ہو تو گھر جہنم ہوتا ہے۔

سرورِ قلب و جگر! تم پر لازم ہے کہ اپنی خوش اخلاقیوں اور نیکیوں سے گھر کو نمونۂ جنت بنانا۔ جیسے شیشے کا فانوس شمع کی حفاظت کرتا ہے اور آندھی میں اسے بجھنے نہیں دیتا۔ اسی طرح شریف و پاکباز بیوی اپنے شوہر پر آنچ نہیں آنے دیتی اور خاوند کے مال و اسباب کی حفاظت بڑے چاؤ سے کرتی ہے۔

راحتِ دل! تم لاانتہا محبت اور اخلاق سے شوہر اور اس کے متعلقین کے ساتھ پیش آؤ گی تو ان سب کے دلوں کو مسخر کر لوگی اور شوہر کی ملکہ محبوبۂ نگاہ کا مرتبہ حاصل کر لوگی۔ بظاہر تم اس کے حکم کی تابع رہوگی۔ مگر محبت کی دنیا میں وہ تمہارا مطیع رہے گا۔ زندگی عیش و شادمانی کے ساتھ گزرے گی۔

پیاری بیٹی! شوہر بیوی کا سچا رفیق، ہمدرد، محسن اور رازدار دوست ہوتا ہے اور بیوی شوہر کی نصف بہتر کہلاتی ہے۔ شوہر کی ہستی عورت کے لئے ایک خوش آئند خواب ہے محبت کرنے والا شوہر اللہ کی نعمت عظمیٰ ہے۔

اس کے بعد صمیم قلب سے اللہ پاک سے ہماری پُر خلوص دعا ہے تم دونوں کی ازدواجی زندگی قابلِ رشک اور بے مثال ہو۔ دوسرے تمہیں رشک کی نظروں سے دیکھیں اور تم سسرال میں ہر ایک کی آنکھ کا تارا بن کر رہو۔ پھولو پھلو اور تمہاری الفت تاج محل جیسی

انتقال پر بھی دیکھی گئی۔ خدائے پاک ان کی مغفرت کرے۔ واقعی سانحہ بڑا ہی المناک ہے۔ میں بھی آپ کا شریک غم ہوں۔ (نسیم انہونوی)

- امینہ دلشاد (سکندرآباد) افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے عزیز بھائی حاجی محمد عمر سیٹھ ۲۲ر فروری ۹۱ء کو بوقت مغرب اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم بڑے پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔ آخر وقت تک نماز ادا کرتے رہے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک مرحوم کو غریق رحمت کرے اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔
- زبیدہ بتول، سعیدہ، رشیدہ اور صفورہ (آمبور) افسوس ہماری دادی ماں محترمہ عائشہ بی بی صاحبہ ۸ر مارچ ۹۱ء بروز جمعرات، بوقت صبح ۷ بجے اس دار فانی سے عالم بقا کو رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ کی عمر ۸۰ سال تھی۔ بڑی نیک اور خداترس تھیں۔ اللہ پاک انھیں جنّت نصیب کرے اور سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔
- حریم کی آخری کاپی پریس جانے والی تھی کہ یہ افسوسناک خبر سنی کہ میرے مخلص دوست اور لکھنؤ کی ایک ہر دل عزیز شخصیت سید زائر حسین عابدی صاحب ۲۶، ۲۷ر مارچ کی درمیانی شب انتقال فرما گئے۔ مرحوم ایک عرصہ سے مرض ذیابطیس میں مبتلا تھے۔ کسی انجکشن کے ری ایکشن کر جانے کے باعث ان کا انتقال ہو گیا۔ ۲۷ر مارچ کو سلطان المدارس میں صدہا حضرات نے نماز جنازہ پڑھی اور غفراں مآب کے امام باڑے میں تدفین ہوئی۔ زائر صاحب کے حسن اخلاق کا اندازہ اس جم غفیر کو دیکھ کر کیا جا سکتا تھا جو ان کو مدفون کرنے کے لئے موجود تھا۔ مرحوم سے میرے دیرینہ تعلقات تھے۔ ان کے انتقال سے جو صدمہ پہنچا ہے اسے تحریر میں نہیں لا سکتا۔ مرحوم کے بچوں کا تڑپنا دیکھ کر میں غم و الم میں ڈوب سا گیا ہوں۔ اللہ پاک مرحوم کو بخشے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

نسیم انہونوی

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ صرف ایک ایسا شعر شائع کیا جاتا ہے جو ہمارے عنوان کے تحت ہو اور نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ مئی کے لئے عنوان ہے "رفتار" اور جون کے لئے "حیات"۔

زندگی قطرے کو سکھلاتی ہے اسرار حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو بنا

مرسلہ۔ قمر لطیف نگار سلطانہ جلیلی (آمبور)

ہے شوخی شرارت لڑکپن کا زیور
شرافت کا بندی لیاقت کا گوہر

مرسلہ۔ ایم اقبال بانو (آمبور)

نورایماں سے مرے دل کو منور کر دے
سنگ ریزہ ہوں ابھی میں، مجھے گوہر کر دے

مرسلہ۔ درسلا احمدی ناز۔ آمبور

مرسلہ۔ نغمہ اسلم۔ تاتار پور —— بھاگلپور

شاخ پر پھول کھلے، سیپ سے گوہر نکلے
لوگ ذہنوں میں لئے بغض کے پتھر نکلے

مرسلہ۔ نزہت مجیب۔ چتوار پور

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف ہی کیا جو قطرے کو نہ گوہر کر سکے

مرسلہ۔ شاہین بانو (امراوتی)

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

مرسلہ۔ مس شاہدہ رب (رحیم آباد سیتا پور)

بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب یہ در گنجینۂ گوہر کھلا

مرسلہ۔ زبیدہ بتول (آمبور)

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

مرسلہ ڈاکٹر کے نسیم اختر (میسور)

The Hareem Lucknow Apr. 1979 (Phones : 44559-45334) Regd. No. LW/NP 32

بسمل بھونوی

Price 12/-

THE HAREEM

May.79

Rs. 1/-

ایڈیٹر

ٹیلیفون نمبر آفس
۴۴۵۵۹

ٹیلی فون نمبر رہائش
۴۵۳۳۴

گذشتہ ۴۸ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے — اور اردو میں ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے۔

جلد (۵۷) نمبر (۵)

ماہنامہ حریم لکھنؤ

ایڈیٹر و نگراں
نسیم انہونوی
معاونین
شوکت جہاں بیگم غزالہ
جانی بیگم ردولوی

بیادگار
سید محمد سلیم انہونوی مرحوم
و
شفیق النساء
بیگم سلیم انہونوی مرحوم

فہرست مضامین
ماہ مئی سنہ ۱۹۷۹ء

قیمت سالانہ

اعزازی۔ منی آرڈر سے اکیس روپیہ۔ مخصوص خریداری۔ منی آرڈر سے انیس روپیہ

معمولی خریداری منی آرڈر سے سولہ روپیہ، وی پی سے پرچہ منگانے پر تین روپیہ زائد۔ فی پرچہ ایک روپیہ غیر ممالک سے بذریعہ ۴۳ روپیہ یا دو پونڈ برائے سی میل۔ ایرمیل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

آفس اور ترسیل زر کا پتہ:۔ نسیم بک ڈپو — لاٹوش روڈ — لکھنؤ

نسیم انہونوی مالک و ناشر، پرنٹر — سرفراز قومی پریس — لکھنؤ

بچوں کی پرورش و پرداخت اور انھیں تربیت دینے کے فرائض زیادہ ماں ہی پر عائد ہوتے ہیں، اس لئے کہ مرد اپنا بیشتر وقت کسب معاش میں صرف کرتا ہے، اسے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال کر سکے۔ ماں نو ماہ بچے کو اپنے پیٹ میں رکھ کر ہر طرح کی احتیاط کرتی ہے تاکہ اس کا بچہ صحیح و سالم عالم وجود میں آئے۔ اور اس کے بعد وہ راتوں کی نیندیں اور دن کا آرام حرام کرکے اسے پروان چڑھاتی ہے۔ اس کے آرام اور اس کی صحت کے لئے خود ہر تکلیف اٹھاتی ہے۔ اس طرح تقریباً تین چار سال تو ہمہ وقت بچے ماں ہی کے پاس رہتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا کچھ وقت اسکول میں گذرتا ہے لیکن بقیہ اوقات بچوں کے ماں ہی کے پاس گذرتے ہیں۔ اس طرح یقین کرنے میں کسی کو بھی تکلف نہیں ہو سکتا کہ بچوں کے کردار ماں کی گود اور ان کی نگہداشت میں ہی بنتے اور بگڑتے ہیں۔ باپ کا تعلق بچوں سے کمتر ہی رہتا ہے اس لئے اگر بچے اچھے بنتے ہیں تو ماں لائق تحسین سمجھی جاتی ہے اور اگر وہ برے بنے تو ماں ہی کو ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

موجودہ دور میں ہمارے بچوں کے کردار بڑی حد تک خراب ہو رہے ہیں، وہ والدین اور بزرگوں کا اس حد تک ادب و لحاظ نہیں کرتے، جتنا کرنا چاہیئے۔ وہ استادوں کی عزت نہیں کرتے، بلکہ ان کی توہین کرتے ہیں۔ وہ راستہ چلتے بد اخلاقی کے مظاہرے کرتے ہیں۔ وہ علم حاصل کرکے امتحان دینے سے زیادہ نقل کرکے پاس ہونا چاہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ قابلیت سند سے نہیں ملتی پڑھنے سے ملتی ہے۔ بچوں کی اس بےراہ روی کی ذمہ داری میں جانتا ہوں کہ بڑی حد تک اس تعلیم پر ہے جو انگریزی دور میں شروع ہوئی اور آج بھی تقریباً اسی ڈھرے پر چل رہی ہے لیکن دوسرے ہاتھ اصل ہی سے قصور نہیں ہو سکتیں انھیں چاہیئے کہ وہ بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں اپنے فرائض کو حسن و خوبی ادا کریں۔ اور خیال رکھیں کہ ان کے بچے کس صحبت میں بیٹھتے ہیں، کیا کرتے ہیں، سبق پڑھتے ہیں یا نہیں اور اس کی مکمل رپورٹ اپنے شوہروں کو دینا چاہیئے تاکہ وہ انھیں سرزنش کر سکیں۔ جو مائیں ممتا کے تحت ایسا نہیں کرتیں اور بچوں کی غلط باتوں کی پردہ پوشی کرتی ہیں وہ اچھا نہیں کرتیں اس سے وہ اپنے ہونہار بننے والے بچوں کو ناکارہ بنانے کی مجرم ہو جاتی ہیں۔ بچوں کے موجودہ کردار کو سنبھالنے کے لئے ماؤں کو پوری جد و جہد کرنا چاہیئے اس لئے کہ یہ سب سے بڑی سماجی کمزوری ہے جس میں ہماری آنے والی نسل بربادی کی جانب بڑھ رہی ہے۔

مسٹر بھٹو کی پھانسی

اس صدی کا شاید یہ سب سے ظالمانہ کام ہوگا کہ ۴ اپریل کی درمیانی شب میں آخرکار بے درد، بے رحم اور ظالم ضیاء الحق نے ساری دنیا کی اپیلوں کو ٹھکرا کر مسٹر بھٹو کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس دنیا میں دودھ کا دھلا کون ہے۔ اچھے اور برے کام تقریباً سب ہی سے سرزد ہوا کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مرحوم بھٹو نے بھی کوئی ایسا کام کیا ہو، جو بادی النظر میں نامناسب ہو لیکن دیکھنا یہ ہے کہ سیاست میں ایسے افعال کی اہمیت کیا ہوتی ہے۔ تاریخ پڑھنے والوں کو علم ہوگا کہ ہمیشہ ہی سلطنت کے کاموں میں رکاوٹ بننے والوں کو راستہ سے ہٹانے کے لئے قتل کر دیا گیا یا انھیں قید خانوں میں سڑا دیا گیا۔ ہم پاکستانی سیاست سے کوئی حصہ آگاہی نہیں رکھتے، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ بھٹو مرحوم کی شخصیت پاکستان میں بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ ایک بڑے ہی معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور انھوں نے پاکستان کو سربلند کرنے کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ ان کا جرم کچھ بھی رہا ہو لیکن دراصل ساری دنیا کہہ رہی تھی کہ بھٹو نے

ان کے لئے رحم کی اپیل کی تھی اور جس شخص کے لئے اتنی اپیلیں کی گئی ہوں اسے پھانسی کی سزا نہ دینا چاہیئے تھی۔ ایسے عظیم سیاست داں کے ساتھ یہ بات ظلم ہی کہی جاسکتی ہے کہ اسے پھانسی دے دی جائے۔ خدا بھٹو کی بخشش کرے یقیناً ان کا شمار دنیا کے عظیم لوگوں میں تھا اور ان کو دنیا کبھی فراموش نہ کرسکے گی۔ ان کے کردار کی ساری دنیا ہمیشہ تعریف کرتی رہے گی اور ضیاء الحق کی اسی طرح مذمت کرے گی اور ان کے اس فعل کو سیاسی تاریخ میں بدترین الفاظ کے ساتھ لکھا جائے گا۔ اور اس فیصلہ کو نا منصفانہ سمجھا جائے گا جو بھٹو کی زندگی کو ختم کرنے کے لئے پاکستان کی سپریم کورٹ نے ملیٹری حکومت کے تحت کیا۔

ایک ناکام تجربہ

عورتوں کے بین الاقوامی سال میں دہلی ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے موٹر بسوں پر ایک سو چار پڑھی لکھی روشن خیال عورتوں کا تقرر ہوسٹس دمیزبان کی حیثیت سے دہلی بلکہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار کیا تھا۔ اور اس کارنامہ پر اسے بڑی داد ملی تھی۔ لیکن اب روزنامہ اسٹیٹسمین دہلی نئی دلی لوٹ بک میں اس تجربہ کی سو فی صدی ناکامی کا اظہار و اعتراف بایں الفاظ کیا گیا ہے۔

ان ملازمتوں پر تقرر کے چند ہی ماہ کے اندر ان ہوسٹس خواتین پر اچھی طرح واضح ہوگیا کہ دہلی میں چلنے والی اور مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی بسوں میں ان کا کام نہایت درجہ دشوار و صبر آزما ہے اس لئے ایک ایک کرکے انھوں نے افسران بالا سے درخواست کرکے اپنا تبادلہ محکمہ کے دوسرے شعبوں انتظامی وغیرہ میں کرانا شروع کردیا اور اب ان ۱۰۴ خواتین میں تقریباً سب کی سب اپنے تبادلہ کی درخواست دے چکی ہیں۔

مساوات مرد و زن کے روشن خیالات نظریہ اور اس دعوے کو مرد و عورت ہر شعبۂ زندگی میں یکساں طور پر کام کرسکتے ہیں تردید کا ایک اور مزید ثبوت مل کر رہا۔

(بشکریہ صدق جدید)

ایک بہن کا خط

ایک بہن نے ایک خط اشاعت کے لئے بھیجا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ (نام مناسب نہیں سمجھتی) لکھا ہو۔ مجھے اس کی اشاعت میں کوئی انکار نہیں، خط نہایت ہی سنجیدہ اور سلجھے ہوئے انداز میں لکھا گیا ہے البتہ چند باتیں بہن موصوفہ مجھے اور تحریر فرمادیں تو بہتر ہوگا۔

ا۔ کاروبار؟ ملازمت یا مشاورت کے سلسلہ میں رسول اللہ صلعم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے عہد میں کچھ واقعات و ارشادات سے آگاہ فرمائیں تاکہ میں اپنی معلومات میں اضافہ کروں اور ایسی مثالیں بھی دیں جن سے یہ ثابت ہو کہ بلا کسی مجبوری کے اختلاط مرد و زن جائز تھا۔ اس سلسلہ میں جن احادیث سے آپ نے علمی استفادہ کیا ہو انکا حوالہ بھی دیں۔

قلمی دوستی

اکثر بھا بجیاں لکھتی ہیں کہ حریم میں قلمی دوستی کا کالم بھی قائم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں چند حقائق بیان کرنا چاہتا ہوں جو میرے علم و تجربہ میں آئے ہیں۔ یہاں ہمارے نوجوان لڑکی بنکر خطوط لکھتے ہیں اور خط و کتابت کے سلسلہ کو اتنی وسعت دیتے ہیں کہ خراب نتائج بھی نکلتے ہیں۔ میری جوانی کے زمانے میں دو ایک رسائل میں جو خواتین کے لئے شائع ہوئے تھے چند اسکینڈل ہوگئے تھے حالانکہ اسوقت ہمارے نوجوانوں میں اتنی اخلاقی گراوٹ نہ تھی، جتنی اب ہوگئی ہے، اس لئے میں اس سلسلہ کو کسی طرح پسند نہیں کرسکتا۔ میں تو حریم میں کسی مضمون نگار کا بھی پتہ اسی لئے شائع نہیں کرتا۔ آپ سوچئے کہ آپ کے پاس ایک خط آتا ہے جو بظاہر ایک سہیلی کی جانب سے لکھا جاتا ہے۔ لیکن وہ سہیلی نہیں سہیلا ہوتا ہے۔ انجام کچھ بھی نہ نکلے تو بھی کسی لڑکے کے خطوط کسی لڑکی کے پاس جائیں، میں اسے بھی پسند نہیں کرتا۔

نسیم انہونوی

تبصرا

ریویو کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں۔

اُردو زبان اور اس کا نام

مولف۔ کنول ڈبائیوی بیتھ اردو کے۔ آئی۔ کالج ڈبائی۔ ضلع بلند شہر۔ سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۲۳۲۔ غیر مجلد۔ قیمت بارہ روپیہ۔

مولف نے اس کتاب کے ذریعہ یہ چاہا ہے کہ اردو کا نام ہندستانی، ہندوستان کی مناسبت سے ہونا چاہیئے تھا جیسے بنگال میں بنگالی۔ مدراس میں مدراسی پنجاب میں پنجابی۔ گجرات میں گجراتی وغیرہ۔ اس سلسلہ میں مولف نے مختلف لوگوں کی تقریروں اور مضامین سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کا نام ہندستانی ہونا چاہیئے تھا، جس طرح جرمن میں جرمنی، فرانس میں فرانسیسی۔ انگلینڈ میں انگریزی وغیرہ۔ اس سلسلہ میں متعدد مشاہیر اور ادباء نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جنھیں مولف نے اپنے خیال کو تقویت پہنچانے کے لئے اس کتاب میں شامل کر دیا ہے، اس کے ساتھ ہی ایسی آرا بھی شامل کی گئی ہیں جو مخالفت میں ہیں۔ میرے خیال سے ہندوستان اتنا بڑا ملک ہے کہ یہاں ایک ہی زبان سارے ملک میں بولی نہیں جا سکتی۔ جس طرح کہ ہندی آج تک سارے ملک کی زبان نہ بن سکی اردو جس طرح بنی تھی اور جس لئے اس کا نام اردو ہوا تھا۔ اس کے پیش نظر اس کا نام اردو کے سوا اب کچھ نہیں رکھا جا سکتا۔ اور ہندستانی رکھا جائے تو یہ بھی ضروری ہے کہ اسے تمام ہندوستان کی زبان بنایا جائے ورنہ ہندستانی کا تعلق اس زبان سے بے معنی ہوگا۔ بہر حال اردو زبان کو بدلنے یا نہ بدلنے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ ایک تحقیقی کتاب ہے۔

مولف نے کافی کاوش کے ساتھ نام کی تبدیلی کے مقصد کی وضاحت کے ساتھ ہی اردوئے قدیم و جدید کی ابتدا ارتقا اور اس کے تاریخی، سماجی، ثقافتی اور لسانی پہلوؤں پر بھی ایک مختصر لیکن جامع روشنی ڈالی ہے۔

نگارخانۂ سخن

سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۱۰۰۔ قیمت کا کتاب میں کوئی ذکر نہیں۔ ملنے کا پتہ بزم اردو انجمن کالج۔ بھٹکل۔ کرناٹک کتاب ان غزلیات کا مجموعہ ہے جو بزم اردو انجمن کالج بھٹکل کے کل ہند شاعرہ منعقدہ ۲ر جنوری ۱۹۸۰ء میں پڑھی گئی تھیں۔ اس کتاب کے مرتب پروفیسر عمر حیات خاں غوری، شعبہ اردو، انجمن کالج بھٹکل ہیں۔

ڈاکٹر سید انور علی صاحب نے مقدمہ میں بھٹکل پر روشنی ڈالتے ہوئے ان شعرا کا تعارف کرایا ہے جو اس مشاعرہ میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

مقدمہ کے بعد اردو ادب اور مشاعرے کے عنوان سے ڈاکٹر عمر حیات خاں غوری صاحب کا مضمون اس قابل ہے کہ پڑھا جائے۔ مشاعرے کی تاریخ لکھتے ہوئے معرکہ میر و سودا، معرکہ انشا و مصحفی، معرکۂ ذوق غالب معرکہ آتش و ناسخ کے واقعات نہایت دلچسپ انداز میں پیش کئے ہیں۔ اس مضمون سے کتاب میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ اور کلام شعرا کے ساتھ ہی اسے ادبی اہمیت بھی حاصل ہو گئی ہے۔

حنا (ماہنامہ)

اس دلکش نام کا ایک ماہنامہ حال ہی میں لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ جس کے مدیر اعلیٰ سردار محمود اور مدیرہ رضیہ جمیل صاحبہ ہیں۔ نائب مدیران میں بلقیس بھٹی، نمینہ حفیظ، فرزانہ شوکت اور صائمہ محمود ہیں۔ مدیر خصوصی کی حیثیت سے معین زخمی صاحب کا نام شائع ہوا ہے۔ نگراں جناب عدنان صاحب ہیں۔ قیمت سالانہ کا پرچے میں ذکر نہیں البتہ فی پرچہ قیمت پانچ روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ ۵۵۔ سرکلر روڈ۔ لاہور۔ پاکستان۔ پہلا شمارہ ۱۹۲ صفحات پر شائع ہوا ہے اور بہترین مضامین اس شمارے میں یکجا کر دئیے گئے ہیں

اسی شمارے سے محترمہ رفیعہ بٹ کا افسانہ بدگمانی کی سزا حنا ہی سے نقل کیا گیا تھا۔ حسب ذیل مستقل عنوانات قائم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت نہایت دلچسپ اور معیاری مضامین شامل کئے گئے ہیں۔

رنگ حنا (اڈیٹوریل)، انٹرویو۔ سفرنامہ۔ مسلسل ناول، افسانے

سچی کہانیاں۔ کیسے بھول جاؤں: اسلامیات کشیدہ کاری، نظمیں غزلیں۔ نفیس ذائقہ، مضامین۔ حسن پریشاں اور روحانی ڈاک۔

حسن طباعت کے اعتبار سے بھی حنا کا معیار بہت بلند ہے۔ پڑھنے کے ساتھ ہی اسے رکھنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ کاش ہند و پاک کے درمیان رسائل و اخبار کی آمد و رفت پر پابندیاں نہ ہوتیں اور حنا ہندوستان میں بھی بآسانی آسکتا۔

بھٹی قوم اپنی تاریخ کے آئینہ میں

مولف انور حسین خاں انور۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۱۱۲۔ کتابت طباعت اچھی۔ قیمت پانچ روپیہ۔ ملنے کا پتہ اخلاق حسین خاں قصبہ و ڈاکخانہ بدورہ۔ ضلع بارہ بنکی۔

بھٹی قوم کا نام سب ہی نے سنا ہوگا۔ مختلف مقامات پر اس قوم کے افراد رہتے ہیں۔ خصوصیت سے بدورہ میں اس قوم کی اکثر معتدد بستیاں گذری ہیں اس لئے کہ وہاں اس قوم کا رشتہ تعلقداری سے رہا ہے۔ اسی لئے مولف نے بھٹی خاندان اس شاخ کے خاندانی افراد کے حالات تفصیل سے درج کئے ہیں۔

بھٹی قوم کی ایک تاریخی حیثیت ہے جس کا ذکر ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں ہے۔ ایشری پرشاد نے بھی ضمناً بھٹیوں کا تذکرہ کیا ہے اور نجم الغنی رام پوری نے پوری تفصیل اور شجرہ کے ساتھ شری کرشن جی سے لے کر اس وقت تک کا ذکر کیا ہے جب بھیرو نامی راجپوت نے اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح بھٹی قوم میں راجپوتوں ہی کا خون رواں دواں ہے۔

تاریخ بیحد دلچسپ مبحث ہے بشرطیکہ اس کو اس طرح لکھا جائے جس طرح انور حسین خاں نے لکھا ہے۔ بھٹی قوم کی بیشتر آبادی بارہ بنکی کے مختلف مواضعات میں ہے جن کی تفصیل اس کتاب میں اختصار کے ساتھ موجود ہے۔

تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اور خصوصاً بھٹی قوم کے لوگوں کے لئے یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی نے کتاب کا مسودہ دیکھ کر اظہار خیال کے عنوان اس کی تعریف کی ہے جو شامل کتاب ہے۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھئے اور جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ

اس گرانی کے زمانے میں غریب لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بڑا ہی دشوار ہوگیا ہے۔ شادیاں شادیوں ہی کی طرح ہوتی ہیں۔ جھلکے بیٹھے سے کپڑوں کو چمکانے اور بھڑکانے والی چیزیں بھی اتنی گراں ہوگئی ہیں کہ ان کا خریدنا آسان نہیں رہا۔ ایک دوپٹہ کے لئے معمولی سا لچکا بھی لیا جائے تو بیس پچیس روپیہ سے کم میں نہ آئے گا۔

پتلی سی کرن بھی آنچل میں لگائیے تو بیس روپیہ میں آئے گی۔ شادیوں کے دسیوں جوڑوں کے لئے یہ سب لیا جائے تو سینکڑوں روپیہ صرف ہوجاتا ہے پھر شادی بیاہ پر ہی منحصر نہیں خواتین اور لڑکیاں عام دنوں میں لچکے لگے دوپٹے استعمال کرتی ہیں۔ سورتی بیلیں اور چھپا چکلی وغیرہ۔ لگاکر دوپٹے اور ساریاں پہنتی ہیں۔

ان مشکلات کا حل سائنسدانوں نے یوں نکالا ہے کہ اسٹیل کا سامان تیار کر دیا اور ایسا کہ چاندی سے زیادہ دلکش اور بھڑکیلا یہ بھی نہیں کہ استعمال سے کالا پڑ جائے یا خراب ہوجائے اور دام نسبتاً بہت ہی کم۔ نائلون کے ستارے سنہرے ستاروں کو ماند کرتے ہیں۔ یہ اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ ایک تولہ میں لاتعداد چڑھتے ہیں ان کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اس طرح کا تمام سامان ...... آپ کو

درشنو مل آتما رام اینڈ سنز گوٹے والے

راج کمل ہوٹل بلڈنگ امین آباد لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔ مال وی پی سے منگائیں یا خود تشریف لاکر ملاحظہ فرمائیں۔

(فون نمبر: ۲۲۳۳۴)

میری شگفتہ یادیں

عطیہ پروین

یادیں!

اُف! یہ یادیں بھی کیا عجیب چیز ہوتی ہیں۔ کبھی بھلائی نہیں جاتیں۔ جہاں ذرا تنہائی ملی سکون ملا اور ان یادوں نے ہر سمت سے لپیٹ لیا۔ یادیں بھی کئی طرح کی ہوتی ہیں۔

تلخ۔ خوبصورت، شیریں، کھیانک، گدگدا دینے والی، مسکراہٹ لے آنے والی، کھلکھلا کر ہنس پڑنے والی اور اس کے ساتھ آنکھوں میں آنسو لے آنے والی بھی۔ دل درد اور کسک بھر دینے والی بھی۔ جسم کو کپکپا دینے والی بھی۔

میں ایسی یادوں کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتی ہاں، چند شگفتہ یادوں میں گھر کے ذرا دیر کے لئے پھر ان ہی دنوں میں پہنچ جاتی ہوں۔ جو گزر چکے ہیں۔ اب کبھی نہیں آئیں گے بس اپنے کو یاد دلا کر دل کو گدگدا دیں گے لبوں پر مسکراہٹ لے آئیں گے۔

ایسی بہت سی یادیں ہیں، بہت سی صورتیں ہیں، جو میری تنہائی کو محفل میں بدل دیتی ہیں اور میں کھو کے رہ جاتی ہوں۔!

آج۔ جب یہ مضمون لکھنے بیٹھی تو اچانک بے اختیار میری آنکھوں تلے ایک صورت گھوم گئی۔ کس کی؟ ہائے ایک بڑی ہی پیاری شخصیت کی۔ ایک کٹھے کی عورت تھی وہ۔ بڑی بڑی بیگمات کو پیچھے پست ڈال دینے والی۔ یہ عورت میرے ننھیال میں تھی۔ تھی نہیں۔ آتی رہتی تھی۔ میرا ننھیال لکھنؤ کے ایک پرانے مشہور محلے میں ہے کٹرہ ابو تراب خاں! اس محلے سے میرا دلی تعلق ہے۔ میرے بچپن لڑکپن اور پھر جوانی کا بھی اچھا خاصا حصّہ یہاں گزرا ہے۔ یہ عورت میرے ننھیال کے پرانے دھوبی منن کی بیوی تھی۔ آج بھی اس کی صورت مجھے یاد ہے۔

چھوٹا قد، سانولا رنگ، موٹے موٹے ہونٹ، بڑا سا دہانہ، گول چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، تنگ پیشانی اور مٹاپے کی حد تک تندرست! منن کی بیوی جب آتی اس شان سے آتی ایک بہت بڑا گٹھر کپڑوں کا سر پر، اس کے اوپر اس سے چھوٹا گٹھر، پھر اس سے چھوٹا گٹھر پھر گٹھری اور پھر پوٹلی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے سات عدد ہوا کرتے تھے۔ (جیسا کہ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو جہیز میں سات پتیلے اور پتیلیوں کے سیٹ دئیے جایا کرتے تھے۔ ایک بہت بڑا پتیلا، پھر اس سے چھوٹی پتیلی اور آخر میں چوتھی پر دودھ کے لئے ننھی سی پتیلیا۔:)

تو جناب۔ منن کی بیوی خدا معلوم کس طرح یہ بڑی چھوٹی پہاڑیاں سر پر اٹھائے اور اس طرح کہ گردن نہ جھکے اتنا راستہ طے کرکے ہمارے یہاں آتی دروازے سے پکارتی۔

"بہو صاحب۔ کپڑے لائی ہوں!"

اور گٹھریاں صحن میں دھما دھم گھما گھم گرنا شروع ہو جاتیں۔ آخر میں بڑا والا گٹھر ایک زوردار دھماکے کے ساتھ گرتا اور اس کے ساتھ ہی منن کی بیوی دھم سے پلنگ پر گر جاتی۔ پلنگ کی چرچراہٹ سن کر میری نانی صاحبہ اس کو گھور کے دیکھتیں مگر منہ سے کچھ نہ بولتیں۔ کیا مجال جو منن کی بیوی زمین پر بیٹھ جائے لیکن اتنا خیال ہمیشہ رکھتی کہ اروائن پر ہی بیٹھتی۔ ایک لمبی سانس لیتی سر پر رکھا کپڑے کا پگڑ اتار کے پھینکتی اور دوپٹے کے آنچل سے پسینہ خشک کرتی ہوئی کہتی۔

"اے بہو بیگم ایک ذرا سا پان کھلا دیجئے آتے آتے گلا مونڈا کا نٹا خالی ہو گیا!"

میں منن کی بیوی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتی۔ دل میں اس کا اور اپنے دادھیال بلگرام کی کالی کلوٹی دھوبن کلّو کا موازنہ کیا کرتی تھی۔ اس کمبخت کے پاس یہ ٹھاٹ اور یہ ٹھسّہ کہاں۔!

"ہاں ہاں۔ کپڑا لے لیو!" کہہ کے پھر ... گھورت پلنگ پہ

رکھ دیتی اور بھدّے زمین پر بیٹھ کے اپنے اُلجھے میلے گندے بال کھجا کھجا کھجانے لگتی میری دادی صاحبہ اکثر کہتیں۔

"کپڑے اتنے صاف دھوتی ہے مگر خود غلیظ رہتی ہے مردی!" اور یہ منن کی بیوی!

صاف ستھری! نہاتی دھلتی ایسی بیگم کا گھیر گھمار والا غرارہ پہنے چکن کا دودھ جیسا جمپر یا کرتا پہنے۔ ہلکے رنگ کا چنا ہوا دوپٹہ اوڑھے۔ کانوں میں سونے کے جھمکے اکثر ان جھمکوں کے ساتھ بیلے کے پھول بھی لگے ہوتے۔ کانوں تک بال جا کے چوٹی میں پھندنے دار پراندے ڈالے ہوئے۔ آنکھوں میں کاجل۔ گلے میں پان اور عطر حنا کی مہک! واہ! کیا شاندار دھوبن تھی جس کے میل بھی بڑے شاندار ہوا کرتے تھے۔

اب۔ گٹھریاں کھل رہی ہیں۔ خاندان بھر کے کپڑے الگ کیے جا رہے ہیں اور منن کی بیوی کی زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے۔

"سلام بہو صاحب۔ آئیے کپڑے لیجئے یہ دیکھئے آپ کے غرارے کا رنگ ٹس سے مس جو ہوا ہو انعام دیجئے گا۔ اے یہ لیجئے بہو بیگم آپ اپنی ساڑھی۔ دیکھئے کیسی جھلا جھل ہو رہی ہے استری آپ کے دھوبی نے بڑی محنت سے کی ہے میں نے تاکید کر دی تھی دلہن بیگم کی ساڑھی ہے آنکھیں کھول کے استری کرنا۔ ہاں بیٹا۔ آپ اپنے کپڑے لیجئے۔ معاف کیجئے گا آپ کے فالسئی بلاؤز کا ایک بٹن ٹوٹ گیا ہے۔ یہ لیجئے میاں کی اچکن اور یہ بھیا کا پتلون ...... آخر میں مجھے پکارتی۔

"عطیہ بٹیا آپ اپنے کپڑے اٹھائیے دیکھئے آپ کی بلگرام کی دھوبن نے کبھی اتنے صاف کپڑے دھوئے تھے!"

اور سارا حساب کتاب کر کے وہ لکھنؤ بھر کی خبریں سناتی گھر کے ہر معاملے میں ٹانگ اڑاتی ہر بات میں مشورہ دیتی بیٹھی بیٹھی کئی پان مع لونگ اور الائچی کے کھا جاتی کہتی۔ "لے ہے بغیر میرا کلہ ہی گرم نہیں ہوتا کیا کروں اور الائچی کے بغیر تو کوئی بدذوق ہی پان کھاتا ہوگا!"

کبھی منن سے جھگڑا ہو جاتا تو بیٹھی اول تا آخر قصہ سناتی۔

"میری جیسی عورت چراغ لیکے ڈھونڈھے سے نہ ملے گی سونڈی کاٹے کو!"

منن کی بیوی کی یاد اکثر اس لئے اور کبھی آتی رہتی ہے کہ اسی نے مجھے ایک بہت بڑے حادثے سے بچایا ہے۔ جی ہاں۔ حادثے سے! ہوا یہ کہ میرے رشتے کے ایک چچا رضی احمد چچا اس زمانے میں پاکستان سے آئے ہوئے تھے۔ میرے والد کا ننہال سندیلے کا ہے والد صاحب کی خالہ زاد بہن لکھنؤ میں میری والدہ کے چچا کو بیاہی تھیں اس رشتے سے میری ماں کی چچی میری نانی بھی ہوتی ہیں اور والد کے رشتے سے پھوپھی بھی۔ اب ان نانی پھوپھی کے بھائی یعنی میرے چچا لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ میں بھی اس زمانے میں لکھنؤ میں تھی۔ اس وقت تک میرا سن ایسا تھا کہ جیسے رواج کے مطابق پردے نہیں بٹھایا گیا تھا میں اور میری چھوٹی بہن دن بھر دوڑ دوڑ کے کبھی کبھی نانی کے گھر جایا کرتی تھیں کچھ تو رضی احمد چچا کی دلچسپ باتوں، نئی نئی کہانیوں اور چٹکلوں کی وجہ سے اور کچھ نانی صاحبہ کے گھر کے روشن کھلے کھلے ہنستے کھیلتے ماحول کی وجہ سے۔ یہ مکان خاندان کے اور بہت سے ملے جلے یعنی ایک کوٹھی ایک دروازے سے الگ ہٹ کے سڑک پر ہے یحییٰ گنج کے چوراہے کے قریب! جب تک نانا گھر پر نہ آتے گھر میں ہنسی مذاق اور گنگنا ہٹیں گونجا کرتیں ادھر نانا نے گھر میں قدم رکھا ادھر سناٹے کا یہ عالم کہ سوئی گرے تو آواز سن لو ایسا ہی لحاظ ہوا کرتا تھا بزرگوں کا!

رضی احمد چچا ایک روز بولے جبکہ ہم سب رشتے کے ماموں، خالہ اور بھانجے بھانجیاں ان کو گھیرے بیٹھے تھے۔ بولے

"ان سارے لڑکے لڑکیوں میں یا تو اکبر جہاں کا رنگ کم ہے (میری ایک خالہ) یا پھر عطیہ کا اور سب گورے ہیں۔ تعجب ہے یہ عطیہ سانولی کیسے ہوگئی جبکہ رضیہ (میری چھوٹی بہن) گوری ہے۔"

"میں آپ کو پڑی ہوں!" میں نے فوراً کہا اور سب ہنس پڑے۔

چچا کہنے لگے۔

"ارے بٹیا میں تو پھر بھی سلونا تھا بس یہ کہو یہ نسخہ ہاتھ لگ گیا تھا اس کو استعمال کرنے سے رنگ ذرا کھل گیا۔"

میں بے چین ہوگئی۔ اس زمانے میں اپنے سانولے رنگ کی مجھے بڑی خلش رہتی تھی ہر ایک سے رنگ گورا کرنے کی ترکیبیں پوچھا کرتی تھی۔

میں نے پوچھا۔

"چچا وہ نسخہ مجھے بھی بتا دیجئے!"

"ارے تم نہیں استعمال کر سکو گی!"

"آپ بتائیے تو آپ کو خدا کی قسم!" میں ان کے پیچھے پڑ گئی

انھوں نے پہلے تو اپنا چھوٹا موٹا کام مجھ سے خوب لیا پھر ہنس کے بولے۔ بس یہ کرو کہیں سے تھوڑا سا تیزاب لو ایک پھریری ڈبوا ور چہرے پر پھیرلو گوری بھبھوکا نہ ہو جاؤ تب کہنا ؟

ایک قہقہہ لگا مگر میں چپ رہی۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ محض مذاق ہے یا سنجیدگی ہے، اس نسخے پر عمل کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ بات ٹل گئی مذاق میں لیکن، میرے دل میں جا کے بیٹھ گئی۔ یا اللہ کیا کروں کس سے مدد لوں۔ کہاں سے تیزاب حاصل کروں۔ اسی روز منن کی بیوی آگئی۔ میری نانی اس پر خفا ہو رہی تھیں۔

"میرا پاجاما غارت کرکے رکھ دیا تم نے منن کی بیوی کتنا تیزاب ڈال دیا تھا مردا جگہ جگہ سے کٹک گیا ہے!" منن کی بیوی نے کیا جواب دیا میں نے نہیں سنا میرے دماغ میں تو ایک نام گھوم رہا تھا۔ تیزاب! تیزاب! میں دوڑ کے باہر احاطے میں نیم کے پیڑ کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر بعد منن کی بیوی نکلی فوراً مجھے ٹوکا۔

"اے بیٹا اس بھری دوپہر میں نیم کے نیچے کیوں کھڑی ہو۔ نوج! کوراپنڈا ہے اللہ محفوظ رکھے چلو اندر جاؤ!"

منن کی بیوی مجھے ایک چیز دے دو۔ میں نے پھولی سانسوں سے اس سے کہا ڈر تھا کوئی آنہ جائے۔ سن نہ لے۔ مگر تمھیں اللہ کی قسم کسی کو بتانا نہ!"

"کیا چیز بیٹا۔ اس نے پان کی گلوری کلے میں دبا کے ایک خوشبودار پیک کی پچکاری سڑک کے کنارے نالی میں تھوکی اور سر پر رکھی میلے کپڑوں کی گٹھری سنبھالنے لگی۔

مجھے ذرا سا تیزاب لا دو۔ یہ لو شیشی!" میں نے افغان اسنو کی خالی شیشی اس کی طرف بڑھائی۔

"تیزاب۔ اس نے آنکھیں پھاڑیں۔ ووئی! تیزاب کیا کرو گی؟"

"مجھے کام ہے۔ میں تم کو ایک روپیہ دوں گی ابا کا منی آرڈر کل ہی آیا ہے پورے بیس روپے کا۔ میں نے اس کو لالچ دلائی۔ مگر چپکے سے مجھے دینا کسی کو بتانا نا میری اچھی منن کی بیوی!"

"میری لاڈو! بچارے بچپن کے اس نے شیشی مجھ سے لے لی بولی۔ اچھا لیتی آؤں گی؟

"کب لاؤ گی؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"پرسوں محمد میاں کے کپڑے لاؤں گی تب لیتی آؤں گی!"

وہ چلی گئی اور میں گھڑیاں گننے لگی۔ رات میں خواب دیکھا منن کی بیوی ڈھیر سا تیزاب لے آئی ہے۔ میں بالٹی میں بھر کے اس سے نہا رہی ہوں حمام سے میرے بجائے ایک گوری چٹی چاند سی لڑکی نکلتی ہے۔ گھر والے حیران ہیں میں ہنس کے سب کو آداب کرتی ہوں۔

"ارے یہ تو عطیہ ہے!"

میری بہن رضیہ رو رہی ہے "بجو مجھ سے زیادہ گوری ہوگئیں" بھائی خوشامد کر رہے ہیں" مجھے بھی گورا ہونے کی ترکیب بتا دو" (ساتھ ہی یہ بتاتی چلوں میرے بھائی علی باقر عرف حسن میاں بھی میری طرح سانولے رنگ کے ہیں):

اُف خوہ! کتنا خوبصورت خواب تھا۔ میں نشے جیسی کیفیت میں اٹھی۔ دل میں گدگدی مچی تھی کسی کو اپنا ہمراز بنا لوں لیکن راز کھل جانے کے خوف سے دل کی دل میں لئے رہی۔

خدا خدا کرکے تیسرے دن منن کی بیوی آئی۔ گلابی غرارہ، گلابی جمپر گلابی دوپٹہ۔ کاجل، مسّی، پان، خوشبو اور چمیلی کے تیل کی مہک۔ مجھے دیکھ کے مسکرائی اِدھر اُدھر دیکھا پھر چپکے سے دوپٹے کے پلو میں بندھی شیشی کھول کے میرے ہاتھ میں تھما دی۔ مجھے جیسے دولت مل گئی۔ جھپٹ کر سکی کپڑے لئے اور غسلخانے میں گھس گئی۔ نانی نے ٹوکا۔

"ارے اس وقت نہا رہی ہو۔ سردی لگ جائے گی!"

پھر میری خودسری اور ضد پر بڑبڑانے لگیں۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے شیشی کھول لی۔ روئی پہلے سے گریبان میں چھپا رکھی تھی نکالی شیشی کے اندر گہری چائے کے رنگ جیسی کوئی شئے بھری تھی اس میں روئی ڈبوئی بسم اللہ کہکے آنکھیں بند کیں اور گیلی روئی چہرے پر ملی پھر شیشی میں ڈبوئی گردن پر ملی پھر ہاتھوں اور باہوں پر۔ چند لمحے انتظار کیا۔ دل تھا کہ انجن کی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ دھیرے دھیرے منہ دھویا — نہایا کون، بس پانی انڈیل لیا کپڑے بدلے دھڑکتے دل سے باہر نکلی اب لوگ دیکھیں گے! حیرت بھری آوازیں ابھریں گی۔ شور مچ جائے گا۔

"ارے یہ اتنی گوری چاند سی لڑکی کہاں سے آگئی!"

نہ کوئی آواز ابھری نہ شور مچا۔ نانی نے گھور کے مجھے دیکھا۔ منن کی بیوی نے قہقہہ لگایا۔

"عطیہ بیٹا۔ آئینہ دیکھا!"

میرے دوپٹی کرے میں گئی۔ آئینہ اٹھایا دیکھا اور رکھ دیا۔ جی چاہا پھوٹ پھوٹ کے روؤں۔

"اے بیٹا بھول کے بھی تیزاب کا نام نہ لیا۔ منّن کی بیوی کہہ رہی تھی۔ مذاق کی بات سچ سمجھ لی۔ موا قاتل ہوتا ہے زہر ہوتا ہے۔ ایک پھریری بھی لگ جاتی تو دشمنوں کا منہ بھسم ہو جاتا آنکھیں پھوٹ جاتیں بال اتر جاتے۔ ارے بہو صاحب۔ وہ تو اتفاق سے میں بھی اس وقت حسنین بھیا کے وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے پاکستان والے ماموں ہنس ہنس کے تیزاب والا نسخہ بتا رہے تھے کہ ایک پھریری لگاؤ گوری بھق نہ ہو جاؤ تب کہنا۔ عطیہ بٹیا نے مجھ سے تیزاب مانگا تب ہی میں سمجھ گئی اللہ نے بڑی خیر کی بہو صاحب صدقہ نکالیے گا ان کا — !"

"مگر پھر یہ کیا چیز تھی ؟" میں نے کھسیا کے پوچھا۔

"اے بی بی میں نے چائے کا رنگ بھر دیا تھا شیشی میں۔ اور کیا سچ مچ تیزاب لے آتی !"

اگر منّن کی بیوی سچ مچ تیزاب لے آتی تو میں اس وقت کہاں ہوتی ! میرے چہرے کا کیا عالم ہوتا ! شکریہ تمہارا اور تمہاری سات پشتوں کا منّن کی بیوی خدا معلوم اب تم کہاں ہو برسوں سے تم کو نہیں دیکھا ہے لیکن تم میری یادوں میں اب تک بسی ہوئی ہو۔ اپنی تمام نفاستوں، نزاکتوں، خوشبوؤں اور گھٹے کے ساتھ !

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

کیا آپ کو علم ہے کہ

لکھنؤ کس لئے مشہور ہے

اگر نہیں تو ہم آپ کو بتاتے ہیں

لکھنؤ اپنی مخصوص تہذیب اور مشرقی تمدن کے لئے مشہور رہا ہے جس کا کہیں جواب نہیں گو یہ تہذیب اب زمانے کے ہاتھوں رفتہ رفتہ مٹ گئی ہے پھر بھی ہاتھی لاکھ گھٹے تب بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ گری حالت میں بھی ایک نمونہ ہے۔ لکھنؤ کے مٹی کے کھلونے اور پھل و میوہ جو دیکھنے والوں کو متحیر کر دیتے ہیں اصل اور نقل میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

آصف الدولہ (جن کے متعلق مشہور تھا جس کو نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ) کا مشہور تاریخی امام باڑہ ریزیڈنسی مارٹین صاحب کی کوٹھی، بوٹانیکل گارڈن، بنارسی باغ، زندہ عجائب گھر، چھتر منزل، قیصر باغ، ریوڑیاں جسے کھٹیاں بھی کہتے ہیں۔ عطریات اور چکن کا کام اور ان سب سے زیادہ زردوزی، کامدانی اور بادلہ وغیرہ کے کاریگر جن کا کام سارے ہندوستان میں مشہور ہے اور ان کاریگروں کا.....
بہترین کام :-

طلاق نامہ

مسز اعجاز

"میری قمیض استری ہو چکی ہے کیا" عامر نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

"میری یونیفارم تیار ہے" ۶ سالہ نومی نے بستر سے چھلانگ لگاتے ہوئے پوچھا۔

زوبی جو رات بھر بخار اور درد میں مبتلا رہی تھی کہ اس کے کانوں میں شوہر اور بیٹے کی آوازیں آنی شروع ہوگئیں صبح کے سات بج چکے تھے۔ زوبی کی طرف سے کوئی آواز نہ آئی تو عامر چلائے میرے بوٹ بھی پالش نہیں۔ نومی بھی ویسے ہی گرجا، "ٹائم کھو رہا ہے ناشتہ بھی تیار نہیں۔"

زوبی کو غصہ آگیا "آپ لوگ اپنا اپنا کام خود کیوں نہیں کر لیتے۔ میں بھی انسان ہوں۔ مشین تھوڑی ہوں۔ باپ کو تیار کر دوں۔ بیٹے کو کروں، ناشتہ تیار کر دوں" اتنے میں ننھی کے رونے کی آواز آئی۔ "لیجئے صاحبزادی بھی دودھ مانگ رہی ہیں۔ زوبی کبھی جذباتی ہوتی چلی گئی۔ میری طبیعت خراب ہے مجھ سے کچھ نہیں ہوتا۔ روز روز کی مصیبت اب مجھ سے سہی نہیں جاتی۔"

"بیگم صاحبہ اور کیا کام ہے آپ کا؟ آپ یہ کام بھی نہیں کر سکتیں" عامر ذرا غصے میں بولے۔

نہ جانے زوبی کو آج کیا ہوگیا تھا! وہ غصے میں کیوں آگئی تھی۔ وہ پوری طرح ہڑتال کرنے کے موڈ میں تھی۔ بولی مجھ سے کچھ نہیں ہوتا کوئی اور لے آئیے۔"

"تو آپ سمجھتی ہیں کہ مجھے کوئی اور نہیں ملے گی، ایک چھوڑ دس لا کر دکھاؤں گا۔"

"مجھے طلاق چاہئیے میرا آپ کے ساتھ گزارا نہیں" زوبی جذباتی ہو کر سب کچھ کہہ گئی۔

اسی لڑائی جھگڑے میں آفس کا وقت ہوگیا۔ عامر دفتر چلے گئے اور جاتے ہوئے کہہ گئے "واپسی پر طلاق نامہ لیتا آؤں گا۔"

"طلاق اور طلاق نامہ" یہ سب کچھ کیا ہوا اور کیا ہو رہا تھا۔ یہ لفظ اس کی زبان سے نکلا کیسے؟ وہ خود حیران تھی زوبی دھڑام سے اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی۔ عامر جا چکے تھے۔ نومی بھی اسکول چلا گیا۔ ننھی کھلونوں سے کھیلنے لگی اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس کا ضمیر اسے کوس رہا تھا۔ عامر آج بھوکے ہی چلے گئے۔ ۸ سال شادی کو ہوئے۔ مگر ایسا جھگڑا تو نہ ہوا آج یہ کیا ہوا۔ معمولی سی بات پر، کیا یہ کام وہ روزانہ ہی کرتی تھی۔ آج کوئی نیا کام تھا۔ کیا ہوا ذرا سی طبیعت خراب تھی۔

وہ بے سدھ سی لیٹی ہوئی اپنے آپ سے ہی باتیں کرنے لگی۔

"زوبی تمہیں پیار کرتے تھے۔ تیرے گھٹاؤں جیسے سیاہ بال نشیلی آنکھیں سب ہی پسند کرتے تھے۔ جب کوئی رشتہ دار آتا تم کتنی خوش ہوا کرتی تھیں۔ کیونکہ حیدر آباد میں کوئی تمہارا رشتہ دار نہ تھا۔ تمہیں یاد ہے جب عامر اور ان کی امی تم سے پہلی بار ملے تھے۔ عامر تمہارا ہم عمر تھا۔ تم نے ساری سہیلیوں سے اس کا تعارف کروایا تھا۔ تم دونوں ہر وقت اکٹھے ہی رہتے۔ چچی جان تمہاری جوڑی کو دیکھ کر پھولی نہیں سمائی تھیں۔ دو ماہ کی چھٹیاں گزار کر عامی واپس چلا گیا اور تم کچھ دنوں کے لئے اداس ہوگئیں۔

پھر جب ملے تو تم میٹرک کر چکی تھیں۔ عامی بھی کالج میں قدم رکھ چکا تھا۔ تمہیں یاد ہے وہ دن جب تم اور عامر لڈو کھیل رہے تھے۔ چچی کی بکری تمہارے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ چچی بولی وہ مری زوبی "تو عامر بولا" تم مرو زوبی کیوں مرے"؟

"تم کون ہوتے ہو مجھے بچانے والے" تم نے عامر کا کان کھینچا اور بھاگ گئیں۔

تمہیں یاد ہے وہ دن جب سب لوگ پکنک منانے نہر کنارے

گئے تھے۔ بڑے لوگ ہٹ ہاؤس میں بیٹھ گئے اور جوان پارٹی آنکھ مچولی کھیلنے میں لگی سب لوگ ادھر اُدھر چھپ گئے۔ عامر تلاش کرتے کرتے تھک گئے اور آم کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے اتنے میں ایک آم ان کی ناک پر آگرا وہ درد سے کراہ اٹھے انھوں نے سمجھا کسی طوطے نے گرایا ہے وہ پتھر اٹھا کر مارنے لگے۔ تو تم فاتحانہ مسکراہٹ لئے دیکھ رہی تھیں۔

"او ہو تو میں سمجھا طوطا بیٹھا ہے" حالانکہ یہ طوطی تھی وہ اپنی خفت مٹاتے ہوئے بولے تم نیچے اتریں تو انھوں نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"معافی مانگو پھر چھوڑوں گا"

"نہیں مانگتی" اسی تکرار میں سب آگئے اور تمہاری جان بچ گئی۔

زوبی تمہیں بہار کی وہ رنگین شام کبھی یاد ہوگی۔ نرم نرم سنہری کرنیں کم ہو رہی تھیں۔ رنگا رنگ پھول اپنے مکھڑے چھپا رہے تھے۔ فضا میں دلفریب مہک تھی۔ بہار کی خوشگوار ہوائیں بہک بہک کر چل رہی تھیں، پرندے سحر انگیز نغمے گا رہے تھے تم ان سب چیزوں سے بے خبر لان میں بیٹھی عامر کا سوئیٹر بن رہی تھیں کہ اچانک گول سفید سی چیز تمہاری گود میں گر پڑی تم چیخ مار کر اچھل پڑیں کرسی کے پیچھے عامر مسکرا رہے تھے۔ گہرے نیلے سوٹ میں ملبوس کشادہ پیشانی پر بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں شوخی مچل رہی تھی تم نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنی حالت پر شرمندہ ہوتے ہوئے گیند کر روئی کے گالے سے ڈر گئیں۔

زوبی! موری مٹھی میں کیا ہے؟ عامر نے شوخی سے پوچھا تم نے ان کی طرف دیکھ کر کہا "ہوگا کسی کا دل"!

"ارے۔ رے۔ کہاں! ہم جیسے بدنصیب کو کون دل دیتا ہے۔ تم نظریں جھکائے کچھ سوچ رہی تھیں کہ اس نے مٹھی کھول دی اس میں دو ٹافیاں تھیں ایک خود کھالی اور دوسری تمہارے منھ میں ٹھونس دی۔ پھر اچانک سنجیدہ ہوکر کہنے لگا۔

"ایک بات سچ سچ بتاؤ گی زوبی"

"کونسی بات" تم گھبرا گئیں۔

"تمہاری آنکھوں میں گھور کر بولا" زوبی! کیا تم میری ساتھی بننے کے لئے تیار ہو"

تمہیں اس لہجے اور سوال پر ہنسی آگئی اور قدرے بن کر بولیں تو کیا اب میں تمہاری ساتھی نہیں بچپن سے تمہاری ساتھی ہوں اور ہمیشہ رہوں گی تو وہ ہلکے سے تمہیں چپت لگا کر مسکراتا ہوا آگیا۔

تمہیں یاد ہے جب صفو آپی کی شادی تھی رخصتی کے بعد تھک کر سب ہی سو گئے۔ گھر میں ویرانی سی چھا گئی اس دن تمہارے آنسو رکنے کا نام نہ لے رہے تھے۔ ہر طرف اداسی تھی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نیند ابھی کوسوں دور تھی۔ چاندنی رات تھی تم نے باغ کی طرف چلنا شروع کر دیا کہ اچانک کسی کا ہاتھ تم نے شانے پر محسوس کیا۔

"عامر تم" وہ بھی شاید بہن کی جدائی میں رو رہا تھا آنکھیں سرخ تھیں۔ اپنا غم بھلانے کے لئے مسکرا دیا۔

"زوبی! کس کا انتظار کر رہی ہو"

تمہیں یہ سوال سن کر غصہ آگیا۔

"میں کیوں لگی کسی کا انتظار کرنے لوگ خوامخواہ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں"

اس نے گہرا سانس لیا اور بڑے ہی دکھ سے بولا۔

"تم ہمیشہ مجھ سے ناراض رہتی ہو اور تم اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگیں جو تمہیں بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ وہ شاید پوچھ رہی تھیں کہ تم رات گئے تک اتنی ٹھنڈ میں کیوں کھڑی ہو تمہیں اپنے رویے پر افسوس ہوا۔

"ناراض تو نہیں عامر نیند نہیں آرہی تھی ادھر آگئی"

"کیوں" وہ شرارت سے ہنسا

"بس یونہی" اس نے تمہارے دل میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"زوبی! تم اداس کیوں ہو"

"پھر وہی قیاس آرائیاں!" تم نے ٹوکا

نہیں زوبی یہ اداسی تمہارے دل کا راز ہے تم مجھ سے چھپاتی کیوں ہو میں تمہیں جانتا ہوں۔ میں تمہارے دل کی بات جانتا ہوں وہ کیا اور تم گھبرا گئیں۔ کیا واقعی وہ سب کچھ جانتا ہے۔

رک کیوں گئے"

"اس لئے کہ میں نے تمہارے دل کی آواز سن لی ہے زوبی"

وہ انتہائی جذباتی ہو رہا تھا تم نے جانا چاہا تھا تو اس نے تمہارا راستہ روک لیا۔

"زوبی تمہیں معلوم ہے کہ میں کل شام کی فلائٹ پر لندن جا رہا ہوں دو سال کے لئے۔ ایک بات بتاؤ گی وہ جلدی سے کہہ گیا وعدہ کرو زوبی سچ سچ بتاؤ گی نا"

تم نے سنبھلتے ہوئے کہا" کچھ کہو تو سہی"

"میں ڈرتا ہوں کہیں تم انکار نہ کر دو" وہ شرارت سے مسکرایا۔ اگر میں امی کو تمہارا رشتہ مانگنے کے لئے بھیجوں تو تمہیں انکار تو نہیں ہوگا۔

عا... مر تم بمشکل سے کہہ سکیں اور تیز تیز قدم اٹھاتی چلی گئیں تم تمام رات نہ سو سکیں۔ تمہیں یاد ہے اس نے کن محبت بھری نگاہوں سے تمہیں الوداع کہا تھا اور پھر تم دونوں کی منگنی بھی ہوگئی۔

دو سال بعد تمہاری شادی بھی ہوئی شادی کے بعد بھی یاد ہے نومی کی پیدائش پر تمہاری حالت تشویش ناک تھی۔ ڈاکٹروں نے خون کا مطالبہ کیا کسی کا خون نہ ملا تو عامر نے ہی تمہیں اپنا خون دے کر بچایا۔ تمہیں یہ بھی یاد ہوگا جب وہ نومی کو دیکھنے کمرے میں آئے تو انھوں نے کتنے پیار سے تمہیں دیکھ کر کہا تھا۔

"مجھے نومی کی پیدائش کی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی تمہاری جان بچا کر ہوئی ہے۔ زوبی میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا مجھے اپنی زندگی اندھیر نظر آنے لگی تھی"

اور ہاں زوبی تمہیں وہ دن بھی یاد ہے جب تم اپنے دونوں بچوں کو لے کر صفو آپی کے گھر گئیں تھیں۔ پندرہ دن کے لئے کتنے فون کئے تھے۔ عامر نے کتنے خطوط لکھے تھے اور جب واپس آگئیں تو کس طرح ملے تھے جیسے صدیوں کے بچھڑے ملتے تھے۔

ہاں آج تمہیں کیا ہوا زوبی تم اتنی جذباتی کیوں ہوگئی تھیں۔ معمولی سے کلام پر ناراض ہو کر تم نے اپنے عامر کو ناشتہ بھی نہ کروایا آج وہ بھوکے ہی آفس چلے گئے کیا تم وہی زوبی ہو عامر کے بغیر نوالہ حلق سے نہیں اترتا۔ آج تم نے ان سے طلاق کا مطالبہ کر دیا کیا تم ان بچوں کو باپ کا پیار دے سکو گی کیا تم عامر کے بغیر زندہ رہ سکو گی اٹھو زوبی ہوش میں آؤ اپنے کئے کی معافی مانگو"

یہ عہد کرکے زوبی اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر آئی کھانا تیار کیا۔ نومی اسکول سے آچکا تھا۔ دونوں بچوں کو تیار کیا خود عامر کے پسند کی ساڑھی پہنی اور ان کا انتظار کرنے لگی۔ گھڑی کی طرف دیکھا ۵ بج چکے تھے وقت گذرتا گیا شام ہوگئی مگر عامر کے آنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ آفس میں فون کیا جہاں وہ جایا کرتے فون کئے مگر عامر کا پتہ نہ چلا۔

رات کے آٹھ بج گئے۔ بچے سو گئے۔ زوبی پریشانی میں رونے لگی۔ انتظار کی گھڑیاں لمبی ہوتی جا رہی تھیں دروازے پر جانی پہچانی دستک ہوئی۔ خوشی اور ندامت کے ملے جلے جذبات سے دروازہ کھولنے بڑھی تو باہر سے آواز آئی۔

زوبی میں نے آج تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ طلاق نامہ لانے میں دیر ہوگئی لو اس پر......

ابھی انھوں نے فقرہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ زوبی دوڑ کر ان سے لپٹ گئی اور ندامت سے سر جھکا دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہوگئی جسے عامر نے اپنے رومال میں جذب کر لیا۔

ٹوٹی کہاں کمند

آنسہ ناظمہ

میں بچپن سے اب تک بہت خشک مزاج رہا ہوں۔ جانے کیوں! جبکہ میرے گھر والے اور سب بہن بھائی خاصے زندہ دل اور ہنس مکھ ہیں بقول کہ انھوں نے کبھی غم نہیں پالا۔ بہرحال میں ہنسا اور قہقہے لگانا ان کی زندہ دلی کی مثال دی جاتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں اس گھر کا فرد معلوم ہی نہیں ہوتا۔ دوست احباب رشتہ دار سب ہی مذاق اڑاتے اور کہتے کہ جانے میں کس مٹی کا بنا تھا۔ کچھ اثر نہ ہوتا۔ مجھے اگر کوئی شوق تھا تو مطالعہ کا دنیا بھر کے موضوعات پر میرا مطالعہ بہت وسیع تھا اس کے ساتھ ہی جو ذمہ داری مجھے سونپی جاتی اسے محنت سے پورا کرتا یہی وجہ ہے کہ اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک میں ہونہار طالب علم کی حیثیت سے تمام ٹیچرز کی آنکھوں کا تارا بنا۔ لیکن جب بھی کسی نے مجھے دوسری سرگرمیوں میں حصہ لینے کو کہا میں انکار کر گیا خدا جانے مجھے اپنی ذات سے اتنی دلچسپی کیوں تھی۔ گھنٹوں بیٹھا اپنے متعلق سوچا کرتا یا پھر کتابیں ہوتیں اور میں۔ ہاں یاد آیا اس کے علاوہ مجھے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر کا نظارا کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔

میری کھڑکی کچی سڑک پر کھلتی تھی۔ سڑک پار ایک طرف کچھ مکانات تھے۔ دوسری طرف کھلا میدان، میدان سے پار پہاڑی سلسلہ اور یہی سب کچھ میری دلچسپی کا مرکز تھا۔ شام کے وقت میدان میں کھیلتے ہوئے بچے بھاگتے دوڑتے ایک دوسرے کو دھکا دیتے گراتے مجھے بہت اچھے لگتے۔ لیکن پھر بھی کبھی یہ خواہش نہ ہوتی کہ میں بھی ان کے ساتھ کھیلتا بارش کے دنوں میں یہ مناظر اور بھی خوبصورت لگتے۔ پہاڑوں کے اس پار بھی آبادی تھی کیونکہ اکثر اوقات لڑکیاں اور بچے پہاڑوں پر بھاگتے دوڑتے نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی سامنے والے میدان میں دوسرے شہر سے کھیلنے والے کالج والے ٹیمیں قبائلی گروپ ڈالتے ان دنوں وہ گرد کا ماحول بہت زیادہ رنگین ہوجاتا اس میں کوئی شک نہیں کہ قبائلی

لڑکیاں بہت حسین اور خوبصورت ہوتی تھیں۔ لیکن میں کبھی بھی ان سے متاثر نہیں ہوا جب کبھی یہ قافلے آتے میرے دوست میرے گھر آتے اور ان لوگوں سے گپ شپ لگایا کرتے بلکہ عامر جو ہمارے گروپ میں سب سے زیادہ ہنگامہ پسند تھا۔ ایک آدھ لڑکی سے دوستی بھی کرلیتا لیکن مجھ پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ میں کہتا تھا۔ یہ سب بھرے پیٹ کی باتیں ہیں۔ ابھی ان لوگوں کی جیب خالی ہو اور سر پر ذمہ داریوں کا بوجھ پڑا ہو تو پھر انھیں اپنا بھی ہوش نہیں رہے گا۔

رومانس لڑانا تو دور کی بات ہے جب کبھی میں عامر سے یہ بات کہتا وہ شوخی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا "پیارے یہ سب جینے کی باتیں ہیں۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ ہم کوئی تمہاری طرح خشک مزاج دقیانوسی نہیں کہ خدا کی نعمتوں کو ٹھکرا کر کفران نعمت کریں" پھر وہ میری خوشامد کرتا "شکیل یار ایک بار میری بات مان کر دیکھو کیا لطف آتا ہے۔ تمہاری زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ نہ کوئی ACTIVITY نہ کوئی ہنگامہ میں اس کی گوش مالی کرتا تو وہ بالکل بچوں کی طرح گلے میں باہیں ڈال دیتا "شکیل ایمان سے میں نے پڑھا ہے۔ خوش مزاج لوگوں کی عمریں بھی لمبی ہوتی ہیں"

"عامر تمہاری نصیحتیں تمہیں مبارک مجھے نہیں چاہئے لمبی عمر" تب وہ غصے سے بھنا اٹھتا "لگتے تو انسان ہیں پتھر ہے بلکہ پتھر سے بھی گیا گذرا کہ کبھی تو پتھر کو بھی جونک لگ جاتی ہے مگر تجھ پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا جانے اللہ میاں نے تجھے دنیا میں بھیجا ہی کیوں" اور واقعی کبھی کبھی میں سوچتا کہ میں اتنا خشک مزاج کیوں ہوں۔ لیکن پھر اپنے آپ کو تسلی دیتا کہ کم از کم سکون اور اطمینان سے تو ہوں ان لوگوں کی طرح مجھے فکر تو نہیں کھائے جاتی کہ کبھی پانی میں جانا ہے۔ تو کبھی پاس اور جو تا ہو۔ سالگرہ پر جانا ہے خوبصورت تحفہ چاہئیے میں ان غموں سے آزاد خود کو

بہت گھٹن محسوس کرتا۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب تعلیم کی تکمیل کے بعد ملازمت کی تگ و دو میں پھر رہا تھا خدا خدا کر کے کراچی میں اچھی ملازمت مل گئی۔ گھر والوں کے ساتھ کراچی منتقل ہو گیا یوں بھی ابا کی وفات کے بعد خاندان کی ذمہ داری مجھ پر ہی تھی ایک دو ماہ تو اجنبیت محسوس ہوئی پھر حالات معمول پر آگئے۔ میں نے ایک فلیٹ لے لیا تھا جو ہم لوگوں کی ضرورت کو کافی تھا۔ میرے دوستوں کے خطوط آتے تھے وہ سب ہی اپنے کام سے لگ گئے تھے۔ عامر کے خطوط اس کی اپنی طرح بہت دلچسپ ہوتے اس کا خیال تھا۔ شاید کراچی جیسے شہر میں آکر میں بدل جاؤں گا۔ اس لئے ہر خط میں کوئی نئی تازہ خبر ضرور پوچھتا تھا۔ پھر ایک دن وہ اچانک میرے دفتر آدھمکا میں اس کی اتفاقی آمد پر بہت خوش ہوا۔ اس دن میں اسے لے کر جلد گھر آگیا۔ آتے ہی اس نے میرے پڑوسیوں کے بارے میں معلومات کیں لیکن مجھے تو کچھ معلوم ہی نہ تھا اس لئے چھوٹی بہن بینا نے اسے ساری معلومات بہم پہنچائیں۔

اگلے دن جب ہم شام کو گیلری میں بیٹھے تھے تو اس نے میری توجہ سامنے والے گھر کی طرف دلائی جہاں ایک خوش شکل لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کے ہمراہ کھڑی کسی طرف دیکھ رہی تھی۔ عامر بولا "شکیل میں بڑی دیر سے محسوس کر رہا ہوں وہ تمہاری طرف متوجہ ہے؟"

"تم تو پاگل ہو" میں نے اسے واقعی جھڑک دیا "کبھی تو اپنی حرکتوں سے باز آیا کرو .... تم تو چلے جاؤ گے لوگ خواہ مخواہ ہمارے بارے میں شک کریں گے" لیکن وہ ڈھیٹ کب ماننے والا تھا۔ ایک ہفتہ رہا اور اس دوران روز مجھے اس لڑکی کے بارے میں بتاتا "دیکھو شکیل آج اس نے نیلا سوٹ پہنا ہے کتنی خوبصورت لگ رہی ہے" "آج جوڑا بنایا ہے اور اس میں پھول بھی لگا ہے۔ ایمان سے قیامت ہے"

جس دن اسے جانا تھا ہم شاپنگ سے واپس آئے تو بینا گیلری میں کسی سے باتیں کر رہی تھی میں اندر جانا چاہتا تھا کہ اس نے آواز دی "بھیا سنیے ان سے ملیں میری نئی دوست ثمینہ سامنے والے فلیٹ میں رہتی ہیں" "آداب" میں نے اس کی آواز پر "آداب" کہا اور چلا آیا۔ "یار بڑے خوش نصیب ہیں آپ کے دعا تھی میں بھی ..... آ

آگئے"

"کیا بکواس ہے"

"بکواس نہیں حضور یہ وہی محترمہ ہیں جو روز آپ کو دیکھتی تھیں آج چلی آئیں"

میں نے اس واقعے کو کوئی اہمیت نہ دی۔ عامر چلا تو گیا مگر اب اسے شرارت کا نیا موضوع ہاتھ آگیا تھا۔ ہر خط میں ثمینہ کے بارے میں پوچھتا کبھی کبھی لکھتا "بھائی میرے شاید اس لئے بتانا نہیں چاہتے کہ میں تم سے حسد نہ کرنے لگوں تو سنو دوست ایسی بات نہیں اس لئے کہ ہم نے تو اپنا آئیڈیل پا لیا ہے تم بھی دیکھو گے تو رشک کرو گے۔ اپنے عامر کی قسمت پر" اس کا خیال تھا کہ میں اسے بتاتا نہیں ہوں۔ رفتہ رفتہ بینا اور ثمینہ اچھی دوست بن گئیں اور وہ اکثر اپنے بھائی بہلی کے ساتھ آجاتی۔ بینا نے بتایا تھا کہ اس کے ابو اور بھیا گزشتہ برس ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اب وہ اپنی امی اور بھائی کے ساتھ رہتی ہے اس کی والدہ ایک سکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔

مجھے زندگی میں پہلی بار لاشعوری طور پر اس لڑکی سے ہمدردی ہو گئی اب میں بھی اکثر بینا سے اس کے بارے میں پوچھتا۔ بینا کی زبانی مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ وہ کبھی میری اکثر تعریف کرتی رہتی ہے اکثر ایسا ہوتا کہ میری اس کی مڈبھیڑ ہو جاتی، میں اس کی خیریت دریافت کرتا تو وہ دھیمے لہجے میں جواب دیتی لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری موجودگی میں جتنی دیر بینا کے پاس رہتی میرے کمرے کی طرف دیکھتی رہتی۔ مجھے ایک دم سے زندگی بہت خوبصورت لگنے لگی میں جان بوجھ کر ایسی جگہ بیٹھتا جہاں سے وہ مجھے نظر آتی رہتی، میں محسوس کرنے لگا تھا کہ لاشعوری طور پر اچھی لگنے لگی تھی اور اب تک میرا یہی اندازہ تھا کہ اس کے تاثرات بھی میرے بارے میں ایسے ہی ہیں لیکن آج کی بات نے مجھے یہ سارے پچھلے واقعات یاد دلا دیئے اور میں سوچ رہا ہوں کہ اپنی پہلی والی زندگی سے مطمئن تھا نہ جانے یہ جذبہ کب کہاں اور کیسے میری زندگی میں پیدا ہو گیا جس نے مجھے بے چین کر کے رکھ دیا۔ اگر میں ثمینہ کی بات نہ سن لیتا تو شاید اسی تصور کے سہارے مطمئن رہتا کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ لیکن آج جو کچھ میں نے سنا ہے سن کر مجھے اپنے ان دوستوں پر غصہ آرہا ہے جو مجھے زندگی کی رنگینی کے لیکچر دیا کرتے تھے۔ کیا یہی زندگی ہے کہ انسان ایک چیز کی خواہش کرے وہ اسے مل بھی جائے اور پھر اس سے چھین لی جائے۔

آج جو ابا (؟) میں دفتر سے آیا تو وہ دونوں حسب معمول گیلری میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، ثمینہ نے سفید لباس پہن رکھا تھا وہ مجھے ہر دن سے زیادہ اچھی لگی معصوم اور بھولی بھالی سی پھر میں نے سنا وہ کہہ رہی تھی۔ "بینا میں کئی دن سے ایک بات کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہ سکی پر آج ضرور کہوں گی۔"

"ہاں ہاں کہو نا ایسی کیا بات ہے۔" بینا نے بڑے پیار سے کہا۔

میرا دل جانے کیوں خوشی سے دھڑک اٹھا میں جانتا تھا وہ کہے گی۔ "بینا مجھے تمہارے بھیا بہت اچھے لگتے ہیں۔" بجلی کی تیزی سے اٹھ کر میں دروازے کی اوٹ میں ہو گیا لیکن اب سوچتا ہوں کاش ایسا نہ کیا ہوتا اس طرح میں شاید اس کی بات نہ سن پاتا لیکن بہرحال اب تو سن چکا ہوں، وہ بڑے اداس لہجے میں کہہ رہی تھی "بینا تمہارے بھیا کی شکل بالکل میرے مرحوم بھیا جیسی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں انھیں بھائی جان کہا کروں، آج ابا اور بھیا کی پہلی برسی ہے وہ مجھے بہت یاد آرہے ہیں۔ اگر میں انھیں بھائی جان کہوں تو انھیں اعتراض تو نہ ہوگا۔"

اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر غیر یقینی انداز میں بینا کی طرف دیکھا جو خوشی سے اس کے گلے میں جھول گئی "نہیں ثمینہ کیسی باتیں کرتی ہو بھیا بہت اچھے ہیں انھیں یقیناً خوشی ہوگی کہ ان کی دو بہنیں ہو گئیں میں تو تمہیں پہلے دن سے ہی بہن سمجھتی ہوں آؤ تمہیں بھیا کے پاس لے چلوں۔"

قبل اس کے کہ وہ دونوں میرے کمرے میں آتیں میں دوسرے کمرے کے دروازے سے نکل کر باہر چلا آیا یونہی بے مقصد آوارہ گردی کرتے کرتے ابھی کچھ دیر پہلے آیا تھا۔ اسی لئے آج مجھے ماضی شدت سے یاد آرہا تھا ماضی جو بہت خوبصورت تھا میں اپنی دنیا میں مطمئن تھا۔ رہ رہ کر ثمینہ کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے "ان کی شکل بالکل میرے بھیا جیسی ہے۔"

جواہر پارے

- باپ کی دعا بیٹے کے حق میں ویسی ہی پر اثر ہے، جیسے نبی کی دعا اس کی امت کے لئے ہو سکتی ہے۔
- اللہ کے یہاں سب سے بڑی سفارش انسان کے اچھے اعمال ہوں گے۔
- غریبوں اور محتاجوں سے پیار کرو اور ان کی مجلسوں میں خوشی کے ساتھ شریک ہوا کرو۔
- انسان بیماری کے ڈر سے کھانے میں پرہیز کرتا ہے، لیکن عذاب کے ڈر سے گناہوں سے پرہیز نہیں کرتا۔
- علم کسی خزانے سے بہتر ہے اس لئے کہ خزانے کی حفاظت کرنا پڑتی ہے اور علم خود انسان کی حفاظت کرتا ہے۔

مرسلہ عقیلہ انجم (پرنام بٹ)

حسن معاشرت کا حکم

قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ ان عورتوں کے ساتھ گذربسر کرو اچھی طرح، پھر تم ان کو ناپسند کرو تو ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ میاں نے تمہارے واسطے اس میں بہت خوبی بھلائی رکھدی ہو۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایام جاہلیت میں عورت کے ساتھ ذلت وسختی کا برتاؤ کیا جاتا تھا تم اس طرح کے اطوار سے الگ ہو کر عورتوں سے بول چال میں شیریں زبانی اور معاملات میں حسن سلوک اختیار کرو اور اگر تم کو اپنی عورت کی کوئی عادت وخصلت پسند نہ ہو تو صبر کرو، ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی خوبی بھی ہو اور یہ عین ممکن ہے کہ تم کو کوئی چیز ناپسند ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس میں تمہارے لئے کوئی دینی یا دنیوی بڑی منفعت رکھ دی ہو اس لئے تم کو عورت سے نباہ بھی کرنا چاہیئے اور بدخو کے ساتھ تم کو بدخوئی نہ کرنا چاہیئے۔

محبت کے مزار پر جل اٹھی شمع

کوثر انجم

آنٹی کی طبیعت کل سے کچھ ٹھیک نہیں تھی سوچا آنٹی کو اطلاع ہی کر دوں۔ خط لکھنے کے لئے اوپر والی منزل پر آئی تھی کہ نیچے سے جہاں زیب نے ہانک لگا دی "ارے او باجی تیرے کا فون آیا ہے پھیصل آباد سے"۔
میں دوپٹہ جوتا کمرے میں چھوڑ نیچے کو بھاگی۔
"کون ہے آپ بول رہے ہیں انکل عظیم" میں نے آواز پہچان لی۔
"شنی وہ بلی جو تم نے دیکھی تھی نا مجھے پسند آگئی ہے۔ بس اب تم واپس آجاؤ تو اسے گھر لے آتا ہوں" انکل عظیم کی کھنکتی ہوئی ہنسی مجھے صاف سنائی دی۔

"او انکل پلیز شرارت کا وقت نہیں ہے مجھے جلدی سے بتائیں نا" میں بے تاب سی ہو گئی۔

"شنی جلدی سے سب کو لے کر کل آجاؤ میں بیاہ رچا رہا ہوں"۔
"سچ انکل" فرط جذبات سے میرا انگ انگ رقص کرنے لگا۔ "مگر آنٹی گرمی میں۔

اگر تم کو بھی آنا ہے تو آؤ ورنہ" ان کا فقرہ مکمل کرنے سے پہلے بیچ میں کوئی اور کود پڑا اور میں فون کو چھوڑ کر آنٹی کے کمرے کو بھاگی۔
آنٹی سر پر پٹی باندھے لیٹی تھیں۔ دروازہ کھلا ہونے کا مطلب یہی تھا کہ وہ جاگ رہی ہیں۔
"آنٹی، انکل عظیم شادی کر رہے ہیں۔
میں آنٹی کی بیماری کی پروا کئے بغیر ان سے لپٹ گئی "خدایا تیرا شکر ہے" آنٹی تکیہ کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھیں۔

"آپ جا رہی ہیں ہمارے ساتھ پنجاب؟" میں نے آنٹی کا پروگرام پوچھا مگر انھوں نے طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے بے انتہا خوشی ہونے کے باوجود جانے سے مجبوری ظاہر کی۔ ٹیپو اور ٹونی کو ساتھ لے کر میں پنجاب اکیلی ہی چلی آئی۔ سارے رستے مرداں کی خوبصورت زمین یاد آتی ہے ٹیپو بار بار چھیڑ رہا تھا۔ "باجی آپ اس بات پر افسردہ ہیں کہ پٹھانوں جیسی مہمان نوازی آپ لوگ کبھی نہیں کر سکتے"۔ مجھے انکی چھیڑ چھاڑ سے ذرا بھر لطف نہیں آ رہا ہے۔ انکل عظیم کے یوں شادی کے پروگرام پر مجھے خوشی کے ساتھ حیرانی بھی ہو رہی تھی۔

گیٹ پر سب سے پہلے انکل عظیم سے ہی ملاقات ہوئی "ادھر آ گئی ہے میری گپو"، وہ مجھے اکثر چڑانے کے لئے "گپو" ہی کہتے تھے۔
"انکل عظیم آپ سچ مچ کی شادی کر رہے ہیں نا یا پھر آپ نے میرے ساتھ کوئی شرارت کی ہے" میں لڑائی بھول کر سیریس ہو گئی۔
"تو کیا میری شادی نہیں ہو سکتی"۔ انکل عظیم نے بڑی شان سے نکٹائی کی گرہ درست کی۔ "انکل ہمیں بھی تو پوچھ لیں"۔ کندھے سے بیگ اتارتے ہوئے ٹونی نے کہا
"او ہو تم بھی آ گئے میرے ٹونی یار" انکل اسے گلے سے لپٹانے بڑھے تو میں جان چھڑا کر اندر بھاگ گئی۔

سب مہمان اندر آئے بیٹھے تھے۔ فری اور تارہ سرخ دوپٹے پر گوٹا ٹانک رہی تھی، پاس ہی مشتاق اور آصف کھڑے کوک سے شوق فرما رہے تھے۔ "آ گیا ہمارا رنگ لیڈر" فری دوپٹہ چھوڑ کر میری طرف بھاگی اور وہ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی شادی کی تفصیلات بتانے لگی۔ انکل عظیم کی شرارتوں پر ہم دل کھول کر ہنسے
برات کی روانگی سے پہلے سہرا بندی کی رسم تھی امی جان نے سب سے بڑے ہونے کے ناطے ان کے سر پر سہرا باندھا تو جلدی سے منہ باہر نکال کر کہنے لگے۔ "آپی میں کوئی کانا کھتوڑی ہوں جو میرا چہرہ چھپایا جا رہا ہے۔
"چپ رہو عظیم" امی نے ذرا آنکھیں دکھائیں تو وہ یوں ہی خواہ مخواہ منہ چڑانے لگے۔ ان کی شرارتوں سے تو سارا خاندان پناہ مانگتا تھا اب اپنی شادی کے موقع پر بھی باز نہیں آ رہے تھے۔ انکل

عظیم شادی کے بعد ہمارے گھر رہے اور جب وہ اپنے گھر "قصر عظیم" شفٹ ہونے لگے تو ضد کر کے مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے گئے۔

سامان گھر کے سے اُٹھا پڑا تھا۔ کچن کا دروازہ کھولا تو نشرا نے ہمارا استقبال کیا "زیبی اب اٹھالو اپنا ہاتھ اوپر" انکل عظیم نے اپنا ہاتھ بھی کندھے تک لاتے ہوئے اپنی بیگم کو حکم دیا۔ وہ بے چاری مرتی کیا نہ کرتی فوراً ہاتھ اوپر اٹھا لیا۔ "ہاں تسنی اب تم گواہ رہنا" انھوں نے مجھے مخاطب کیا اور پھر بڑے مودب انداز میں کہنے لگے "زیبی کہو میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتی ہوں کہ جب تک عظیم کا ہاتھ رہے گا باورچی خانے کی مالکن یعنی باورچن بن کر مزیدار کھانے کھلاتی رہوں گی۔" میں بیچ میں زور سے ہنس پڑی تو مصنوعی غصہ سے بولے "چپ رہو لڑکی ہوٹل کے کھانے کھا کھا کر تو تنگ آ گیا تھا" "آپ تو بس ایسے ہی کرتے رہیں گے۔ میں زیبی کا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم میں لے آئی ڈرائنگ روم آپ شاید باتھ روم کے طور پر استعمال کرتے ہیں" پرانے گندے اور گرم سوٹوں کو صوفوں پر بے ترتیبی سے پڑا دیکھ کر میں نے انکل عظیم پر چوٹ کی۔

ٹھیک ہے مت کرو اور جا کر میرے گرم کپڑوں کو میری وارڈ روب میں رکھ آؤ اور ہاں ذرا اس کی صفائی کر دینا میری چندا، ماموں نے پیار سے پچکارا تو میں انکار نہ کر سکی

میری موجودگی میں انکل عظیم کی بیوی کام کرتی مجھے اچھا نہ لگا اس لئے بڑی فرمانبرداری سے ان کے گرم سوٹ اٹھا کر چلی آئی ورنہ کوئی اور موقعہ ہوتا تو کبھی کہنا نہ مانتی کوٹ کو جھاڑا تاکہ وارڈ روم میں رکھوں تو ایک تصویر اچھل کر نیچے گر پڑی۔ میں نے لپک کر نیچے سے اٹھائی تو دم بخود رہ گئی۔ مونا آپی کی تصویر تھی۔ تصویر میرے ہاتھ میں تھی اور میں یادوں کے سیلاب میں بہتی نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچی۔

انکل عظیم اپنے سب بہن بھائیوں سے چھوٹے تھے اور میری امی جان سب سے بڑی تھیں۔ انکل اس وقت طالب علم ہی تھے جب نانی اماں انھیں چھوڑ کر نانا ابا کے پاس عدم کو سدھار گئیں۔ انکل عظیم نے ہوسٹل میں داخلہ لے لیا اور چھٹیوں میں ہمارے ہاں آ جاتے گو کہ ہم چھوٹے تھے لیکن ان کی ظریفانہ طبیعت کے باعث ہم ان سے یوں

قریب تھے جیسے دوست ہوں۔ ہوسٹل سے واپس آنے تو مجھے اور تارا کو پاس بلا کر بریف کیس کھولتے۔ ٹافیوں کا پیکٹ دیکھ کر دل مچل اٹھتا مگر وہ ہمیشہ مشروط طور پر ٹافیاں پیش کرتے۔ میں اور تارا ایک دوسرے سے بازی لے جاتے ہم فوراً مونا آپی کے کمرے کی طرف بھاگتے۔ ان کو گھسیٹتی جب انکل عظیم کے پاس لے آتی تو وہ پیکٹ ہماری طرف اچھال دیتے۔

مونا آپی اپنی امی کے ساتھ ہماری کوٹھی کے اوپر والے پورشن میں رہتی تھیں۔ شام کا وقت تھا سب لوگ اکٹھے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں نا سمجھ تھی، کیک کا پیس پلیٹ سے اٹھاتے ہوئے جھٹ سے پوچھا "مونا آپی آپ کے ابو..." "مونا تم بھی تو لو نا کیک" امی نے بیچ ہی میں میری بات کاٹ دی اور "ہاں تسنی تم ذرا جلدی سے جا کر میرے کمرے کی کنڈی لگا آؤ۔ امی نے مجھے وہاں سے اٹھا دیا۔ امی کے یوں بات کاٹنے سے میری متجسس طبیعت بے چین سی رہی۔ رات جب حسب معمول امی ہمارا راؤنڈ لینے آئیں کہ پڑھ رہی ہیں یا نہیں تو میں نے کتاب تپائی پر رکھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا "امی کہاں ہیں مونا آپی کے ابو" امی میرے قریب ہی بیٹھ گئیں "بیٹے وہ مونا میری سگی خالہ زاد ہے۔ خالو ابا نے دوسری شادی کر لی اور اپنی دوسری بیوی کے ساتھ کسی اور شہر میں رہتے ہیں۔ میرے ابا نے خالہ جان کو کوٹھی کا اوپر والا حصہ ان لوگوں کو دے دیا تھا تب سے وہ ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔

"ہماری کوٹھی میں کیوں امی" تارا بھی گفتگو میں دلچسپی لینے لگی "تارا یہ کوٹھی میرے ابا جی کی ہے جس کو چاہیں دیں۔" پھر یہ مونا آپی تو ہماری آنٹی ہوئیں۔ میں نے اپنے ذہن میں رشتہ جوڑا۔ ہاں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے! امی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"امی مونا آپی کے ابو آتے ہیں؟" تارا نے ایک بار پھر سوال کیا۔

"ہاں آتے ہیں تو ممی میں اضافہ کر جاتے ہیں" امی باہر چلی گئیں اور پردے کے ہلنے کے ساتھ میرے ذہن میں بھی ہلچل سی برپا ہو گئی۔

مونا آپی مجھے بہت اچھی لگتی۔ کتنا وہ کتنا دہ آنکھوں والی سر پر ہر وقت دوپٹہ ٹکا رہتا۔ ایک مرتبہ انکل عظیم آئے تو تارا

حسب معمول مونا آپی کو بلانے بھاگ گئی۔ انکل نے پیکٹ میری طرف بڑھایا تو میں خاموش ہو رہی۔

"کیا بات ہے گیبو تم پہ یہ اداسی کیوں ہے ؟"

اداسی نہیں ہے انکل امی کہتی ہیں اب تم میٹرک میں آگئی ہو اس لیے شرارتیں کم کر دو، میں نے بہانا بنایا۔

"ہاں تمھیں پتہ ہے شنی چند ماہ تک میں بہت بڑا افسر بننے والا ہوں اس کے بعد میں۔۔۔۔ شادی کریں گے آپ" میں نے فقرہ مکمل کر دیا

"یہ تم نجومی کب سے ہو گئی" انکل دیوان پر ٹک کر بیٹھ گئے۔

"انکل کریں گے کس سے شادی" میں نے سوال کیا ہی تھا کہ تارا اور مونا آپی کمرے کے دروازے میں آن کھڑی ہوئیں۔

"ہم شادی اس سے کریں گے جس کی آنکھوں میں بلا کی معصومیت ہے جس کے حسن میں حوروں کی سی پاکیزگی ہے چال میں پہاڑوں کے بیچ بہتے والی ندی کا دھیما پن ہے"

"انکل آپ کتنی مشکل باتیں کر رہے ہے" تارا کچھ بھی سمجھ نہ پائی مگر میں نے دیکھ لیا کہ انکل کی نظریں مونا آپی پر جمی ہوئی ہے اور وہ نگاہیں جھکائے زمین کو ہی تکے جا رہی تھیں۔ میں بھی اپنی عمر کے اس دور میں داخل ہو چکی تھی۔ جہاں یہ باتیں جذباتی بن جاتی ہیں۔ انکل نے تارا کی طرف پیکٹ پھینکا تو وہ باہر کی طرف بھاگی اور مونا آپی بھی کچھ سنے بغیر چلی دیں۔

"انکل آپ مونا آپی سے۔۔۔ میرا مطلب ہے وہ آپ کو اچھی لگتی ہیں" میں نے انکل سے اقرار کروانا چاہا۔

"بڑی سیانی ہوتی جا رہی ہے میری بلی ویسے اچھے لوگ ہمیشہ اچھے لگتے ہیں۔ انکل نے گول مول سا جواب دے کر مطمئن کر دیا

انکل اور مونا آپی اب میری موجودگی میں بات کرتے گھبراتے نہیں تھے کیونکہ میں نے بھی ان کے اعتماد کو سہارا دے رکھا تھا۔ انکل کی شریر آنکھوں میں بلا کی وارفتگی اور مونا آپی کے ہونٹوں پر نرم نرم مسکراہٹ دیکھ کر میرے دل سے ان کے لیے دعائیں نکلتیں۔ انکل دفتر سے آتے تو خوب شرارتیں کرتے مونا آپی بھی خلاف معمول چہکنے لگتیں امی جان اپنے چھوٹے بھائی کو دل و جان سے چاہتی تھیں۔ اس لیے انھیں نے بھی مونا آپی اور انکل کے ملنے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ خالہ بی سے مونا آپی کا رشتہ طلب کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

میں میٹرک کے امتحان سے فارغ ہو چکی تھی۔ اب امی کے ساتھ بیٹھی پہروں انکل کی منگنی کے لیے جوڑے پر وگرام بناتی رہتی۔ امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے انھوں نے بہتر یہ جانا کہ جب طبیعت ٹھیک ہو گی تو انکل کی نسبت زبانی ٹھہرا کر بڑی دھوم دھام سے منگنی کا جشن منائیں گے۔ مگر ہماری سب خوشیاں ادھوری رہ گئیں۔

مونا آپی کے ابو پورے دو سال بعد آئے مگر دکھوں کے پیامبر بن کر۔ خالہ بی رو رو کر برا حال کر رہی تھیں کہ مونا کا رشتہ وہ چالیس سالہ بڈھے سے کر رہے تھے۔ مونا آپی کا حسن کلیوں کی مانند مرجھا گیا۔ میرے آنسو رو کے نہ رکتے تھے۔ امی الگ خالو ابا کی منت سماجت کر رہی تھیں۔ مگر انھوں نے نام کا باپ ہونے کا حق جتایا اور مونا آپی کا نکاح زبردستی چالیس سالہ نواب نصیر سے کر دیا۔ مونا آپی کمرے کی ہو کر رہ گئیں میں جو سدا کی باتونی ٹھہری تھی اب بالکل خاموش ہو گئی انکل عظیم کے یاد آتے ہی آنکھوں میں آنسو بہنے لگتے۔ بار بار دل چاہا کہ انھیں اطلاع کر دوں مگر امی نے روک دیا۔ آخر ایک دن چوری چھپے انکل کو خط لکھ ہی دیا آنکھوں سے گرتے آنسو خط کو بھگو رہے تھے اور میں مونا آپی کی بے بسی اور ان کے والد کی بے حسی کی باتیں لکھ رہی تھی۔ میں نے ہر بات تفصیل سے انکل کو لکھ دی۔ ٹھیک ایک ہفتے بعد وہ واپس آگئے۔ مگر ان کا چہرہ یوں مسکرا رہا تھا جیسے وہ ہر بات سے بے گانے ہوں۔ تارا اور مجھ سے پیار کرنے لگے۔ بریف کیس کھولا تو تارا اپنی ٹافیوں کی سوغات دیکھے بنا مونا آپی کو بلانے بھاگی۔ نہ جانے کن مشکلوں سے وہ آنے پائیں ان کی زرد رنگت پریشان آنکھیں، اجڑا اجڑا چہرہ ان کا حال دل کہہ رہا تھا۔ انکل نے فضا میں پیکٹ پھینکا تو تارا اٹھا کر باہر بھاگ گئی۔

"مبارک ہو مونا" انکل عظیم نے مسکراتے ہونٹوں مگر پر نم آنکھوں سے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو عظیم" مونا آپی سسکنے لگیں میرا دل چاہا کہ مونا آپی کے گلے لگ کر اتنا روؤں کہ دل کا سارا بوجھ آنسوؤں کے

راستے اتر جائے۔ مونا آپا روتی رہیں اور انکل خاموش ہو کر صوفے پر بیٹھے رہے۔ میں جان بوجھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ کافی دیر بعد جب گئی تو مونا آپا جا چکی تھیں اور انکل سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہے تھے۔

"تمہارا رزلٹ آؤٹ ہوا نا تو شاندار پارٹی لیں گے تم سے" انکل نے چٹکی بجا کر راکھ جھاڑی تو قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ "میرا دل چاہا ان سے کہوں انکل آپ ہار کیوں نہیں مان لیتے۔ لیکن اسی دوران امی کمرے میں آگئیں۔ انکل کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکیں۔ "میں کچھ نہ کر سکی عظیم" امی ان کے کندھے سے لگ کر رونے لگیں۔ "ہر والدین کا اپنی اولاد پر حق ہوتا ہے آپا"، انکل نے اپنے کندھے سے امی کو جدا کرتے ہوئے آنسو پونچھے۔

انکل چار دن ہمارے پاس رہے لیکن اس دوران بھی وہ شرارتیں کرتے اور ہنساتے رہے مگر مجھے ان کی مسکراہٹ زخمی اور قہقہوں میں غموں کی جھلک سی معلوم ہوتی تھی۔ انکل چلے گئے اور ہم مزید اداس ہو گئے۔

دو ماہ ہو گئے تھے انکل اپنی دفتری مصروفیات کی بنا جلدی واپس نہ آسکے۔ مونا آپی کی حالت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر آہستہ آہستہ امی سے کہہ رہے تھے کہ یہ کسی وقت ختم ہو سکتی ہیں۔ "اف میرے خدا" میں نے دروازے کے پیچھے سے سن لیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ خط لکھوں۔ "انکل اپنی محبت کو اپنے ہاتھوں رخصت کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کف افسوس ملتے رہ جائیں" مگر کچھ سوچ کر قلم ہاتھ سے چھوڑ دیا۔

آپی کا علاج ہوتا رہا مگر وہ غم سینے سے لگائے اپنی ابدی منزل کی طرف بڑھتی رہیں۔ اف وہ دن بھی کتنا منحوس تھا جب آپی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ باپ کی ہٹ دھرمی اور ضد جیت گئی اور مونا آپی نے جان کی قربانی دے کر اپنی محبت کو امر کر دیا۔

میں نے انکل عظیم کو رنگ کیا تو پتہ چلا کہ وہ دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ بے چارے انکل، آپی کو آخری دیدار بھی نہ کر سکے۔ جب وہ لوٹے میں ان کے سینے سے لگ کر بے اختیار رو پڑی۔ انکل سب دکھ لٹا کر خاموش ہو گئے۔ والدین کی موت کے بعد انھیں مونا آپی کا سب سے بڑا غم تھا۔ وہ بالکل ہی بدل گئے۔ امی ان کی اس حالت پر کڑھنے لگیں۔ نتیجتاً وہ بیمار پڑ گئیں۔ ان کی حالت دیکھ کر انکل نے ایک بار پھر اپنے آپ کو بدل ڈالا وہ پھر سے وہی انکل بن گئے جن کی ہمیں جستجو تھی۔

انکل نے "قصر عظیم" تعمیر کروا لیا تو میں نے چھیڑا۔ اب شادی بھی کر ڈالیے مگر انھوں نے ہنستے ہوئے انکار کر دیا۔ امی نے ہزار ہا رشتے دکھائے مگر ان کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتے۔ امی بھی تھک ہار کر خاموش ہو گئیں البتہ میں کبھی کبھی انھیں ضرور تنگ کرتی تھی۔ بی۔ اے کا امتحان دیا تو انکل اپنے پاس لے گئے۔ میں اتنے بڑے بنگلے میں بالکل اکیلی ہوں۔ وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ پارو آگئی مگر وہ بھی صرف دو دن رہنے کے لیے۔ اسے صبح ۶ بجے کی فلائیٹ سے جانا تھا۔ اس لئے انکل کے ہاں آکر ٹھہر گئی۔ انکل دفتر جانے لگے تو ہم نے فرمائش کر ڈالی۔ "انکل آتے ہوئے کریم رول ضرور لائیے گا"۔ "ضرور مگر جو آکر گیٹ سب سے پہلے کھولے گا کریم رول اسے ملیں گے"۔ انکل گاڑی لے کر چلے گئے اور ہم ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی ترکیبیں سوچنے لگیں۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ پارو اپنی پسندیدہ کیسٹ لگائے صوفے میں دھنسی ناول پڑھ رہی تھی اور ارد گرد کے ماحول سے بالکل بیگانہ ہو چکی تھی۔ گاڑی رکنے کی آواز آئی تو میں لپک کر باہر نکلی۔ گیٹ کھولا تو انکل نے کریم رول کا لفافہ سر سے اوپر کر لیا۔ میں نے لپک کر ان کا ہاتھ پکڑنا چاہا ہی تھا کہ رات کے سناٹے میں ایک زوردار آواز سنائی دی۔ "ذلیل کمینی تجھے ہوتا کیا ہے۔ وہ دوسری بھی تو تمہاری بہنیں ہیں نا اچھا کھاتی ہیں، پہنتی ہیں اور میل ملاپ کرتی ہیں اور ایک تو ہے کہ..." "بس بس اماں..... بس مجھے نہیں چاہئے ایسی آسائشیں" ایک دوسری آواز آئی میں اور انکل ایک دوسرے کو حیرانی سے تک رہے تھے۔ میں پریشان ہو کر وہاں ہی کھڑی رہی تو انکل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "شنو وہ میرا دوست فاروق ہے نا وہ بتا رہا

تھا کہ یہ پاس والی کوٹھی آج ہی کرائے پر کسی نے لی ہے "۔ ماموں نے میری حیرانی دور کر دی۔

یار وچلی گئی تو میں بالکل اکیلی رہ گئی تنہائی میں اکثر اس رات میں آنے والی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ میں نے ایک دن یوں ہی اوپر کھڑے ہو کر دیکھا تو اس کوٹھی کے نئے مکیں صحن میں چلتے پھرتے نظر آرہے تھے دو لڑکیاں خاصی ماڈرن تھیں۔ دوپٹے سے بے نیاز، چست لباس پہنے میک اپ سے بھرپور چہرہ لئے وہ کسی اشتہار سے کم نہ تھیں۔ میں ابھی ان کا جائزہ لے رہی تھی کہ کمرے سے ایک اور لڑکی نکلی۔ پروقار چال چلتی ہوئی اور سر پر دوپٹہ اوڑھے وہ بہت بھلی لگی "اتنے فیشن زدہ گھر میں اس لڑکی کا کیا کام ؟" میں نے سوچا اور پھر یکدم اس رات کی گفتگو میری سمجھ میں آ گئی۔

انکل فاروق کے بچے آجاتے تو میرا دل بہل جاتا۔ وہ میرے ساتھ پیروں کیرم اور لڈو کھیلتے رہتے، رات کافی ہو چکی تھی اور وہ کھیلے جاتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ میں اور انکل انھیں چھوڑنے گئے تو واپسی پر "گرین والا" سے پھر اسی قسم کی تلخ باتوں کی آواز سنائی دی۔ دوسرے دن انکل کے دوست فاروق آئے تو انھوں نے مجھے چائے بنانے بھیج دیا چائے کے برتن ٹرے میں سجا کر کمرے میں لا رہی تھی کہ انکل اور فاروق انکل کی سرگوشیوں نے مجھے چونکا دیا "یار وہ لڑکی بہت اچھی ہے خوبصورت بھی بس تم راضی ہو جاؤ" یہ فاروق انکل کہہ رہے تھے "سوچ کر بتاؤں گا" انکل عظیم دھیرے دھیرے سے بولے

مردان والے انکل اور آنٹی بھی چند دن بعد ہی "قصر عظیم" میں آگئے انکل نے مجھے اور آنٹی کو "گرین والا" بھیجا دل تو نہیں چاہتا تھا مگر جانا پڑا "گرین والا" کے لوگوں کی جتنی ظاہری چمک دمک تھی اتنا ہی ان کے اندر نفرت کا اندھیرا تھا۔ وہی معصوم سی لڑکی آئی اور ہمیں کمرے میں بٹھا گئی

باہر اسکی ماں اسے کوسنے دے رہی تھی "یہ کون سے تیرے ہوتے سوتے کی ہیں جن کی خدمت کر رہی ہے۔ جب میں کہتی ہوں کبھا ذرا اندر مہمانوں کو چائے دے آؤ تو ماتھے پر تیوریاں ڈالتی ہو"

امی یہ ہمسائے ہیں اور ان سے اچھا سلوک کرنا ہمارا اخلاقی فرض ہے"۔ وہ آہستہ سے بولی ان کی مزید تکرار ہونے سے پہلے ہی ہم اٹھ کر چلے آئے۔

انکل کو بتایا کہ وہ لڑکی واقعی بہت خوبصورت اور نیک ہے مگر گھر والوں کا رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ میرا بی۔ اے کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا تھا لہذا مجھے واپس گھر آنا پڑا اس بات کو تقریباً چھ ماہ ہو چکے تھے اور انکل نے کوئی بھی ذکر نہ کیا۔ میں نے بھی امی کو کوئی بات نہ بتائی کیونکہ انکل اکثر "سرپرائز" قسم کی شرارتیں کر جایا کرتے تھے میں نے ایم اے میں داخلہ لے لیا مگر انکل شادی کا کوئی فیصلہ نہ کر پائے میں ان سے ملے بغیر ہی انکل فراز کے پاس چھٹیاں گزارنے مردان چلی گئی۔ ابھی ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ انھوں نے فون کر کے واپس بلا لیا۔ سب سے بڑی حیرانی تو اس وقت ہوئی جب میں نے یہ سنا کہ وہ لوگ اپنی لڑکیوں کی عزت نیلام کر کے ٹھاٹھ کی زندگی گزار رہے ہیں ان کے گھر انکل نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے امی سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ انکل عظیم کے دوست کی کوٹھی "گرین والا" کے بالکل ساتھ ہے اسلئے وہ ان کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے۔ زیبی کے گھر والے اس کو زبردستی برائی کی طرف مائل کر رہے تھے مگر وہ اس راہ پر چلنا نہیں چاہتی بالآخر عظیم نے قربانی دے کر زیبی کو بچا لیا اور اس کو دلہن بنا کر گھر لے آئے۔

مونا آپی کی تصویر میری آنکھوں سے اتر چکی تھی مونا آپی کو دلہن بنانے کے سارے خواب تو بکھر گئے اور زیبی انکل عظیم کی بیوی بن کر "قصر عظیم" میں آگئی۔ میں مونا آپی کی تصویر کو سینے سے لگائے پھسک پڑی بڑی نکمی ہو گئی ہو تم منی ابھی تک رونا دھونا صاف نہیں کیا انکل عظیم کی آواز پر میں گھبرا سی گئی۔ وہ میرے قریب آگئے یکبارگی انکی نگاہ میرے آنسوؤں سے تر چہرے سے ہوتی ہوئی ہاتھ میں پکڑی مونا آپی کی تصویر پر پڑی اور ان کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی۔

"آخر آپ نے شادی کر لی انکل" میں انکے سینے سے لگ گئی

"ہاں منی" انھوں نے مجھے بازوؤں سے تھام لیا۔ میں نے انکی طرف غور سے دیکھا انکے لبوں پر آج آٹھ سال پہلے والی زخمی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں اداسیوں کے ڈیرے تھے جب مونا آپی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔

اپنی آنکھ کا شہتیر

حمیرا اطہر

"گڑیا کی امی کچھ سنا تم نے۔ کپڑوں پر کیسی آگ لگ گئی ہے۔ کم بخت سوتی کپڑے اتنے مہنگے ہو گئے ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اب ریشمی کپڑے بنائے جائیں۔ سستے بھی پڑتے ہیں اور عزت بھی بنتی ہے"

عارف بھائی کی چچی نے آتے ہی امی کو مخاطب کیا اور ان کے ساتھ ہر بھی سننے لگے۔ سننے تذکرتے بھی کہا۔ "ایک تو وہ باتیں نہایت دلچسپ کرتی ہیں پھر ماشاء اللہ آواز بھی خاصی اچھی پائی ہے جو کمروں کی دیواروں کو خاطر میں لائے بغیر سارے گھر میں گونج جاتی ہے۔ ہاں تو وہ کہہ رہی تھی

"پہلا کہ فائدہ ہے یوں ریشمی کپڑوں کے سوتی پھر سوتی ہیں۔ اس میں جو آرام ہے وہ بھلا ان نائلون کے اور ریشمی کپڑوں میں کہاں۔ بس نئے نئے نام رکھ کر کپڑے بنائے جاتے رہتے ہیں اور کپڑے ایسے ہوتے ہیں جن میں دم گھٹ کر رہ جائے۔ گرمیوں میں تو پسینہ تک خشک ہوتا نہیں دیکھو نا بمبئی کا تو موسم ہی ایسا ہے کہ یہاں سارا سال گرمیاں رہتی ہیں۔ سردی تو بس قسم کھانے کو چند دنوں کے لئے پڑتی ہے۔ یہاں تو زیادہ تر باریک کپڑے ہی پہنے جاتے ہیں مگر وائل اور لون کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ ایک تو میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ روز بروز ہر چیز اس قدر مہنگی کیوں ہوتی جاتی ہے وہ" انھوں نے انتہائی فکرمندی سے کہا اور قبل اس کے کہ امی یا میں اس کی کچھ وجہ بیان کرتی انھوں نے کچھ سمجھ میں نہ آنے کے باوجود خود ہی جواب دینا شروع کر دیا۔

کہنے لگیں: "بہن تمھارے بہنوئی بتا رہے تھے کہ کپڑوں کی اسمگلنگ ہو رہی ہے۔ سارا ہندوستانی کپڑا چوری چھپے باہر جا رہا ہے کیونکہ وہاں اس کی قیمت اس سے بھی زیادہ ملتی ہے پھر باہر اور نیپالی سرحد سے جو ریشمی کپڑے اسمگل ہو کر بازاروں میں آ رہے ہیں اسکی وجہ سے ملک کا سارا روپیہ باہر جا رہا ہے۔ ظاہر ہے اب ملک میں مہنگائی تو بڑھے گی ہی"

امی نے نہایت سعادت مندی سے گردن ہلا کر ان کی ہاں میں ہاں ملائی امی ہمیشہ یہی کیا کرتی ہیں، کیونکہ انھیں پتہ ہے کہ ان کا بولنا بے سود ہوگا۔ جیسے ہی وہ کوئی بات شروع کریں گی خاتون اسے کاٹ کر پھر اپنا فلسفہ شروع کر دیں گی اور یہی ہوا یعنی قبل اس کے کہ امی کچھ کہتیں انھوں نے خود ہی اس مسئلہ کا حل بھی بتانا شروع کر دیا۔ کہنے لگیں۔

"اگر سب لوگ اسمگلنگ کے مال کا بائیکاٹ کر دیں تو چار دن میں یہ مہنگائی ختم ہو سکتی ہے۔ کیونکہ پھر ملک کا پیسہ ملک ہی میں رہے گا جس طرح گھر میں روپیہ ہوتا ہے تو تنگی نہیں ہوتی مگر جب آخر مہینے میں خرچ کا روپیہ ختم ہو جاتا ہے تو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ہندوستان کا روپیہ بھی ہندوستان ہی میں رہے تو کبھی تنگی نہیں ہوگی اور لوگوں کو مہنگائی سے بھی نجات مل جائے گی۔

بات تو معقول تھی۔ میں نے کہا: "خالہ جان مگر ایسا ہو کس طرح اسمگلروں کو کوئی کس طرح روک سکتا ہے جب کہ ان کا پتہ بھی نہیں چل پاتا؟"

وہ فوراً جذباتی ہو کر بولیں "ہاں بیٹی پتہ نہیں یہ کون ملک دشمن ہیں جو سارا روپیہ باہر بھیجے جاتے ہیں مجھے مل جائیں تو ایک ایک کو گولی سے اڑا دوں۔ کم بخت اپنے ہی ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ اس میں وہ عام لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو اسمگلنگ کا لایا ہوا مال خریدتے ہیں۔ اگر وہ خریدنا بند کر دیں تو پھر یہ "چور" لانا بھی بند کر دیں گے۔ میں تو سمجھتی ہوں اللہ اسمگلروں کو تو سزا دیگا ہی مگر ایسے لوگوں کو بھی ہرگز نہیں بخشے گا جو ان کا سامان خرید کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں: "لوگوں کے ضمیر ہی مر چکے ہیں۔ گناہ کیے جاتے ہیں اور احساس تک نہیں ہوتا۔ قیامت میں سب کی بخشش تو ہو جائیگی پر یہ کس حدیث شریف میں ہے کہ مجرموں اور چور رولا کی بھی بخشش ہوگی۔ یا ان کے سرپرستوں کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔

میں نے دیکھا کہ عارف بھائی کی چچی کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی ہیں اور امی بدستور گردن ہلا ہلا کر ان کی تائید میں مشغول ہیں۔ میں نے انھیں موضوع سے ہٹانے کے لئے کہا "کیا بات ہے خالہ جان آج مہنگائی کا احساس کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ کہیں شاپنگ کرنے چلی گئی تھیں کیا۔؟" اس پر وہ چونک کر بولیں۔

"ارے ہاں! میں تو بالکل بھول ہی گئی تھی۔ دراصل میں تو تمھاری امی کو بلانے آئی تھی۔" پھر امی سے کہنے لگیں۔

"بہن! بہت دنوں سے تم ہماری طرف آئیں بھی نہیں چلو تو تمھیں دکھاؤں رات میرا عارف کیا کیا لایا ہے۔ اللہ اسے ہمیشہ خوش رکھے۔ کہنے کو تو جیٹھ کی اولاد ہے پر میں نے پالا ہے تو اس کا مان بھی بہت رکھتا ہے۔ جب بھی باہر جاتا ہے میرے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لاتا ہے۔ تم تو جانتی ہو ہمارے گھر میں کوئی بھی چیز ہندوستانی نہیں ہے۔ دراصل ہندوستانی چیزیں نہ عارف کو پسند ہیں اور نہ تمھارے بہنوئی کو۔ پھر جب باہر سے لانے والا موجود ہے تو کیا ضرورت ہے ہندوستانی چیزیں خرید کر پیسہ برباد کرنے کی؟ یہ تو وہ خریدیں جن کے پاس پیسہ نہ ہو۔ اللہ سلامت رکھے میرے عارف کو۔ سال چھ مہینے میں ایک چکر دبئی کا لگا لیتا ہے۔ اور ہمیشہ لدا پھندا آتا ہے۔"

عارف بھائی کی چچی اپنے بھتیجے کے قصیدے پڑھ رہی تھیں اور امی کے ساتھ ساتھ میں بھی منھ کھولے ان کی شکل دیکھ رہی تھی کہ ابھی تو وہ اس قدر جذباتی ہو رہی تھیں اور وطن کی محبت سے سرشار ہو کر اسمگلروں کو گولی مار دینے کو تیار تھیں اور اب کس شان سے قصیدہ خوانی کر رہی ہیں۔

لیکن وہ تو ہمارے تاثرات سے بے نیاز اپنی رام کہانی سنائے جا رہی تھیں۔

"پتہ ہے اس مرتبہ عارف ٹیلیویژن اور فریج لایا ہے۔ مجھے تو ٹی۔ وی کا اتنا شوق تھا کہ بس کیا بتاؤں مگر یہ چچا بھتیجے ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ موقع ملنے دو، چھا سا آجائے گا اور اب آ ہی گیا نا۔ اور پتہ ہے چھ ساریاں بھی لایا ہے میرے لئے۔ ساریاں بھی بے حد نفیس ہیں۔ ہائے اللہ کیا بتاؤں کتنی باریک ہیں۔

"ہاں وہ بھی کہہ رہا تھا کہ چچی جان یہ ساریاں تو میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر لایا ہوں" انھوں نے فخریہ جواب دیا۔

"تو خالہ۔ یہ بھی تو اسمگلنگ ہوئی نا" میں نے امی کی گھورتی ہوئی آنکھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں۔ بے شک اسمگلنگ ہے۔ پر اس سے کیا ہوتا ہے۔ اگر پورے ملک کے لوگ توبہ کریں تب بھی مجھے بھی کہو۔ میں بھلا اکیلی یہ برت رکھ کر کیا کروں گی" انھوں نے تڑپ کر جواب دیا۔

"ہر ایک اپنی جگہ یہی سوچتا ہے مگر پہل کوئی نہیں کرتا جب ہی یہ دھندہ ختم نہیں ہوتا" میں نے انھیں قائل کرنا چاہا۔

"سب کے گھر تو باہر کی اچھی چیزوں سے سجیں اور وہ باہر کے نفیس کپڑے پہنیں۔ بس میں اکیلی ہی بائیکاٹ کروں۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی۔ نہ بی بی نہ میں نے یہ بال دھوپ میں نہیں پکائے۔ تم کسی اور کو یہ سبق پڑھانا" انھوں نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

"مگر خالہ آپ ہی تو کہہ رہی ہیں کہ "اس طرح کا مال استعمال کرنا بھی گناہ ہے"" میں نے انھیں ان کی بات یاد دلانی چاہی تو وہ جھٹ بولیں۔

"گناہ ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ جہاں سب سزا بھگتیں گے میں بھی بھگت لوں گی" پھر امی کی طرف متوجہ ہو کر بولیں۔

"چلو نا گڑیا کی ماں۔ تم دیکھو نہ سہی میری چیزیں"

انھوں نے بعد اصرار امی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور امی بے چاری ایک مقناطیسی اثر کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے چل دیں

میں یہ سوچتی ہی رہ گئی کہ کس طرح انھیں یہ بات سمجھا دی جائے کہ خالہ جان جب آپ کا نظریہ یہی ہے تو کم از کم اسمگلنگ اور اسمگلروں کے خلاف اتنی جذباتی تقریریں کرنا ہی چھوڑ دیں" مگر یہ بات انھیں کون سمجھائے کہ وہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا مگر دوسرے کی آنکھ میں تنکا فوراً تلاش کر لیتے ہیں۔

بہاریں یوں بھی آتی ہیں

غزالہ افضل بوسعدی (بی۔اے)

شاذی کاشف کی رشتہ میں بہن ہوتی تھی۔ کبھی وہ اپنی ملنساری کے تحت شاذی کے گھر بھی چلا جاتا تھا، اس لئے کہ اسے ملنے ملانے کا شوق تھا، جتنے بھی دور و نزدیک کے اعزہ تھے۔ کاشف سب ہی کے یہاں جایا کرتا تھا اور اسی لئے وہ سارے خاندان میں اچھی نظروں سے دیکھا جاتا تھا، چھوٹے بڑے سب ہی اس سے محبت کرتے تھے۔ اپنے کردار کی پختگی کے باعث اس نے خاندان کی کسی بھی لڑکی کو اس نظر سے نہ دیکھا تھا کہ اسے بیوی بنا سکے۔ نہ جانے کتنی خالہ زاد، ماموں زاد اور چچازاد بہنیں تھیں، جن سے اس کی شادی ہو سکتی تھی، لیکن اس نے ایسا کبھی نہ سوچا تھا، حالانکہ اس کی عمر ۲۲ سال سے تجاوز کر گئی تھی اور یہ وہ عمر ہوتی ہے جس میں پہونچ کر لڑکے اکثر رومانس شروع کر دیتے ہیں۔

ایک دن کاشف شاذی کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ اندر کچھ خواتین آئی ہوئی ہیں۔ وہ باہر ہی بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد عورتیں رخصت ہو گئیں تو وہ اندر گیا۔ اس کی چچی نے کہا بیٹا تمہاری بہن کو دیکھنے کچھ عورتیں آئی تھیں۔ ماشاءاللہ اب سیانی ہو گئی ہے۔ چاہتی ہوں اس کے ہاتھ پیلے کر دوں۔ خدا کرے یہ رشتہ طے ہو جائے۔ سنا ہے لڑکا اچھا اور تعلیم یافتہ ہے۔ حالانکہ ابھی کچھ کرتا نہیں، لیکن کھاتے پیتے گھر کا ہے۔ کبھی نہ کبھی کچھ کرنے ہی لگے گا۔ یہ سب تو لڑکی کی تقدیر سے ہوا کرتا ہے۔

شاذی شرم کے مارے اس روز کاشف کے سامنے نہیں آئی کاشف نے چند منٹ بعد چچی سے پوچھ ہی لیا۔ شاذی کہاں ہے چچی، چچی نے کہا اندر ہے بیٹا۔ شرما رہی ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ لڑکیاں شادی کی بات پر آج بھی شرما جاتی ہیں۔ دعا کرو بیٹا کہ رشتہ طے ہو جائے۔ اس سے پہلے بھی دو مرتبہ اسے دیکھنے عورتیں آئی تھیں۔ مگر آج کل تو حسن کی تلاش ہوتی ہے۔ خود لڑکوں کی مائیں اور بہنیں جو دیکھنے آئی تھیں، میری شاذی سے بھی زیادہ سانولی اور کالی تھیں۔ لیکن بہو چاند جیسی تلاش کرتی ہیں؛

ایک آہ سرد بھر کر چچی کہتی رہیں۔ شکل و صورت تو اللہ بناتا ہے۔ ماں باپ کسی کو حسین و جمیل کیسے بنا سکتے ہیں۔ ہاں گن ڈھنگ ماں باپ سکھاتے ہیں۔ مگر کون دیکھتا ہے یہ ہنر۔ اب تو رنگ روپ ہو چاہے لڑکی کچھ بھی نہ جانتی ہو۔

کاشف نے پوچھا۔ جو عورتیں آئی تھیں۔ انھوں نے پسند کیا میری میری بہن کو یا نہیں۔

چچی نے کہا منھ پر کوئی کچھ نہیں کہتا۔ کھا پی کر چلی گئیں۔ کہا مردوں سے بات کر کے بتائیں گے۔ دیکھو اللہ کو منظور ہو گا تو پسند کر لیں گی ورنہ نہیں۔

کاشف دیر تک بیٹھا اس بحث پر چچی کی یاس بھری باتیں سنتا رہا اسے بھی افسوس تھا کہ شاذی کی نسبت طے نہ ہو سکی تھی، حالانکہ اس کی عمر اب ۲۲ سے زائد ہو چکی تھی۔

ایک روز ماں نے کہا بیٹا کاشف گڑیا کی نسبت طے ہو گئی جلد ہی تمہارے ابا اسے بیاہ دیں گے اور پھر یہ گھر سنسان نظر آنے لگے گا۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی بھی ساتھ ہی کر دیں گڑیا جائے تو چاند سی بہو گھر میں آجائے۔

کاشف نے ہنس کر کہا۔ امی! اگر چاند سی بہو نہ ملی تو؟ ماں نے کہا۔ پگلے خاندان میں ایک سے ایک حسین لڑکیاں ہیں اور سب ہی کے ماں باپ کی نظریں تیری ہی طرف ہیں۔ نعیمہ کو تو جانتا ہی ہے۔ کتنی نازک حسین لڑکی ہے۔ سلمیٰ کبھی چندے آفتاب و چندے ماہتاب ہے۔ ہنستی ہے تو پھول جھڑتے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کا شہابی رنگ محفلوں میں عورتیں دیکھتی ہی رہ جاتی ہیں۔ اپنی شاہدہ بھی کچھ کم نہیں۔ اس کا تبسم سب سے زیادہ حسین و دلکش ہے۔ جس گھر جائے گی، وہاں روشنی ہو جائے گی، ان میں سے جو تجھے پسند ہو بتا دے

تاکہ میں پیغام بھیج دوں۔

کاشف نے کہا" امی ابھی اتنی جلدی شادی وادی کی مجھے پسند نہیں۔ دیکھا جائے گا۔ لڑکیاں کہیں چلی تو نہ جائیں گی۔

ارے چل لڑکے! کیا سمجھا ہے تو ایسی لڑکیوں پر تو سب ہی کی نظریں رہتی ہیں۔ اب تک تو ان کے رشتے طے بھی ہو چکے ہوتے۔ مگر سب کی نظر تجھ پر ہے۔

کاشف نے کہا "تب تو ڈر ہے کہ مجھے نظر لگ جائے گی۔

ماں نے ہنس کر کہا چل ہٹ۔ نظر لگے تیرے دشمنوں کو۔ مذاق چھوڑ اور بتا تجھے کون پسند ہے۔

کاشف نے کہا" ماں! اتنی جلدی شادی تم میرے لئے نہیں اپنے لئے کرنا چاہتی ہو۔ ہے نا یہی بات"؟

"ہاں، یہی بات ہے" ماں نے کہا" کیا تو چاہتا ہے کہ گڑیا کے جانے کے بعد میں گھر اکیلی بنکر رہوں۔

کاشف نے کہا" امی جان! جتنے بھی نام آپ نے لئے ہیں وہ گھر میں بس ایک حسین و جمیل اسٹیچو بنکر ہی آئیں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ شادی کروں تو ایسی لڑکی سے جو آپ کے دل سے گڑیا کی یاد بھلا دے اور آپ کی ایسی خدمت کرے کہ آپ کو بہو بھی بیٹی معلوم ہو۔

ماں نے کہا" بیٹا تو اس کی فکر نہ کر۔

کیوں نہ کروں ماں۔ شادی ان لڑکیوں سے میں نہیں کر سکتا ——

تو پھر کیا تو نے کوئی پسند کر رکھی ہے۔

نہیں ماں، میں نے پسند نہیں کر رکھی ہے۔ لیکن میرے خیالات آپ سے مختلف ہیں۔ کیوں نہ میں کسی ایسی لڑکی سے شادی کر لوں جس کو کوئی پسند نہ کرتا ہو۔

"یعنی ؟" ماں نے حیرت سے کہا۔

جیسے امین چچا کی لڑکی شاذی۔

تجھ دیوانہ تو نہیں ہو گیا ہے لڑکے۔ کہاں تو، کالی کلوٹی۔ بھلا اس کا تیرا کیا جوڑ۔ اور پھر وہ تجھ سے بڑی بھی ہو گی۔

کاشف نے کہا" امی کیا اسے خدا نے نہیں بنایا ہے۔ اور کیا اگر آپ کی گڑیا خدانخواستہ حسین نہ ہوتی تو آپ کیا کرتیں۔ آپ کے احساسات کیا ہوتے۔ شاذی کی شادی نہیں ہو رہی ہے۔ اسے کوئی پسند نہیں کر رہا ہے، اس لئے کہ وہ حسین نہیں ہے، گوری نہیں ہے۔ لیکن اس کے والدین کے دل سے پوچھئے جنھوں نے اسے پڑھایا لکھایا اور گھر گرہستی کے سارے گن ڈھنگ سکھائے۔ امی جان! سوچئے کہ وہ آپ کی بیٹی ہوتی تو آپ کا کیا حال ہوتا۔ رہا عمر کا سوال تو آپ ہر وقت سنت رسول اللہ کا ذکر فرمایا کرتی ہیں سنت رسول کی پیروی کرنے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ کیا یہ سنت رسول نہیں ہے —— کیا آپ کو علم نہیں سرکار دو عالم کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ سے عمر میں کتنی بڑی تھیں —— امی جان میں شاذی سے محبت نہیں کرتا۔ آپ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ مجھے اس سے صرف ہمدردی ہے اور میں دوسروں کے سامنے یہ مثال قائم کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے حسین و جمیل لڑکیوں پر شادی کو ترجیح دی۔ صرف اس لئے کہ آخر ایسی لڑکیاں کیا کریں جو ظاہری حسن سے محروم ہیں۔ امی جان میں سمجھتا ہوں کہ یہ کار ثواب بھی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان لڑکیوں کے مقابلہ میں جو آپ کی نظر میں میرے لائق ہیں شاذی آپکی زیادہ خدمت کر سکے گی۔

ماں بڑی حیرت سے بیٹے کی باتیں سن رہی تھیں۔ ان کا چہرہ فخر سے دمک اٹھا کہ انھوں نے ایک ایسے فرزند کو جنم دیا ہے جو سچا مسلمان ہے۔ انھوں نے فرط محبت سے بیٹے کو پکڑ کر اپنے سینہ سے لگا کر کہا، تم قابل رشک مثال پیش کر رہے ہو۔ میں کل ہی پیغام بھیجدوں گی تاکہ گڑیا کے ساتھ ہی تیری شادی بھی ہو جائے۔

شاذی کی ماں نے کاشف کی ماں کو لوازمات کے ساتھ آتے دیکھا تو حیران رہ گئیں۔ شاذی بھی بڑی سادگی سے ماں کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کاشف کی ماں اسے مانگنے آئی ہیں۔

رسمی گفتگو کے بعد کاشف کی ماں نے کہا۔ بہن آج میں تم سے کچھ مانگنے آئی ہوں انکار نہ کرنا۔ شاذی کا دل اچھلنے لگا۔ گھبرا کر وہ اندر کی طرف بھاگ گئی شاذی کی ماں نے کاشف کی ماں سے فرمائش سنی تو انھیں یقین نہ آیا۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے اور وہ بیساختہ کاشف کی ماں سے لپٹ گئیں۔

حریمی دسترخوان

آئس کریم بنائیے

اب وہ موسم آ گیا ہے کہ آئس کریم کھانے کی خواہش ہر دل میں پیدا ہوتی ہے اور اسے دبایا نہیں جا سکتا۔ خصوصیت سے ہمارے بچے تو کسی طرح مانتے ہی نہیں "ادھر آئس کریم والے کی آواز آئی ادھر وہ بے چین ہو اٹھے" اور انھیں سمجھانا آسان نہیں رہتا۔ آئس کریم بنانا دشوار نہیں، بشرطیکہ آپ کے گھر میں ریفریجریٹر ہو۔ ہمارے یہاں بہت سی بہنیں فرج ہونے کے باوجود آئس کریم بنانے کی ترکیب نہیں جانتیں۔ تو آئیے ہم آپ کو بتائیں کہ کس طرح آپ اسے تیار کر سکتی ہیں۔

سامان:- دودھ - ایک کلو۔ کسٹرڈ پاؤڈر (سادہ) تقریباً ۵۰ گرام شکر۔ ۱۰۰ گرام یا کچھ زیادہ۔ جیسی شیرینی آپ پسند فرمائیں۔ ونیلا آسنس کے ۸ - ۱۰ قطرے۔ کریم ۵۰ گرام۔

ترکیب:- تھوڑے دودھ میں کسٹرڈ پاؤڈر کو اچھی طرح حل کر لیں اس کے بعد بقیہ دودھ اور شکر ملا کر چولھے پر چڑھا دیں اور کافی گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں تاکہ ٹھنڈا ہو جائے۔ اس کے بعد کریم کو کسی گہرے برتن میں رکھ کر پھینٹیں۔ پھینٹی بنانے کے لئے پھینٹنے والے آلات معمولی قیمت پر بازار میں ملتے ہیں۔

کریم کو پھینٹنے کے بعد دودھ میں ملا دیں اور اب سب کو خوب پھینٹیں اس کے بعد کسی المونیم یا ہلکی دھات کے ہلکے برتن میں انڈیل کر فرج کے چیسٹ (برف جمانے والا خانہ) میں رکھیں۔ برتن پر ایسا کوئی ڈھکن رکھ دیں کہ پانی اگر ٹپکے تو اندر نہ جانے پائے کال ایک گھنٹے کے لئے فرج کو بند رکھئے۔ اس عرصہ میں آئس کریم تیار ہو جائے گی۔

اگر ونیلا خوشبو آمیز کسٹرڈ پوڈر ہو تو ونیلا آسنس کم ڈالیں۔ ورنہ زائد۔ ونیلا آسنس اچھے بھی آتے ہیں اور معمولی بھی۔ کوشش کر کے اچھی کوالٹی کا لیجئے۔

موسمی پھل بھی ملا کر آئس کریم تیار کی جا سکتی ہے۔ کیلے کے باریک باریک ٹکڑے ملائے جا سکتے ہیں۔ بغیر ریشہ آم کے ٹکڑوں یا رس کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں پھینٹنے سے قبل ہی ملائی جائیں۔ ضروری ہے۔

فروٹ کریم

کھانے کے بعد ہلکے قسم کی سویٹ ڈش (میٹھی چیز کی پلیٹ) گرمیوں کے موسم میں بڑے شوق سے کھائی جاتی ہے اور اس کے تیار کرنے میں کبھی کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

موسمی پھل مثلاً انگور۔ سنترہ۔ آم۔ سیب۔ کیلا۔ اناناس وغیرہ میں سے جو بھی مل سکیں، انھیں کریم میں ملائیں اور شکر آمیز کر کے فرج کے آئس بکس میں رکھ دیں اور کافی ٹھنڈا ہو جانے کے بعد نوش فرمائیں۔ اگر کریم ملنے میں دشواری ہو تو دودھ میں کسٹرڈ پاؤڈر ڈال کر پکائیں۔ گاڑھا ہو جائے تو اس میں فروٹ ملائیں۔ لیکن کریم سے لذت بہت بڑھ جاتی ہے لیکن کریم ہر جگہ آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتی اس لئے اس کا بدل کسٹرڈ پوڈر اور دودھ ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کے گھر میں فرج نہیں ہے تو کسی بالٹی میں برف توڑ کر رکھیں اور اس میں مرکب کا برتن اس طرح رکھ دیں کہ ڈوبنے نہ پائے۔ مرکب کا برتن اگر کسی برتن سے بند رہے تو آسانی سے ٹھنڈا ہو جائے گا۔

مرسلہ:- مسز خالدہ مقصود

خاتونِ جنت

حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا

خاتونِ جنت حضرت فاطمہ زہرا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ جو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بطن سے پیدا ہوئیں، آپ کی پیدائش ۲۰ رجمادی الثانی بروز جمعہ مکہ معظمہ میں ہوئی ابھی صرف پانچ سال کی عمر کی تھیں کہ والدہ ماجدہ کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئیں۔ اس لئے والد محترم رسول اکرم کی محبت و شفقت کا محور و مرکز بن گئیں، رسول اللہ نے اپنی اس صاحبزادی کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ فرمائی اور اپنے بے مثال پیار و محبت کے سایے میں پروان چڑھایا۔

رسول اللہ ہجرت کر کے مکے سے مدینے آ گئے اور صاحبزادیاں مکے ہی میں تھیں آپ ان کی جدائی سے بیقرار رہتے۔ چنانچہ آپ نے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ اور ابو رافع کو مکہ اور ان کے ساتھ اپنی صاحبزادیوں ام کلثوم اور حضرت فاطمہ کو مدینہ بلوا کر اپنے آغوشِ شفقت میں لے لیا۔

حضرت حضرت فاطمہ سن بلوغ کو پہنچیں تو حضرت علی مرتضیٰ جنہوں نے بھی رسول اللہ کے زیر سایہ تربیت پائی تھی۔ حضرت فاطمہؓ کی خواستگاری کی درخواست لے کر آئے۔ آپ نے جواب میں صرف اللہ مرحبا کہا اور خاموش ہو گئے۔ اس سے قبل آپ بہت سے رشتوں کو رد فرما چکے تھے۔ حضرت علیؓ کی درخواست کے بعد جیسے صورت حال واضح ہو گئی۔ تاہم آپ نے حضرت عمرؓ سے مشورہ کیا اور حضرت عمرؓ نے بھی اس رشتے کو پسند کیا لیکن آپ نے صرف اپنی پسند پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ کو بھی اس رشتے کے بارے میں بتایا اور ان کی پسند معلوم کی حضرت فاطمہ رضامندی میں خاموش رہیں۔

پھر دنوں کے بعد آپ نے حضرت علیؓ کو بلایا اور پوچھا تمہارے پاس بھی کچھ دینے کو کچھ ہے؟ حضرت علیؓ نے جواب میں کہا، یا رسول اللہ میرے پاس ایک گھوڑا ہے اور ایک زرہ جو مجھے جنگ بدر میں غنیمت کے طور پر ملے تھے اور تو کچھ بھی نہیں ہے آپ نے فرمایا زرہ فروخت کر دو اور جو قیمت حاصل ہو اس سے بیوی کا سامان تیار کر لو، حضرت علیؓ نے یہ زرہ حضرت عثمان کے ہاتھ ۴۸۰ درہم میں فروخت کر دی اور یہ رقم چادر کے کونے میں باندھ کر رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ یہ میری زرہ کی قیمت ہے۔

رسول اللہ نے اپنے مؤذن خاص حضرت بلال سے کہا کہ باہر جا کر خوشبوئیں خرید لاؤ، بقیہ رقم حضرت علی کو واپس کرتے ہوئے کہا کہ اس سے شادی کا انتظام کر لو۔ جب مختصر سا انتظام ہو گیا تو آپ نے صحابہ کرام کو جمع کیا۔ اور ان کی موجودگی میں خطبہ نکاح پڑھا اور اپنے جگر کے ٹکڑے فاطمہ کو اپنے محبوب چچا زاد بھائی علی کی زوجیت میں دے دیا۔

آپ نے اپنی پیاری بیٹی کو رخصت کرتے وقت جو سامان دیا اس میں ایک جوڑا کپڑا، ایک مقنع، ایک سیاہ کمبل، کھجور کے پتوں کا ایک بستر، دو موٹے ٹاٹ، چمڑے کے تکیے، آٹا پیسنے کی ایک چکی، کپڑے دھونے کا ایک برتن، ایک مشک، کھانا پکانے کا برتن، مٹی کے دو آبخورے ایک مٹی کی صراحی، ایک سفید چادر اور ایک لوٹا، یہ شادی جنگ بدر کے بعد ۲ھ میں ہوئی۔

آنحضرت نے اپنی صاحبزادی کی جس انداز میں تربیت فرمائی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا بھر کی عورتوں کے لئے ان کو ایک مثال بنا کر پیش فرمانا چاہتے تھے، درحقیقت یہ ہے کہ ان کی پوری زندگی بچپن سے لے کر وفات تک مسلمان عورت کے لئے ایک روشن مثال رہی اپنے والد محترم کی زندگی کا ان پر بچپن سے گہرا اثر تھا، چنانچہ روایت ہے کہ ایک بار ان کی والدہ ماجدہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کسی کی شادی کی تقریب میں جانے کو تیار ہوئیں تو بچی فاطمہ کے پاس ڈھنگ کے کپڑے

نہ تھے جس کی وجہ سے وہ انھیں ساتھ لے جانے میں پس و پیش کر رہی تھیں، لیکن چار یا پانچ سال کی بچی فاطمہ نے کہا کہ اس میں تردد کی کیا بات ہے، میرے پاس جو کپڑا ہے وہ کافی ہے۔ نئے یا اچھے کپڑے کی کیا ضرورت ہے۔

اپنی والدہ کی وفات کے بعد کم سن فاطمہ نے اپنے والد محترم کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی آپ کی ضروریات کا خیال رکھا۔ ایک بیٹی کی حیثیت سے حضرت فاطمہ کا کردار تمام بیٹیوں کے لئے ایسی مثال ہے کہ جس پر عمل کرکے مسلمان بیٹیاں اپنے گھر اور خاندان کو جنت بنا سکتی ہیں۔

اسی طرح جب وہ اپنے گھر میں تشریف لے گئیں تو اسے بھی سکون و راحت کا گہوارہ بنا دیا اور شوہر کی خدمت و اطاعت گذاری اور صبر و تحمل کا ایسا نمونہ پیش کیا جو ہر مسلمان گھر کے لئے ایک مثال اور رسول کی تربیت کا شاہکار ہے۔ یہی کردار بچوں کی تربیت اور ان کے لئے ایثار میں نمایاں رہا۔

جب حضرت فاطمہؓ کے پاس کنیز نہ تھی تو آپ گھر کا سارا کام خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیتیں۔ گھر کی صفائی کپڑے دھونا، کھانا پکانا بچوں کی دیکھ بھال اور شوہر کی خدمت سب کچھ کرتیں اور کبھی زبان پر حرف شکوہ نہ آیا۔ جب کنیز ملی تو اس کے کام میں ہاتھ بٹاتیں۔ آپ کے صاحبزادے حضرت حسنؓ کا بیان ہے کہ میری ماں نے میرے باپ سے پہلے کبھی کھانا نہیں کھایا۔ حضرت سیدہ فاطمہؓ نے غزوات میں بھی شرکت کی اور مجاہدین اسلام کی زخموں کی مرہم پٹی کی۔ مجاہدین کو پانی پلایا۔

فقر و فاقہ میں بھی صبر و شکر کا دامن نہ چھوڑا۔ روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے ساتھ حضرت ابو ایوب انصاری کے مکان پر تشریف لے گئے۔ انھوں نے آپؐ کی دعوت کی اور ایک بکری ذبح کرکے سالن تیار کیا باعث تخلیق کائنات اور سرور دوجہاں نے روٹی کا ایک ٹکڑا اور تھوڑا سا سالن لیا اور حضرت ابو ایوب انصاری سے فرمایا کہ یہ فاطمہ کو دے آؤ اس کو کئی روز سے کچھ نہیں ملا ہے۔

دریا دلی اور مخلوق خدا کی خدمت اور مدد کا ایسا جذبہ تھا کہ بارہا ایسا ہوا کہ کوئی سائل آ گیا تو اپنے گھر والوں کے لئے جو کچھ کھانا موجود ہوتا وہ اس سائل کو دے دیتیں اور خود فاقہ کر لیتیں۔

عبادت و ریاضت کا یہ حال تھا کہ اکثر رات رات بھر عبادت میں گذار دیتیں۔ حضرت امام حسینؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک بار میری والدہ محترمہ رات بھر عبادت میں مشغول رہیں یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ وہ مسلسل مومنین و مومنات کے لئے دعا فرماتی رہیں۔ اپنے لئے کوئی دعا نہ کی۔ میں نے پوچھا کہ آپ سب کے لئے دعا کر رہی ہیں لیکن اپنے لئے کچھ نہ مانگتیں تو انھوں نے فرمایا کہ پہلے ہمسائے کا حق ہے۔ اس کے بعد اپنا اس لئے پہلے اہل ایمان کے لئے دعا کرنا چاہئے۔

رسول اللہ کو اپنی صاحبزادی سے بے پناہ محبت تھی، سینکڑوں صحابہ کرام سے متفقہ روایت ہے کہ رسول اللہ نے ام المومنین حضرت ام سلمہ کے گھر میں فاطمہؓ، حسنؓ، حسینؓ اور علیؓ کو اپنی چادر مبارک میں سمیٹا اور دعا کی اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں تو ان سے ہر قسم کی آلودگی کو دور رکھنا اور ایسا پاکیزہ رکھنا جیسا پاکیزگی کا حق ہے۔ آنحضرتؐ جب غزوات میں تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ کو الوداع کہنے جاتے اور واپسی میں سب سے پہلے ان کے پاس جاتے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ فاطمہ عورتوں میں اور ان کے شوہر مردوں میں آنحضرتؐ کو سب سے زیادہ عزیز تھے۔ حضرت عائشہؓ ہی سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرتؐ کے بعد فاطمہ سے زیادہ کسی کو سچ بولنے والا نہیں دیکھا۔ حضرت عائشہ ہی سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ کے مرض الموت کے دوران حضرت فاطمہؓ ان کو دیکھ کر بیقرار ہو کر رونے لگیں تو آپ نے اپنے قریب بلایا اور کان میں کچھ کہا جس سے حضرت فاطمہ پہلے تو زیادہ رونے لگیں پھر ہنسنے لگیں، میں نے دریافت کیا تو بتایا کہ بابا جان بہت جلد اس جہاں فانی سے رخصت ہونے والے ہیں، یہ سن کر میں رونے لگی، پھر جب یہ کہا کہ جنت میں سب سے پہلے مجھ سے ملو گی تو میں ہنسنے لگی۔

اپنے والد محترم کی وفات کے بعد حضرت فاطمہؓ بے حد غمزدہ رہنے لگیں لوگوں کا بیان ہے کہ اس کے بعد کسی نے ان کے لبوں پر مسکراہٹ نہیں دیکھی اور نہ کبھی ان کے آنسو تھمے۔ صرف چھ ماہ بعد ہی بیٹی باپ سے جا ملی۔

رفیق زندگی حضرت علیؓ نے خاتون جنت کی وفات کے بعد فرمایا وہ جنت کا ایک خوشبودار پھول تھیں جس کے مرجھانے پر اس کی خوشبو سے میرا دماغ بسا ہوا اور میری روح اب تک معطر ہے۔

حضرت علیؓ نے اپنی رفیق حیات کے بارے میں مزید فرمایا۔

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی رسلہ صرف ایک خبر ہر ماہ شائع ہو سکتی ہے بشرطیکہ خبر ولادت، شادی یا انتقال کے متعلق ہو۔ کم سے کم الفاظ میں صاف صاف لکھی گئی ہو اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ، نمبر خریداری کے ساتھ روانہ کی گئی ہو۔ ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہونے والی خبریں ایک ماہ تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔ خبر کی اشاعت میں کوئی غلطی ہو جائے تو دفتر حریم ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ البتہ اطلاع ملنے پر اس کی صحت کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔ (ادارہ)

ولادت اطفال

• امینہ دلشاد (سکندر آباد) میری پیاری بیٹی سکینہ بیگم سلمہا بیگم قاری محمد اقبال سیٹھ کے گلشن حیات کو گلزار بناتے ہوئے ۸ فروری ۷۹ء بروز جمعرات اللہ پاک نے ایک ساتھ دو پھول کھلائے۔ نام جواد حسن، عماد حسن قرار پائے۔ اللہ سے دعا ہے کہ دونوں کو فخر خاندان بنائے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھیں۔

• روبینہ پروین (دربھنگہ)۔ میری آپا شہناز پروین اور دولہا بھائی طارق مجتبیٰ کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے ۳ مارچ ۷۹ء بروز سنیچر بوقت ۸ بجے صبح ایک ساتھ دو پھول کھلائے۔ نام اوصاف رزمی، اور الطاف رزمی قرار پائے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں عمر خضری دے اور اقبال مند بنائے۔

• سلطانہ شبانہ (پرنام بٹ)۔ میری عزیز سہیلی آمنہ عشرت کے گلشن حیات کو باغ و بہار بنانے کے لئے دوسری بار ۱۲ فروری ۷۹ء بروز پیر بوقت ۷ بجے صبح ایک کلی مسکرائی۔ نام فریدہ عرف نوشین عشرت رکھا گیا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ پیاری منی والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور نصیبے ور ہو۔

• آر شمشاد شاہین وعشرت آرا (آمبور) میری پیاری بہن الزہری بیگم و بہنوئی عبدالصمد کے گلشن حیات کو پر بہار بناتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ۵ مارچ ۷۹ء بروز جمعرات بوقت شام ایک پیاری ننھی کلی کھلائی۔ دعا ہے کہ نومولود عمر خضر پائے اور اسے دونوں جہان کی شادمانیاں حاصل ہوں۔

• بی فریدہ انجم (پرنام بٹ)۔ میری خالہ زادہ بیگم صاحبہ دخالو عبدالصمد صاحب کے گلشن حیات میں ۱۹ مارچ ۷۹ء بروز پیر بوقت ۱۲ بجے دن ایک پھول کھلا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ عمر طویل پائے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• حور لقا (گورکھپور)۔ میرے عزیز بھائی غیاث الدین اور میری پیاری بھابی عزالہ تبسم (کلکتہ) کے گلشن حیات میں بہار لاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ۱۱ مارچ ۷۹ء بروز اتوار بوقت ۲ بجے شب ایک ننھی سی کلی کھلائی نام امینہ عظیم قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ بچی عمر طویل پائے اور اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• بی عظمت ترنم (آمبور) میری پیاری بھابی نازنین انجم و بھیا عبدالکریم کے گلشن حیات میں بہار لاتے ہوئے اللہ پاک نے ۲ مارچ ۷۹ء کی شام پہلی بار ایک پھول کھلایا۔ نام کلیم اللہ قرار پایا۔ پروردگار میرے بھتیجے کو عمر دراز بخشے اور فخر خاندان بنائے۔

• طلعت افروز فریدہ رحمٰن نیازی (آنولہ) میری پیاری بہن زینت انجم اور بہنوئی محمد احمد انجم صاحب کے گلشن حیات میں ۲۹ مارچ ۷۹ء بوقت آٹھ بجے شب ایک پھول کے بعد ایک ننھی کلی کھلائی۔ دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور صاحب نصیب ہو۔

• مہناز فریدی (مراد آباد)۔ میری پیاری باجی صبا انجم و بہنوئی نجم الحسن کے گلشن حیات میں ایک پھول کھلانے کے بعد ۱۲ مارچ ۷۹ء بروز پیر ایک کلی کھلائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ بچی اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے اور ہمیشہ خوشیوں کے گہوارے میں جھولے۔

• شمشاد بیگم و عشرت آرا (آمبور) ہماری پیاری بہن زبیدہ یاسمین بی، ایس، سی، بی ایڈ اور بہنوئی مظہر اللہ سعید، ڈسٹرکٹ ڈاکٹر ویلوری کے گلشن حیات میں ایک پھول کھلا بارگاہ الٰہی میں دعا گو ہوں کہ یہ پھول خزاؤں سے محفوظ رہ کر بہار

بنا رہے اور خوشحال رہے ۔

• بھائی محمد عطاء الرحمن صاحب (پٹنہ) نے یہ خوش خبری دی ہے کہ ان کے فرزند عزیزی خورشید سلمہٗ اور ان کی دلہن سلمہا کے چمن حیات میں پہلی بار ۲ اپریل ۸۰ء بروز دوشنبہ بوقت سوا دس بجے کرجی اسپتال میں ایک پھول کھلایا ۔ میری دعا ہے کہ عطاء الرحمن صاحب کو پوتا مبارک ہو ۔ اللہ پاک اسے اقبالمند بنائے اور حیات جاوید بخشے (نسیم انہونوی) ۔

• فخا ہمن ناز (بنگلور) میری پھوپھی زاد بہن شمیم جمیل اور بہنوئی جمیل احمد اے ، ای ، او ان کی زندگی میں ایک پھول اور کلی کے بعد تیسری بار ایک اور کلی ۔ ۷ مارچ ۸۰ء کو کھلی نام فائزہ جمیل قرار پایا ۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہماری بہن کا گلشن ان پھولوں اور کلیوں سے ہمیشہ مہکتا رہے ۔

پیغامات نشاط

• فرحانہ تبسم (میسور) ۔ میری پیاری بھانجی عز الفردوس بنت انجینئر محمد اسمٰعیل اسسٹنٹ ایگزیکیٹو انجینئر میسور کا عقد سعید جاوید احمد (فرزند جناب ایم ، ایس جیلانی) کے ساتھ ۲۳ مارچ ۸۰ء بروز اتوار بوقت ۱۱ بجے صبح بحسن وخوبی انجام پایا ۔ رب العزت دونوں کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے ۔

• رفعت صدیقی (بریلی) میرے عزیز بھائی افتخار علی سلمہٗ (بن اسحاق علی قریشی) کا عقد نکاح میری کزن بیگم شکیلہ سلطانہ (بنت محمد احسن صاحب) کے ساتھ ۱۷ مئی ۸۰ء کو ہونا قرار پایا ہے دعا ہے کہ دولہا دلہن ہمیشہ شاد وخرم رہیں ۔

• تابندہ مصباح (حاجی منگی) میری بڑی بہن نجمہ مصباح (بنت سلیمان اللہ) کی شادی جعفر احمد صاحب کے ساتھ ۱۳ اپریل ۸۰ء بروز جمعہ بوقت ۸ بجے شام بمقام حاجی منگی بخیر وخوبی انجام پائی ۔ خدا سے دعا ہے کہ اس جوڑے کو ہمیشہ شاد وخرم رکھے ۔

• آمنہ خاتون زیدی (نئی دہلی) میرے برادر عزیز سید مہر عباس عرف نسیم رضا کی شادی خانہ آبادی ہمراہ کنیز زہرہ بتاریخ ۲۶ مارچ ۸۰ء بمقام صدر سر فیض آباد بحسن

وخوبی انجام پائی ۔ اللہ پاک دولہا دلہن کو شاد و آباد رکھے ۔

• صوالی مجید عاشی (آمبور) میرے عزیز بھائی محمد عبداللہ باشاہ عرف اکبر باشاہ بی ۔ اے ، الکٹرانک انجینئر (ٹیلیفون) (فرزند دلبند جناب محمد اسداللہ صاحب مرحوم بی ۔ اے ، ایل ، ٹی مدراس) کی شادی فوزیہ ۔ بی ، ایس ، سی ہوم سائنس کے ساتھ بتاریخ ۱۸ فروری ۸۰ء بمقام شادی محل مدراس بحسن وخوبی انجام پائی ۔ اللہ پاک دولہا دلہن کو ہمیشہ شاد وخرم رکھے ۔

• رفعت صفی (مظفر پور) میرے ماموں زاد بھائی نسیم الحق عرف نستو بی اے (ابن محمد نجم الحق ۔ بلاک ایجوکیشن آفیسر ، حبیب نگر امپوواہ) کی شادی میری خالہ زاد بہن نزہت حبیب (بنت شفیع الرحمن صاحب جنوار پور ستی پور) کے ساتھ ۲۱ مارچ ۸۰ء بروز جمعہ بخیر انجام پائی ۔ اللہ مبارک کرے اور میرے بھائی وبہن کو ہمیشہ شادماں وکامراں رکھے ۔

• زبیدہ سلطانہ ، ذکیہ سلطانہ (آمبور) میرے ماموں زاد بھائی محمد شفیع اللہ کا نکاح شہباز کوثر سے بمقام ممبئی تاریخ ۱۹ مارچ ۸۰ء بروز پیر بعد نماز مغرب ہوا ۔ بارگاہ ایزدی میں دعا ہے کہ دولہا دلہن تاحیات ایک دوسرے کے وفادار رہیں ۔ نیکی ، خوشحالی اور صحت وتندرستی ہر ہر گام پر ان کے قدم چومے ۔

• حوا باجی عبدالرزاق (لیبین) میری پیاری بہن فریدہ بانو بنت یوسف سیٹھ کی شادی ممبئی والے نواب ابراہیم عبداللہ نواب کے ساتھ ۲۵ فروری ۸۰ء بروز اتوار بمقام ممبئی کچھی میمن جماعت خانہ بخیر وخوبی انجام پائی ۔ حوا کی بہنیں دعا کریں کہ اللہ مبارک کرے ۔

• عزیز امام صاحب کی بھتیجی یاسمین امام سلمہا (دختر نیک اختر امام صاحب) کی شادی عنبر یونس سلمہٗ (فرزند ارجمند جناب یعقوب یونس صاحب) کے ساتھ ۲۸ مارچ ۸۰ء بروز بدھ بمقام رام باغ دوسلی گنج مرزا پور بحسن وخوبی انجام پائی اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی) ۔

• اظہر علی صاحب کی صاحبزادی ضیاء شمیم سلمہا کی شادی

پسندیدہ اشعار

• اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے بشرطیکہ شعر موزوں، معیاری اور ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ ساتھ ہی حریم کے نمبر خریداری کے ساتھ روانہ کیا گیا ہو۔ صرف وہی اشعار شریک اشاعت ہوتے ہیں جو ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائیں۔ جون کے لئے ہمارا عنوان ہے "حیات" اور جولائی کے لئے "یاد"

ایک حلقے پہ اگر قائم تری رفتار ہے
تیری گردش بھی مثال گردش پرکار ہے

مرسلہ قمر لطیف نگار سلطانہ، منور سلطانہ جلیلی (آمبور)

رفتار زندگی ہے کہ مانگے ہے بجلیاں
ہم ہیں کہ بے حسی کو گلے سے لگائے ہیں

مرسلہ رضیہ سلطانہ (مجدرک)

ہر چند سبھی نام ور تھے
رفتار جہاں سے بے خبر تھے

مرسلہ شہناز مجاہد (داردہ)

دیکھ کر اس کو عجب دل پہ سماں چھاتا ہے
اس کی رفتار پہ موجوں کا گماں ہوتا ہے

مرسلہ سیما نگوارے (شرکا وردھن)

اس در سے بہے گا تری رفتار کا سیلاب
اس راہ سے پھیلے گی شفق تیری قبا کی

مرسلہ زبیدہ اے حلیم (زیاتور)

آنکھ مانوس ہے تیرے در و دیوار سے
اجنبیت ہے مگر پیدا مری رفتار سے

مرسلہ ورسلا احمدی ناز (آمبور)

تجھے آیا رے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ رفتار، تو ثابت وہ سیارا (زبیدہ دیول آمبور) مرسلہ

پیرانہ موز میں ہے نیا آسمان نوی
دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر

مرسلہ مسز نسیمہ عزیز (برہ پورہ بھاگلپور)

وادیٔ شوق میں وارفتۂ رفتار ہیں ہم
بیخودی کچھ تو بتا کس کے طلبگار ہیں ہم

مرسلہ روما نہ تبسم (ڈالٹن گنج، پالامئو)

<u>بقیہ تعلیمات قرآن صفحہ ۳۱</u>

(۱۴۵) اور اگر ان کو ہاتھ لگانے سے قبل طلاق دو اور ان کے لئے کچھ مہر مقرر کر چکے تھے تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہو۔ اس کا نصف (مطلقہ کا حق) ہے مگر یہ کہ وہ عورتیں معاف کر دیں۔ (سورۂ بقرہ)

(۱۴۶) سو تم عورتوں سے ایام حیض میں علیحدہ رہا کرو۔ اور ان سے قربت نہ کیا کرو۔ جبتک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں، ہاں جب پاک ہو جائیں تو جس طریق سے خدا نے تمہیں ارشاد فرمایا ہے۔ ان کے پاس جاؤ۔ سورۂ بقرہ

(۱۴۷) اور بچوں والی عورتیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں۔ یہ مدت اس کے لئے ہے جو کوئی شیر خوارگی کی تکمیل کرنا چاہے پھر اگر ماں باپ رضا و مشورہ سے دودھ (دو برس کے اندر ہی) چھڑانا چاہیں تو ان پر کچھ گناہ نہیں۔ (سورۂ بقرہ)

(۱۴۸) طلاق رجعی دو بار تک ہے اور پھر اگر اس عورت کو (تیسری بار) طلاق دی تو اس کے بعد اس کو وہ عورت حلال نہیں۔ (سورہ بقرہ)

(۱۴۹) پھر اگر کوئی عورت کو طلاق دے تو اس کے بعد پھر وہ اس کے لئے حلال نہ رہے گی جب تک کہ وہ اس کے سوا ایک اور خاوند سے نکاح نہ کر لے۔ پھر اگر یہ (نیا خاوند) اسے (بخوشی خود) طلاق دے دے تو ان دونوں پر اس میں کچھ گناہ نہیں کہ بدستور پھر (بذریعہ نکاح جدید) مل جاویں۔ بشرطیکہ دونوں کو گمان غالب ہو کہ وہ خداوندی ضابطوں کو قائم رکھ سکیں گے۔ (سورہ بقرہ)

(۱۵۰) اور طلاق والی عورتیں اپنے آپ کو (عدت گزارنے کے لئے) تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔ (سورۂ بقرہ)

(۱۵۱) اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض آنے سے ناامید ہو چکی ہوں اگر تم کو شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہیں اور اسی طرح جن عورتوں کو حیض نہیں آیا۔ (سورۂ طلاق)

اچھا مسٹر ایزد۔ ہائے! میرا بولی۔

خدا حافظ: ایزد نے کہا۔ اور مہ وش پر نگاہ ڈالی۔ وہ دوسری طرف منہ کیے کھڑی تھی۔ رخصتی ایک لفظ تک اس نے نہیں کہا۔! اور میرا کا ہاتھ تھام کر ایک ماؤ ٹکے کی طرف بڑھ گئی۔

ریاض بے تکان ملاحیاں سنا رہا تھا۔ ایزد کو ہنسی آ رہی تھی۔ وہ بیحد خوش تھا۔ شاید اس مقام پر وہ درپردہ مہ وش سے عرض مدعا کر سکے۔ شاید کچھ ایسا ہو جائے کہ تقدیر مہربان ہو جائے۔

دوسرے روز وہ پتہ معلوم کر کے میرا کے گھر پہونچ گیا۔ ریاض نے ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ایزد نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ اس کی رفاقت چاہتا بھی نہیں تھا!۔

میرا کی طبیعت خراب نکلی۔ سرد آب و ہوا نے اسے زکام اور حرارت میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ ایزد سے معذرت کر کے آرام کرنے چلی گئی۔ مہ وش ڈرائنگ روم میں بیٹھی کوئی صحت مند کتاب پڑھ رہی تھی۔ وہ ہاتھ سے رکھ دی اور اٹھتی ہوئی بولی۔

تشریف رکھیے۔ میں میرا کی طرف سے آپ کی خاطر کرنے پر مجبور ہوں۔ کیونکہ وہ۔۔ آپ کی میزبان رہی تھی۔ ایسی نہیں:

ایزد کی باچھیں کھل گئیں لیکن دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ کیا کیجئے کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بات اس کے منہ سے ایسی نکل جائے جو پھر اس کی طبع نازک پر گراں گذرے۔ بہرحال وہ کھنکھار کر بولا: آپ بیٹھ جائیے۔ چائے وائے کا تکلف نہ کیجئے۔

وہ بیٹھ گئی۔ جیسے ان حال سے کہتی ہو کر چلو اچھا ہی ہوا۔

ایزد نے کنکھیوں سے اس کا جائزہ لیا۔ لیکن اس کے تیاف سے ہرگز معلوم نہ ہو سکا

(باقی آئندہ)

آپ خود کس کھیت کی مولی ہیں۔ کالج کے بدمعاش۔ چلے آتے ہیں اوٹ کیطرح منہ لٹکائے ہوئے کسی کا وقت غارت کرنے: وہ اتنی زور سے چیخی کہ ایزد بدحواس ہو کر بھاگ گیا۔ کیا تعجب تھا کہ اس کا لہجہ بہتیروں کو ان کی طرف متوجہ نہ کر دیتا۔ اب وہ زیادہ بپھرا ہوا تھا۔ اس کا بپھرنا اس لیے زیادہ تھا کہ وہ بدلہ نہ لے سکا تھا۔

ساری رات وہ سو بھی نہ سکا۔ کبھی لڑکی کی دلفریب شکل یاد آتی اور بے چین کرتی۔ کبھی اس کا غصہ اس کے سینے میں بھی آگ لگا دیتا۔

عجیب بات یہ تھی کہ رہ رہ کر اس کے الٹے سیدھے احساسات اس کے غصے پر حاوی ہوتے جا رہے تھے۔ اور وہ اپنے سینے میں ہلکی ہلکی کسک محسوس کر رہا تھا۔

شاید محبت کا پہلا قدم ایسا ہی لطیف ہوتا ہے جو بعد کو شکنجہ بن جاتا ہے۔

دوسرے دن گھر میں شادی کی اور نئی دلہن کی آمد آمد کی بوکھلاہٹ مچی رہی لیکن وہ یونیورسٹی چلا گیا۔!

اس کا اکلوتا دوست ریاض ابھی نہیں آیا تھا۔ لہٰذا وہ لائبریری میں جا بیٹھا۔ یہاں کوئی موجود نہ تھا۔ اس لیے وہ بے فکری سے الاپنے لگا۔

ہمارے بعد ساقی قلقل مینا نہ ہوئے گا
نئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے روئے گا

یہ کون اینڈیٹ ہے: الماری کے پیچھے سے ایک سریلی ڈانٹ سنائی دی۔ وہ جھینپ کر خاموش ہو گیا۔ لیکن جب الماری کے کنارے سے چاند طلوع ہوا تو ایزد کی پلکیں جھپک گئیں۔

اوہ۔ آپ ہیں: مہ وش نے برا سا منہ بنا کر کہا: میں پہلے ہی کہتی تھی۔ آپ سے سنجیدگی کی توقع رکھنا بیکار ہے۔

میں ابھی نہیں سمجھتا تھا کہ پھر آپ میرا راستہ کاٹیں گی۔ اس طرح زندگی کے ہر موڑ پر بھوت ملتے ہیں۔ انسان نہیں:

بھوتوں کو بھلا انسان کیوں ملنے لگے۔؟

پلیز پلیز۔ آپ لوگ اونچے درجے کے متعلم ہیں۔ یہ آپ دونوں میں کیا تکرار ہونے لگی: لائبریرین نے تنبیہہ کی: مسٹر ایزد۔ براہ مہربانی آپ ادھر آکے بیٹھئے:

آپ نے انہیں کچھ نہیں کہا؟: ایزد جھنجھلاتا ہوا بولا: کیا آپ نے نہیں سنا کہ ان محترمہ نے مجھے گالی دی تھی:

غلطی آپ کی تھی: مہ وش بولی: کیا یہ جگہ آپ کی ذاتی ہے۔ یا یہ کوئی کلاس ہال ہے کہ آپ نے الاپنا شروع کر دیا۔!

کٹ دس آؤٹ۔ پلیز۔ مس مہ وش: لائبریرین صاحب نے دخل دیا۔ دفعتہً تین چار لڑکے اور اس جگہ آگئے۔ ان کی لڑائی ادھوری رہ گئی۔

ایزد ریاض کی تلاش میں نیچے چلا گیا۔

کلاس میں ایزد نے ریاض کو بیٹھنے نہیں دیا۔ پروفیسر صاحب ابھی نہیں آئے تھے۔ ایزد ریاض کو باغ میں گھسیٹ لے گیا۔!

کیوں اس قدر بوکھلا رہے ہو یار: ریاض حیران تھا: سچ کہو، کسی کو قتل کر کے تو نہیں بھاگے:

قتل تو میں ہو رہا ہوں قسطوں میں: ایزد بولا۔

ابھی پورا ہو نہیں چکا؟: ریاض نے پوچھا۔

سن بے۔ ایسا ہوا کہ: ایزد بولا اور اس نے ریاض سے پوری کہانی کہی۔ یہ تک واضح کرنے سے پیچھے نہیں ہٹا کہ جب مہ وش کے دائیں یا بائیں کسی گال پر مکھی کا بچہ بیٹھ گیا تھا تو وہ اچانک کتنی حسین ہو گئی تھی۔ پھر وہ تشویش سے بولا۔

آپ کو کچھ اعتراض ہے:

ریاض کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یہ تو وہی بات ہوئی تھی کہ مان نہ مان۔ بھلا وہ مہ وش سے باقاعدہ متعارف کہاں ہوا تھا۔؟

ارے اس انبوہ سے نکلو۔ خدا کے لیے: میرا دفعتہً بولی: میرا تو دم گھٹا جاتا ہے۔ بالآخر میدان صاف ہوا۔ اور چاروں ساتھ ساتھ گیٹ تک آئے۔

ریاض پھولا ہوا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر ٹیکسی کا انتظار کرنے لگا۔

پرچے کیسے ہوئے۔ مسٹر ایزد: میرا نے پوچھا۔

"خراب"

کیوں:

پڑھ نہیں سکا۔

کوئی خاص وجہ تھی؟

جی نہیں۔ بس کوئی الجھن سی تھی۔ خیر۔ چھوڑیئے۔ آپ نے پرچے کیسے کیے: ایزد نے پوچھا۔

درمیانی: نخوت بھرے لہجے میں میرا نے جواب دیا۔

اتنے میں ایک معمولی سی معقول گالی دے کر ریاض بولا: سالا کوئی ٹیکسی آج نہیں ملے گی۔ چلو یار پیدل ہی چلتے ہیں:

آپ یہاں کہاں ٹھہری ہیں: ایزد نے نہ چاہنے کے باوجود پوچھا۔ میرا نے پتہ بتا دیا اور ساتھ ہی دعوت دی: کبھی آیئے نا ہمارے یہاں

ضرور ضرور:

باتیں اگر ختم ہو چکی ہوں تو چلنے کا ارادہ کرو: مہ وش نے میرا سے کہا۔

لیکن ٹھہرو۔ سوچنے دو۔ پتہ نہیں مکھی کا بچہ کس گال پر بیٹھا تھا: وہ پیشانی کو انگلی سے بجاتا ہوا بولا: داہنے پر کہ بائیں پر:

یقیناً اس کے صرف دو ہی گال ہوں گے: ریاض محققانہ شان سے بولا: ان گالوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی ہوگی۔ اس الجھن کا تصفیہ ہو جانے کے بعد تم اس چکر میں حیران ہو گئے کہ وہ چیز جو گال پر بیٹھی تھی۔ مکھی کا لڑکا تھا کہ لڑکی؟:

پھر ایزد نے اپنی حالت کے اظہار میں، مہوش کے حسن کی تعریف میں اور اپنے احساسات کے واضح کرنے میں ایک بیحد لمبی چوڑی تقریر کی!۔

ریاض اپنی کلائی پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ اور جب ایزد کے ہونٹوں سے بہتا ہوا الفاظ کا آبشار رکا تو ریاض نے بڑے اطمینان سے اعلان کیا کہ پونے دو گھنٹے گزر چکے ہیں!۔

ریاض اگر تم نے مذاق کیا نا۔ تو سچ کہتا ہوں کہ تمہیں قتل کر کے اس جگہ دفن کر دوں گا: ایزد دانت پیس کر بولا: کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ تم کون سے جہنم میں ختم ہوئے۔

کیا واقعی۔ تم اتنے سنجیدہ ہو: ریاض نے تعجب سے آنکھیں پھیلائیں: ایزد صاحب اور محبت۔ اللہ اکبر۔ بلکہ انا للہ وانا الیہ راجعون:

اچھا میں چلا۔ آئندہ اگر تم سے بولوں تو خدا مجھے غارت کرے: ایزد اٹھنے لگا مگر اس کا ہاتھ پکڑ کر ریاض نے اسے اپنے اوپر گرا لیا۔

اچھا بولو کیا چاہتے ہو مجھ سے: ریاض نے اسے دبوچتے ہوئے کہا۔ تمہارے لیے جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا۔ وہ میں ضرور کر دوں گا:

تم نے کبھی دیکھا ہے اسے؟: ایزد جلدی سے من گیا اور سیدھا ہو بیٹھا۔ ایک دفعہ شاید کسی ڈبیٹ میں بولی تھی: ریاض بولا۔

اسے اپنے اوپر رحم بھی آتا تھا۔ غصہ بھی۔ کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا تھا مہوش کی غیر موجودگی میں اس پر طیش آیا کرتا۔ انتقامی کارروائیوں کے منصوبے بناتا اور وہ سامنے آ جاتی۔ سب بھول جاتا۔ اور پھر اس کی بے پایاں محبت دل کے سمندر میں مد و جزر کی سی کیفیت پیدا کرنے لگتی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ اسے بہت پسند کرتا تھا۔ اور یہی چاہتا تھا کہ وہ اس کی زندگی میں آ جائے"

مہوش نے اسے ذلیل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اسے تنفر سے گھورتی۔ حقارت آمیز انداز میں مسکراتی۔ کبھی اسے سیدھے منہ جواب نہ دیتی۔ لیکن ایزد نے اپنی ساری خودداری طاق پر اٹھا رکھی تھی۔ برا اتنا ہی نہ تھا!۔

امتحان کے بعد گیلیں لے اسے زبردستی آوٹنگ بھیج دیا!۔ یہاں ریاض کی دور کی ایک بہن رہتی تھیں۔ ریاض اور ایزد ان ہی کے پاس ٹھہرے تھے! بہن اور بہنوئی نے دونوں کی تواضع کی کہ وہ شرمندگی محسوس کرنے لگے۔ ان کی شادی کو عرصہ گزر چکا تھا۔ اولاد نہیں تھی۔ لہٰذا اپنے سے ہر چھوٹے کو وہ اولاد کی طرح چاہنے لگتے تھے!!۔ دونوں دن بھر تو سیر کرتے پھرتے؟۔ ریاض تو خوب انجوائے کرنے کے موڈ میں تھا۔ لیکن ایزد بجھا بجھا رہتا۔ ریاض کی خاطر وہ ہنسا بولتا! وہ گھومتا پھرتا تو تھا۔ لیکن اس کی شخصیت جیسے کھلی ہوئی تھی!۔

ایک روز دونوں نظم دیکھ کر ہال سے نکل رہے تھے۔ انہیں لیڈیز کی بھیڑ میں مہوش اور میر نظر آئیں!۔ یک بیک جیسے کسی نے غبار آلود آئینہ پر مخمل کا ڈسٹر پھیر دیا ہو۔ ایزد کا چہرہ چمک اٹھا۔

اوہو۔ آپ بھی یہاں آئی ہوئی ہیں۔ محترمہ مس سعید: ریاض پاس جا کر چہکا۔

دو تین آدمیوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ مہوش نے خفیف ہو کر کہا: جی!

برسو جو رہیں۔ کیا وجہ ہے؟"

"امتحان نزدیک آ گیا ہے۔ بھائی جان" اس نے انھیں ٹال دیا۔

"تم نے تو کسی امتحان کو اتنی اہمیت نہیں دی۔؟" کفیل نے کہا "اب کیا ہوا ہے۔ اگر کسی قسم کی پریشانی درپیش ہے تو مجھ سے کہو۔ بڑوں سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہیئے۔"

"کچھ نہیں بھائی جان۔ آپ خواہ مخواہ فکر مت کیجئے" ایزد نے کہا۔ ان دنوں گھر میں خوب دلچسپ ہنگامے رہتے تھے۔ نگار کی شادی کا مسئلہ درپیش تھا۔! نفو کی بوڈ آیا ہوا تھا۔ سب لوگ یا تو کہیں گھومنے چلے جاتے یا پھر ان ڈور گیم کا سلسلہ چلتا۔ ایزد نے کسی پروگرام میں حصہ نہیں لیا۔

پھر امتحان کا دور شروع ہوا۔

ال حیس اس نے مہ وش کو دیکھا۔ یہ مذ نکھری ستھری الگ رہی تھی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح بے حد سنجیدہ، خاموش اور فکر میں غرق۔! وہ اس کے پاس گیا۔ مہ وش نے سرد نظروں سے اسے دیکھا۔

"پلیز۔ بتائیے۔ میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں؟" اس نے بے حد جھجکتے سے پوچھا۔

"ایزد صاحب" دفعتاً اس نے ترش ہو کر کہا "آپ اس طرح مجھ سے مخاطب مت ہوا کیجئے۔"

وہ یکبارگی شرمندہ ہو گیا۔ یہ توقع نہیں تھی کہ وہ یوں بھنبھوڑ کھائے گی۔

پرچے اس نے خراب کر دیئے۔ اور غصے کے مارے بھناتا ہوا سوچتا رہا کہ اس کے تلخ لہجے کا بدلہ کس طرح لے سکتا ہے۔!

"سوال یہ ہے کہ آج تک میں نے کیوں نہیں دیکھا؟" ایزد نے کہا۔

"انھیں کبھی اس طرف آنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی" ریاض نے سمجھایا "اب چونکہ سالانہ امتحان نزدیک ہے اس لیے سیمنار یا لائبریری سے کتابیں لینے آنے لگی ہیں۔ پروفیسر صاحبان نے نوٹس دینے بند کر دئے ہیں۔ انھیں نوٹس کی تیاری میں مختلف کتابوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔"

"گولی مارو۔ تم یہ بتاؤ کہ تمھیں وہ کیسی لگی؟" ریشہ خطمی ہو کر ایزد نے پوچھا۔

"مجھے یا تمھیں؟" ریاض نے مسکرا کر پوچھا۔

مختصر سی احمقانہ ہنسی ہنس کر ایزد نے کہا "میرا مطلب یہ تھا کہ کتنی اچھی لڑکی ہے۔ چاہے جانے کے قابل۔ اب میرا یہ حال ہے ریاض کہ مجھے رات کو نیند ہی نہیں آتی"

"تم دن میں کیوں نہیں سو جاتے۔"

دھڑام سے ایک گھونسہ ریاض کی پیٹھ پر رسید کر کے ایزد نے کہا "مجھے یہ بتاؤ۔ اب میرا کیا ہوگا؟ میں اسے چاہنے لگا ہوں۔ لیکن ریاض۔ ساتھ ہی میں اتنا غیور ہوں کہ ہرگز ہرگز اپنے منہ سے اس کے سامنے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنے دل میں اس کے لیے کسی قسم کے جذبات رکھتا ہوں۔!"

"تو گویا افسانوی محبت کرنا چاہتے ہو کہ وہ تمھاری نظروں کی زبان سمجھ لے"

"میری محبت نظروں سے بھی عیاں نہیں ہوگی ریاض" ایزد اب سنجیدہ تھا۔

"تو پھر"

"اس کلیہ پر اعتقاد رکھتا ہوں! محبت اگر کہیں ہے تو وہ اپنا وجود خود بخود منوالے گی"

"لیکن اس بے چاری کو تمھاری محبت کا علم کیسے ہوگا۔"

میری محبت سچی ہے تو وہ اس پر ضرور اثر کرے گی۔

یہ پرانی باتیں ہیں ایزد۔

محبت پر زمان و مکان کے بدلتے ہوئے اثرات حاوی نہیں ہوتے۔

ریاض۔ یہ تو انسان کے نظریات، خیالات، اصول اور جذبات بدل گئے ہیں۔ محبت کا جذبہ اپنی جگہ قدیم اور موثر ہے:

تو پھر بھئی۔ میری بھی دعا ہے کہ تمہاری یہ گونگی محبت بار آور ہو۔ یوں بھی مشہور ہے عشق کی آنکھ تیز ہوتی ہے:

سوال تو یہ ہے کہ وہ بھائی جان کی شادی میں کیسے شریک تھی؟ ایزد نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ڈھیروں مہمانوں میں سے کسی ایک کے ہمراہ آ گئی ہوگی!۔

مجھے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ یہیں پڑھتی ہے۔

جی ہاں جناب: ریاض انگڑائی لے کر بولا: شاید بی۔ اے کا آخری سال ہے۔ اور ہاں تم نے میرا کا نام بھی لیا تھا۔ اسے تو میں کچھ بھی جانتا ہوں۔ وہ تو انگلش مجلہ کی ایڈیٹر ہے۔ اس سے باتوں باتوں میں تمہاری حماقت آپ کا نام پتہ تاریخ پیدائش اور مقام رہائش سب کچھ معلوم کر سکتے ہیں:

لیکن اس طرح کی تفتیش نہ کرنا کہ وہ مشکوک ہو جائے: ایزد بولا۔

ارے میاں۔ یہ عاشقی ہے۔ اس میں عزت سادات تک چلی جاتی ہے:

ریاض بولا: تم بھی کیا پہلے کی سی خود داری اور وضعداری کو لیے پھرتے ہو۔ میری مانو تو مرد بنو۔ اور دھڑلے سے جا کر کھڑے ہو جاؤ اس کے سامنے۔ کہہ دو برملا کہ ہم تمہیں پسند کرتے ہیں۔ اگر تم بھی ہمیں پسند کرنے لگو تو بات ٹھیک ہے ورنہ تمہارا بھی حال ہوگا جو بر تھوی راج کے ہاتھوں سنجوگتا کا ہوا ہے:

اور خوش خیالیوں سے باز آیئے:

ایسے گلفام تو آپ بھی نہیں ہیں!:

تو پھر آپ کیوں کھڑی ہیں: میرے سامنے۔ اپنا راستہ ناپیے۔

آپ نہایت تو ہے اور بدتمیز معلوم ہوتے ہیں۔

جمال ہم نفس در من اثر کرد: ایزد برجستہ بولا۔ وہ مہ وش کی تیکھی تلخ گفتگو سے بے کیف محظوظ ہو رہا تھا۔

مہ وش اسے جلی کٹی سنانے لگی۔

ایزد نے دل میں سوچ لیا تھا کہ یہ لاگ بھی لگاؤ کی ایک قسم ہے۔

وہ روز بروز اس کا دیوانہ ہوتا گیا۔

ریاض نے اسے سمجھایا کہ لڑکی لال مرچ سے زیادہ تیز معلوم ہوتی ہے۔ اسے خدنگ ناعاقبت ہے۔ لیکن ایزد وہ مانا۔ پہلی محبت یوں بھی آدمی کو عزیز ہوتی ہے جیسے پہلوٹھی کا بچہ۔ اس سے بہت الفت ہوتی ہے۔

اور وہ پچھ اپنی دیوانگی میں اپنے آپ کو بھولا پھر اکیا۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔!

اسے اپنی بدنامی مہ وش کی رسوائی گوارہ نہ تھی نہ اسے یہ منظور پسند کر کوئی اسے مہ وش سے منسوب کرے۔ صرف ریاض کو اس کے راز کا علم تھا۔ لیکن وہ اس سے وعدہ کر چکا تھا کہ کسی سے کچھ نہ کہے گا۔

دن گزرتے رہے۔ امتحان سر پر سوار تھا۔ ایزد کو اس کا احساس تک نہیں تھا۔ گھر والے اس کی حالت کو تعجب سے دیکھتے۔

کن پریشانیوں میں مبتلا ہو۔ ایزد تم کیفی نے ایک روز کہا۔ بالکل مجنوں لگ رہے ہو سر کے بال کندھوں تک پہونچنے والے ہیں۔ ہفتہ کی داڑھی مونچھیں چہرے

کہتی تھی کہ مردوں سے سخت نفرت کرتی ہوں: ایزد نے ہنستے ہوئے کہا۔

ان لونڈیوں کا مطلب ہمیشہ الٹا ہوتا ہے جی: ریاض سخت اکتا گیا ہے۔ اب ذرا بھی تجاہل پر اتر آیا: مردوں سے نفرت کرنے والیاں ہی دراصل مردوں کی بھوکی ہوتی ہیں:

نہیں نہیں۔ ریاض۔ کم از کم اس کے متعلق ایسے توہین آمیز الفاظ استعمال نہ کرو: ایزد نے جلدی سے کہا۔

اچھا میں پوری پولیس انکوائری کر کے عنقریب آپ کے غریب خانے پر قدم رنجہ فرماؤں گا: ریاض اٹھ گیا: اور اب تم بھی جاؤ۔ آدمی بنو۔ دل سنبھالو اپنے۔ میرے لال کا منہ اتنا سا نکل آیا ہے۔ گال ناتوانی کے ارے اتنے پچک گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے تین دن سے کھیں اڑ کر منہ میں نہیں گئی ہے۔ ہائے اللہ۔ میرا تو کلیجہ مسوس رہا ہے:

اچھا اچھا منحوس صاحب: دانت پیس کر کھسیا کر اور گھونسہ دکھاتا ہوا ایزد بولا: اونٹ پہاڑ تلے آجائے پھر مزاج پوچھوں گا۔ بیٹے مجھے یاد ہے بس میری کا قصہ۔ تم واقعی پھرتے تھے اس کے پیچھے گریبان چاک کیے۔ ناتے کرتے تھے۔ کچھ۔ بھول گئے وہ دن۔ اب ہم پر طنز کرنے چلے ہیں:

وہ واقعہ کیا تھا؟ معصوم؟؟: ریاض بولا: ان دنوں ابا نے جیب خرچ بند کر دیا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ بس میری کے نانا اس کے نام اپنی پوری دولت کرنے والے ہیں۔ اور ماشاء اللہ وہ سکرات میں مبتلا ہیں۔ بس میں تو غنیمت جان کر مس میری کے پیچھے پیچھے پھرنے لگا تھا۔ بعد کو جب پتہ چلا کہ اس کے کھوسٹ نانا نے فی الحال ختم ہونے کا پروگرام ملتوی کر دیا ہے تو میں نے بھی لاحول پڑھ کر ہوٹل میں پیٹ بھر پلاؤ کھا لیا تھا۔!!

اس گفتگو سے ایزد نے اندازہ لگایا کہ دونوں میاں بیوی کا مہ وش سے خوش نہیں تھے۔ اور اس کے متعلق اچھی رائے بھی نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا ایزد نے موضوع تبدیل کر کے یہ ظاہر کرنا اور انہیں یہ یاد کرانا شروع کر دیا کہ اسے مہ وش سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اور بدستور اللہ کے یہاں آتا جاتا رہا تاکہ اس کا شبہ دور ہو جائے۔

ویسے وہ اس کا خیال ترک نہ کر سکا! اس کی روز روز کی بے پیائی... رنگ لائی۔

ایک دن اس نے گیٹ پر ایزد کو کھڑا دیکھ کر خواب لہجے میں پوچھا۔

آپ کس کا انتظار کر رہے ہیں۔ جانتے کیوں نہیں۔ سیکڑوں رکشے سامنے سے گزر چکے ہیں:

میرے کھڑے رہنے سے آپ کا کیا نقصان ہو رہا ہے: ایزد نے کہا۔

یہ اچھی بات نہیں ہے۔ آپ ہمارے گھر کے چکر بھی لگاتے رہتے ہیں۔

آپ کا گھر۔ کیا خوب۔ کبھی آپ نے مجھے دیکھا بھی ہے اپنے گھر میں۔ میں تو اپنی بھابھی کے بھائی اشرف صاحب سے ملنے چلا آتا ہوں۔

آپ یونیورسٹی میں بھی میرے پیچھے رہتے ہیں۔ کبھی لائبریری میں کبھی... کامن روم میں کبھی سیمنار میں۔ کیا یہ کوئی شریفانہ حرکت ہے۔ آپ ایکدم ہی سے نہیں گھبراتے:

غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو محترمہ: ایزد نے کہا: آپ سمجھتی ہیں کہ آپ اس قدر حسین اور خوش اخلاق ہیں کہ شخص آپ کی ایک جھلک دیکھنے آپ سے ایک مرتبہ مخاطب ہونے کے لیے پیچھے پیچھے پھرا کرتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ایک مرتبہ اچھی طرح آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ

اشرف بھائی۔ آخر ہماری جنس نے کیا بگاڑا ہے ان کا؟ : ایزد بے بسی سے بولا۔

وہ تو ٹھیک ہے۔ مردوں کے نام سے۔! یہ بھی کوئی نفسیاتی کومپلکس یا مرض ہوگا! اشرف نے جواب دیا۔

ان کے والد صاحب تو خود ڈاکٹر ہیں۔ اپنی صاحبزادی کا علاج نہیں کیا انھوں نے : ایزد بولا۔

میاں تم اس گھر کے لیے نئے ہو۔ جبھی اس قسم کے سوالات کر رہے ہو : اشرف نے کٹتے ہوئے لہجے میں کہا۔ تم جانتے نہیں کہ یہاں سارے جتن سارے علاج اور تمام مرحلے آزمائے جا چکے ہیں۔!

اچھا؟ ایزد نے منہ بنایا۔

ان لوگوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے :

لیکن ایسا کیوں ہے؟ : ایزد نے پوچھا۔

بھائی وہ اپنی بجائے خود ایک بر عکس ہے : اشرف نے آواز دبا کر کہا۔ لاڈ پیار اور ناز و نعم کی بہتات نے دماغ کو بے حال کر دیا ہے۔ بھلا لڑکیوں کی اتنی زیادہ سرکشی، خود سری اور خود مختاری کبھی اچھی نہیں لگتی۔ میں تو لڑکوں کو بھی ایک خاص حد میں رکھنے کا قائل ہوں۔ میرا چھوٹا بھائی اتنا تیز، گستاخ اور بے ادب نہیں ہے جتنی وہ لڑکی ہے۔ چچا صاحب کو میں نے سمجھایا تھا کہ زبردستی مہ وش کی شادی کر دی جائے۔ سمجھ اس کا شوہر اسے راہ راست پر لے آئے گا۔ لیکن انھوں نے منظور نہیں کیا۔

ڈرتے ہیں کہ کہیں واقعی مہ وش اپنی ضد میں اپنا کہا نہ کر دکھائے : فرا نے کہا۔

تمہاری ایسی کی تیسی : ایزد نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی جرأت مت کرنا۔ ورنہ سچ کہتا ہوں۔ کند چھری سے تمہارا قیمہ بنا دوں گا۔ خبردار اور ریاض کسی سلسلے میں میرا نام لے کے بکواس مت کرنا۔ سمجھا کہ نہیں :

اسے کہہ گیا یار۔ تمہاری اندھی محبت بھی عجیب ٹیکل ہے : ریاض بولا۔

بہت بعد کو اسے پتہ چلا کہ مہ وش بھابی کے اپنے خاندان کی فرد ہے۔ تب وہ فرط مسرت سے اچھل گیا۔ لیکن اس نے اپنی مسرت کا اظہار نہیں کیا۔ مہ وش ڈاکٹر سعید کی بیٹی تھی۔ جنھیں وہ بخوبی جانتا تھا۔ شعیب صاحب کے علاج معالجہ کے سلسلہ میں وہ کئی مرتبہ اس کے گھر آئے بھی تھے! ناصیہ کے ایک بھائی سے زبردستی دوستی گانٹھ کر وہ ڈاکٹر سعید کے یہاں آنے جانے لگا! ناصیہ کے بھائی اگرچہ ایزد کے ہم عمر نہیں تھے۔ لیکن وہ چونکہ انجینئر تھے اس لیے ایک بہانہ پیدا کر کے وہ بھی بی۔ ای جوائین کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس آنے جانے لگا! مہ وش سے بھی اس کی علیک سلیک ہوئی۔ لیکن گھر کے کسی فرد کو یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ صرف مہ وش ہی کی خاطر آتا تھا! ناصیہ کی والدہ اس کو بہت چاہتی تھیں۔ یونیورسٹی سے اکثر وہ ڈاکٹر صاحب کے گھر چلا جاتا۔ بارہا مہ وش نے دیکھا تھا کہ ایزد اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی سے نکلا اور رکشے کے انتظار میں دیر تک گیٹ پر کھڑا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی گاڑی مہ وش کے لیے آتی تھی لیکن بھولے سے بھی اس نے ایزد کو لفٹ نہیں دی۔!

ایزد نے اس کا نوٹس بھی نہیں لیا۔ کیونکہ محبت، محبوبہ کے ہر عیب، بداخلاقی اور کج ادائی پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ یا پھر محبت کرنے والے ہی کی آنکھوں پر اتنی دبیز پٹی بندھ جاتی ہے کہ وہ محبوب کا کوئی عیب دیکھ نہیں سکتا۔

ڈاکٹر اور انجینئر اشرف ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ بس رہائشی حصے الگ الگ تھے۔ تو بھی ایزد نے محسوس کیا کہ اپنے حصے سے سروش کسی نہ کسی کام کے بہانے اس طرف آجاتی تھی۔ اشرف کی بیوی سے اس کی کچھ زیادہ چھنتی تھی ویسے کبھی اس نے کسی کو منہ نہیں لگایا تھا۔

چونکہ اشرف کی بیوی اچھے کھانے پکانے کے لیے مشہور تھیں۔ اس لیے اب ایزد ان کی طرف جھکا۔

ایزد ان کے لیے غیر نہیں تھا۔ اب جگہ اس کی آؤ بھگت ہوتی تھی ـــ وہ خوش مزاج زندہ دل تھا۔ بہت جلد سب میں گھل مل گیا۔

اشرف سے اس نے کوئی تیوری کوئی نا رولا نہیں سیکھا۔

انھوں نے ایک روز شکایت کی۔ تب ایزد بولا۔

" معاف کیجئے۔ میرا تو وہ مطلب ہی نہ تھا۔ میں نے تو آپ کو عمدہ دسترخوان تک پہنچنے کے لیے وسیلہ بنایا تھا:

اس کے لیے تمہیں بہت سے پاپڑ بیلنے پڑے: اشرف نے کہا۔

کیا کرتا۔ اشرف بھائی۔ اتنا بھی بے غیرت نہیں ہوں کہ صاف صاف آپ سے کہہ سکتا کہ مجھے اپنے گھر لے چلیے۔ میں بھابی کے ہاتھ کے پکے کھانے کھانا چاہتا ہوں:

میں سب سمجھتی ہوں: ثمرا نے مسکرا کر کہا: انھوں نے مجھے بھی وسیلہ بنایا ہے کسی اور ہی چیز کی طلب کا:

کیا مطلب بھابی۔ وہ چکرا گیا۔

اب مطلب بھی میں ہی بتاؤں۔ ثمرا ہنسنے لگیں۔

میں بھی نہیں سمجھا تمھارا مطلب: اشرف نے کہا۔

آپ نے اپنے گھر میں جو بیری لگائی ہے۔ یہ اس کا پھل ڈھیلا ہے: ثمرا نے کہا۔

اچھا۔ چچا... تو یہ بات ہے: اشرف نے آنکھیں نکالیں۔

لیکن۔ ایزد۔ ہماری بات اگر مانو تو ہم کہیں کہ تم اپنے ارادے سے باز آؤ: ثریا بولیں۔

بڑا افسوس ہے ایزد: اشرف بولے: ہم یقیناً تمھاری بہتری چاہتے ہیں یہ نہیں چاہتے کہ تم الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار ہو جاؤ۔ ہاں۔ وہ میری چچا زاد بہن ہے۔ میں اس کی برائی بھی نہیں کرتا۔ وہ بے وقوف ہے۔ مخلص اور ذہین ہے۔ ہر طرح اچھی ہے۔ مگر اسے۔ مصیبت یہ ہے یار کہ اسے ہماری جنس سے قطعی نفرت ہے۔ اس نے میرے سامنے قسم کھائی تھی کہ عمر بھر شادی نہ کرے گی۔ ایک نہایت عمدہ پیغام ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب کا اس نے رد کر دیا۔

تو پھر وہ آئندہ کیا کریں گی؟: ایزد نے پوچھا۔

پڑھ رہی ہے اسی خیال سے۔ ملازمت کرے گی: ثریا بولیں۔

ان کے والدین انھیں سمجھائیں گے نہیں؟: ایزد نے کہا۔

تم کیا کہتے ہو۔؟: اشرف بولے: بھائی اس سلسلے میں نہایت خونک جنگ ہو چکی ہے۔ سروش اپنے ارادے میں اس قدر اٹل ہے کہ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس کا مستقبل کبھی زیر بحث لایا گیا تو وہ خود کشی کرلے گی۔"

The Hareem Lucknow May. 1979 (Phones : 44559-45334) Regd. No. LW/NP 32

June.79

Rs. 1/-

گزشتہ ۵۶ سال سے پابندی وقت کیساتھ شائع ہو رہا ہے — اور اردو میں ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے۔

جلد (۵۷) — نمبر (٦)

ماہنامہ حریم لکھنؤ

بیادگار
سید محمد سلیم انہونوی مرحوم
و
شفیق النساء
بیگم سلیم انہونوی مرحوم
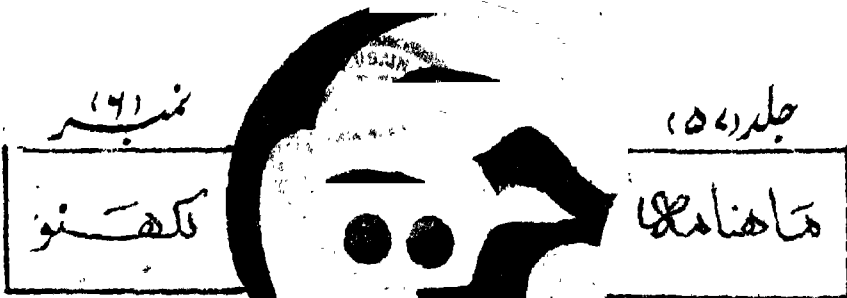
اڈیٹر و نگراں
نسیم انہونوی
معاونین
شوکت جہاں بیگم غزالہ
جانی بیگم رُدولوی

فہرست مضامین
ماہ جون ۱۹۷۹ء

قیمت سالانہ

اعزازی۔ منی آرڈر سے اکیس روپیہ، مخصوص خریداری۔ منی آرڈر سے ، انیس روپیہ۔ معمولی خریداری منی آرڈر سے۔ سولہ روپیہ وی۔پی سے پرچہ منگانے پر تین روپیہ زائد۔ فی پرچہ ایک روپیہ۔ غیر ممالک سے بقدر ۳۲ روپیہ یا دو پونڈ برائے سی۔میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں۔ آفس اور ترسیل زر کا پتہ۔ نسیم بُک ڈپو — لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ۔

نسیم انہونوی۔ مالک و ناشر۔ پرنٹر سرفراز قومی پریس — لکھنؤ

کیا آپ ایک ساس ہیں۔ اگر ہیں اور جب آپ اپنے دولھا کے ساتھ بیاہ کر اپنی سسرال آئی ہوں گی اور آپ کی ساس بھی بقیدِ حیات رہی ہوں گی تو آپ کو یقیناً یاد ہوگا کہ آپ پر کیا بیتی ہوگی۔ ساس بہو کا رشتہ مہذب دنیا کی ابتدائی تاریخ سے چلا آرہا ہے۔ ہر مذہب و ملت میں شادی کسی نہ کسی طریقے سے ہوتی آئی ہے، اس لئے کہ یہی رشتہ ایسا ہے جو انسان و حیوان کے درمیان تفریق دکھاتا ہے۔ نفس اور سکس چرند پرند، چوپایوں اور درندوں سب ہی میں پایا جاتا ہے، لیکن انسانوں نے اس کے لئے راہ مستقیم اختیار کی ہے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکے کو شادی کے بندھن میں باندھا جاتا ہے۔ اور یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ دونوں بس ایک دوسرے کے ہی ہو کر رہیں گے (یہ اور بات ہے کہ اکثر لوگ ان معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں) اور ساری دنیا میں شادی بیاہ کی رسم (طریقے مختلف ہوتے ہیں) منائی جاتی ہے اور ہر لڑکی کو بہو بنکر ایسے گھر میں جانا ہوتا ہے جہاں ساس ہوتی ہے (مستثنیات کا ذکر نہیں) اور شاید ہی کوئی گھر ایسا ہوتا ہو جہاں ساس بہو میں کھٹ پٹ نہ ہوتی ہو۔ عام طور پر اس کھٹ پٹ کی ذمہ داری ساس ہی پر ڈالی جاتی ہے، اس کو برا بھلا کہا جاتا ہے، اس لئے کہ بہو بیچاری ایک اجنبی گھر میں تنہا آتی ہے، کچھ معاشرتی اختلاف ہوتا ہے کچھ شرم و حیا بھی آڑے آتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات جو ساس کو بری لگتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ بہو اس کے بیٹے کی محبت کل نہیں تو اس کا بیشتر حصہ حاصل کر لیتی ہے۔ بتقاضائے فطرت کے تقاضے کے تحت شادی کے بعد شوہر کے لئے بیوی کی محبت (اس کی الفت) کشش ہوتی ہے کہ شوہر اپنی فرصت کا ہر لمحہ بیوی بچوں کے ساتھ گذارنا پسند کرتا ہے۔ شادی سے پہلے وہ ان لمحات کو ماں کے ساتھ گذارتا تھا۔ یکایک اس تبدیلی کا ماں پر اثر ہوتا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ اس کے بیٹے کو اس کی بہو نے اپنے قبضے میں کر لیا ہے، حالانکہ وہ بیچاری شوہر کی اس وارفتگی کی ذمہ دار نہیں ہوتی، اور نہ یہ چاہتی ہے کہ اس کا شوہر ہمہ وقت اس کے پاس بیٹھا رہے، اس لئے کہ مرد کی سی جذباتیت عورت میں نہیں ہوتی، لیکن ماں سراسر بہو کو ہی قصوروار سمجھتی ہے اور بیٹے کی کوتاہیوں کا انتقام بہو سے لیتی ہے اور طرح طرح سے اسے لعن طعن کا ہدف بناتی ہے۔ اکثر بہویں ضبط و صبر سے کام لیکر دل ہی دل میں کڑھ کڑھ کر رہ جاتی ہیں۔ اکثر جواب دے کر ساس کو اور بھڑکا دیتی ہیں۔

> خدمتِ خلق
>
> سب سے بڑی عبادت ہے
> جو انسانوں اور جانوروں سے
> محبت نہیں کر سکتا، خدا سے
> کیسے محبت کر سکتا ہے۔
>
> نسیم انہونوی

دوسری بات یہ ہوتی ہے کہ ساس، جہاں دیدہ ہر کام میں مشاق اور تجربہ کار ہوتی ہے اور بہو ناتجربہ کار اور الھڑ۔ اس لئے جو کام بھی کرتی ہے وہ ساس کا من پسند نہیں ہوتا۔ ساس سرزنش کرتی ہے اور بہو کو ناگوار گذرتا ہے۔ بات بات پر اعتراض سننا اسے پسند نہیں آتا کھٹ پٹ بڑھتی ہے اور گھر کی فضا مکدر ہو جاتی ہے۔ آخر کار معاملات شوہر کے کانوں تک پہنچتے ہیں۔ بیوی اپنی بپتا سناتی ہے اور ماں اپنی۔ بیٹا چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پستا رہتا ہے اور اس کے بعد دو ہی صورتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ سعادتمندی کے تحت ماں بہن کے ساتھ رہے اور بیوی پر جو ظلم ماں کرتی رہے، اسے برداشت کرتا رہے یا پھر بیوی کو لے کر علٰحدہ ہو جائے۔ اس وقت اسے جورو کا غلام کہا جانے لگتا ہے۔

آپ ساس ہیں تو آپ کو یہ سوچنا چاہئے کہ محبت [illegible]

ہوتی رہتی ہے۔ ایک بیٹے کی محبت اس وقت تک خالصتاً ماں ہی کی رہتی ہے جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی۔ شادی کے بعد ایک جوان بیٹا اپنی بیوی سے محبت کرنے لگتا ہے اس لئے کہ یہ اس کے سکس کا تقاضہ ہوتا ہے۔ ماں کو سوچنا چاہیئے کہ ۲۵-۳۰ سال تک بلا شرکت غیرے وہ بیٹے کی محبت حاصل کرتی رہتی ہے۔ قانون قدرت کے تحت اس عمر کے بعد لڑکے ماں سے زیادہ بیوی کو چاہنے لگتے ہیں۔ اور اس کے بعد جب بچے بالوجود میں آجاتے ہیں تو میاں بیوی کی محبت بھی تقسیم ہو جاتی ہے اور شوہر و بیوی میں محبت کی وہ حیثیت قائم نہیں رہتی جو بچوں کی آمد سے پہلے رہا کرتی ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلا کرتا ہے۔ اس لئے ہر ماں کو بیٹے کی شادی کرنے کے بعد یہ توقع نہ رکھنا چاہئے کہ اس کے بیٹے کی محبت حسب سابق قائم رہے گی جس طرح جائداد کا بٹوارہ ہونے کے بعد جائداد کی ملکیت باقی نہیں رہ جاتی شادی کے بعد بیٹوں کی محبت بھی ماؤں سے زیادہ بیویوں کے حصے میں آجاتی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ بہوئیں دودھ کی دھوئی ہوئی ہیں اور سارا قصور ساس ہی میں ہوتا ہے۔ نہیں ہماری بیٹیاں بھی بہت کچھ ان ناچاقیوں کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ اگر وہ کسی ماں سے اس کے بیٹے کی محبت لے لیتی ہیں تو انھیں خود ایک بیٹی کی طرح ساس سے محبت کر کے اس کی تلافی کرنا چاہئے۔ اگر بہوئیں ایسا کرسکیں تو بڑی حد تک ساس کی دلدہی ہو سکتی ہے اور وہ بیٹے کی کم توجہی کا زیادہ احساس نہیں کرسکتی۔

طالبات کے مسائل

نہ والدین سوچتے ہیں نہ حکومت غور کرتی ہے کہ ان لڑکیوں کو کن زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جاتی ہیں۔

نام نہ لکھوں گا لیکن لکھنؤ میں دو ایسے زنانہ کالج ہیں جو نوجوانوں اور جوانوں کے لئے تماشہ گاہ کا کام دیتے ہیں۔ کالج کھلنے اور بند ہونے کے اوقات پر بد اخلاق اور بدکردار لڑکے اور جوان آوارہ گردوں کا آجانا دیکھتے ہیں۔ آوازے کستے ہیں اور اکثر ناشائستہ حرکتیں بھی کرتے ہیں۔

حکومت کا مقصد تو بس یہ ہے کہ لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ خواہ اس کے لئے انھیں گالیوں سے بھی بدتر الفاظ سننا پڑیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ گرلس کالجز کے لئے بسوں کا انتظام ہو جو لڑکیوں کو کالجوں تک لائیں اور ان کے گھروں تک نہ سہی تو گھروں کے قریب تک پہنچائیں۔ میرے بچپن میں جب تعلیم نسواں کا آغاز ہوا تھا تو بسوں اور پردہ دار گاڑیوں کا انتظام تھا۔ ان کے ساتھ کہار اور ڈولیاں بھی رہا کرتی تھیں جو انھیں گھروں سے لاتیں اور گھروں تک پہنچاتی تھیں۔ کشمیری محلہ گرلس اسکول میں اس کا بہترین انتظام تھا۔ اس کی پرنسپل مسز گپتا پردے کا ایسا خیال رکھتی تھیں کہ کبھی کسی مسلمان پرنسپل نے بھی ایسا نہیں کیا۔ حکومت کروڑوں روپیہ تعلیم پر خرچ کرتی ہے وہ چاہے تو گرلس کالجز کے لئے بسوں کا انتظام کرسکتی ہے۔ اس کے لئے فیس بھی مقرر کرسکتی ہے۔ اکثر و بیشتر لڑکیاں رکشوں پر آتی ہیں جو غیر معمولی رقم لیتے ہیں اور پھر ان رکشوں کا تعاقب کیا جاتا ہے اور جب تک لڑکیاں گھروں تک نہ پہنچ جائیں ان کے کانوں میں ناپاک جملے پہنچتے رہتے ہیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ایسی بد اخلاقیاں اب شرافت پر بار نہیں ہوتیں۔ لڑکیوں کے کان ان گندے جملوں کے سننے کے عادی ہو چکے ہیں اور والدین کو صرف یہی ایک دھن رہ گئی ہے ان کی لڑکیاں بی، اے، ایم اے وغیرہ ہو جائیں۔

حکومت یہ بھی نہیں کرتی کہ سادہ وردی میں ایسی پولیس تعینات کی جائے جو ان غنڈوں کو پکڑ کر ایسی سزائیں دے کہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ یہ کام چنداں دشوار بھی نہیں ہے۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں

ادھر کئی ایسی شادیوں کی خبر سنی کہ دلہن بی۔ اے۔ ایم۔ اے ہے اور دلہا میاں دسواں۔ گیارھواں پاس۔ یہ ایک مضحکہ خیز سی بات ہے۔ کبھی شوہر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتا تھا اور بیوی اس سے کم پڑھی ہوتی تھی، لیکن اب لڑکیوں میں تعلیم زیادہ سے زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف لڑکوں میں پڑھنے کا ذوق گھٹ رہا ہے۔ اس طرح توازن قائم نہیں رہ گیا اس لئے جن تصورات کے ساتھ والدین اپنی لڑکیوں کو پڑھاتے ہیں وہ

خاک میں مل جاتے ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکوں کے نہ ملنے کی صورت میں یا تو لڑکیاں ملازمت کرنے لگتی ہیں یا پھر کم ہی پڑھے لکھے لڑکوں کے ساتھ بیاہ دی جاتی ہیں۔ ان کی مقابل زندگی کیسی گذرتی ہوگی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اردو کتابی میلہ

نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا دہلی اور اترپردیش اردو اکیڈمی کی متفقہ کوششوں سے لکھنؤ کی سفید بارہ دری قیصر باغ میں ۱۷ اپریل سے ۲۶ اپریل تک اردو کتب کا میلہ لگا تھا جو اس اعتبار سے پہلا میلہ تھا جس میں صرف اردو کتب کی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہندستان کے بیشتر اردو ناشرین نے اس میلہ میں اپنی مطبوعات کے اسٹال لگائے۔ سنہ سے اب تک شائع ہونے والی اردو کتب جو مہیا ہوسکیں ایک ہال میں علٰحدہ سجائی گئی تھیں۔ ان کی تعداد بہت کافی تھی، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کی کتابیں کافی تعداد میں شائع ہو رہی ہیں۔ اسی سلسلہ میں پبلشرز، ادبی جرائد کے ایڈیٹرس اور لائبریرین حضرات کی کانفرنسیں بھی ہوئیں۔ لٹریری کوئز بیت بازی کا مقابلہ اور ایک شاندار مشاعرہ بھی ہوا۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے تین انعام رکھے تھے جو اسٹالس کی سجاوٹ پر دیئے گئے۔ ان میں پہلا انعام ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ کو، دوسرا مجلس نشر و اشاعت ندوۃ العلما لکھنؤ کو اور تیسرا دارالاشاعت اسلامیہ دہلی کو ملا، اردو اکیڈمی کی جانب سے صرف ایک ہی انعامی شیلڈ رکھی گئی تھی جو نسیم بکڈپو کو اس کی ۵۰ سالہ خدمات کے عوض دی گئی۔ کافی لوگوں نے میلہ میں آکر اردو کتب کی سب سے بڑی نمائش کو دیکھا، کتابیں بھی خریدیں۔ کاش یہ میلہ اس گرمی کے بجائے نومبر یا فروری میں ہوا ہوتا تو کہیں زیادہ کامیاب رہتا۔

بقیہ تبصرات صفحہ (۶) کے

۔۔۔ سب سے زیادہ مشہور ہے ۔۔۔ تہ وہ بھی ایک الوہی تھا ۔۔۔ نے وزیر کی شکل میں سلطان محمود غزنوی کو قتل و غارت گری سے باز رکھنے کے لئے درس عبرت پڑھایا جاتا تھا۔

اسی طرح ب سے بگلا۔ پ سے پاگل وغیرہ حروف پر مزاحیہ انداز پر نظمیں لکھی گئی ہیں۔

کیا آپ کو علم ہے کہ

لکھنؤ کس لئے مشہور ہے

اگر نہیں تو ہم آپ کو بتاتے ہیں

لکھنؤ اپنی مخصوص تہذیب اور مشرقی تمدن کے لئے مشہور ہے۔ جس کا کہیں جواب نہیں گو یہ تہذیب اب زمانے کے ہاتھوں رفتہ رفتہ مٹ گئی ہے پھر بھی ہاتھی لاکھ لٹے تب بھی سوا لاکھ ٹکے کا، گری حالت میں بھی ایک نمونہ ہے۔ لکھنؤ کے مٹی کے کھلونے اور پھل و میوہ جو دیکھنے والوں کو متحیر کر دیتے ہیں اصل اور نقل میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

آصف الدولہ (جن کے متعلق مشہور تھا جس کو نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ) کا مشہور تاریخی امام باڑہ، ریزیڈینسی، مارٹین صاحب کی کوٹھی، بوٹانیکل گارڈن، بنارسی باغ، زندہ عجائب گھر، چھتر منزل، قیصر باغ۔ ریوڑیاں جسے گٹھیاں بھی کہتے ہیں۔ عطریات اور چکن کا کام اور ان سب سے زیادہ زردوزی کامدانی اور بدلہ وغیرہ کے کاریگر جن کا کام سارے ہندستان میں مشہور ہے اور ان کاریگروں کا بہترین کام۔

درشنو مل آتمارام اسٹیشن گوٹے والے

راج کمل ہوٹل بلڈنگ امین آباد روڈ لکھنؤ

میں ہوتا ہے صدہا حریص جنہیں اب تک اس فرم کا تجربہ کرچکی ہیں اپنی ضروریات کے لئے خط و کتابت کیجئے یا فون نمبر ۴۳۲۰ پر بات کیجئے۔ ایمانداری۔ خوش معاملگی اور وقت کی پابندی کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

تبصرے

آپ (تذکرہ شعرائے لکھنؤ حصہ اول) سائز ۲۲×۱۸/۱۰ صفحات ۹۶ کتابت و طباعت متوسط۔ جلد دیدہ زیب۔ قیمت اٹھارہ روپیہ۔ ناشر اردو سماج موتی لال بوس روڈ لکھنؤ۔ مولف عرفان عباسی۔

یہ کتاب لکھنؤ سے متعلق ۵۰ مرحوم شعرا کے حالات زندگی اور نمونہ کلام کا مجموعہ ہے جسے مولف نے بڑی کاوش اور تحقیق کے بعد مرتب کیا ہے۔ پڑھنے والے سوچ بھی نہ سکیں گے کہ مولف کو ان پچاس مرحوم شعرا کے حالات، کلام اور فوٹو شائع کرنے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنا پڑے ہوں گے اور کتنا وقت عزیز لوگوں سے ملنے اور حالات، کلام اور فوٹو حاصل کرنے میں صرف کرنا پڑا ہوگا۔

عرفان عباسی نہایت ذہین اور محنتی نوجوان ہیں۔ ان کا یہ کارنامہ اردو ادب میں ایک بہترین اضافہ ہے جو ان پچاس شعرا کو کبھی فنا نہ ہونے دے گا جن کا تذکرہ اس کتاب میں آگیا ہے۔

"آپ" میں متعدد ایسے شعرا کا ذکر ہے جنھیں میں نے اپنے سن بلوغت کے بعد دیکھا ہے یا ان سے ملتا رہا ہوں۔ ایسے شعرا کا تذکرہ پڑھ کر عرفان صاحب کو میں نے بیساختہ داد دی، جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس طرح لکھا ہے، جیسے کہ انھوں نے بغور ان کا مطالعہ کیا ہو۔ حالانکہ ان میں کے بیشتر شعرا ایسے ہیں جنھیں شاید عرفان صاحب نے بالغ نظر ہونے کے بعد دیکھا ہی نہ ہوگا۔

شعرا کے فوٹو اگر لیتھو کے بجائے بلاکس سے چھپوائے جاتے تو کتاب میں چار چاند لگ جاتے، لیکن اس پر غیر معمولی اخراجات آتے اس لیے تصاویر حربوں کے ذریعہ چھپوائی گئی ہیں۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ اتر پردیش اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے چھپی ہے۔

اخلاق نبوی

مولف مولانا قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی سائز ۲۲×۱۸/۸ صفحات ۴۰ کتابت و طباعت متوسط جلد دلکش۔ قیمت مجلد آٹھ روپیہ۔ ناشر: مرکز دعوت اسلام۔ دفتر جمیعۃ علماء ہند۔

کتاب اخلاقیات نبوی سے متعلق احادیث صحیحہ کا مجموعہ ہے احادیث کو عربی میں مع ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ ان احادیث کے مطالعہ سے ہر مسلم اور غیر مسلم کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اس لیے کہ ان کا تعلق ارکان مذہب سے نہیں صرف اخلاقیات سے ہے اور ان میں ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو نہایت سبق آموز ہیں اور انھیں پڑھ کر ہم اپنی بہت سی کمزوریوں کو دور کر سکتے ہیں۔ رسول مقبول صلعم نے اخلاق انسانی کو سنوارنے کے لیے کیا کیا، کیا اور کیا کیا ارشاد فرمایا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے بآسانی علم ہو سکتا ہے۔ آپ اس کتاب کو منگا کر خود پڑھیں اور دوسروں کو پڑھا کر ثواب حاصل کریں۔

اس حمام میں

مصنف ابو الکلام (ابو الکلام آزاد نہیں) سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۴۲ قیمت پانچ روپیہ۔ ناشر زیور پبلیکیشن۔ باقر گنج۔ پٹنہ

کتاب ایک طرح کا قاعدہ ہے جو الف سے لے کر ی پر ختم ہوتا ہے اور ہر حرف پر ابو الکلام نے ایسا کلام پیش کیا ہے جسے پڑھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ مثلاً الف سے الو کے سلسلہ میں لکھا ہے سنجیدگی، متانت اور وقار کی علامت، گوشہ نشین، بردباری، خاکساری کا پیکر، وہ تارک الدنیا بزرگ جس کے اعلیٰ پایہ کے زہد اور ریاضت سے حسد کھا کر لوگوں نے اسے تباہی و بربادی، قتل و غارت گری اور ویرانی کا پیغامبر بنا کر نحوست کا نشان قرار دیا۔ جہاں کہیں بھی اس کی آمد شروع ہوئی لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اب اس جگہ کی خیر نہیں گویا تباہی و بربادی اس کے جلو میں چلتی ہے ـــ الو کی بہتیری قسمیں ہوتی ہیں ان میں سے کاٹھ کا الو

(بقیہ صفحہ ۔۔۔ کالم ایک پر)

حریمی دسترخوان

قیمہ کے دہی بڑے

سامان:۔ ماش کی دال (یا ماش کی دال پسی ہوئی جو بسکٹ کی شکل میں ملتی ہے) دال ہو تو ۲۵۰ گرام۔ پسی ہوئی ہو تو ۲۰۰ گرام۔ نصف آنڈی پسا ہوا لہسن۔ پسی ہوئی نصف گانٹھ متوسط سائز کی ادرک۔ زیرہ پسا ہوا چار کا ایک چمچہ۔ سُرخ مرچ حسب خواہش نمک حسب ضرورت۔ دہی جما ہوا تازہ جو کھٹا نہ ہو۔ آدھ سیر فصل ہو تو ہرا دھنیا ایک گڈی۔ گھی یا ڈالڈا جتنا صرف ہو۔

ترکیب:۔ دال کو رات میں بھگو دیں۔ صبح چھلکے صاف کرکے اسے سل پر باریک پیس لیں۔ تمام مسالے دال میں ڈال کر ملالیں۔ اور خوب پھینٹیں۔ پھر دہی کو اچھی طرح پھینٹ ڈالیں۔ پانی نہ ملائیں۔ دال کی تھوڑی مقدار لے کر ہتھیلی پر رکھ کر ٹکیا سی بنائیں۔ قیمہ کو صاف کرکے اُبال کر پہلے ہی سے باریک پیس کر رکھ لیں ہلکا سا نمک قیمہ میں بھی ملا دیں۔ چاء کا ایک چمچہ قیمہ ٹکیا پر رکھ کر پیڑے کی طرح سے موڑ کر گھی میں تلیں اور اس کے بعد پانی میں ڈال دیں۔ چند منٹ کے بعد نکال کر پھینٹے ہوئے دہی میں جو کسی گہرے برتن میں رکھا ہو ڈالتی جائیں۔

بڑوں کو ہلکی آنچ پر تلیں اور جب گلابی ہو جائیں تب ہی نکالیں۔ سب سے آخر میں ہرا دھنیا کاٹ کر چھڑک دیں۔ اگر آپ چاہیں تو پانی یا دہی میں ڈالنے سے پہلے ہی تل کر انھیں استعمال کر سکتی ہیں بہت لذیذ معلوم ہوتے ہیں، مگر انھیں گرم گرم ہی کھایا جائے۔

(مرسلہ:۔ فیروزی قیمہ اشرفی لکھنؤ)

سہیلی کا منظوم خط

ریاض فاطمہ ریاضی

خط تمہارا بختصر مجھکو کل ملا
پیاس میں پیاسے کو جیسے جل ملا

انتظارِ آمدِ خط میں میری
ڈاکیہ سے جستجو ہر روز تھی

اس قدر دکھلایا تم نے انتظار
ناامیدی میں نہ تھا دل کو قرار

جلد خط لکھنے کا وعدہ تھا کیا
کرکے وعدہ پھر نہ کیوں ایفا کیا

آپ کو دنیا وہاں کیا کام ہے
جس سے چھٹکارا نہ صبح شام ہے

کچھ شکایت ہے نصیبِ دشمناں
جس سے دو حرفوں کا لکھنا ہے گراں

ہیں یہ سب حیلے حوالے اے بہن
لگ گئی ہے اور ہی اب کچھ لگن

اپنی تفریحوں سے فرصت کس کو ہے
یادِ خواہر کی ضرورت کس کو ہے

ہو مبارک آپ کو دلچسپیاں
خوش رہو تم شاد ہوں دولہا میاں

شادیاں تو سب کی ہوتی ہیں دُلہن
بھول جاتے ہیں کہیں بھائی بہن

یاد ہیں بچپن کی وہ سرگوشیاں
بیٹھ کر خلوت میں وہ سرگوشیاں

اے ریاضی اب شکایت ہے فضول
ایسے عالم میں سبھی جاتے ہیں بھول

انتخاب تعلیمات قرآن

(۱۵۲) اور جن کے پیٹ میں بچہ ہے ان کی عدت یہ ہے کہ پیٹ کا بچہ جن لیں۔ (سورۂ طلاق)

(۱۵۳) اے ایمان والو جب تم مسلمان عورتوں کو نکاح میں لاؤ پھر ان کو چھوڑ دو (طلاق دے دو) قبل اس کے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ تو ان کو عدت میں بٹھلانے کا تم کو کوئی حق نہیں کہ گنتی پوری کراؤ۔ بلکہ ان کو کچھ فائدہ پہنچا کر احسن طریق سے رخصت کر دو۔ (سورۂ احزاب)

(۱۵۴) تم پر وصیت کرنا فرض کر دیا گیا ہے۔ جب کسی کو موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ (وہ) کچھ مال چھوڑ رہا ہو۔ (سورہ بقرہ)

(۱۵۵) پھر جو شخص وصیت سن لینے کے بعد تبدیل کر گیا تو اس کا گناہ انھیں پر ہے جنھوں نے اس کو بدلا۔ بے شک اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔ (سورۂ بقرہ)

(۱۵۶) مردوں کا بھی اس میں حصّہ ہے جو ماں باپ اور قرابت والے چھوڑ کر مریں اور عورتوں کا بھی اس میں حصّہ ہے جو ماں باپ یا قریبی رشتہ دار چھوڑ کر مریں خواہ وہ (ترکہ) قلیل ہو یا کثیر (ہر ایک کا) حصّہ اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔ (سورۂ النساء)

(۱۵۷) اگر مرنے والے کی اولاد ہو تو اس کے ماں باپ کے لیے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لیے میت کے ترکہ میں چھٹا حصّہ ہے۔ (سورہ النساء)

(۱۵۸) اور اگر اس (مرنے والے) کی اولاد نہیں ہے اور اس کے ماں باپ وارث ہیں تو اس کی ماں کا تہائی حصّہ ہے (اور باپ کا دو تہائی) (سورہ النساء)

(۱۵۹) اور اگر مرنے والے کے کئی بھائی ہیں (اولاد نہیں) تو اس کی ماں کا چھٹا حصّہ ہے (سورہ النساء)

(۱۶۰) اور تمہارا (ان کے ترکہ میں) جو تمہاری عورتیں چھوڑ کر مریں آدھا مال ہے بشرطیکہ ان کی اولاد نہ ہو اور اگر ان کی اولاد ہے تو اس میں سے جو چھوڑ گئیں تمہارے واسطے چوتھائی ہے (سورہ النساء)

(۱۶۱) اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو عورتوں کے لیے چوتھائی مال ہے اس میں سے جو تم چھوڑ مرو۔ (سورۂ النساء)

(۱۶۲) اور اگر تمہاری اولاد ہے تو ان (عورتوں) کے لیے آٹھواں حصہ ہے اس میں سے جو تم چھوڑ دو (سورۂ النساء)

(۱۶۳) اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے حق میں تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک مرد کا حصہ برابر ہے دو عورتوں کے حصے کے۔ (سورۂ النساء)

(۱۶۴) پھر اگر (لڑکا نہ ہو) صرف دو سے زیادہ عورتیں (لڑکیاں) ہی ہوں تو ان کے لیے اس ترکہ میں دو تہائی حصہ ہے۔ (سورہ النساء)

(۱۶۵) اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لیے آدھا حصہ ہے۔ (سورہ النساء)

(۱۶۶) آپ رسول اکرمؐ ایمان والوں سے کہدیں کہ ذرا اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں (ستر) کی حفاظت کریں۔ (سورۂ نور)

(۱۶۷) اے ایمان والو اپنے گھروں کے سوا کسی کے گھر میں نہ جایا کرو، جب تک کہ اجازت حاصل نہ کر لو۔ اور ان گھر والوں پر سلام نہ کر لو (سورۂ نور)

(۱۶۸) اور جب کوئی چیز مانگنے جاؤ تو پردہ کے باہر سے مانگ لو اس میں خوب ستھرائی ہے۔ تمہارے دل کو اور ان کے دل کو۔ (سورۂ احزاب)

(۱۶۹) سو تم (لڑکیاں) بولنے میں نزاکت نہ کرو کہ ایسے شخص کو خیال (بد) ہونے لگتا ہے جس کے قلب میں خرابی ہے بلکہ معقول طریقہ سے بات کہو۔ (سورہ احزاب)

(۱۷۰) اے نبی آپ اپنی ازواج کو اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو کہہ دیں کہ اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں نیچے لٹکالیں اس سے جلد (باکباز عورتوں) کی پہچان ہو جایا کرے گی۔ (سورہ احزاب)

(۱۷۱) اور اپنے دوپٹے اپنے گریبان پر ڈالے رہو اور اپنی زینت نہ دکھائیں (سورۂ نور)

(باقی آئندہ)

اپنی داستان

عطیہ پروین

بڑے دن بعد ملاقات ہوئی تم سے فاخرہ! کہو کہاں رہیں اتنے عرصے؟ بڑی دُبلی پتلی اور زرد زرد سی نظر آرہی ہو کیا ہوگیا تمہیں؟ بیمار تھیں کیا؟ نہ پوچھوں؟ اچھا نہیں پوچھوں گی۔ اپنی سناؤں؟ ضرور سناؤں گی۔ ان تین برسوں میں کیا کیا نہ ہوگیا فاخرہ۔ محبت کی، بی، اے کیا۔ ہاں ہاں دونوں کام ہوئے۔ ہاہاہا! اور دونوں میں کامیابی ملی۔ ہاں اپنی قسمت پر جتنا ناز کروں کم ہے۔ جس کو چاہا، جس کو پسند کیا ——— اس کو حاصل بھی کر لیا۔

نہیں خبر کیوں نہ کی؟ پگلی! کہاں کرتی؟ تم تو جانے کہاں کہاں گھوم رہی تھیں۔ نہ پتا۔ کہاں کھوجتی تم کو؟ ہائے ہائے بڑا جی چاہتا تھا کسی کو اپنی محبت کا رازدار بناؤں۔ اپنے پریم کے قصے سناؤں۔ اچھا۔ تم اپنی ننہال چلی گئی تھیں۔ اتنے دن وہاں رہیں! کیوں بھلا؟ بے کہے سنے یہاں سے غائب کیوں ہوگئیں؟ نہ پوچھوں؟ اچھا نہیں پوچھوں گی۔ ہاں میری سنو۔ تم یہاں سے چلی گئیں میری ملاقات ایک بانکے سجیلے جوان سے ہوگئی کیا کہوں فاخرہ! پہلی نظر میں ہی اس کو دل دے بیٹھی اور وہ بھی میری طرف بے اختیار کھنچ آیا۔ ہم ایک دوسرے کے لئے دیوانے ہوگئے۔ ہاں، گھر والوں کو بھی معلوم ہوا۔ بڑی مخالفت کی سب نے۔ اپنے برابر کا نہیں ہے۔ کم تنخواہ پاتا ہے۔ یہ اور وہ ——— مگر نہ مانی۔ اس کے لئے گھر بار، دولت، سب پر لات مار کر نکل گئی سیدھی اس کے پاس جا کے دم لیا۔ اس کو معلوم ہوا تو مجھے بہت سمجھایا بجھایا اور مجھے میری کوٹھی پر واپس لے گیا۔ ڈیڈی سے معافی مانگی۔ بس فاخرہ اس کی یہ شرافت ڈیڈی کو بھا گئی۔ ایسی بھا گئی کہ اس کو داماد بنانے پر تیار ہوگئے۔ ہاہا! محبت کی جیت ہوئی تا جو بڑی دھوم دھام سے ہماری شادی ہوئی۔

ڈیڈی نے یہ بنگلہ میرے شوہر کو سلامی میں دیا ہے آخر میرے شوہر کے شایانِ شان مکان بھی تو ہونا چاہئے تھا نا۔ بھائی جان نے مجھے کار دی۔ بھائی صاحب نے ٹی وی اور ریفریجریٹر دیا۔ آپا نے زیورات کے دو سیٹ اور دس ساڑھیاں دیں۔ ڈیڈی نے لاکھوں کا جہیز دیا۔ دولھا بھائی نے تمہارے بہنوئی کو اپنی فرم کا منیجر بنوا دیا ہے۔ فاخرہ اب وہ ایک معمولی آدمی نہیں رہا۔ ہمارے برابر کا ہوگیا ہے۔

ارے ہر وقت میرے اردگرد منڈلاتا رہتا ہے وہ۔ اور تم پوچھتی ہو کیا سلوک ہے اس کا۔ شادی سے پہلے بھی میں اس کی محبوبہ تھی شادی کے بعد بھی ہوں۔ ہوں، نصیبوں والی؟ ارے نہیں کیا بتاؤں فاخرہ! میرے میاں کو ایک پگلی سی لڑکی نے بھی چاہا تھا۔ ہاں انھوں نے بڑے مزے لے لے کے اس کے قصے سنائے۔ میرے میاں نے اس کو خوب بے وقوف بنا دیا۔ ان کو اس سے ذرا بھی محبت نہیں تھی۔ وہ ہی گلے پڑ گئی تھی۔ ان ہی جیسی کسی معمولی خاندان کی لڑکی تھی۔ بھلا ان کو کیا ملتا اس سے؟ ....

.... میں جگمگاتا دمکتا ہیرا تھی۔ وہ کوڑے میں پڑا مٹی میں سنا ننھا سا موتی۔ میں آسمان تھی۔ وہ زمین۔ میرے شوہر کے مقدر میں روشنیاں تھیں تو وہ اندھیرے کیوں سمیٹتے؟

سنا ہے وہ لڑکی اپنا دل ٹوٹنے کا صدمہ نہ سہ سکی منہ چھپا کر نکل گئی کہیں۔ اور خیر چھوڑو بھی بلا وجہ بیکار قصّہ لے بیٹھی۔ آؤ تمہیں اپنا بنگلہ دکھاؤں۔ یہ ڈرائنگ روم یہ ڈریسنگ روم۔ اور یہ دیکھو ہمارا بیڈ روم کیا سندر سجوایا ہے میں نے یہ فوٹو؟ ارے پگلی، یہ میرا ہے، اور میرے میاں کا دیکھنا! کتنے خوبصورت، کس قدر شاندار ہیں مگر سگریٹ تو کسی وقت ان کے لبوں سے الگ نہیں ہوتی...... ارے یہ تم کانپ کیوں رہی ہو کیا ہو گیا تمہیں.... کچھ نہیں؟ صحت کا خیال رکھو فاخرہ تم بہت کمزور ہو گئی ہو۔ آؤ چلیں کچھ تمہارے لئے چائے منگاؤں ذرا

پہ کھلی تو بھاگتا —— ذکر کم بخت سنتے ہی نہیں سب کچن میں جا مرتے ہیں۔ اُف وہ! آج کتنی خوش دل ہوں میں تمہیں دیکھ کر۔ میری شادی میں نہ ہوئیں تم۔ کیا شان دار برات آئی تھی۔ ہزاروں کا مجمع ہو گیا تھا لوگ اب بھی مثال دیتے ہیں۔ وقار۔ یہ میرے میاں کا نام ہے اتنے پیارے دولہا بنے تھے کہ لوگوں کی نظر لگی جا رہی تھی۔ ارے تم پھر آنکھیں بند کرنے لگیں۔ لو یہ سیب کھاؤ۔ یہ سنتو بھی لو۔ یہ نمکین بادام اور کاجو۔ ارے کھاؤ، ذرا طاقت تو آئے۔ کبھی گلاب کا پھول ہوا کرتی تھیں اب تو گیندے کی مرجھائی کلی لگ رہی ہو۔ کونسا روگ لگا لیا تم نے فاخرہ؟ نہیں بتاؤگی؟ اچھا نہ بتاؤ —— لو چائے پیو۔

وقار تو کہیں شام کو آئیں گے۔ اکثر ان کو دیر ہو جاتی ہے آتے ہی مجھے پکاریں گے ڈارلنگ!" اور میں کہیں بھی ہوں وہیں پہنچ جائیں گے سچ فاخرہ، ان کا یہ ڈھیر سا پیار مجھ سے سنبھلتا ہی نہیں ہے اور اب۔ اب تو ان کے پیار کی نشانی بھی میرے اندر پروان چڑھ رہی ہے۔ ہاں فاخرہ میں ماں بننے والی ہوں۔ وقار تو خوشی سے دیوانے ہو گئے تھے یہ خبر سن کر مجھے گود میں اٹھا کے ناچنے لگے تھے۔ شریر ابھی سے ننھے کے لئے ڈھیروں سامان اکٹھا کر لیا ہے۔ ننھا منا خوب صورت جھولا، ننھی سی کرسی۔ ان گنت کھلونے۔ بڑا ئی سکل۔ لکڑی کا گھوڑا۔ موٹر۔ اوہ! پوچھو نہیں کتنی بے تابی ہے ان کو ننھے کے آنے کا انتظار ہے؟ ان کو یقین ہے ننھا ہی ہوگا۔ کہتے ہیں ابھی سے اچھی تعلیم دلاؤں گا۔ فارن بھیجوں گا۔ یہ کر دوں گا۔ وہ کر دوں گا۔ توبہ! میں تو تھک جاتی ہوں ان کی اس پیار بھری بکواس سن کر کیا مجال جو مجھے کوئی بھاری چیز اٹھانے دیں مجھے ذرا دیر بھی چپ ہونے دیں۔ کہتے ہیں ہنستی رہو تاکہ ہمارا منا۔ خوب ہنس مکھ اور صحت مند پیدا ہو۔ سچ کہتی ہوں فاخرہ، ان جیسا نیک اور محبت کرنے والا شوہر مجھے دوسرا نہیں مل سکتا تھا.... فاخرہ! فاخرہ! ارے کیا ہوا تمہیں؟ رو رہی ہو تم؟ کیوں کس لئے؟

کیا تکلیف ہے تمہیں؟ مجھے نہیں بتاؤ گی؟

نہیں شاہدہ کچھ نہیں بتاؤں گی بس تمہیں۔ تمہاری ہنستی کھیلتی زندگی میں زہر گھول کر مجھے کچھ نہیں ملے گا۔ خدا کرے تمہارا یہ دنیا بھر کی خوشیاں سمیٹے میرے اس بچے کی طرح دنیا میں آنے سے پہلے نالی میں نہ بہا دیا جائے!

فاخرہ

"اپنے نیک اور محبت کرنے والے فرشتہ خصلت شوہر سے یہ کبھی نہ کہنا شاہدہ کہ ایک پگلی سی لڑکی ان کی دہلیز پر آئی تھی...."

"فاخرہ —— فاخرہ! رکو تو سہی —— سنو تو —— اُف! کچھ کہئے کچھ بتائیے۔ مونہہ پر کوئی بات لائے بغیر یہ یکایک اٹھ کر کیوں چلی گئی؟ اور پھر میری باتیں سن کر یہ کم بخت کیوں رو رہی تھی؟"

بشکریہ حنا، لاہور

ڈرامہ

روٹی

صفیہ ہاشمی

کردار

مینا	اٹھارہ انیس سال کی لڑکی
صنم	مینا کی چھوٹی بہن ہائی اسکول کی طالبہ
ارشد	مینا کا چھوٹا بھائی
امّی	مینا کی بیوہ ماں
نازش	مینا کا پڑوسی
فیاض	ڈاکٹر

پہلا منظر

کالی میلی دیواروں والا ایک چھوٹا سا گھر۔ اندر کوٹھری نما دو کمرے باہر ایک چھوٹا سا صحن اور صحن میں باہر سڑک پر کھلنے والا دروازہ .... اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے ہیں ...... مینا اندر کمرے میں ارشد اور صنم کو سکول کے لیئے تیار کر رہی ہے۔ امّی باہر صحن میں امرود کے گھنے درخت کے سائے میں تخت پر بیٹھی مشین پر کچھ سی رہی ہیں۔ ایک طرف کچھ بغیر سلے کپڑوں کا ڈھیر پڑا ہوا ہے۔ اندر سے اچانک ارشد کے رونے کی آواز آتی ہے۔

امّی (پکار کر)۔ مینا۔ ارے بیٹی کب تک الجھی رہے گی ان کے جھگڑوں میں۔ تجھے ہاسپٹل بھی تو جانا ہے۔ دیر نہ کرو بیٹا۔

مینا (میلے لباس میں باہر آتے ہوئے) بس امّی ابھی تیار ہوتی ہوں .... یہ دونوں تو چلے جائیں ....

(کچھ رک کر) امّی بکس میں کچھ پیسے پڑے تھے وہ مل نہیں رہے ہیں۔ ارشد آج پھر مانگ رہا ہے کاپی کے لیئے۔

امّی (غم گین لہجے میں)۔ پگلی وہ تو۔ کل شام کے لیئے میں آٹا لے آئی تھی۔ لالہ اب ادھار نہیں دیتا۔

(پھر ارشد کو پچکارتے ہوئے) ارشد کون سی کاپی چاہیئے میرے لال تجھے۔ کل لے لینا میرے چاند ... جا جلدی سے اسکول جا۔ دیکھ اپیا کو بھی دیر ہو رہی ہے۔

ارشد منہ بسورے بستہ اٹھائے دروازے کی طرف جاتا ہے صنم چپ چاپ اس کے پیچھے کتابیں سنبھالے چلی جاتی ہے ... مینا اشکبار نگاہوں سے ان کے افسردہ چہروں کو دیکھتی ہے .... اسکی نگاہ باورچی خانے کی طرف اٹھ جاتی ہے جہاں آج بھی خاک اڑ رہی ہے وہ دونوں آج بھی بنا روٹی کھائے چلے گئے۔ اس کے سینے میں ٹیس سی اٹھتی ہے۔ اور وہ مڑ کر امّی سے بول پڑتی ہے۔

مینا ... امّی کاش ابو اتنی جلدی زندگی کی لڑائی نہ ہار جاتے تو کم سے کم ہمیں ایک وقت کی روٹی سی تو محروم نہ ہونا پڑتا۔

امّی ایک آہ سرد بھر کر سر جھکا لیتی ہیں اور مینا خاموشی سے اندر چلی جاتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ تیار ہو کر آتی ہے اور ماں کو سلام کر کے تیزی سے باہر چلی جاتی ہے۔

(نازش اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا گویا اسی کی راہ دیکھ رہا ہے)

نازش۔ اتنی دیر سے نکلو گی تو خدا ہی حافظ ہے ... بس چھوٹ گئی تو وقت پر ڈیوٹی پر کیسے پہونچو گی۔ آج تو میرے پاس سائیکل بھی نہیں ہے کل شام ہی کرایہ پر دیدی تھی ... کچھ پیسوں کی ضرورت آ پڑی تھی ..... خیر (کچھ ٹھہر کر) اتنی خاموش کیوں ہو مینا۔

مینا (ٹالتے ہوئے) کچھ نہیں۔ سوچ رہی ہوں۔ میری وجہ سے تمہیں ہر روز اتنے سویرے نکلنا پڑتا ہے۔

دفتر تو دس بجے کھلتا ہوگا نا۔

نازش (ہنسکر) چلو تمہیں دھیان تو آیا ... مگر مینو اس ایک وجہ سے کچھ فائدہ بھی حاصل ہو گیا ہے۔

مینا (حیرت سے) فائدہ۔ کیسا فائدہ۔ نازش ... پہلے بتاؤ

آٹھ سے دس کے درمیان کرتے کیا ہو۔ کیا گھر واپس آجاتے ہو۔
نازش (آہ بھرکر) گھر۔ مینا۔ ایک اکیلا آدمی، بچھڑے کو گیا گھر کہہ سکتا ہے ۔۔۔ خیر چھوڑو ۔۔۔ میں تو بتا رہا تھا کہ رنگل سینما کے پاس وہ کتابوں کی دوکان ہے نہ دائیں طرف۔

مینا۔ ہاں ہاں۔ تو پھر
نازش۔ وہیں دو گھنٹے بیٹھتا ہوں۔ بس چھوٹی موٹی نوکری ہے مگر ہے بڑے کام کی ۔۔۔۔ اپنے سبجکٹ کی کتابیں بھی مل جاتی ہیں پڑھنے کو۔ اب رات کو لائبریری میں نوٹس بنانے کے لئے سر کھپانا نہیں پڑتا۔ اور مجھے دفتر میں اوور ٹائم جاب کے لئے خاصا وقت بھی مل جاتا ہے۔
مینا۔ افسردہ سی نازش کو غور سے دیکھتی ہے ۔۔۔۔ صبح سے شام تک کڑی محنت کے آثار اسکے چہرے پر ثبت تھے۔ دونوں ہی ایک جیسے حالات کا شکار رہتے۔ دونوں کو ہی اپنے اپنے خاندان کے لئے روٹی کمانے کی دھن لگی تھی۔ اور دونوں ہی ہر طرح کی کفالت کرنے میں کوشاں تھے۔ مینا کے باپ نے دو سال پہلے روٹی کی لڑائی سے تنگ آکر اپنے آپ کو شراب میں غرق کر لیا تھا اور تقریباً ایک سال ہو رہا تھا جب زہریلی شراب پینے سے اس کی موت واقع ہو گئی تھی ۔۔۔۔ سارا خاندان مانو جلتی ہوئی دھوپ میں کھڑا ہو گیا تھا۔۔
۔۔ مینا نے انٹر کر کے نرسنگ جوائن کر لی تھی ۔۔۔ نازش اس کے بچپن کا ساتھی بھی تھا اور دکھ درد کا رفیق بھی ۔۔۔ وہ زندگی بھر کے لئے نازش کی محبت کا سہارا چاہتی تھی اور نازش بھی اپنی مالی حالت سدھارنے کے لئے دن رات محنت کر رہا ہے تاکہ کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھ سکے۔

مینا اپنے ہی خیالوں سے اچانک چونک پڑتی ہے۔ ایک بس ان کے قریب آکر رکتی ہے۔ دونوں چڑھ جاتے ہیں ۔۔۔۔
مینا ۔۔۔ اماں کی کوئی چٹھی آئی
نازش (افسردگی سے) ہاں آئی ہے۔ آپا کی شادی کے لئے پریشان ہیں ۔۔۔ لڑکے والے جلدی کرنا چاہتے ہیں اور یہاں ابھی خاطر خواہ جہیز کا انتظام بھی نہیں ہوا
مینا۔ (دکھ سے) تو اب کیا کرو گے۔

نازش (آہ بھرکر) دیکھو نوری ہو۔ اسی کی کوشش تو کر رہا ہوں۔ مقابلہ میں کامیاب ہو گیا تو کم سے کم اچھی نوکری تو مل سکے گی۔ ان دو سو روپیوں میں ہوتا ہی کیا ہے۔ خیر جانے دو۔۔ سناؤ۔ ہاسٹل میں کیسے گزر رہی ہے۔
مینا (ہلکی مسکراہٹ سے) ٹھیک ہی ہے۔ کام مسلسل کرنا پڑتا ہے۔ دن کی ڈیوٹی میں تو ٹھیک ہے۔
مگر رات کی ڈیوٹی ۔۔۔۔۔
نازش (بے ساختہ مڑکر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے) کیوں۔ کیا پریشانی ہے۔
مینا (نظریں چرا کر) بس یونہی۔ رات کو گھر سے دور رہتی ہوں۔ امی الگ پریشان رہتی ہیں۔
اب تو ان کی طبیعت بھی گری گری رہتی ہے
نازش (رنج سے) اوہ مینو۔ کتنا چاہتا ہوں کہ ایک دن اس قابل ہو جاؤں کہ تمہیں کام نہ کرنا پڑے
۔۔۔ مگر میری قسمت ۔۔۔۔۔ لو تمہارا ہاسپٹل بھی آگیا آج کب تک لوٹو گی۔
مینا۔۔ بس رات تک کی ڈیوٹی ہے جلد ہی فارغ ہو جاؤں گی۔
نازش (خوش ہو کر) تو آج دفتر سے سیدھے یہیں آجاؤں گا۔ ساتھ چلیں گے۔ آج میرا اوور ٹائم بھی نہیں ہے ۔۔۔ اچھا خدا حافظ (محبت بھری نظروں سے تکتا ہے)
مینا۔۔ شرمیلی سی مسکراہٹ لئے ہاسپٹل کے گیٹ کے اندر چلی جاتی ہے۔
ڈاکٹر فیاض کو ریڈور میں مل جاتا ہے ۔۔۔ مینا اسے گڈ مارننگ کہکر تیزی سے گذر نا چاہتی ہے کہ ڈاکٹر کی تحکمانہ آواز سنکر ٹھٹک جاتی ہے
ڈاکٹر فیاض ۔۔۔ مینا۔ دس منٹ لیٹ ہو
مینا (ندامت سے) سوری ڈاکٹر ۔۔۔ آئندہ سے ایسی شکایت نہیں ہوگی۔
فیاض کچھ لمحے اسکے جھکے چہرے کو دیکھتا ہے اور پھر اندر

(جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ کریں)

آنے کا اشارہ کر کے اپنے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے ... مینا
گھبرائی گھبرائی اس کے پیچھے آ گئی ہے۔
فیاض .... مینا میں دیکھ رہا ہوں تم کچھ دنوں سے بہت
پریشان ہو .... پہلے سوچا تھا شاید میری نظر کا فریب ہے
مگر آج تو یقین آ گیا .... دیکھو تم نے نیم لمبر بھی اپنے لباس
پر نہیں لگایا ہے۔
مینا (بوکھلا کر) جی۔ وہ۔ سوری ... ویری سوری سر
فیاض (سنجیدگی سے) خیر یہ تو تم سٹور روم سے لے لو
... مگر مینا۔ تمہیں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔
ابتک کا تمہارا ریکارڈ کافی اچھا رہا ہے ... اسٹاف
سسٹر بھی تعریف کرتی ہے .... تمہیں اپنے کام میں محنت
اور خلوص سے لگے دیکھ مجھے بھی خوشی ہوئی تھی مگر ....
مینا (جلدی سے) سر اس بار معاف فرمائیے .... آئندہ
سے ایسی بات نہیں ہو گی۔
ڈاکٹر فیاض۔ خیر ڈاکٹر فیاض تمہیں معاف کر دے گا
مگر فیاض سے معافی کی توقع نہ رکھنا۔
مینا (سوالیہ انداز سے) میں۔ میں سمجھی نہیں سر۔
ڈاکٹر فیاض۔ مینا میں اگر تمہاری کسی پریشانی میں
کام آ سکوں تو بلا جھجک کہنا .... مجھے خوشی ہو گی۔
مینا ... (گھبرا کر) جی۔ میں پریشان ... تھینک یو سر
... آپ کی مہربانی ... اب اجازت دیں ڈیوٹی کا وقت
ہو رہا ہے۔
مینا اجازت لیکر جلدی سے ڈیوٹی روم کی طرف بڑھ جاتی
ہے۔ فیاض کی نظریں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں
وہ مینا کو پسند کرتا ہے ... مینا پر یہ بات ظاہر تھی ... وہ
حتی الامکان فیاض کی ہمدردی سے بچنے کی کوشش کرتی ہے
مگر وہ تو اس کی ماتحت تھی۔ فیاض کی شرافت کی وہ معترف
تھی مگر .... اس کے دل میں تو کسی اور کی ہی تصویر تھی۔

دوسرا منظر

مینا ... حسب معمول ہاسپٹل کے باہر نازش کے انتظار
میں کھڑی ہے۔ اندھیرا بڑھ رہا ہے ... فیاض کی کار گیٹ
سے باہر نکل کر اس کے قریب آ رکتی ہے۔
فیاض (سر نکال کر) مینا۔ آج پھر پیدل۔ میں نے پہلے
ہی کہا تھا گھر تک چھوڑ دونگا مگر آج بھی تم نے بس کا بہانہ
کیا ... چلو آج تو چوری پکڑی گئی ... آج ٹالونگا نہیں چلو
بیٹھو۔ تمہارا گھر بھی دیکھ لوں گا۔
مینا (ہچکچا کر) سر۔ میں۔ میں تو روز جاتی ہوں آپ
تکلیف نہ کریں۔
فیاض (مسکرا کر) تو گویا۔ تم ہمیں گھر لیجانا پسند نہیں کرتی
مینا (گھبرا کر) نہیں نہیں سر۔ ایسی بات نہیں میں تو ...
فیاض (دروازہ کھول کر) تو پھر آؤ۔ بیٹھو۔ دیکھو سڑک پر
بحث کرنا مناسب نہیں
مینا بوکھلا کر چاروں طرف دیکھتی ہے کہ ... نازش
سائیکل پر آتا دکھائی دیتا ہے۔ مینا کی جان میں جان آتی
ہے۔
مینا ... سر۔ وہ۔ وہ نازش آ رہا ہے میں اس کے
ساتھ چلی جاؤں گی
فیاض (سنجیدہ ہو کر) نازش کون نازش۔
مینا (نگاہیں جھکا کر) ہمارے پڑوس میں رہتے ہیں ہم
دونوں بچپن سے ساتھ پلے بڑھے ہیں۔
فیاض (تاسف سے) اوہ۔ اچھا تو میں چلتا ہوں
مینا۔ سر ملیں گے نہیں ان سے۔
فیاض۔ پھر کبھی تو نگا (گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے)
ویسے میرا اس وقت کیا کام .... اچھا خدا حافظ۔
کار تیزی سے گذر جاتی ہے۔ مینا حیرت سے تکتی رہ جاتی
ہے۔ نازش اس کے قریب آ کر سائیکل روک دیتا ہے
مینا کو کار کی طرف دیکھتے پا کر ٹوکتا ہے۔

نازش۔ کیا بات ہے مینا۔ کون تھا وہ۔

مینا (بیخیالی میں) ڈاکٹر فیاض۔ میرے انچارج.... بہت خیال رکھتے ہیں بیچارے۔

نازش (معنی خیز نظروں سے) تو اتنی جلدی کیوں چلے گئے۔ میں بھی مل لیتا۔ بہت اچھے ہیں جو تمہارا دھیان رکھتے ہیں۔

مینا (سنبھل کر) نازش۔ تم بھی کیا بات کرنے لگے.... یہ بتاؤ اتنی دیر کیوں ہوئی۔۔ کب سے کھڑی انتظار کر رہی ہوں۔

نازش (کرب سے) انتظار تو میرا مقدر ہے مینا... جانے کب سے کب تک کا۔۔۔ آؤ بیٹھو۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔ کچھ خریدنا تو نہیں ہے۔

مینا... ہاں ذرا بازار سے گذرتے جائیں گے سالگ خریدلوں۔ تمہیں پسند ہے نا۔

نازش۔ ہاں مگر روٹی کے ساتھ.....

دونوں خاموش رہ جاتے ہیں۔ مینا۔ پُرنم آنکھوں سے ہاتھ میں پکڑے پانچ روپیہ کے نوٹ کو دیکھتی ہے جو آج اُس نے سسٹر میری سے قرض لئے تھے۔

تیسرا منظر

چراغ دھیمی لو سے جل رہا ہے۔ مینا اور نازش امی کے سرہانے بیٹھے ہیں صنم اور ارشد پاس پڑی چارپائی پر سو رہے ہیں۔ کمرے میں امی کے دھیمے دھیمے کراہنے کی آواز تھوڑی تھوڑی دیر بعد تیز ہو جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ جاتے ہیں۔

صبح ہو رہی ہے۔ مرغ کی بانگ کے ساتھ اذان کی آواز آتی ہے۔

امی... مینا۔ آہ مینا۔ تو کدھر ہے میری بچی۔

مینا (لپک کر) مما۔ میں یہاں ہوں امی۔ بولئے اب آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا امی

امی۔ (آنکھ کھولتے ہوئے) میں ٹھیک ہوں بیٹی

نازش بیٹیا۔ خدا تیری عمر دراز کرے جو ہم دکھیاروں کے کام آتے ہو۔

نازش (دکھ سے) خالہ امی۔ میں کیا آپ کے لئے غیر ہوں.... آپ نے تو مجھے اپنا بیٹا کہا ہے امی.... مگر افسوس ہے خالہ امی کہ آپ کی خاطر خواہ خدمت مجھ سے نہیں ہو پا رہی ہے... (مینا سے) وہ دوا کی شیشی تو اٹھانا

مینا۔ دوا پی لیجئے خالہ امی۔

مینا (دوا کی بوتل دیتے ہوئے) نازش۔ آج دفتر جاتے ہوئے میری چھٹی کی درخواست ہاسپٹل دیتے جانا۔

نازش۔ لاؤ دیدو۔ واپسی میں کسی ڈاکٹر کو بھی لیتا آؤں گا۔۔۔ یا ایسا کرو۔ خالہ امی کو ہاسپٹل ہی لئے چلتے ہیں تمہاری وجہ سے علاج بھی اچھا ہو جائے گا۔ اب دیر کرنا مناسب نہیں۔

مینا خاموش رہ جاتی ہے... صنم اور ارشد کو سکول بھیج کر وہ تینوں ہاسپٹل چلے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر فیاض۔ مینا کے ساتھ ایک بوڑھی عورت اور نوجوان کو دیکھ کر چونک پڑتا ہے۔

مینا جھینپی جھینپی سی امی اور نازش کا تعارف کراتی ہے فیاض کی نظریں لمحے بھر کے لئے نازش پر رک جاتی ہیں۔ چہرے پر ہلکی سی سرخی پھیل جاتی ہے.... مگر جلد ہی وہ خود کو سنبھال لیتا ہے۔

فیاض۔ مینا۔ تم نے اچھا کیا جو امی کو یہاں لے آئیں میں ابھی کمرہ ریزرو کرواتا ہوں

(گھنٹی بجا کر وارڈ بوائے کو ہدایت دیتا ہے)

مینا (جھجکتے ہوئے) سر۔ فیس کے روپئے میری تنخواہ سے.....

فیاض (تیزی سے) بیوقوفی کی باتیں نہ کرو مینا... یہ

بعد میں دیکھا جائے گا۔

فیاض کے پرخلوص رویہ سے امی بہت متاثر ہوتی ہیں مگر نازش کی بیتاب نظریں بار بار فیاض اور مینا کے چہروں پر پڑجاتی ہیں اور وہ اضطراب میں بار بار پہلو بدلتا ہے۔

چوتھا منظر

ہاسپٹل کا کمرہ۔ امی صاف ستھرے بیڈ پر لیٹی ہیں۔ اب وہ بالکل صحت یاب ہیں۔

مینا ان کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی ہے ..... فیاض ارشد اور صنم کے ساتھ اندر داخل ہوتا ہے۔ دونوں نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ خوشی ان کے چہرے سے پھوٹ رہی ہے۔ ... فیاض کے ہاتھوں میں بہت سے پیکٹ ہیں جنھیں وہ ٹیبل پر رکھتا ہے۔ مینا کھڑے ہو کر اسے متشکر نگاہوں سے دیکھتی ہے۔

صنم (خوشی سے)۔ امی۔ فیاض بھائی نے ہمارے لئے ڈھیر سارے کپڑے خریدے ہیں ... اور امی آج ہم نے آئس کریم کھائی اور سرکس بھی دیکھا ... (گال پھلا کر بندر کی ایکٹنگ کرتے ہوئے)۔

مینا (سرزنش کرتے ہوئے) صنم اب تم بچی نہیں ہو۔

فیاض۔ جانے دو مینا۔ ابھی یہ بچے ہی ہیں۔ (امی سے مخاطب ہو کر) اب کیسی طبیعت ہے آپ کی امی۔ اب تو سارا علاج مکمل ہو گیا۔ چاہیں تو گھر جا سکتی ہیں۔

امی (پرنم آنکھوں سے) بیٹا فیاض۔ تم نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا۔ اتنا تو اپنے بھی نہیں کرتے۔ خدا تمہیں اور تمہارے ماں باپ کو سلامت رکھے۔ جو تمہارے دل میں ہم غریبوں کے لئے اتنی محبت دی۔ ہم تمہارا احسان نہیں بھلا سکتے بیٹا۔

فیاض (افسردگی سے) امی میرے والدین تو جانے کب کے جنت سدھار چکے۔ آپ کو ہی اب میں نے اپنی ماں سمجھا ہے امی۔ اور ماں کے ساتھ بھلا کوئی احسان کرتا ہے۔ مجھے تو بس خدمت کا موقعہ دیجئے امی تاکہ اپنے والدین کی اور ان کی محبت سے محرومیت کی تڑپ کو تسکین دے سکوں۔

مینا چونک کر فیاض کی پرنم آنکھوں کو دیکھتی ہے اور اس کا احساس دل فیاض کے لئے ہمدردی سے بھر جاتا ہے

نازش اندر داخل ہوتا ہے

نازش۔ السلام علیکم امی

امی۔ جیتے رہو بیٹا .... ہائیں جیدا۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔ رات بھر سوئے نہیں ہو کیا۔ اتنی محنت نہ کیا کرو بیٹا .... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔

مینا افسردہ سی نازش کو تکتی ہے۔ الجھے ہوئے بال سرخ آنکھیں، ملگجا لباس اس کے پریشان دل کی غمازی کر رہے تھے۔

مینا۔ نازش۔ کیا آج دفتر نہیں جاؤ گے

نازش (اکھڑے ہوئے لہجے میں) ہاں جاؤں گا۔ کیا میرا یہاں آنا تمہیں پسند نہیں؟

مینا (حیرت سے) کیسی باتیں کرنے لگے تم نازش ... (امی کی طرف مخاطب ہو کر) ... امی میں دوا لیکر ابھی آتی ہوں .... دروازے سے باہر جاتی ہے نازش اس کا اشارہ پا کر باہر آجاتا ہے۔ کوریڈور سنسان دیکھ کر نازش مینا کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔

نازش (رنجیدہ لہجے میں) مینا، مینا۔ مجھ سے چھن تو نہیں جاؤ گی۔

مینا (حیرت سے) نازش یہ آج تمہیں ہوا کیا ہے ..

نازش (بھرائی ہوئی آواز میں) میں۔ میں کئی روز سے سو نہیں سکا ہوں، آسمان سخت ہے اور تم دور ہو مینا۔ فیاض کی نظریں جب تم پر پڑتی ہیں میں کانپ اٹھتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرے خواب ٹوٹ رہے ہوں۔

مینا بے ساختہ اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیتی ہے آئندہ ایسی فضول باتیں سوچنا بھی نہیں۔ ورنہ بولونگی

نہیں... سامنے سے ایک نرس کو آتے دیکھ دونوں سنبھل جاتے ہیں.... نازش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جاگ اٹھتی ہے۔

مینا... ایک بیکار سی بات پر حلیہ بنالیا... چلو میں ساتھ چلتی ہوں گھر۔ نہا دھو کر انسان بنو۔ پھر دفتر جانا۔

نازش (خوشی سے) او مینا۔ میری مینو۔

مینا اندر آکر امی اور فیاض سے گھر جانے کی اجازت چاہتی ہے۔ فیاض پہلو بدل کر رہ جاتا ہے۔

کچھ دیر بعد دونوں پھر واپس آتے ہیں۔ نازش اب بہتر حالت میں ہے۔ مسکراہٹ اس کے چہرے پر رقصاں ہے۔ وہ امی سے اجازت طلب کرکے دفتر چلا جاتا ہے فیاض تیکھی نظروں سے اُسے جاتے دیکھتا ہے۔

پانچواں منظر

شام ڈھل رہی ہے۔ مینا تخت پر امی کے قریب سر جھکائے بیٹھی ہے۔

امی (سمجھانے والے انداز میں) بیٹی۔ تیرے بھلے کے لئے کہتی ہوں۔ فیاض جیسا مخلص انسان ہر ایک انسان کو نہیں ملا کرتا.. یہ تو بڑے نصیب کی بات ہے مینا کہ اُس نے خود تمہارا ہاتھ مانگا ہے

مینا (بھرائی ہوئی آواز میں) مگر امی۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں میں... میں شادی نہیں کروں گی۔ ابھی تو صنم اور ارشد کی پڑھائی بھی ختم نہیں ہوئی۔

امی۔ بیٹی۔ ہمارے پاس کون سی ایسی دولت ہے کہ اونچے خواب دیکھیں۔ پیٹ بھرنے کے لئے دو روٹی مل جائے غنیمت ہے... بیٹی تو پرائی ہوتی ہے چندا۔ صنم کونسا گھر بیٹھی رہے گی.... تیری شادی ہو جائے گی تو کم از کم صنم کے لئے بھی اچھا لڑکا مل جائیگا

مینا اپنے خوابوں کے محل کو مسمار ہوتے دیکھ تڑپ اٹھتی ہے اس کی نظروں کے سامنے بار بار نازش کا افسردہ چہرہ ابھر آتا ہے.. جو اسے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اس کی ذرا سی جدائی پر بیقرار ہوا اٹھتا ہے..... امی تو سمجھتی ہیں پھر کیوں انجان بنتی ہیں۔

امی (اسے خاموش دیکھکر) تو کیا سوچ رہی ہے بیٹی.... میں سمجھتی ہوں۔ تو نازش کے لئے سوچ رہی ہے نا۔

مینا (سسک کر) امی۔ وہ۔ وہ نازش۔ کیا ہوگا اس کا امی۔ کیا اس کے احسانات کم ہیں ہمارے اوپر۔ کیا سوچے گا کہ ہم کتنے خودغرض ہیں امی....

امی (تڑپ کر) نہ رو بیٹی۔ نہ رو۔ اگر تیری مرضی ہے تو یہی سہی اتنے دن میں نے دکھ کے گذارے ہیں باقی بھی گذار لوں گی مگر مجھ سے ارشد اور صنم کا کبھی کبھی ایک لقمے کے لئے ترسنا نہیں دیکھا جاتا۔ نہیں فیاض کے گھر خوشحال دیکھکر مجھے تھوڑا سکون تو مل جاتا.... رہی نازش کی بات تو بیٹی اُس کے مستقبل کا کیا ٹھیک۔ اسکی پریشانیاں کیا کم ہیں.... ابھی تو فوزیہ کی شادی کے لئے وہ خود پریشان ہے.... مجھے تو آگے کچھ سوجھتا نہیں بیٹی.... میری زندگی کا کیا بھروسہ۔ اپنے بعد تم لوگوں کو کس کے سہارے چھوڑ دوں.... یہ سوچکر کلیجہ دہل جاتا ہے بیٹی......

مینا (رو کر) امی۔ دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔

امی (دکھ سے) بیٹی تم نا سمجھ نہیں ہوں نازش بھی سمجھدار ہے.. اپنوں کے لئے تو لوگ کتنی بڑی قربانیاں دیتے ہیں.... تمہیں اپنے بھائی بہن کا خیال نہیں آتا مینا..... خالی پیٹ تو محبت بھی بے معنیٰ ہو جاتی ہے بیٹی۔ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تو روٹی ہے بیٹیا... آج کون ہے جو روٹی کی لڑائی میں نہیں لگا ہوا ہے۔ یہی زندگی کا ذریعہ ہے۔ یہی جینے کی راہ ہے... باقی سب اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

مینا (روتے ہوئے) ٹھیک ہے امی۔ جب آپ نے سب کچھ سوچ ہی لیا ہے تو... اور وہ اندر بھاگ جاتی ہے۔ اس کے جاتے ہی فیاض اندر داخل ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر رنج و غم کی پرچھائیاں عیاں ہیں۔

امی کو سلام کرتے ہوئے وہ تخت پر بیٹھ جاتا ہے.... اس کے دل میں ایک انجانی کشمکش جاری ہے۔ مینا کی سسکیوں کی آواز رہ رہ کر گونج اٹھتی ہے اور وہ تڑپ اٹھتا ہے۔

(مضامین بکثرت آتے ہیں اسلئے نمبر آنے پر ہی ان کی اشاعت ہوتی ہے)

فیاض (بھرائے لہجے میں) امی۔ آپ مجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہیں نا۔ تو پھر میری یہ آخری خواہش بھی پوری کر دیجئے۔ دیکھئے انکار نہ کیجئے گا۔
امی۔ تم بولکر تو دیکھو بیٹا۔۔۔ خدا گواہ ہے تمہارے لئے میرے دل سے کتنی دعائیں نکلتی ہیں۔
آج کل کے زمانے میں کون ہے جو غریبوں سے ایسا سلوک کرتا ہے۔
فیاض۔۔۔ دیکھئے امی پھر دہی غربت کی باتیں۔ آپ تو میری ماں ہیں امی۔۔۔ میری التجا ہے۔ میرے ساتھ چلکر رہئے۔۔۔ اتنا بڑا گھر بڑا سونا سونا سا لگتا ہے۔۔۔ آپ ہونگیں صنم اور اختر ہوں گے تو گھر میں کیسی رونق ہو گی۔۔۔ اور پھر۔ میں چاہتا ہوں کہ مینا کی ڈولی میرے ہی گھر سے رخصت ہو۔۔۔۔۔۔
امی (حیرت سے) یہ۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو فیاض بیٹے۔۔۔ مینا تو ۔۔۔۔۔۔
فیاض۔ ہاں امی۔ میری دلی آرزو ہے کہ مینا نازش کی دلہن بنے۔ آپ نازش کے گھر والوں سے ملکر جلدی ہی تاریخ طے کر لیں۔
امی (حیرت اور افسوس سے) میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔
فیاض (کرب سے) آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں امی۔۔۔ انتظام میں کروں گا۔ آخر بھائی کا بھی تو کچھ حق ہوتا ہے۔۔۔۔ اور یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔ (وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے)۔
امی (دکھی لہجے میں)۔ اچھا بیٹا۔ جو تمہاری مرضی۔۔۔۔

چھٹا منظر

شہنائیوں کی گونج میں مینا دلہن بنی دھیرے دھیرے باہر آتی ہے۔۔۔ فیاض نازش کے قریب کھڑا ہے۔۔۔ نازش کے چہرے پر دلی خوشیاں رقصاں ہیں۔۔۔ فیاض کی آنکھوں میں اشک ہیں لیکن وہ بڑے صبر و تحمل سے نازش کو گلے لگا کر مبارکباد دیتا ہے۔
مینا لمحہ بھر کے لئے نظریں اٹھا کر اس عظمت و ایثار کے پیکر کو دیکھتی ہے اور فیاض کے قدموں میں جھک جاتی ہے۔ فیاض اُسے سہارا دیکر اٹھانا چاہتا ہے تو وہ بے اختیار اس کے شانے سے لگ کر سسکنے لگتی ہے۔۔۔ شہنائیوں کی غم انگیز دھن اور تیز ہو جاتی ہے۔۔۔ فیاض اُسے سہارا دیکر پھر ہلکے سے گاڑی میں بٹھا دیتا ہے۔۔۔ نازش مینا کے پہلو میں آ بیٹھتا ہے۔ اور کار تیزی سے گزر جاتی ہے۔۔۔۔۔ فیاض کی ویران نظریں دور تک کار کے تعاقب میں چلی جاتی ہیں اور وہ بڑی دیر تک راہ کے غبار کو تکتا رہتا ہے

ختم شد

(مضامین اور افسانے پسند آنے پر ہی شائع کئے جاتے ہیں)

افسانہ

رُوماپا

ڈاکٹر اشرف جہاں ترنم (ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ٹیچر)

ان کا نام "روما نہ نسرین" تھا لیکن ہم سبھی انھیں روما نہ آپا کہنے کے بجائے "روماپا" کہتے تھے۔ مجھے ان سے ملنے کی بے حد خواہش تھی۔ بچپن میں کسی کی شادی کے موقعہ پر انھیں دیکھا تھا۔ لیکن اس دھندلی سی یاد کے سہارے کوئی تصویر نہیں بنتی تھی۔ وہ ہماری قریبی رشتہ دار تو تھیں نہیں اس لئے ان سے ملاقات شادی بیاہ کے موقعہ پر ہی ممکن تھی اور جب میری بڑی بہن عزت باجی کی شادی طے پائی تو یہ خواہش وقت کے ساتھ شدت اختیار کر چکی تھی۔ ایسا شاید اس لئے بھی تھا کہ روماپا کے چرچے برابر گھر میں ہوتے رہتے تھے۔ کیونکہ وہ ہمارے گھر کی پہلی لڑکی تھیں جنہیں شادی کے بعد فوراً طلاق پڑ گئی۔ طلاق کی وجہ لوگ ان کی شخصیت میں تلاش کرتے۔ اور طرح طرح کے نتائج نکالے جاتے۔ اور خاص کر عورتوں کی فطرت تجسس کی اس معاملہ میں زیادہ اُجاگر ہوتی ہے۔ کچھ عورتیں ان کی اعلیٰ تعلیم کو ہی اس حادثے کا اہم پہلو قرار دیتیں کیونکہ وہ میرے خاندان کی پہلی لڑکی تھیں جنھوں نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری لی تھی لیکن زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ ان کی سانولی رنگت ہی ان کی ساری محرومی کا سبب تھی۔

اور ایک شام گھر کے چھوٹے بڑے سبھی دوڑ پڑے "جمیلہ آگئیں، جمیلہ آپا آگئیں" "جمیلہ خالہ آگئیں"۔ میرا دل زور وں سے دھڑکنے لگا نہ جانے کیوں۔ میں نے چاہا کہ دوڑ کر جمیلہ خالہ سے پوچھوں کہ "روماپا" آئیں لیکن میں تو جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ جب وہ لوگ آنگن میں پہنچیں تو گھر کی عورتیں بھیگی ہوئی آنکھوں سے انھیں خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ دفعتاً امی کی آواز پر دل کی دھڑکن اور بھی تیز ہو گئی۔ وہ اپنے گلے سے لگی ہوئی لڑکی کو الگ کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں "بیٹھو روما نہ بیٹی" نام سنتے ہی میری نظریں ان کی جانب اٹھ گئیں۔ تو یہ ہیں روماپا۔ برسات کی شفق شام کی طرح پرکشش سانولی سانولی معصوم سی صورت عنابی ہونٹ پیچ دار زلفیں۔ چھوٹی سی ستواں ناک اور ان کی آنکھیں نہ جانے کتنی مسحور کن تھیں۔

اس وقت وہ سفید ساڑی باندھے تھیں ساڑی کے ٹیڑھے میڑھے موڑ پر ان کے جسم کا ہر خم بے حد خوبصورت تھا۔ شادی کے ہنگامے میں میں نے کئی بار چاہا کہ ان سے باتیں کروں لیکن ان کی شخصیت کے سامنے میری زبان نہیں کھلتی تھی۔ وہ بھی بہت خاموش طبیعت تھیں۔ شادی کی محفل جب برخاست ہوئی تو روماپا بھی جا چکی تھیں۔ پھر زندگی اپنے معمول پر آ گئی لیکن مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا۔ جیسے زندگی میں کسی چیز کی کمی ہو گئی ہو۔

دوسری بار جب روماپا سے ملاقات ہوئی تو پانچ سال کے بعد۔ اس عرصہ میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ بھیا کی شادی ہو چکی تھی۔ چھوٹی بہنیں بھی بیاہی جا چکی تھیں۔ میں ایم۔ ایس سی کے فائنل میں تھا جمیلہ خالہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ "روماپا" کو ہمارے شہر میں لیڈی ڈاکٹر کی جگہ مل گئی تھی۔

روماپا اسپتال سے ملے ہوئے کوارٹر میں آئی تھیں اور اپنی آمد کے متعلق ہمیں کچھ نہیں بتایا تھا۔

ایک دن میں جیسے ہی کالج سے گھر آیا اچانک میری ملاقات روماپا سے ہو گئی۔ روماپا کو یوں اچانک دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا۔

"شاہد تم نے سلام بھی نہیں کیا" امی نے مجھے ٹوکا۔

شاید پہچانا نہیں، بھول گئے" روماپا نے کہا۔

"بھول گئے" مجھے روماپا کے الفاظ چبھتے ہوئے معلوم ہوئے ایک دن کیا جسے ایک لمحہ بھی فراموش نہیں کیا اسے کیسے نہیں پہچانوں گا؟ لیکن میں کچھ کہہ نہ سکا بس جلدی جلدی میں نے کسی طرح انھیں سلام کیا۔

روماپا میرے شہر میں آکر میرے اور بھی قریب آگئیں میں اکثر ان سے ملنے ان کے کوارٹر چلا جاتا۔ روماپا تو بہت کم باتیں کرتیں اکثر جمیلہ خالہ باتیں کرتی رہتیں۔ اور میں روماپا کو دیکھتا رہتا ان کی آنکھوں میں پھیلی ہوئی دور تک ویرانی ہی ویرانی تھی۔ میرا دل چاہتا کہ روماپا کی

اُداس پھیلی ہوئی آنکھوں میں خوشیوں کی لہراتی ہوئی موجیں دیکھوں
ان کے لبوں کی مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی دیکھوں۔ لیکن
میری تمنا صرف میرے قصیدوں کی آرزو بن سکتی تھی۔۔۔ اور بس۔۔۔۔

ایک شام میں روما آپا سے ملنے گیا تو ان کا کمرہ کھلا ہوا تھا جمیلہ
خالہ برآمدہ میں کسی کام میں منہمک تھیں۔ میں نے آہستہ سے چوروں
کی طرح جھانک کر دیکھا۔ روما آپا سہری پر اوندھی لیٹی ہوئی تھیں۔
ان کا سارا وجود ہل رہا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور آہستہ
سے پکارا "روما آپا۔۔۔۔"

"اندر آجاؤ" چند لمحے بعد روما آپا کی آواز آئی۔

"روما آپا شاید دیر تک روتی رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی
تھیں۔ اور چہرہ جذبات کی تمازت سے دمک رہا تھا۔ پلکیں اب بھی
بھیگی ہوئی تھیں۔

ان کے آنسوؤں نے میرے اندر اتنی جرأت پیدا کر دی کہ میں
نہایت کرب سے بول پڑا۔

"روما آپا" تم اپنے درد کا علاج کیوں نہیں کرتیں۔۔۔"

انھوں نے میری طرف بڑی تعجب بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اور
ہمیشہ کی طرح ان کی نگاہوں کی تاب نہ لاکر میں بوکھلا گیا۔ تب وہ
ہلکے سے مسکرائیں۔

"روح کے درد کا علاج کیا ہو سکتا ہے؟"

"پیار" میں نے بے ساختہ کہا اور پھر فوراً اس لفظ پر میں شرما گیا۔

"پیار" لیکن ہاں۔۔۔۔ اور پھر ایک تلخ مسکراہٹ ان کے
ہونٹوں پر پھیل گئی۔

اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ بہت پرانی ہیں۔ تمہارے سب
پیپرس اچھے گئے "نا" وہ اب نارمل ہو گئی تھیں اور بڑے پُروقار
انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

دل تو چاہا کہہ دوں روما آپا یوں نہ چھپاؤ اپنے کرب کو یوں
پردہ نہ ڈالو۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں تمہارے چہرے کی حسرتوں
کے سارے نقش مٹا دینا چاہتا ہوں لیکن۔۔۔ لیکن میں
کچھ نہ کہہ سکا ان کی شخصیت کے سامنے میری گویائی سلب
ہو جاتی تھی۔

پھر جمیلہ خالہ آگئیں۔ اور برابر کی طرح ادھر ادھر کی باتوں
کے بعد روما آپا کے ہاتھ کی بنی پکوڑیاں کھا کر لوٹ آیا۔

اور پھر ایک عرصہ بعد مجھے جب لکچرار کی جگہ مل گئی تو امی جان
میری شادی کے لئے بضد ہو گئیں۔

میں نے پہلے روما آپا سے پوچھ لینا ہی مناسب سمجھا

"روما آپا انسان کسی چیز کی خواہش کرے اور وہ اس کی دسترس
سے بلند ہو تو وہ کیا کرے ۔۔؟"

"کوشش" اور نہیں تو کبھی کبھی خواہش کی نا تکمیلیت ہی
انسانی وجود کے تکمیل کا باعث بن جاتی ہے ۔۔۔"

انھوں نے نہایت سلجھے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر ان کی نگاہیں
مجھے وہ سب کچھ بولتی ہوئی معلوم ہوئیں ۔۔ جو کچھ نہ وہ کہہ سکیں اور نہ
میں پوچھ سکا۔

میں نے سوچا۔ روما آپا کا مقدس وجود پرستش کے لئے ہے
چھونے اور پانے کی خواہش ہی بے سود ہے ۔۔ زندگی کو اس کی
راہ پر بہنے دینا ہی چاہئے۔ امی کی خواہش کے سامنے میں مجبور ہو گیا

اپنی شادی کی خوشی میں بہنوں کے کپڑے کے ساتھ میں نے
روما آپا کے لئے بھی ایک سرخ ساٹن خرید لی۔ "بڑے چاؤ سے
ارمان سے میں اسے پہنوں گی"۔۔۔ میرے تحفے کو انھوں نے دیکھ کر
کہا۔

"میری خوشی میں شریک نہیں ہوں گی روما آپا" میں نے التجا سے
کہا۔

"لیکن یہ سرخ رنگ۔۔۔۔" اور پھر میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ ہانپنے
لگیں جیسے کوسوں دوڑ کر آئی ہوں۔ ان کے بالائی ہونٹ پر پسینے
کی بوندیں ابھر آئیں۔

میں کچھ نہ کہہ سکا۔۔۔۔۔۔۔

آرسی مصحف کے وقت جب بہن کی حیثیت سے روما آپا نے میرے
سر پر آنچل ڈالا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ سرخ ساڑی تھی۔ آئینہ میں
میری شریک حیات شبنم کے چہرے کی ایک جھلک نظر آئی لیکن فوراً
ہی روما آپا کا سرخ آنچل میں لپٹا ہوا چہرہ ابھرا اور پھر وہ سرخ آنچل
میرے ہوش و حواس پر چھاتا چلا گیا۔۔۔

آج جب میرے ناول "سرخ آنچل" کو بیسٹسلر ایوارڈ ملا تو

مجھے رو رہا یا کی آواز ہر سمت گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔
"خواہش کی ناتکمیلیت ہی انسانی وجود کی تکمیل ہے۔"

نسیم انہونوی
کا وہ ناول جو تقریباً دس سال
سے نایاب تھا۔ اب اس کا
نیا اڈیشن
شائع ہو گیا ہے

ارمان

ایک نہایت جذباتی سچی کہانی جو خود مصنف کو بے حد پسند ہے۔
یہ ایک ایسے ارمان کی کہانی ہے جسے وہ محبت کرنے والے ہی جانتے تھے دنیا والوں کو ان کے ارمانوں کی خبر نہ تھی۔ ان کے ارمان کبھی نکل نہ سکے، اس لئے کہ انھوں نے اپنی پاکیزہ محبت کا اظہار نہیں کیا۔ حالات نے بھی انھیں اس کے لئے مجبور کیا۔
ایک ایسا دلچسپ سبق آموز اور اصلاحی ناول جسے پڑھ کر آپ برسوں بھول نہ سکیں گے۔
قیمت مجلد۔ بارہ روپیہ

خانہ دار بیگم

ہر ماں اور بہو کے لئے بہترین کتاب۔ قیمت دو روپیہ پچاس پیسے

سلمیٰ کنول کا شاہکار ناول

عندلیب

جو ایک عرصہ سے نایاب تھا اب زیر طبع ہے۔ اپنے آرڈر بک کرا دیں تاکہ چھپتے ہی آپ کو بھجوا دیا جائے۔

شعاع	نادرہ خاتون	-/25
آبرو	حمیدہ جبیں	-/15
رستہ جگنا	دیبا خانم	-/15

لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ

اس گرانی کے زمانے میں غریب لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بڑا ہی دشوار ہو گیا ہے۔ شادیاں شادیوں ہی کی طرح ہوتی ہیں۔ لچکے ٹھپے سے کپڑوں کو جگمگانے اور بھڑکانے والی چیزیں بھی اتنی گراں ہو گئی ہیں کہ ان کا خریدنا آسان نہیں رہا۔ ایک دوپٹہ کے لئے معمولی سا لچکا بھی لیا جائے تو بیس پچیس روپیہ سے کم میں نہ آئے گا۔
پتلی سی کرن بھی آنچل لگائیے تو بیس روپیہ میں آئے گی۔ شادیوں کے دسیوں جوڑوں کے لئے یہ سب لیا جائے تو سینکڑوں روپیہ صرف ہو جاتا ہے پھر شادی بیاہ پر ہی منحصر نہیں خواتین اور لڑکیاں عام دنوں میں لچکے لگے دوپٹے استعمال کرتی ہیں۔ سورتی بیلیں اور چھاپا ٹکلی وغیرہ۔ ٹکاکر دوپٹے اور ساریاں پہنتی ہیں۔
ان مشکلات کا حل سائنسدانوں نے یوں نکالا ہے کہ اسٹیل کا سامان تیار کر دیا اور ایسا کہ چاندی سے زیادہ دلکش اور بھڑکیلا یہ بھی نہیں کہ استعمال سے کالا پڑ جائے یا خراب ہو جائے اور دام نسبتاً بہت ہی کم۔ نائلون کے ستارے ستھرے ستاروں کو ماند کرتے ہیں۔ یہ اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ ایک تولہ میں لاتعداد چڑھتے ہیں ان کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اس طرح کا تمام سامان آپکو

درشنول آتما رام اینڈ سن گوٹے والے

راج کمل ہوٹل بلڈنگ امین آباد لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔
مال وی پی سے منگائیں یا خود تشریف لاکر ملاحظہ فرمائیں۔
(فون نمبر: ۴۳۴۶۶)

افسانہ

اکیلا
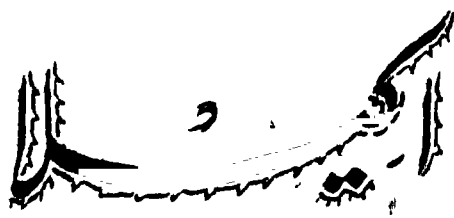
رضیہ بٹ

وہ سردیوں کی یخ بستہ سی اندھیری رات تھی۔ بوجھل ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے درختوں کے سوکھے پتے جھڑ کر ہواؤں کے ریلے سے ادھر اُدھر جا رہے تھے۔ جب کوئی زور کا ریلا آتا تو سائیں سائیں کی آوازیں سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ میں مل کر کسی بین کا تاثر چھوڑ جاتیں۔ ماحول میں ویران سناٹوں کی گونج محسوس ہوتی۔ اور اداسی کٹار کی طرح روح کے اندر بڑے مبہم طریق سے اترنے لگی۔

وہ اپنے پلنگ پر رضائی میں دبکا پڑا تھا۔ نظام دین کے اوپر کمبل بھی ڈال دیا تھا جاتا تھا۔ بوڑھے جسم کو اس شدید ترین سردی سے بچانے کیلئے ایک رضائی ناکافی ہے۔ آتش دان میں موٹی موٹی لکڑیاں جل کر راکھ زدہ انگاروں میں بدل چکی تھیں۔ غسلخانے کی بتی روشن تھی اور ادھ کھلے دروازے سے روشنی کی موٹی سی لکیر کمرے کی تاریکی کو معتدل بنا رہی تھی۔ نظام دودھ کا گلاس بھی پلنگ کے قریب پڑی چھوٹی سی میز پر رکھ گیا تھا۔ لیکن اس نے دودھ پیا نہیں تھا۔ نظام کی ساری ہمدردانہ توجہ کے باوجود وہ اپنے اکیلے پن کے احساس پر قابو نہ پا رہا تھا۔ اس کو اپنا آپ سردیوں کی اس یخ بستہ رات کی طرح لگ رہا تھا۔ جو اندھیری تھی۔ بوجھل ہواؤں کے جھکڑ اور سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اسے اپنے اندر محسوس ہو رہی تھی۔

وہ کتنا اکیلا تھا۔

تنہائی خاردار جھاڑیوں کی طرح اس کے اندر اگ رہی تھی۔ پھیل رہی تھی۔ بڑھ رہی تھی۔ گھبرا کر اس نے کروٹ بدلی۔ رضائی میں لپٹا سر باہر نکالا۔ ہوا کے دباؤ سے کواڑ بار بار بج رہے تھے۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا اور اس کے برابر کا پلنگ خالی پڑا تھا۔

یہ پلنگ مریم کا تھا۔

مریم ——— جس کے ساتھ اس نے زندگی کے چالیس طویل سال بڑے بھرپور انداز میں گذارے تھے۔ اور جس کی زندگی میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ مر کر اس کا من یوں خالی کر جائے گی۔

اس نے حسرت بھری نگاہوں سے اس پلنگ کو ٹٹولا۔ یہ پلنگ خالی تھا لیکن اس خالی پلنگ سے کتنی بھری بھری یادیں وابستہ تھیں اس نے لاشعوری طور پر ہاتھ رضائی سے نکالا۔ اور مریم کے خالی بستر پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔

اس بستر پر یادوں کے انبار تھے۔ ایک ایک سلوٹ یادوں کا ڈھیر تھی۔ یہ بستر چالیس برسوں سے اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ کمرے بدلے تھے ترتیب بدلی تھی۔ لیکن یہ بستر اس کے ساتھ ہی رہا تھا۔ یہ بستر اس کی چھوٹی سی دنیا تھی ——— یہ دنیا ——— کس خوبصورتی سے آباد ہوئی تھی۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں اس کا آبادی کا تصور آج بھی جوان تھا۔ مچھلی کی طرح پھسلتی ۔ چکنی مٹی کی نرم نرم مورت ۔ صندلی رنگت اور سیاہ چمکیلی آنکھیں ——— مریم جب اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ تو اس نے اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان جانا تھا وہ

(شکایت لکھنے پر بھی حریم نہ ملے تو دوبارہ خط لکھیں اکثر شکایتی خط بھی وصول نہیں ہوتے)

حریم لکھنؤ

اس کی زندگی میں بہار کی دلکشی اور رنگینی بن کر داخل ہوئی تھی۔ وہ دن کتنے جاندار تھے۔ رفاقتوں چاہتوں سے بھرپور دن۔ رنگ رنگ کے خوشیوں کے سوتے ابلتے تھے سینے میں میٹھے میٹھے درد کا احساس ہمہ وقت رہتا تھا۔ چند دنوں کیلئے بھی وہ میکے چلی جاتی تو زندگی خالی خالی محسوس ہوتی۔

لیکن ـــ گھبرا کر اس نے کروٹ بدلی۔ ایک گہرا ٹھنڈا سانس لیا۔ باہر جھکڑ آندھی کا روپ دھار رہے تھے۔ سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ بڑھ رہی تھی۔ اور شاں شاں کی آوازیں شدت اختیار کر رہی تھیں۔

اس نے سوچا۔ جب کی خالی خالی زندگی اب کی خالی خالی زندگی سے کتنی مختلف تھی۔ اس خالی پن میں ملن کی [illegible] زندہ ہوتا تھا۔ اور اس خالی پن میں کرب و اذیت کے سوا کچھ نہیں۔

آنکھیں بند کئے چپ چاپ پڑا وہ لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ مریم کی زندگی کے آخری تین سالوں کا کرب اس کی ڈوبتی ابھرتی سانسوں میں بھرنے لگا۔ مفلوجی کے تین سال اس نے اس بستر پر گزارے تھے۔ ان دنوں وہ گم صم رہتی تھی۔ ہائے ہائے کے سوا بہت کم الفاظ اس کے ہونٹوں پر آتے تھے (اپنے آپ سے بیزار محتاج مریم بیکار سی شے تھی جو اس بستر پر پڑی رہتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ خود بھی اس بیکار سی شے سے اکتا جاتا تھا۔ لیکن بیکار شے ہونے کے باوجود بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے وجود کا اپنا ہی مقام تھا۔ تنہائی کا دکھ اور اکیلے پن کا کرب اس کے ہوتے ہوئے تو کبھی نہ جھیلا تھا۔

اس نے اپنے ناتواں وجود کو بڑی شعوری کوشش سے اٹھایا ـــ پلنگ کے چوبی تکئے سے سرہانہ ٹکا کر پشت اس سے لگاتے ہوئے رضائی سینے تک کر لی۔

آج نیند نہیں آ رہی تھی۔ جھکڑوں کے شور اسے اپنے اندر محسوس ہو رہے تھے۔ مریم کو مرے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ اس کے چاروں بچے چالیسویں کے بعد گئے تھے۔

ان کے ہوتے ہوئے مریم کی کمی اور اکیلے پن کا احساس اتنی شدت سے نہ جاگا تھا۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی مع آل اولاد کے حویلی میں مقیم تھے۔ ہر وقت مریم ہی کی باتیں ہوتی تھیں۔ بیٹے دلگیر تھے۔ بہوئیں آنسو بہا رہی تھیں۔ اور بیٹی تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔ بچے بھی دادی اور نانی اماں کی شفقت یاد کرتے تھے۔ تو اسے مریم کے بچھڑنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ سب اس کے دکھ کے شریک تھے غم مشترک تھا۔ جدائی میں سب کی سانجھ تھی۔ پھر بھلا اسے اکیلے پن کا اتنی شدت سے احساس کیونکر ہوتا۔

اور ـــ اس کے پانچوں بچوں کو اس کا کتنا احساس تھا۔ وہ اسے یوں بہلاتے تھے جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہے۔ کتنے ہی دن اس کے بیٹے اس کمرے میں اس کے ساتھ سوتے رہے تھے۔ جب تک اسے نیند نہ آ جاتی۔ وہ ماں کی باتیں کرتے رہتے۔ بہوئیں بھی اس کا بہت خیال رکھنے لگی تھیں۔ گھر میں تین تین نوکروں کی موجودگی میں اس کام کا اپنے ہاتھوں سے کرتیں۔ کوئی اس کے کپڑے تہہ کر رہی ہے۔ کوئی حقہ تازہ کر رہی ہے۔ کوئی کھانے میں پسند کا پوچھ رہی ہے۔

اور اس کی بیٹی ـــ کتنے دکھ سے روتی تھی۔ باپ کے گلے لگ لگ کر ـــ چالیسویں کے بعد جب وہ اپنے گھر جانے لگی تھی تو پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اور اسے ایک گونا سا اطمینان مل رہا تھا۔ کہ مریم کا غم سہنے میں اکیلا نہیں ـــ اس کے بچے اس غم کو بانٹ رہے ہیں ـــ یوں غم کا بوجھ کتنا ہلکا ہو گیا تھا۔

میں اکیلا نہیں ہوں ـــ میں اکیلا نہیں ہوں،، اس نے سر کو ادھر ادھر ہلکے ہلکے جھٹکے دیتے ہوئے مستحکم آواز میں کہا۔ میرے بیٹے میری بیٹی۔ میرے ساتھ پوتے پوتیاں میرا داماد ـــ سالم نبی اور گلو ـــ ان سب کے ہوتے ہوئے میں اکیلا نہیں ہوں ـــ یہ سب میرے اور مریم کے وجود کے حصے ہیں۔ اداسی کی وجہ صرف یہی ہے۔ کہ میں ان سب میں بٹ کر بکھر گیا ہوں۔ میں ان سب کو اکٹھا

کروں گا۔ اپنے وجود اپنے جسم اور اپنی شخصیت کے ان ٹکڑوں کو اکٹھا کروں گا۔ ان کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنا حماقت ہی ہے۔ مریم ان سب کے وجود وں میں زندہ ہے"

خیالات کے اس پلٹے پر اس نے اپنی روح میں تازگی اترتی محسوس کی۔ سوچ کا انداز بدل جانے سے اُسے سکون مل گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے پلنگ میں نیچے ہوتا گیا اس کی آنکھوں میں نیند اترتی گئی۔

اور پھر وہ جھکڑوں۔ سوکھے پتوں اور شاخوں کی آوازوں سے بے خبر ہو کر سو گیا۔

ان کے ہوتے ہوئے دکھ کا احساس اتنا شدید نہیں تھا۔ مریم کی موت نے تو ان سب کو اس کے بہت قریب کر دیا تھا تین بیٹے ایک بیٹی اور ان کے چودہ پندرہ بچے۔ حویلی میں گہما گہمی تھی۔ اور پھر سب اس کا خیال بھی کتنا رکھتے تھے۔ سہارا دیکر کمرے سے باہر لاتے۔ بیٹھنے کے لئے لپک کر کرسی پیش کرتے۔ کھانے کا خیال رکھتے۔ دل بہلانے کا سامان کرتے۔ بعض اوقات تو اُسے یوں لگتا جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہے جو شفقت مادری سے محروم ہو گیا ہے اور سب اس شفقت کا مداوا کر رہے ہیں۔

اس کا جی چاہا کہ سب پھر یہاں اکٹھے ہو جائیں۔ مریم کے ہونے اور نہ ہونے کی باتیں کریں۔ اس کے اندر خار دار جھاڑیوں کی طرح پھیلنے والی تنہائی کو کاٹ پھینکیں۔ اس کی اداسی کو دور کریں۔ اس کی ذات میں پورے خلوص سے جھانکیں۔

وہ جانتا تھا کہ اس کے بیٹے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود کتنے سعادتمند ہیں۔ ہر بیٹے نے اسے اپنے ساتھ لیجانے کی خواہش کس شدت سے کی تھی۔ لیکن وہ اپنا نشیمن چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ بھرا پرا گھر تھا۔ اس کی ذاتی چیزیں تھیں۔ بہوؤں کے فالتو سامان سے کمرے بھرے پڑے تھے۔ سب کو نوکروں کے حوالے کیسے کر سکتا تھا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ۔ اس کے گھر کے در و دیوار اپنے تھے۔ فضا اپنی تھی ماحول اپنا تھا۔ یہاں اس نے زندگی کے کتنے بھرپور دن گذارے ہے۔ وہ بیٹوں کے ساتھ نہیں گیا تھا۔

لیکن یادوں سے لپٹ لپٹ کر کئی ماہ گذار کر اس کے اندر سونے پن سے ویرانی ہونے لگی تھی۔ کاش مریم نہ مرتی۔ یا وہ ہی اس کا ساتھ دے سکتا۔ مریم کے ساتھ دکھ سکھ کے ایام کہیں آسودگی سے گذارے تھے۔

اپنا ناتواں سا سوکھا ہوا ہاتھ اس نے اپنے جھریوں زدہ چہرے پر پھیرا۔ چند دھیانی ہوئی آنکھوں کے گوشے گیلے ہو رہے تھے۔ بڑھاپے کا اندوہناک احساس اسے اندر ہی اندر دہلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں برسوں پہلے کا اپنا وجود لہرا گیا۔ تنومند جوان اور آرزوؤں سے بھرپور خوبصورت وجود۔ موہنی سی مریم۔ خوبصورت بچے۔ اور مصروف زندگی۔ اور اب۔ وہ خوفزدہ سا ہو گیا۔ مریم کی بیماری کے آخری تین سالوں میں اس کی جو ہیئت تبدیل کی تھی۔ سب اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔

اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ قدرت کی حسین ترین تخلیق کا اتنا بدصورت انجام۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کئی لمحے یونہی پڑا رہا پھر اس نے فیصلہ کیا۔ کہ وہ اپنے سب بچوں کو بلا بھیجے گا۔ حویلی میں سب اکٹھے ہوں گے۔ رونق چہل پہل اور گہما گہمی ہو گی۔ اس کے بچے اس کی تنہائی کا کرب بانٹ لیں گے۔ وہ تنہا نہیں رہے گا۔ سب! سب! اس کے پاس ہوں گے۔ وہ پریشان اسی لئے ہے۔ کہ اپنوں سے کٹ گیا ہے۔ کئی ماہ سے کٹا ہوا ہے۔ اس کے مونس و غمگسار بچے آجائیں گے تو اکیلے پن کی ویرانی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ وہ اتنا پیار دیں گے کہ بڑھاپے کی بدصورتی اور تنہائی کا احساس حرف کی طرح مٹ جائے گا۔

سوچوں کے اس انداز نے اُسے سکون بخشا۔ اور وہ بستر میں سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ جلد ہی نیند نے آلیا۔

صبح اس نے پہلا کام اپنے بیٹوں اور بیٹی کو خط لکھنے کا کیا۔ عید قریب آرہی ہے۔ اس نے سب کو یہ عید حویلی میں منانے کا تاکیداً لکھا۔ پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں کو اصرار سے بلایا۔

گہما گہمی کے تصور ہی سے اُسے سکون ملا۔ وہ اب ان سب کی آمد پر حویلی میں رچ بس جانے والی رونق ہی کا سوچتا رہتا۔ اس کے بچے

اُسے پیار کرتے تھے۔ عزت و احترام کرتے تھے۔ اس کے دکھ میں ساجھی تھے۔ اس کے غم کے شریک تھے

ہفتہ بھر پہلے اس نے حویلی کی صفائی کروائی۔ کمرے ٹھیک کروائے۔ ضرورت کی چیزیں ان کمروں میں رکھوائیں۔ بڑی بہو ہمیشہ اوپر والے کمرے میں ٹھہرا کرتی تھی۔ منجھلی پیچھے والے بیرونی کمرے میں۔ اور چھوٹی بائیں کے کمرے میں۔ اس کی اپنی خوابگاہ کے دائیں ہاتھ والے بڑے کمرے میں قیام کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے بھی سب کچھ کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بچے کسی کمی کو محسوس کریں۔

ان دنوں مریم اسے بے طرح یاد آئی۔ اپنا آپ کھوکھلا کھوکھلا لگا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے تصویر کائنات میں رنگ محض مریم ہی کے دم سے تھا اپنی بھرپور زندگی کے چالیس سالوں کے کئی عکس اس کے ذہن میں لہرالہرا گئے۔ ہر آن ہر لمحہ اسے یہی محسوس ہوا۔ کہ مریم کی رفاقت سے ٹوٹ کر وہ اس بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا ہے۔

لیکن ـــــــ اس نے بڑی سختی سے ہر اس آن اور اس لمحہ کو کچل دیا اتنے بھرے پُرے کنبے میں اپنے آپ کو اکیلا کہنے اکیلا سمجھنے کی حماقت اب وہ کبھی نہیں کرے گا۔

عید سے دو دن پہلے سبھی آن پہونچے کوئی صبح کی گاڑی سے آیا۔ اور کوئی دوپہر کی ـ ـ ـ ـ ۔ بڑا بیٹا نو بجے کے فلائیٹ سے پہونچا۔ اور بیٹی اپنی گاڑی میں شام کو آگئی۔ حویلی میں جیسے بہار آگئی۔ چھوٹے بڑے چودہ پندرہ بچے۔ بیٹی بیٹے بہوئیں اور داماد رونقیں آباد ہوگئیں۔ بیٹے تپاک سے ملے بہوئیں احترام سے پیش آئیں۔ بیٹی گلے لگ کر سسکی ـــ بچے دادا ابا اور نانا ابا پکارتے ہوئے لپٹ گئے۔

خوشی اور مسرت کی لہریں اُسے اپنے وجود میں اٹھتی محسوس ہوئیں۔ ان انبساطی لمحوں نے اس کے سونے سونے من میں اکیلے پن کے جاگتے احساس کو یکسر ختم کر دیا۔ مریم کی بھی کتنی ہی باتیں ہوئیں۔ بیٹوں کی سرد آہیں اور بیٹی کے بہتے آنسوؤں نے ماں کی یاد کو تازہ کر دیا۔

لیکن جلد ہی موضوع بدل گیا۔ سب بہن بھائی ایک عرصے کے بعد اکٹھے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا جانے لگا۔

اور پھر ـــــــ احوال پرسی کا سلسلہ کچھ اس طرح چلا کہ سب ایک دوسرے میں کھو گئے۔ اسے یوں نظر انداز کر دیا گیا۔ جیسے وہ وہاں ہو ہی نہیں۔ اسے اپنے اندر ہی اندر دکھ قطرہ قطرہ ٹپکتا محسوس ہوا۔ لیکن اس نے اپنے اس دکھ پر قابو پا لیا۔ اس سب باتوں میں خود بھی حصہ لینے لگا۔ کسی بات پر ہنس پڑا۔ کسی کی پشت پر تھپکا دیا۔ کسی کو ٹوکا کسی کو پیار سے دو بول کہے وہ سب آپس ہی میں لگے رہے۔ گلے شکوے باتیں ہنسی مذاق سبھی کچھ ہوا۔

پھر اس کی بہوئیں اپنے اپنے کمروں میں سامان وغیرہ ترتیب سے لگانے چلی گئیں۔ بچے کمروں اور صحن میں بکھر گئے۔ بیٹی اور داماد بازار چلے گئے دونوں بیٹے اپنے دوستوں سے ملنے چل دیئے۔ اور بڑا بیٹا اخبار لے کر وہیں قالین پر لیٹ گیا۔

اور وہ اٹھ کر برآمدے میں آگیا۔ اس نے بیٹے سے دو ایک باتیں کی تھیں۔ وہ اخبار پڑھنے میں مگن تھا۔ ہوں ہاں کے سوا کچھ نہیں کہا۔

تنہائی کی کاٹ کاٹنے کو اس نے بچوں کو پکارا۔ چھوٹے بچے تو کھیل میں مصروف تھے متوجہ نہ ہوئے۔ گلو اس کے پاس آگیا۔ اور سپنی گلو کے بلانے پر آگئی ـــــــ وہ ان سے ان کی پڑھائی اور سکول کی باتیں کرنے لگا۔

"کون سی کلاس میں پڑھتے ہو۔"

"سکول کیسا ہے"

"کیا بننے کا ارادہ ہے۔"

دونوں بڑی سعادتمندی سے جواب دیتے رہے۔ وہ انہیں دل لگا کر پڑھنے کی تلقین کرنے لگا۔ نصیحتوں کو بوریت سمجھتے ہوئے گلو اور سپنی نیچی نیچی نگاہوں سے ایک دوسرے کو اشارے کرتے ہوئے مسکرانے لگا۔ وہ جان چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کی بوڑھی جہاندیدہ نظروں نے ناتجربہ کار بچکانہ نظروں کی عیاری بھانپ لی۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ "جاؤ بچو۔ اپنے

اپنے کمرے ٹھیک کر لو جا کر ـــــ"

"بہت اچھا دادا ابا" کہتے ہوئے دونوں برابر والے کمرے میں گھس گئے۔

".. کوئی بات نہیں بچے ہی تو ہیں ـــ" اس نے اپنے من سے اٹھنے والی تنہائی کی گونج کو دبانے کی کوشش کی ـــ

رات کھانے کے کمرے میں بڑی گھما گھمی تھی۔ میز پر سب تو پورے نہ آسکتے تھے۔ کوئی کھڑا تھا کوئی بیٹھا۔ کسی نے مونڈھا گھسیٹ لیا تھا۔ کوئی سائڈ ٹیبل پر چڑھ بیٹھا تھا۔ ہنسیوں قہقہوں کی کھنکھناہٹ پلیٹوں چمچوں کی آوازوں میں مدغم ہو رہی تھی۔

"بڑے دنوں سے اکٹھا ہونے کو جی چاہ رہا تھا"

"خدا کی خود میرا دل بھی چاہتا تھا"

"ابا جی نہ بلاتے تو میں خود سب کو گھر آنے کا لکھنے کا سوچ رہا تھا"

"سال میں دو بار ایسا اجتماع ضرور ہونا چاہئے ـــ"

"اور کیا ـــ یہ نہ ہوا۔ تو سب ایک دوسرے سے کٹ جائیں گے"

"آئندہ پروگرام ہی ایسا بنایا کریں گے۔ آگے پیچھے چھٹیاں لینے سے لطف نہیں آئے گا۔ ایک ایک ہفتے کی چھٹی کی بجائے مہینہ مہینہ چھٹی لینی چاہئے بھئی ـ.."

"وہ آئندہ بھی"

"بہت ضروری ہے ـــ"

"ہاں تو ـــ ورنہ ہمارے بچے ایک دوسرے سے اجنبی ہو جائیں گے ـــ"

"بالکل بالکل ـــ اسی لئے تو کہتا ہوں ـــ سال میں کم از کم دو دفعہ سب اکٹھے ہوا کریں ـــ"

کھانے کے دوران ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ سب کی باتوں سے متفق ہو کر اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ ہاں اس کا دل چاہتا رہا کہ سب یہ بھی کہیں۔ کہ ابا جی کی خاطر سب سال میں دو بار اکٹھا ہوا کریں گے۔

رات بھی بڑے کمرے میں جمع تھے۔ ایک کونے میں ٹی وی پڑا تھا بچے [illegible] انہماک سے پروگرام دیکھ رہے تھے۔ اس کی بہوئیں اور بیٹی ٹی وی سے بے نیاز اپنی ہی باتوں میں گم تھیں۔ دبے دبے قہقہے تھے۔ دل چسپ سرگوشیاں تھیں۔ راز و نیاز کی باتیں تھیں۔ دونوں بیٹے گاؤ تکیوں کے سہارے اپنی ملازمتوں اور رکی ہوئی ترقیوں کی باتیں کر رہے تھے۔ بڑا بیٹا اور داماد ماحول سے بے نیاز ملکی سیاست پر بحث کر رہے تھے

اسے کوئی اپنے کمرے میں بیٹھنے کے لئے بلانے بھی نہ آیا۔ یوں جیسے وہ بڑی ہی غیر اہم شے ہے۔ اس کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوئی ہو۔ وہ خود ہی اٹھ کر چلا گیا۔ قطرہ قطرہ ٹپکنے والے دکھ کو پہلے سے روکنے کا یہی طریقہ تھا۔

"آئیے ابا جی ـــ ہم سمجھے آپ سو گئے" بڑے بیٹے نے گاؤ تکیے پر ٹھیک سے تکیہ رکھتے ہوئے ان کے لئے جگہ بنائی۔ بہوئیں اور بیٹی چند لمحے چپ ہو گئیں۔

"آپ آرام ہی کرتے تو اچھا تھا" بڑی بہو نے عقیدت سے کہا۔

"ہاں ابا جی۔ صبح سے آپ چل پھر رہے ہیں۔ تھک گئے ہوں گے" بیٹی نے کہا۔

"ٹی وی بند کر دوں" چھوٹا بیٹا بولا۔

"نہیں نہیں" بچوں نے دادا ابا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شور مچا دیا۔

"دیکھو بھئی دیکھو" وہ بڑے بیٹے کے قریب گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گیا۔ دو چار منٹ سب اس کی طرف متوجہ رہے۔ سرسری سی گفتگو ـــ اور پھر سب اپنی اپنی باتوں میں کھو گئے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا رہا کبھی ٹی وی پر نگاہ ڈالی کبھی اپنے گرد و پیش۔

"مومی" اکتا کر اس نے آٹھ سالہ پوتی کو پکارا۔

"جی دادا ابا" وہ الٹی لیٹی اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ کوئی بڑا جاذب نظر اشتہار تھا۔

وہ چند لمحے کچھ نہیں بولا۔ پھر اس نے شوکی کا بازو پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

"ٹھہرئیے نا دادا ابا ـــ" اس نے بازو سختی سے چھڑا لیا۔ شوکی شوق سے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

اکیلے پن (?) سے کسی کو بھی اپنے پاس بلانا چاہا ـــ وہ کسمسا کر ٹی وی میں گم ہو رہا۔ چھوٹے چھوٹے دو تین بچوں کو دھیرے دھیرے ڈانٹا بھی ـــ لیکن ان پر اثر نہ ہوا۔

وہ تکیے کے سہارے خاموش بیٹھا اپنے اندر ہوتی ٹوٹ پھوٹ

سے گھر اتار رہا۔

پھر

شاید

اسے اونگھ آگئی۔

"ابا جی — پلنگ پر چل کر سوئیے" بیٹے نے اس کا کندھا ہلایا۔

"چلیے، میں چھوڑ آؤں" بیٹی بولی۔

"تھکان سے طبیعت خراب نہ ہو جائے" دوسرا بیٹا بولا۔

"یہاں شور بھی تو بہت ہو رہا ہے —" بہو نے کہا۔

"اٹھیے — جائیے" وقفوں کے بعد اس کے کانوں میں یہی الفاظ اتر رہے تھے۔ ان الفاظ میں احترام کی ملائمت تھی۔

وہ نہیں اٹھا۔ "کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں" کہتے ہوئے وہ اپنے کرب کو چھپا رہا — وہ تو ان سب سے گھل مل کر باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنی تنہائیوں کو مٹانا چاہتا تھا۔ اداسیوں کو نوچ پھینکنا چاہتا تھا — آسودگی — ذہنی آسودگی کا خواہاں تھا۔

لیکن کوئی اس کے اندر نہیں جھانک رہا تھا۔

اور جب کئی بار سب کے کہنے کے باوجود بھی وہ نہ اٹھا۔ تو اس نے لہجے کا فرق صاف طور پر محسوس کیا۔ "اب اٹھیے سو جائیے جاکر" کہنے میں احترام کی ملائمت کی جگہ غیر محسوس سا کھنچاؤ بھی تھا۔ وہ کھنچاؤ جو کسی ضدی بچے کو ایک ہی بات بار بار کہنے سے اپنے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔

وہ چپکے سے اٹھا اور اپنے کمرے میں آگیا —

جب وہ بستر میں لیٹا تو انتہائی بے چین تھا۔

آج جھکڑ چل رہے تھے۔ نہ سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ تھی۔ کواڑ بھی نہیں بج رہے تھے۔ اور سناں سناں کرتی آوازیں بھی نہ تھیں۔ بڑے کمرے سے بہوؤں بیٹی اور بیٹوں کے چھپانے ہنسنے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ کسی من پسند پروگرام پر بچے کھلکھلا کر ہنس بھی رہے تھے شور و غل مچا رہے تھے۔ تالیاں بھی بج رہی تھیں۔

لیکن

ان سب باتوں کے باوجود — گہما گہمی اور رونق کے باوجود تنہائی کا احساس اسے ڈس رہا تھا۔ بھری محفل میں بھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ اداسی کی کٹار اس کے اندر اتر رہی تھی۔ سناٹے گونج رہے تھے۔ اور اکیلے پن کا کرب پوری کی وحشت سے اسے نگل رہا تھا۔

مریم کے خالی بستر پر اپنا ناتواں ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بڑے درد سے سسک اٹھا —

"مریم — میں کتنا اکیلا ہوں — کتنا اکیلا"

(بقیہ بزم حریم صفحہ ۲۹ پر)

انا للہ وانا الیہ راجعون) مرحوم پابند صوم و صلوٰۃ تھے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مقام قرب اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• شوبر فاطمہ (اناؤ) انتہائی رنج و غم کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ ہر علی ملکیہ میرے بہنوئی نذیر احمد صدیقی جو میرے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے کراچی میں ہارٹ فیل ہو گیا۔ مرحوم اپنے بچوں سے جدا ہو کر اپنے اعزا سے ملنے کراچی گئے تھے۔ ادارہ حریم اور حریمی بہنوں سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

(بقیہ پسندیدہ اشعار صفحہ ۲۲ کے)

رہ حیات میں کوئی مقام پا نہ سکے
جو لوگ اپنے پرائے کے کام آ نہ سکے

مرسلہ۔ انجم نورانی۔ آگرہ

سنگیں حادثوں پہ بھی ہنستی رہی حیات
پتھر پر ایک گلاب ہمیشہ کھلا رہا

مرسلہ۔ زرینہ حبیب (بستی)

حوصلے پست نہ ہوں ولولے پژمردہ نہ ہوں
وقت کے سانچے میں ڈھل کر ہی نکھرتی ہے حیات

مرسلہ۔ قمر لطیف۔ نگار سلطانہ جلیلی (آنبور)

تلخابۂ حیات کا احساس ہے مجھے
غم میں مٹھاس درد میں لذت کیا کروں

مرسلہ۔ فریدہ حسن تاز دیو گھر سنتھال پرگنہ

یہ کیا کہ حیات جاودانی کیا ہے
پہلے دیکھو جہان فانی کیا ہے

مرسلہ۔ رشیدہ خاتون بیگو سرائے

غم دئیے ہیں حیات نے ہم کو
ہم سے غم نے حیات پائی ہے
ہر ٹانے مرے قدم جو سے
تیرے غم کی بھی کیا رسائی ہے

مرسلہ۔ جمیلہ ادیب عظیمی

افسانچہ

نئی راہ

عالیہ نشاط (بہرائچ)

نیلم نے سہیل کی جھڑکی سنی تو جامے سے باہر ہو گئی۔ بات کوئی ایسی نہ تھی کہ وہ اس طرح چراغ پا ہوتی۔ دن بھر کا تھکا ماندہ شوہر جب آفس سے آتا ہے تو اس کی تمنا ہوتی ہے کہ بیوی مسکرا کر اس کا خیر مقدم کرے اور چائے لا کر سامنے رکھدے، نیلم اپنی چند ترقی پسند سہیلیوں کے ساتھ قہقہے لگا رہی تھی۔ کھانے کی میز پر بہت سی چیزیں پلیٹوں میں تھوڑی بہت نظر آ رہی تھیں۔ نیلم نے اپنی سہیلیوں کو چھوڑ کر شوہر کا خیر مقدم کرنے میں کچھ سبکی محسوس کی۔ سہیل اپنے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کرنے لگا۔ قہقہے اب بھی اس کے کانوں میں گویا زہر گھول رہے تھے۔ وہ ان بڑاکی لڑکیوں کو اچھی نظر سے نہ دیکھتا تھا اور نہ ہی یہ بات اسے پسند تھی کہ نیلم ان کی صحبت میں گھل مل کر رہے۔

کئی منٹ گذر گئے سہیل آرام کرسی پر لیٹ کر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اس کی عادت تھی کہ دفتر سے آتے ہی وہ کافی لیا کرتا تھا۔ ہر آزاد خیالی کے باوجود نیلم اتنا خیال ضرور رکھتی تھی کہ سہیل کے آتے ہی کافی لا کر اس کے سامنے رکھدے۔

یہ پہلا ہی موقع تھا کہ نیلم کی یہ بیباک اور آزاد خیال سہیلیاں اس گھر آئی تھیں، اس سے پہلے خود نیلم ہی ان سے جا کر ملا کرتی تھی اور ان سے اپنی خاطر مدارات کرایا کرتی تھی۔ شاید جواباً آج اس نے ان سب کو اپنے گھر بلایا تھا۔ اور اس کے لئے سہیل سے اس نے اجازت لینے کا خیال تک نہ کیا تھا۔

سہیل کے آتے ہی اس کی بعض شوخ و شنگ سہیلیوں نے کہا بھی کہ اپنے ہزبینڈ سے ہمیں ملاؤ گی نہیں۔ نیلم نے یہ کہکر ٹال دیا کہ وہ دفتر سے تھکے ماندے آتے ہیں تو ان کا موڈ آف رہتا ہے۔ پھر کسی روز نہیں ملاؤں گی۔

تھوڑی دیر بعد سب رخصت ہو گئیں تو نیلم سہیل کے پاس آئی "آج کافی تمہیں نہ مل سکے گی۔ دودھ ختم ہو گیا۔ اچانک ہی ان سب نے دھاوا بول دیا۔ اب اخلاق کا تقاضہ یہی تھا کہ ان کی خاطر مدارات کرتی۔

سہیل جلا بھنا تو بیٹھا ہی تھا، یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا کہ آج اسے کافی بھی نہ ملے گی۔ غصّے سے غضبناک ہو کر کہا نیلم تم میری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں ایسی لوکھریوں سے تمہارا ملنا جلنا پسند نہیں کرتا۔ کسی بھی شریف لڑکی یا عورت کو ایسی سوسائٹی گرلس سے نہ ملنا چاہئے۔ اب تک میں نے ڈھیل دے کر غلطی کی، لیکن اب بات میری برداشت سے باہر ہو گئی ہے اور مجھے تمہارے ساتھ سختی کرنا ہو گی۔

نیلم نے سہیل کے منہ سے کبھی ایسی باتیں نہ سنی تھیں، ناگن کی طرح بل کھا کر بولی۔ تو آپ آج عام شوہروں کی طرح مجھ پر دھونس ڈال رہے ہیں۔ لیکن کان کھول کر سن لیجئے کہ میں آپ کی نصف بہتر ہوں، کنیز نہیں۔ کیا آپ نے کوئی جاہل عورت سمجھ لیا ہے جو شوہروں کے عزے ڈبے سنتی اور برداشت کرتی رہتی ہے۔ میں تعلیم یافتہ ہوں اور چاہوں تو آج ملازمت کر کے تم سے زیادہ تنخواہ پا سکتی ہوں۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ تم میری آزادی میں روڑا بنو۔ علم نے ہم پر واضح کر دیا ہے کہ مرد و عورت دونوں آزاد ہیں۔ میں تمہاری خواہشات پر اپنی خوشیوں کو قربان نہیں کر سکتی۔ اب تک میں نے کبھی تم سے کچھ نہیں کہا۔ بس سنتی ہی رہی، لیکن اب یہ مجھ سے نہیں سن سکتی۔ اگر ایسا ہی تھا تو کوئی دیہات کی ان پڑھ لڑکی بیاہ لائے ہوتے، ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی سے تم ایسی توقع کرو کہ وہ تمہارے گھر میں قید رہ کر ایک پرندہ کی طرح زندگی گذارے تو یہ ممکن نہیں۔ میں روشن خیال عورت

ہوں، سوسائٹی کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ کاش میں نے پہلے ہی سوچ لیا ہوتا کہ تم بھی آخر مرد ہی ہو اور مرد کی فطرت کبھی بدل نہیں سکتی۔ کس کس طرح تم نے اظہارِ محبت کیا تھا، کیسے کیسے وعدے کیے تھے کہ کبھی مجھ پر شک نہ کرو گے، کبھی مجھ سے قید و بند میں نہ رکھو گے۔ میں آزاد ہو کر تمہاری جیون ساتھی بنوں گی۔۔۔ لیکن شادی کے چار ہی سال بعد تم نے وہ کینچلی اتار دی جو مجھے پھنسانے کے لیے چڑھا رکھی تھی۔ میں عرصے سے محسوس کر رہی تھی کہ تمہیں میری آزادی کھٹکتی ہے اور تم اسے پسند نہیں کرتے کہ میں ان شریف لڑکیوں سے ملوں، جو میری عزت کرتی ہیں اور میرا دل بہلاتی ہیں۔

سہیل حیران تھا کہ نیلم کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ اس طرح اس نے کبھی اس سے بات نہ کی تھی۔ جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے اس نے نرم لہجے میں کہا "نیلم! تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ میں جو کچھ کہتا ہوں تمہارے بھلے کے لئے کہتا ہوں اور دراصل اگر تم سوچو تو یہ میری محبت ہی ہے کہ میں تمہارا کسی تمہاری ہم جنس سے ملنا بھی گوارا نہیں کر پاتا۔ ذرا سوچو تو کہ تم اب ایک بچے کی ماں ہو۔ کیا سلیم سے بھی زیادہ تمہیں کوئی پیارا ہو سکتا ہے۔ اب تو تمہیں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اس کو دینا چاہیئے۔ ماشاء اللہ تین سال کا ہو گیا ہے۔ اس عمر میں ماں کی نگرانی ایک بچے کے لئے اشد ضروری ہوتی ہے۔ مانا کہ تم نے ایک آیا رکھ چھوڑی ہے، لیکن کیا ایک آیا کسی بچے کو ماں کی محبت دے سکتی ہے۔ کیا وہ ماں کی جگہ لے سکتی ہے۔ جو پیار سلیم کے لئے تمہارے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ تم اسے اپنا دودھ نہیں پلاتیں، خیر نہ پلاؤ، لیکن تمہاری محبت اور تمہاری شفقت تو اسے ملنا ہی چاہیئے، اس سے تمہارے حسن و جوانی میں بھی کوئی فرق پیدا نہیں ہو سکتا۔ ماں کا تو خون بڑھتا ہے جب اس کا بچہ اس کی آغوش میں ہمکتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس کی بھی پروا نہیں کرتیں۔ سیر و تفریح کو جاتی ہو تو اسے لے جاتے بھی شرماتی ہو۔ کیا بچہ ہو جانا کوئی گناہ ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بات فخر و [illegible] ہے۔ عورت کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب وہ کسی بچے کی ماں بن جاتی ہے۔ تم تو اسے فخر کے ساتھ اپنی آغوش میں لے کر جا سکتی ہو اور ان عورتوں کو شرما سکتی ہو جن کی گودیں اولاد سے خالی ہیں۔ مجھے نہ چاہو، لیکن بچے کو ایک ماں کے پیار سے محروم نہ کرو۔
نیلم نے سب کچھ سن کر کہا۔ اس لیکچر کی کیا ضرورت تھی۔ میں سب کچھ جانتی ہوں مجھے پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ میں ماں ہوں لیکن ماڈرن ماں، وہ ماں نہیں جو ہر وقت بچے کا منہ اپنی چھاتیوں سے لگائے رکھتی ہے۔ ہر محبت اپنی اپنی جگہ رکھتی ہے۔ میں تم سے بھی محبت کرتی ہوں اور سلیم سے بھی لیکن تم دونوں کی محبت کے لئے میں اپنی صحت و تندرستی برباد نہیں کر سکتی، اپنا دل نہیں مار سکتی۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ گھٹ گھٹ کر جاہل عورتوں کی طرح جینے کا نہیں۔

ہکا بکا سہیل بیوی کی باتیں سنتا رہا۔ پھر کچھ کہنا اس نے عبث سمجھا۔ وہ سمجھ گیا کہ جو نشہ نیلم پر سوار ہے اس کا اترنا آسان نہیں۔ اور اس روز سے اس نے اس طرح کی باتیں کہنا چھوڑ دیں۔

کسی فنکشن میں ایک ڈرامہ تھا۔ نیلم کو ہیروئن کا کردار دیا گیا تھا دس پندرہ روز سے وہ ریہرسل کر رہی تھی اور بے حد خوش تھی کہ وہ ایک ایسا رول ادا کرے گی کہ تماشائی تالیاں بجاتے بجاتے تھک جائیں گے۔ اس پروگرام کی خبر اس نے سہیل کو بھی نہ دی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس بات کو پسند نہ کرے گا۔ اور جس روز یہ ڈرامہ ہونا تھا سلیم کو اچانک بخار آ گیا۔ سہیل دفتر گیا ہوا تھا۔ نیلم نے سلیم کے بخار کی چنداں پروا نہ کی۔ مٹیاسن سیرپ دے کر ماما کو تاکید کر گئی کہ وہ اچھی طرح سلیم کی دیکھ بھال کرتی رہے۔ اور خود فنکشن میں چلی گئی جہاں وہ آج گویا ملکہ بنی ہوئی تھی۔ واقعی اس کا حسن تھا بھی ایسا ہی کہ جو رول اسے دیا گیا تھا اسے بکمال ادا کر سکے۔

شام کو سہیل گھر میں داخل ہوا تو ماما نے گھبرا کر کہا صاحب بھیا کو تو بہت تیز بخار ہے۔ دیکھئے اس کا بدن آگ کی طرح جل رہا ہے۔

سلیم کو گود میں لیتے ہوئے سہیل نے پوچھا نیلم کہاں ہیں۔ بچے کا جسم گرم توے کی طرح جل رہا تھا۔ سہیل گھبرا گیا جلدی سے اس نے تھرمامیٹر لگا کر دیکھا۔ بخار ۱۰۲ ڈگری سے بھی زائد تھا۔ بچے کو آیا کے سپرد کر کے وہ باہر گیا اور ایک دوکان سے فون کر کے ڈاکٹر کو بلایا۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر آیا۔ معائنہ کرنے کے بعد اس نے کہا، اسے ڈبل نمونیہ ہو گیا ہے۔ اب تک آپ کیا کرتا رہا۔ انجکشن لگا کر ڈاکٹر نے دوائیں لکھیں۔ اور واپس چلا گیا۔ نیلم کا اب تک پتہ نہ تھا۔
کہاں کو کہہ کر گئی ہے وہ۔ سہیل نے آیا سے پوچھا۔
سرکار ہم سے بتا کر نہیں گئیں۔ بخار تو اسے اس وقت بھی تھا جب میم صاحب جا رہی تھیں۔ وہ دوا بھی دے گئی تھیں [illegible] تھا کہ

میں رات میں دیر سے آؤں گی تم اچھی طرح اس کی دیکھ بھال رکھنا۔

سہیل دونوں ہاتھ ملنے لگا۔ سلیم بے سدھ پڑا تھا۔ آئس کیپ رکھکر وہ اپنے لخت جگر کی آنکھیں کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ کبھی کبھی وقت آہستہ سے سلیم ممی۔ ممی کہتا اور بے ہوش ہو جاتا۔ شام کے قریب اس نے پھر ڈاکٹر کو بلایا ڈاکٹر نے دیکھا اور خاموش رہا۔ ایک انجکشن اور لگا کر چلا گیا۔ حالت دمبدم خراب ہوتی گئی۔ سہیل کی بے چینی ایسی تھی جسے بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بخار بتھا کر بچے کو بھسم کئے دے رہا تھا۔ ممی۔ ممی کی آواز نقاہت کے ساتھ بار بار نکل رہی تھی مگر سلیم کا سہیل کو کوئی پتہ نہ تھا۔ ایسی حالت میں وہ سلیم کو چھوڑ کر کہیں جا بھی تو نہ سکتا تھا۔ آئس کیپ اس کے سر پر رکھے وہ دعائیں پڑھ رہا تھا منتیں مانگ رہا تھا، لیکن کچھ بھی کارگر نہ ہو رہا تھا۔ خدا کو شاید یہی منظور تھا کہ پھول جیسا پیارا سلیم مرجھا جائے۔ حلق سے پانی اترنا بھی بند ہو گیا تھا، اس کی ساری تدبیریں رائیگاں گئیں اور اسی کے سامنے سلیم نے دم توڑ دیا۔ سہیل کا تو جو حال ہوا وہ ہوا، خود ڈاکٹر کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک پڑے —— صبر کی تلقین کر کے ڈاکٹر جانے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ نیلم پھول کی طرح کھلی ہوئی، ایک شاندار کپ لئے اندر داخل ہوئی۔ یہ کپ اسے بہترین اداکاری کے انعام میں دیا گیا تھا۔ وہ یہ سوچتی ہوئی آئی تھی کہ سہیل سے فخریہ اپنی کامیابی کا ذکر کرے گی لیکن ڈاکٹر کو نکلتے اور سہیل کو پچھاڑیں کھاتے دیکھکر اس کی تمام خوشیاں کافور کی طرح اڑ گئیں۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آسکا کہ معاملہ کیا ہے لیکن جب بھاگتی ہوئی وہ سہیل کے قریب پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اس کا لخت جگر بے جان پڑا ہوا ہے اور سہیل پلنگ کی پٹی پر اپنا سر پٹخ پٹخ کر اپنے کو گھائل کر رہا ہے۔ کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور وہ خود تڑپ کر اپنے بچے سے لپٹ گئی۔ سلیم مرنہ چکا ہوتا تو شاید سہیل نیلم کا گلا گھونٹ دیتا، لیکن اب ایسا کرنے سے بھی سلیم زندہ ہو سکتا تھا۔ فیشن زدہ ہی، لیکن نیلم ماں ہی تھی مامتا پورے جوش و خروش سے ابھر رہی تھی اور وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر بیٹے مرے ہوئے سلیم کا منھ چوم رہی تھی اس سے لپٹی جا رہی تھی اور عالم دیوانگی میں نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔

سلیم کی موت ایک ایسا تازیانہ تھا جس نے نیلم کی ساری گمراہی دور کر دی تھی اور اب وہ ایک دوسری ہی نیلم بن گئی تھی جو پہلی نیلم سے

بالکل مختلف تھی۔ سادہ مزاج۔ پابند صوم و صلوٰۃ اور فیشن، آزادی کی دنیا سے دور بہت دور رہ کر اس نے ایک نئی راہ اختیار کر لی تھی۔

بقیہ :- بزم حریم۔ صفحہ ۲۱ کا

نہایت نیک سیرت اور نیک و پرہیزگار انسان تھے۔

—— نسیم انہونوی

- مسز ناز فریدی مراد آباد۔ میری بھتیجی ۲۱ فروری ۱۹۸۹ء بروز بدھ بوقت صبح ۲ بجکر ۵ منٹ پر ایک سال ۹ ماہ کی ہوکر اپنے مالک حقیقی سے جا ملی۔ بچی کی ماں تین ماہ پہلے ہی اس سے رخصت ہوکر ابدی نیند سو چکی تھی اللہ پاک دونوں کی مغفرت کرے۔ اور ہم سب کو صبر جمیل عطا کرے۔
- شاہین بانو (امراؤتی) افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے بڑے بہنوئی عبدالحکیم خاں صاحب ٹیکنیشن کا انتقال اکولہ میں ۲ اپریل بروز جمعرات کے ۹ بجے ہو گیا۔ سنیچر کے روز بعد عصر فورٹ وارڈ میں سپرد خاک کئے گئے مرحوم کے چار لڑکیاں اور دو لڑکے ایک بیوہ یادگار ہیں اللہ انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کی مغفرت کرے۔
- رضیہ سلطانہ حجرہ مرو ڈ مجھے یہ لکھتے ہوئے بڑا دکھ و غم ہو رہا ہے کہ میرے والد صاحب سید مظہر الحق العیدروس سجادہ نشین کا ۵ مئی بروز سنیچر سہ پہر کو انتقال ہو گیا۔ اور ہم سب بچوں کو خون کے آنسو روتے چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ حریمی بہنوں سے التماس ہے کہ آپ سب بہنیں دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ انھیں جنت فردوس میں اعلیٰ جگہ عطا فرمائے اور ہمیں صبر جمیل دے۔ آمین
- بہن مسرت صاحبہ سرودہ سے تحریر فرماتی ہیں کہ ۹ مارچ ۱۹۸۹ء کو ہماری جوان بہن نے ہمارے سروں پر غم کا پہاڑ گرا دیا پروردگار عالم مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرماتے ہوئے مرحومہ کی اولاد کی نگہبانی فرمائے۔
- بشریٰ جبین (کلکتہ) میرے دادا جان الحاج ہاشمی الدین صاحب (نام صحیح پڑھا نہ جا سکا) مورخہ ۶ اپریل ۱۹۸۹ء بعمر ۸۰ سال حرکت قلب بند ہو جانے سے وفات پا گئے۔

(بقیہ صفحہ ۳۶ پر)

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک خبر ہماہ شائع ہوسکتی ہے بشرطیکہ خبر ولادت، شادی یا انتقال کے متعلق ہو۔ کم سے کم الفاظ میں صاف صاف لکھی گئی ہو۔ اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ و نمبر خریداری کے ساتھ روانہ کی گئی ہو۔ ۱۰ تاریخ کے بعد وصول ہونے والی خبریں ایک ماہ تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔ خبر کی اشاعت میں کوئی غلطی ہوجائے تو دفتر حریم ذمہ دار نہیں ہوسکتا۔ البتہ اطلاع ملنے پر اس کی صحت کا اعلان کیا جاسکتا ہے۔

ـــــــ (ادارہ)

ولادت اطفال

- مہر النساء صاحبہ (ہنسور) سے تحریر فرماتی ہیں کہ میرے بڑے بھائی محمد صفی اللہ و بھابی شاہدہ نور فاطمہ کے گلشن حیات میں بروز جمعرات بتاریخ ۱۹ راپریل ۹۰ء پہلی بار ایک کلی مسکرائی۔ نام ماجرہ فہیم رکھا گیا ہے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اس کلی کو ہمیشہ شاداب رکھے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- نکہت سلطانہ محل یار بہار شریف۔ میرے بڑے بھائی جان شمیم الدین اور بھابی جان شگفتہ کے گلشن حیات میں پہلی مارچ بروز اتوار ۶ بجے صبح اللہ پاک نے ایک پھول کھلایا ہم سب لوگوں کی دعا ہے کہ بچہ کو حیات خضری اور اقبال سکندری عطا ہو اور نومولود ماں باپ کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- ناهید نگار کلکتہ میری چھوٹی کرکا (جو لندن میں مقیم ہیں) کو اللہ تعالیٰ نے بیٹی کے بعد ۱۶ رمارچ ۹۰ء یوم جمعہ ۱۱ بجے دن کو ایک بیٹا عطا فرمایا۔ نام مرثر جمال رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولود اپنے والدین و عزیزوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- حور لقا گورکھپور۔ میری چھوٹی بہن اور بہنوئی جمال احمد کا نور کے گلشن حیات میں ۶ رمارچ ۹۰ء بروز منگل بوقت ۱۱ بجے دن پہلی بار خدا کے فضل و کرم سے ایک حسین کلی کھلی ہے۔ اللہ پاک سے دعا ہے مولود نیک و صالح اور طویل العمر و اقبال مند ہو۔
- اے۔ آر (گنی) جتوار پور۔ میری نند چھوٹی و چھوٹے صاحب کے گلشن حیات میں دوسری بار ۱۴ دسمبر ۸۹ء بروز منگل بوقت نو بجے صبح اللہ پاک نے ایک کلی کھلائی پیارا کا نام چندا رکھا گیا پروردگار نومولود کو والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔
- مس شہناز عراقی۔ ناظر الیاس۔ کلکتہ۔ میرے پیارے بھائی خلیق الزماں عراقی اور سویٹی بھابی کوثر خلیق کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے ۲۴ راپریل ۹۰ء بروز منگل ۱۲ بجکر ۳ منٹ پر ایک پھول کھلایا خدا سے میری دعا ہے کہ نومولود عمر خضر پائے اور اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- رفعت دردانہ (موتی پور) میری عزیز سہیلی مسز ستارہ جبیں کے گلشن حیات میں پہلی بار ۳۰ راپریل کو ایک ننھی کلی مسکرائی اللہ پاک عمر دراز کرے اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔ آمین۔
- امتہ الحسیب اعجاز (میسور) میرے پیارے بھائی جان عبد الحفیظ صاحب ایم۔ ایس۔ سی۔ لکچرار جے ایس ایس کالج چامراج نگر اور بھابی صاحبہ امتہ الرفیع۔ بی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ایڈ کے گلشن حیات میں ایک حسین شگوفہ ۲ راپریل ۹۰ء کو صبح ۱۱ بجے کھلا۔ نام کامران حفیظ رکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ مولود کی زندگی کامرانیوں اور شادمانیوں میں گذرے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔ آمین۔
- نگار سلطانہ جلیلی (آمبور) میری دلنواز باجی زبیدہ یاسمین بی۔ ایس۔ بی ایڈ اور بہنوئی ڈاکٹر سید مظہر اللہ خاں کے گلشن حیات میں ۸ راپریل ۹۰ء بروز اتوار بوقت سوا تین بجے رات کو ایک پھول کھلا نام سمیع اللہ عرف پرویز قرار پایا۔ اللہ پاک نومولود کو قوم و ملت کے آکاش کا آفتاب بنکر جگمگائے۔ آمین
- نفیسہ کوثر قادری (موتی پور) میری باجی سعدہ جبیں اور محمود بھیا کے گلشن حیات میں اللہ تعالیٰ نے پہلی بار ۳ اپریل ۹۰ء وقت صبح ۹ بجے ایک پیاری سی کلی کھلائی۔ نام "فرخندہ محمود" عرف کلثوم قرار پایا۔ اللہ تعالیٰ اسے عروج بخشے اور نصیبہ بلند کرے۔ آمین
- زبیدہ بتول، شائستہ فاطمہ (آمبور) میری عزیز ترین سہیلی اور کلاس فیلو عشیرہ کہ دین اور بھائی جان

نثار احمد ایم۔کام کے گلشن حیات کو پربہار بناتے ہوئے بروز چہارشنبہ بتاریخ ۲۸ مارچ ۱۹۷۹ء ایک شگفتہ پھول نے کھل کر میری سہیلی کو پہلی بار "امی" بننے کا شرف بخشا۔ نام رویدہ صنوبر قرار پایا۔ بارگاہ الہٰی میں ملتجی ہوں کہ یہ پھول خزاؤں سے محفوظ رہ کر سدا بہار بنا رہے اور فخرِ خاندان بنے۔

پیغامات نشاط

- میرے مرحوم دوست یوسف محمد باریکہ صاحب لندن کی صاحبزادی مسز عائشہ داؤد باریکہ کے فرزند اعظم سلمہ کی شادی خانہ آبادی نسیم سلمہا کے ساتھ ۴ر مئی ۱۹۷۹ء کو بمقام کراچی بحسن وخوبی انجام پائی۔ اعظم سلمہ کو بچپن ہی سے مرحوم یوسف محمد باریکہ صاحب کی ہمشیرہ امینہ احمد صاحبہ نے لے لیا تھا اور اپنی اولاد کی طرح پالا، اس لیے میں خصوصیت سے بہن امینہ احمد صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اللہ پاک اعظم اور نسیم کی جوڑی کو تاحیات شاد و خرم رکھے۔ (نسیم انہونوی)
- فرحانہ تبسم (ہنسور) میری سہیلی حبیب النساء عرف درشہوار ابنت قاضی محمد لیٰسین صاحب کی شادی مرزا نبی بیگ عرف مختار کے ساتھ ۱۱ر مارچ ۱۹۷۹ء بروز اتوار بوقت ۱۱ بجے دن بخیر و خوبی انجام پائی، اللہ پاک اس جوڑی کو سلامت رکھے۔
- اسماء جمال۔ (اجرہ بی بی (کلکتہ) ہماری سہیلی شگفتہ شاہین کی شادی پرویز عالم کے ساتھ ۲۵ر مارچ ۱۹۷۹ء بمقام سالگریٹ لین دہلی کلب میں بخیر و خوبی انجام پائی اللہ پاک جوڑی کو سدا شاد و خرم رکھے۔
- بی عظمت ترنم (آمبور) میری باجی احمدی ناز (دختر جناب درسلا محمد باشا صاحب نور اللہ قدسرہٗ) کی شادی۔ ایس۔ ایم حاجی محمد عظمت اللہ (فرزند جناب ایس حاجی موسیٰ میاں صاحب) کے ساتھ ۱۳ر مئی ۱۹۷۹ء کی صبح ساڑھے گیارہ بجے بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک دولھا دلہن کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔
- مس طاہرہ بیگم (بنگلور) میری خالہ زاد بہن محمودہ خانم دختر جناب ٹی ایس ابراہیم خاں صاحب مرحوم کی شادی خانہ آبادی میرے خالہ زاد بھائی اسلم احمد ابن الاسلام ایڈ ایڈیا کے ساتھ ۱۸ر فروری ۱۹۷۹ء کو بمقام ٹمکور بحسن و خوبی انجام پائی خدا دونوں کی ازدواجی زندگی کو پرمسرت بنائے۔
- ہمارے دفتری خانہ کے کارکن حبیب علی سلمہ ابن نواب علی صاحب مرحوم کی شادی روشن جہاں سلمہا بنت شہامت خاں اورنگ آباد سیتاپور کے ساتھ بتاریخ ۸ر مئی ۱۹۷۹ء بخیر و خوبی انجام پائی پروردگار عالم دولھا دلہن کو یہ شادی ہر طرح مبارک و مسعود فرمائے۔
——— نسیم انہونوی
- رفعت صفی مظفرپور۔ میری عزیز سہیلی شہناز شاہین، بی۔ اے۔ (بنت نثار احمد اسکر صاحب وکیل مظفرپور) کی شادی آفتاب عالم مائننگ انجینئر، رانی گنج کے ساتھ ۱۰ر ۱۱ر مئی بروز جمعرات جمعہ ۱۹۷۹ء انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ آمین۔

انتقال پُرملال کی خبریں

- میرے والد مرحوم کے سب سے بڑے بھائی سید سخاوت علی صاحب مرحوم (انہونہ) کی اکلوتی صاحبزادی زینب سلمہا کے شوہر سلیم میاں کا ۲۹ر ۳۰ر اپریل ۱۹۷۹ء کی درمیانی شب میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کئی ماہ سے کینسر میں مبتلا تھے، عرصے تک جے۔ کے اسپتال کانپور میں زیرعلاج رہے لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ تکالیف جھیل کر آخر راہیٔ ملک عدم ہوگئے۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔
- ۲۶ر اپریل ۱۹۷۹ء کو لکھنؤ کے ممتاز ایڈوکیٹ سید اصغر حسین صاحب کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی شخصیت لکھنؤ میں نمایاں تھی۔ متعدد تعلیمی سماجی اور دینی اداروں کو مرحوم سے ہمیشہ تعلق رہا۔ اور فیض پہنچا۔ شہر کی ہر بڑی تقریب میں مرحوم ضرور نظر آتے تھے۔ نہایت منکسرالمزاج اور ہمدرد ملت تھے۔ اللہ مغفرت کرے اور مرحوم کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔
- بمبئی کے مشہور عطر ساز فرم حافظ محمد ذکریا برادرس کے جناب محمد ہارون صاحب (پدر جناب معروف صاحب) ۱۰ر اپریل ۱۹۷۹ء کو بعارضہ قلب انتقال فرماگئے۔ مرحوم کئی سال سے اسی مرض میں مبتلا تھے۔ اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ ہارون صاحب مرحوم

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت ہم بھی بہنوں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے بشرطیکہ شعر موزوں، معیاری اور ہمارے مجوزہ عنوان کے تحت ہو۔ ساتھ ہی حریم کے نمبر خریداری کے ساتھ روانہ کیا گیا ہو۔ صرف وہی اشعار شریک اشاعت ہوتے ہیں جو ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہونچ جائیں۔ جولائی کے لئے ہمارا عنوان ہے "یاد" اگست کے لئے "رات"۔

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

مرسلہ:۔ شکیلہ پروین بلند شہر

بربادیٔ حیات کا دنیا سے کیا گلہ ... ؛
ہے قابل گرفت دل بد نصیب بھی

مرسلہ:۔ نسرین فاطمہ جاجمو کانپور

ناکامیٔ حیات کا کرتے بھی کیا گلہ
دو دن گذار نا تھا گذارے چلے گئے

مرسلہ:۔ مسز نسیمہ عزیز بھاگل پور

پھیکا سا ہو چلا ہے کچھ افسانۂ حیات
آؤ کہ اس میں رنگ بھریں ابتدا سے ہم

مرسلہ:۔ نازش ہلال دھنباد

تاریکیٔ حیات میں بھر کر خوشی کا رنگ
ظلمت کدوں سے نور کی کرنیں اچھالئے

مرسلہ:۔ نکہت تنویر ڈالٹن گنج پالامئو

بجھ گئی اک آہ میں شمع حیات
مجھ کو آہ سرد نے ٹھنڈا کیا

مرسلہ:۔ بی فریدہ شمیم پرنام بٹ

یوں تو غم حیات سے واقف ہیں سب مگر
کرتی ہے ... پریشان کبھی کبھی

مرسلہ۔ بی عظمت ترنم
آمبور

دل گیا رونق حیات گئی
غم گیا ساری کائنات گئی

مرسلہ۔ ورسلا احمدی ناز آمبور

عمر حیات مانگ کر لائے تھے چار دن
دو آرزو بھی کٹ گئے دو انتظار میں

مرسلہ۔ خالدہ نعیم شمسی پہلی بھیت

ہے بڑی چیز انبساط مگر
غم نہ ہو تو حیات کچھ بھی نہیں

مرسلہ۔ زبیدہ بتول آمبور

میری حیات ہے محروم مدعائے حیات
وہ رہگذر ہوں جسے کوئی نقش پا نہ ملا

مرسلہ۔ مہ جبین نزہت نکہت۔ فرخ دیبا
امراؤتی

یہ حیات و موت کیا ہے اسے ہم نے کچھ نہ جانا
یہی زندگی حقیقت یہی زندگی فسانہ

مرسلہ رضیہ سلطانہ بھدروک

بہر فروغ دین حق نذر تھی جس کی زندگی
وقف تھی قوم کے لئے جس کی حیات مستعار

مرسلہ۔ مس اسماء رمزی خاں۔ ملیح آباد لکھنؤ

لائی حیات آئے۔ قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

مرسلہ: عذرا فریدی امروہہ

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مرسلہ۔ زبیدہ فضلی رامپور

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

مرسلہ۔ نغمہ اسلم تاتار پور بھاگل پور بعارضی
ومکا ستقال برگنہ

(بقیہ پسندیدہ اشعار صفحہ ۱۰۷ پر)

"ابا جان سوئے نہیں گئے؟" ناصیہ جھٹکا سے کھڑی ہوگئیں۔
"ہم کا یہ خبر نہیں" ملا جیدن بولی "مگر شاید وہ غصے ناہرے ہیں۔ کہت رہن
کہ جن کا ہمارے پاس نہیں آسکت تو ہم خود اوکے پاس جیبا۔ آوت ہی ہوئیہیں"
"آپ چلئے ہم ابھی آئے" ناصیہ نے جیدن سے کہا۔ وہ اپنی لامحدود فکر سے
تپ ہو گئیں۔ ناصیہ نے گھبرا کر ایزد کا بازو جکڑ لیا "چلو میرے بھائی خدا کے واسطے
ابا جان کیوں غصے ہیں ہیں وہ تو کہہ رہے تھے کہ طبیعت اچھی نہیں ہے
ہوں گا"
"بڑھاپے میں اسی طرح حواس مختل ہو جاتے ہیں" ایزد حقارت سے ہنسا۔
"چپ بدتمیز" ناصیہ نے للکارا۔ ایزد نے چائے کی پیالی میز پر پٹخی اور نیپکن
منہ پونچھ کر باہر نکلا۔ شعیب صاحب دالان میں کھڑے تھے۔ انھوں نے ایزد کو
گھور کر آواز میں کہا۔
"کتنی تعجب ہے کہ تم نے مجھے اپنے جواب کا منتظر رکھا ہے"
"میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے خط میں جواب کے قابل کوئی بات نہیں تھی"
"یعنی تمھیں منظور ہے!"
"قطعی انکار ہے"
"کیا!" شعیب صاحب کے منہ سے نکلا۔
ایزد دوسری طرف دیکھنے لگا۔ شعیب صاحب کو غصہ آگیا "اچھا بات ہے۔
یہی تمھارا جواب ہے تو پھر میرا اپنا بیٹا نہیں ہے سمجھوں گا۔ میں نے طے کر لیا تھا
میں جائیداد دوں گا" شعیب صاحب کی تقریر آخر میں غصے سے بے ربط ہونے
لگی۔ "میں جا رہا ہوں۔ تم جانو تمھارا کام جانے۔ میں تو اس عہد شکن کے
اپنے دوست کو منہ نہیں دکھا سکتا!" (باقی آئندہ)

کہ اس کی آمد کا اس پر کیا اثر ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح بیزار، خفا، اور اکتائی ہوئی لگی۔
"آپ کو یہاں پا کر مجھے بہت خوشی ہوئی" ایزد نے خاموشی سے گھبرا کر ایک ہی
سا جملہ کہہ دیا۔
"اچھا!" اس ایک اچھا میں جو طنز، تلخی اور استہزا تھا وہ ایزد سے پوشیدہ
نہ رہا۔
"آپ کا ارادہ آگے پڑھنے کا ہوگا؟" ایزد نے پوچھا۔
"میری زندگی کا مقصد ہی یہی ہے" روکھے پن سے وہ بولی۔
"معلوم نہیں کہ آپ کے والدین"
"میرے والدین مجھے عدم سے وجود میں لانے کے ذمہ دار بے شک ہیں۔ لیکن
میرے مستقبل اور میری زندگی پر ان کا اختیار نہیں۔ وہ میری اپنی چیزیں ہیں اس
سلسلے میں بہتر طریقے پر میں سوچ سکتی ہوں"
ایزد نے اب بھی بے حیائی لا کر کہا "محترمہ مہ وش۔ آپ مجھ سے بہت
خفا معلوم ہوتی ہیں۔ حالانکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ میں نے آپ کی شان میں
کوئی گستاخی نہیں کی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ"
"آپ کا خیال غلط ہے" مہ وش نے خشک لہجے میں کہا "مجھے آپ سے
نہیں بلکہ اس صنف ہی سے نفرت ہے"
"دفعتہ غصے میں بھر کر ایزد بولا "اور اگر کوئی آپ کی جنس سے نفرت کرنے
لگے۔!"
"کسے پرواہ ہے۔ لیکن معاف کیجئے کہ آپ لوگوں نے جس طرح ساری دنیا پر
اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے وہ سخت قابل اعتراض ہے۔ ابتدا سے آفرینش
ہی سے یہ ہو رہا ہے کہ مرد حاکم اور عورت محکوم ہے۔ کم بخت بزدل عورتوں نے

خود ہی مردوں کو سر۔۔۔ چڑھا رکھا ہے۔ کہیں وہ دیوتا ہیں کہیں اوتار
کہیں خدائے مجازی ہیں تو کہیں ناخدا کیا کچھ نہ دماغ بگڑے گا آپ سب کا؟"
حقیقت میں عرض ہے کہ یہ بحث نہایت قدیم اور فرسودہ ہو چکی ہے لیکن
اس بحث کو آپ اجتماعی نقطہ نظر سے کیوں دیکھتی ہیں۔ انفرادی طور پر دیکھئے
ایزد نے کہا "یہ تو مسلّم امر ہے کہ دونوں فریق اپنی ہار ماننے پر تیار نہیں ہوں گے
عورت نے بھی آج کل عروج و ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر لیے ہیں۔ چنانچہ وہ آج
مردوں کے دوش بدوش زندگی کے ہر میدان میں قدم زن ہے۔!
پھر بھی احساس برتری کہ۔ مردوں کے دوش بدوش۔!" مہوش نے بات
اچک لی "یقیناً" وہ بحث پر تل گیا "آزادی آپ کی صنف کو حال ہی میں نصیب
ہوئی ہے۔ ورنہ آپ تو وہ مخلوق تھیں جنھیں زندہ دفن کرنے کا رواج تھا"
"مسٹر ایزد۔ آپ جا سکتے ہیں"
"لڑائی جھگڑا نکال کر اسے طول دینا بس آپ پر ختم ہے" ایزد بپھر گیا۔
"مجھے آپ سے بات نہیں کرنا ہے"
"میں کب تڑپ رہا ہوں"
اور پھر اس کے بعد جب کہیں اور جہاں کہیں مہوش ملی۔ ان میں ایسی
ہی دلخراش اور جگر پاش بحثیں ہوا کیں اس نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔ وہ کریک
تھے!۔ لیکن پھر بھی۔ وہ اسے چاہتا تھا۔ اپنی طفلانہ سادگی کے تحت یا مہوش
کے حسن کی وجہ سے۔ وہ خود کو اس سے متنفر کرنے پر آمادہ نہ کر سکا۔!!
پھر وہ ادنی سے واپس آ گیا۔ ابھی ایم۔ اے میں وہ بس پاس ہوا تھا۔۔۔
سب کو حیرت ہوئی کیونکہ اس سے کنبہ والوں اور اساتذہ صاحبان نے بہتر امید
لگائی تھی۔ بہرحال اسی کو غنیمت جان کر کسی نے اس کے لیے ملازمت کا

نہ کہیں گیا تو نہیں ہے۔ میں اس میں منتقل ہو سکتا ہوں"
"سب کچھ کر سکتے ہو تم" بگڑ کر ناصیہ نے کہا "گھر چھوڑ سکتے ہو۔ عزت و آبرو
پانی پھیر سکتے ہو۔ باپ کی نیک نامی پر خاک ڈال سکتے ہو۔ بس وہی نہیں کر سکتے
جو سب کی مرضی ہے"
"اتنی سی بات آپ سمجھ نہیں سکتیں" ایزد نے کھانا ختم کر کے پلیٹیں سامنے
سے سرکاتے ہوئے اور ملازم کو گرم چائے لانے کا حکم دیتے ہوئے کہا "شادی کا نام
ہے روحانی مسرت کا۔ صرف دو انسانوں کو بدرجہ مجبوری ایک کر دینے کو شادی
نہیں کہہ سکتے۔ اور اس صورت میں جبکہ مجھے ان نام نہاد خاتون سے سخت
استکراہ محسوس ہوتا ہے۔ جو پہلے ہی شوہر بیزاری کی نشانی بھی ساتھ لانے والی ہیں۔
آپ سوچئے کہ ان کے ساتھ گزارہ کیونکر ہو گا؟"
"تم نے اس کے متعلق جو لفظ نام نہاد استعمال کیا ہے۔ وہ سخت معیوب ہے"
ناصیہ نے کہا۔ نوکر چائے لئے آیا تھا اسے باہر جانے کا حکم دے کر انھوں نے
پھر سلسلہ شروع کیا "وہ ہر طرح معصوم، پاک اور بھولی بھالی ہے۔ اور یقین کرو
کہ اگر ہمیں بیٹے جیسے اور نگار کو وہ پسند نہ آ جاتی تو ہم کبھی تم پر دباؤ نہ ڈالتے
کہ تم۔۔۔"
"میں کس کے دباؤ کو مانتا ہوں۔ بھابی!" ایزد نے استہزائیہ انداز میں
ہنس کر کہا "میں بہرحال اس شادی خانہ آبادی پر آمادہ نہیں۔ میں تو آج
ہی شام کو پھر سرد سے پر جا رہا ہوں"
اتنے میں حکیم شمیم ناصیہ ان نے خلاف توقع کمرے میں جھانکا اور اپنی
آہنگ دار آواز میں بولیں "دیکھ لیا۔ تم کا اور حسن میاں کا بڑے میاں لئے
رہیں۔ جن وہ دلار سے ایزد کو کہتی تھیں۔ اس نے منہ سکوڑ لیا۔

براہ کرم مجھے ہر طرح سے الگ رکھا جائے۔ ذات کو والدصاحب کا ایک
خط مجھے ملا ہے۔ خیر۔ وہ اس قابل نہیں کہ میں اس کا جواب بھی دوں
آپ ان کی خدمت میں صرف میرا ایک حرفی انکار پہونچا دیجئے۔ اور یہ اپنی
طرف سے عرض کر دیجئے کہ میں صرف ایک آدمی ہوں مجھ میں فرشتگانہ اوصاف
مطلقاً موجود نہیں ہیں۔ نہ میں اتنا شریف اور اس قدر بلند ہوں کہ دوسروں
کی مجبوریوں اور بہتری پر خود کو بھینٹ چڑھا دوں۔ ابھی کم سے کم پانچ
سال تک میں اپنی شادی کا کوئی تصور نہیں رکھتا!"

"یہ تو اب ناممکن ہے ایزد" ناصیہ نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔
دونوں طرف تیاریاں ہونے لگی ہیں۔ تمھیں ابا جان کی بات کی پاسداری
رکھنی چاہئے۔ انھوں نے تم پر مکمل بھروسہ کر لیا ہے"

"غلطی کی ہے۔ میں ہرگز شادی نہیں کروں گا"

"تمھیں نہیں معلوم۔ ایزد۔ وہ لڑکی بہت پیاری بے حد حسین ہے۔ ساتھ ہی
خوب سیرت بھی ہے۔ تم اسے بہت پسند کرو گے۔ کیا تمھیں مجھ پر اعتماد نہیں رہا۔ میں
بھلا کوئی ناپسندیدہ ہستی تمھارے گلے باندھ دوں گی"

"جی ہاں وہ فرشتہ سہی۔ لیکن مجھے نہیں چاہئے۔ خدا کے لیے بھابی مجھ سے زبردستی
مت کیجئے۔ ورنہ میں آپ کو تو خیر کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن"

"ہاں ہاں کہو۔ رک کیوں گئے" ناصیہ نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے
کہا۔ "دھمکی دو کوئی خوفناک۔ کہ میں مرعوب ہو جاؤں"

"میں آپ کو کوئی دھمکی نہیں دیتا" ایزد نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ "میں صرف
یہ کہنے والا تھا کہ اپنے آپ پر مجھے اختیار ہے۔ میں مجبور تو نہیں ہوں۔ اس گھر میں
رہنے پر۔ مجھے کمپنی کی طرف سے فلیٹ مل رہا تھا۔ آپ سب نے لینے نہ دیا لیکن

انتظام کر دیا!

شروع شروع میں اس کا جی گھبراتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ عادی ہو گیا۔
ایاس نے دوران تعلیم ہی سے عربی ممالک میں قسمت آزمائی کا قصد کر لیا
تھا۔ اس نے اس ضمن میں سرکاری کاغذات بھی مکمل کر رکھے تھے۔ چنانچہ پاس
ہوتے ہی چھ ماہ کی ٹکنیکل ٹریننگ کے بعد وہ دوحہ قطر کے لیے روانہ ہو گیا!
مہوش کے متعلق اس نے معلوم کیا کہ وہ بی۔ اے کر رہی تھی۔ اور ہنوز
اپنی طبیعت میں ویسی ہی سخت اور کھردری تھی! اس کے بدلنے کا کوئی امکان
نہیں تھا!

گھر والوں سے اس نے بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ ناصیہ خبریں سناتی تھیں کہ
مہوش روز بروز سخت گیر ہوتی جا رہی تھی! اب اس کا تنہائی کا جنون ترقی
پر تھا! اپنے ایک پروفیسر سے جھگڑا کرنے کی خبر بھی ایزد نے سنی تھی کہ ان
بیچارے نے دل سے مجبور ہو کر ایک دو سطری نامۂ شوق مہوش کی خدمت
میں روانہ کیا تھا۔ جس پر وہ اس قدر بپھری تھی کہ بس فوجداری ہوتے ہوتے
رہ گئی۔ اور پروفیسر صاحب نے از خجالت سے اپنا تبادلہ کروا لیا!

ایزد نے بارہا یہ بھی سوچا تھا کہ شاید اس کی صنف سے کوئی "تلخ تجربہ" مہوش کو
ہوا تھا جس نے اسے مردوں سے نفرت دلا دی تھی۔ لیکن پھر وہ اپنی سوء ظنی پر لعنت
بھیجتا! ایسا معصوم پاکیزہ اور بارعب چہرہ کسی گناہگار کا نہیں ہو سکتا! عصمت و
عفت کا نور تو عورت کی پیشانی سے جھلکتا ہے۔ آنکھوں سے نمایاں ہوتا ہے!!

پھر بہتیری بار دونوں کا سامنا ہوا۔ اور درد محبت کی تیز لہر ایزد نے اپنے
پہلو میں محسوس کی لیکن بے سود اس کے معاملہ میں دل سے دل کو راہ والا مقولہ
بھی بے معنی ہو کر نکلا۔ بہرحال وہ اسی طرف مائل رہا! اپنی پوشیدہ محبت کو وہ

نفرت میں نہ بدل سکا۔ بلکہ اب تو اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ جوں جوں مہوش کی نفرت ترقی پر تھی۔ دن بدن اس کی محبت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تو اسے مہوش کی کرب انگیز خاموشی پر ترس آنے لگا تھا!۔

یہ سودا اسے کیوں سوار ہوا تھا۔

اسے معلوم نہ تھا۔

دل کے ہاتھوں سے سب لوگ لاچار ہیں
محبت کی راہیں بڑا اسرار ہیں

عجیب بات ہے۔ ایک جسیم و تنومند صحیح الحواس آدمی اپنے مٹھی بھر دل پر قابو نہیں پا سکتا!۔

روز بروز وہ بھی گوشہ نشین ہوتا گیا۔

اب وہ ذمہ دار آدمی تھا۔ لیکن اوروں کی نظر میں۔

اپنے طور پر وہ بلکتا تھا ایک ناکام آرزو کی تکمیل کے لیے۔

دست بدعا رہتا تھا۔ کاش ایسا ہو سکے کہ وہ اس کے دل سے مردوں کی نفرت نکال سکے!!۔

ایک مرتبہ وہ اشرف کے بچے کی سالگرہ میں پھر مہوش سے ملا۔

وہ اسے بدلی بدلی اور تھکی تھکی سی لگی۔ چہرے کے نقوش بھی اتنے تند نہیں تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی فکر اسے لاحق تھی۔ گال تمتما رہے تھے۔ لب پژمردہ تھے اور آنکھوں سے تو ویرانی عیاں تھا!۔ اس نے ایزد کو دیکھا اور کسی اجنبی کی طرح سلیک کے بغیر رخ پھیر لیا۔ ایزد کے دل پر دھکا سا لگا!۔ وہ اب ایک طالب علم نہیں تھا۔ ذمہ دار فرد لگتا تھا۔ وہ بتا چاہتا تھا کہ وہ جیسا اس کے چہرے پر بھی سنجیدگی لا سکتا تھی۔ چنانچہ مہوش کی بے رخی کا جواب اس نے بھی سرد مہری سے دیا۔ انکا کرے

"یہ اچھا اصول ہے آپ کا بھائی": ایزد نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "جب گھر پر ہوتا ہوں تب بھی آپ سمجھتی ہیں کہ میں دورے پہ مارا مارا پھر رہا ہوں۔ ناشتے کھانے کا حساب ہی نہیں رکھتیں":

"اپنا قصور نہیں کہو گے کہ دس بجے سو کر اٹھے ہو نواب صاحبوں کی طرح": ناصیہ نے بھی ڈانٹ کر کہا۔

"آپ کا قصور کیا کم ہے کہ آپ نے مجھے جگا نہیں لیا": ایزد طعام خانے میں پہنچ کر بولا۔ اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"نا وقت جگاتی تو تم جھنجھوڑ کھاتے مجھے": ناصیہ بولیں: "اچھا کیا آج دفتر نہیں جانا ہے تمھیں؟"

"ایک بجے تک جاؤں گا":

کفیل دروازے پر نظر آئے: "میں جا رہا ہوں۔ ناصیہ۔ تم نے اگر چیزیں نکال لی ہوں تو دے دو مجھے۔ واپسی پر انھیں پالش کروا تا لاؤں گا":

وہ ایزد سے مخاطب نہیں ہوئے۔! ناصیہ نے خوش نما دے کہا: "میری سنگار میز پر ڈبیہ رکھی ہے۔ اینی سے کہیے دے دیگی":

کفیل نے پردہ چھوڑ دیا اور مڑ گئے۔ ایزد نے آنکھیں اٹھا کر ناصیہ کو گھورا۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

"کیوں مسکرا رہی ہیں آپ؟":

"اے لو۔ اب کیا تم میرے ہنسنے مسکرانے پر بھی کرفیو لگا دوگے۔ ہوگی کوئی خوشی مجھے۔ تمھیں اس سے کیا؟":

ایزد نے سر جھکا کر نوالہ چباتے ہوئے کہا: "بھابی میں کسی تمہید کے بغیر ایک بات آپ سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے گھر میں کوئی خوشی یا کوئی [illegible]

سے کہا: میں تھک سا گیا ہوں اور کوئی بات نہیں!" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ ناصرہ چائے بنانے اٹھ گئی۔

آپا ذاکرہ نے اس عرصہ میں جوئیں مارنے کے انداز میں کاغذ پر کچھ ٹاپک ٹوپکے مارے تھے۔ وہ صالحہ بیگم کی طرف بڑھاتی ہوئی بولیں: بس اتنا ہی یاد آیا جو میں نے لکھ دیا ہے۔ اب تو ذہن پر کم بخت ایسی پھپھوندی جمی ہے کہ لاکھ دماغ پر زور دو، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

رکھ دیجئے۔ دلہن ایک نظر دیکھ لے گی: صالحہ بیگم بولیں: مجھے تو یہ فکر کھائے لیتی ہے کہ باپ کی چٹھی کا کیا جواب دے گا ایزد۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باپ بیٹے میں جھک جھک کی نوبت آجائے:

آپ نے ایزد کو ہوا بنا رکھا ہے: کلیم نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ اور وہ آپ کی اکڑ دکھا کر کے بگڑا ہیں اسی لیے اور بھی غرا غرا کر آنکھیں نکالتے ہیں آپ پر۔۔۔ میں بہت ضبط کرتا ہوں۔ ورنہ پہلے تو ہم ہی دونوں میں جھک جھک ہو جائے:

خدا کے لیے بیٹا اس کے منہ نہ لگنا: صالحہ بیگم نے پریشان ہو کر کہا۔

کلیم کچھ برہم سے اٹھ کر چلے گئے۔ شارق اور رضا باتیں کرنے بیٹھ گئے کہ نادکا میں کون سے موقعہ پر کون سا لباس پہنیں گے۔ آپا ذاکرہ اور صالحہ بیگم کھسر پھسر کرنے لگیں۔

دھوپ ڈھلنے کے بعد ایزد ہاتھ دھو کے اور لباس تبدیل کر کے نیچے اترا۔ صحن میں گزر کر اس نے تیزی کو پکارتے ہوئے ناشتہ طلب کیا۔ اور خود وہیں حوض کی منڈیر پر ایک پاؤں رکھ کر ٹک گیا۔ کیاریوں میں کھلنے والے پھولوں کو دیکھنے لگا۔ دو ہی تین لمحے بعد ناصرہ نے طعام خانے سے جھانک کر کہا۔

چلو بھیا۔ لگا تمہارا ناشتہ:

میں بیٹھا رہا لیکن اس سے مخاطب نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے مہوش کو جلانا اور ستانا شروع کر دیا۔

ایک ننھی سی بچی اس کے لیے پانی لائی تھی۔ ایزد نے گلاس لیتے لیتے قصداً یوں ہاتھ کھینچا کہ گلاس بچی کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اس نے ہونٹ بسورے اور تب قہقہہ لگا کر ایزد بولا۔

چھی چھی عجیب بزدل۔۔۔ ننھی اور ڈرپوک لڑکی ہو۔ اتنی سی بات پر رونے لگیں۔ واہ جی واہ۔ حالانکہ تم تو ایک دلیر اور بہادر صنف سے تعلق رکھتی ہو۔ تمہاری قوم تو اب ہوائی جہاز اڑانے لگی ہے۔ ریل چلاتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے تم وہ لوگ ہو جنھیں ایک طاقتور مرد کی بیوی بننا اور اس کے بچے پیدا کرنا ہے۔ سمجھیں۔ یوں چاہے تو تم وہ لوگ ہو کیسے ہی اونچے دعوے کرو اور بیکار کی لاف و گزاف کرو لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم کم از کم میری نظروں میں جانور سے بدتر اور چیونٹی سے زیادہ حقیر ہو:

اس نے ایک زہریلا قہقہہ لگا کر نظریں اٹھائیں تو دھک سے رہ گیا۔ مہوش اپنے صوفہ کی پشت گاہ پر لڑھکی ہوئی تھی۔ اس کا سینہ متلاطم تھا اور ہچکیاں لگی ہوئی تھیں۔

مہوش: وہ اپنی بے ہودہ بکواس پر شرمندہ ہو کر بے ساختہ چیخا۔ ادھر سے لوگ دوڑے اس کے چہرہ پر پانی چھڑکا گیا۔ سید صاحب جھپٹ کر آئے تب تک مہوش کی حالت سنبھل چکی تھی۔ سید صاحب نے بازوؤں سے سنبھال کر اسے اٹھانا چاہا تھا۔ لیکن وہ عجیب طرح کی تھراتی ہوئی آواز میں بولی۔

ہٹ جائیے۔ میرے پاس سے ہٹ جائیے ڈیڈی۔ میں آپ اٹھ جاؤں گی اور پھر وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوئی۔ اب اس کا چہرہ اتنا سرخ تھا جیسے جلد

کے اندر خون پھٹ گیا ہو۔ لب مرتعش تھے اور حالت بھی زبوں۔ ایزد نے
اپنے پر لعنت بھیجی کہ اس نے اتنی کمینہ پن کی بکواس نہ کی ہوتی تو مہ وش کی یہ
حالت کیوں ہوتی۔! سید صاحب سر محفل اپنی توہین پر برہم تھے۔ اوروں کو بھی
مہ وش کا لہجہ ناگوار گزرا تھا۔ بہر حال وہ اٹھی اور اپنی ناگہانی بے ہوشی کا کوئی
ادھورا سا عذر کر کے ہال سے چلی گئی۔

مہمان چہ میگوئیاں کرتے رہ گئے۔

عجیب حد ہے کہ مردوں سے اتنی نفرت کہ باپ تک کو قریب آنے نہیں دیا۔
ایزد نے پختہ اندازہ کر لیا۔ یقیناً وہ کسی گہرے کمپلکس کا شکار تھی۔ اسے
اس پر اب غصہ نہیں ترس آ رہا تھا۔

مہ وش کا واقعہ اتنا مشہور ہو گیا کہ ناصیہ کو تاویل کرنی پڑی۔

اس کی بڑی بہن نے تن من دھن سے کسی سے محبت کی تھی۔ اسے اپنی ہستی
سپرد کر دی تھی۔ آخر میں ہوا یہ کہ اس شخص نے مہ وش کی بہن کو سخت دھوکا دیا۔
ان کی تیز طرار ملازمہ سے پینگیں بڑھائیں۔ اور اسے بیگم کا درجہ دے کر بیوی
کے برابر لا بٹھایا۔ بیوی کو مجبور کیا کہ اپنی ملازمہ کی خدمت کریں۔ ملازمہ اپنی
سابقہ بیگم کی درگت پر ہنستی تھی۔ بے وفا آدمی بھی ملازمہ ہی کا ساتھ دیتا تھا
بیگم کڑھ کڑھ کر رہ جاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ وہ اس نوبت پر پہونچیں کہ ڈاکٹروں
نے دق کا مژدہ سنا دیا۔ آخر وقت میں ان کی بری حالت ہو گئی۔ غشی کے
عالم میں پڑی وہ اس جفا پیشہ کو آوازیں دیا کرتیں جس نے انھیں ان حالوں

میں مانگتی کب ہوں امی: ناصیہ نے احتجاج کیا۔

ہاں بیٹی اب تم اپنی ہو۔ لیکن فی الحال تو سوال غیروں میں آن کے
رکھنے کا ہے۔ تمھاری رائے ٹھیک ہے۔ یہی کرو: شعیب صاحب نے کہا۔

ارے تو دلہن خود شادی میں کیا پہنے گی؟: صالحہ بیگم بولیں۔

میری فکر نہ کیجئے امی۔ آج کل زیور پہنتا ہی کون ہے: ناصیہ نے جواب دیا

"اللہ کا نام لے کے لکھو۔ نہرس۔!" آپا ذاکرہ بولیں۔

کفیل میاں۔ بیٹے تم لکھ لو۔ میں ذرا دیر لیٹوں گا۔ معلوم نہیں کیوں طبیعت
گری جا رہی ہے:

شعیب صاحب نے کہا: سر میں بھی درد ہے۔ رات کو مجھے دیر تک نیند
بھی نہیں آئی۔

میں جانتا ہوں ابا جان آپ نے فکریں بڑھا لی ہیں: کفیل نے کہا:
گھروں کی اکھاڑ پچھاڑ، قرض کی ادائیگی وغیرہ ایسی باتیں ہیں۔ جن کا اثر آپ
قدرتی طور پر ہوا ہے۔ لیکن اب آپ کیا سوچا کرتے ہیں؟ جس کا کچھ فائدہ نہیں۔
ابا جان ابھی میں ملازم ہوں۔ ایزد کی آمدنی پر تو وار ہے۔ خدا نے چاہا تو ہم
مالی پریشانی میں مبتلا نہ ہوں گے:

ہرگز میں ایسی کوئی بات نہیں سوچتا: شعیب صاحب نے کہا: خدا کے فضل سے
تمھاری سعادت مندی پر مجھے پہلے ہی پورا بھروسہ تھا۔ یقیناً خدا نہ کرے کہ
آزمائش میں مبتلا نہیں کرے گا۔ یہ مجھے کوئی طبی تکلیف معلوم ہوتی ہے۔
نہیں بلکہ دیر سو رہوں گا طبیعت اچھی ہو جائے گی:

ڈاکٹر کے پاس ہو آئیے شارق کو ساتھ لے کر: صالحہ بیگم بولیں۔

دلہن تم مجھے ایک پیالی خوب گرم چائے دے دو: شعیب صاحب نے کہا

کو پہنچا دیا تھا۔ لیکن اسے نہ آنا تھا وہ نہ آیا۔ غریب مظلوم عورت اسی عالم میں
دنیا سے کوچ کر گئی۔ جس وقت ان کا جنازہ گھر سے نکلا اسی وقت ملازمہ کو ہمراہ
لیے وہ بدنہاد بھی گھر سے تفریح کے لیے نکلا تھا۔ اسے سابقہ بیگم کی موت کی اطلاع
ملی تھی لیکن اس نے تب بھی میت پہ جانے کی ضرورت نہ سمجھی!!۔

اور پھر بھابی نے کہا کہ تب ہی سے مہ وش کو مرد ذات سے نفرت ہو گئی تھی۔ کسی
کا سلوک ایثار اور وفا کیشی اسے متاثر نہ کر سکی تھی۔

اس نے یہ قصہ سنایا تھا۔ لیکن وہ مہ وش کو معاف نہ کر سکا۔!!

کیونکہ اس کے پاس بھی استدلال موجود تھا۔ سب انگلیاں برابر کی نہیں
ہوتیں کیا مہ وش نے محبت کرنے والوں اور عورت کی خاطر تخت و تاج کو ٹھکرانے
والے شہنشاہوں کی داستانیں نہیں پڑھی تھیں!۔ اس نے دنیا بھر کے
مردوں کو ایک ہی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت کیوں سمجھی تھی؟۔

اپنی توہین کے خیال سے وہ بھی مہ وش ہی کا سا چڑچڑا بد دماغ اور تند خو
ہو گیا۔ دن بدن اس کی نفرت بھی ترقی کرتی رہی۔

پھر وہ کبھی اشرت کے گھر نہیں گیا۔ کوئی توقع ہی نہیں رہ گئی تھی۔

اس کی زندگی کے بے رونق صبح و شام گزرنے لگے!۔

اور پھر جیسے کوئی ساکن سطح آب پر پتھر پھینک کر پانی میں تموج پیدا کر دے
شعیب صاحب کا خط اس کے خیالوں کی ساکن دنیا میں طوفان اٹھا گیا!۔

رات کے پل بھاگ رہے تھے۔ موسم بھیگنے لگا تھا۔ اب آسمان ابر آلود ہو
گیا تھا۔ چاند کا چہرہ کالے ابر سے کبھی جھانکتا کبھی چھپ جاتا!۔ موسم گرما کے خاص
پھولوں کی تیز مہک سے برآمدہ معمور ہو رہا تھا!۔ فضا سحر کن ہو گئی تھی!!
سگریٹ اس کی انگلیوں میں بجھ چکا تھا!۔ اس کی آنکھیں اب بھی خلا

تم کون سے میرے نانا میاں ہو۔ منٹ آکر مجھے منٹ کو کیا بڑے ہو گئے
ہمارے رعب جمائے رکھے دیتے ہیں" رعنا بولی۔ قریب تھا کہ پھر دونوں میں
جنگ ہونے لگتی۔ ناصرہ نے انھیں خاموش کرا دیا۔ اور اطمینان دلایا کہ پھول چار
روز پہلے سے بکے گی لیکن لاؤڈ اسپیکر عین شادی کے روز لگوا دینا۔

جو کچھ منگوانا ہو۔ لکھوا دیجئے" صالحہ بیگم نے شعیب صاحب سے کہا "دن کم
رہ گئے ہیں!"

میں کیا لکھواؤں گا۔ آپا سے پوچھ کے لکھو" شعیب صاحب نے جواب دیا۔
لیکن یہ خیال رکھو کہ میں اب بالکل کھوکھلا ہوں۔ بمشکل تین ہزار روپئے الماری
میں ہوں گے!۔

شادی کی بات تو یہ ہے۔ بھیا کہ جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا" آپا ذاکرہ
نے کہا "لیکن اب اتنی گنجائش نہیں ہے تو بس چار جوڑے کپڑے لکھوا دو۔ اللہ
بیچارا مالک۔ اللہ اللہ خیر سلا"

زیور۔؟؟" کیفی جو دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ چپکے سے بولے۔

ہاں زیور تو دینے ہی پڑیں گے" آپا ذاکرہ نے گردن ہلا کر کہا "تین چار
زیور تو ضرور ہونی چاہئیں۔ یہاں اللہ کا نام ہے۔ مجھے پتہ ہوتا کہ ایک دن
آنے والا ہے تو میں اپنا بیس تولے کا زیور رعنا کے بیاہ کے لیے لگا دیتی۔ نام نہ قدر
کچھ۔ مرحوم اپنی جان سے گئی کھانے والوں کو سوا دو نہ آیا۔ نگوڑی وہی شئی میری
بچی۔ ہاتھ لکھو نام دولت خاں!"

میری امی سنیں گی نہیں ورنہ میرے پاس جو رہ گیا ہے وہ دے دیں" تاجہ
کہا۔

بیٹی کس بھرم پر تم سے لیں۔ دینے کا نام کہاں ہے" صالحہ بیگم بولیں۔

میں نگراں تھی لیکن اب اس خلا کے پردے پر کوئی تصویر متحرک نہیں تھی جو اس کی یادوں کو درہم برہم کر سکتی!۔

اس کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ سر کا درد باعث اذیت ہونے لگا تھا! ایک پہلو پر بیٹھے بیٹھے اس کا آدھا جسم سن ہو گیا تھا!۔

اندر گھر میں سناٹا پڑا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ اٹھا۔ اور مرے مرے قدموں سے کمرے میں پہونچا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے خوشنما اسٹینڈ پر رکھی ریڈیم ڈائل والی ٹائم پیس پونے تین بجا رہی تھی!! اس نے ہاتھ بڑھا کر بلب آف کیا اور بستر پر گر پڑا۔

اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ والد صاحب نے جلد از جلد ضمنی جواب مانگا ہے!

اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ بکھر گئی۔

کیا ہو سکتا ہے میرا جواب۔ اس نے گھپ اندھیرے میں ٹٹول کر تکیے کے نیچے سے سگریٹ کیس اور لائٹر نکالا۔ سگریٹ سلگایا۔ ایک طویل کش لے کے گہرا دھواں اس نے اگل دیا اور نفرت سے منہ بنا کر بڑبڑایا۔

"انکار۔ قطعی انکار۔ کسی کی کرچی کا محتاج ان میں جھکنے کے لیے تیار نہیں۔

ہنہ۔ بیوہ عورت۔ ایک بچے کی ماں۔ ایسی کون سی شامت نے آ کر مجھے گھیرا ہے!"

ایک سرد آہ اس کے لبوں سے نکلی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ نفرت کے باوجود تمہاری ذات سے بے پایاں محبت میری رگ رگ میں سما چکی ہے۔ سروش کاش

تم۔ میری آنکھوں میں پوشیدہ پیغام کو پڑھ سکتیں۔ تم نے نفرت کا سبق سیکھا ہے۔ کسی نے تمہیں محبت کے لطیف احساسات سے آشنا نہیں کیا!۔

دفعتہ سگریٹ اس کے سینے پر گر پڑا۔ اس نے چونک کر قمیص جھاڑی اور سگریٹ برآمدے میں پھینک کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک قطعی فیصلہ پر پہونچ کے سکون ہو گیا تھا۔

صبح ناشتہ کے بعد شعیب صاحب نے پھر تذکرہ کیا!۔ زیتون سے ایڈوکیٹ پیغام بھیجا کہ اسے اپنا جواب دینا ہے۔ لڑکی نے واپس آ کر پیغام دیا۔ "چھوٹے سو رہے ہیں۔"

خان صاحب نے ضمنی جواب دے دیا۔ اب وہ شادی کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ شعیب صاحب نے کہا: "ہمارے یہاں ابھی صاحبزادے کی مرضی کا چکر چل رہا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیسا منحوس آشوب دور آ گیا ہے۔ بھئی میرے باپ نے ہرگز میری مرضی نہیں پوچھی تھی مگر میں اس پر مجبور ہوں۔"

"میں پوچھوں گی ان کی مرضی ابا جان۔ آپ کو جو کچھ کرنا ہو۔ وہ کیجئے"۔ رنا نے کہا۔

"اپنی تمام سہیلیوں کو میں کل ہی بلاؤں گی"۔ رعنا خوش ہو کر بولی: "مزا آ جائے گا۔ بوا کی بہو بہت اچھا ڈھولک بجاتی ہیں۔ بھابی وہ کتنا اچھا ہے نا۔ بنے کو ہیرے لگے۔ اشرفی لٹاتا آیا بنے۔ ابا جان ہم ساری کی ساری گائیں گی۔ آپ خفا تو نہ ہوں گے نا!"

"نہیں تو"۔ شعیب صاحب نے کچھ اور سوچتے ہوئے بے خیالی سے کہا۔

"میں تو ابھی سے کہے دیتا ہوں کہ میں پورے چار لاؤڈ اسپیکر لگاؤں گا" شارق بولا۔ "چاروں کونوں پر چار۔ لیلیٰ مجنوں، پاکیزہ اور مغل اعظم کے ریکارڈ لاؤں گا۔"

"ایک لاؤڈ اسپیکر اپنی کھوپڑی پر بھی لگوا لینا"۔ رعنا جل گئی۔ "ان کی بھدی آواز میں میرے ڈھولک کے گیت کیسے سنائی دیں گے؟"

"ابھی آپ دیکھ رہی ہیں"۔ شارق بگڑا۔ "اب یہ بھلے کھوپڑی اور [illegible] لگی ہے رنا نام کو ادب نہیں کرتی!"

The Hareem Lucknow June. 1979 (Phones : 44559-45334) Regd. No. LW/NP 32

THE HAREEM

July .79

Rs. 1/-

ایڈیٹر

ٹیلیفون نمبر ۲۰۴۴۴

ٹیلیفون نمبر آفس ۲۲۵۵۹

گذشتہ ۵۸ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے ــــ اور ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے۔

نمبر (۷)

جلد (۵۷)

ماہنامہ حریم لکھنؤ

بیادگار

سید محمد سلیم اہنونوی مرحوم

و

شفیق النساء

بیگم سلیم اہنونوی مرحوم

اڈیٹر و نگران

نسیم اہنونوی

معاونین

شوکت جہاں بیگم غزالہ

جانی بیگم ردولوی

فہرست مضامین

ماہ جولائی سنہ ۱۹۷۹ء

قیمت سالانہ

اعزازی: فی آرڈر سے اکیس روپیہ، سکول خریداری منی آرڈر سے بائیس روپیہ عمل خریداری منی آرڈر سے سولہ روپیہ، وی پی سے پرچہ منگانے پر تین روپیہ زائد۔ فی پرچہ۔ ایک روپیہ غیر ممالک سے بقدر ۳۲ روپیہ یا دو پونڈ بذریعہ سی میل۔ ایرمیل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں۔

آفس اور ترسیل زر کا پتہ:۔ نسیم بک ڈپو ــــ لاٹوش روڈ ــــ لکھنؤ

نسیم انہونوی مالک و ناشر نے سرفراز قومی پریس ــــ لکھنؤ

واہ! کیا دلفریب خوشبو ہے
سُندری سُہاگ
اِن حسین لہراتی کالی زلفوں کو جب آپ
سُندری سہاگ سے سنواریں گی تو خود آپ ہی
اس تیل کی دل نواز خوشبو سے مسحور ہو جائیں گی اور
آپ کی سہیلیاں رشک و حیرت سے پوچھیں گی بہن آپ
سُندری سُہاگ ہی لگاتی ہیں نا؟
سُندری سُہاگ۔ بخشی کی ایک اور من موہنی پیشکش
تین شیشی کیلئے 17/50 پیشگی بھیج کر رجسٹری پارسل طلب کرے۔
ایس اے بی بخشی کمپنی
نمبر ۳۲ مولانا شوکت علی اسٹریٹ (کولوٹولہ) کلکتہ ۷۳
پوسٹ بکس ۔ ۱۲۳۴۵
لکھنؤ میں:۔ اشتیاق حسین پرفیومرز۔ مولوی گنج

ایک بہن نے اپریل میں ایک خط مجھے اس لمعات سے متاثر ہو کر لکھا تھا جو علامہ خمینی کے اس اعلان پر لکھا گیا تھا کہ اسلامی جمہوریہ میں بھی عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ اور یہ کہ اسلام اس بات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ خواتین بھی مردوں کی طرح تمام معاملات میں حصّہ لیں۔

ہمیں حیرت ہے کہ علامہ خمینی نے ایسا اعلان کیوں کیا جبکہ ایسے ہی حالات سے انھوں نے سخت ترین اختلاف کیا تھا۔ ان کے بقول اگر ایسی حوصلہ افزائی ایرانی خواتین کو ملی تو شہنشاہ کے زمانہ کی خواتین سے اس دور کی خواتین میں کوئی خاص فرق نہ رہے گا۔ شاہ بھی عورتوں کو مردوں کے صف بہ صف دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ایسا نہ کرنے والی عورتوں کے خلاف تھے، جیسا کہ اخبارات کی خبروں سے معلوم ہوتا تھا۔

میرے لمعات مطبوعہ اپریل ۷۹ء کو پڑھ کر متذکرہ بہن نے ایک خط جسے شائع کرنے سے پہلے میں نے بہن صاحبہ سے چند باتیں حریم ہی کے ذریعہ دریافت کی تھیں۔ اس کے جواب میں بہن صاحبہ نے صرف ایک ہی بات لکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اُم المومنین حضرت خدیجہؓ ایک کاروباری خاتون تھیں۔

حالانکہ حضرت بی بی خدیجہؓ کا دورِ تجارت جس کے ایجنٹ کی حیثیت سے ہمارے رسولِ مقبول صلعم وابستہ تھے، اسلامی دور سے قبل کی بات ہے اور اس وقت تو دورِ جہالت تھا، نہ جانے کیا کیا ہوتا تھا۔

میں نے کاروبار۔ ملازمت اور مشاورت کے سلسلے کی مثالیں چاہی تھیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ نہ صرف رسولِ اکرم صلعم کے دور میں بلکہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی کیا ایسی مثالیں ہیں کہ خواتین مالک یا سیلز مین کی حیثیت سے دوکانوں پر بیٹھتی ہوں۔ کیا ایسی مثالیں ہیں کہ آج کل کی کونسلوں کی طرح مجالس مشاورات میں خواتین بھی شامل ہوتی تھیں۔ کیا اختلاطِ مرد و زن کی ایسی ہی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے، جیسی آج نظر آتی ہیں تقریبوں میں بازاروں میں۔ جلسوں میں۔ کلبوں میں وغیرہ وغیرہ کیا اس دور میں کوئی خاتون قاضی، پولیس افسر یا اور کسی محکمے کی انچارج تھی۔ کیا کوئی خاتون وکالت کرتی تھی کیا پولیس میں کوئی عورت آجکل کی نسواں پولیس کی طرح فعال تھی۔

میں چاہتا تھا کہ بہن موصوفہ ایسی مثالیں لکھدیں تو میں اپنی تمام تحریروں کو جو پچاس سال سے حریم میں لکھتا رہا ہوں کالعدم سمجھ لوں۔

میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا لب لباب یہی رہا کہ اسلام نے جو معاشرہ قائم کیا تھا۔ اس کی بنیادی باتیں یہ تھیں کہ عورتوں اور مردوں کا یکجا اختلاط نہ ہو۔ اسی لئے نماز تک کے لئے یہ ہدایت تھی کہ عورتیں اگر تنہائی میں نماز ادا کریں تو اس سے بہتر ہے کہ وہ مسجد میں ادا کریں جبکہ مردوں کے لئے احکام برعکس ہیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہٗ کے سامنے جھکتے ہوئے شاید بعض مکروہ اور گندے خیالات ذہنوں میں سر اٹھائیں، لیکن اس کے باوجود اسلام نے یہی چاہا کہ عورتیں علیحدہ ہی نماز ادا کریں تو بہتر ہوگا۔

شادیوں میں بارات اس طرح آتی ہے کہ مردوں کے ساتھ ہی عورتیں بھڑکدار باریک ملبوس میں جسم کے بیشتر حصوں کو برہنہ کئے سینٹ دلوڈر میں ڈوبی میک اپ سے حسن کو دوبالا کئے آتی ہیں اور دلہن والے مہمان اس تماشے کو دیکھتے ہیں۔ کیا ایسا کوئی نظارہ کبھی رسول اللہ یا خلفائے راشدین کے دور میں بھی دیکھا گیا ہوگا۔

بہن محترمہ نے بہت ہی گھسی پٹی بات یہ بھی لکھی ہے کہ گھر میں رہنے سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں تو پردہ میں رہ کر بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔

[illegible] انکار نہیں اس لئے [illegible] حالات میں کام کرتا ہے۔
لیکن سوچنے کی بات صرف اتنی ہے کہ امکانات کہاں زیادہ ہوسکتے ہیں۔
[illegible] ہمہ وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیں اور کسی لڑکے
کو [illegible] آزاد چھوڑ دیا جائے تو کس کے کردار کے خراب ہونے کا امکان
[illegible] اور بہتان ہے کہ میں ان تمام خواتین یا لڑکیوں کے
کردار [illegible] مشکوک سمجھتا ہوں جو آزاد رہتی ہیں۔ ہاں یہ میں نے ضرور لکھا ہے
کہ ان کے کردار بگڑنے کا امکان زیادہ ہے۔

بہن موصوفہ کا خیال ہے کہ میں نے اپنی زندگی کو صرف گرد و پیش میں ہی
دیکھا ہے۔ کاشتکار، اہل حرفت، کپڑا بننے والے، اور اپنے ہاتھوں سے
محنت مزدوری کرنے والے طبقوں کی خواتین کو جو ہمیشہ اپنے مردوں کی شریک کار
رہیں انہیں دیکھا ہے۔

یہ بالکل درست ہے، لیکن جہاں تک میرا مطالعہ ہے اسلام کے
ابتدائی دور میں ایسا نہیں رہا ہے اور وہی دور ایسا ہے جس کی پیروی
ہم مسلمان کرتے رہے ہیں۔ تاریخ ہمیں نہیں بتاتی کہ اس دور میں بھی
عوامی طبقہ کے مرد اور خواتین اسی طرح کام کرتے رہے ہوں جس طرح
آج ہوتا ہے۔ خلفائے راشدین کے بعد تو نہ جانے کیا کیا ہونے لگا تھا۔
اسلام کی روح تقریباً فنا ہو گئی تھی۔ اور اب تو شرک و بدعات بھی شامل اسلام
ہیں۔

بہن موصوفہ نے شاید محسوس کیا ہوگا کہ میں ایک عرصہ سے اب یہی
کہتا آیا ہوں کہ آپ پردہ نہیں کرتیں نہ کریں، لیکن بے حیائی اور بے غیرتی
کو تو نہ اختیار کریں جو عورت کا بہترین زیور ہے بہن موصوفہ نے لکھا ہے
[illegible] بیشک فیشن پرستی، بے حیائی، عریانیت، تماش بینی، ہوس پرستی،
[illegible] اخلاق اور خراب عادتوں کے خلاف جد و جہد کریں۔"
کاش یہ الفاظ لکھتے وقت بہن محترمہ نے غور فرمایا ہوتا کہ کیا
[illegible] عدم موجودگی میں ان باتوں کی اصلاح ممکن ہے۔ اگر شراب
[illegible] اجازت دے کر یہ کوشش کی جائے کہ شرابی کا اخلاق نہ بگڑے،
[illegible] خراب نہ ہو۔ اپنے گھر میں شریف انسان کی طرح رہے۔ شور و
[illegible] بیوی کو زد و کوب نہ کرے اور مالی حیثیت سے دیوالیہ نہ ہو،
[illegible] ممکن ہے۔

اسلام کے ہر شرعی حکم کے تحت کوئی نہ کوئی اہم علت کی بنا ضرور
[illegible] شراب کو حرام کرنے کے سلسلہ میں ہے۔ کون نہیں جانتا

[illegible] نہایت نفیس ٹانک ہے۔ [illegible] ٹانک کے طور پر استعمال
کیا جائے، اور ایسے لوگ بھی خال خال موجود ہیں جو اپنے نفس پر کنٹرول
کر کے ایسا ہی کرتے ہیں، لیکن یہ حقیقت بھی دنیا بھر نے تسلیم کر لی ہے کہ
اکثریت ایسا نہیں کر سکتی اس لئے ان چند نفوس کے خاطر جو شراب پینے میں
کنٹرول رکھ سکتے ہیں، مشروط طریقہ پر شراب کو حلال نہیں کیا گیا۔
پردہ کی شرعی حیثیت بھی ایسی ہی ہے۔ بہن موصوفہ اپنی تحریر سے
ایک بےحد شریف خاتون معلوم ہوتی ہیں اس لئے یقیناً وہ موجودہ حالات
کا تجزیہ لینے نہ نکلتی ہوں گی اور لاعلم ہوں گی کہ بے پردگی اور اس سے
زیادہ آزادی نے کیا گل کھلا رکھے ہیں۔ ابھی کل ہی کا واقعہ ہے کہ میرے
دفتر کے قریب ہی ایک مکان میں تین شریف ماں باپ کی بیٹیاں اپنے
منہ کالے کر رہے تھے۔ میں پھر کہوں گا کہ پردہ کے اندر بھی ایسے تخریبی
واقعات ہو سکتے ہیں، لیکن معاف فرمائیں پردہ کرنے والے گھروں میں
لڑکیوں کو لڑکوں جیسی آزادی نہیں دی جاتی تھی۔
بہن موصوفہ پردہ کی شرعی نوعیت سے بھی منکر ہیں۔ اس کا کوئی
علاج نہیں یہ ایسی ہی بات ہے۔ جیسے سری سمپورنانند (آنجہانی) نے
ایک بار کہا تھا کہ اردو یو۔ پی میں بولی ہی نہیں جاتی۔ پردہ کا شرعی جواز
مسلمہ ہے حضرت بی بی زینبؓ کی بے ردائی پر آج تک سینہ کوبی کی جاتی
ہے۔ نہ جانے بہن صاحبہ کس شرع پر اعتقاد رکھتی ہیں۔ میں نے شرعی
پردے پر بڑے بڑے علما کی کتابیں پڑھی ہیں اور میرا ایمان ہے کہ پردے
کی شرعی اہمیت سے انکار ایک بہت بڑا فریب ہے جس میں کوئی اپنے
کو مبتلا کر سکتا ہے۔ بہر حال اعتقادات کی دنیا بہت وسیع ہے۔ مسلم فرقے
اسی سلسلہ میں برسرپیکار رہتے ہیں۔ بہن صاحبہ پردے کی شرعی حیثیت
تسلیم نہیں کرتیں تو انھیں اختیار ہے نہ کریں، لیکن میں تو کرتا ہوں اور
اس کے تحت لکھتا ہوں۔
بہن ایک بار پھر کہوں گا اگر بہن موصوفہ پردے کی شرعی حیثیت
تسلیم نہیں کرتیں تو بھی انھیں کم از کم اس کی سماجی حیثیت سے انکار
نہ ہونا چاہیئے۔ اور اگر وہ چاہتی ہیں کہ عورت فیشن پرستی کے سیلاب
میں بہتی ہوئی عریانیت اور بے حیائی سے دور رہے تو انہیں تسلیم کر لینا
چاہیئے کہ ایسا اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب پردہ کا نظم رہے گا۔ پردہ کا
قیام صرف انسدادِ فحش کے لئے ہے۔ جس کے بغیر قومیں تباہی و بربادی کا شکار
ہوتی رہی ہیں۔ اسی علت کو قرآن حکیم نے فحش سے تعبیر کیا ہے۔ شراب کا استعمال

پہلے حضرت علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ کے درمیانی قرآن در زمانہ فترہ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ کے درمیانی دور کو قرآن پاک نے جاہلیت اولیٰ فرمایا ہے۔ اس لئے کہ ان ادوار میں عورت کی بے حجابی اور بے پردگی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس وقت عورت ایک فاحش اور متاع عامہ کی چیز متصور ہونے لگی تھی۔

اس کے بعد زوال دور کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جو صنف عورت کی آزادی اور فیشن پرستی ہی نے ہوا تھا ـــ عورت کی ایسی ہی آزادی کی ابتدا ہو چکی ہے اور انتہا بھی ہو کر رہے گی، اگر شرعی پردے کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ شریعت کے اس حکم کو مکمل طور پر نہیں تو اس حد تک تو برتنا ہی چاہیئے۔ جیسے اور دوسرے شرعی احکام کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک لڑکی اپنے چچا زاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد بھائی سے آجکل پردہ نہیں کرتی، لیکن گھر کی چہار دیواری میں رہ کر لڑکیاں کے سامنے ان بھائیوں کے سامنے آنا۔ اس سے کہیں کم خطرناک ہے کہ ایک لڑکی گھر سے نکلے اور جس کے ساتھ چاہے۔ گھومے پھرے اور داد عیش دے۔

ڈاک کا نظام

ہمارے ملک میں اس وقت سب سے زیادہ خراب نظام محکمہ ڈاک اور ریل کا ہے۔ شاید ہی کوئی ٹرین وقت پر پہنچتی ہو۔ اسی طرح ڈاک بھی بعد تاخیر سے پہنچتی ہے اور اکثر پہنچنے کا یقین بھی نہیں رہتا۔ حریم کی ۱۵۰ کاپیاں ہر ماہ زائد چھپوائی جاتی ہیں جو ان بہنوں کو دوبارہ، سہ بارہ بھیجی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ ڈیڑھ سو پرچے بھیجنے کے باوجود شکایتیں باقی رہ جاتی ہیں اور ہم بے بس ہو جاتے ہیں۔ مئی ۷۹ء کا پرچہ بھی اسی طرح اس قدر غائب ہوا کہ بقیہ شکایتوں کے لئے ہمیں ناول کے صفحات چھپواکر دوبارہ ارسال کرنا پڑے۔

مجھے افسوس ہے کہ قدر کی اس گرانی اور نایابی پر یہ نقصان بہت ہی گراں گزر رہا ہے۔ لیکن اس بدنظمی کی اصلاح کا حکومت کے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ ہر محکمہ آزاد ہے اور جس طرح چاہتا ہے کام کرتا ہے بدنظمی کا یہ عالم ہے کہ ایک ماہ ہو گیا لکھنؤ کے کسی بھی ڈاک خانے میں دو پیسے والے ٹکٹ نہیں ہیں۔

بعض حریمی بہنوں سے بھی یہ شکوہ ہے کہ وہ بروقت یعنی ۲۰ تاریخ تک بعد اطلاع نہیں کرتیں۔ بعض جو کی بہنیں ۲۰ سے پہلے ہی شکایت کرتی ہیں جن پر توجہ نہیں کی جاتی۔

کچھ اپنے متعلق

میری صحت ۱۸ مئی سے زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ اسی حالت میں ۲۸ مئی کو نینی تال گیا۔ ۲۸ جون کو جلد ہی واپس آیا۔ وہاں کوئی افاقہ نہ ہوا البتہ یہاں کی گرمی سے اتنے عرصہ کے لئے نجات مل گئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب میں ۱۰ جون سے دفتر آنے لگا ہوں، البتہ کمزوری کے باعث کام بہت ہلکے کم کر پاتا ہوں۔ اکثر حریمی بہنیں اور بھانجیاں میری صحت کے متعلق استفسار کرتی ہیں۔ افسوس کہ فرداً فرداً سب کو جواب دینا میرے لئے ممکن نہیں۔ اس لئے یہ چند سطریں لکھ دیں۔

رُباعیات

فیروز نظامی

ایمان میں مستئ وفا آجائے
احساس میں حق کا نشہ آجائے
مصروفِ نماز ہوں میں، سجدے میں ہے سر
اب آنکھ جو چھلکے تو مزا آجائے

کام آئے گی ہرگز نہ یہ گھاٹے کی نماز
فرائٹے کے سجدے، وقت کاٹے کی نماز
ملیامیٹ ہو نفرت سے عند الحشر کے دن
منھ پر ترے مار دے سپاٹے کی نماز

شائستہ اسرارِ جلی ہو جائے
محبوبِ رسولِ عربی ہو جائے
پڑھتے تھے علی شیرِ خدا جیسے نماز
تو بھی یوں ہی پڑھے تو ولی ہو جائے

انتخاب تعلیمات قرآن

١٧٣۔ اور اپنی زینت ظاہر نہ ہونے دیں۔ مگر اپنے خاوند پر یا اپنے باپ پر یا اپنے خاوند کے باپ پر یا اپنے بیٹے پر اپنے خاوند کے بیٹے پر یا اپنے بھائی پر یا اپنی عورتوں پر (مراد مسلمان عورتوں پر) یا اپنے ہاتھ کے (غلام) یا کار دبار کرنے والوں پر جو مرد کہ کچھ غرض نہیں رکھتے (اور اپنے کام کاج میں لگے رہتے ہیں) یا ان لڑکوں پر جنھوں نے ابھی عورتوں کے بھید کو نہیں جانا (سورۂ نور)

١٧٤۔ اور تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا بیٹا نہیں بنادیا۔ یہ صرف تمہارے منہ سے کہنے کی بات ہے۔ (سورۂ احزاب)

١٧٥۔ جب تم اپنے گھروں سے جانے لگو تو اپنے لوگوں کو سلام کر لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں برکت والی عمدہ دعا ہے۔ (سورۂ نور)

١٧٦۔ اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کرو۔ سورۂ انعام

١٧٧۔ اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو۔ سورہ اعراف

١٧٨۔ اے ایمان والو سود مت کھاؤ (خواہ وہ) دوگنے پر دوگنا بھی ہو۔ (سورۂ آل عمران)

١٧٩۔ اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری بیہودہ قسموں پر پکڑتا ہے جن کا تمہارے دلوں نے قصد کیا۔ (سورۂ بقرہ)

١٨٠۔ اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ (سورہ بقرہ)

١٨١۔ اور آپ کسی قسمیں کھانے والے بے قدر کا کہا نہ مانیں۔ سورۂ قلم

١٨٢۔ اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ (سورۂ مائدہ)

١٨٣۔ جو لوگ اپنی بیویوں کو تہمت (بدکاری) کی لگائیں اور ان کے پاس بجز اپنے اور کوئی گواہ نہ ہو تو ان کی گواہی کی صورت یہ ہے کہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر یہ کہدیں کہ میں اپنے دعویٰ میں سچا ہوں اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر میں الزام لگانے میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت (سورۂ نور)

١٨٤۔ اور اس عورت سے سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار بار قسم کھا کر کہے بے شک یہ مرد جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر خدا کا غضب ہو۔ اگر یہ سچا ہو۔ (سورۂ نور)

١٨٥۔ جو لوگ پاکدامنوں کو عیب لگائیں اور پھر چار گواہ نہ لا سکیں تو ایسے لوگوں کو اسی دُرّے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی نہ مانی جائے اور یہ فاسق لوگ ہیں۔ (سورۂ نور)

١٨٦۔ بدکاری کرنے والی عورت اور مرد سو دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو دُرّے مارو۔ (سورۂ نور)

١٨٧۔ چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کے ہاتھ اللہ کی طرف سے ان کے کردار کے عوض بطور سزا کے کاٹ ڈالو۔ (سورہ مائدہ)

١٨٨۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔ خدا ان کو بہشتوں میں داخل کرے گا۔ (سورۂ الحج)

١٨٩۔ اور اگر تم کو اس (کتاب) میں جو ہم نے اپنے بندے (رسول اللہ) پر نازل فرمائی ہے کچھ شک ہو تو اسی طرح کی ایک سورت تم بھی بنا لاؤ اگر تم سچے ہو۔ (سورۂ بقرہ)

١٩٠۔ جو شخص خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہو تو ایسے کافروں کا خدا دشمن ہے۔ (سورہ بقرہ)

١٩١۔ اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں۔ (سورۂ بنی اسرائیل)

١٩٢۔ اور زنا کے پاس بھی نہ جانا کہ وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔ (سورۂ بنی اسرائیل)

١٩٣۔ لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو کہ قیامت کا زلزلہ ایک حادثہ عظیم ہوگا۔ (سورہ الحج)

١٩٤۔ جو لوگ پرہیزگار اور برے کاموں سے بے خبر اور ایماندار عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا و آخرت دونوں میں لعنت ہے اور ان کو سخت عذاب ہوگا۔ (سورۂ عنکبوت)

١٩٥۔ کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔ (سورۂ عنکبوت)

١٩٦۔ جو نماز کی پابندی کرتے اور زکات دیتے اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں یہی اپنے پروردگار (کی طرف) سے ہدایت پر ہیں اور یہی نجات پانے والے ہیں۔

١٩٧۔ اے اہل ایمان خدا کا بہت ذکر کیا کرو۔ (سورۂ احزاب)

١٩٨۔ خدا جو اپنی رحمت (کا دروازہ) کھول دے تو اس کو بند کرنے والا نہیں۔ (سورۂ فاطر)

"تردیدِ بغاوت"

رونق دکنی سیمابی (جمشید پور)

نَفَسِ چند کے ہر لمحہ کو پیارا کر لیں
چاہنے والا ہو مخلص تو گوارا کر لیں

رخصتی کا وہ سماں یاد تو ہو گا انجم
تم چلی آئی تھیں ہمراہ میری ڈولی تک
اور ازراہِ تمسخر یہ کہا تھا دھیرے سے
جاؤ سرتاج کے اب "رحم و کرم" پر جینا
وہ اگر زہرِ ہلاہل بھی پلا دے پینا
سہمی سہمی ہوئی جب میں ہوئی ڈولی میں سوار
گیت بابل کے ہوئے تیز بہ اندازِ بُکا
پی لئے میں نے اُمنڈتے ہوئے آنسو خاموش
خیر مقدم ہوا سسرال میں اُمید افزا
ساس نے بڑھ کے بلائیں لیں، مجھے پیار کیا
کچھ رسومات تھیں جو ختم بہ اسلوب ہوئیں
اور اب میں تھی اکیلی اور عروسی حجلہ
اک پُر اسرار خموشی تھی مہکتی تھی فضا
وسط میں تازہ گلابوں کا تھا اک گلدستہ
پھوٹتی خود تھی میرے جسم سے بوئے دلہن
نیلگوں بلب اُدھر گھور رہا تھا مجھ کو
غرق موجوں میں تھی کشتی کی طرح میں گم صم
خوف انجانا تھا کیا جانے وہ کیسے ہوں گے
یک بیک "رحم و کرم" والا تمہارا جملہ
سانپ کی طرح مجھے ڈسنے لگا رہ رہ کر
مہوکی تم نے "درندہ" سے عبارت کی تھی
رسمِ شادی کے اصولوں سے بغاوت کی تھی
ایسے میں کوئی دبے پاؤں در آیا چپ سے
ذہن میں لپکا اسی وقت درندہ کا خیال

میں نے اندازہ لگایا یہ وہی تو وہ ہوں گے
ورنہ بیباکی سے یوں کون گھس آسکتا ہے
سیج پر بیٹھ گئے سامنے وہ تکنے لگے
سانس روکے رہی یہ خوف تھا اب کیا ہوگا
رکھ دیا ہاتھ میری پشت پہ پھر بھولے سے
منجمد ہونے لگا خون رگوں میں جیسے
نام دھیرے سے لیا اور جو گھونگھٹ اٹھا
پلکیں میری جھکیں گول مٹول آنکھوں پر
کچھ حیا اس میں تھی کچھ خوف تھا کچھ استعجاب
اس ادا پر میرے شاید انھیں پیار آ ہی گیا
ہاتھ میں ہاتھ لیا کیا کہا یہ یاد نہیں
تھا سحر خیز وہ اندازِ تکلم اُن کا
میٹھا جس میں تھا سحر یا ہوا اک درد خلوص
برقی اک لہر تھی جو دوڑ گئی نس نس میں
دل پہ قابو نہ رہا ہوش ہی کب تھا بس میں
اور میں کھو گئی پھیلائی ہوئی باہنوں میں
صبح اٹھی تو بدن ٹوٹ رہا تھا میرا
میں نے تنہائی میں بھرپور اک انگڑائی لی
درد میں کیف تھا زہ زہ کے ہنسی آتی تھی
اب یہ عالم ہے کہ گھبرائے ہے جی اُن کے بغیر
خود بخود آپ ہی بھر آتے ہے جی اُن کے بغیر
نشہ سا رہتا ہے دن رات کسک رہتی ہے
اُفقِ شوق پہ دن رات دھنک رہتی ہے
کس نے کیا کھویا ہے کیا پایا ہے یہ یاد نہیں

حریمی دسترخوان

آم کا لذیذ مربّہ

اشیاء۔ کچے آم ایک سیر، شکر تین پاؤ، لیموں ایک عدد، پانی تین پیالی، زعفران حسب خواہش، زردہ رنگ معمولی سا، کیوڑہ چند قطرے۔

ترکیب۔ ایک برتن میں ٹھنڈا پانی ڈالیں۔ آم دھو کر پانی میں ڈال دیں۔ پھر انھیں چھیل لیں۔

آم کی حسب خواہش قاشیں کرلیں۔ گٹھلی پھینک دیں۔

ایک برتن میں پانی ڈال کر کٹی ہوئی قاشیں اس میں ڈال دیں۔

قاشوں پر لیموں کا رس نچوڑ کر تقریباً دو گھنٹے تک پانی میں بھیگنے دیں۔

ایک دیگچی میں تین پیالی پانی، رنگ، اور شکر ڈال کر دھیمی آنچ پر تقریباً دس منٹ پکائیں۔

شیرے میں اُبال آجائے تو چمچے سے میلا جھاگ نکال کر پھینک دیں۔

ایک برتن پر چھلنی رکھیں۔ چھلنی میں آم کی قاشیں ڈالیں۔

جب قاشوں کا پانی نکل جائے تو ایک چمچے سے قاشیں اٹھا کر علیٰحدہ برتن میں رکھیں۔

اب قاشوں کو شیرے میں ڈال کر دھیمی آنچ پر پکائیں

جب قاشیں گل جائیں اور شیرہ گاڑھا ہوجائے تو دیگچی چولہے سے اتار لیں۔ اور کیوڑے کے چند قطرے، اور زعفران مربّے میں ڈالیں۔

صاف اور خشک مرتبان میں۔

جب مربّہ ٹھنڈا ہوجائے تو چمچے سے ڈالیں۔

مرتبان کا منھ کپڑے یا ڈھکن سے اچھی طرح بند کردیں۔

لیجئے کچے آموں کا لذیذ مربّہ تیار ہے۔ آم کا مربّہ سالہا سال تک محفوظ رہ سکتا ہے۔

نوٹ۔ برتن میں اتنا پانی ڈالیں کہ قاشیں پانی میں ڈوب جائیں۔

مربّے کے لئے [illegible] لیں تو بہتر ہے لیکن رس دار آم بھی نہ لیں۔

خریدتے وقت ہاتھ سے آم کو دبا کر دیکھیں۔ معمولی نرم آم خریدیں۔ اگر [illegible] شکر [illegible]۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے اور جواب طلب امور کے لئے لفافہ و ٹکٹ ارسال کریں۔

تبصرات

عرش:- نعتیہ کلام جناب کشفی لکھنوی۔

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۳۲۔ قیمت ایک روپیہ۔ ناشر:- عرفان بکڈپو۔ پاٹا نالہ لکھنؤ

جناب کشفی لکھنؤ کے باکمال شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جب مشاعرے میں جاتے ہیں اسے لوٹ لیتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ موصوف نورِ بصیرت سے محروم ہیں۔ اور بڑی بڑی نعتیں جو جو وہ کہتے ہیں حافظہ کے زور میں پڑھتے ہیں۔

اس مختصر سے مجموعے میں ۲۵ نعتیں شامل ہیں جنھیں پڑھکر کشفی صاحب کی اس والہانہ محبت و عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے جو انھیں رسول اکرم صلعم اور صحابہ کرامؓ سے ہے۔

نمونہ کے طور پر ایک نعت نقل کر رہا ہوں۔

پائی ہے وہ عظمت درِ محبوب خدا نے
آتے ہیں فرشتے بھی جہاں سر کو جھکانے

جب نورِ محمد کی ضیا پیشِ نظر ہے
اب کون سنے طور و تجلی کے فسانے

سرکار کا روضہ ہے وہ سرچشمۂ رحمت
پائی ہے مراد اپنی ہر اک شاہ و گدا نے

احسان ہے دنیا پہ ابوبکرؓ و عمرؓ کا
آئے جو نظر صدق و عدالت کے زمانے

انسان کو نظر آتی ہے ایمان کی عظمت
وہ درس دیا حضرت عثمانؓ کی حیا نے

پھیلی ہیں ہر اک سمت جو اسلام کی کرنیں
بخشی ہے ضیا ان کو علیؓ شیرِ خدا نے

[illegible] کے ہونے سے یا پھر آپس میں بلند آواز سے گفتگو کرنے سے شروع ہو جاتا ہے جس پر دیگر خواتین کو اعتراض ہوتا ہے تو ایک [illegible] اجلاس کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ کارروائی اس زور شور سے ہونے لگتی ہے کہ مردانے میں آواز آجاتی ہے اور صورت حال پر قابو پانے کے لئے منتظمین کو اپنی فوج بے قاعدہ روانہ کرنی پڑتی ہے۔ بعض وقت تو دخل دینے سے مسئلہ پیچیدہ ہو جاتا ہے تو فوج کو واپس بلا لینا پڑتا ہے۔

پڑوسیوں کا اجلاس ایک خاص قسم کا ہوتا ہے۔ جب محلے کی خواتین کے شوہر اپنے متعلقہ کاموں اور بچے اسکولوں کو چلے جاتے ہیں۔ تو پڑوسنیں آپس میں کسی ایک گھر میں جمع ہو کر اپنا اجلاس منعقد کر لیتی ہیں۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ پڑوسنیں اپنے گھروں کے دروازوں یا دریچوں میں ہی منعقد رہتی ہیں اور اجلاس پوری کامیابی کے ساتھ چلتا ہے۔ کسی وقت اس قسم کے اجلاس کے نتیجے میں ان خواتین کے شوہروں کا جنگ و جدل کا اجلاس ہو جاتا ہے۔

اب تک ہم اسی خیال میں تھے کہ مردوں کی طرح خواتین کو خاص طور پر اجلاس منعقد کرنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ اُن کا اجلاس کہیں بھی اور کسی بھی وقت شروع ہو سکتا ہے۔ لیکن جب مردوں نے پے در پے ادبی اجلاس اور مشاعرے برپا کرنے شروع کر دیئے تو خواتین نے محسوس کیا کہ مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کے لئے انھیں بھی اپنے اجلاس منعقد کرنے چاہئیں حالانکہ اکثر خواتین تو مردانہ ادبی اجلاس ایک گوشے میں بیٹھ کر اپنا علیحدہ اجلاس منعقد کر لیا کرتی تھیں جو مردوں کے اجلاس کے ختم ہونے کے بعد بھی جاری رہتا تھا لیکن اس کی حیثیت مسلمہ نہ تھی۔ غالباً اسی احساس کے تحت اب خواتین نے اپنے ادبی اجلاس اور مشاعرے منعقد کرنے شروع کر دیئے ہیں۔

خواتین کے ادبی اجلاس کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جس میں صرف پروگرام میں حصہ لینے والی خواتین ہوتی ہیں اور شرکت کرنے والی [illegible] خواتین سب ہی ہوتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں پروگرام [illegible] والی بھی خواتین ہیں اور شرکت کرنے والی بھی خواتین۔ [illegible] کسی مرد کی ہوتی ہے۔ اور مہمان خصوصی بھی ایک مرد ہوتا [illegible] مردوں کے ساتھ دو چار مرد اور بھی آجائیں تو وہ بھی شریک [illegible] ہیں۔ [illegible] کہ صدر کوئی مرکزی وزیر یا نائب وزیر اور مہمان خصوصی [illegible] پیشا یا کوئی دولت مند امیر و کبیر ہوتا ہے۔ تیسری قسم کا ادبی اجلاس وہ ہوتا ہے جس میں صرف خواتین ہی خواتین ہوتی ہیں کسی مرد کا سایہ تک اس اجلاس پر نہیں پڑتا۔ خواہ کوئی مرد نامرد ہی کیوں نہ ہو اس اجلاس میں مردوں کے شریک ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ زنانہ لباس پہن کر اپنی بیوی کے ساتھ اس کی سہیلی کی حیثیت سے شریک ہوں۔ لیکن اس میں زبردست خطرہ درپیش ہوتا ہے کیونکہ اگر پکڑے گئے تو اجلاس سے زندہ اور صحیح وسلامت نکلنا ممکن نہیں۔

(باقی آئندہ)

انعامی مقابلہ

(رضیہ بٹ)

اسے پانچ سو روپے کی اشد ضرورت تھی۔ اگلے ماہ اسکو داخلہ بھیجنا تھا۔ کچھ کتابیں خریدنا تھیں اور ہوسٹل کا بل دینا تھا۔ پیسے کے لیے دوڑ دھوپ اس نے ابھی سے شروع کر دی تھی۔ گاؤں وہ کھ نہیں سکتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ ماں کے پاس پیسے نہیں ہوں گے اور نہ ہی وہ اتنی بڑی رقم کا بندوبست کر سکے گی۔ . . . . . .

. . . اس کے پاس تو آخری چیز چاندی کی جھانجریں تھیں جو اس نے اپنی بہو کے لئے مدت سے سنبھال کر رکھی تھیں۔ لیکن شریف کی پڑھائی کا شوق اتنا بڑھا تھا کہ اس نے یہ جھانجریں بیچ ڈالی تھیں ماں کو دکھ تو بہت ہوا تھا۔ لیکن شریف نے جب اس کے گلے میں باہیں ڈال کر بڑے ہی پیار سے کہا تھا "ماں مجھے تعلیم حاصل کر لینے دے پھر دیکھنا۔"

"پھر کیا ہوگا؟" ماں نے کسی سہانے تصور سے مغلوب ہوئے بغیر کہا تھا۔

"پھر۔ پھر تیرا بیٹا بہت بڑا افسر بنے گا ماں۔ کالج میں پڑھایا کرے گا۔ اتنی ڈھیر ساری تنخواہ ہر ماہ لاکر تیرے ہاتھ پر رکھ دیا کرے گا۔ پھر اس سے جو تیرا جی چاہا کرے گا خریدا کرنا۔ چاندی کی جھانجریں آج کل کوئی نہیں پہنتا ماں۔ شہر میں تو بڑی اعلیٰ اعلیٰ چیزیں ملتی ہیں بہوؤں کے لیے۔ پھر تیری بہو بھی تو . . . پڑھی لکھی ہوگی ماں۔"

اور ماں اس کے بازو گردن سے جھٹک کر نکالتے ہوئے کہتی "دیکھ شریف دلہن میں تیری مرضی کی نہیں اپنی مرضی کی لاؤں گی۔ شہر کی کسی لڑکی کے خیال میں مت رہنا۔ میں تو اپنے گاؤں کی کسی الھڑ مٹیار سے تیرا ناتہ جوڑوں گی۔ جو جھانجریں پہن کر سارے گھر میں ہرنی کی طرح چوکڑے بھرتی پھرے اور چھن چھن کی آوازیں سارے گھر میں گونجتی رہیں۔"

"اچھا ماں جو تیری مرضی!" وہ ماں کے خواب کو توڑنا نہیں چاہتا تھا اور پھر شادی کے لئے تو ابھی عرصہ پڑا تھا۔ اسے تو ضرورت پیسے کی تھی۔ شہر جاکر کالج میں داخلہ لینا تھا۔ ہوسٹل کے اخراجات برداشت کرنا تھے۔ کتابیں خریدنا تھیں۔

اُسے تو لگن تھی پڑھنے اور صرف پڑھنے کی۔ ایف اے تو اس نے قریب والے قصبہ کے انٹر کالج سے کر لیا تھا۔ اب بی اے میں داخلہ لینا تھا۔ جس کے لئے ماں کی رکھی رکھائی پونجی کے ساتھ جھانجریں بھی کام آگئیں۔ اس سے داخلہ ہوا اور کئی ماہ کا خرچہ بھی چلتا رہا۔ اپنے ایک شہری دوست کی وساطت سے اس نے دو بچوں کی ٹیوشن بھی کر لی تھی اس طرح ماں پر دباؤ ڈالے بغیر وہ اپنے تعلیمی مراحل طے کرتا رہا تھا اور لنڈے بازار سے دو پتلونیں اور قمیصیں بھی خرید لی تھیں۔ کبھی کبھی ماں اپنی تھوڑی سی زمین کی فصل بیچ کر اس کی ضرورت پوری کر دیتی تھی۔ بیٹا بی اے میں پڑھ رہا تھا۔ ماں کے لئے یہ فخر کا مقام تھا۔ گاؤں کے کسی لڑکے نے ابھی اتنی تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ چودھری کے بیٹوں کی تو بات ہی اور تھی۔ وہ تو بچپن ہی سے تعلیم کے لئے باہر جا چکے تھے۔ باقی سب لوگوں میں شریف آگے تھا۔ اس کے دو تین دوست میٹرک تک ہی پہنچے تھے۔ ایک آدھ نے ایف اے فیل ہونے تک دوڑ کی تھی۔ گاؤں کا وہ پہلا لڑکا تھا جس نے ایف اے اچھے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا اور اب بی اے کے آخری سال میں تھا۔

اس آخری سال تک پہنچنے کے لئے اس نے کتنی محنت کی تھی۔ کتنے پاپڑ بیلے تھے یہ وہی جانتا تھا۔ گاؤں والوں پر تو کیا اس نے تو اپنی ماں پر بھی ان تکالیف کو ظاہر نہ کیا تھا جو اسے جھیلنا پڑی تھیں۔ اس کے لئے تو سب سے بڑی تکلیف

شہر کے امیرزادوں کا کلاس فیلو ہونا ہی تھا۔ لمبی لمبی گاڑیوں اور بیش قیمت ملبوسات میں آنے والے لڑکے اس کے ذہن پر برتری کا بار ڈالتے ہی رہتے لیکن اس نے اس بات کا اظہار کبھی ہونے ہی نہ دیا تھا اسکو تعلیم حاصل کرنا تھی اور ہر مصیبت جھیل کر بھی وہ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

لیکن

اب اسے پانچ سو روپے کی اشد ضرورت تھی۔ وہ ماں کو نہیں لکھ سکتا تھا۔ اس کی بڑی بہن کو سسرال والوں نے لڑ جھگڑ کر میکے بھیج دیا تھا اور اپنے پانچ بچوں سمیت ماں کے پاس آگئی تھی ماں کے حالات چھ افراد کے اخراجات کے متحمل کہاں تھے۔ لیکن وہ بھی کیا کرتی۔ کہاں جاتی۔ کوئی اور ٹھکانہ بھی تو نہیں تھا۔ تھوڑی سی آراضی جو ماں کے پاس تھی اس سے صرف سوکھی . . . . روٹی چل سکتی تھی۔

گھر کے حالات کا شریف کو اچھی طرح علم تھا اس لئے پانچ سو روپے کی اس رقم کے لئے وہ گھر اشارتاً بھی نہ لکھ سکتا تھا یہ پانچ سو روپے اسے اپنے طور پر اکٹھا کرنے تھے۔

اپنے قریبی دوست عمو سے اس نے قرض لینے کا سوچا۔ اس کے والدین امیر و کبیر تو نہ تھے لیکن مخلص اور ہمدرد ضرور تھے دوستی کی قدر مشترک معاشی ہمسری تھی۔

اس دن شریف ہوسٹل جانے کی بجائے کالج سے چھٹی پر عمو کے ساتھ ہی چلا آیا۔ وہ کبھی کبھی عمو کے ہاں دوپہر کا کھانا کھانے چلا جاتا تھا۔ ہوسٹل کی گھی بندھی معمول کے مطابق ایک ہی قسم کی روٹی کھاتے کھاتے جب جی اُچاٹ ہو جاتا تو وہ عمو سے کہتا: آج تمہارے ساتھ چلوں گا ــــ بہت دنوں سے گھر کا کھانا نہیں کھایا:

اور عمو بڑی اپنائیت سے ہمیشہ کہا کرتا: یار تکلف کرتے ہو، ورنہ دوپہر کا کھانا تو روز ہی ہمارے ہاں کھا سکتے ہو:

شریف ٹھیک ٹھیک کر کہتا: بھئی ہم جانتے ہیں کہ قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا: اس کے باوجود عمو کے ہاں جب بھی کوئی خاص چیز پکتی وہ اسے زبردستی کھینچ کر گھر لے آتا۔

عمو کی امی بڑے پیار سے اپنے بیٹے کے اس دوست کو کھانا کھلاتیں۔ سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی شہروں میں بڑے اہتمام سے پکائی جاتی ہے عمو کے ہاں بھی اس کا خاص اہتمام ہوتا۔ جانے کہاں کہاں کہہ کر امی اصلی مکھن منگواتیں خود ساگ پکاتیں۔ بڑا ہی مزیدار ساگ بنتا تھا۔

انڈوں والے کوفتے بھی جب گھر میں بنتے' عمو شریف کے ساتھ ہی کھاتا۔

اب تو عمو کی امی خود ہی کہہ دیا کرتیں: بیٹے آج پلاؤ بناؤں گی شریف کو ساتھ لے آنا:

"ماش کی دال بھونوں گی۔ شریف کہتا تھا دال کھانے کو جی چاہتا ہے' اُسے بھی لے آنا بیٹے:

آج کوفتے پکیں گے۔ شریف کو ضرور کھلانا:

"چینی ملی ہے آج کھیر بناؤں گی شریف کو ساتھ لیتے آنا۔

دونوں خاصے بے تکلف دوست تھے اور اب تو عمو گھر والوں کے لئے بھی کوئی اجنبی نہ تھا۔ انہی تعلقات کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا عمو کے ابا سے قرض لے لے گا۔ پھر ٹیوشن فیس ملے گی تو چند ماہ میں قرضہ اتار دے گا۔

اس دن وہ اسی ارادے سے عمو کے ساتھ ان کے گھر گیا۔

"اچھا ہوا تم آگئے: امی نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا، صبح عمو سے کہنا یاد ہی نہ رہا تھا۔ آج بینگن بنائے تھے:

"آپ کی محبت کا شکریہ خالہ جی: وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے آج بینگنوں کی کالج ہی میں خوشبو آگئی تھی۔ دیکھ لیجئے خود ہی آ پہنچا:

"تیرا اپنا گھر ہے بیٹے۔ مجھے تو تُو عمو ہی کی طرح لگتا ہے:

"بہت بہت شکریہ خالہ جی۔ مجھے بھی جب گھر کی یاد آتی ہے ادھر ہی کا رخ کرتا ہوں:

"چلو ہاتھ منہ دھو لو۔ میں کھانا لگاتی ہوں:

"چچا جان نہیں آئے ابھی۔ ان کا انتظار کر لیں:

"وہ جانے کب آئیں ان کے لئے کھانا نکال کر رکھ لوں گی آج انھیں فرصت نہیں ملے گی آنے کی:"

"جی ــ ؟:

شریف کا دل ڈوب گیا۔ وہ تو ان سے پیسے اُدھار مانگنے کی

فرض سے آیا تھا۔ ممو اپنے کمرے میں کتابیں رکھنے چلا گیا تھا۔ اس کی امی باورچی خانے چلی گئیں۔

شریف خیالوں کی اُدھیڑبن میں کھو گیا پیسے کا بندوبست کرنا ضروری تھا۔ گو ان کی ضرورت پڑنے میں ابھی کچھ دن تھے، لیکن ابھی سے فکر تھی۔ چھوٹی موٹی رقم تو نہ تھی۔ پورے پانچ سو کی ضرورت تھی۔

وہ جن بچوں کو پڑھاتا تھا۔ ان کی ممی سے بھی دو دن پہلے اس نے جھجکتے جھجکتے اشارتاً پیسوں کی بات کی تھی۔ لیکن ہر ماہ صرف اپنے میک اپ پر ہی اتنی رقم خرچ کر دینے والی ممی نے بڑی شائستگی سے مسکراتے ہوئے معذرت کر دی تھی۔

"شریف صاحب اتنے پیسے خرچ سے نکالنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہیں۔ صاحب تو مجھے بنے تلے پیسے دیتے ہیں۔ ہاں آپ کی ٹیوشن فیس آپ کو وقت مل جاتی ہے وہ دو چار دن پہلے کوشش کروں گی آپ کو دے دوں"

"بیگم صاحبہ مجھے ان پیسوں کی پڑھائی کے لئے ضرورت ہے آپ ہر ماہ ٹیوشن فیس میں سے پیسے کاٹ لیا کریں۔ میں بچوں کو اپنے امتحانوں کے دنوں میں بھی پڑھانے آیا کروں گا"

"ٹھیک ہے۔ لیکن میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ کہیں اور سے یہ رقم لے لیں"

شریف مایوس ہو کر چپ ہو رہا تھا۔ پھر اس نے ارادہ کر لیا کہ ان بیگم صاحبہ سے پیسے نہیں مانگے گا۔ غصے میں تو جی چاہا تھا کہ پڑھانا بھی چھوڑ دے لیکن اس میں نقصان اپنا ہی تھا۔ کتنی مشکلوں سے یہ کام ملا تھا۔ اسے کھو دینا حماقت ہی تھی۔

ممو کے ابو سے قرض لینے کا خیال اسے اچانک ہی آ گیا تھا اتنے مخلص لوگ تھے۔ کتنا پیار کرتے تھے اس سے۔ ممو کی امی تو اُسے اپنا ہی بیٹا سمجھتی تھیں۔

یہاں سے پیسے بلا حیل و حجت ملنے کی اُسے قوی اُمید تھی اسی لئے وہ آج ممو کے ساتھ بن بلائے ہی آ گیا تھا۔

لیکن ــــ

ممو کے ابو آج شاید ہی گھر آئیں۔

تو ــــ

کیا ــــ

اُسے ممو کی امی سے پیسے مانگنا چاہئیں؟"

بیٹھک میں ایک گدے دار کرسی پر بیٹھا وہ تذبذب کے عالم میں سوچ رہا تھا۔ اگر دونوں نے انکار کر دیا تو۔؟

اس تو کے آگے کچھ سوچنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

"شریف ــــ" ممو نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے اُسے بلایا۔

"ہوں"

"آؤ یار کھانا کھا لیں۔ بہت بھوک لگ رہی ہے"

"ہاں"

"آؤ پھر ــ"

وہ بے دلی سے اُٹھتے ہوئے ممو کو دیکھ کر جھجکتے ہوئے بولا۔ "اپنے ابو کا انتظار کر ہی لو۔ اتنی بھی کیا جلدی ہے"

"نہیں بھئی۔ ان کے آنے کا کچھ پتہ نہیں۔ ان دنوں وہ بڑے چکر میں ہیں"

"کیوں"

"کچھ پیسے کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں"

"کچھ پیسے کے لئے۔؟"

"ہاں یار۔ دو تین ہزار کے لئے سرگرداں ہیں۔ ہم متوسط طبقہ کے لوگوں کے لئے ایسی مصیبتیں کھڑی ہی رہتی ہیں"

"میں ــ میں تمہاری بات سمجھا نہیں ــ"

"یار ابا جان نے کراچی سے کچھ مال منگوایا تھا۔ پیسے کم تھے بڑی باجی کی چوڑیاں گروی رکھ کر ابا جی نے مال چھڑوا لیا خیال تھا کہ ایک دو ماہ میں مال بک جائے گا تو وہ چوڑیاں لے آئیں گے۔ پر باجی کے سسرال والوں نے قیامت مچا دی ہے ــ بیچاری باجی بھی پریشان ہیں اور ابا جی بھی ــ بس اسی دوڑ دھوپ میں لگے ہیں کہ کہیں سے پیسہ قرض لے کر چوڑیاں گروی سے چھڑوا کر باجی کو دے دیں"

شریف کا دل بیٹھ سا گیا۔ اب تو قرض کی بات بھی زبان پر لانا ممکن نہ تھی۔

پھندے بڑے لذیذ تھے۔ لیکن شریف کے حلق میں نوالے

پھنس رہے تھے۔ اپنی پریشانی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ کھانا زہر مار کرتا رہا۔

اس رات اُسے نیند نہیں آئی۔ سوچوں کے تانے بانے ہی بنتا رہا۔ کبھی دل میں خیال آتا کہ ماں کو خط لکھ دے۔ کہیں نہ کہیں سے مانگ تانگ کر پیسے بھیج ہی دے گی۔ اور کچھ نہیں تو فصل بیچ دے گی۔

لیکن ——

فصل بک گئی تو بہن اور اس کے بچے سال بھر کھائیں گے کیا۔ ؟؟

پھر ——

پھر ——

وہ کیا کرے۔

کہاں سے اتنے پیسے لائے ؟؟

اُسے اپنی کلاس کے امیر و کبیر لڑکے نوید کا خیال آیا۔ اس کا صرف سگریٹ ہی کا خرچہ پانچ سو روپے ماہوار سے اوپر تھا۔ وہ ٹھاٹھ سے کالج آتا تھا۔ اس کی اپنی گاڑی تھی جس میں سارا دن دوستوں کو بھر کر وہ شہر کی سڑکیں ناپا کرتا تھا۔ دوستوں کو پکنک کھلانے چائے اور کافی پلانے اور کبھی کبھی چائنیز میں کھانا کھلانے بھی لے جاتا تھا۔

لیکن ——

وہ اس سے قرض کیونکر مانگے۔ وہ تو اس سے بات کرتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ وہ اس سے ذہین نہیں تھا۔ زیادہ خوبصورت بھی نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی ڈرتا تھا۔

شاید اس کی امارت سے۔

یا ——

اپنی غربت سے۔

نوید سے پیسے مانگنے کا سوال ہی نہ تھا۔

پھر ——

پھر ——

سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھر گیا۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے، اس کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ پڑھائی سے بھی دل اُچاٹ ہوگیا تھا۔ دو دفعہ تو اس نے پوری سنجیدگی سے پڑھائی ادھوری چھوڑ کر گاؤں چلے جانے کا سوچا —— ہوسٹل کا کمرہ خاموشی سے چھوڑ کر چپ چاپ نکل جانے کا ارادہ کیا۔

لیکن ——

لیکن ——

وہ ایسا بھی نہ کر سکتا تھا۔ اُسے محنت کرنا تھی۔ بی۔ اے پاس کرنا تھا۔

اگلے دن اس نے پروفیسر جمیل سے اپنی مشکل بیان کرنے کا سوچا۔ پروفیسر جمیل انسان دوست آدمی تھے۔ اس نے لڑکوں سے سنا تھا کہ وہ چپکے چپکے کئی غریب طالب علموں کی مدد کرتے ہیں۔

لیکن ——

ان سے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کو اپنے مسئلے کا حل مل گیا اس کی ضرورت خاموشی ہی سے بڑے آبرو مندانہ طریقے سے حل ہو جانے کا امکان نظر آگیا۔

وہ اپنے خالی پیریڈ میں لائبریری میں آبیٹھا تھا۔ اور پریشانی کو دور کرنے کے لئے میز پر پڑا ایک رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا تھا۔ یہ خواتین کا کوئی ماہنامہ تھا اور شاید کوئی لڑکی اُسے میز پر رکھ کر بھول گئی تھی۔

بے دلی سے ورق گردانی کرتے ہوئے وہ چونک گیا کسی پر آگے کو جھک کر وہ جلدی جلدی پڑھنے لگا۔

یہ ——

ایک اشتہار تھا۔

رسالے کے سالگرہ نمبر کے لئے افسانہ چاہیئے تھا۔

پہلے نمبر پر آنے والے پانچ افسانوں پر معاوضے کے علاوہ پانچ سو روپے انعام تھا۔

"افسانہ اس ماہ کی سولہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانا چاہیئے"

سولہ تاریخ !

"آج کیا تاریخ ہے" خوشی سے بہکتے ہوئے شریف نے سوچا۔

"دس" اس نے خود ہی کہا۔

اور —

پھر —

وہ —

خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے میز پر زور سے مکا مارا۔ "میں افسانہ لکھوں گا — ضرور — ضرور —"

کچھ طالب علم برابر والی میز پر بیٹھے تھے۔ شریف کی اس حرکت پر مسکرانے لگے۔ آج شریف نے اس طنزیہ مسکراہٹ کی پرواہ نہیں کی۔ رسالہ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔

وہ کبھی کبھی ادبی جریدوں کے لئے چھوٹے چھوٹے افسانے لکھا کرتا تھا۔ یہ افسانے قارئین سے بھی داد پاتے تھے۔ مگر ان کا معاوضہ اسے بیس پچیس روپے سے کبھی زیادہ نہ ملا تھا۔ پھر بھی اسے فخر تھا کہ وہ ادبی رسائل میں کبھی نہ کبھی چھپتا ہی ہے۔

اور —

خواتین کے اس رسالے کے لئے افسانہ لکھنا تو کچھ مشکل ہی نہ تھا۔ ایک حسین لڑکی۔ ایک خوبرو نوجوان۔ دونوں میں زمانے بھر کی خوبیاں — ڈرامائی ٹکراؤ — محبت — زمانے کی اونچ نیچ — دلداریاں، دل فگاریاں — انجام چاہے کامیڈی کر لو یا چاہے ٹریجڈی۔

دن کم تھے۔ لیکن اس کو اس مقابلے میں حصہ لینا تھا اور انعامی مقابلے میں جیتنا تھا۔ پہلے پانچ افسانوں پر پانچ پانچ سو روپے کے انعام تھے۔

پہلا نہ سہی دوسرے نمبر پر ہی سہی۔

دوسرے نہ تو تیسرے۔

تیسرے نہ تو چوتھے۔

اور —

چوتھے بھی نہ تو پانچویں نمبر تو افسانہ آ ہی جائے گا۔

اسے اپنی تحریر پر یقین تھا کہ افسانہ ضرور انعام پائے گا۔

رسالہ اگلے ماہ کے پہلے ہفتے میں مارکیٹ میں آجانا ضروری تھا۔ اپنا افسانہ اس میں دیکھتے ہی وہ ایڈیٹر کو خط لکھ دے گا کہ اسے انعامی رقم فوری طور پر بھیج دی جائے۔

اس نے تو اس بات میں بھی حرج نہیں سمجھا کہ وہ پانچ سو روپے کے لئے انہیں تار دے دے گا۔

وہ افسانہ سوچنے لگا۔

دو دن اور دو راتیں سوچنے میں گزر گئیں۔ کبھی اس کے ذہن میں پہاڑوں کی جھاڑیوں والی چوکڑیاں بھرتی گاؤں کی کوئی گوری آجاتی کبھی شہر کی الٹرا ماڈرن لڑکی اپنے اسمارٹ جسم اور خوبصورت میک اپ سے آراستہ چہرے کے ساتھ خیالات پر چھا جاتی ہیرو کا تصور اس کے اپنے ہی اردگرد منڈلاتا رہا۔

آخر —

اس نے افسانہ لکھ ہی مارا۔ بڑا ہی رنگین بڑا ہی حسین رومانوی افسانہ — دھیمی دھیمی محبت کی سلگتی آنچ میں جلتے دو دلوں کی کہانی اس نے بڑے خوبصورت انداز میں لکھی۔

اسے پورا یقین ہو گیا کہ اس کا افسانہ انعام کا مستحق قرار پائے گا۔

اس نے کئی بار افسانے کو پڑھا۔ پھر مطمئن ہو کر اسے لفافے میں ڈال کر لفافہ بند کر دیا۔ انعام پانے کے یقین کو پختہ بنانے کے لئے اس نے اپنا نام لکھنے کے بجائے لڑکی کا نام لکھ دیا۔ شک کی ہر گنجائش مٹانا ضروری تھی۔ کیا خبر یہ خواتین کے رسالے صرف خواتین ہی کے افسانوں پر انعام دیتے ہوں۔

ہر لحاظ سے مطمئن ہو کر اس نے لفافے پر پتہ لکھا اور پوسٹ کر دیا۔

افسانہ پوسٹ کر کے وہ واپس اپنے کمرے میں آیا تو بےحد خوش تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سر سے تفکرات کا سلسلہ بوجھ اتر گیا ہو۔ طبیعت کی جھلاہٹ اعصاب پر چھائی پژمردگی اور ذہن پر مسلط مایوسی دور ہو گئی۔

وہ جھوم جھوم گیا۔

گنگناتے ہوئے اپنے بستر پر لیٹا۔

اور —

تکیے کے تلے رکھا رسالہ نکال لیا۔

اس نے اس رسالے کو چوم لیا۔

اس رسالے نے۔

اس کی پریشانیاں دور کر دی تھیں کسی شفیق اور مہربان ہستی کی طرح اس کے دکھ بانٹ لئے تھے۔

وہ خوش تھا۔

بہت خوش۔

اس نے رسالے کا وہی صفحہ نکالا۔

اشتہار کو ایک بار نہیں کئی بار پڑھا اور پھر فرطِ شوق و مسرت سے اسے چوم لیا۔

پھر اس نے پہلے رسالے کی دو تین سلسلے وار کہانیاں بھی پڑھ ڈالیں۔ ان کہانیوں کا اس نے اپنی چھپی ہوئی کہانی سے موازنہ کیا تو اپنی تحریر ان سے کہیں بہتر نظر آئی۔

بڑے اطمینان سے اس نے رسالہ بند کیا۔

لیکن ـــ

رسالہ تکیے کے قریب رکھتے ہی جب اس کی نظر سرورق پر پڑی تو۔

وہ آنکھیں پھاڑے سکتے کے سے عالم میں اسے تکتا رہ گیا رسالے کی پیشانی پر رسالے کے نام کے ساتھ دسمبر کا شمارہ لکھا تھا:

اور اب مارچ گزر رہا تھا۔

شیشے کی دیوار

(آمنہ ابوالحسن)

بھیا کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ شیروانی کھونٹی سے ٹانگتے ہوئے بولے "انو ایک پیالی گرم چائے تو لا دو۔" میں باورچی خانے میں آ گئی۔ آپا ہانڈی بھون رہی تھیں۔ میں نے کہا "آپا جلدی سے ایک پیالہ چائے تو بنا دو۔"

"تمہیں تو ہر وقت چائے کی پڑی رہتی ہے اور پھر یہ بے وقت چائے کیسی۔؟" آپا ناگواری سے بولیں۔

میں نے کہا "میرے لئے نہیں، بھیا کے لیے، ان کا جی اچھا نہیں۔"

"کیا ہوا۔؟" آپا نے جلدی سے کیتلی چولھے پر رکھی اور بھیا کے کمرے کی طرف دوڑ گئیں واپسی پر ان کے ہاتھ پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے کام کرنے لگے۔

بڑے بڑے گھونٹ لے کر چائے ختم کرنے کے بعد بھیا نے کہا "انو ذرا مجھے لحاف تو اڑھا دو۔" اور لحاف اڑھاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ بھیا کا بدن تپ رہا ہے "بخار تیز ہے بھیا دوائی لے آؤ۔"

"یونہی تھوڑا سا ہے، فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"فکر کی بات کیسے نہیں۔" دروازے میں کھڑی ہوئی آپا بولیں۔

"آپ تو اپنا خیال ہی نہیں رکھتے۔ کام۔ کام۔ کام اور فکر بھی۔ آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں کہ ۔۔۔"

بھیا نے لحاف منہ پر کھینچ لیا اور دیوار کی طرف پلٹ گئے آپا روہانسی کھڑی رہیں۔ مجھے یکایک گزرے ہوئے دن یاد آگئے کیا گزرے کے دن تھے بے فکری ہی بے فکری۔ فراغت ہی فراغت مصیبت تو بڑی آپا کی شادی سے شروع ہوئی۔ ذاتی گھر رہن ہوا۔ کرائے کے گھر میں اٹھ آنا پڑا۔ پھر اپنا گھر چھڑانے کی بجائے ابا مقروض ہی ہوتے گئے۔ بس اماں کی ضد تھی گھر کا پہلا کام دھوم دھام سے ہو۔ محلے بھر میں بلکہ دنیا بھر میں شہرت، نیک نامی اور سلیقہ شعاری کے ڈنکے بجیں سو تو بج گئے۔ بڑی آپا کی شادی کا تذکرہ آج تک ہر زبان پر تھا۔ لیکن اس کے بعد کی مصیبت کا حال صرف ہمیں معلوم ہے یا ہمارے خدا کو۔ ابا کی پنشن لگ گئی۔ بھیا ابھی پڑھ رہے تھے۔ آپا رائی سے پربت بن چکی تھیں۔ میں خود محسوس کر رہی تھی۔ مجھ میں کئی تبدیلیاں آچلیں۔ سب سے بڑھ کر ہمیشہ شائستگی سے آہستہ آہستہ بات کرنے والے امی ابا اب ہر وقت چلا چلا کر ایک دوسرے کو الزام دیتے رہتے۔ ابا کہتے "تمہاری ضد نے آج اس حال کو پہنچایا۔ بے جا نام و نمود کی خواہش اور دنیا پسندی نے ہمیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔" امی کہتیں "اگر تم ہی اتنے عقلمند ہوتے تو یہ نیا ڈوبتی ہی کیوں اس وقت ہی سوجھا دیتے، منع کر دیتے، مجھے روک دیتے کسی کے کہنے سے آدمی اپنی عقل تہہ کر کے تو نہیں رکھ دیتا۔"

ایسی بے تکی تکرار سے ہم سہمے سہمے متاثر رہتے جیسے آپا نے کچھ کھو دیا ہو۔ بھیا مستقبل کی سمت بڑھتے ہوئے بھی پشیمان اور رنجیدہ ہوں اور میں۔

یہ کتنا سچ ہے کہ حقائق سے روبرو ہونے کا احساس کم عمری میں بھی تلخی گھول دیتا ہے۔ اپنی دانست میں میں خود کو ایک ایسی ہستی تصور کرتی جس پر بے حد ذمہ داریاں ہوں حالانکہ بھیا ہمیشہ کہتے "تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" ابا بھی کبھی کبھی اپنا غم محسوس کر لیتے۔ "یہ شوخیاں کیوں نہیں کرتی اتنا خاموش کیوں رہتی ہے۔" اماں اور آپا نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ کر رہ جاتیں۔

پھر ایک دن اماں نے بھیا سے کہا۔
"تم کیسے بھائی ہو؟ اپنی بہنوں کے لئے اچھے بر بھی نہیں ڈھونڈ سکتے؟"

"بر تو ہر وقت مل سکتے ہیں امی لیکن . . ." بھیا بولتے بولتے رک جاتے۔ گہری خاموشی ہر طرف پھیل جاتی جیسے بہت سے بادل برسے بغیر اپنے کالے کالے پنکھ پھیلائے ہم سب کے سروں پر چھا گئے ہوں۔ امی کی آنکھیں ماند پڑ جاتیں۔ آپا کی جوانی کا اجالا کانپ کر رہ جاتا۔ ابّا حقے کے کش لگا لگا کر بے قلعی دیواروں کو گھورنے لگتے۔ اس گھر میں تو محسوس ہوتا ہے جیسے دم ہی گھٹ جائے گا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔"

ان کا تنفس تیز ہو جاتا۔ امی کی جھلاہٹ بڑھ جاتی۔
"تم مکان دار سے کہتے کیوں نہیں، ہم انسان ہیں کوئی جانور تو نہیں، رکھنے والے تو جانوروں کے گھر بھی اس سے اچھی حالت میں رکھ لیتے ہیں۔" امی کو ایک دم زندگی کی اچھی حالتیں یاد آنے لگتیں۔ ابّا حقہ چھوڑ کر اٹھ جاتے۔ بھیا اپنے کمرے کی طرف سرک جاتے۔ آپا کے خد و خال کی روشنی اندھیرا بن جاتی اور میں چپ چاپ سوچتی زندگی آخر کس رخ پر جا رہی ہے؟

بہت زیادہ خاموشی چھائے جانے پر بوجھل پن توڑنے کو آپا خواہ مخواہ پوچھ لیتیں "سب کام ہو گیا انو؟ برتن صاف کر لئے صفائی کر چکیں؟"

میں سر کھائی اور اداسی سے کہتی "ہاں آپا" اور میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ کہاں وہ دن کہ ہمارے گھر کام کرنے والے دو دو، چار چار نوکر ادھر ادھر بھاگتے پھرتے اور کہاں یہ زمانہ کہ میں جو سب سے چھوٹی سارے گھر کی لاڈلی تھی۔ ہمیشہ کے کام چور اب صحن و دالان کو جھاڑو تک لگاتی۔ کمرے صاف کرتی۔ چھت و دیواروں سے جالے اتارتی۔ فرش دھوتی اور جو بھی کام ہوتا کرتی، پھر بھی امی ہمیشہ شکایت کرتیں۔
"کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا، زندگی کیونکر گزرے گی اس طرح؟"

ایسے ہی بے کیف شب و روز میں ایک دن بھیا نے پکار کر کہا "آج دو پیالے چائے انو۔" میں حیران رہ گئی۔

"دو کیوں بھیا! آج آپ دو پیالے پئیں گے کیا؟"
بھیا نے کمرے کی چق اٹھائی اور آہستہ سے بولے۔
"آج میرے ساتھ دانش بھی ہے۔"
"کون دانش ـــ؟" میں نے بڑی جستجو سے بھیا کے کمرے میں جھانکا۔

ایک بھونق سا انسان کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا تھا، اس وقت تو مجھے بالکل ایسا ہی محسوس ہوا جیسے یہ آدمی دھات کا بنا ہوا کوئی مجسمہ ہے جو بول نہیں سکتا، کچھ سمجھ نہیں سکتا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد جب اس کی ہنسی گونجی تو یکایک محسوس ہوا کہ سارا گھر خوشیوں سے بھر گیا۔ میں دوڑی باورچی خانے میں گئی اور مسکرا کر آپا سے بولی۔

"آج ایک نہیں دو پیالے چائے آپا۔"
آپا کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں "تجھے چاہیئے؟"
"نہیں" میں نے سکون سے کہا "دانش کے لیے۔"
"کون دانش؟" آپا نے ہکا بکا ہو کر میری طرف دیکھا۔

وہ بھیا کو علم و عقل سکھاتا ہے لیکن شکل سے ایکدم بدھو معلوم ہوتا ہے اور مجھے ڈر ہے آپا کہ . . . کہ . . . میں زور زور سے قہقہہ لگانے لگی۔ آپا کیتلی چولھے پر رکھ، باہر والے کمرے کی طرف بھاگیں۔ پھر آنچل منہ میں ٹھونسے ہنسی روکتی ہوئی آئیں اور خاموشی سے چائے بنانے لگیں۔ جب میں چائے لیکر باہر گئی تو بھیا نے بڑے نرم لہجے میں تعارف کرایا۔

"یہ میری چھوٹی بہن انیس ہے دانش، اور یہ میرے دوست ہیں بھئی۔"

دانش کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ ایک تھرتھراتے ہوئے ہاتھ نے پیالہ اٹھایا اور بس۔

پھر تو اکثر دانش ہمارے ہاں آنے لگا اور بھیا اپنی دبی زبان میں سب کو جتانے لگے۔ بڑے گھر کا ہے بھئی۔ اسے کسی چیز کی کوئی کمی نہیں۔ وہ تو بس دوستی کی خاطر آتا ہے اور ـــ

لیکن امی کو دوستی کا مطلق احساس نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے زمانے میں اسکول میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ سکھی

سہیلیاں نہیں بنائی تھیں۔ کسی انوکھے جذبے کی اپنے دل میں پرورش و حفاظت نہیں کی تھی۔ بلکہ چپ چاپ زینے طے کر کے جوانی میں قدم رکھتے ہی کسی کی دلہن بن کر پرائے گھر اٹھ آئی تھیں۔

بھیا نے بولیں۔ "تم کہتے ہو بڑے گھر کا لڑکا ہے۔ تمہارا دوست بھی ہے تو پھر اپنی بہن کے بارے میں سوچتے کیوں نہیں"

ارے۔ بھیا نروس ہو گئے۔

"ہائے اتنی سڑی سی شکل۔!" میں نے منہ بسورا۔ مجھے آپا کے نصیب پر رونا آنے لگا۔

"لڑکے کی شکل کون دیکھتا ہے پگلی" امی نے مجھے تنبیہ کی بھیا کچھ کہنے کی بجائے اٹھ کھڑے ہوئے اور میں نے بستر پر گٹھڑی بنی ہوئی آپا کو گدگدا کر پوچھا۔

"تمہیں حسن چاہیئے یا عقل آپا۔؟"

آپا نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"امی کو دانش بہت پسند آ گیا ہے" میں نے انکشاف کیا۔

"چپ! بکواس نہ کرو" آپا نے تکئے میں منہ چھپا لیا۔ جانے ہنس پڑیں یا بسورنے لگیں۔ لیکن ایک تبدیلی ان میں ضرور آ گئی کہ مرجھائے ہوئے چہرے پر سرخی سی سرخی نظر آنے لگی اور مدھم مدھم خد و خال کچھ نوکیلے ہونے لگے۔ اب مقررہ اوقات سے ہٹ کر کیتلی ہر دم چولہے پر رہنے لگی۔ جانے کب چائے مانگ لی جائے اور امی کی کمائی سے پکے پکے پان بھی چوری ہونے لگے۔ کبھی کبھار اپنے حصے کی مٹھائی اور پھل بھی چائے کے ساتھ بھجوائے جانے لگے اور چولہے کی گھٹی ہوئی فضا سے نکل کر آپا اکثر آئینے کے آگے بھی نظر آنے لگیں۔

ہائے آپا تم اس سڑی سی شکل کے لڑکے کے ساتھ اتنی راضی ہو" میں سوچتی۔ "وہ تمہارا آئیڈیل خوبصورتی کا خواب کیا ہوا۔ کیا اس دنیا میں پیسہ ہی سب کچھ ہے۔؟"

لیکن امی بیمار بھیا سے کہے جا رہی تھیں۔

"تم دانش سے بات کرو۔ ایک بہن کا بوجھ تو کم ہو" بھیا کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن سنتے سنتے ایک بار انھیں بھی غصہ آ گیا چلا کر بولے۔

"میں دانش سے یہ بات کبھی نہیں کہوں گا۔ وہ میرا دوست ہے۔ اور میں اتنا خود غرض کمینہ نہیں کہ اس کے پیسے پر نظر رکھوں" آپا پریشان ہو گئے۔

"چولہے میں جائے تمہارا بھرم۔ دوستوں سے کوئی فائدہ نہ پہونچے ایسی دوستی سے حاصل؟" امی نے بھی چیخ کر کہا۔

"اسے اچھی سے اچھی، امیر سے امیر لڑکیاں مل سکتی ہیں امی" بھیا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے "مجھے اپنی بہن کی بے عزتی منظور نہیں۔"

"اور یہ بڑی عزت کی بات ہے کہ بہنیں پڑی سڑتی رہیں۔ امی نے صاف صاف کہہ دیا "تم نہ کہو میں خود اس سے بات کر لوں گی"

"نہیں امی نہیں" بھیا کی آواز کانپ گئی آپا بے چین ہو گئیں میرا دل تڑپنے لگا۔ کہیں دانش انکار ہی نہ کر دے پھر تو آپا اور بھیا کے لیے ڈوب مرنے کے سوا چارہ نہ رہے گا۔

"آپ دانش کو گھر ہی نہ بلائیں" میں نے بھیا کو سوچا یا بھیا شش و پنج میں پڑ گئے "کیسے منع کر دوں۔ وہ یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ ان کا آنا پسند نہیں کیا جا رہا ہے"

"مگر آپا کی قسمت یہی ہے تو وہ خود یہ بات کہہ سکتا ہے بھیا"

اور رات بھر کے جاگے ہوئے بھیا اسی کشمکش میں کالج چلے گئے، لیکن آدھے ہی دن سے لوٹ آئے۔ شاید مارے ہی اندر گھلتا ہوتے رہنے سے انھیں بخار ہو گیا۔ مجھے امی پر غصہ آنے لگا۔ ابا بھی بھیا کے پیچھے دبی زبان سے کہہ چکے تھے۔ "لڑکے کو زیادہ پریشان مت کرو۔ اتنی جلدی کیا ہے اور لڑکیوں کا خدا مالک ہے" مگر امی اپنی ہی دھن میں تھیں اور آپا ہمیشہ سے زیادہ خاموش بے شک آپا زندگی چاہتی ہوں گی۔ اپنا گھر، ساتھی آرام، آسائش لیکن ——

لحاف سرکا کر بھیا نے آہستہ سے پوچھا "دانش آ گیا؟"

"نہیں" میں نے ہولے سے کہا۔

ابا دعا کر کر نکڑ والے ڈاکٹر کے پاس گئے۔

تبھی دانش نے آواز دی "آ جاؤں؟"

میں نے خوفزدہ ہو کر آپا کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ ادھر سے میں ہونے کی بجائے خلاف وضع چھت کی طرف بڑھیں اور بولیں

آجائیے:

غصے سے میرا دم گھٹنے لگا۔ کیا آپا کو بھیا کی عزت کا کوئی خیال نہیں؟ ذرا بھی پاس و لحاظ نہیں؟

دانش جھٹ اٹھا کر اندر آگیا۔ آپا کو دیکھ کر ٹھٹکا پھر پلٹنے ہی والا تھا کہ آپا نے کہا۔

"بھائی کے دوست بھی تو بھائی ہی ہوتے ہیں۔ بھائی سے پردہ کیسا"۔

اسی بجلی بھرے بادل کی طرح کڑکیں "نابکار"۔ بھیا چونک گئے۔ آپا تیزی سے اندر لپکی جا رہی تھیں۔ کسی نے دیکھا یا نہیں لیکن میں نے ضرور دیکھ لیا کہ آپا کے چہرے کے نقوش تیزی سے بدل رہے تھے جیسے کسی خوبصورت تصویر پر روشنائی کے داغ پھیل گئے ہوں اور شیشے کی وہ دیوار جو لمحہ بھر پہلے میرے اور آپا کے درمیان کھڑی ہوگئی تھی چھن سے زمین پر آرہی اور میری آنکھیں تیزی سے بھیگنے لگیں۔

جنت بی بی

(شمیم فضلِ خالق)

میں نے جنت کو اس وقت دیکھا تھا جب میں دلہن بن کر سسرال کی دہلیز پر اتری تھی۔ میرا گھونگھٹ اٹھانے والی پہلی عورت جنت تھی۔ جنت کا روپ ایسا تھا جیسے اچانک ہی کہیں چپکے سے بہار آجائے اور فضا خوشبوؤں سے بھر جائے جنت کو دیکھ کر کچھ ایسا ہی خوشگوار سا احساس ہوتا تھا پتلے پتلے ہونٹوں پر بکھری لازوال مسکراہٹ کسی جھرنے کی طرح گنگناتی مترنم آواز کا نام جنت تھا۔ بعد میں میری رشتے کی نند نے بتایا یہ جنت ہے ساتھ والا گھر اس کا ہے یہ تمہاری ہمسائی ہے۔ بڑی اچھی عورت ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزرا ہے اولاد نہیں ہے۔ تمہارا دل اسکی وجہ سے بہلا رہے گا

میری کوئی ساس، کوئی نند نہیں تھی لیکن جنت کی وجہ سے میں نے کبھی تنہائی محسوس نہیں کی۔ کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد ہم دیوار پر کھڑے ہو کر ڈھیروں باتیں کرتے جنت کا خاوند نور دین کسی کمپنی میں عارضی نوکری میں لگا تھا جنت کا چھوٹا سا گھر مجھے کسی جنت کی مانند لگتا۔ ویسے بھی اپنے خاوند اور گھر سے بے پناہ محبت تھی۔ نور دین صبح کا گیا رات گئے لوٹتا۔ جنت کی ہر بات کا آغاز بھی نور دین سے ہوتا اور اختتام بھی وہ سارا دن نور دین کی باتیں کرتی اس کے اس والہانہ پیار کو دیکھ کر میں سوچتی کہ جس عورت کی اولاد نہیں ہوتی۔ اسکی محبت کا سارا مرکز اس کے شوہر کی ذات ہوتی ہے جنت کو میں نے اولاد کیلئے کبھی اداس نہیں دیکھا کوئی ایسی ویسی بات کر بھی دیتا تو وہ جھٹ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر کہتی "خدا میرے نور دینے کو زندہ رکھے مجھے تو اولاد کا خیال تک نہیں آتا۔"

میری شادی کو ایک سال گزرا تھا اور جنت کی شادی کو نو سال کہ پہلی بار میں نے جنت کو اداس دیکھا اس دن کام کاج ختم کر کے وہ میرے پاس آ گئی تو میں دوپہر کے کھانے کے لئے سبزی کاٹ رہی تھی وہ ہمیشہ کی طرح ہنستی مسکراتی نہیں آئی میں نے بہت جلد اس کی خاموشی محسوس کی۔

جنت تم کیوں اداس ہو؟ میں نے پوچھا تو وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔

"ہاں دلہن میں تو سوچا کرتی تھی کہ ... نور دین مجھے شدت سے احساس ہوا ہے کہ میری اولاد نہیں ہے" وہ رک رک کر بولی تو میں چونک پڑی۔

کس نے احساس دلایا ہے جنت؟ میں بولی۔

"نور دین نے" وہ ایک آہ بھر کر بولی تو میں حیرت زدہ ہو گئی

"کیسے؟"

رات کو نور دین بہت تھکا آیا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ اتنا کام نہ کرے تو اس نے کہا کہ جنت کہتی تو ٹھیک ہے میری کونسی اولاد ہے جس کے لئے میں محنت کروں۔ پھر کہا کہ جنت اگر ہمارے بچے ہوتے تو آج یہ آنگن اتنا سونا نہ ہوتا" جنت کی آواز گلوگیر ہو گئی تھی

"ہاں جنت" میں نے اس کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے ہوئے کہا۔ لیکن تم نے کچھ علاج وغیرہ تو کیا ہوتا بعض اوقات معمولی سی خرابی کی وجہ سے بھی بچے نہیں ہوتے۔

"علاج بہت کرایا ہے دلہن ڈاکٹر کہتے ہیں تیرے کبھی بچہ نہیں ہو گا" اسکی آنکھوں میں ایک شکست خوردہ عورت کا درد جھلملا رہا تھا۔

ڈاکٹر لوگ خدا تو نہیں ہوتے جنت" میں نے اسے دلاسا دیا تو ایک بار پھر کوشش کر۔

"نہیں دلہن اب مزید وقت ضائع نہیں کروں گی ... میں کتنی بیوقوف عورت ہوں کہ خود تو اولاد کی نعمت سے محروم رہی لیکن نور دینے کو کیوں محروم رکھا" وہ خواب کی سی کیفیت سے بولی۔

"کیا ... تیرا مطلب کیا ہے؟" میں بوکھلا کر بولی۔

میں نور دینے کا دوسرا بیاہ کروں گی۔ اس نے بڑے سکون سے کہا لیکن میں یوں اچھل پڑی جیسے بچھو نے کاٹ کھایا ہو۔

"تو پاگل تو نہیں ہو گئی جنت" میں نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ اس نے نرمی سے میرے دونوں ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹائے اور بولی۔

"میں نے نور دینے کو شدت سے چاہا ہے ..." وہ افسردہ مجھ سے یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ ملکہ میں تو سوچتی ہوں کہ آنا ہے بہت پہلے مجھے

اس کا بیاہ کر دینا چاہیے تھا۔

"تم سچ مچ پاگل ہو گئی ہو جنت! اگر یہ کامنشا دے سکتی ہو کر دوسری بیوی سے اس کی اولاد ضرور ہوگی" میں نے کہا تو وہ اسی سکون سے بولی۔

"یقیناً دے سکتی ہوں ... اس لئے کہ میں نے ہمیشہ خدا پر بھروسہ کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ قربانی جو جس مقصد کے لئے دے رہی ہوں میرا رب میرا مقصد ضرور پورا کرے گا۔"

"جنت ... خدا کے لئے" میں نے دکھ سے بھرپور آواز میں اسے سمجھایا۔ "بچے تو تیرے ہیں نہیں۔ لے دے کے ایک شوہر کی ذات ہے۔ اسے اپنے ہاتھوں کیوں جدا کر رہی ہے یہ پہاڑ سی زندگی کس سہارے پر گزارے گی؟"

"دلہن! وہ ناراض سی ہو کر بولی۔ نور دین کبھی پرایا نہیں ہوگا ... یہ میں جانتی ہوں میں اپنی زندگی اس کی اور اس کی اولاد کی خدمت کرنے میں گزار دوں گی مجھے سر کا بچا چھوڑ کر وہ بیچارہ جا۔" اس کے بعد میرے علاوہ پاس پڑوس کی سب عورتوں نے اسے سمجھایا خود نور دین اس شادی پر راضی نہ تھا لیکن جنت نے منت سماجت سے نور دین کو منا لیا جب نور دین مان گیا تو جنت کا یہ کام رہ گیا کہ صبح کو گھر سے لڑکی دیکھنے نکلتی اور رات گئے آتی اس دن میں کام ختم کر کے فراست سے بیٹھی تو جنت دیوار پر چڑھ کر آوازیں دینے لگی۔ میں باہر گئی تو دیکھا کہ جنت کے ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈبہ تھا اور چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا میرا دل دھک سے رہ گیا۔

کیا بات ہے جنت؟

کھا لے پہلے یہ مٹھائی کھا لے ... پھر بتاؤں گی وہ چہک کر بولی۔

نہیں پہلے بات بتا دے۔ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

اری دلہن .... تو نے ذکیہ کو تو دیکھا ہے نا؟

کون ذکیہ میں نے سوچتے ہوئے کہا تو وہ جھٹ بولی اری پچھلی عید میں میرے پاس سوئیاں لے کر آئی تھی ... وہ شرمیلی سی لڑکی ... میں تیرے گھر بھی تو لائی تھی اسے

"ارے ہاں ... یاد آیا ... پھر کیا ہوا ذکیہ کو؟" میں نے پوچھا۔

اری وہ ہنس کر بولی اسے کیا ہونا تھا ... میں تو اس کی بات نور دین سے پکی کر آئی ہوں۔

"کیا؟" میرا دل تڑپ اٹھا۔ جنت یہ کیا کیا تو نے میں دکھ سے بوجھل آواز میں بولی۔

"لے یہ مٹھائی کھا لے" وہ ڈبہ کھول کر میرے آگے کرنے لگی تو میں نے گلوگیر آواز میں کہا

"رہنے دے جنت! میں تیری بربادی کی مٹھائی کیا کھاؤں گی ... جا نور دین کو کھلا دے۔ وہ اپنی آبادی کی مٹھائی بڑی خوشی سے کھائے گا۔" میں نے دیکھا اس کی ہر وقت ہنسنے والی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور ایک لفظ کہے بغیر وہ مٹھائی کا ڈبہ لے کر نیچے اتر گئی اس کے بعد جنت کا یہ کام رہ گیا کہ سارا سارا دن شادی کی تیاریوں میں لگی رہتی کبھی ذکیہ کے لئے کپڑے سی رہی ہے تو کبھی شادی کے چاول صاف کر رہی ہے کبھی دوپٹوں پر گوٹہ لگا رہی ہے .... نور دین کی شادی کا دن بھی آ گیا .... اس دن جنت نے سرخ جوڑا پہن رکھا تھا ہونٹوں پر سرخی لگائی تھی اور سارے کام کو سنبھال رہی تھی کبھی مہمانوں کے سامنے چاول رکھتی تو کبھی ادھر کبھی ادھر بھاگتی۔

شادی ہو گئی ذکیہ دلہن بن کر آ گئی جنت کی ذمہ داریوں اور کاموں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ذکیہ کا وہ اتنا خیال رکھتی کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی اس کے کپڑے خود دھوتی اس کی استری خود کرتی۔ ایک دن جب کپڑے دھو رہی تھی کہ جنت آ گئی میرے پاس ہی بیٹھ گئی ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے ذکیہ کے بارے میں پوچھا تو جنت نے بتایا کہ ذکیہ سے میں بہت خوش ہوں ... بڑی اچھی اور فرمانبردار لڑکی ہے لیکن .... وہ جھجک کر چپ ہو گئی تو میں نے پوچھا ہاں ہاں جنت مجھ سے کچھ مت چھپاؤ ... تم چپ کیوں ہو گئیں۔

"دلہن .... جانے یہ میری نظر کا فتور ہے یا حقیقت ... لیکن میں نور دین کو کچھ بدلا بدلا سا محسوس کرتی ہوں" وہ رک رک کر بولی اور میرا دل دھک سے رہ گیا پھر بھی اس سے پوچھا لیکن تم نے یہ محسوس کیسے کیا جنت .... ؟ ہو سکتا ہے تمہارا وہم ہو"

"شادی کے بعد .... وہ ایک رات بھی میرے کمرے میں نہیں سویا" وہ جھجک کر گلابی چہرے سے بولی۔ ہاں ممکن ہے میرا وہم ہو" وہ خود کو تسلی دینے کے انداز میں بولی۔

"دیکھو جنت" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "جو وقت تمہیں سمجھانے کا تھا اس وقت ہم نے تمہیں خوب سمجھایا اس وقت تم نہ مانیں .... اب تمہیں اپنا دل سمندر کی طرح وسیع کرنا ہے ... ذکیہ نئی نویلی دلہن ہے جی بھر اسے بھی سہاگ رات منانے دو" میں جتنا اسے سمجھا سکتی تھی سمجھایا کوئی تین مہینے بعد وہ پھر ایک بار مٹھائی کا ڈبہ لے کر میرے پاس آئی اس دن خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی ...

نام پہ بار بن چکی تھی۔ نوردین کو بیوی کا پتا لگ چکی تھی اور بچہ بھی۔ کاش نوردین آج اگر اس بھال اور لٹی پھوٹی جنت کو دیکھتا تو تب اسے پتہ چلتا کہ آج کون تہی دست ہے کس کا دامن خالی ہے ذکیہ کا یا جنت کا۔

شام کو سے تیز بخار نے آگھیرا میں نے اس کی دیکھ بھال اور خبر گیری میں کوئی کوتاہی نہیں کی اسے مقدرکستی دوائیاں دیں خوراک دی پورے پندرہ دن بعد اس کا بخار اترا تو وہ ایک مرجھائی کلی بن چکی تھی۔ ہونٹوں کی وہ لازوال مسکراہٹ جانے کہاں غائب ہو چکی تھی۔ آنکھوں کی وہ شوخی ہنسی کی مترنم آواز اب قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ جنت میں جہاں اور ڈھیر ساری خوبیاں تھیں وہاں وہ بہت خود دار بھی تھی۔ مجھے اسکی مدد کرنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آیا تو ایک دن میں اپنے دو تین سوٹ جنت کے پاس لے گئی اس نے وہ سوٹ سی دیئے تو میں نے اسے سلائی کے پیسے دیئے اور ساتھ ہی اسے سمجھایا کہ زندہ رہنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے اور جب تمہارے ہاتھ میں ہنر ہے تو تم اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاؤ۔ اس نے روتے ہوئے وہ پیسے رکھ لئے میری دیکھا دیکھی محلے کے سب لوگ اس سے کپڑے سلانے لگے اور یوں اس کی زندگی کی کشتی ڈولتی ڈگمگاتی سست خرامی سے چلنے لگی۔

وقت گزرتا رہا نوردین نے پلٹ کر جنت کی خبر تک نہ لی۔ اڑتی اڑتی خبر آئی کہ نوردین کا دوسرا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ جنت اپنے دکھوں اور غموں سمیت مر مر کر جیتی رہی ایک دن میں کپڑے سینے کے لئے جنت کے پاس لے گئی ابھی ہم دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سن کر جنت نے دروازہ کھولا میں نے دیکھا تو میرا اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی جانے جنت کا کیا حال ہوا ہوگا کیونکہ دروازہ پر نوردین کھڑا ہوا تھا۔ دونوں بچے اس کے پاس تھے وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

" جنت! میں تیرا گناہ گار ہوں .... مجھے جو چاہے سزا دے لیکن خدا کے لئے ———— ان بچوں کو میری کسی خطا کی سزا نہ دینا۔ یہ بن ماں کے بچے ہیں ذکیہ آج تیسرا دن ہے فوت ہو گئی ہے۔ اس کا تیسرا بچہ ہونے والا تھا۔ وہ سیڑھیوں سے گری اور مر گئی۔ اور اب یہ بچے ماں کی گرم آغوش مانگتے ہیں۔" میں نے دیکھا جنت پتھر کی مورت کی مانند ساکت کھڑی تھی۔ جنت خدارا، کچھ تو بولو۔ کچھ تو کہو۔

مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا میں نفرت سے بولی اس ظلم کا کیا جانے ہو نیہو اور کشش بھی کیا تیرے نوردین وہ کیا جنت کے سینے میں دل ہے اسکا

سینہ بڑا فراخ ہے۔ وہ تیرے سارے تیر کھاتی رہی اور مسکراتی رہی۔

"میں گناہ گار ہوں بہن جی! لیکن میں جنت سے معافی مانگنے آیا ہوں۔"

تو تو معافی مانگ کے بری الذمہ ہو جائے گا نوردین میں نے طنز کیا لیکن جنت کے وہ غم وہ افسردہ تنہائی کس کھاتے میں لکھے گا۔ جب تو نے جنت کی زندگی جہنم بنائی اس وقت تجھے کچھ خیال نہ آیا۔ آج جب بچوں کے پالنے کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے تو تو معافی مانگنے آیا ہے بول تو نے جنت کو کس آسرے پر چھوڑا تھا۔ مجھے جواب دے نوردین!" جانے مجھے آج کیا ہو گیا تھا۔

جنت زرد چہرہ لئے خاموش کھڑی تھی اور نوردین سر جھکائے شرمندہ کھڑا تھا۔ میں لپک کر قریب آئی اور جنت کا چہرہ اس کی طرف جھکاتے ہوئے بولی۔

"مجھے بتا نوردین، جنت کا وہ شاداب چہرہ کہاں گیا وہ مسکراتے ہونٹوں کی مسکراہٹ کس نے چھینی۔ غور سے دیکھ کیا تو جنت کو اس طرح چھوڑ کر گیا تھا۔"

"میں سچ مچ جنت کا گناہ گار ہوں بہن جی! تیری باتوں نے مجھے بہت زیادہ احساس دلایا ہے! واقعی مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اچھا جنت خدا تجھے خوش رکھے۔ ہو سکے تو مجھ گناہ گار کو معاف کر دینا۔"

وہ مڑا تو اچانک جنت میں جیسے زندگی آ گئی ہو اس کا ہاتھ پکڑ کر بچے کو گود میں لے لیا۔ دوسرے بچے کو اپنے قریب کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔"

"نوردین! تو نے جنت کو سمجھا ہی نہیں۔" وہ سسک سسک کر کہنے لگی تو نے جنت کی محبت کو تولا ہی نہیں۔ تو نے جنت کا دل نہیں دیکھا۔ نوردین خوشی اور مسرت سے بے قابو ہو گیا اور جنت کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

اور میں حیران کھڑی دونوں کا ملاپ دیکھتی رہی۔ جی چاہا عورت کے اس روپ پر سو بار قربان ہو جاؤں۔

ہمارا دین

(سید فضل الرحمان جعفری)

جنگِ تبوک میں یوں تو اسّی سے زیادہ انصاری شریک نہ تھے لیکن یہ سب منافق تھے۔ ان کے علاوہ ایک بڑی جماعت باہر کی تھی جس نے بھی شرکت سے گریز کیا تھا۔ لیکن تین سچے اور مخلص مسلمان ایسے تھے جنھوں نے بلا کسی معقول عذر کے محض تن آسانی اور غفلت کی وجہ سے جہاد میں شرکت کی سعادت حاصل نہیں کی تھی۔ یہ کعبؓ بن مالکؓ، ہلال بنؓ امیہؓ اور مرارۃ بن ربیعؓ تھے۔ مرارۃؓ بن ربیعؓ تو اس لئے شرکت سے محروم رہے کہ ان کے باغ میں اس سال کثرت سے پھل آئے تھے۔ ان کو یہ گمان ہوا کہ اگر وہ چلے گئے تو باغ کی نگرانی نہ ہو سکے گی اور تمام پھل ضائع ہو جائیں گے۔ ان کے نفس نے ایک خیالی جنت سامنے کھڑی کر دی تھی، اور وہ اپنے دل کو اس طرح تسکین دینے لگے کہ وہ ہمیشہ تو جہاد میں شرکت کرتے رہے ہیں اس بار نہ سہی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کو ایمان کی ایسی روشنی عطا کی کہ وہ سنبھلے اور انہوں نے یہ سوچا کہ اس سعادت سے محرومی کا سبب یہ باغ ہے اس لئے انہوں نے اسے صدقہ کر دیا۔

ہلالؓ اپنے عزیزوں کی وجہ سے اتنے غافل ہو گئے کہ ان کو بھی یہی خیال آیا کہ پچھلی جنگوں میں تو وہ شرکت کرتے رہے ہیں لیکن اگر اس جنگ میں شریک نہ ہوئے تو کیا مضائقہ، اس لئے وہ بھی شرکت نہ کر سکے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انکے دل میں خوف و ہراس کی ایسی کیفیت طاری کر دی کہ وہ بھی سخت نادم اور دلگیر ہوئے، ان پر ندامت و پشیمانی کا ایسا غلبہ ہوا کہ انہوں نے لوگوں سے تعلقات ختم کر کے گوشہ نشین ہو گئے۔ اور توبہ استغفار میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جنگ میں شرکت سے محرومی کا سبب یہی تعلقات تھے۔

حضرت کعبؓ کا واقعہ بڑا عبرت ناک اور سبق آموز ہے اس واقعہ کو حضرت کعبؓ خود اپنی زبان سے فرماتے ہیں ان کا بیان ہے کہ جنگِ تبوک سے پہلے کبھی وہ اتنے خوش حال اور دولت مند نہ تھے۔ اس وقت ان کے پاس دو تندرست اور توانا اونٹنیاں تھیں جبکہ اس سے پہلے ان کے پاس دو اونٹنیاں کبھی نہ تھیں۔ اس کے علاوہ وہ زمانہ شدید گرمی کا تھا۔ اور مقابلہ بڑے طاقتور دشمنوں کا تھا۔ روم کی طاقت اس زمانے میں پوری دنیا میں مشہور تھی۔ اور مسلمانوں کی حالت اچھی نہ تھی جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے لیے چندہ کا اعلان فرمایا تو صحابہ کرام اپنے اپنے گھروں کی طرف دوڑ پڑے حضرت ابوبکر صدیقؓ گھر کا پورا سامان اٹھا لائے۔ اور اسے تاجدار نبوت کے قدموں میں ڈال دیا۔ حضرت عمرؓ آدھا سامان لائے اور آقا کے سامنے اسے ڈھیر کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے ایک تہائی لشکر کے لئے پورا سامان مہیا کر دیا۔ اس طرح تمام مسلمان اپنی اپنی حیثیت سے زیادہ سامان لا کر ڈھیر کرتے رہے۔ اس طرح چشم فلک نے مسلمانوں کے جذبۂ ایمانی کا ایک بڑا تابناک منظر دیکھا۔

یہ لڑائی بہت سخت تھی گرمی اپنے شباب پر تھی۔ ریگزار عرب کا ہر ذرہ تیر و نشتر کا حکم رکھتا۔ بادِ سموم کے جھونکوں سے چہرے انگار بن گئے تھے سفر لمبا تھا اور بے حد خطرناک، موسم ایسا تھا کہ مدینہ منورہ میں کھجور کے باغات بالکل تیار تھے۔ اور فصل بہت اچھی تھی۔ فصل ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ یہ صورت حال مسلمانوں کے لئے سخت امتحان کی تھی۔ ایک طرف دنیا کی خوشحالی اور آسائش کی جنت سامنے تھی اور دوسری طرف تاجدار نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنگ میں شرکت کا حکم تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے حکم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو ترجیح دی اور پھر

دنیا کی ساری رعنائیاں ان کی نگاہ سے اوجھل ہو گئی تھیں حضرت کعبؓ بھی جنگ میں شرکت کی تیاری کرتے رہے لیکن مکمل نہ کر سکے اور یہی سوچتے رہے کہ عین وقت پر وہ تیار ہو کر لشکر کے ساتھ روانہ ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا اور لشکر کوچ کر گیا تبوک پہنچ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے پوچھا کہ کعبؓ نظر نہیں آتے۔ کہاں ہیں؟ ایک صاحب نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم! کعبؓ کو اپنے مال و منال کا بڑا خیال ہے۔ حضرت معاذؓ یہ سن کر بولے "غلط ہے ہم کعبؓ کو اچھا آدمی سمجھتے ہیں" لیکن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بالکل سکوت اختیار فرمایا۔

جب لشکر اسلام کی واپسی کا زمانہ قریب آیا تو حضرت کعبؓ کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلّم کی بارگاہ میں وہ کیا جواب وہی کریں گے اور کس طرح آپؐ کی ناراضی سے اپنی جان بچائیں گے۔ دل کا اضطراب بڑھتا گیا تو حضرت کعبؓ نے طے کر لیا کہ بارگاہ نبویؐ میں کوئی عذر پیش نہیں کریں گے بلکہ صاف صاف اپنی غلطی کا اعتراف کر لیں گے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم مسجد نبویؐ میں جب تشریف فرما ہوئے اور آپؐ کی خدمت میں منافق لوگ جھوٹے عذر پیش کر کے اپنے باطن کو چھپاتے رہے تو اسی ہجوم سے اچانک حضرت کعبؓ نمودار ہوئے اور سلام عرض کیا لیکن آپؐ نے سلام لینے سے گریز کیا۔ یہ دیکھ کر حضرت کعبؓ نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! خدا کی قسم میں

نہ منافق ہوں نہ میرے ایمان میں کچھ کمی ہے"

ارشاد نبویؐ ہوا" ادھر آ، حضرت کعبؓ قریب ہو کر بیٹھ گئے ارشاد ہوا کہ اے کعبؓ تجھے کس چیز نے جنگ میں شرکت سے روکا؟ حضرت کعبؓ نے عرض کیا" یا رسول اللہ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا اس لئے کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ اصل بات سے مطلع فرما دیں گے اس لئے سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے واللہ کوئی عذر نہیں تھا اور مجھے جتنی خوشحالی اس زمانے میں ہے اتنی پہلے کبھی نہ تھی"

یہ سن کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا" اے کعبؓ اٹھ جاؤ! تمہارا فیصلہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے"

پھر صورت حال یہ ہوئی۔ مسلمانوں نے کعبؓ سے بولنا چھوڑ دیا اور ان سے معاشرتی تعلقات توڑ لئے۔ کعبؓ یہ دیکھ رہے تھے کہ مدینے کی زمین ان کے لئے تنگ ہو رہی ہے۔ مدینے کا ہر شخص ان سے بے زار ہے۔ اور مدینے کا ہر ذرہ ان سے نفرت کرنے لگا ہے۔ وہ اس وسیع شہر میں تنہا رہ گئے ہیں۔ ان کی زندگی تلخ ہو گئی ہے۔ مسجد نبویؐ میں ان سے کوئی بات نہیں کرتا۔ نہ کوئی ان کی طرف توجہ دیتا ہے۔ ان کا کلیجہ پھٹنے لگا تھا۔ ان کے دماغ کی شریانیں ٹوٹنے لگی تھیں۔ انہیں اس کا بھی غم تھا کہ اگر اس حال میں ان کی موت ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ان کی نماز جنازہ نہ پڑھائیں گے۔ اور نہ کوئی دوسرا ان کی نماز پڑھائے گا۔ ہلالؓ اور مرارہؓ تو اپنے اپنے گھروں میں چھپ گئے تھے۔ کعبؓ البتہ مسجد نبویؐ میں جاتے۔ بازاروں میں گھومتے، لیکن کوئی ان کے سلام کا جواب تک نہ دیتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کعبؓ کا سلام سن کر منہ پھیر لیتے۔ حضرت کعبؓ کا بیان ہے کہ:۔

میں مدینہ کے بازار جا رہا تھا کہ ایک قبطی جو شام سے مدینہ منورہ آیا تھا۔ لوگوں سے یہ پوچھ رہا تھا کہ کوئی کعبؓ بن مالک کا پتہ بتا دے۔ لوگوں نے میری طرف اشارہ کر کے بتا دیا۔ اس نے مجھے غسان کے کافر بادشاہ کا پیغام دیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے آقا نے تم پر ظلم و ستم روا رکھا ہے۔ تمہیں اللہ ذلت میں نہ رکھے اور نہ تمہیں ضائع کرے۔ تم ہمارے پاس آ جاؤ۔ ہم تمہاری مدد کریں گے"

کعبؓ کا بیان ہے کہ:۔

میں نے یہ خط پڑھا تو بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور اپنی حالت پر رونے لگا تھا کہ میں اس حال کو پہنچ گیا ہوں کہ کافر بھی مجھے لالچ دینے لگے اور اسلام سے ہٹانے لگے۔ یہ وقت بڑی سخت آزمائش و ابتلا کا تھا۔ میں نے

یہ خط لے جاکر تنور میں پھینک دیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کی بے التفاتی کی وجہ سے میری یہ حالت ہو گئی ہے کہ اغیار بھی مجھے لالچ دینے لگے۔

اسی حال میں چالیس دن گذر گئے تھے کہ قاصد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پیغام لے کر آیا کہ "اے کعب! تم اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر لو۔" کعبؓ کہتے ہیں کہ پیغمبرانہ حکم پانے کے بعد میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"تو اپنے میکے چلی جا جب تک اللہ تعالےٰ میرا فیصلہ نہ فرمادیں۔"

اسی حال میں دس دن اور گذر گئے۔ پچاسویں دن فجر کی نماز کے بعد کعبؓ اپنے گھر کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا دل بے حد غمگین تھا۔ ان کی دنیا تیرہ و تار تھی اور زندگی بوجھ ہو رہی تھی کہ اچانک سلع کی پہاڑی کی چوٹی سے ایک آواز بلند ہوئی۔ اور وہ یہ تھی۔

کعبؓ! خوشخبری ہے تم کو:

کعبؓ نے یہ آواز سنی تو فرط مسرت سے ان کی پیشانی سجدہ میں گر گئی۔ اور آنکھوں سے اشکوں کے تار بندھ گئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ ان میں اللہ کی بارگاہ میں شکر و سپاس کا جذبہ فراوانی تھا۔ ان میں اللہ تعالیٰ کے احسان و انعام کا اعتراف تھا۔ اسی اثناء میں ایک سوار گھوڑے پر بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے کعب کو بشارت دی۔ حضرت کعبؓ نے اپنے جسم کے کپڑے خوشی میں اس کو عطا کر دیئے۔ حضرت کعبؓ کا بیان ہے کہ:

میں جب مسجد نبویؐ میں حاضر ہوا تو لوگ مجھے مبارکباد دینے کے لیے دوڑ پڑے سب سے پہلے ابو طلحہؓ نے مبارکباد دی اور مصافحہ کیا۔ پھر میں نے بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچ کر سلام عرض کیا۔ میں نے دیکھا کہ چہرہ اقدس مسرت سے جگمگا رہا تھا۔ میں نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری توبہ کی تکمیل یہ ہے کہ میری جو جائیداد ہے وہ سب اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں کہ یہ جائیداد ہی میری اس مصیبت کا سبب بنی تھی۔"

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہوا۔

اس میں تنگی ہو گی کچھ حصہ اپنے پاس بھی رہنے دو۔

پھر حضرت کعبؓ بن مالک نے اعلان کیا۔

مجھے "سچ" نے نجات دی اس لئے میں عہد کرتا ہوں کہ ہمیشہ سچ بولوں گا۔

(درمنثور، فتح الباری)

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر شائع کی جاتی ہے جو ولادت شادی یا غمی کے تحت ہو۔ خبر کم سے کم الفاظ میں صاف صاف لکھی جائے پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کا ہونا ضروری ہے۔ صرف وہی خبریں حالیہ حریم میں شائع ہوتی ہیں جو ۲۰ تک وصول ہو جاتی ہیں خبر کی اشاعت میں کسی بھی غلطی کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔ البتہ اطلاع ملنے پر اسکی تصحیح شائع کر دیجائے گی۔ (ادارہ)

ولادت اطفال کی خبریں

• شاہین بانو اسرادق۔ میری پیاری بہن اختر بانو اور بہنوئی بہادر خاں کے گلشن حیات میں ۶ر اپریل ۷۹ء اللہ پاک نے ایک پھول کھلایا۔ دعا ہے کہ عمر طویل پائے، تندرست رہے اور فخر خاندان وملت بنے۔ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• شاہدہ تبسم و صبیحہ تبسم (ملی پور۔ بنگلور) ہماری پیاری آنٹی ملکہ زرنگار اور انکل عبدالغنی صاحب (پرنام ہٹ) کے گلستان حیات میں پہلی بار ۲۹ر مئی ۷۹ء کی شام کو ۳ بجے بہار آئی اور ایک معصوم کلی مسکرائی نام نجم السحر اور پیار کا نام رعنا زرنگار رکھا گیا۔ دعا ہے کہ بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے اور صاحب نصیب ہو۔

• سلطانہ شبانہ سرو تابانہ بیگم (پرنام ہٹ) ہمارے پھوپھی زاد بھائی عبدالغنی اور بھابی ملکہ زرنگار کے چمن کو پر بہار بناتے ہوئے خدائے پاک نے ۳ر مئی ۷۹ء بروز پیر بوقت ۳ بجے شام پہلی بار ایک ننھی منی کلی کھلائی نام ام کلثوم عرف شاداں نسرین رکھا گیا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ عمر طویل پائے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• صبیحہ سلطانہ (بنگلور) "میرے بھائی الطاف حسین اور بھابی زینت سلطانہ (خریدار حریم) کے گلشن حیات میں اللہ رب العزت نے بروز منگل بتاریخ ۵ر مئی ۷۹ء بوقت صبح ایک کلی کھلائی۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اس کو والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔

• آسمہ خاتون زبیدی (دہلی) " میرے بھائی سید شہود رضا ایڈوکیٹ جونپور۔ یو۔ پی۔ اور پیاری بھابھی صفیہ بیگم کے گلشن حیات میں دو کلیوں کے بعد ایک پھول کھلا۔ بچہ آپریشن سے ہوا۔ پاک پروردگار اس کو سرسبز و شاداب رکھے اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• یاسمین اقبال (ملوسترم) میری نند شیریں شکیل کے گلشن حیات میں پہلی بار ۲۶ر مئی ۷۹ء بروز ہفتہ۔ بوقت ۵ بجے صبح اللہ پاک نے ایک پھول کھلایا۔ نام علیمہ (آگے پڑھا نہ جاسکا) قرار پایا۔ دعا ہے کلی اپنے والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور ان کا چمن معطر رکھے

پیغامات نشاط

• عقیلہ ہارون بالوجی (مرو ڈ ضجرہ) میرے عزیز بھائی اقبال ہارون بالوجی کی شادی ۲۳ر اپریل ۷۹ء کو ریحانہ محمد قادری کے ساتھ بحسن و خوبی انجام پائی۔ خدا سے دعا ہے کہ اس جوڑی کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے

• مہر افروز صفیہ راحت (ملکاپور) میری چھوٹی بہن عطیہ افروز کی شادی عطاء اللہ صاحب ایم۔ اے کے ساتھ ۲ر مئی ۷۹ء بروز اتوار بوقت ۸ بجے صبح بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک عطیہ اور عطا کی جوڑی کو تا حیات شاد و خرم رکھے۔

• عقیلہ ہارون بالوجی (مرو ڈ ضجرہ) میرے بھائی اقبال ہارون بالوجی کی شادی ۲۳ر اپریل ۷۹ء کو ریحانہ محمد قادری کے ساتھ بحسن و خوبی انجام پائی۔ خدا سے دعا ہے کہ اس جوڑی کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• احمد امام صاحب (دربھنگہ) کے لخت جگر بابو سید امام سلمہ و دختر نیک اختر عزیزی تبسم آرا سلمہا کی شادیاں بسید ولی احمد (درگاہ بیلا دبیالی) کی دختر نیک اختر۔ شاہین سلمہا اور گوشہ جگر عزیزی بابو سید شہوار (صاف پڑھا نہ جاسکا) سلمہ سے علی الترتیب ۲۸، ۲۹ر مئی ۷۹ء اور یکم و ۲ر جون ۷۹ء کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انجم نعما)

• رخشانہ طلعت بلیا نئک۔ میرے دیور قیصر جمال ابن مولانا اسرائیل صاحب کی شادی شاہجہاں بانو بنت عبدالمجید صاحب کے ساتھ ۷ر اپریل کو بمقام آرہ اور چھوٹے دیور اختر جمال کی مولانا اسرائیل صاحب کی شادی حسن بانو بنت حافظ اسرائیل کے ساتھ ۸ اپریل ۷۹ء کو بمقام جگدیش پور بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک دونوں جوڑیوں کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• حکیم شمس الدین صاحب مرحوم کی نواسی اور السید مسعود حسین صاحب کی دختر نیک اختر نزہت سلمہا کی شادی محبوب سلمہ پسر جناب بشیر الدین احمد

صاحب (کانپور) کے ساتھ ۲۴ر جون ۸۴ء کی شام کو کارلٹن ہوٹل لکھنؤ میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• میرے مخلص دوست اور اردو کے شہرہ آفاق مزاح نگار و شاعر سوسی کلیم برق آشیانوی صاحب کے فرزند دلبند عزیزی سید جعفر رشید ،بی اے ،پرنسپل مارل منٹ اسکول لشیر آباد حیدرآباد کی شادی ربیعہ بانو سلمہا دختر نیک اختر مسٹر سید محمد اسسٹنٹ انجینیر کرناٹک کے ساتھ یکم جون ۸۴ء کی شام کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے اور برق صاحب کو "نسیم سحر" جیسی بہو ملی ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی صحت کی خرابی اور موسم کی ناخوشگواری کے باعث برق صاحب کی مسرتوں میں شریک نہ ہو پایا حالانکہ میں نے وعدہ کیا تھا کہ یہ دن آئے تو میں حیدرآباد آؤں گا۔ (نسیم انہونوی)

• محمد حسین شمس علوی صاحب مالک ادارہ فروغ اردو لکھنؤ کے فرزند دلبند عزیزی زبیر علوی سلمہ کی شادی ریحانہ فاطمہ علوی سلمہا بنت حافظ حسن احمد علوی مرحوم حیدرآباد کے ساتھ انجام پائی اس سلسلہ میں شمس صاحب نے ۱۶ر جون کی شب میں اپنے اعزہ اقربا، اور معززین شہر کو ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• سید حسن رضوی صاحب (لکھنؤ) کے فرزند دلبند ظہیر حسن سلمہ، کی شادی شاہدہ بیگم سلمہا دختر ایس نصیر الدین حسین مرزا (گنگوا اسٹیٹ پورنیہ) کے ساتھ۔ اور دختر نیک اختر رخشندہ حسن سلمہا کی شادی ایس حبیب محمد (فرزند حبیب اصغر صاحب مرحوم۔ لکھنؤ) کے ساتھ سینٹ جونس اسکول لکھنؤ میں ۵ر جون ۸۴ء کی شب بہ بحسن و خوبی انجام پائی اللہ دونوں جوڑیوں کو سدا شاد و خرم رکھے۔

• دل آویز سعید خان۔ (تاتار پور۔ بھاگلپور) ،میری منجھلی بہن کی بڑی بیٹی کہکشاں سلیمان عرف طلعت بی۔ اے آنرز کی شادی ظہیر انور (پسر آفتاب احمد صاحب۔ دانا پور) کے ساتھ ۱۶ر مئی ۸۴ء بروز اتوار بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک ہمیشہ دونوں کو شاد و خرم رکھے۔

انتقال پر ملال کی خبریں

• یہ افسوس ناک خبر میرے چچا زاد بھائی منظور احمد نے سنائی کہ میرے کرمفرما منشی عبد الصمد صاحب مرحوم کے منجھلے بھائی منشی نذیر احمد عرف اقبال نے دماغی توازن کی خرابی کے باعث ۲۳ر رجب کو انہوں نے ریلوے اسٹیشن پر ایک چلتی ہوئی ٹرین سے اپنی زندگی ختم کر لی —— ۲۳ر رجب کو بعد نماز ظہر آبائی قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔ مرحوم بڑے نیک ملنسار اور ہر دلعزیز انسان تھے۔ اللہ پاک انھیں بخشے اور تمام پس ماندگان و متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• شدیدہ خاتون دلشوکری حکیسا بڑے ہی افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ ہماری چھوٹی پھوپی صاحبہ ۳ر مارچ ۸۴ء بروز جمعہ بوقت ۳ بجے شب۔ اپنے پانچ بچوں اور ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر اپنے مولائے حقیقی سے جا ملیں۔ مرحومہ بڑی پابند صوم و صلوٰۃ تھیں۔ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

لطیفے

• ایک آدمی پرندوں کی دکان پر گیا اور کہا مجھے ایک باتیں کرنے والی مینا چاہیئے۔
دکاندار حیرت سے بولا "کیا تم نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔

• ایک صاحب اپنی والدہ اور بیوی کے ساتھ سمندر کی سیر کو گئے۔ جب لانچ چلی اور ٹھنڈی ہوا لگی۔ والدہ صاحبہ نے سامنے بیٹھے ہوئے برخوردار سے پوچھا۔ اگر میں اور تمہاری بیوی ایک ساتھ سمندر میں گر جائیں تو تم کسے بچاؤ گے؟
وہ صاحب خاصے نروس ہو گئے اور بیوی کی طرف دیکھا تو وہ بولی: آپ اپنی والدہ کو بچالیں میری خیر ہے:
والدہ بولیں: ویسی کیا وجہ ہے۔ کہ تم مجھے بچانے کے لئے کہہ رہی ہو:
بیوی بولی مجھے تو بچانے کے لئے کئی کود پڑیں گے مگر آپ کو بچانے کے لئے کوئی نہ کودے گا۔

• بیگم مجھے شادی میں جانا ہے۔
جاؤ لیکن چھٹی صرف اس شرط پر ملے گی کہ تم مجھے واپس آکر بتاؤ وہاں عورتوں نے کیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ ایک شعر شائع کیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو موزوں معیاری اور سنجیدہ ہو۔ اور نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو وہی اشعار شائع کئے جاتے ہیں جو ۲۰ تاریخ تک دفتر پہنچ جاتے ہیں۔ اگست کے لئے عنوان ہے "رات" اور ستمبر کے لئے "رحمت" (ادارہ)

پھر وہی شام وہی غم وہی تنہائی ہے
دل کو سمجھانے تری یاد چلی آئی ہے

مرسلہ:۔ مسلمہ بی۔ رامپور

نکل جاتے ہیں آنسو جب تمھاری یاد آتی ہے
زمانہ مسکراتا ہے۔ محبت رو رکھ جاتی ہے

مرسلہ:۔ دُرِ شہوار بیگم (دھنباد)

بچپن کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا
جب یاد مری آئے ملنے کی دعا کرنا

مرسلہ:۔ خالدہ نعیم شمس (بیلی بھیت)

یاد اسی کی ہے مری زیست نظام
موت آئی جو ذرا بھول گیا

مرسلہ:۔ مس قمر فاطمہ نیازی (آگرہ)

آ گئی نذر شبِ ہستانہ کسی کو کیا یاد
وہ ستانے کیا بزم میں بیہوش مجھے

مرسلہ:۔ عشرت جہاں لاری (لکھنؤ)

یوں سلگتی ہے تری یاد مرے دل میں
جیسے ویرانے میں تربت پہ دیا جلتا ہے

مرسلہ: تسنیم بانو حاجی منو کا نپور۔

دل و جگر میں ہے درد آنکھیں ہیں اشکبار
معبود تیری یاد میں کیا سوز و ساز ہے

مرسلہ:۔ روحانہ تبسم ڈاکٹن گنج (بالاموں)

جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے خدا
ایک عادت ہے کہ تجھ کو یاد کر لیتی ہوں میں ۔ مرسلہ:۔ عالیہ نشاط (رہانپور)

جس کو تم بھول گئے یاد کرے کون اسے
جس کو تم یاد ہو وہ اور کسے یاد کرے

مرسلہ:۔ صوفیہ صبیحہ عاشی (رامپور)

تمھاری یاد نے اپنا لیا جب سے مرے دل کو
زمانے کی ہر اک شے اجنبی محسوس ہوتی ہے

مرسلہ:۔ عقیلہ یاسمین یالوجی (سرد ڈھیرہ)

یاد آجاتی ہے جب تیرے تبسم کی ہمیں
دیر تک دل میں چراغاں کا سماں دیتا ہے

مرسلہ:۔ جعفری بیگم (گنگا ونی)

دو ہی ہچکی میں ہوا بیمارِ غم کا فیصلہ
ایک ہچکی موت کی تھی ایک تیری یاد کی

مرسلہ:۔ نرخانہ (رامپور)

ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی
اب تو ہر وقت یاد آتی ہے

مرسلہ:۔ زبیدہ، حلیم (رہبر نام ٹ)

رس رس جائے کاجل سورا۔ مہندی گھس گھس جائے
اڑ جائے گجروں کی خوشبو۔ یاد سجن جب آئے

مرسلہ: فریدہ حسن ناز (دیوگھر)

یادِ خدا ہے لب پہ محمدؐ کا نام ہے
اپنا یہی وظیفہ غرض صبح و شام ہے

مرسلہ:۔ شاہدہ تبسم۔ بنگلور سادق)

نہ لینا نام اے قاصد۔ فقط اتنا ہی کہہ دینا
جنھیں تم بھول بیٹھے ہو، تمھیں وہ یاد کرتے ہیں

مرسلہ:۔ ڈی عظمت ترنم (رامپور)

ہمیں بھی یاد رکھنا جب لکھو تاریخ گلشن کی
کہ ہم نے بھی لٹایا ہے چمن میں آشیاں اپنا

مرسلہ:۔ نجمہ حافظ (ٹمکور)

کچھ نقش تری یاد کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سر و ساماں سہی، ویراں تو نہیں ہے

مرسلہ:۔ پرنس مرتضیٰ
(دھنباد)

آپ کے خوشی چلی گئی۔ اک یاد دل میں رہ گئی
یاد بھی کیوں نہ چھین لی، آتی ہے بار بار کیوں

مرسلہ:۔ کہکشاں اختر (سگرولی چھپارن)

کچھ ایسے نقش بھی ہوتے ہیں جو بن کر نہیں مٹتے
ہمیشہ ڈوبنے والے کو ساحل یاد رہتا ہے

مرسلہ: مسز نسیمہ عزیز (بھاگلپور)

سچ ہے نظام یاد بھی اسکو نہ بھول گئے ہم
ہم کیا کریں، وہ ہم سے بھلایا نہ جائے گا

مرسلہ: مس قمر لطیف نگار سلطانہ جلیلی (آمبور)

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

مرسلہ:۔ شہناز مجاہد (دارسہ)

تمہاری یاد ہماری حیات ہے ورنہ
غم فراق سے گھبرا کے مر گئے ہوتے

مرسلہ:۔ شاہین بانو (امراوتی)

میری پلکوں کے نیچے کچھ نمی تھرتھرائی ہے
نہیں معلوم دل کو آج کس کی یاد آئی ہے

مرسلہ:۔ دلشاد ریحانہ (چرکھاری)

یہ آنسو یاد کرتے ہیں، یہ آہیں یاد کرتی ہیں
تمہیں تھا ناز جن پر وہ دعائیں یاد کرتی ہیں

مرسلہ:۔ نسرین فاطمہ (حاجیو کانپور)

آتی ہے یاد اکثر روتے ہیں بے بسی میں
اک بے وفا کو ہم نے چاہا تھا زندگی میں

مرسلہ:۔ نیلوفر نور سے (میدنا پور)

یاد کی صبح ڈھل گئی، شوق کی شام ہو گئی
آپ کے انتظار میں عمر تمام ہو گئی

مرسلہ: شکیلہ پروین (ملیند نمبر)

آتا ہے یاد مجھکو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

مرسلہ:۔ اسماء صغریٰ خان (ملیح آباد)
(لکھنؤ)

یادِ ماضی سے فروزاں ہیں مرے دل کے چراغ
ورنہ اکتا ہی گئے تھے غمِ تنہائی سے

مرسلہ: مسعود اختر مہہ جبیں (سکندر پور)

یادِ ماضی میں نکل آتے ہیں آنسو اکثر
کیا خبر تھی کہ بدل جائیں گے حالات ایسے

مرسلہ: تابندہ مصباح (حاجیو کانپور)

مٹ چکے ذہن سے سب یادِ گزشتہ کے نقوش
پھر بھی اک چیز ہے ایسی کہ فراموش نہیں

(مرسلہ:۔ زبیدہ تبول آمبور)

اقوالِ زریں

- زندگی خدا کی امانت ہے۔ اسے برے کاموں میں لگانا امانت میں خیانت کرنا ہے۔
- مشکلات کا مقابلہ کرنے کا نام زندگی ہے۔ اور ان پر غالب آجانے کا نام کامیابی ہے۔
- ارادہ استقلال۔ وقت اور محنت۔ ان چاروں کو ملاکر معجون بنائیے اور روزانہ استعمال کیجئے پھر دیکھئے کیسی کایا پلٹ ہوتی ہے۔
- مایوسی سے بڑھکر دنیا میں کوئی زیادہ بری چیز نہیں ہے یہ اصل موت ہے۔
- زندگی کا ایک مقصد بنا لیجئے۔ پھر اپنی ساری طاقت۔ ساری توجہ اس پر لگا دیجئے یقیناً آپ کامیاب ہونگے۔
- محنت وہ سنہری کنجی ہے جو قسمت کا دروازہ کھول دیتی ہے۔
- دولت کسی کو شریف نہیں بنا سکتی اور افلاس کے باعث کوئی کمینہ بن جاتا ہے۔
- کسی شے کی زیادہ خواہش اور حرص بری ہی نہیں بلکہ مہلک بھی ہوتی ہے۔
- دلی سکون خواہشات کے پورا کرنے میں نہیں بلکہ خواہشات کے روکنے میں ہے۔
- سکون و عافیت وہیں ہے جہاں انصاف و اخلاق کی حکمرانی ہو

مرسلہ:۔ رعنا کوثر (جون پور)

دانتوں کی صفائی

دانتوں کی بقا اور صحت کے لئے ٹوتھ برش کا استعمال ضروری ہے۔ اس کے ریشے مسوڑھوں اور دانتوں کی ریخوں میں جمی ہوئی کثافت کو دور کر کے انہیں کیڑوں سے محفوظ بنا دیتے ہیں۔ خاص طور پر رات کے کھانے کے بعد برش کرنا اچھا ہے۔ ٹوتھ برش کے چند فائدے ذیل میں ملاحظہ کیجئے:۔

۱۔ ٹوتھ برش کرنے سے مسوڑھوں کے مرض کے لگنے کا عرصہ کم ہو جاتا ہے۔

۲۔ یہ مسوڑھوں کو صحت مند رکھتا ہے اور ان کی کیفیت میں اچھا اضافہ کرتا ہے۔

۳۔ پلاک یا چکناہٹ یا جرثومی مواد کو اکٹھا نہیں ہونے دیتا۔

۴۔ دانتوں کو کیڑا لگنے سے محفوظ رکھتا ہے۔

۵۔ برش کرنے سے ذہنی سکون اور طبیعت پر اچھا اثر ہوتا ہے۔

۶۔ برش کرنے سے مسوڑھوں کی ورزش ہوتی ہے اور خون بڑھا کرتا ہے۔ یہ منہ کے امراض کو روکتا ہے اس سے منہ میں بدبو پیدا نہیں ہوتی۔

دانتوں کی برش سے صفائی

ٹوتھ برش میڈیم سائز ہونا چاہیئے نہ زیادہ سخت ہو اور نہ زیادہ نرم۔ ٹوتھ برش سے خوراک کے ذرات دانتوں کی بیرونی سطح سے دور کئے جاتے ہیں۔ بیکٹریل پلاک نہیں ہوتا لیس دار مادہ ختم ہو جاتا ہے جراثیموں کو پرورش پانے کا موقع نہیں ملتا۔ ٹوتھ برش کے ساتھ ٹوتھ پیسٹ کا استعمال بھی آج کل عام ہے۔ ٹوتھ پیسٹ کسی قسم کی دوائی نہیں بلکہ ایک ذریعہ ہے صفائی کرنے کا جس میں تین قسم کے اجزاء ہوتے ہیں (۱) [illegible] (۲) ذائقہ دار مادہ (۳) جرثومی کش دوائیاں۔ (۴) [illegible] مرض کے مطابق کرتی ہے باقی ہر کمپنی کا ٹوتھ پیسٹ بیت [illegible] کے مطابق اس کے رنگ روپ میں فرق رکھا جاتا ہے، ٹوتھ پیسٹ کوئی دوائی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ذریعہ ہے جس سے دانتوں کو صاف کیا جاتا ہے۔ بہتر یہ ہوتا ہے کہ ٹوتھ پیسٹ ہر ماہ تبدیل کی جائے۔ تاکہ زبان کے وہ خلیے جو ذائقے دار ہوتے ہیں زیادہ لعاب پیدا کرتے ہیں وہ ایک ذائقے پر عادی نہ ہونے پائے۔

منہ کے جراثیم ایک جرثوم کش دوائی سے ٹیسٹ ہو جاتے ہیں۔ اور دوائی کا اثر نہیں ہوتا۔ ایک ہی قسم کی ٹوتھ پیسٹ پر اکتفا بھی دانش مندی نہیں ہے، ٹوتھ پیسٹ وہ اچھا ہے جس میں زیادہ جھاگ ہو اور جس میں فلورائیڈ نمکیات موجود ہوں۔

بہت سے لوگ انگلی پر ٹوتھ پیسٹ لگا کر دانتوں کو مانجتے ہیں ان کو ڈر ہوتا ہے کہ ٹوتھ برش سے خون آجائے گا، یہ طریقہ غلط ہے۔

کاغذ کی گرانی

۲۔۳ ماہ سے کاغذ کے دام اسطرح بڑھ رہے ہیں جسطرح گھڑی بڑھتی ہے۔ چند ماہ قبل جو کاغذ R52/- ریم ملتا تھا وہ اب R.105/- ریم ہے اور اس نوٹ کے چھپنے تک نہ جانے نرخ اور کیا ہو جائے۔ اتنا ہی نہیں کہ قیمتیں بے روک ٹوک بڑھ رہی ہیں، بلکہ کاغذ ملتا بھی نہیں ہے شاید اس لئے کہ اسکا بلیک کیا جائے گا، ایسی حالت میں کتابوں کی اشاعت ایک ایسا مسئلہ بن گیا ہے جسے حل کرنا مشکل ہے۔ اسطرح کا گراں کاغذ لیکر اگر کتابیں چھپوائی جائیں تو قیمتیں اتنی زیادہ ہوں گی کہ خریدار کے لئے ان کا خریدنا آسان نہ ہوگا، اس لئے کہ کتابوں کی خریداری عام گھروں میں ہر چیز کے بعد ہوتی ہے۔ اور اسوقت ضروریات زندگی کی دوسری اشیا بھی گراں ہیں۔ انہیں خریدنے کے بعد اتنی گراں کتابیں خریدنا بہت مشکل ہے۔ بہت سے پبلشرز نے کتابوں کی اشاعت روک دی ہے۔ ہم بھی سروست ہمت ہار گئے ہیں اور اشاعتی کام ٹھپ ہے۔

کیا ہوا ہے امی کو؟" نگار نے چیخ کر پوچھا۔ اور آگے بڑھ کر ان پر جھک گئیں۔"

"آپ۔ جا کے ابا جان کو دیکھیے" ایزد نے ہانپتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اس نے کفیل کو زینوں کی طرف ڈھکیلتے ہوئے کہا: "جائیے ایسا نہ ہو کہ وہ دور نکل جائیں۔ یہاں تو میں موجود ہوں۔"

"ہوا کیا؟" کفیل نے حواس باختہ ہو کر پوچھا۔

"آپ پہلے جائیے تو۔ میں بتا دوں گا کیا ہوا" ایزد نے پیچھے مڑ کر صالحہ بیگم کو دیکھا اور پھر کفیل کو زینوں تک ڈھکیل لے گیا۔ وہ تیزی سے زینہ اترتے باہر چلے گئے۔

ایزد تو نگار نے دہائیاں ڈال دیں۔ چھاتی پیٹ لی۔ اور رونا شروع کر دیا "کیسا نیا ظلم ڈھایا میری امی پر۔ ہائے میں سمجھتی تھی۔ ابا جان اور تم مل کر مار ڈالو گے انھیں۔ سکون ہی نصیب نہ تھا۔ فکروں کے مارے نیم جان ہو رہی تھیں" نگار کی دیکھا دیکھی بچے بھی بلند آواز میں رونے لگے۔

"باجی کیوں شور مچا رہی ہیں آپ" ایزد نے چیخ کر کہا اور شارق کو ایک گرجدار ڈانٹ بتائی "خاموش رہو۔ خبردار اب آواز نہ نکلے۔ ڈھکیل دوں گا زینوں پر نیچے صحن میں جا پڑو گے۔"

رونے چیخنے چلانے کی آوازیں نیچے پہونچیں۔ اور ناصیہ بھی اوپر آئیں ان کے پیچھے اپنی کا بچی آپا ذاکرہ اور ان کے بھی پیچھے گول مول گوشت کی پہاڑی ماما عیدن۔ سب کے سب ایک لے میں پوچھ رہے تھے۔ کیا ہوا کیا بات ہے۔

ناصیہ نے کانپتے ہاتھ سے صالحہ بیگم کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ اور ان کے کان کے پاس منہ کر کے انھیں آوازیں دیں۔

"تم نے اب کیا گل کھلایا تھا آپی کا" نگار نے ثمر کالونہ پر ایک قہر آلود نظر ڈالی۔

(باقی آئندہ)

دوست" ایزد نے ترکی بہ ترکی باپ کے مقابلہ میں آواز بلند کر کے کہا۔

"اس ناہنجار، خود غرض، مکار آدمی کو آپ اپنا دوست کہتے ہیں۔ جس نے آپ کو ہر طرح تباہ اور مفلس کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی؟ اس مطلبی مفاد پرست شخص کی دوستی کا دم بھرتے ہیں آپ۔ جو اپنی بیوہ لڑکی اور نواسہ آپ کے سر تھوپنا چاہتا ہے۔ مجھے سمجھائیے۔ کدھر سے ہے وہ آپ کا دوست کیسے ہے وہ آپ کا دوست۔؟"

"تمھیں ان فروعات سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے" شعیب صاحب نے جواب دیا: "تم صرف بات واضح کر دو کہ تمھیں اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کرنا ہے کہ نہیں!"

"باپ اپنی ذات کی حد تک کوئی حکم دے تو میں تعمیل کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن باپ اگر دیکھتے بھالتے اندھے کنوئیں میں گرے اور بیٹے کو بھی گرنے پر مجبور کرے تو میں ایسا حکم ماننے سے قاصر ہوں"

"بہت اچھا بہت اچھا" شعیب صاحب نے قہرناک لہجے میں کہا: "سن لیا میں نے تمھارا جواب۔ اب تو ہماری آن کا سوال آ پڑا ہے۔ ہم تو جا رہے ہیں۔ کر لو اپنی من مانی"

وہ پلٹے اور پشت پر ہاتھ باندھے تیز تیز قدموں سے چلے گئے۔

"دھاندلی کی بھی کوئی حد ہے" ایزد نے کہا۔

"بیٹا۔ لحاظ نہ آیا۔ باپ کو برابر سے جواب دیتے چلے گئے" آپا ذاکرہ نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا: "واہ وہی مثل ہے کہ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ ارے کیا اسی لیے اس نے پڑھا لکھا کر تمھیں اس قابل کیا تھا کہ وقت پڑے تو اس کے منہ آؤ"

"پھوپھی اماں۔ آپ بس نمازیں پڑھیئے اور تسبیحیں پھیریئے۔" ایزد نے انھیں بھی جواب دے دیا: "باقی معاملات میں آپ کا دخل نہیں ہے۔ چپ چاپ تماشہ دیکھا کیجئے۔ بس!"

"خاموش رہو گستاخ بدتمیز" صالحہ بیگم نے پولی آواز میں ڈانٹا: "جا کے دیکھو باہر کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سچ مچ گھر چھوڑ کے چلے جائیں"

"چلے جائیں تو میں کیا کروں۔ میں بھی جا رہا ہوں" ایزد نے چلا کر کہا۔

"واہ جناب۔ کیا خوب زبردستی ہے"

"ایزد۔ ہوش میں تو ہو؟" ناصیہ نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ تو کانپ رہی تھی۔ ایسی حالت میں ان کی گرفت کمزور تھی۔ یہ تو ایزد کی انسانیت تھی کہ اس نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا نہیں لیا بلکہ بڑی سرد آواز میں ناصیہ سے بولا: "آپ بھی ان معاملات میں چپ رہیئے بھابی۔ اور ہمیشہ یہ بات یاد رکھیئے کہ شادی بیاہ کے معاملات میں کبھی ثالث کی حیثیت اختیار نہ کیجئے۔" اس نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی اور آہستگی سے اپنی کلائی چھڑائی۔ اور دالان سے تیز تیز گزر کر پھلانگتا ہوا تین تین چار چار زینے چڑھنے لگا!

"رعنا۔ بیٹی بھاگ کے دیکھ آ۔ تیرے ابا جان کیا کر رہے ہیں" صالحہ بیگم نے کہا اور سر تھام لیا۔ رعنا دوڑ کے گئی۔ اور ایک سکنڈ بعد واپس آ کر بولی: "...ابا جان سوٹ کیس میں کپڑے بھر رہے ہیں"

"آپا جانے سمجھائیے انھیں۔ خدا کے واسطے۔ غصہ ضبط کریں" صالحہ بیگم نے آپا ذاکرہ سے کہا وہ کانکھ کر انھیں اور کراہتی ہوئی باہر کی طرف ہولیں۔

"دلھن۔ تم تحریف کو فوراً دوڑا دو۔ وہ کفیل کو اپنے ساتھ لے آئے" صالحہ بیگم نے کہا۔

ہو کر کہیں خدا او راس کا کچھ اس پر ناگوار بوجھ بن جائے۔ اسے یہ بھی اندازہ ہوا کہ ایزد شاید خود سے رضامند نہیں ہوا۔ بلکہ وہ مجبور کر دیا گیا ہے اس کے باپ نے اسے مجبور کیا تھا اور یہ بھی پیش بینی غلط نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے خسر کی زیادتی کا بدلہ اپنی بیوی سے لے!

آسنہ کا خیال صد فی صد صحیح تھا!

شعیب صاحب کے گھر میں قیامت صغریٰ آ چکی تھی! وہ گھر سے جانے پر بالکل تیار تھے۔ کفیل، آپا ذاکرہ اور ناصیہ نے جی بھر کے خوشامد کی۔ شارق دوڑ کر نگار اور خرم کو بھی بلا لایا۔ وہ دونوں گڑگڑائے۔ لیکن وہ شعیب صاحب ہی کیا ہوئے جو مان جاتے۔ بے شک سب کو ان کی یہ بڑھاپے کی ضد عجیب اور ناگوار لگی۔ لیکن وہ کرتے تو کیا کرتے شعیب صاحب ہرگز اپنی آن پر حرف لانے کو تیار نہ تھے!

ادھر ان کے صاحبزادے ایزد ان کے مقابلہ پر تیار تھے۔ اوپر سے وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور پیچ و تاب کھا رہا تھا! لیکن اس کی بھی ضد یہی تھی کہ وہ ہرگز باپ کی مرضی پر قربان نہیں ہوگا۔ بالآخر شعیب صاحب گھر سے نکل گئے!

اور اسی وقت بیچاری صالحہ بیگم نے اپنا آنچل ایزد کے قدموں پر بچھا دیا۔ کہا کچھ بھی نہیں۔ صرف دو آنسو ان کی دھندلی آنکھوں سے نکلے اور فوراً وہ بیہوش ہو کر زمین پر ڈھے گئیں۔!!

ایزد گھبرا گیا۔! اس نے بدحواس ہو کر منڈیر سے جھانکا اور پوری طاقت سے کفیل کو آواز دی۔ پھر جھک کر صالحہ بیگم کو اپنے بازوؤں پر اٹھایا اور مسہری پر لٹا دیا۔ کفیل دوڑتے ہوئے اوپر آئے۔ ان کے پیچھے نگار اور شارق و رعنا بھی تھے!

امی میں جاؤں؟ شارق نے پوچھا: ادھر گیا کہ ادھر آیا!

اپنے ساتھ لیتے آؤ۔ صالحہ بیگم نے کہا: جلدی کرو ایسا نہ ہو کہ کہیں کفیل کے آنے تک دونوں میں سے کوئی چلا جائے۔ یا اللہ کس جھنجھٹ میں پڑی ہوں تم: انھوں نے پریشان ہو کر کہا۔ شارق سائیکل لے کے بھاگا۔!

آپا ذاکرہ کو کمرے میں آتے دیکھ کر شعیب صاحب نے دھڑ سے ٹرنک بند کیا اور ان کی طرف پیٹھ پھیر کے الماری سے کچھ نکالنے لگے۔

میں کہوں۔ یہ تمھیں ہوا کیا ہے شعیب؟ آپا ذاکرہ نے لہجہ بارعب اور بزرگی سے لبریز کر کے کہا: واہ۔ بچے کے برابر بچہ بنے ہو۔ عقل کے ناخن لو۔ تم کہاں جا رہے ہو؟ صالحہ پریشان ہو رہی ہیں۔ ان کی مٹی پلید ہے۔ ادھر تم ادھر وہ ناخلف:

یہ سب کیا دھرا انھیں کا ہے: شعیب صاحب نے آپے سے باہر ہو کر کہا: اولاد کی طرفداری کر کر کے انھوں نے اس بدبخت کو اس قدر سر چڑھایا ہے کہ وہ لعنتی اب اپنے آگے کسی کو نہیں گنتا۔ وہ چاہتیں تو اسے راہ راست پر لا سکتی تھیں۔ میں نے آج تک نہیں سنا کہ انھوں نے میری تائید میں اسے سمجھایا ہو۔ دراصل وہ نہیں چاہتیں کہ میری مرضی پوری ہو:

ہوا میں گرہ لگا رہے ہو۔ بھیا: آپا ذاکرہ نے برا مان کر کہا: واہ۔ ان بے چاری نے کبھی بگڑی اولاد کو نہیں بہکایا۔ ہمیشہ تمھاری ہی کہی گایا کیں۔ یہ کہو کہ آج کل کی اولاد ہی ایسی کہاں سے باہر ہے:

لاحول ولا قوۃ۔ یہ میری ہی غلطی تھی کہ میں نے اسے کفیل کا سا سعادت مند اور فرمانبردار سمجھا تھا۔ خیر۔ آپ اسے ایک بار اور راہ راست پر لانے کی کوشش کیجئے۔ اس کے بعد میں واقعی وہی کروں گا جو میں نے طے کر رکھا ہے:

پھر آپا۔ کچھ کہئے تو۔

ارے بھئی۔ اب شعیب چچا کے چھوٹے صاحبزادے ہی سے تو نسبت لگی ہے۔

کیا؟

میں نے دو ایک سال قبل انھیں دیکھا تھا۔ بہت شکیل وجیہہ اور خوبرو آدمی ہیں:

لیکن میں نے تو۔ سنا تھا آپا کہ۔ کہ۔ وہ: ہچکچا کر حنا نے کہا اور پھر سر جھکا کر بولی: کوئی کہتا تھا ایک روز کہ۔ وہ۔ بہت غصہ ور اور تیز مزاج ہیں:

کون مرد غصہ ور نہیں ہوتا؟: آمنہ نے کہا: اپنے نوید بھائی کو دیکھ لو۔ مرضی کے خلاف کوئی بات ہوتی ہے تو کتنا چیختے چلاتے ہیں:

آپ کو وہ اتنا چاہتے بھی تو ہیں۔

تمھیں کیا خبر کہ ایزد صاحب تمھیں نہیں چاہیں گے؟؟:

پھر بھی ہو آپا۔ میرا دل بے حد دھڑک رہا ہے: حنا نے کہا: میرے جانے کے بعد آپا جی کا کیا حال ہوگا۔ بھائی جان اور بھابی سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ ان کی خبر گیری کریں گے۔ بے چاروں کے گردے کا درد ایسا برا اٹھتا ہے:

ارے تم کیوں ہلکان ہوئی جا رہی ہو۔ حنا۔ آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ کیا آپا جی کی خبر گیری اور خدمت نہیں کریں گے؟!:

پھر خواتین کمرے میں داخل ہوئیں اور بات چیت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔!!

آمنہ ایک نئی تشویش میں مبتلا ہو کر کمرے سے نکلی۔ اسے بھی تمکنت ایزد کی مزاجی...
کیفیت اس کے پیش نظر نہیں تھی وہ تو یہی سوچ سوچ کر اپنا خون جلا رہی تھی کہ اس کے باپ نے ایک غیر اخلاقی حرکت کر کے کسی شریف آدمی کو مجبور کر دیا تھا۔ اب یہ سوچنے لگی کہ واقعی ایزد خوش مزاج ہنس مکھ اور پر محبت آدمی نہیں ہے یا ایسا نہ

ہے۔ جو من پسند چیز سامنے آجاتی ہے۔ ہم کہہ دیتے ہیں کہ دعا قبول ہوئی آہ۔ آپا۔ کیا۔ پچھلی مرتبہ اماں نے میرے لیے دعائیں نہیں مانگی تھیں۔ وہ سب کدھر گئیں... آج مجھے پھر... بے شرمی۔ سے اس معاملہ میں۔ راضی ہونا پڑا:

کیسی باتیں کررہی ہو۔ بیٹی: خان صاحب نے تڑپ کر کہا۔ دنیا کا دستور ہے۔ بے شرمی کی اس میں کوئی بات نہیں:

ابا جی آپ بھی مجھے اپنے کندھے پر کا بوجھ سمجھتے ہیں: حنا کے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔

حاشا وکلا بیٹی۔ میں نے تمہیں کبھی کندھے پر کا بوجھ نہیں سمجھا۔ خدا گواہ ہے۔ تم تو میری زندگی ہو۔ تمہاری صورت دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں: خان صاحب نے کہا: کیوں ایسی باتیں سوچ کر دل بھاری کر رہی ہو۔ میری بچی؟:

"ابا جی آپ کو اچھی طرح پتہ ہے کہ وہ لوگ شریف ہیں: آمنہ نے حنا کو سنانے کی خاطر پوچھا۔

شریف؟؟: تعجب سے خان صاحب بولے: لفظ شرافت ان کی سیرت کی خوبیوں کو پوری طرح واضح نہیں کرسکتا۔ آمنہ۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ لوگ فرشتہ صفت ہیں۔!"

اِس بات چیت سے تو نگار باجی اور ناصیہ بھابی بھی بہت مخلص اور ہمدرد لگیں: آمنہ نے کنکھیوں سے حنا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے اس طرح کہنے پر خان صاحب نے شعیب صاحب کے خاندان کے گن گانے شروع کردیئے۔ ان کے جانے کے بعد حنا نے بے حد تحیر اور تعجب بلکہ دم بخود لہجے میں پوچھا۔

"کیا آپ لوگوں کی باتیں ذرا بھی نہیں سمجھی آپا۔ بھابی اور نگار باجی سے کیا مطلب۔ ان کا کیا تذکرہ تھا: آمنہ دکھاوے کو ہنسنے لگی: آپی ابھی بے خبر ہو:

وعدہ کرو کہ کہیں آنے جانے کا قصد نہ کروگے آپا ذاکرہ نے کہا پھر خوشامد سے بولیں: میں کہوں کہ دلھن بے چاری مرجائیں گی۔ وہی بات ہوگی کہ اللہ نہ کرے نہ دین کی نہ دنیا کی۔! داہ:

جائیے آپ جائیے۔ جو میں نے کہا ہے وہ کیجئے: شعیب صاحب نے دریرہ بھنا کر کہا۔ آپا ذاکرہ بادل نخواستہ اندر آئیں... ماحول بہت اداس تھا۔ ناصیہ اور صالحہ بیگم ایزد کو سمجھا بجھا کر ہار چکی تھیں۔ انھیں کفیل صاحب کا سخت انتظار تھا۔

شعیب صاحب کی حسب ہدایت آپا ذاکرہ نے ایزد کو سمجھایا۔

"بیٹا بات یہ ہے کہ میں کہوں کبھی ناڑ گاڑی پر تو کبھی گاڑی ناڑ پر چھوٹو کی غلطیاں بڑے درگزر کرتے ہیں تو کبھی بڑوں کی بھول چھوٹوں کو بھی انگیز کر لینی چاہیئے۔ ایک بات تمہارے باپ کے منھ سے نکل گئی ہے اسے نباہنا تمہارا کام ہے۔ میں کہوں میاں اتنی سی قربانی تم ان کے لیے نہیں کرسکتے۔ داہ۔ یہ تو سوچو کہ انھوں نے تمہیں رتی سے ہاتھی بنانے میں کیا کیا پاپڑ نہ بیلے ہوں گے۔!"

ان کا جو فرض تھا انھوں نے کیا۔ نہ پیدا کرتے مجھے۔ نہ پالتے پوستے۔ کوئی میں نے ان سے استدعا کی تھی: جاہلوں کی طرح ایزد نے کہا۔

پھر وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔ داہ میں کہوں کسی طرح الٹی مانتے ہو نہ سیدھی: آپا ذاکرہ نے پھر اپنے تکیہ کلام اور محاوروں کے دریا بہاتے ہوئے کہا: ایسی ضد باندھ کے بیٹھے ہو۔ جیسے مولوی کا روزہ کہ ٹوٹتا نہیں۔ !کچھ تو سوچو کہ تمہاری وجہ سے گھر الٹ جائے گا۔ تمہارے باپ ادھر چل دیں گے اماں الگ اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑجائیں گی۔ کیا یہ سب کچھ تمہیں اچھا لگے گا:

ہاں ہاں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ سب لوگوں کی یہ مرضی ہے مجھے بے حقیقت

ہوگا؟۔

دوسرے دن بارات آنے والی تھی۔ خان صاحب کے پاس بھرپور سادگی کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ اور انھیں ایک مستقل اندیشہ لگا تھا کہ انھوں نے شعیب صاحب کو مجبور کر کے کوئی غلطی تو نہیں کی ہے؟ آمنہ کا رکھ رکھاؤ بہت سنجیدہ تھا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اس رشتہ سے خوش نہیں تھی! اس نے زبردستی خط لکھوایا تھا کہ خان صاحب شرطاً واپس لینے پر آمادہ ہیں۔ لیکن اب اصرار شعیب صاحب کی طرف سے تھا! آمنہ اس پر بھی مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ وہ دلگرفتہ تھی۔ اسے پورا گمان تھا کہ حنا کی شادی کے بعد گھر پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور آئے گی۔ اچھے یا برے اثرات پہلے ہی سے آدمی پر اپنا عکس ڈالنے لگتے ہیں۔ چنانچہ آمنہ بہن کی دوسری شادی کی تیاریاں بظاہر بڑے استقلال اور عزم سے کر رہی تھی۔ لیکن باطن میں چھپے ہوئے خدشے اس کے چہرے پر محیط نظر آ رہے تھے!۔

خان صاحب مضطرب تھے! یہاں خواتین کی موجودگی میں زنانے درجے میں ان کا داخلہ بند تھا۔ پھر بھی وہ پردا کروا کے کئی بار حنا کے پاس آ چکے تھے اس کے بچے کو اپنے پاس بلا کے دیکھ چکے تھے۔ غرضیکہ ان کا کرب زنی پر تھا!۔ حنا کی خاموشی بے آواز گریہ وزاری کا ان کے لیے روح فرسا اور جانگسل تھی۔

آمنہ نے بہتیری عزیزہ حنا کو سینے سے لگا کر تسلیاں دی تھیں!۔

"خدا کا شکر ادا کرو" آمنہ نے کہا "ہماری تمنا پوری ہوئی۔ اب تو یہ دعا ہو کہ تم خوشیوں کا منہ دیکھو۔ ہر دم سکھی رہو۔ بہت دکھ اٹھا چکی ہو"

"دعاؤں پہ مجھے یقین نہیں آپا" حنا نے گلوگیر آواز میں کہا "انسان نے صرف اپنے دل کی تسلی کی خاطر ایک چیز دعا ایجاد کر لی ہے۔ تقدیر کا لکھا ہمیشہ پورا ہوتا

جانور کی طرح اپنی خوشی اور مرضی پر قربان کر دیں۔ یہ بالکل محسوس نہ کریں کہ آخر میری بھی زندگی ہے۔ کچھ آرزوئیں ہیں۔ کچھ جذبات ہیں۔۔۔" ایزد نے جارحانہ انداز میں کہا۔

اتنے میں کفیل آ گئے۔ صالحہ بیگم نے آنسو بہا کر ان سے کہا "تمھارے باپ کی مرضی کے آگے گھر تباہ ہو جائے گا۔ بیٹے۔ ادھر وہ جا رہے ہیں ادھر یہ ناخلف دیکھ لینا نہ وہ جھکیں گے نہ یہ دبے گا۔ ہائے میرے اللہ۔ میرے نصیب۔ کیا میں شوہر سے اور اولاد سے ایک ساتھ محروم ہو جاؤں گی"۔

"ارے امی آپ بھی کیا عورتوں کی سی فضول باتیں کرنے لگیں۔ ٹھہریئے میں سب معاملہ برابر کیے دیتا ہوں۔ لاحول ولا قوۃ عجیب مخمصے میں جان آ کے پھنسی ہے۔ میں تو بھاگ کر بھاگ چلا آ رہا ہوں۔ حد ہے کہ رجسٹر میں دستخط بھی نہ کر سکا۔ اچھا تو۔ ناصیہ۔ کہاں ہیں دونوں؟"

"ابا جان اپنے کمرے میں ہیں۔ ایزد اوپر ہے" ناصیہ نے مری ہوئی آواز میں کہا "پھوپھی اماں اسے سمجھانے گئی ہیں"۔

"سمجھ چکے وہ پھوپھی اماں سے" کفیل نے کہا اور ہنستے ہوئے چلے گئے۔

"تم لوگوں کی صورت سے مضبوطی ہے" صالحہ بیگم بولیں "ورنہ مجھے تو یہ باپ بیٹے مل کر ختم کر دیں گے۔ میری تو عجیب مصیبت ہے۔ تمھارے ابا جان سمجھتے ہیں میں نے لڑکے کو بہکا دیا ہے۔ ادھر وہ سمجھتا ہے کہ میں ان ہی کی اس کی زندگی برباد کرنے پر تلی ہوئی ہوں۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل والی بات ہے"۔

"مطمئن رہیے امی" ناصیہ نے دلدہی کی "وہ آ گئے ہیں نا۔ سب ٹھیک کر لیں گے آپ کچھ دیر آرام کیجیے۔ مجھے ایک طرح ٹھیک ہیں۔ میں نانی عیدن سے کہہ کر کھانا لگا لوں گی آپ باورچی خانے میں نہ آیئے گا"

پروردگار تمھیں خوش رکھے۔ بیٹی: بچوں کے لاکھوں لاکھ سکھ دیکھو۔ تم نے مجھے آرام دیا ہے۔ اللہ پاک تمھیں اس سے ہزار گنا آرام دے۔" صالحہ بیگم بولیں۔ پھر یہ کہتی ہوئی اٹھ گئیں: "میں اب جھنجھٹ میں نہیں پڑوں گی۔ باپ بیٹے جانیں اللہ جانے۔ پانچ دن شادی میں رہ گئے ہیں۔ یہاں ابھی تک تنکا نہیں ہلا۔"

"آپ ہلکان نہ ہوں امی۔ سب وقت پر ہو جائے گا۔" ناصیہ نے کہا۔ صالحہ بیگم چلی گئیں۔ اماعیدن نے انھیں دیکھتے ہی شکوہ کیا: "آج بڑی اماں کہاں رہ گئیں ان کے انتظار میں ہم سوکھت ہیں اتی دیر سے۔ چائے نگوڑی بار بار گرم کرکے اتاری ہے۔ ادھر دیکھو دلھن۔ لگن میں قیمہ دھرا ہے پلاؤ کا۔ وہ آئیں تو ہمارا ہاتھ بٹائیں سچی بات تو یہ ہے بٹیا کہ اب ہم کچھ کچھ بھولت ہیں پلاؤ کی ترکیب!"

"وہ اباجان کے کام سے اوپر گئی ہیں۔ نانی عیدن آپ گھبرائیے نہیں۔" ناصیہ نے ہنستے ہوئے کہا: "مزے میں چلئے بیٹھئے اور مجھے بتائیے۔ آپ کا ہاتھ آج میں بٹاؤں گی۔ سالن کیا پکے گا؟"

"قیمہ پلاؤ اور کدو کا رایتہ آلو کی کھیر بڑی اماں کہت تھیں۔ اب اللہ جانے اور کیا سوچے ہیں۔ آئیں تو پتہ چلا۔" عیدن تو سخت بیزار تھیں: "ہم کا پتہ نہیں۔ کا بجا ہے۔ ملٹین (منٹوں) میں سب کھانا مانگنے لگہیں۔"

ناصیہ نے جلدی سے چائے بنا کے اماعیدن کو پیش کی۔ انھوں نے جھوا بھر دعائیں دیتے ہوئے کہا: "اللہ پاک تمھیں اتنی خوشیاں دے بیٹا کہ سمیٹتے سمیٹتے تھک جاؤ۔ ہماری عمر لگ جائے تمھیں کہ ایک دن اپنی بہوؤں کا منہ دیکھو۔ اس گھر کے بھاگ کھلے تھے کہ تمھارے قدم آئے۔ ارے وہ نس پٹر صاحب کی دلھن بہو ہیں ... ناس پیٹی کیسی کی۔ صورت دیکھو تو جھونڈ کا چھتہ ہے۔ نخرے کی حد نہیں ایک دن ہم گئے رہن۔ نیاز کی مٹھائی کا لے کے۔ ہم تو سلام کی خاطر ان کے ایک انگلی

گال تھام لیے۔

"تمھیں وہ بہت چاہتے ہیں۔ تمھاری ہر بات مانتے ہیں۔ ضرور دشمن لیں گے تمھاری۔" کیفی نے زبردستی ناصیہ کو کمرے سے نکالا۔!!

آمنہ سے حنا کو پتہ چل گیا تھا کہ اس کے نصیب پھر زبردستی جگائے جا رہے ہیں۔ آمنہ اور اس کے شوہر تو بہ شادی کی تیاری میں مگن تھے۔ رحمٰن اور رابعہ بھی آگئے تھے۔ خان صاحب نے حنا کا پچھلا جہیز دینا منظور نہیں کیا۔ اور بڑی فراخدلی سے کہا کہ اسے رابعہ اور آمنہ اگر منظور کریں تو آپس میں بانٹ لیں۔ آمنہ نے کام کی زیادتی کی وجہ سے اس پر دھیان نہیں دیا۔ رابعہ نے موقع غنیمت جان کر حنا کی عمدہ عمدہ چیزیں کپڑے اور آرائشی سامان چپکے چپکے پار کر دیا۔ بعد کو آمنہ کے حصہ میں جو کچھ آیا تھا وہ اس قابل تھا کہ خادماؤں کو دیا جاتا۔ اسے حنا کے کپڑے لینے گوارہ بھی نہ تھے۔ لہٰذا وہ سب واقعی ماماؤں میں بٹ گئے۔ رابعہ کو یہ فکر لگی تھی کہ خان صاحب نے قریباً تین لاکھ روپیہ کہاں رکھ دیا تھا؟۔ دوراز ولدی سے الماریاں اور ٹرنک کھنگال چکی تھیں لیکن رقم ان کے ہاتھ نہ لگ سکی۔ رحمٰن کو بھی اندیشہ تھا کہ کہیں وہ محروم [illegible] اب تک باپ کی خدمت نہ کی تھی مگر اب جی جان سے ان کی خدمت میں جٹ گئے تھے اور بیوی کو [illegible] سکھا دیا تھا کہ چند روزہ خدمت کی اداکاری بری نہیں۔ اس لیے وہ بھی اپنوں [illegible] تیاری میں لگی تھیں۔!

حنا گوشہ نشین ہوگئی۔ اس کا سارا [illegible] پوچھنے نہیں آتا تھا کہ اب کیا

خان صاحب کو جواب بھجوا دیتے۔ وہ بھی ٹھیک کہتا ہے کہ آخر جب خان صاحب
نے ابھی فرما واپس لے لیا ہے تو پھر ابا جان ہی کو اس شد و مد سے کیوں اصرار ہے
کفیل نے کہا۔ پھر بے حد فکرمند ہو کر بولے: اس نے ایک انکار کیا اور اسی پر سختی
سے قائم ہے۔ میں ابا جان سے کیا کہوں گا جا کے۔ اُف۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے:
فی الحال ابا جان کو سمجھایئے کہ کچھ ضبط سے کام لیں: ناصیہ بولیں: ان کی اس
ناعاقبت اندیشی سے بنے بنائے کام بگڑ جائیں گے۔ شاید وہ راضی ہو ہی جائے۔
بالفرض محال اگر وہ راضی ہو بھی جائے تو میں کہتا ہوں ناصیہ اس جبری اور
زبردستی شادی کا انجام کیا ہو گا؟: کفیل کی تشویش بجا تھی: میں نے سنا ہے کہ وہ لڑکی
غضب پہلے ہی بہت غمزدہ اور دکھی ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں۔ ہمارے جبر کا بدلہ وہ
اس ناکردہ کار سے لے۔ اور اس کی زندگی تلخ کر کے رکھ دے:
اس کی شکل دیکھیں گے اور موم کی طرح پگھل جائیں گے۔ میں آپ سے سچ کہتی
ہوں کہ وہ بے حد پیاری لڑکی ہے: ناصیہ نے کہا: بڑا سوال تو اس وقت کی ایزد کی
مرضی کا ہے۔ شادی کے بعد جو ہوگا وہ سنبھال لیں گے:
میں اب کچھ نہیں کر سکتا۔ میری عقل چکر میں ہے: کفیل نے کہا۔
اتنے میں شارق آیا: بھائی جان۔ آپ کو ابا جان بلا رہے ہیں:
بتاؤ اب کیا کروں؟: کفیل نے بے بسی سے ناصیہ کو دیکھا۔
اچھے بھیا کو میں سمجھاؤں۔ بھائی جان؟: شارق نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔
کفیل بے دھیانی میں کچھ ہنس پڑے۔ پھر لجاجت سے بولے: ناصیہ۔ میری
جان تم جاؤ۔ بہ نسبت میرے تم ابا جان کو زیادہ آسانی سے معقول دلائل سے
سمجھا سکو گی۔!
ہائے اللہ۔ اتنی بڑی بات ہے۔ ابا جان کیا خاک سنیں گے میری: ناصیہ نے

ماتھے پر رکھی نہ بیٹھنے کو کہا اور نہ یہ پوچھا کہ نانی کچھ کھایا پیو اگ دیکھ کے داغ دیا
ہے ااک نے۔ موئی بانجھ۔ بے اولادی پھر رہی ہے۔ بڑے بوڑھوں کی دعائیں لے تو
گود میں پھول بھی کھلیں۔ اس دن تو جی جل کے کنگورا ہمارا خاک ہوئی گوا:
ناصیہ کا سارا دھیان پڑا تھا ایزد میں۔ انھوں نے کچھ بکواس سنی کچھ نہیں سنی
ہوں ہاں کرتی اور لپ چپ کام کرتی گئیں۔ اتنے میں آپا ذاکرہ باورچی خانے میں آئیں
کیا ہوا پھوپھی اماں: ناصیہ نے جھٹ سے پوچھا۔
ارے تمھیں کہیں جونک لگی ہے۔ بیٹا: وہ برا سا منھ بنا کر بولیں: میں
کہوں۔ بن ناحق کو کفیل اپنا دماغ خالی کیے دے رہا ہے۔ ادھر ایک ہٹ ہے
جو ایک نہیں کی تو اسی پر ابھی تک اڑا تھا۔ اب اللہ معلوم۔ کچھ سیجی ہے کہ نہیں۔
میں تو چلی آئی دماغ گھومنے لگا تھا:
اچھا بڑی اماں، دلھن کا چھٹی دیو اب۔ اور تم پلاؤ پکاؤ۔ لمبے سفر میں لڑکے بھوک
بھوک چلائے گیش: ااعیدن نے کہا۔ چنانچہ آپا ذاکرہ اور ااعیدن کی سدا بہار
جوڑی اپنے دلچسپ ترین مشغلے میں جُٹ گئیں۔ ناصیہ کو ذرا خدا سے چھٹی دے دی گئی
وہ کھلی جھپٹ کر اوپر پہونچیں۔ ایزد کے چیخنے کی آواز انھوں نے سنی۔
انھیں نے پھانسی کا پھندہ تیار کر لیا ہے۔ لیکن موزوں گردن انھیں دستیاب
نہیں ہے۔ یہ کیسا ظلم ہے مجھ پر: اس کی آواز بتدریج بلند ہوگئی: واہ واہ بھائی جان
آپ بھی الٹا ہمانے آئے ہیں۔ آپ اپنے والد کو سمجھاتے تو اچھا تھا اگر کسی ناکردہ گناہ
کروں سولی پر لٹکانا بڑوں کا انصاف نہیں ہے!: اس کا لہجہ تلخ ہوتا گیا اندر فقرے
بے ربط ہونے لگے: میں کہتا ہوں۔ اللہ بدکت نابجا روں سے آپ سب کو اٹھا لے
تب ہے کہ کیوں نہ آپ کے والد اس منحوس عورت سے نکاح کر لیں اس سے
آخر میں۔ میں ہی کیوں سب کی نظروں میں کھٹکتا رہا ہوں:

کیفی کو ضبط کے باوجود ہنسی آگئی۔ وہ ایسے ہی آدمی تھے۔ نسبتاً نیک دل...
پرمحبت۔ بے لوث۔ غصہ تو انھیں آتا ہی نہیں تھا۔ گویا ان کے حصے کا غصہ بھی قدرت
نے ایزد ہی کو بخش دیا تھا۔ انھوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے
اسے سمجھایا: دیکھا تم نے طیش میں انسان کی عقل اتنی سلب ہو جاتی ہے کہ اسے
یہ تک احساس نہیں رہتا اس کے منہ سے کیا نکل رہا ہے۔ ایزد۔ کوئی باپ اپنے بیٹے
کا برا نہیں چاہتا۔ نجانے یہ خیال کیوں تمھارے دماغ میں جم گیا ہے کہ ہم سب مل کر
تمھیں تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بخدائے لایزال ہم ہر کوشش
تمھاری بہتری کی کر رہے ہیں۔ اگر ہم یہ دیکھتے کہ یہ رشتہ تمھارے لیے نامناسب
ہے تو فوراً مخالفت کر دیتے۔ لیکن اس صورت میں جبکہ ۔۔

اس صورت میں جبکہ وہ محترمہ ایک صاحبزادہ مجھے تحفتہً پیش کرنے لائیں گی۔
میں بھی اس رشتہ کے لیے مناسب معلوم ہوا ہوں۔ یہی کہنا چاہتے ہیں آپ:
زہرناک لہجہ میں ایزد نے کہا: میں اس خیال سے بھی کراہت محسوس کر رہا ہوں:
ایزد تعلیم یافتہ روشن خیال اور وسیع النظر ہوتے ہوئے بھی تم اتنی معمولی معمولی
فروعی باتوں پر دھیان دے رہے ہو: کیفی نے کہا: نگار اور ناصیہ نے مجھ سے کہا
ہے کہ خان صاحب کی صاحبزادی صورت و سیرت کی ہر لحاظ سے بہترین ہیں۔ ایسا
نہ ہوتا تو یہ دونوں عورتیں ہرگز رشتہ پر زور نہ دیتیں۔ کیونکہ تم جانتے ہو عورتوں کا کام
ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں میں کیڑے نکالیں۔ تعریف تو وہ اپنی ہم جنس کی کبھی
کرتی نہیں۔ اس لحاظ سے تم اندازہ لگاؤ کہ خان صاحب کی صاحبزادی واقعی ان...
دونوں کی مدح و ستائش پر پوری اترتی ہیں۔ رہا بچے کا معاملہ۔ یہ کوئی ایسا
مسئلہ نہیں ہے ایزد۔ ڈھائی سال کا ناسمجھ بچہ ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کا باپ
کون ہے۔ وہ تمھیں کو باپ سمجھے گا اب کہے گا:

جی ہاں جی ہاں: ایزد نے بھنا کر کہا: بلکہ بچہ مجھے ڈیڈی یا انکل جو کہا کرے
گا مفت میں باپ بن جاؤں گا۔ مجھے فی الحال پلی پلائی اولاد کی ضرورت نہیں
ہے۔ بھائی جان۔ آپ زیادہ بحث مجھ سے مت کیجیے۔ میں ہرگز راضی نہیں ہوں گا:
ابا جان گھر سے چلے جائیں گے تو امی وقت سے پہلے ختم ہو جائیں گی: کیفی نے
عاجز آکے دوسرا پینترہ بدلا۔ لیکن ایزد پر اس کا اثر بھی نہیں ہوا۔ اس نے بے حسی سے
انکار سر ہلا دیا۔

اچھا ایزد۔ جیسی تمھاری مرضی۔ میں ابا جان تک تمھارا انکار پہنچا دوں گا۔ اس
کے بعد وہ حقیقتاً گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ امی خدانخواستہ ختم ہو جائیں گی۔ تم بھی
گھر چھوڑ رہے ہو۔ میں اگر آفس کی طرف سے کسی دور دراز ملک کی طرف بھیج دیا گیا تو
پھر مزہ ہی آجائے گا۔ کسی فرشتے کو آسمان سے اتر کر گھر برباد نہیں کرنا پڑے گا
وہ انشاء اللہ خود بخود اور بہت تیزی سے بہت جلد برباد ہو جائے گا۔ شارق اور
رعنا کا جو حشر ہوگا۔ وہ ہوگا۔ اور یہ سب کچھ صرف تمھاری ضد اور ہٹ سے ہوگا۔
اچھی طرح یاد رکھنا۔ تم نے خوامخواہ ہم سب کو اپنا بدخواہ سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ
ایسا نہیں ہے:

کیفی چلے گئے۔ اب ان پر ذمہ داری آکے پڑی تھی۔ وہ سخت پریشان تھے۔
ناصیہ نے ابھی اپنی سی کوشش کی۔ لیکن ایزد کے سر سے بھوت نہیں اترا۔ ناصیہ اپنے
کمرے میں آئیں تو کیفی کو بہت متفکر دیکھا۔ وہ بستر پر لیٹے بڑے خاموش کرب
میں مبتلا تھے۔ ناصیہ ان کے پاس آ بیٹھیں۔

اب کیا ہوگا۔ ابا جان تو آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے: ناصیہ نے کہا۔
ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

ابا جان نے ناشتہ غلطی کی۔ امی ناشتے کی گستاخی کی مرضی پہلے لیتی تھی۔ بعد کو

The Hareem Lucknow July, 1979 (Phone : 44559-45334) Regd. No. LW/NP 32

THE AREE

Aug .79

Rs. 1/-

ایڈیٹر

ٹیلی فون نمبر آفس ۔ ۲۴۵۵۹

گزشتہ ۵۴ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اور اردو میں ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے۔

ٹیلی فون نمبر رہائش ۔ ۲۵۳۲۲

ماہنامہ (۵۷)

حریم

لکھنؤ نمبر (۸)

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی مرحوم

و

شفیق النساء

بیگم سلیم انہونوی مرحوم

اڈیٹر و نگراں

نسیم انہونوی

معاونین

شوکت جہاں، بیگم غزالہ

جانی بیگم ردولوی

فہرست مضامین

ماہ اگست ۱۹۷۹ء

قیمت سالانہ

خریداری منی آرڈر سے اکیس روپیہ، مخصوص خریداری کی فی ادائیگی ... روپیہ معمولی

خریداری منی آرڈر سے سولہ روپیہ، وی پی سے پرچہ منگانے پر تین روپیہ زائد۔ فی پرچہ۔ ایک روپیہ غیر ممالک سے بقدر ۳۲ روپیہ

یا دو پونڈ برائے سی میل، ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں۔

آفس اور ترسیل زر کا پتہ:۔ نسیم بک ڈپو ـــــ لاٹوش روڈ ـــــ لکھنؤ

نسیم انہونوی مالک و ناشر، پرنٹر۔ سرفراز قومی پریس ـــــ لکھنؤ

ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں گذشتہ کچھ عرصہ میں شادی شدہ لڑکیوں کے جل کر مرنے کے اتنے زیادہ واقعات ہوئے کہ یہ بات یقین کر لی گئی کہ یہ اموات حادثات سے نہیں ہوئیں بلکہ انھیں جلا کر مار دیا گیا ہے اور اکثر ایسے ثبوت فراہم ہوئے کہ یہ قیمتی جانیں جہیز کم ملنے کے تنازعات نے لی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہیلا سمتی تنظیم کی جانب سے مظاہرہ بھی ہوا۔

کوئی مانے یا نہ مانے یقین کرے یا نہ کرے لیکن میں یہ کہے بغیر نہ رہوں گا کہ عورت صنف نازک ہے۔ تعلیم اور آزادی کے باوجود اسے مردوں کی برابری نہ حاصل ہو سکی ہے نہ حاصل ہو سکے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ لڑکیوں کی شادیاں نہ کی جائیں اور وہ جہیز سے پیدا شدہ لعنتوں سے بچی رہیں۔ لیکن یہ غیر فطری بات ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو معاشرہ اتنا گندہ ہو جائے گا کہ اس کے تصور سے بھی گھن آنے لگے گی۔

ہر کوئی جانتا ہے کہ شادی کے بعد عورت سسرال والوں کے رحم و کرم پر رہنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ دہلی میں جو واقعات ہوئے ہیں، وہ ایسی لڑکیوں کے نہیں ہیں جو جاہل ہوں یا انھیں پردے کی بندشوں میں ... بزدل اور کمزور بنا دیا گیا ہو۔ نہیں یہ تعلیم یافتہ اور اچھے گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ لیکن عورت بہر حال عورت ہی رہتی ہے۔ اور اسے صنف نازک ہی کہا جا سکتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی آزاد اور تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو۔

ہمارے ہندوستانی سماج میں عورت کے ساتھ ہمیشہ سے ظلم کیا جاتا رہا ہے۔ حد ہے کہ ایک زمانہ میں اسے ستی ہونے کے لئے اپنے شوہر کی چتا پر بھی جل مرنا پڑتا تھا۔ یہاں عورت کو اتنا کم درجہ سمجھا جاتا تھا کہ بغیر روپیہ پیسہ دیئے اسے کوئی مرد اپنانا ہی نہ چاہتا۔ صدیوں سے چلی آنے والی اس قبیح رسم کو ہماری موجودہ حکومت نے محسوس کر کے ۱۹۶۱ء میں جہیز پر پابندی لگانے کا ایکٹ بنایا لیکن معاشرے کی ایسی خرابیاں قانون کے ذریعہ دور نہیں کی جا سکتیں۔ جیسا کہ ۲۰۔۲۱ سال کی مدت میں اگر ایمانداری کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو کوئی بھی اصلاح نہیں ہوئی۔ جہیز کا کاروبار برابر جاری ہے۔ بلکہ دن بدن اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کہیں کہیں یہ کام رشوت کی طرح چوری چھپے ہوتا رہا ہے۔ لڑکی والے مجبور ہوتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو کسی اچھے لڑکے کے ساتھ شادی کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ اگر وہ لڑکے والوں کو منہ مانگی رقم نہیں دیتے تو شادی نہیں ہوتی حکومت سے شکوہ کریں تو کوئی نتیجہ نہیں نکلتا اس لئے کہ حکومت اس سلسلہ میں کوئی ثبوت اس بات کا حاصل نہیں کر سکتی کہ لڑکے والوں نے کوئی مطالبہ کیا تھا۔ شادی کرنے نہ کرنے کا فیصلہ لڑکے والے ہی کر سکتے ہیں انھیں مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس طرح قانون کے باوجود لاکھوں بلکہ کروروں شادیاں قانون کے خلاف ہوتی رہیں۔

حکومت نے بھی اسے محسوس کر لیا ہے اس لئے اب سابقہ والے ایکٹ کو اور سخت بنا کر اس کے مجرموں پر پانچ ہزار روپیہ تک جرمانہ یا چھ ماہ کی قید سخت دی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ سزا نہایت معمولی ہے۔ ایسا جرم کرنے والوں کے لئے تو عبرت انگیز سزا کا قانون بنانا چاہئے تاکہ اس کے تصور سے ہی انسان کانپ جائے۔

ذرا تصور تو کیجئے کہ ایک معصوم لڑکی اپنے ماں باپ کا سب کچھ لے کر سسرال جاتی ہے لیکن پھر بھی سسرال والوں کی حرص ختم

ماہ رمضان المبارک
میں
زکواۃ
دے کر غریب مسلمانوں
کی عید کا سامان کیجئے

کی آگ نہیں بجھتی۔ وہ لڑکی پر فقرے کستیاں کرتے ہیں۔ اور جو خود دار لڑکیاں اپنے والدین کو مزید زیر بار کرنا پسند نہیں کرتیں انھیں یا تو کسی بہانے سے جلا کر مار دیا جاتا ہے یا وہ خود جل کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی ہیں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ صدیوں سے ہم بھی برادران وطن کے ساتھ رہتے ہوئے اسی رنگ میں رنگے جا رہے ہیں۔ دوسرے رسم و رواج کی طرح اکثر مسلم گھرانوں میں بھی نقد رقم کے بغیر لڑکی کی شادی بہت دشوار ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کا اس لعنت میں گرفتار ہونا اس لئے بڑا نازک مسئلہ بن گیا ہے کہ انکی مالی حالت قابل رحم ہے۔ جس کے دو چار لڑکیاں ہوتی ہیں ایسکے لئے ان کی شادیاں عذاب بن جاتی ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ جس طرح بھی ہو اپنی اصلاح کر کے اس بدترین رسم سے توبہ کر لیں۔ یہ ایسا گناہ عظیم ہے کہ روز قیامت اس کی سخت ترین سزا بھگتنا ہوگی۔

قانون کے ساتھ ہی اخلاقی تعلیمات، ڈراموں اور لکچروں کے ذریعے بھی اس بدرسمی کی اصلاح کی جائے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ ایسی کتابیں اور لٹریچر چھپوائے جو عبرتناک اور سبق آموز ہوں۔ ایک ایسی زنانہ اور مردانہ سی آئی ڈی پولیس بنائی جائے۔ جو ایسی معقول تنخواہیں پائیں کہ انھیں رشوت لینے کی چنداں ضرورت نہ ہو اور وہ سادے لباس میں قریہ قریہ بھیس بدل بدل کر پھریں اور پتہ لگائیں کہ کہاں اس قانون کو توڑا جا رہا ہے۔ ان کے ذریعہ معلومات حاصل ہونے پر مقدمات چلائے جائیں اور ایسی عبرت انگیز سزائیں دی جائیں کہ دوسرے تھرا اٹھیں۔ محکمہ جاتی کارروائی کے ساتھ ہی پاس پڑوس والوں کو بھی اس اخلاقی فریضہ کو ادا کرنے کے لئے خفیہ پولیس کا کام کرتے ہوئے حکومت کو آگاہ کرنا چاہیئے کہ کون کیا کر رہا ہے۔

قابل عبرت عمل

سیوان بہار سے آئی ہوئی ایک خبر اخبار عزائم میں شائع ہوئی ہے جس کا متن یہ ہے کہ ایک غریب خاندان کی حسین لڑکی کچھ عرصہ قبل فرار ہو گئی تھی۔ اچانک لوگوں نے اسے واپس آتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا جسے لوگ پہچانتے نہ تھے۔ پھر اسی شب وہ لڑکی اپنی چھوٹی بہن کو بھگا لے کر فرار ہو گئی۔ کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ان حسین لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہو رہی تھیں، اس لئے کہ ان کی شادی کے سلسلہ میں جو رقمیں طلب کی جا رہی تھیں وہ ان کے متعلقین کے پاس نہ تھیں۔ آخرکار اپنے والدین کی مجبوری اور اپنی جوانی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر بڑی لڑکی نے راہ فرار اختیار کی اور پھر وہ اپنی بہن کو بھی لے گئی۔ کہاں لے گئی۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے وہ خود بھی خراب ہو گئی ہو اور اپنی بہن کو بھی خراب کرنے کے لئے لے گئی ہو۔ لیکن اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ اگر فرار کا سبب یہی تھا کہ منھ مانگے دام نہ دینے کے باعث کوئی اس سے شادی کرنے کے لئے تیار نہ تھا تو، اس کے یہ راستہ اختیار کرنے کی ذمہ داری ان مردوں پر ہے جو بیوی کو قبول کرنے کے لئے غیر معمولی رقوم طلب کرتے ہیں۔ جو بہار اور حیدر آباد میں عام ہے اور اب رفتہ رفتہ اور جگہوں پر بھی ایسے مطالبات شروع ہو گئے ہیں کتنی افسوسناک اور شرمناک بات ہے کہ یہ گمراہ مسلمان اتنا بھی نہیں سوچتے کہ ایسا کر کے وہ نہ صرف اسلامی ضوابط سے روگردانی کرتے ہیں، بلکہ سماج میں ایسی تخریب پھیلاتے ہیں جو اکثر شریف اور ہونہار لڑکیوں کو گھروں سے فرار ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ نفس کے تقاضوں کو ضبط کرنے کی بھی ایک حد ہوا کرتی ہے۔ بھوک کبھی کبھی حد سے سوا ہو کر حرام چیزوں کو بھی کھانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

آج ہمارے ملک میں لاکھوں لڑکیاں سماج کے ہاتھوں کنواری رہ کر اپنی جوانی ڈھلنے کا غم سمیٹے زندگی گذار رہی ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ جو لوگ اپنی لڑکیوں کے لئے بڑی بڑی نقد رقمیں دینے کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ بھی قسم کھا لیں کہ ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دیں۔ نہ جانے کیسے ان کی غیرت اسے گوارا کرتی ہے کہ وہ بیٹی بھی دیتے ہیں اور منھ مانگے دام بھی دولھا کے لئے لگا دیتے ہیں۔

میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ایسا اتفاق کر لیا جائے اور ہر بیٹی والا قسم کھالے کہ وہ کسی حالت میں بھی یہ ذلت گوارہ نہ کرے گا کہ بیٹی کے ساتھ دولت بھی دے تو یہ ننگے بھوکے اور بے غیرت لوگ جنھیں اپنے لڑکوں کو فروخت کرتے شرم نہیں آتی، جو بہو کی لائی ہوئی دولت کو حق سمجھنے لگے ہیں، بڑے شوق سے ان لڑکیوں سے شادیاں کرنے لگیں گے جو انھیں نقد رشوت نہیں دے سکتیں۔ کاش ایسا ہو جائے، کاش ایسا ممکن ہو سکے۔

سیوان کی یہ خبر کسی طرح اخباروں تک پہنچ گئی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ ایک واحد واقعہ ہے۔ نہیں، ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں، لیکن غیرت کے تحت انھیں اچھالا نہیں جاتا۔ ان کی پبلسٹی نہیں کی جاتی، بلکہ ان پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ بہار اور حیدر آباد میں لاکھوں کراہتی جوانیاں موجود ہیں۔ میرے پاس ایسی ماؤں کے خطوط اکثر آتے

رہتے ہیں جو اپنی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے فریاد کرتی ہیں۔ مدد چاہتی ہیں۔ ان خطوں کو پڑھکر میرا دل بھر آتا ہے بے چین ہوجاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیا اب اسلام بس اسی کا نام رہ گیا کہ اسلامی نام رکھ لیا جائے یا زیادہ سے زیادہ نمازیں پڑھ لی جائیں اور حج کر لیا جائے۔ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کی روح یہی ہے کہ اپنے پڑوسیوں کی خبر گیری کی جائے۔ اپنے قریب والوں کی مدد کی جائے یتیموں اور بیواؤں کا سہارا بنا جائے، بیوہ عورتوں سے شادیاں کی جائیں۔ اپنی عمر سے زائد عمر کی لڑکیوں سے شادی کرنے میں تکلف نہ کیا جائے۔ غریب لڑکیوں کی شادیوں کا انتظام کیا جائے جہیز بس جتنا لڑکیوں کے والدین خود دے سکیں اسے ہی قبول کیا جائے۔ اختلاط مرد و زن عام نہ ہو۔ عورتیں شرم و حیا کو ہاتھوں سے نہ جانے دیں۔ زکوٰۃ اور خیرات دی جائے کہ معاشرہ میں توازن پیدا ہو۔ ان باتوں کا خیال رکھئے۔ میرا خیال ہے کہ روزہ نماز بھی کام نہ آئے گا۔ اسلام روزہ نماز جیسی پرمشقت عبادت سے نہیں بلکہ ایسے اخلاقی مظاہروں سے پھیلا تھا جن کا جزوی طور پر میں نے ذکر کیا ہے اور جس کو ہمارے رسول مقبول صلعم نے خود کر کے دکھایا تاکہ اوروں کو ایسا کرنے میں باک نہ ہو۔

کیا ہوگا

یہ سوال سب سے زیادہ کاغذ کے سلسلہ میں اٹھ رہا ہے اس لئے کہ جنتا راج نے سب سے زیادہ چھوٹ کاغذ سازی کارخانوں ہی کو دی ہے۔ کاغذ کی قیمتیں اسی طرح بڑھ رہی ہیں جس طرح ککڑی بڑھا کرتی ہے۔ جو کاغذ جنتا حکومت سے پہلے پچاس یا باون روپیہ ریم تھا وہ اس وقت نوے روپیہ ریم ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس تحریر کے شائع ہونے تک اور کتنا اضافہ ہو جائے گا۔

ہندوستان میں تعلیم بڑھ رہی ہے۔ لوگوں میں مطالعہ کا ذوق بڑھ رہا ہے کسی بھی اسٹال پر جائیے، صدہا رسائل اور ڈائجسٹ اردو ہندی اور مختلف زبانوں میں شائع شدہ آپ کو نظر آئیں گے، لیکن ۲۰ سال قبل جو پاکٹ بکس ایک روپیہ میں ملا کرتی تھیں وہ اب چار یا پانچ روپیہ میں فروخت ہو رہی ہیں۔

اسی لئے خورد و نوش اور دیگر اخراجات کے اضافے کے باعث لوگوں میں قوت خرید کا فقدان ہے، اس لئے اتنی گراں کتب کی طرف بہت کم تر ہی لوگ رخ کر پاتے ہیں۔ اس طرح پبلشر ایک طرف کثیر رقم صرف کر کے کتابیں چھپواتے ہیں، دوسری طرف سیل نہ ہونے کے باعث پبلشر کا روپیہ پھنس کر رہ جاتا ہے۔ اردو کتب کم تر ہی پانچ سو سے زائد چھپتی ہیں اس لئے بنیادی اخراجات بہت زیادہ ہو جاتے ہیں۔ کاغذ کی ہوشربا گرانی کے باعث خصوصیت سے اردو پبلشر کی ہمتیں پست ہوتی جا رہی ہیں اور جو ادارے کتابیں شائع کر رہے ہیں وہ یہی سوچتے رہتے ہیں کہ انجام کیا ہوگا۔ کاغذ ہی شاید ایسی چیز ہے جس کے دام روزانہ بڑھ رہے ہیں اور حکومت خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ گویا اسے خبر ہی نہ ہو کہ اسکے عہد حکومت میں کاغذ کی قیمتیں تقریباً سو فی صدی بڑھ چکی ہیں اور کہاں تک بڑھیں گی، سوچنا بھی محال ہے۔

اکثر لوگوں کو شکایت ہے کہ اردو کتب کی قیمتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو ہندی اور انگریزی کی کتب اردو سے زیادہ گراں نظر آئیں گی۔

پرچہ نہ ملنے کی شکایت

حریمی بہنوں اور بھانجیوں کو نوٹ کر لینا چاہیئے کہ ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ تک پرچے کا انتظار فرمایا کریں۔ اگر ۲۰ تک حریم نہ ملے تو فوراً دفتر کو ایک کارڈ لکھ کر اطلاع دیں۔ دوسرا پرچہ بھیج دیا جائے گا۔ بعض بہنیں کافی تاخیر سے اطلاع دیتی ہیں۔ پرچہ ختم ہو جاتا ہے اس لئے پھر نہیں بھیجا جاتا۔ ۲۰ تاریخ سے پہلے اور ۳۰ تاریخ کے بعد لکھے جانے والے شکایتی خطوط پر کوئی توجہ نہ دی جائے گی۔

تبدیلی پتہ کی اطلاع اس طرح روانہ کی جائے کہ دفتر میں ۱۰ تاریخ تک پہنچ جائے۔ بعض بہنیں اس وقت اطلاع کرتی ہیں جب پرچہ ۹ تاریخ کو روانہ ہو جاتا ہے۔

اقوالِ زرّیں

۱۔ دولت سے نرم اور گدگدے بستر خریدے جا سکتے ہیں۔ لیکن پرسکون میٹھی نیند نہیں خریدی جا سکتی۔

۲۔ دولت کی زیادتی اکثر جوانی کی تباہی کا ذریعہ بنا کرتی ہے۔

۳۔ ڈوبنے والے کے ساتھ یہ ہمدردی نہیں کہ خود بھی ڈوب جائے بلکہ بہتر کہ اسے بچالے۔

۴۔ جو قربانیاں نہیں کر سکتا وہ خدمت بھی نہیں کر سکتا۔

۵۔ خاموش رہو یا ایسی بات کہو جو خاموش رہنے سے بہتر ہو۔

۶۔ جو خود نہیں سیکھنا چاہتا اسے کوئی نہیں سکھا سکتا۔

۷۔ ایمان والوں کے لئے موت راحت ہے۔

مرسلہ:۔ عالیہ نشاط (برہانپور)

عملی زندگی کے چند نکات

۱۔ پارسا بنو۔ لیکن ریاکاری سے بچتے رہو۔

۲۔ بہادر بنو۔ لیکن جلد بازی سے کام نہ لو۔

۳۔ حلیم بنو۔ لیکن غلامی کی حد میں نہ داخل ہو۔

۴۔ صابر بنو۔ لیکن خودداری کو نہ کھو بیٹھو۔

۵۔ سخی بنو۔ لیکن فضول خرچی کی حد تک نہ پہنچو۔

۶۔ بڑے بنو۔ لیکن متکبر نہ بنو۔

۷۔ محسن بنو۔ لیکن احسان نہ جتاؤ۔

۸۔ عالم بنو۔ لیکن بے عمل نہ بنو۔

مرسلہ۔ بی۔ عظمت ترنم (آمبور)

تبصرا

فرقہ وارانہ فسادات اور مسلمان

از مولانا جمیل احمد نذیری مبارک پوری۔ ناشر مکتبۃ البدر، کاکوری ضلع لکھنؤ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶، ۵۶۔ قیمت دو روپیہ۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد سے جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے ان کا سدباب کیسے کیا جائے۔ مسلمان نہ تو اپنا مذہب تبدیل کر سکتا ہے۔ نہ اچھوت بن کر رہ سکتا ہے اور یہ بھی ممکن نہیں کہ اس دور میں کروڑہا مسلمان ہجرت پر کمر باندھ کر ہندوستان سے چلے جائیں۔ اس کتاب میں ہر پہلو سے یہ سمجھایا گیا ہے کہ وہ کون سے طریقے ہو سکتے ہیں جن سے فرقہ وارانہ فسادات بند ہو سکیں۔ کتاب اس قابل ہے کہ اسے پڑھا جائے اور جو مشورے مولف نے دئیے ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کر کے عمل کیا جائے۔

کنوارا دامن

ناول از نکہت شاہجہاں پوری۔ ناشر نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ قیمت دو روپیہ

نکہت صاحبہ ایم۔اے۔ بی۔ٹی کا یہ پہلا ناول ہے جسے نسیم بکڈپو نے اپنی روایات کے مطابق شائع کیا ہے اور اس یقین کے ساتھ شائع کیا ہے کہ اسے پسند کرنے کے بعد پڑھنے والے نکہت بہن کے دوسرے ناول کا انتظار کریں گے۔ کنوارا دامن کی کہانی ایک ترقی پسند تعلیم یافتہ نوجوان اور ایک کم تعلیم یافتہ بھولی بھالی لڑکی کی شادی سے شروع ہوتی ہے۔ دلہن شوہر کی توقعات کے برعکس نکلی، اس لئے وہ اس سے مخاطب ہی نہیں ہوا۔ خوددار دلہن نے اس کی تکمیل کے لئے تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور اسے محکمہ تعلیم میں سروس مل گئی۔ جہاں ایک حسین لکچرر نے اس سے دلچسپی لی اور وہ بھی اس سے محبت کرنے لگی۔ لیکن وہ شادی شدہ تھی اور اس نے اس راز کو راز ہی رکھا۔ عشق کی آگ بھڑکتی رہی۔ انجام کیا ہوا، ناول پڑھ کر ملاحظہ فرمائیں۔

حریمی دسترخوان

کچے قیمے کے کباب

سامان:- قیمہ ۵۰۰ گرام روکھا یعنی چکنائی نہ ہو۔ بھنے ہوئے چنے کی دال کا بیسن چائے کے آٹھ چمچے۔ ادرک ایک گرہ معمولی۔ پیاز دو بڑی بڑی آنڈی۔ گلاب کے پھول کی خشک پنکھڑیاں۔ ۲۰ عدد کالی مرچ چائے کے دو چمچے جوز ۱ گرام بڑی الائچی چار چھوٹی الائچی ۱۰۔ ناریل ۱۰ گرام۔ خشخاش دو کھانے والے چمچے جاوتری ۱ گرام دارچینی ۱ گرام لونگ آٹھ دس۔ سونف چائے کا ایک چمچہ۔ شکر چائے کا ایک چمچہ۔ نمک اندازے سے سرخ مرچ حسب خواہش باریک باریک کاٹ کر۔ کچا پپیتہ سو گرام۔ لہسن دو جوے۔ پیاز کا ایک موٹا گول چھلکا۔ گھی حسب ضرورت۔

ترکیب:- پہلے قیمہ کو صاف پانی میں نچوڑ کر دبا دبا کر اس طرح نکالیں کہ پانی نکل جائے پھر کچے پپیتے کو پیس کر قیمہ میں ملا کر رکھ دیں۔

ہری مرچ، لہسن اور پیاز کے چھلکے کے علاوہ تمام چیزوں کو باریک پیس لیں۔ ایک گھنٹہ گذرنے کے بعد تمام مسالوں کو قیمہ میں ملا کر کسی ہری پتیلی میں رکھیں۔ پیاز کے موٹے چھلکے کو قیمہ میں اس طرح گاڑ دیں کہ اس کا گہرا حلقہ اوپر رہے اس میں تھوڑا گھی ڈال کر لہسن کے جوے الدیں اور ایک تیز انگارہ لے کر پیاز میں پڑے ہوئے گھی میں ڈال کر فوراً ہی پتیلی پر کوئی پلیٹ اوندھی کر کے رکھ دیں کہ دھنگار (دھواں) باہر نہ نکلنے پائے۔ تھوڑی دیر بعد قیمہ کو نکال کر ہتھیلی پر پانی لگا کر فرائی پین میں گھی یا ڈالڈا ڈال کر شامی کبابوں کی طرح تل لیں۔ ٹکیاں چھوٹی چھوٹی بنائیں۔ زیادہ بڑی نہ ہوں۔ اگر آپ چاہیں خشک ڈبل روٹی کے ٹکڑے کو باریک کر کے کبابوں کو لت پت کر کے تلیں اور نوش فرمائیں۔

اگر ٹکیوں کی شکل میں بنانے میں دشواری ہو تو مسالہ ملانے اور انگار دینے کے بعد۔ گھی میں قیمہ کو اچھی طرح بھون لیں، لذت میں فرق نہ آئے گا۔

غزالہ بیگم۔ نسیم انہونوی

کے لئے

ترین ماہنامہ کلیاں۔ لکھنؤ

لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ

اس گرانی کے زمانے میں غریب لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بڑا ہی دشوار ہوگیا ہے۔ شادیاں شادیوں ہی کی طرح ہوتی ہیں۔ لچکے پٹھے سے کپڑوں کو چمکانے اور بھڑکانے والی چیزیں بھی اتنی گراں ہوگئی ہیں کہ ان کا خریدنا آسان نہیں رہا۔ ایک دوپٹہ کے لئے معمولی سا لچکا بھی لیا جائے تو بیس پچیس روپیہ سے کم میں نہ آئے گا۔

پتلی سی کرن بھی آنچل میں لگایئے تو بیس روپیہ میں آئے گی۔ شادیوں کے دسیوں جوڑوں کے لئے۔ یہ سب لیا جائے تو سینکڑوں روپیہ صرف ہوجاتا ہے پھر شادی بیاہ پر ہی منحصر نہیں ——

خواتین اور لڑکیاں عام دنوں میں لچکے لگے دوپٹے استعمال کرتی ہیں۔ سوتی بیلیں اور چھپا چکی وغیرہ۔ لگا کر دوپٹے اور ساریاں پہنتی ہیں۔

ان مشکلات کا حل سائنسدانوں نے یوں نکالا ہے کہ اسٹیل کا سامان تیار کردیا اور ایسا کہ چاندی سے زیادہ دلکش اور بھڑکیلا یہ بھی نہیں کہ استعمال سے کالا پڑ جائے یا خراب ہوجائے اور دام نسبتاً بہت ہی کم نائلون کے ستارے سنہرے ستاروں کو مات کرتے ہیں۔ یہ اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ ایک تولہ میں لاتعداد چڑھتے ہیں ان کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اس طرح کا تمام سامان .... آپ کو

"پچھتاوا"

عفت موہانی

پچھلے سال میں نے اسے بہن کی شادی میں دیکھا تھا اور پھر ہفتہ بھر قبل ہی آج کی سالگرہ میں دیکھا۔ کتنا طویل فاصلہ تھا۔ ان چھ برسوں میں صدیوں کا فاصلہ۔ جسے وقت گزران کی دھند نے ملگجا نہیں کیا تھا۔ وہ جوں کا توں تازہ اور واضح تھا۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ فاصلہ ایک ایسی طویل و عریض خلیج ہو۔ جس کا عبور کرنا کسی کے بس کی بات نہ ہو۔ یا کم از کم میں اسے عبور نہ کر سکا۔ اور وہ ایک کنارے پر تھی اور میں اس سے بڑی دور۔ دوسرے کنارے پر۔

ہو سکتا ہے کہ اس نے بحر حیات کی غواصی کی ہو۔ اس کے دامن میں موتی آئے ہوں یا اس نے خالی صدف ہی سے دل کو بہلا لیا ہو۔ لیکن میں اپنے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ میں زندگی کے سمندر کے کنارے اسی طرح کھڑا ہوں جیسے چھ سال پہلے کھڑا تھا۔ مایوس، نامراد۔ بیرا ہال! وہاں شور تھا۔ بڑا دلچسپ اجتماع تھا اور میں کمرہ تاریک کئے پردے کے پیچھے چھپا کھڑا مسلسل اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔ آدمی بعض حرکتیں ایسی کرتا ہے۔ جس کا وہ کوئی معقول جواز نہیں پیش کرتا۔ مجھ سے کوئی پوچھتا کہ اب اس دیوانگی سے کیا حاصل ہے۔ وہ پرائی ہو چکی۔ اس کا شوہر اس کے ساتھ تھا۔ وہ بڑا اچھا آدمی تھا۔ میں نے سنا تھا کہ اس نے اسے جی بھر کے محبت دی تھی۔ کوئی تمنا اس کی پوری ہونے سے رہ نہیں گئی تھی مگر وہ مہینوں اداس رہی تھی۔ سسرال میں اس کا دل نہیں لگتا تھا وہ کسی نہ کسی بہانے سے اپنے میکے چلی آتی تھی۔ اس کی سسرال میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ اور پھر اس کا شوہر اسے سمجھا بجھا کے لے گیا تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر ناکامی محبت کے اثرات ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ وہ اپنے خیالات کا عکس ہمیشہ دوسرے کے چہرے پر دیکھتا ہے۔ چنانچہ مجھے بھی وہ تبسم کے پیچھے آنسو بہاتی ہوئی گفتگو کے پردے میں کراہتی ہوئی اور ہجوم میں تنہا بھٹکتی ہوئی نظر آئی! —

اور وہ مسرور و تاباں چہرہ ایک آئینہ بن گیا۔ جس پر گزرے ہوئے دنوں کی کہانی لکھی ہوئی تھی۔ شام کو میں یونیورسٹی سے واپس آیا تو نجمہ کے پاس ایک نئی لڑکی کو دیکھا۔ میں نجمہ کی ساری سہیلیوں سے واقف تھا وہ نجمہ ہی کی طرح ہنسوڑ، کھلنڈری اور لاابالی تھیں۔ جس طرح نجمہ اور مجھ میں چھیڑ چھاڑ بناوٹی لڑائی ہوتی اسی طرح اس کی سہیلیوں سے بھی چلتی۔ نہ وہ سنجیدہ ہوتیں اور نہ میں نے انھیں لکھنے پڑھنے میں مصروف دیکھا تھا۔ اور وہ مجھ سے اسی طرح سلوک کرتیں جیسے نجمہ کرتی تھی!

اسے دیکھ کر میں واپس اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور لباس تبدیل کئے بغیر بستر پر لیٹ کے سوچنے لگا۔ وہ کون ہو سکتی ہے۔ بے حد سنجیدہ، بڑی نستعلیق اور بے حد ضابطہ قسم کی معلوم ہو رہی تھی! اس کے چہرے سے علم کی طمانیت ہویدا تھی۔

میں نے جلد ہی اس کا دھیان ہٹا دیا اور اپنے لکھنے کے انبار میں سے چھانٹ چھانٹ کے وہ افسانے اور کہانیاں علیحدہ کرنے لگا جو اگلے مہینوں میں طاہر صاحب کے پرچے میں چھپنے والے تھے۔ طاہر صاحب ماہنامہ اُفق کے مالک تھے اور میں ایڈیٹر۔ ویسے طاہر صاحب نے رسالے کی تمام تر ذمہ داری مجھی کو سونپ رکھی تھی۔ پرچہ ملک کا مانا ہوا موقر ماہنامہ تھا۔ اس میں پہلی بار چھپ جانا شہرت اور عزت کی ضمانت ہوا کرتا تھا۔ ہم نے بڑے نامور اور ماہر قلمکار ادبی دنیا کو دیئے تھے۔ طاہر صاحب اس کا سارا کریڈٹ مجھی کو دیتے تھے۔ ان کے نزدیک میں بڑے سلیقے سے حسن پرستی اور ادب نوازی کر سکتا تھا! مجھے ان کے اس ریمارک پر ہمیشہ ہنسی آتی تھی۔ لیکن اس وقت جب میں کچھ ذہنی خلفشار اور پراگندگی میں مبتلا مختلف تحریریں منتخب کر رہا تھا۔ مجھے ان کا ریمارک درست معلوم ہو رہا تھا! میں سمجھ نہ سکا کہ میں نے کون سے افسانے اور نجانے کیا کچھ منتخب کر لیا تھا۔ اور نہ اس وقت مجھے یہ دھیان آ سکا تھا کہ کوئی تحریر ایسی نہ ہو جس سے ہمارے معیاری پرچے کو دھکا پہنچے!

تبھی دروازہ کھلا تھا اور نجمہ اندر آ گئی۔

[illegible] ستور تھا۔ خدا نے غربت اور بیماری کو لازم و ملزوم بنا کے دنیا میں پیدا کیا ہے۔ مستزاد میری چار چار بہنیں تھیں جو سیلابی ندیوں کی طرح بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ ان کے مستقبل کی فکر نے خون سکھا ڈالا تھا۔ میری ہی کمائی سے ان کے گھر خرید نا تھے۔!

بہر حال حالات یہ تھے جبکہ دمشق میں قحط نے عشق کو ہوا کر دیا تھا۔ لیکن میری قحط سالی نے میرے عشق پنہاں کو ہوا دے دی تھی۔ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اب تو رخشندہ کا تصور میرے خون میں گھل مل چکا تھا۔

ہماری خط و کتابت بالائی بلندی اختیار کر چکی تھی۔! اس کے افسانے آتے رہے۔ میں انھیں متاع گراں بہا کی طرح دنیا کے سامنے پیش کرتا رہا۔ دو سال ہی بھر کے عرصہ میں ایک مشہور اور مانی ہوئی مصنفہ بن گئی!۔ وہ میری شکر گزار تھی۔ اپنی تحریر میں اتنی صاف صاف میری تعریفیں کرتی تھی کہ میری پیشانی پسیج جاتی!۔ اور میں نے کبھی کوئی لاگ لپیٹ نہیں رکھی!۔ اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اس کی محبت کے اس اسٹیج میں ہوں جہاں سے دنیا کو تیاگ دینے کی خواہش ہونے لگتی ہے!۔

وہ مجھ سے کبھی نہیں ملی۔ بڑے اعلیٰ گھرانے کی فرد تھی۔ اس کے والد بڑے عہدے پر تھے۔ اس کے بھائی بھی سرکاری عہدیدار تھے۔ وہ لوگ بڑے متمول اور دولت مند تھے۔ لیکن وہ چونکہ انسانی احساسات کی ترجمان ان کی ماخذداری تھی اس نے کبھی امارت غربت کے فرق کو نہ جانا۔ وہ مجھے لکھتی تھی کہ مجھے ہمت کر کے اس کے ڈیڈی سے ملنا پڑے گا۔ اور انھیں سمجھانا پڑے گا کہ محبت کے سامنے دنیا بھر کے اعتبارات محض حقیر و ہیچ ہیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اس کے ڈیڈی جو زمانہ شناس تجربہ کار انسان ہیں وہ کبھی میری اور اس کی تاویلوں پر مطمئن نہ ہوں گے۔ وہ ہرگز ایک عام آدمی کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ نہیں دیں گے۔ اور میری یہ کہانی بھی عام کہانی کی طرح ایک کلائمکس پر پہونچے بغیر ختم ہو جائیگی!۔ مجھ میرے الٰہی واقف تھی لیکن وہ میری کوئی مدد نہ کر سکی۔ کیونکہ اس کی اور صفیہ کی شادیاں طے ہو گئی تھیں۔ ان کی یکشت شادیوں نے ہمیں جھنجوڑ ڈالا۔ اور میں بار بار تنکا تنکا جوڑ کے آشیانہ بنانے کی فکر میں لگ گیا۔ مجھ نے اپنی شادی پر اسے بلایا تھا۔ وہ آئی بھی تھی۔ میں [illegible] سکا۔ طاقت پرواز نہ تھی اور وہ مجھ تک اس لئے [illegible] ڈر لگتا تھا۔! دوسری دفعہ اس کی عید [illegible] کر دیا۔ میں نے اسے لکھا کہ ۔۔۔۔ "اگر جذب دل سچا ہے تو پھر تم میری طرح بے چین کیوں نہیں ہو۔ رخشندہ میں ہر پل تمہارے قریب ہونا چاہتا ہوں۔ اب یہ آگ جو دامن میں لگی ہے وہ دل تک پہونچنے والی ہے۔ میں تمہارے لئے چاند ستارے نہیں لا سکتا۔ سمندر کھنگال کے سچے موتی کے انبار تمہارے قدموں میں نہیں لگا سکتا۔ لیکن ایک محبت کرنے والے انسان کی کل متاع حیات اپنا دل میں تمہارے قدموں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پر نثار کر دوں گا۔! دنیا میں پیار بھرے دل کے سوا کون سی چیز قیمتی ہے۔ رخشندہ۔ چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں۔ ؟۔

اس کا جواب درد انگیز تھا: "آپ کا دل اب آپ کا نہیں رہا۔ وہ میرا ہو گیا ہے۔ اس کی ناز برداری میرا فرض ہے۔ مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔ ہماری محبت ہمیشہ پردہ دار رہی ہے۔ میں اس کے چہرے سے پردہ اٹھانے کی ہمت نہیں رکھتی۔ اور آپ مناسب نہیں سمجھتے کہ اسے عریاں کیجئے۔ دنیا کے ہر باپ کی طرح میرے ڈیڈی بھی میرے مستقبل کی فکر کر رہے ہیں۔ اگر آپ نے مجھے بچا نہ لیا تو پھر ایک روایتی لڑکی کی طرح میں ناکام محبت آپ سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دی جاؤں گی!۔۔۔ جلدی کیجئے جو کچھ کرنا ہے "

میرے بس میں کیا تھا۔ میں ایک دوزخی آگ میں جلنے لگا۔ کیا کرتا ؟۔ کیا اپنے اجڑے ہوئے حلیہ میں جا کے اس کے باپ کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ وہ مجھ سے میری تعریف نہ پوچھتے۔ میں کیا انھیں یہ بتا سکتا کہ میں صرف چھ سو روپئے ماہوار اٹھاتا ہوں اور اپنی چھ سو میں مرتا جیتا ہوں۔ ادیب ہمیشہ مفلس کے حوالے اپنی بیٹی کو کبھی نہ کرتے [illegible] مزید دکھ ملتے۔ مزید آنسو ملتے۔ مزید حرماں نصیبیاں مجھے رونے کو آجاتیں۔

میں اپنے گھر پر نظریں دوڑاتا۔ کیا تھا یہاں۔ بوسیدہ سا گھر، نیچی سی چھت۔ تاریک کمرے۔ چھوٹا سا [illegible] بہن بھائی، بیمار بوڑھی ماں۔ کندھوں پہ سے جھکا ہوا پریشان حال باپ جو اس خیال دیتا کہ کیسے کم سے کم ہی کا سوٹ پہن کے اور سینہ تان کے اپنے ہونے والے سمدھی سے گفتگو کر سکے۔ جو یہ کہہ سکے کہ چونکہ اس کا بیٹا شہر کا مشہور ڈاکٹر یا بیرسٹر یا انجینئر ہے۔ وہ پانچ دس ہزار ماہوار کماتا ہے لہذا اس کی بولی اونچی لگے گی۔ وہ چالیس ہزار میں بیٹے کو تمہارے ہاتھ بیچے گا۔ اور مزید ایک لاکھ سمیت تمہاری بیٹی کو قبول کرے گا۔ نہیں۔ یہ [illegible]

نہیں تھا! میرے باپ نے تو شاید میری شادی یا اپنی بہو کے ادھورے خواب بھی نہیں دیکھے تھے!۔

میرے گھر میں امرا کا سا سامان تعیش نہ تھا۔ نہ ریفریجریٹر، نہ سیلنگ فین، نہ اسٹیل کی میز اور الماریاں نہ شاندار مسہریاں۔ نہ ٹیپ ریکارڈر نہ ریڈیو۔ نہ بڑا سا بنگلہ نہ شاندار کیس۔ یہاں کچھ بھی نہ تھا۔ کچھ بھی نہ تھا صرف محبت بھرا دل تھا۔ وہ کس کام کا تھا۔؟

دفعتاً رخشندہ کا خط مجھے ملا۔ جس میں اس نے بہت کچھ جذباتی دلی کا اظہار کر کے لکھا تھا کہ وہ پہلی دفعہ مجھ سے ملنے آرہی ہے۔ اپنے بچاؤ اور اپنی محبت کی زندگی کی خاطر مجھ سے مشورہ لینا چاہتی تھی۔

کیا مشورہ دوں گا میں اسے۔ وہ رات مجھ پر ایک بیمار کی رات کی طرح گزری۔ میں ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا کہ اسے کیا جواب دے سکوں گا۔ میرے خیالات اتنے اُلجھ گئے تھے کہ میں انھیں سلجھا نہ سکا۔ بیمار سا ہوگیا۔ ایک طرف رخشندہ تھی۔ محبت تھی۔ میں تھا۔ دوسری طرف فرض تھا۔ میرے غریب عزیز تھے اور رسوائی تھی۔!

میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ کچھ بھی نہیں۔ بس اپنا دفتر بند کیے سگریٹ پھونکتا رہا اور غیر شعوری طور پر اس کا انتظار کرتا رہا۔ نجانے کون سا وقت تھا کہ میرے دفتر پر ایک شاندار کار آکے رکی۔ میں سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گیا۔ دل کی دھڑکن مجھے بے چین کرنے لگی۔ میرے ہاتھ سے سگریٹ چھوٹ گیا۔! وہ دروازے پر دستک دے رہی تھی۔! میری آواز مرچکی تھی۔! میں کچھ کہہ بھی نہ سکا۔

دوسرے لمحے اس نے چپکے سے دروازے کو دھکا دیا۔ وہ کھل گئے اور ہوا کے معطر جھونکے کی طرح وہ اندر آئی۔ میں کسی پتھر کے بت کی طرح اپنی جگہ کھڑا رہا۔

"میں شکیب یزدانی صاحب سے ملنا چاہتی ہوں" اس نے کہا۔

"شکیب یزدانی صاحب۔؟" میں نے گلا صاف کر کے کہا۔

"جی ہاں۔ وہ جو ماہنامہ "اُفق" کے مدیر ہیں۔" اس نے پھر کہا۔ "کیا آپ انھیں جانتے ہیں۔" "جی ہاں جانتا ہوں" میں نے جواب دیا۔ "وہ میرے دوست ہیں... لیکن ——"

"وہ کہاں ہیں۔ براہ کرم بتا دیجئے۔ مجھے ان سے بڑا ضروری کام ہے۔"

"آپ کون ہیں۔ محترمہ آپ کا نام؟"

"بس آپ شکیب صاحب کو یہ بتا دیجئے کہ ان کی پرانی فین آئی ہے۔ وہ پہچان جائیں گے۔ وہ کہاں ہیں"

"محترمہ۔ وہ تو۔ وہ تو کل ہی شام کی گاڑی سے دہلی چلے گئے ہیں"

خدا جانے یہ بہانہ کیسے میرے ہونٹوں سے نکل گیا۔ میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ میں اس کے سامنے کھڑا ہو کر اتنا مکمل جھوٹ بول سکوں گا۔ وہ مجھے تک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی کی زردی سی آگئی۔ چہرہ سفید ہوگیا۔

"دہلی چلے گئے۔؟ کب آئیں گے؟" وہ کانپتے لہجے میں بولی۔

"جی ہاں اچانک بڑے ضروری کام سے انھیں جانا پڑا۔ کوئی ادبی کانفرنس ہے ان کی شرکت ضروری ہے۔ شاید دو ہفتوں بعد آئیں گے۔"

"آپ کو ان سے کیا کام تھا"

"دو ہفتوں بعد ۔ او۔ خدا۔ اب کیا ہوگا؟" اس نے گرنے سے بچنے کے لئے کرسی کی پشت تھام لی۔ "اوہ۔ میں کتنی آس لگا کے آئی تھی" وہ خود سے کہہ رہی تھی "مجھے معلوم ہوتا تو میں انھیں کہیں جانے سے روک دیتی۔ وہ۔ کیا معلوم تھا انھیں۔ مجھے بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔!"

میں کھڑا اسے تکتا رہا۔ پھر وہ مجھ سے ملے بغیر چلی گئی۔ شکیب یزدانی کے دوست سے کیا ملتی؟۔ اور تب میں بے جان سا کرسی پر گر پڑا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ یہ مکمل پلاٹ اچانک میرے ذہن میں آجائے گا۔ میں اسے مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اگر وہ مجھ سے ملتی۔ تو میں اس سے کیا کہتا؟۔ میری دلجوئی تسلی اس کے کس کام آتی؟۔ اب تو یہ ہوا ہے کہ —— دل ٹوٹنے سے تھوڑی سی تکلیف تو ہوئی لیکن تمام عمر کو آرام ہوگیا۔

میں نے خود کو جھٹلا دیا۔! اس کی شادی ہوگئی۔ وہ بڑے بڑے گھر گئی۔ لیکن پھر اس کا کوئی خط نہیں آیا۔ وہ محبت سے لبریز جذبات سے بھرپور۔ شاید وہ بھی اپنی تقدیر پہ قانع ہوچکی تھی۔

اور آج چھ سال بعد میں نے مجھ کے بچے کی سالگرہ پر اسے دیکھا جب نجانے اس کے دل میں کتنے طوفان چل رہے تھے۔ اور —— کئی کہانیاں میرے صبر و ضبط کے بند توڑ کے ابل آئی تھیں۔ میں پچھتا رہا ہوں۔ میری روح ایک عجیب سے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ ایک شدید غم میرے دل کا لہو نچوڑ رہا ہے۔ کاش۔ میں اس وقت اس سے جھوٹ نہ بولتا۔ کاش بہ مشکل ملکے اپنی یکجائی کا کوئی حل نکال لیتے۔ کاش —— اے کاش ——! میں اس سے اپنی اصلی شخصیت میں مل تو لیتا ——! کتنے بھرم سے

آئی ہوگی۔ کیا کچھ سوچ کے آئی ہوگی۔ ناکام چلی گئی — آہ — میرے آنسو
میری تقدیر بدلنے کی طاقت نہیں رکھتے!!!

رُباعیات

فیروز نظامی

رغبت نہ رفاقت ہے نہ سرشاری ہے
ایثار نہ مستی نہ وفاداری ہے
اک سانس میں دو سجدے ادا کرتے ہیں
کہئے یہ خلوص ہے کہ بیزاری ہے

دل خلد کی سیر کر رہا ہے جیسے
دامانِ مراد بھر رہا ہے جیسے
میلاد کی شب کثرتِ انوار تو دیکھو
قرآنِ مجید اتر رہا ہے جیسے

اللہ کی پہچان نظر آتا ہے
ایمان ہی ایمان نظر آتا ہے
فاراں تری چوٹی پہ دو عالم کا حبیبؐ
منھ بولتا قرآن نظر آتا ہے

چاکِ غمِ احتیاج سلتا ہے ضرور
تقدیر کا کہسار بھی ہلتا ہے ضرور
اے دل رہِ جستجو میں ہمت کو نہ ہار
کوشش کا صلہ خدا سے ملتا ہے ضرور

مقدر کے کھیل

از قلم۔ مسرت بانو زوجہ ابراہیم شیخ

آدرش نگر اس دھرتی کی ایسی بستی تھی جو گندے غلیظ ڈھیر پر بسی ہوئی تھی۔ جہاں معصوم اُمنگوں کے ساتھ بھرپور جوانی بکتی تھی۔ دنیا کے قول غموں کے افسانے اور خوشیوں کی کہانی بکتی تھی۔ جہاں دولت کی خاطر ہر چیز بکتی تھی۔ مطلب کی خاطر انسان بدل جاتے تھے اور چمکیلے سنہری سکوں کی خاطر ایمان بدلے جاتے تھے۔ حدِ نظر تک جھونپڑیوں کی قطار دکھائی دیتی تھی جہاں لڑکیوں کا بازار گرم تھا۔ غرضکہ اسی بستی کے ہر کوچے ہر گلی سے ایک نئی کہانی وابستہ تھی۔

اسی بستی کے ایک بوسیدہ سے مکان میں جمن اور بی خالہ کے بیچ کھسر پھسر چل رہی تھی۔ بڑے راز و نیاز کے ساتھ ساجدہ کی تقدیر کا فیصلہ کیا جا رہا تھا۔ ساجدہ بی خالہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے والد کو ملازمت سے برطرف ہوئے عرصہ بیت چکا تھا۔ بھولے بھٹکے کوئی کام مل جاتا تو اس کی آمدنی اور بی خالہ کی سلائی کی مزدوری پر گھر کا خرچ چلتا تھا۔ ساجدہ تعلیم یافتہ تھی۔ اس نے میونسپل اسکول سے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد چولہا چکی سنبھال لی تھی۔ دیکھنے میں خوبصورت اور سلیقہ مند تھی۔ سن بلوغ کو پہونچنے کے بعد عام لڑکیوں کی طرح اس نے بھی مستقبل کے سنہرے سپنے دیکھے تھے۔

اور اس کے سپنوں کا شہزادہ انور تھا۔

انور اس کا پڑوسی تھا اور موٹر میکانیک کا کام کرتا تھا۔ لیکن بی خالہ اس رشتے کے سخت خلاف تھی۔ اس کی اڑان اونچی تھی۔ وہ ایمپورٹیڈ داماد کی خواہش مند تھی۔ اور اس بستی میں آئے دن ہزاروں مفلس و مجبور لڑکیوں کو چاندی کے چند سکوں کی خاطر عرب اور دبئی۔ بحرین اور کویت کے عیاش دولت کے بل بوتے پر شراب و شباب سے کھیلنے والے بڈھے مردوں کے دامن سے باندھ دیا جاتا تھا۔ کہنے کو تو یہ شریعت کے مطابق نکاح ہو جاتا تھا۔ لیکن ایک بار عربی داماد لوٹ کر چلا جاتا تو پھر دوسری بار مڑ کر بھی نہ دیکھتا۔ غرضکہ ایسی ہزاروں ساجن بنا سہاگن بنی لڑکیاں وقت سے پہلے بیوگی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دی گئی تھیں۔ جن کے پاس سوائے تنہائی اور تاریک مستقبل کے کچھ نہ ہوتا تھا۔

ساجدہ کو ایسے رشتوں سے سخت نفرت تھی۔ اسے ایک چھوٹے سے گھر کی آرزو تھی۔ جس کی چار دیواری میں اپنے شوہر کی چاہت کی تمنا کی تھی۔ اور اس کے آنگن کو ننھی ننھی کلکاریوں سے مہکانے کے سپنے دیکھے تھے۔ لیکن بھلا بی خالہ اس کی کب چلنے دینے والی تھی۔ وہ تو دن رات اپنے پروردگار سے یہی دعا مانگتی کہ اُسے بھی ایک عربی داماد مل جائے جو اس کی خوبصورت اور جوان بیٹی کی دس ہزار قیمت لگا سکے۔ اس کے گرتے ہوئے بوسیدہ مکان کو پختہ مکان بنا سکے۔ ساجدہ زیورات سے لد جائے اور وہ بھی سینہ ٹھونک کر چار ہمسایوں کے بیچ جی سکے۔ بھلے چار دن کی چاندنی کے بعد پھر اندھیری رات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے اس لیے اس نے اس بستی کے ایسے کئی دلالوں سے رابطہ قائم کر رکھا تھا جو ہزار روپے دلالی کے عوض سے ایک عدد داماد فراہم کر سکتے تھے اور آج وہ دن آ گیا تھا۔ جمن اس کی دلی مراد بر لایا تھا اسی لیے دونوں بڑی راز داری سے محو گفتگو تھے۔ اسی وقت انہیں کچھ آہٹ سنائی دی۔

بی خالہ نے کھنکھار کر جمن کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور خود آہٹ کی طرف متوجہ ہوئی آہٹ ساجدہ کے قدموں کی تھی۔ جو دروازے پر چائے کا کپ لئے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے اداسی صاف عیاں تھی اور وہ خوف زدہ نگاہوں سے جمن کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ماں نے بیٹی کو اس طرح گھورتے دیکھ کر جھٹ سے اُٹھ کر اس کے ہاتھ سے کپ لیا اور جمن کو تھما دیا۔ اور خود محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

خدا میری چاندی بیٹی کا مقدر جگا دے۔ بس اس کے بعد میں آرام سے قبر کی نیند سو سکوں گی۔ دیکھ کیا حالت بنا رکھی ہے...... جا جلدی سے منہ ہاتھ دھولے۔ اور ریشمی گلابی غرارہ قمیض پہن لے۔ اور ذرا کنگھی چوٹی بھی کر لے...... خدا نے چاہا تو بہت جلد میری بیٹی کا مقدر سنور جائیگا

پھر دیکھنا وہ ہمیشہ سنگار میز سے دیکھ کر ا کرے گی۔

ساجدہ کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہ ابھرا۔ وہ چپ چاپ خالی کپ لے کر اندر کے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جمن بھی بی خالہ کو چند ضروری ہدایات دے کر رخصت ہو گیا۔

شام کو جب بی خالہ کے بار بار کہنے پر بھی ساجدہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے اس کے لمبے گھنے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر بڑی بے دردی سے کھینچتے ہوئے کہا۔

کس کے نام کا سوگ منا رہی ہے۔ ماں باپ ابھی دونوں زندہ ہیں۔ مہمانوں کے آنے کا وقت ہو رہا ہے اور صاحبزادی نخرے کئے جا رہی ہے۔ چل اٹھ کر جلدی سے کپڑے بدل لے ورنہ کھال کھینچ کر رکھ دوں گی۔

ماں! ساجدہ نہایت دردناک آواز میں بولی۔ مجھے زندہ در گور مت کرو ماں۔ میں تمہاری ایک ہی بیٹی ہوں۔ مجھے اس طرح بے دردی سے کسی عرب کے دامن سے مت باندھو....... نہیں چاہئے مجھے عیش و عشرت کی زندگی۔ میں ان ٹاٹ کے پیوندوں میں ہی خوش ہوں.........

نہیں چاہئے مجھے روپے پیسوں کا ڈھیر۔

بہت خوب!... روپیوں پیسوں کے ڈھیر پر تو تُلی ہے۔ منحوس جنم جلی ایسی پیدا ہوئی کہ ایک دن خوشی کا دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ یہاں کون شہزادہ تیرے لئے منتظر کھڑا ہے؟ وہ ملور؟ جس کا خود کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اے لڑکی ابھی اوقات پہچان...... اگر کوئی بھولا بھٹکا آ بھی جائے تو ہے تیرے باپ کے پاس اسے جہیز دینے کی طاقت... گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں زہر کھانے کے لئے اور صاحبزادی کے مزاج دیکھو آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔

.....چل اٹھ کمبخت.... جنم جلی۔

بی خالہ نے دو چار مکے کس کر ساجدہ کی پیٹھ پر جما دیئے اور غصے سے ہانپتی کانپتی بیرونی دروازے سے باہر چلی گئی۔ ساجدہ کچھ دیر گم سم خالی خلا میں گھورتی رہی۔ پھر ایک عزم کے ساتھ اس نے اپنے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا۔ صندوق کھول کر گلابی سوٹ نکال کر زیب تن کیا۔ بال سنوارے اور ماں کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے تھوڑا سج دھج کر نئی نویلی دلہن کی طرح اپنی قسمت کے خریدار کے انتظار میں بیٹھ گئی۔

ٹھیک سات بجے جمن ایک پچاس سالہ مرد کے ساتھ دروازے میں داخل ہوا۔ ساجدہ دوسرے کمرے میں بیٹھی دو کمروں کے درمیان حائل پردے کی چادر کے سوراخوں سے اس اجنبی کو دیکھ کر سر سے پیر تک کانپ گئی۔

اس کا ہونے والا دولہا عمر میں اس کے والد کی برابری کر رہا تھا۔ سانولی رنگت۔ موٹے موٹے ہونٹ۔ بدصورت خدوخال اور ڈاڑھی کے بالوں میں جگہ جگہ سفیدی جھلک رہی تھی۔ ساجدہ کا دل بھر آیا۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں اور خود بخود چھلک اٹھیں۔

ادھر ساجدہ کے والد ہونے والے داماد کی خاطر تواضع میں لگے ہوئے تھے۔ اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ لیکن اجنبی کی پیاسی نگاہیں دلہن کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہو رہی تھیں۔ اسی لئے اس کی نگاہیں بار بار کھڑکی اور اندر دروازے کا طواف کرتی جا رہی تھیں۔ آخرکار بڑے میاں سے صبر نہ ہو سکا۔

انھوں نے بھاری آواز میں جمن سے کہا۔

جمن میاں! فضول وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔ مطلب کی بات کراؤ۔ اس دوزخ میں ہمارا دم گھٹا جا رہا ہے۔

شیخ صاحب! یہ بیقراری بھی کیسی؟ تصویر تو آپ دیکھ چکے ہیں تھوڑی دیر میں جلوۂ حسن بھی ہو جائے گا....... اجی۔ جو مزہ انتظار میں ہے وہ وصال میں کہاں۔

جمن میاں! اگر لڑکی واقعی حسین ہوگی تو ہم سعید میاں کی بیٹی کے دام دس ہزار سے بڑھا کر بیس ہزار بھی کر سکتے ہیں۔ سوال پیسوں کا نہیں۔ بلکہ ہماری پسند کا ہے۔

بندے کے پاس سوائے خدا کی اس دین کے اور رکھا ہی کیا ہے۔ جو آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے جو آپ کے قدم مبارک ہمارے در سے لگے اور ہمیں آپ کی خدمت کا موقع ملا۔ ورنہ ہم لوگوں کی ایسی قسمت کہاں۔ خاکسار ابھی آپ کا حکم بجا لاتا ہے۔

سعید میاں نہایت عاجزی اور انکساری سے چند جملے ادا کرکے ساجدہ کو لینے اندر چلے گئے۔ جس وقت ساجدہ کو اس کے روبرو پیش کیا گیا تو بڑے میاں چند لمحوں تک اسے بنا پلک جھپکائے دیکھتے رہے۔ اور جب ہوش آیا تو ان کی زبان سے خود بخود مرحبا اور آفریں کے کلمے نکلنے لگے۔ جھٹ سے انھوں نے اپنے کرتے کی جیب سے نوٹوں کا بنڈل نکالا اور سو سو کے دس نوٹ گن کر ساجدہ کی طرف بڑھا دیئے۔

لو.... یہ تمہارا انعام ہے۔ ہم تمہارے جلوۂ حسن سے بہت خوش ہوئے ہیں۔

لیکن ساجدہ کسی بت کی طرح ساکت کھڑی رہی۔ اس کے ہاتھ

ویرانے میں بہار

رفیعہ بٹ

"جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔
جیسے سوکھے ڈالوں پر ہریالی لہرانے لگے۔
جیسے اندھیری رات چاندنی کا پیرہن پہن لے۔
جیسے خاموشیوں کے ساکت دل دھڑک اٹھیں اور دم بخود ماحول میں نغموں کا رسیلا ترنم لہرانے لگے۔

عاشی کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ خوشیوں کے سوتے اس کی ذات کے اندر جیسے پھوٹ رہے تھے۔ گال تمتما رہے تھے۔ اور آنکھوں میں رنگین خوابوں کا عکس لہرانے لگا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ ہوا کے دوش پر لہرائے بکھرے، جھومے، ناچے اور مستی کے عالم میں بہک بہک جائے۔

تھوڑی دیر پہلے وہ نمو بھابی کے گول مٹول بچے کو اٹھانے۔ ان کے کمرے میں گئی تھی۔ بھابی جی کوئی خط پڑھ رہی تھیں۔

"کس کا خط ہے۔ بھابی؟" اس نے بچے کو ہوا میں اچھالتے ہوئے پوچھا تھا۔

"عامی کا ہے"

"جی ــ" عاشی کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔

"عامی کی پوسٹنگ یہاں ہو گئی ہے۔ عاشی۔ ڈوپٹے کو آرہا ہے" انہوں نے خط کو تہہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر بولیں۔ "امی کہاں ہیں۔؟"

"تائی امی پچھلے برآمدے میں بیٹھی ہیں" فرطِ مسرت سے عاشی نے بچے کو اتنی زور سے بھینچا کہ وہ چیخ اٹھا۔

"آجاؤ مُنی آجاؤ" نمو بھابی نے بچے کو لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے بچہ اچھل کر ماں کی گود میں آگیا۔

"یہ خط امی جان کو دے آؤ عاشی۔ شکر ہے عامی کی پوسٹنگ یہاں ہو گئی" نمو بھابی نے عاشی کے گلگوں رخساروں پر نگاہ ڈالی۔ اسکی حیا بار نظروں کو دیکھا۔ عاشی خط لے کر باہر نکل گئی۔

بیٹے کی پوسٹنگ کی خبر ماں کے لئے خوش کن تھی۔ خط پڑھ کر ان کی آنکھوں کے گوشے گیلے ہو گئے۔ خوشی کے آنسو تھے۔ میٹرک کے بعد وہ گھر سے نکلا تھا۔

پہلے کالج میں داخلہ لے کر ہوسٹل میں رہا پھر کمیشن لے لی اور چار پانچ سال پورے پاکستان میں گھومتا رہا۔ کبھی مظفر آباد تو کبھی کوئٹہ۔ کبھی پشاور تو کبھی حیدر آباد میں۔ کبھی کبھار یہاں بھی رہا۔ اور کچھ وقت پنڈی میں بھی گذرا۔ اس سارے عرصے میں وہ بہت کم گھر آیا۔ لمبی چھٹی تو کبھی گھر پہ گذاری ہی نہیں تھی۔ آٹھ دس دن کے لئے آتا۔ اور پھر مہینوں کے لئے چلا جاتا۔ امی اس کی جدائی بُری طرح محسوس کرتی تھیں۔ گو بڑا بیٹا اور بہو گھر میں تھے۔ لیکن عامی کی بات ہی اور تھی۔ اور جب سے نجمہ کی شادی بھی کر دی تھی۔ تائی اماں کے من کے اندر جیسے تنہائیاں رہ گئی تھیں۔ بہو بیٹے کی مصروفیات ہی ایسی تھیں کہ ان کا وجود نہ ہونے کے برابر ہی محسوس ہوتا تھا۔ ہاں عاشی کے آجانے سے انہیں جیسے نجمہ کا بدل مل گیا تھا۔

عاشی کے اماں ابو ان دنوں سعودی عرب میں تھے۔ ابو آرمی کے ڈاکٹر تھے۔ دو سال کے ڈیپوٹیشن پر گورنمنٹ نے بھیجا تھا۔ عاشی بی اے فائنل میں تھی۔ تعلیم کا سلسلہ وہاں جاری نہ رکھا جا سکتا تھا۔ اس لئے اسے تائی امی کے پاس چھوڑ دیا گیا تھا۔

عاشی پہلے پہل تو بہت گھبرائی تھی۔ اتنی بڑی کوٹھی میں چند نفوس وہ بھی جیسے ایک دوسرے سے بے خبر ناشتے کی میز پر ملاقات ہوتی۔ یا پھر رات کے کھانے پر۔ ہر کوئی اپنی ذات کے حصار میں مقید۔ اپنے حالات میں گرفتار تھا۔ عاشی کوئی چلبلی یا باتونی سی لڑکی ہوتی تو شاید اس آراستہ قفس میں اس کا دم گھٹ جاتا لیکن وہ کم سخن اور شرمیلی سی لڑکی تھی۔ جلد ہی اس ماحول میں رچ بس گئی۔ وقت گذاری کے لئے وہ اپنے تئیں تائی اماں کی خدمت کی نذر کر دیتی۔ منا اس سے اس قدر ہل گیا تھا کہ وہ کالج سے آتی تو ماں کی گود سے مچل مچل کر اس کی طرف باہیں پھیلا کر تکنے لگتا۔ یہی حال تائی اماں کا تھا۔ کالج سے آتی۔ تو خود اس کے لئے کھانا لگواتیں۔ پاس بیٹھ کر کھلاتیں۔ اور اس سے کالج کی چھوٹی چھوٹی مصروفیات کو پوچھتی رہتیں۔

زندگی اپنے طور سے رواں دواں تھی۔ تائی امی منا اور کورس کی کتابیں عاشی کی دلچسپیوں کے یہی محور تھے۔

لیکن ۔۔۔!

اچانک یہی محور بدل گئے۔ دل جیسیوں کا نیا محور جو نیا تو نہیں تھا۔ عرصے سے من کے کسی گوشے میں چھپا تھا۔ سامنے آ گیا۔ ان دنوں عامی کھاریاں میں تھا اور تین دن کی چھٹی پر آیا تھا۔

اونچے لمبے قد چوڑے چکلے بدن اور ہنستی مسکراتی آنکھوں والا عامر اس عامر سے کتنا مختلف تھا۔ جس کے ساتھ وہ بچپن میں کھیلا کرتی تھی۔ بات بات پر لڑائی اور دانت کاٹ لیا کرتی تھی۔ وہ بھی تو موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا کرتا تھا۔ کبھی اس کے بال نوچ لیتا۔ کبھی دھکا دیا کرتا۔ اور کھلونے تو کبھی چھوڑتا ہی نہیں تھا پیاری پیاری گڑیاں آناً فاناً توڑ دیا کرتا۔ پیارے پیارے ٹی سیٹ اس کی آنکھ بچا کر چکنا چور کر دیا کرتا۔ دونوں میں اتنی لڑائی ہوتی تھی کہ اکثر والدین پریشان ہو جایا کرتے تھے۔ پل بھر کو بھی تو دونوں چین سے نہ بیٹھ سکتے تھے۔ صلح بھی ہوتی تو سب کو یہی خدشہ رہتا کہ ابھی لڑے کہ لڑے۔

اور پھر عاشی کے ابو کا تبادلہ ہو گیا تھا کئی سال وہ دوسرے شہروں میں رہے۔ عاشی کے ذہن میں عامر کی کوئی خوشگوار یاد محفوظ نہ رہ سکی۔ کوئی اچھا تاثر یادوں کے سایے پر نہ لہرایا۔ کبھی کبھار اگر ملنا بھی ہوتا تو اجنبیوں کی طرح کچھ بچپن کے یہ لاشعوری تاثرات اور کچھ عاشی کی کم سخنی اور شرمیلی طبع۔ کبھی عامر نے کسی خاموش جذبے کا اظہار کیا تھا۔ عاشی کی طرف سے تو اظہار کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔

لیکن جانے کیا ہو گیا۔ دنیا ہی الٹ پلٹ ہو گئی۔ خاکی وردی میں ملبوس جیالا سپاہی اپنے تمام تر وقار اور شخصیت کے نکھرے حسن کی روح کی گہرائیوں میں اتر گیا۔

کیسا اجنبی بن گیا تھا وہ ۔۔۔ تائی اماں سے کیسی بے نیازی سے پوچھا تھا "یہ کون صاحبہ ہیں امی۔"

"جیسے جانتا ہی نہیں شریر کہیں کا" امی نے پیار سے اس کے سر پر ہلکا سا تھپڑ لگایا تھا۔ اور عاشی کی نگاہیں اس طرح جھک گئی تھیں کہ اٹھا کر عامر کو دیکھ ہی نہ سکی تھی۔

"قسم سے میں نہیں جانتا انہیں" وہ تاچتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہائے ہائے، عاشی کو نہیں جانتا" امی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا تو یہ عاشی صاحبہ ہیں۔ جبھی تو انہیں دیکھتے ہی میری کلائی میں درد ہونے لگا تھا۔ یاد ہے۔ یہاں دانت کاٹے تھے جناب نے" اس نے ہنستے ہوئے اپنی کلائی عاشی کے سامنے کر دی تھی۔ بالوں سے بھرا مضبوط مردانہ بازو گھبرا کر اس نے اپنے نرم گداز ہاتھ کو پیچھے ہٹایا تھا۔ تو جیسے بجلی کے مثبت و منفی تار ٹکرا گئے تھے۔ شدید ترین جھٹکے کے احساس سے کانپ گئی تھی۔

شاید اس کی گھبراہٹ وہ بھانپ گیا تھا۔ کتنی شوخ نظروں سے اسے دیکھ کر لبوں میں مسکراہٹ دبا گیا تھا۔

پہلے ہی دن اس نے بے تکلف ہونے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ لیکن عاشی کتراتی رہی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد وہ تاش لے آیا تھا۔

"کھیلو گی؟"

"نہیں۔"

"کیوں آتا نہیں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"میں سکھائے دیتا ہوں۔"

عاشی نے گھبرا کر نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

نمو بھابی نے اس کی جان چھڑائی۔ "آؤ میرے ساتھ کھیلو۔"

اور وہ دونوں دیر تک کھیلتے رہے تھے۔ عاشی قریب ہی کرسی پر بیٹھی رسالہ دیکھ رہی تھی۔

اور اس شام اس نے واپس جانا تھا۔ لان میں چائے پینے کے بعد بڑے بھیا اٹھ گئے تھے۔ نمو بھابی سلائیاں بننے میں مصروف تھیں۔ اماں اخبار لئے بیٹھی تھیں۔ مگر اس پر عامر نے کوئی لٹیا بار بار اچھال رہا تھا۔

"منے یار تم گونگے ہو۔ باتیں ہی نہیں کرتے۔ پتھر لگتے ہو پتھر" وہ ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کی ان باتوں پر عاشی کا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا تھا۔ اور گال تمتما اٹھے تھے۔ وہ اس کی دزدیدہ نظروں کی تپش بھی تو محسوس کر رہی تھی۔

تیسرے دن عامر واپس چلا گیا تھا۔ تو عاشی کو یوں لگا تھا۔ جیسے وہی رونق محفل تھا۔ وہی جان انجمن۔ ہر سو ویرانی ہی ویرانی چھا گئی تھی۔ تنہائی کا احساس جان لیوا سا ہو گیا تھا۔ کتنے ہی دن وہ اداس رہی تھی۔ امی ابو کو یاد کر کے روتی بھی رہی تھی۔ من کے اندر یوں ایک آپ ہی آگ آنے والی اداسیوں کو ان کی یاد سے منسوب کر کے جذبات کی پردہ پوشی تو کر رہی تھی۔

غضب۔!

عامی آرہا تھا۔ یہاں ہی رہنے کے لئے۔ عاشی کی خوشیاں بہک رہی تھیں رنگین خوابوں کے عکس آنکھوں میں ڈولنے لگے تھے۔ وہ کتنی شدت سے اسے پیار کرنے لگی تھی۔ وہ اکثر ڈوب کر سوچتی کہ اسے ایکا ایکی یہ کیا ہوگیا ہے۔ عامی وہی تو ہے جس سے اگر وہ نفرت نہیں تو محبت بھی نہیں کرتی۔ عام سا لڑکا لگتا تھا لیکن اب کیا یہ اس کی فوجی وردی کی خوبی تھی۔ یا اس کی شخصیت ہی اتنی نکھر آئی تھی کہ بچپن کے تلخ تاثرات محبت کی شدتوں میں ڈھل گئے تھے۔

عامی آگیا۔

یوں لگا کہ بن میں موسم بہار آگیا ہے۔ ماحول میں جو ایک مخصوص سی چپ عاشی نے ہمیشہ محسوس کی تھی ٹوٹ گئی۔ وہ جتنی دیر گھر میں رہتا ہلچل مچی رہتی۔ کبھی بھائی امی کے گلے میں بانہیں ڈالے جھول رہا ہے تو کبھی نمو بھابی کو ستا رہا ہے۔ منے کی تو اکثر شامت ہی آئی رہتی۔ گال سرخ انگارہ ہوجاتے۔ عامی کی چٹکیوں سے، بھابی چیختیں اور وہ مزے سے منے کو گدگداتا۔ جھنجھوڑتا اور ستاتا رہتا۔

کتنے پر بہار متبسم ہوگئے تھے، دن رات وہی گھر جہاں دس بجے سونا معمول تھا۔ اب بارہ ایک ایک بجے تک قہقہوں سے گونجتا رہتا۔ اس ہلچل میں عاشی بھی شریک ہوتی۔ لیکن جانے کیا بات تھی۔ وہ اکیلے میں عامی کا سامنا کر پاتی۔ کترا کر نکل جاتی۔ فوراً بھاگ جاتی۔ بات تک کرنے کا موقع نہ دیتی شاید اس کی وجہ امی کے ان الفاظ کا ذہن میں خوف تھا۔ جو انھوں نے جاتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہے تھے۔

"بیٹی تمہیں یہاں اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ہم۔ رشتہ دار ذرا ذرا سی بات پر اسکینڈل بنا دیتے ہیں۔ محتاط رہنا۔"

یا پھر نمو بھابی کے اس دل والے ریمارکس تھے۔ جو انھوں نے تائی اماں سے باتوں کے دوران پاس کئے تھے۔ عامی کی شادی کے لئے وہ بیقرار تھیں۔ لڑکیوں کے انتخاب کا مرحلہ تھا۔ نمو بھابی لمبی چوڑی باتوں کے بعد بولیں۔ عامی لڑکیوں سے بہت جلد فری ہوجاتا ہے۔ امی اس کی پسند نا پسند کا اس طرح پتہ نہیں چل سکے گا۔ سنجیدہ تو کبھی ہوا ہی نہیں۔"

عاشی کا من کانپ گیا تھا۔ اس لئے اس نے اجتناب کی روش اپنالی تھی۔ عامی نے تو اس سے بے تکلف ہونے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

اس شام وہ رنگین پھولوں کی کیاریوں کے پاس بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ وہ آگیا تھا۔ سفید پتلون اور سفید قمیض میں کتنا اسمارٹ نظر آرہا تھا۔ عاشی اسے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا پڑھ رہی ہو۔؟"

کتاب۔"

"وہ تو دیکھ رہا ہوں۔ ہے کس چیز کی۔؟"

"الکا عکس۔"

"ایک دم بور اور خشک مضمون، اسے پڑھ کر تبھی تم بھی خشک اور بور ہوگئی ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے کتاب چھین کر دور پھینک دی۔

عاشی ایسی بے تکلفی کے لئے ذہنی طور پر آمادہ نہ تھی۔ غصے میں آگئی۔ جھلا کر وہاں سے تیزی سے پلٹی اور کتاب اٹھا کر اندر چلی گئی۔

چھوٹے موٹے کئی واقعات رونما ہوتے رہے۔ عامی جو کسی انجانی کشش سے عاشی کی طرف کھنچ رہا تھا۔ اس کی سرد مہری اور بیگانہ روش سے جھنجھلا گیا۔ ایک دن ڈرائنگ روم میں سب بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ عاشی کے برابر والی کرسی پر آ بیٹھا تھا۔ عاشی نے لمحے کے توقف کے بغیر اپنی جگہ بدل لی تھی۔ نمو بھابی کے ساتھ صوفے پر آ بیٹھی تھی۔ اور منے کو اٹھا کر اپنے اور عامی کے درمیان کر لیا تھا۔ وہ گھور رہا اس بیہودگی سے رہا تھا۔

ایک سہ پہر وہ کھیل کر واپس آیا تو برآمدے ہی میں کرسی پر پھیل گیا۔ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ عاشی برآمدے میں کھڑی ملے کے فراک میں بٹن ٹانک رہی تھی۔ وہ بن بلائے ہی بولا۔ "میں نے تو یہاں ٹرانسفر کروا کے سخت غلطی کی ہے سپاٹ چہرے دیکھ دیکھ کر کوفت ہونے لگی ہے۔"

"کس کے سپاٹ چہرے۔" اچانک نمو بھابی وارد ہوگئیں۔ عاشی تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے بھابی کو کیا جواب دیا۔ وہ سن نہ پائی۔

اور پھر اس دن اماں عاشی سے شادی کے متعلق پوچھ رہی تھیں۔ کھانے کی میز پر سب بیٹھے تھے۔ یہ موضوع کئی دن سے چل رہا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا امی کسی جیتی جاگتی لڑکی کا انتخاب کیجئے گا۔ پتھر کے مجسمے پسند نہیں۔"

وہ میز سے اٹھ گیا تھا۔ سب ہنس پڑے تھے۔ اس کی بات پر

لیکن اس رات عاشی کا تکیہ بھیگ گیا تھا۔

اس دن کے بعد عامی کا رویّہ عاشی سے خاصہ جارحانہ اور بیگانہ ہوگیا تھا۔ شاید وہ قربت کی منزلیں پھلانگنے سے اپہلے مڑ کر دوسری سمت چل نکلا تھا۔ عاشی کو بعض اوقات وہ اتنا دکھ دیتا کہ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آتے۔

انہی دنوں نجمہ آپا اپنی پیاری سی نند شگو کے ساتھ آگئیں۔ شوخ چنچل اور بڑی جلدی بے تکلف ہوجانے والی شگو اور عامی میں دوستی بھلا کیونکر نہ ہوتی۔ ممو بھابی کے مصداق عامی تو لڑکیوں سے جلد فری ہوجانے کا عادی ہی تھا۔ واقعی یہ سچ دونوں یوں گھل مل گئے جیسے برسوں کے ساتھی ہوں۔ رات گئے تاش کی بازیاں جمتیں پکچر کے پروگرام بنتے۔ جس میں دعوتیں ہوتیں۔ بیڈ منٹن کھیلا جاتا۔ پکنک کے منصوبے بنتے۔

عاشی کا دل ڈوب ڈوب جاتا۔ خاموش طبع تو یوں بھی تھی۔ اب تو اسے جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ شب و روز بے کیف ہوگئے۔ عامی پر اسے ان دنوں غصّہ بھی بہت آتا تھا۔ جب وہ شگو کو پسند کرہی بیٹھا تھا تو پھر دل جلانے کی باتیں کیوں کرتا تھا۔

اس دن عاشی چائے کی ٹرے اٹھا کر لائی۔ تو اس نے کتنی بیدردی سے کہا تھا "یہ خادم قسم کی لڑکیاں مجھے زہر لگتی ہیں۔"

اور پھر کتنی دفعہ اس نے عاشی کے سامنے شگو کی تعریف کی تھی۔ شگو کے چلے جانے پر ہی بے اختیار کہہ دیتا تھا "بھرپور زندگی کا نام شگو ہے۔ شگو کا جواب نہیں۔ وقت کے تقاضے شگو ہی پورے کرتی ہے۔ بیسویں صدی میں انیسویں صدی کی لڑکیاں نہیں کھپ سکتیں۔"

ایسی ایسی باتیں وہ اکثر نے کو مخاطب کر کے بھی اسے سنایا کرتا تھا اور وہ دل ہی دل میں جل جایا کرتی تھی۔ کئی بار تو رو بھی پڑتی تھی۔

تائی امی کو عامی کی شادی کی جلدی تھی۔ جب سے نجمہ آئی۔ ماں بیٹی اکثر اس موضوع پر باتیں کرتی رہتیں۔ انہیں عاشی بہت پسند تھی۔ لیکن نجمہ شگو اور عامی کی بے تکلفی دیکھتے ہوئے نند کے حق میں تھیں۔ اب کونسا زمانہ تھا۔ جو بچوں کے رجحان کے خلاف قدم اٹھایا جاتا۔ نجمہ ہمیشہ ایسی باتیں ماں کی نظروں میں لاکر انہیں قائل کرنا چاہتی تھیں۔ ہاں ایک ممو بھابی تھیں۔ جو کبھی ماں بیٹی کی باتوں میں شریک ہوئیں تو بے دھڑک کہتیں "عامی کی ان باتوں پر نہ جایئے گا۔ لڑکیوں سے فری ہونا تو اس کا شغل ہے، اچھا ہے جو آپ اسی سے پوچھ لیں۔ فیصلہ اس پر تھوپنے کے بجائے اسی پر چھوڑ دیں۔" ممو بھابی کی باتیں ہمیشہ معقول ہوتی تھیں۔ امی اور نجمہ بھی اس حقیقت کو مان گئیں۔

عامی چھ ہفتے کے لئے جا رہا تھا۔ نجمہ نے بہتر جانا کہ رشتے کے اہم مسئلے پر جانے سے پہلے ہی گفتگو ہوجائے۔ وہ اپنے کمرے میں سامان وغیرہ ٹھیک کر رہا تھا۔ کہ نجمہ وہاں جا پہنچی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مطلب کی طرف آئی۔

"عامی ایک بات پوچھنا ہے تم سے۔"

"پوچھئے۔"

"شادی کے متعلق کیا خیال ہے۔"

وہ ہینگر ہاتھ میں پکڑے ایک لمحہ کو ٹھٹکا۔ پھر خوشدلی سے بولا۔

"نیک۔"

"اور شگو کے متعلق۔"

"کیا مطلب۔" وہ ہینگر پھینک کر بہن کے سامنے آکھڑا ہوا۔ نجمہ نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔ اور جلدی سے بولی "شگو تمہیں پسند ہے نا۔"

"لیکن شادی اور شگو کا کیا میل۔" وہ جلدی سے بولا۔

"کیا تم شادی کے متعلق سیریس نہیں۔"

"ہوں۔"

"تو پھر شگو کے لئے بات۔"

"لیتی۔۔۔" وہ زور سے چیخا۔ نجمہ ششدر سی اس کا منہ دیکھنے لگی۔ وہ ایک دم کمر موڑ کر بولا "شادی نہ ہوئی مذاق ہوگیا۔ آپ سے کس نے کہا کہ میں شگو کو اس حد تک پسند کرنے لگا ہوں۔ کہ۔۔۔"

نجمہ غصّے میں آگئی "اس سے جو بے تکلفی کی پینگیں بڑھائی ہیں تو اس کا کیا مطلب۔؟"

وہ مڑ کر نجمہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "اس کا مطلب، اس کا مطلب۔ ا۔۔۔ میں۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔"

نجمہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ غصّے میں خوب خوب سنائیں۔ اپنے اور شگو کے رشتے کی نزاکت کا احساس دلایا۔ وہ بولتی رہی۔ اسے عامی کی باتوں سے دھچکا جو لگا تھا۔ لیکن عامی تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ہلچل مچی تھی۔ کچھ سوچ رہا تھا لیکن سوائے مٹھیاں بند کرتے کھولتے اور ٹہلنے کے اور کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

"جو کچھ کرنا ہے دو ٹوک فیصلہ کرو۔ تم نے تو میرے لئے اچھی خاصی مصیبت

کھڑی کر دی ہے۔" بجھی الجھن اور بے دلی سے کہتی کمرے سے نکل گئی۔

"دو ٹوک فیصلہ" عامی نے زیر لب کہا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ سر کو جھٹکا بیقراری سے کمرے میں ادھر سے ادھر گیا۔ وردیاں اُدھر سے اٹھا کر ادھر پٹخیں۔ سامان منتشر کر دیا۔ پھر بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو برق کی سی تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

دوسرے لمحے وہ عاشی کے کمرے میں تھا۔

کھڑکی کے ادھ کھلے پٹ کے ساتھ لگی وہ باہر خلاؤں میں جانے کیا دیکھ رہی تھی۔

"عاشی!" عامی نے جھنجھلاہٹ، الجھن اور تذبذب سے بھری آواز میں اُسے پکارا۔

عاشی نے پلٹ کر دیکھا۔ عامی کے چہرے سے پریشانی اور جھلاہٹ مترشح تھی۔ ذہنی کوفت کے پرتو بھی لہراتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ساری مصیبت تم نے ڈال رکھی ہے۔" وہ اس کے قریب یوں آیا جیسے کھا ہی جائے گا۔ اُسے۔

"جی" عاشی سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

"عاشی یہ کتنا بڑا اور سنگین مرحلہ درپیش ہے" وہ اس کے عین سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"جی۔۔" وہ ہراسانی سے اُسے آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگی۔

اور جب مختصر سی تمہید کے بعد جلے جلے لفظوں سے عامی نے کہا۔

"شگو کو میرے پلے باندھنے کے منصوبے بن رہے ہیں"

تو وہ تلخی سے مسکرائی۔ رُخ موڑتے ہوئے بڑے سفاک طنز سے بولی "مبارک ہو"

"عاشی۔" وہ اتنے زور سے پاؤں پٹختے ہوئے چیخا کہ عاشی کو مڑ کر دیکھنا پڑا۔ گھبرا کر بولی۔

"شگو آپ کو پسند بھی تو ہے۔ اور کیا چاہتے ہیں آپ۔؟"

"جو چاہتا ہوں، تم اچھی طرح جانتی ہو" وہ بے دھڑک بولا۔

"جی۔۔؟ جی۔۔؟" عاشی بے یقینی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی۔

"تم۔ تم پتھر ہو پتھر۔" عامی نے سختی سے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

جس نے اس پتھر کو توڑنے پھوڑنے کے لئے شگو کو استعمال کیا۔ لیکن۔

تم تم کیا ہو عاشی۔ کچھ اثر ہی نہ ہوا۔ مجھے صرف اتنا بتا دو۔ کہ مجھ سے کتراتی کیوں ہو۔ فرار کی کوشش کیوں کرتی ہو۔ کیا اتنی نفرت"

لیکن وہ جملہ پورا نہ کر سکا۔ عاشی نے جلدی سے اپنا نرم و گداز ہاتھ اس کے لبوں پر رکھ دیا۔

"عاشی۔" عامی فرط مسرت سے چیخ اٹھا۔ دوسرے لمحے عاشی اس کے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں تھی۔ اور وہ بے یقینی کے عالم میں کہے جا رہا تھا "کیا واقعی؟ کیا واقعی۔۔ تم مجھ سے نفرت نہیں کرتیں"

اور خوشیوں کی یلغار سے بے سدھ ہوتی۔ عاشی سر کو دھیرے دھیرے نفی کے انداز میں ہلاتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔۔ "عامی۔۔ تم نے مجھے بہت دکھ دیئے۔۔ بہت ستایا۔۔ بہت رلایا۔۔ تم آئے تھے تو مجھے لگا تھا۔۔ جیسے۔۔ جیسے ویرانے میں بہار آ گئی ہو۔۔ لیکن۔؟"

"لیکن ویکن کچھ نہیں عاشی، ویرانے میں بہار تو اب آئی ہے۔۔"

وہ بازوؤں کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے مسکرایا۔

عاشی کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

فیشن آلود محکمۂ موسمیات

تسنیم شہناز

محکمۂ موسمیات، وہ اہم محکمہ ہے کہ اگر اس کا وجود نہ ہوتا تو سمجھ لیجئے کہ اس دنیا کا کاروبار ہی نہ چلتا۔ شب و روز کی گاڑی کو گھسیٹنے کے لئے اس محکمہ کا قیام از حد ضروری تھا اور ٹھیک ہی تو ہے کہ اگر موسمیات کا محکمہ سرگرم عمل نہ ہوتا تو ہمیں آسمان کی گردشوں اور حسینوں کے موڈ کی طرح بدلتے ہوئے موسمی مزاج کا کیسے پتہ چلتا۔ ہم یہ کیسے جان سکتے کہ آج موسم خوشگوار رہا یا ابر آلود رہا۔ نجانے ہم کہاں سوئے رہتے ہیں اور دن گذر جاتا ہے اور موسم کی ہمیں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ جبھی تو ہر روز رات کو ٹیلی فون سے محکمہ موسمیات والوں کو ہمیں یہ گوش گذار کرنے کی زحمت گوارا فرمانی پڑتی ہے کہ آج موسم خوشگوار رہا۔ ٹھنڈی ہوائیں چلیں کل بھی موسم خوشگوار رہے گا اور ٹھنڈی ہوائیں چلیں گی۔

ہم مذکورہ اطلاع پر یقین کر کے بیٹھ جاتے ہیں مگر بیڑا غرق ہو گرگٹ کی طرح بدلتے اس موسم کا کہ اگلے روز موسلا دھار بارش ہو جاتی ہے اور یوں محکمۂ موسمیات والوں کے اعلانات پر پانی پھر جاتا ہے۔ باہر تو موسلا دھار بارش ہو کر تھم جاتی ہے اور محکمۂ موسمیات والے یہ پیش گوئی کر رہے ہوتے ہیں کہ آج تمام دن موسلا دھار بارش ہوئی اور کل بھی بارش ہونے کا امکان ہے اور ہم یہ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ان کی گذشتہ روز پیش گوئی کا کیا بنا ہرحال پھر کل آتی ہے اور سارا دن دھوپ نکلی رہتی ہے اس وقت ہم کیا خود محکمۂ موسمیات والے موسم کی ان بھول بھلیوں پر حیران پریشان ہوتے رہ جاتے ہیں

موسم اور محکمۂ موسمیات والے کہتے ہیں۔ کل موسم ابر آلود رہے گا۔ اور بادل چھائے رہیں گے مگر اگلے روز بارش والا بادل کا ٹکڑا کہیں نظر نہیں آتا۔ موسمیات والے پیش گوئی کر رہے ہیں کہ کل مطلع صاف رہے گا مگر دوسرے روز آسمان گھنگھور بادل چھا جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ موسم کچھ کہتا ہے اور محکمۂ موسمیات والے کچھ کہتے ہیں۔ چنانچہ ملک مکان اور کرایہ دار کے باہمی تنازعہ کی طرح اس تنازعہ کے حل کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ محکمہ موسمیات والوں کو چند گرانقدر مشوروں سے نوازیں اب وہ ان کی قدر کریں یا نہ کریں ان کی مرضی۔

بہرحال کہنا یہ ہے کہ موسمیات کے ماہرین جو ہر موسم سماوی تبدیلیوں کے چکر میں رہتے ہیں اور لوگوں کو ان کے بارے میں آگاہ کر کے انھیں محتاط ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں اگر ارضی تبدیلیوں کی جانب توجہ فرمائیں تو اس ضمن میں ان کی پیش گوئیاں مؤثر اور جاندار ہو سکتی ہیں۔ زمین پر دیکھیں آئے دن کیسی کیسی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں جن سے بہت سے لوگ باخبر ہوتے ہوئے بھی بے خبر رہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں تو اب آپ کو اپنی پیش گوئیوں میں مختلف نوعیت کی تبدیلیاں کرنی چاہئیں۔ اگر محکمۂ موسمیات والے ناراض نہ ہوں اور اپنی نشست ہمارے حق میں چھوڑ دینے کے لئے تیار ہوں تو ہم کچھ اس قسم کی پیش گوئیاں کریں گے۔ مثلاً:-

آج مطلع فیشن آلود رہا۔ نت نئے ملبوسات کی تیز ہوائیں چلیں ہر یالی کے زبردست جھکڑ چلتے رہے فیشن کی متوالیوں کے دوپٹے اڑ گئے۔ زلفیں شانوں کی بجائے کانوں تک آ گئیں۔ چہرے میک اپ سے اٹ گئے نام نہاد عاشقوں کے دلوں پر چھریاں چل گئیں۔ یہ صورت حال نجانے کب تک رہے گی۔

آج عریانیت کی زبردست لو چلی غرارے سکڑ کر فلیپر ہو گئے۔ آستینیں غائب ہو گئیں قمیصیں سکڑ کر بنیانیں بن گئیں۔ دوپٹے مجلس کرتی بن گئے۔ اہل دل جذبات کی آگ سے بھڑک اٹھے اور شربت وغیرہ پینے کے لئے گھروں سے نکل آئے۔ عاشقوں کے دلوں کا درجۂ حرارت ۴۴ ڈگری سینٹی گریڈ رہا۔ محکمۂ موسمیات کی پیش گوئی کے مطابق یہ صورت حال آئندہ موسم سرما تک رہیگی۔

آج ہر طرف جدید فیشنوں کی موسلا دھار بارش ہوئی زلفوں کے بادل چھائے رہے جو حجاموں کی دکانوں پر برسے قمقموں کی بجلیاں گریں۔ ہر طرف سے حسن کا سیلاب آ گیا۔ سینکڑوں ہزاروں دل ڈوب گئے۔ یہ صورت حال غیر معینہ مدت تک رہے گی۔

آج موسم سرما کی سخت سردی پڑی۔ پرانے فیشن پر برفباری ہوئی۔

[illegible]
[illegible] ہو گئے ۲ [illegible] کی [illegible] ہوا [illegible]
کا نقطۂ انجماد ۲۰ درجہ سینٹی گریڈ رہا۔ حسن بے پرواہ سوئیٹروں اور گرم اونی کوٹوں میں چھپ گیا۔ زلفوں نے سردی سے بچنے کے لئے مفلر اور ٹوپیوں میں پناہ لی۔ محکمہ موسمیات کی پیش گوئی کے مطابق یہ صورت حال آئندہ موسم گرما تک برقرار رہے گی۔

آج ہر طرف موسم بہار کے پھول کھلے حسن اور فیشن والے چاندنی لان اور احمد لان پہن کر گھروں سے باہر نکل آئے۔ دیوانے صحراؤں کی طرف چل دیئے۔ شاعروں کے دلوں پر قیامتیں ٹوٹ پڑیں، بہاروں نے ان کے آشیاں جلا کر خاک کر دیئے۔ محکمۂ موسمیات کی پیش گوئی کے مطابق یہ صورت حال موسم خزاں تک جاری و ساری رہے گی۔

آج موسم خزاں آلود رہا، پودوں اور درختوں نے زرد ماتمی لباس پہن لئے پھول اپنی قسمت کو رو دھو کر شاخوں سے گر کر بے ہوش ہو گئے حسن کے چہرے پر ہوائیاں اڑیں۔ عاشقوں اور شاعروں کے دل کھل اٹھے اور وہ بہاروں کے گیت موسم خزاں کے ختم ہونے تک موجود رہے گی۔

آج فضائیں مہنگائی آلود رہیں۔ اشیاء کی قیمتیں آسمانوں سے باتیں کرنے لگیں غریب فاقوں پر مجبور ہو گئے امیر تلملا کر رہ گئے، بحث و تمحیص کا بازار گرم رہا۔ میاں و بیوی کے درمیان غم و غصہ کا کھلاؤ ۴۰ درجہ سینٹی گریڈ جا پہنچا۔ جوتوں کی بارش بھی ہوئی محکمۂ موسمیات کی پیش گوئی کے مطابق یہ صورت حال نامعلوم مدت تک برقرار رہے گی۔

اور بھی بہت سی تبدیلیوں کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کیا جا سکتا ہے جہاں تک سورج کی آنکھ مچولی کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں بھی یوں کہا جا سکتا ہے کہ آج سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکلا اور مغرب کی بجائے مشرق میں غروب ہوا، یا یہ کہ کل سورج مغرب سے نکل کر شمال کو چلا جائے گا اور جنوب کی سیر کرتا ہوا مشرق کی سمت جا ڈوبے گا، یا آئندہ سائنسدان براہ کر بچے گا۔ جہاں تک ہوا میں نمی کا تعلق ہے تو ہوا میں نمی کبھی ہو ہی نہیں سکتی تھی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

[illegible]
چیخ [illegible] ہیں [illegible] عجیب و غریب ہے [illegible]
گی آسمان اور زمین گلے مل جائیں گے۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں گے بادل رنگی ہوئی دھنی ہوئی روئی کی مانند ہوں گے لوگ [illegible] کی مانند ادھر ادھر پھر رہے ہوں گے۔ حضرت اسرافیل صور پھونکیں گے جس کی آواز اس قدر خوفناک ہو گی کہ ہر جاندار اور بے جان شے فنا ہو جائے گی [illegible]
اب کل آئے گی تو دیکھا جائے گا، اپنا کاروبار تو چلتا ہی [illegible]

[illegible]

طلعت پروین صدیقی۔ اعظم گڑھ

[illegible] پرسکون نظر آرہا تھا۔ جو کرب اور
[illegible] تھی۔ وہ دھیرے دھیرے مٹ رہی تھی۔
[illegible] تھی۔ اپنا نام پکارے جانے پر دھیرے
[illegible] پر آگے بڑھنے لگا۔ ہال میں تالیوں کے شور نے
[illegible]۔ اور وہ ہونٹوں پر بے جان سی مسکراہٹ لئے ہوئے
[illegible] کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کافی
[illegible] بھی رہی تھی۔ وہ بہت بیمار تھا۔ پھر بھی زندگی
[illegible] ان کو کہیں کا نہ رکھا تھا۔ دن رات غم میں
[illegible] ہو گیا تھا۔

[illegible] باوجود وہ اپنا پروگرام پیش کرنے پر مصر تھا۔
[illegible] تھی جو وہ ڈاکٹر کا مشورہ مان لیتا۔ ابھی تھوڑی
[illegible] تھی۔ خوش تھا کہ اب غموں سے ہمیشہ کے
[illegible]

[illegible] ہوئی تھیں۔ اور تھرتھراتے ہوئے لبوں
[illegible]

[illegible] سے پہلے غزل چلی آئی

[illegible] تھا درد تھا کہ ہر ایک دل بے تاب ہو اٹھتا تھا۔
[illegible]۔ آج وہ شاید اپنا آخری پروگرام پیش کر رہا تھا۔
[illegible] صرف فاران کی بھاری اور پرسوز آواز گونج
[illegible] دکھائے چند سنہرے خواب دکھائے تھے۔
[illegible] سال پہلے بھی گا رہا تھا۔ جب اس کی زندگی میں
[illegible] غم نہیں تھا۔ فاران جب بارہ سال کا تھا۔
[illegible] اس کی آنکھیں چلی گئی تھیں۔ غریب ہونے
[illegible] کا آپریشن نہ کرا سکا تھا۔ اس اندھے پن کے
[illegible] دیا تھا۔ گیت کے ختم ہونے پر سب
[illegible] مبارکباد دینے آئی۔ جو کسی اسپتال میں نرس

کی ٹریننگ لے رہی تھی۔ اس کی مبارکباد کا وہ ہر پروگرام کے ختم ہونے پر انتظار کیا کرتا تھا۔ اور ہر بار وہ ضرور آئی تھی۔

اپنے دل کی آنکھوں سے فاران نے دیبا کو پرکھ لیا تھا۔ اور اس وسیع دنیا میں صرف اس کو اپنا سمجھا تھا۔ اور شاید فاران کے دل میں دیبا کے لئے نرم گوشے بھی موجود تھے۔ لیکن اس نے کبھی ان جذبات کو ہونٹوں پر نہیں آنے دیا۔ اپنی محرومی کا اس کو احساس تھا۔

لیکن اس روز دیبا نے معلوم نہیں کس جذبے کے تحت کہہ ڈالا۔

"فاران صاحب آپ ہمیشہ درد بھرے گیت ہی کیوں گاتے رہیں!"

"دیبا، میری زندگی میں درد کے سوا اور کیا ہے"

"شاید آپ آنکھیں نہ ہونے کی وجہ سے غمزدہ رہتے ہیں۔ مجھے اپنی آنکھیں بنا لیجئے۔ میں آپ کے سارے غم لے لونگی" رندھی ہوئی آواز میں دیبا بولی۔

"دیبا میں اندھا تم کو کیا دے سکتا ہوں۔ سوائے درد سر کے"

"ایسا نہ کہئے فاران صاحب۔ میں نے سب کچھ پا لیا ہے"

اور پھر دونوں مستقبل کے سنہرے خوابوں میں کھو گئے۔ فاران نے دیبا کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ دونوں شادی کے لئے تیار تھے۔ دیبا نے اپنے بابا کو خط لکھا کہ وہ شادی کر رہی ہے۔ اور ان کو شادی میں آنے کو کہا۔

دونوں کورٹ جانے کو تیار بیٹھے تھے کہ دیبا کے بابا آگئے۔ ان کو چشمہ لگائے ہوئے فاران بہت اچھا لگا۔ دیبا نے ان کا تعارف کروایا۔ دونوں طرف سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھے۔ فاران کے بھٹکتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر بابا سکتے کے عالم میں اس کو دیکھتے رہ گئے۔

اور پھر ان کی آواز بم کی طرح پھٹ پڑی۔

"دیبا تم کو یہی اندھا ملا تھا"

ان کی آواز کے ساتھ ہی فاران کا [illegible] ہاتھ [illegible] دیبا بابا کے ساتھ گھسیٹتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

تعبیر ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ کر بکھر گئے اور اس تیزی سے بکھرے کہ فاران تڑپ کر رہ گیا۔

چھ ہی مہینوں میں اس کی حالت بدل کر رہ گئی۔ خوبصورت جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا۔ دن رات سگریٹ پھونکتے رہنے سے اس کا جگر جل گیا۔ خون تھوکتے تھوکتے بے حال ہو گیا۔ پھر بھی کبھی ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا۔ کیونکہ وہ مرجانا چاہتا تھا۔

آنکھیں بند کئے ہوئے وہ لگاتار ایک لائن دھرائے جا رہا تھا۔

بہار آنے سے پہلے خزاں چلی آئی۔

اس سے پہلے کہ کوئی ٹوکتا کھانسی کا دورہ اٹھا۔ اور منہ سے ڈھیر سارا خون نکل آیا۔ اس کے بعد فاران کو ہوش نہیں رہا۔

جب دوبارہ ہوش آیا تو اسپتال کی مہک محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر پاس ہی کھڑا تھا۔ ہوش میں دیکھکر بولا۔

مسٹر فاران اب خطرے سے باہر ہیں۔ آپ کا پھیپھڑا بدلا جا چکا ہے۔ دو تین روز میں آپ کی آنکھوں کا بھی آپریشن ہوگا۔ آپ انشاء اللہ جلدی ہی دوبارہ دیکھ سکیں گے۔

فاران بڑے کرب سے بولا" ڈاکٹر صاحب مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔ مجھے خوشیاں راس نہیں آئیں۔ میں اس دنیا کو لیکر کیا کروں گا۔ جس میں دیبا نہ دکھائی دے"

"آپ کی دیبا مل گئی ہے۔ وہ اسی اسپتال میں نرس ہے۔ وہ آپ کا پروگرام سن رہی تھی۔ جب آپ گر پڑے تو وہ آپ کو اسپتال لے آئی۔ سب کچھ اسی کی مرضی سے ہوا ہے۔ آپ ان سے مل سکتے ہیں۔

یہ کہکر ڈاکٹر باہر چلا گیا۔

"فاران" تبھی اس کو دیبا کی آواز سنائی دی" میں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ میں نے تم کو بہت تلاش کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم شہر ہی چھوڑ چکے ہو۔ اب ہم فوراً شادی کریں گے۔ اب مجھے کوئی نہیں روک سکتا"

اس کے ساتھ ہی وہ پھوٹ کر رو پڑی۔ فاران بھی اپنے آنسو برداشت نہ کر سکا اور رو پڑا۔ فاران کی آنکھوں کا آپریشن ہو چکا تھا۔ اب پٹی کھلنے والی تھی۔ دیبا بے تابی سے ٹہل رہی تھی۔ آخر کار پٹی کھل گئی۔ آپریشن کامیاب رہا تھا۔ فاران کو آنکھیں مل گئی تھیں۔ سب سے پہلے اس نے دیبا کو دیکھا۔ دلہن کے ڈریس میں لپٹی ہوئی۔ جلتی دہکتی آگ سی دیبا۔

دونوں کے ہاتھ ایک ساتھ اٹھ گئے [illegible]

عفت موہانی

کا ایک نیا تحفہ یعنی نیا شاہکار

پیاسی برسات

زیر طبع ہے اور امید ہے ۱۵ اگست تک شائع ہوجائے گا۔

پیاسی برسات ایک ایسا ناول ہے جسے پڑھ کر آپ عرصہ تک متاثر رہیں گی۔

قیمت مجلد۔ بارہ روپیہ

عفت موہانی

کے دوسرے ناول جو مل سکتے ہیں

آگ میں پھول 6/75 • اک چراغ دور کا 10/- • آہوں کے گیت 10/-

انتظار 6/75 • بھنور 10/- • پندار 15/- • پیمان 15/-

اک زخم نہاں اور 11/- • آرزو کی سوغات 12/- • پت جھڑ کی بہار 10/50

تقدیر 13/- • سویرے 9/- • صنم 10/- • راز 8/50

مداوا 10/50 • ہمسفر 12/- • داغ دل 9/50 • پھول کا دل 8/50

پرانی آگ 6/00 • دور کا رشتہ 12/- • ستم کے سہارے 8/50

شہر آرزو 7/- • شام تمنا 9/- • قافلے بہار کے 10/-

لے نام بھی آہستہ 9/-

پردے کا مقصد عورت کے احترام کو فروغ دینا ہے

(رخسانہ دلپذیر)

اللہ تعالیٰ کو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کی عزت و حرمت نہایت عزیز ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی شخص کسی مسلمان کو ذلیل کرے۔ مسلمان کے ذلت کے معنی حق و صداقت کی تذلیل ہے اور خدا پرستوں کی ایک ایسی جماعت کی تحقیر ہے۔ جو کائنات میں امام ہے۔ اور ساری دنیا کی راہنمائی جن کا دینی فرض ہے۔

اول اول چونکہ پردے کا رواج نہ تھا اس لئے مسلمان عورتیں ضروریات کی وجہ سے گھروں سے نکلتیں تو بدکار اور آوارہ لوگ ان کو چھیڑتے ——— اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ تم ایسی حرکات کا ارتکاب کیوں کرتے ہو تو کہتے ہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ شاید غلام عورتیں ہیں۔ لونڈیوں سے چھیڑ چھاڑ اس وقت اس قبیل کے لوگوں میں معیوب نہیں تھی۔ اس پر پردے کا حکم نازل ہوا کہ امہات المومنین اور عام مسلمان عورتوں کو چاہیئے کہ کھلے منہ گھروں سے باہر نہ نکلا کریں۔ بلکہ نکلیں تو گھونگھٹ نکال کر۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ شریف پردہ دار خواتین ہیں۔ اور اس طرح ان بدقماش لوگوں کو شرارت کا موقع نہ ملے۔

یہ پردہ کی وہ سادہ اور نہایت حیا پرور صورت ہے۔ جو معقول بھی ہے اور حفظ ناموس کے لئے ضروری بھی۔ برقع موجودہ حالات میں شرعی پردہ نہیں ہے بلکہ پردہ کی ایک ارتقائی شکل ہے۔ اور تمدن کے ارتقاء کے ساتھ اس نوع کا ارتقا بھی ضروری تھا۔ گو یہ بڑی حد تک مفید ہے۔ مگر چونکہ تمدن کی ارتقائی بدعت ہے۔ اور اسلامی سادگی سے مختلف ہے اس لئے طبعاً اس میں چند نقائص ہیں۔ جن کا ذمہ دار اسلام یا قرآن نہیں ہے۔ چونکہ چیں حضرات پردہ اور برقع میں بعض اوقات امتیاز روا نہیں رکھتے۔ اس لئے ان سے اس باب میں لغزش ہو جاتی ہے۔ اور وہ ان عیوب کو جو برقع کا لازمی نتیجہ ہیں۔ نفس پردہ کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں بالکل جدا جدا ہیں۔ پردہ ایک تمدنی نصب العین ہے جس کا مقصد ہے حفظ ناموس۔ اور برقع محض ایک ذریعہ ہے جو عموماً مفید ہے۔ دوسرے ذرائع کو بھی اختیار کیا جا سکتا ہے جس سے زینت کے مقامات بھی ظاہر نہ ہوں اور وہ سادگی میں بے ضرر بھی ہو۔ بشرطیکہ کوئی دوسرا ذریعہ اس کی جگہ لے سکے۔

جس شخص نے قرآن مجید کا تھوڑا بہت مطالعہ بھی کیا ہوگا وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہمارے معاشرتی مسائل میں سے جو مسائل زیادہ سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اور وضاحت کے ساتھ قرآن مجید میں اور احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ پردہ کا مسئلہ بھی ہے۔ پردہ سے متعلق تمام اصولی ہدایات قرآن مجید میں دی گئی ہیں۔ ان کی ضروری توضیحات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی ہیں (ترجمہ)

"اور وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھو۔ اور گذرے ہوئے زمانۂ جاہلیت کی طرح اپنے سنگھار دکھاتی نہ پھرو۔ اور نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ دو۔ اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔"

(سورۂ الاحزاب۔ ۳۳)

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کا اصل میدان عمل اس کا گھر ہے اور ایک صالح اور دیندار معاشرے کی تشکیل میں مدد دینا ہے۔ کیونکہ جہاں زینت چھپانے کا حکم ہے وہیں نماز، زکوٰۃ اور خدا و رسول کے احکام پر عمل کرنے کا حکم بھی ہے۔

اسلام کے ظہور سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں اس طرح کی باتیں عورتوں میں پائی جاتی تھیں۔ جن کو اسلام نے آ کر مٹایا ہے۔ اس لئے اسلام کا پسندیدہ کردار ایک عورت کے لئے وہی ہے جو اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ اور اس کردار کی مسلمان عورتوں کو تعلیم دی گئی ہے۔ اس آیت میں اگرچہ مخاطب رسول پاکؐ کی ازواج ہیں۔ لیکن یہ ہدایت صرف انہی کو نہیں دی گئی۔ بلکہ یہ سب کے لئے ہے اور ان کو مخاطب اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ تمام امت کی عورتوں کے لئے نمونہ ہیں۔

ایک مشہور حدیث میں جس میں معاشرہ کے مختلف طبقات کی ذمہ داریوں کو آنحضرتؐ نے الگ الگ گنایا ہے۔ عورت کی اصل ذمہ داری

یہ بیان فرمائی ہے۔

"ہر عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگراں بنائی گئی ہے اور اس سے ان چیزوں کی بابت پرسش ہوگی۔"

پردے کا رواج قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ یونان کی عورتیں بہت ہی حسین وجمیل تھیں۔ ان کی عادت تھی کہ گھر سے باہر نکلتے وقت اپنے چہروں کو اپنے دامن یا کسی خاص اوڑھنی سے ڈھانپ لیا کرتی تھیں۔

فنیقیہ کی عورتیں سرخ پردہ اوڑھا کرتی تھیں۔ یونان کے سب سے پہلے مصنف نے پردہ پر مضمون لکھا۔ بادشاہ عوسیں کی بیوی "نیلاپ" ہمیشہ پردہ اوڑھے رہتی تھی۔

شہر تیب کی عورتوں کا پردہ خاص ہوتا تھا جس میں آنکھوں کے سامنے دو سوراخ ہوتے تھے۔ تاکہ بآسانی دیکھا جا سکے۔

نصوص شرعیہ یعنی قرآنی آیات اور صحیح احادیث و آثار سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام نے پردے کے بارے میں تشدد برتا ہو۔

یاایھا النبی قل لازواجک وبنٰتک ونساء المؤمنین یدنین علیھن من جلابیبھن ط ذالک ادنیٰ ان یعرفن فلا یؤذین ط وکان اللہ غفوراً رحیماً o

(سورۃ الاحزاب ۵۹)

ترجمہ۔ اے پیغمبرؐ اپنی بیبیوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور دوسرے مسلمانوں کی بیبیوں سے بھی کہہ دیجئے کہ نیچی کر لیا کریں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں۔ اس سے جلدی پہچان ہو جایا کرے گی۔ تو آزادی نہ دی جایا کرے گی اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

"اور مسلمان عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی آنکھوں کو نیچی رکھیں۔"

(سورۃ الاحزاب)

رسول اللہ کی بعثت کی غرض وغایت یہ تھی کہ آپ کے ذریعے سے دنیا کی اصلاح کی جائے اور برائیوں کا قلع قمع کیا جائے۔ عورت کے جملہ امور کی اصلاح کر کے اس کے ذریعے سے ایک نظام قائم کیا جائے، تاکہ وہ ظالموں کے لئے مظالم کا تختہ مشق نہ بن جائے۔

مغربی مصنفوں میں سے ایک منصف مزاج ہملٹن اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ

"اسلامی احکام عورت کی شان میں نہایت صریح ہیں جو اس کی عزت افزائی کو برقرار رکھنے اور اس کو ہر حق اور ایذا رسانی سے محفوظ

رکھنے کی طرف خاص توجہ دلاتے ہیں۔ اسلام نے پردے کے بارے میں تنگ نظری سے کام نہیں لیا۔ جیسا کہ بعض مصنفوں کا خیال ہے بلکہ اس نے غیرت و مروّت کے اسباب کا لحاظ رکھا ہے۔"

اسپارٹا کی نوجوان لڑکیاں شادی ہونے سے پہلے لوگوں سے ملتی جلتی تھیں۔ مگر شادی کے بعد وہ پردہ پوش ہو جاتی تھیں۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عموماً عورتیں اپنے چہروں اور جسموں کو ڈھانکے رہتی تھیں۔ جب انھیں بازار جانا ہوتا تو سر سے لے کر پاؤں تک برقع اوڑھے ہوئے نکلنا ان کے لئے ضروری تھا۔ خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا کنواری۔

اسی طرح سیلبٹریہ، ایشیا، ایران اور عرب میں پردے کا رواج تھا۔ روم میں عورتوں میں یہ رسم انتہائی حد تک جاری تھی کہ جب ان میں سے کوئی عورت باہر نکلتی تو نہایت احتیاط کے ساتھ ایسا پردہ اوڑھتی جو ایک لمبی چادر کی شکل میں ٹخنوں کے نیچے تک لٹکا ہوتا تھا۔ پھر اس کے اوپر ایک عبا پہن لیتیں تاکہ کوئی عضو نظر نہ آئے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ازواج نبی کو ان کے گھروں میں رہنے اور ان کو زیب و زینت کا مظاہرہ کرنے سے منع کرنے کا حکم صادر ہونے کے بعد وہ دنیا سے بے خبر اور عزلت گزین نہیں ہو گئیں تھیں۔ جیسا کہ مغربی مفکرین کا خیال ہے کیوں کہ سیدہ عائشہ زوجہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کے خلاف جنگ میں شرکت کی۔ بلکہ فوج کی کمان کی سیدہ فاطمہ الزہرہ نے حضرت علیؓ کی خلافت کے دعویٰ میں بیشتر حصہ لیا۔ سیدہ زینب بنت حسینؓ نے اپنے چھوٹے یتیم بھائی کو حادثہ کربلا کے بعد امویوں کے پنجہ سے رہائی دلائی۔ ان نامور خواتین پر اسلام کا گہرا اثر تھا۔ اور وہ قومی زندگی کے میدان میں برابر شریک ہوا کرتی تھیں۔

عرب جاہلیت، یہود اور نصاریٰ کے اخلاق و کردار میں انتہائی زوال و انحطاط پیدا ہو چکا تھا۔ قرآن کریم نے ازواج نبی کریمؐ کو ان کے گھروں میں ٹھہرے رہنے اور جاہلیت کی زیب و آرائش کا مظاہرہ کرنے سے پرہیز اختیار کرنے کا جو حکم دیا۔ اس کی وجہ سے اخلاق و تہذیب برقرار رہ گیا۔ اور سیرت و کردار کی سطح اونچی ہو گئی کیونکہ ازواج نبی کریمؐ کے لئے بہترین نمونہ تھیں۔

وان کریمر کا قول ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پردہ کو اسلام نے عرب کے اندر

[illegible] ... جنھوں نے سبیل ہول رکھے کہ جو حرام قرار دیا ہے۔

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ عورتوں سے اعتماد کے جذبہ کو ختم کر دیا جائے بلکہ یہ ایک ذریعہ ہے۔ ان کے ناموس کی حفاظت اور احترام کا ذریعہ ہے ان کی رسوائی کی روک تھام کا۔ درحقیقت اسلام کی نظر میں عورت کا جو درجہ اور مقام ہے۔ وہ یقیناً قابلِ رشک ہے:

حمزہ بن ابواسید انصاری اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے نکل رہے تھے کہ آپ نے دیکھا کہ راستے میں مرد عورتوں کے ساتھ مل گئے ہیں۔ آپ نے عورتوں سے فرمایا کہ تم پیچھے ہو جاؤ تمہارے لئے راستے کے بیچ میں چلنا ٹھیک نہیں ہے تم راستے کے کنارے سے چلو۔ چنانچہ اس حکم کے بعد عورتیں بالکل دیوار سے لگ جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کی چادریں دیوار سے الجھتی تھیں۔

(ابوداؤد ما جاء فی مشی النساء فی الطریق)

روایت میں آیا ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر ٹھہر جاتے کہ عورتیں نکل جائیں تاکہ راستے میں عورتوں اور مردوں کا تصادم نہ ہو۔ عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کا ایک دروازہ عورتوں کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔!

عیدین کی نمازوں میں عورتوں کو شرکت کی خاص طور پر اجازت تھی لیکن ان کا اجتماع مردوں سے الگ ہوتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی مرد دو عورتوں کے درمیان چلے۔ (ابوداؤد)

عرب کے باعزت گھرانوں میں رواج تھا کہ وہ ایک بڑی چادر سے سر سے پاؤں تک اپنے جسم کو چھپا لیتی تھیں اور یہ چادریں عورت کے لباس، اس کی زینتوں اور اس کے جسم کے محاسن کو ڈھانک لینے کے لئے حجم کے لحاظ سے زیادہ موزوں تھیں۔ قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں چادر کو گھونگھٹ کی شکل میں چہرے پر لٹکایا کریں۔ حضرت عائشہ نے حجۃ الوداع کے موقع کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

قافلے کے قافلے ہمارے پاس سے گزرتے تھے اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ احرام کی حالت میں تھے۔ جب قافلے ہمارے سامنے آ جاتے تو ہم سر کی طرف سے بڑی چادر کا کچھ حصہ چہرے پر لٹکا لیتے اور جب وہ گزر جاتے تو اس کو اٹھا دیتیں۔

حضرت عائشہ واقعہ افک کے سلسلے میں بیان کرتی ہیں کہ جب میں نے صفوان بن معطل کے انا للہ پڑھنے کی آواز سنی تو خمرت وجہی بجلبابی (بخاری)

ترجمہ: میں نے اپنی چادر سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا۔

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ جب کوئی اندوہناک حادثے میں عورتیں اپنے سینے پیٹتیں اور گریبان چاک کرتیں تو اس وقت بھی کئی عورتیں اس حکم کا احترام کرتی تھیں کہ اپنے پردے کا خاص خیال رکھتی تھیں۔

ایک خاتون جن کا نام ام خلاد تھا۔ آنحضرت کی خدمت میں اپنے بیٹے کا جو مقتول ہو چکا تھا۔ انجام دریافت کرنے آئیں اور وہ نقاب پہنے ہوئے تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے ان کی اس حوصلہ مندی پر تعجب کرتے ہوئے کہا "نقاب پہن کر اپنے بیٹے کا حال دریافت کرنے آئی ہیں"؛
انھوں نے اس کے جواب میں فرمایا کہ میرا بیٹا مرا ہے، میری حیا نہیں مری ہے۔
اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی کہ تمہارے بیٹے کو دو شہیدوں کا اجر ملے گا۔

انھوں نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوگا۔

رسول پاک نے فرمایا۔ اس لئے کہ اس کو اہل کتاب نے قتل کیا ہے۔

اسلام نے عورت کے درجے اور احترام کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ حقوق و آزادی بھی عطا کی۔ پردے کے تصور میں عورت کی غلامی نہیں بلکہ اس کے احترام اور حفظ و ناموس کا تصور کارفرما ہے۔ اسلام ایسا معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے۔ جس میں عورت کا احترام کیا جائے اور اس کی گود میں پرورش پانے والی نسل اسلام اور اسلامی تعلیمات کی علمبردار ہو۔

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کی مرسلہ ہر ماہ صرف ایک ایسی خبر شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال پُر ملال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھ کر اس طرح روانہ کی جائے کہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے ورنہ ایک ماہ بعد چھپے گی۔ خبر پر نمبر خریداری ضرور لکھا جائے اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھی بھیجے جائیں۔ خبر کی اشاعت کے سلسلہ میں کتابت کی غلطی کا ذمہ دار دفتر نہ ہوگا، البتہ اطلاع ملنے پر اس کی صحت شائع کر دی جائے گی۔

ولادت اطفال کی خبریں

- طلعت افروز و فیروزہ بیگم (آنولہ) میری پیاری بہن فریدہ رحمٰن نیازی (خریدار حریم) کے چمن حیات میں اللہ تعالیٰ نے چار سال بعد پہلی بار ۱۴ر جون ۹۰ء مطابق ۰ ر رجب المرجب صبح ۴ بجے ایک ننھا منا پھول کھلایا۔ نام محمد عثمان باری عرف مشہود رافع قرار پایا۔ دعا ہے کہ میرا ننھا بھانجہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور عمر دراز پائے۔
- بشریٰ جبیں (کلکتہ) میرے سب سے چھوٹے چچا سراج الدین قمر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے پانچ لڑکیوں کے بعد ایک فرزند ۹ر جون ۹۰ء کو عطا فرمایا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نومولود کو عمر طویل بخشے، اور فخر قوم و ملت بنائے اور والدین کے لئے قرۃ العین ثابت ہو۔
- نفیسہ کوثر (موتی پور) میرے بڑے بھائی محمد ہاشم سیٹھ صاحب اور بھابی ساجدہ ہاشم صاحبہ کے چمن حیات میں یکم جون ۹۰ء بروز جمعہ بمقام بنگلور ایک ستارہ طلوع ہوا۔ نام محمد قیصر سیٹھ قرار پایا۔ بارگاہِ الٰہی میں ملتجی ہوں کہ یہ ننھا ستارہ ہمیشہ تابناک رہ کر خاندان کا نام روشن کرتا رہے۔
- مس ریحانہ (پھلی گاؤں) میری پیاری اپی اور بہنوئی [illegible] صاحب کے گلشن حیات میں پروردگار عالم نے ۴ر فروری ۹۰ء اتوار کا دن گذار کر ایک بجے شب میں ایک پھول کھلایا۔ نام [illegible] اور پیار کا نام [illegible] قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ [illegible] والدین کے زیر سایہ پلے بڑھے اور صاحب نصیب ہو۔

پیغاماتِ نشاط

- عائشہ طلعت (کٹک) میری پیاری پھوپی اور آپ کے حریم کی پرستار خصوصی رابعہ لطیف صاحبہ کی شادی ڈاکٹر [illegible] فضل امین صاحب (فرزند دلبند جناب قمر الہدیٰ صاحب) کے ساتھ ۱۱ر جولائی ۹۰ء بروز بدھ بمقام بارہ بنکی اسٹیشن بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک ان کی ازدواجی زندگی کو ہمیشہ شادمانیوں سے دوچار رکھے۔ (مسز حنیفہ اے لطیف (دادی) [illegible] کی خدمت میں دلی مبارکباد میں بھی پیش کرتا ہوں۔ نسیم [illegible]
- میرے چچا زاد بھائی چودھری کاظم علی کی صاحبزادی [illegible] عزیزی چودھری اظہر حسین سلمہ (پسر جناب چودھری سید مظفر الدین صاحب مرحوم۔ انہونہ) کے ساتھ ۱۳ر جولائی ۹۰ء بمقام سلیماپور۔ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اس سلسلہ میں ۵ر جولائی کو برادران چودھری اظہر حسین سلمہ کی جانب سے ایک نہایت شاندار دعوت ولیمہ بمقام انہونہ [illegible] جس میں معززین اور اعزہ نے شرکت کی۔ افسوس کہ میں [illegible] کے باعث نہ سلیماپور جا سکا نہ انہونہ۔ بہرحال دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعاگو ہوں کہ دولہا دلہن ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔ (نسیم انہونوی)
- راشدہ خاتون (اندورہ) میرے عزیز بھائی محمد سعید [illegible] کی شادی خانہ آبادی، عذرا بیگم (بنت نسیم صدیقی صاحب مرحوم [illegible]) کے ساتھ ۱۶ر جولائی ۹۰ء بروز پیر بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ میری بھابی اور بھیا ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔
- عشرت احمد و ناہید احمد (پٹنہ سٹی) ہماری پیاری [illegible] حریم احمد جہاں زینت ایم۔ اے (دختر جمیل احمد صاحب سابق [illegible] اے۔ پٹنہ) کی شادی، منصور عالم صاحب ایم۔ ایس۔ سی (پسر جناب [illegible] رئیس چین پور) کے ساتھ ۱۰ر جون ۹۰ء بروز اتوار بمقام پٹنہ سٹی بحسن و خوبی انجام پائی۔ معززین ریاست دہلی، [illegible] اور شہر پٹنہ کی ایک کثیر تعداد نے شرکت فرمائی۔

جناب جمیل احمد صاحب [illegible] صاحب [illegible] جن کے [illegible] کا خیر مقدم کیا۔ اللہ پاک دولہا دلہن کی ازدواجی زندگی کو [illegible]

کی ازدواجی مسرتوں سے ہمکنار کرے۔

• عزیزہ شاہدہ (آمبور) میری پیاری نواسی ناصرہ تسنیم بنت عالیجناب [illegible] کی شادی ہمراہ عزیزی جمیل احمد (ابن عالیجناب عبدالکریم) کے ساتھ [illegible] بروز اتوار بخیر و خوبی انجام پائی۔ بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ دونوں کو تاحیات شاد و خرم رکھے۔ آمین

• آفتاب حاجی سفیر (جین پیٹن) میری بھانجی صغرا جہانی خبنا اختر (دختر نیک اختر عالیجناب ایم سعید الدین احمد صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی سکریٹری [illegible] کالیکال) کا عقد نکاح اقبال پاشاہ بی ایس او نز فرزند رشید فخرالدین صاحب میسور کے ساتھ ۱۳ رمئی [illegible] بروز اتوار بمقام شکروٹن [illegible] بحسن و خوبی انجام پائی۔ خدائے تعالیٰ سے دعا ہے کہ دونوں کی ازدواجی زندگی کو دنیا کی ساری مسرتوں سے بھر دے۔

انتقال پُرملال کی خبریں

• جناب مولانا ہاشم میاں فرنگی محلی (لکھنؤ) کی اہلیہ محترمہ ۲۲ راور ۲۳ رمئی [illegible] کی درمیانی شب میں اچانک انتقال فرما گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحومہ اپنے فرزند اقبال ہاشم سلمہ کو دیکھنے میڈیکل کالج گئی ہوئی تھیں۔ واپسی میں گھر کے قریب پہنچتے ہی ہارٹ اٹیک ہوا اور بیہوش ہوگئیں۔ ہاشم میاں صاحب قریبی مسجد میں تھے عین نماز کے وقت اطلاع ملی۔ لیکن آپ نے فریضۂ نماز کو مقدم سمجھا۔ نماز پڑھکر ہی حیران و پریشان گھر پہنچے اور فوراً میڈیکل کالج لے گئے، لیکن ڈاکٹر کچھ نہ کر سکے۔ تھوڑی ہی دیر میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ سب سے بڑی ٹریجڈی یہ تھی کہ۔ اسی اسپتال میں اقبال ہاشم سلمہ اس حالت میں تھے کہ انھیں اطلاع بھی نہ دی جا سکی کہ ماں کا آخری دیدار کر لیتے۔ اس لئے کہ ایسا کیا جاتا تو نہ جانے ان پر کیسا اثر ہوتا۔

میاں اچانک اپنی قدیم شریک حیات، ہر دل عزیز اور سلیقہ مند بیوی کو جدا کر کے گھر واپس آگئے۔ اتنا پرانا رشتہ تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ گیا۔ اس عمر میں ایسی رفیق حیات کی جدائی جتنی شاق ہو سکتی ہے اسے ہاشم میاں کا دل ہی سمجھ سکتا ہے۔ ان کی بزلہ سنجی ختم ہوگئی ہے اور وہ ایسی قابل رحم [illegible] کے غم و الم کا لبادہ اوڑھے نظر آتے ہیں۔ میں اس وقت [illegible] تھا۔ واپس آیا تو شدید علالت کے باعث فرش رہا۔ اس لئے [illegible] کی خبر کافی تاخیر سے ملی اس لئے اب اسے شائع کر سکا۔

نسیم اہلوی

• بیگم فرالنسا (جمیل دیوجکر) بعد دکھ و صدمے کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے اٹھارہ سالہ گبرو جوان منجھلے بھائی عزیز عبدالرحیم بریجکر کا ۱۲ رجون [illegible] کی شام کو ۶ بجکر ۲۰ منٹ پر اچانک پھسل کر کھاڑی میں گر جانے سے ڈوب کر انتقال ہوگیا۔ مرحوم کے غم میں میرے والدین اور ہم سبھوں کا حال تباہ ہے۔ مرحوم زبیر بیحد ملنسار، نیک سیرت کالج کے طالب علم تھے۔ تحریکی بہنیں دعائے مغفرت فرمائیں۔ (میں اور ادارہ حریم بھی اس افسوس ناک حادثاتی جوانا مرگی پر متاسف ہے۔

(نسیم اہلوی)

• نیرالنسا نثار احمد (اوٹاکمنڈ) افسوس صد افسوس کہ ہمارے بھائی محمد ابراہیم سیٹھ صاحب ۱۲ رفروری [illegible] کو اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم خوش مزاج، ملنسار اور دوسری بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے۔ (ڈیڑھ سال بعد خبر کی اشاعت سمجھ میں نہ آسکی۔ ادارہ)

• اسما عزیزی خاں (بختیار نگر۔ ملیح آباد) افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے دادا اور اتر پردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے صدر جناب عصمت ملیح آبادی کے جد بزرگوار اور جناب مائل ملیح آبادی و خان محمد عاطف صاحب ایم۔ ایل۔ اے کے پدر بزرگوار جناب عبدالقدیر خاں صاحب ۶ رجولائی [illegible] کو بمقام موضع حبیب پور بعمر ۱۰۰ سال انتقال فرما گئے۔ مرحوم قومی یک جہتی اور خلوص و محبت کی بہت سی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں۔ اللہ پاک میرے دادا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

• افضلی بی۔ ایم مانکوارب (شری وردھن) بڑے ہی افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرا بڑا ہی پیارا معصوم بھانجہ محمد شارق عمر صرف آٹھ ماہ ۵ رجولائی [illegible] بروز جمعرات بوقت ۱۰½ بجے دن چار روز کی علالت کے بعد اللہ کو پیارا ہوگیا۔ ماں کا غم و الم سے برا حال ہے۔ ایسی ہی اموات کے لئے کسی نے خوب کہا ہے

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

• یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ سر علی امام صاحب کی اہلیہ لیڈی انیس امام صاحبہ کا ۱۴ رجون [illegible] کو تقریباً اسّی سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحومہ عالم جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھیں اور اسی وقت سے انھوں نے بنی نوع انسان کی خدمت کو اپنا شعار

بنتا تھا۔ مرحومہ بہار کی پہلی مسلم خاتون تھیں جو سنہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء تک بہار کونسل کی ممبر رہیں۔ بہار میں اردو تحریک کی رہنما ہونے کی حیثیت سے مرحومہ نے دس لاکھ دستخطوں کے ساتھ آنجہانی راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند کو ایک یادداشت پیش کی تھی۔ غرض مرحومہ کی قومی و ملی صدہا خدمات ہیں۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے۔

(نسیم انہونوی)

لکھنؤ کے باکمال مزاحیہ شاعر

جناب جھنجھٹ لکھنوی ۲۶ جولائی ۸۲ء کو کسی زہریلے کیڑے کے کاٹنے سے انتقال فرما گئے۔ اس سے پہلے ان پر ہارٹ اٹیک بھی ہوا تھا اور اس وقت سے وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔

۲۷ جولائی بروز جمعہ نماز جمعہ کے بعد مرحوم کو عیش باغ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

جھنجھٹ مرحوم کا کلام دوسروں کو ہنساتا تھا لیکن اس روز وہی سب لوگ رو رہے تھے جو کبھی ان کی محفل میں مسکراتے اور ہنستے رہتے تھے۔

جھنجھٹ بڑے ہی سادہ طبیعت اور خاکسار المزاج تھے۔ امین آباد پاور ہاؤس کے نکڑ پر ان کی ایک چھوٹی سی چپلوں کی دکان تھی جس کے پٹرے پر ہر وقت کوئی نہ کوئی شاعر یا ادیب بیٹھا نظر آتا تھا۔ میں جب کبھی ادھر سے گذرتا دوڑ کر مجھے بلاتے اور چائے پلائے بغیر نہ اٹھنے دیتے۔

جناب عمر انصاری کو اپنا استاد مانتے تھے، جس کا اعتراف اپنے مجموعۂ کلام جھنجھٹیات میں انھوں نے اس طرح کیا ہے۔

استادوں کے استاد ہیں استاد ہمارے

افسوس کہ عمر انصاری صاحب اپنے اس شاگرد کی تدفین میں شریک نہ ہو سکے اس لئے کہ وہ فریضۂ حج بیت اللہ کے لئے جا چکے تھے۔ جھنجھٹ صاحب کا مجموعۂ کلام جھنجھٹیات ان کی شاعری کی یادگار ہے جسے مرحوم نے خود ہی شائع کرایا تھا۔ اس کے دیباچے میں مرحوم نے اپنا ایک شعر لکھا تھا۔

ہے نفس کی آمد و شد پہ مدار زندگی

دیکھنا ہے کب تک یہ سلسلہ زندگی

اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

ڈاکٹر منگلانی صاحب مجھے دیکھنے تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ باہر کوئی شخص کھڑا ہے وہ اندر نہیں آیا۔ میں نے سمجھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کا نوکر ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی وہ نہیں گیا۔ اس نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ میں نے اسے بلا لیا۔

میں نے سمجھا وہ کوئی پاگل ہے، لیکن وہ پاگل نہ تھا۔ اس کے پاس میرا ایک خط تھا، جسے اس نے احتیاط کے ساتھ رکھ چھوڑا تھا۔

یہ خط وہ مجھے نہ دکھاتا تو شاید میں اسے پاگل ہی سمجھتا رہتا۔ کئی سال قبل اس نے مجھے لکھا تھا کہ میں اس کی داستانِ حیات ناول کی شکل میں لکھ دوں، لیکن میں نے اپنی معذوری کا اظہار کر دیا تھا۔ واقعی میں اب ناول نہیں لکھتا۔ حسرت میرا آخری ناول تھا جو میں نے سنہ ۷۲ء میں لکھا تھا۔ لیکن شرافت کی باتوں نے مجھے مجبور کر دیا مجھے اس سے ہمدردی ہوئی اور میں نے اس کی کہانی بستر علالت ہی پر لیٹے لیٹے سنی اور پھر اسے اپنے ۱۲ روزہ قیام نینی تال ہی میں ناول کی شکل میں لکھ ڈالا۔ جس کا نام ہے - - - - - - -

آخری تمنا

شرافت اپنی کہانی کو کتابی شکل میں دیکھ کر اتنا خوش ہوگا کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اسے شادی مرگ نہ ہو جائے۔ وہ بڑی بے چینی سے اس ناول کا انتظار کر رہا ہے۔ جو اس کی تمنا پوری کرنے کے ساتھ ہی میرے ناولوں میں ایک کا اضافہ کر دے گا۔

اس ناولٹ کے دونوں کردار یعنی زبیدہ اور شرافت ایسے کردار ہیں کہ شاید آپ، جو کچھ ہوا اس کا یقین نہ کر سکیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ شرافت کا ایک ایک لفظ سچا تھا۔ اور ایسا نہ ہوتا تو میں اس کی تمنا پوری کرنے کے لئے یہ ناول نہ لکھتا۔

آخری تمنا

اگر کاغذ مل سکا تو امید ہے آخر ستمبر تک آپ پڑھ سکیں گے

نسیم انہونوی

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو، موزوں، سنجیدہ اور معیاری ہو، ساتھ ہی ہر تاریخ تک دفتر میں نمبر خریداری کے ساتھ وصول ہو گیا ہو۔
ستمبر کے لئے عنوان تھا "رات" اور اکتوبر کے لئے "رخصت"

سیاہ رات ہے سایہ تو ہو نہیں سکتا
یہ کون ہے جو مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

مرسلہ۔ سہیل ادیب شمسی

میرے آنگن میں جگنو بھی آتے نہیں
چاندنی رات تو دور کی بات ہے

مرسلہ۔ منصور بنازی (کلکتہ)

ختم ہونے کو ہے وہ ہم باشئے ستاں کی رات اب
آفتاب فکر[1] فسردا جلوہ گر ہونے کو ہے

مرسلہ۔ شہناز مجاہد (دارو

اے شمع ہم سے سوز محبت کے ضبط سیکھ
کم بخت ایک رات میں کیوں ساری جل گئی

مرسلہ۔ عالیہ لشاط (برہانپور)

کیا اعتماد وعدہ کہ کل آئیں گے چراغ جلے
تمام رات چراغوں سے دل کے داغ جلے

مرسلہ۔ نسرین فاطمہ (جاجمئو۔ کانپور)

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

مرسلہ۔ زبیدہ فضلی (رامپور)

رات یوں اس طرح سے اے دوست تری یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

مرسلہ۔ نسیمہ (میسور)

[1] پابندہ گوہر... [2] کل کی فکر

انھیں قمر کی کرنوں میں ... جانے لگا
اندھیری رات کے پردوں میں روشنی بھی ہے

مرسلہ۔ قمر لطیف نگار سلطانہ جلیلی (آمبور)

کیوں رات گئے تک جاگیں ہم، کیوں صبح تک بے چین رہیں
یہ چاند کا تکنا کس کے لئے، اشکوں کی روانی کس کے لئے

مرسلہ۔ عرفانہ منظور فرحانہ پروین (آمبور)

وعدے کی رات نیند نے فرصت انھیں نہ دی
افسوس جاگ کر مری تقدیر سو گئی

مرسلہ۔ سعیدہ محسن (بنگلور)

تاروں کے ٹوٹنے کی ادا ان کو بھا گئی
افشاں چھڑک چھڑک کے چھڑائی تمام رات

مرسلہ:۔ شکیلہ پروین (بلند شہر

اے رات کے سناٹے یہ راز بتا تو ہی
کیوں جسم سلگتے ہیں بھیگی ہوئی راتوں میں

مرسلہ:۔ نیلوفر (ہردوئی)

رات ان کو بات بات پہ سو سو دئے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں[1] نہ تھا

مرسلہ:۔ مسعود اختر صدیقی (سکندرپور۔ بلیا)

یاد میں تیری جاگ کر ہم
رات بھر کروٹیں بدلتے ہیں

مرسلہ۔ بی عظمت ترنم (آمبور)

فقط اس آسرے پر رات کاٹی شمع نے روکر
کہ شاید صبح تک زندہ مرا پروانہ ہو جائے

مرسلہ۔ نیلوفر گورے (بدلاپور)

نہ پوچھو رنج میں کیوں مسکرائے جاتے ہیں
اندھیری رات میں شمعیں جلائے جاتے ہیں

مرسلہ۔ مس زرینہ حبیب (بستی)

مہتاب کی بندی ماتھے پر قندیل سی روشن ہوتی ہے
جس رات میں تم آجاتے ہو، وہ رات سہاگن ہوتی ہے

مرسلہ۔ مسز نسیمہ ... پور۔ بھاگلپور)

[1] شک، خیال

"یہ کا برا فال منھ سے نکالت ہو۔ بڑی اماں: ماما عیدن نے اپنی کھونپو کی سی آواز میں تنبیہ کی:

اللہ دلھن بی کی آئی بلا ٹالے۔ یہ ہوا کا ہے۔ بتن میاں نے کچھ کہہ دیا۔؟ واہ بٹیا۔ کا اسی لیے تم کا نو مہینے پیٹ میں رکھ کے۔"

آپ سب لوگ امی کو کیسے جانیں گے: بھلا کر ا د ربھنا کر ایز د نے کہا "پوچھ لیجئے امی کہ اگر میں نے ایک لفظ بھی منھ سے پھوٹا ہو تو خدا مجھے کھڑے کھڑے غارت کر دے۔ بس:

اس نے کچھ نہیں کہا آپا: صالحہ بیگم اب اٹھ بیٹھیں اور گلوگیر آواز میں بولیں: میں نے اپنے سہاگ کی سلامتی کی خاطر اولاد کے قدموں پہ آنچل رکھ کے بھیک مانگی تھی۔ مجبور ہوں کسی پر زور نہیں ہے میرا۔ نہ اُن پر۔ نہ ان پر" پھر وہ آنچل میں چہرہ چھپا کر زار زار رونے لگیں۔

دیکھ لیو بٹیا: ماما عیدن نے حسب توفیق ایزد کو تنبیہ فرمائی: ای کا اولاد ہو۔ ماں کے قدم تلے جنت ہے... یہ بات اچھی نہیں بٹیا۔ اللہ ساب کے فرشتے ایک ایک اعمالوں کے حساب کتاب رکھت ہیں۔ ہاں۔ اتنا یاد رکھو:

امی سب پر لعنت بھیجئے: نگار کو بے حد غصہ تھا: آپ کو کسی سے کیا مطلب جانے دیجئے ابا جان کو اپنی راہ پر۔ اور اس ناخلف کو بھی اس کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ آپ چلیے میرے ساتھ میرے گھر۔ سچ کہتی ہوں میں۔ آپ کا یہی حال رہا تو پھر۔"

نہ اتنا رو یئے امی: ناصیہ نے اپنے آنچل سے صالحہ بیگم کے آنسو پونچھے اور بھیگی آواز میں تسلی دی: آپ ہی سے تو گھر کی صورت ہے۔ خدانخواستہ آپ کا دل [illegible] ہو گیا تو پھر سچ مچ گھر تباہی ہے۔ جی کو سنبھالیے۔ ابا جان کو وہ

نہیں آرہی۔ لائی جا رہی ہے۔!

حنا؟: ایزد نے دہرایا: نام تو شاعرانہ ہے۔ یا شاید یہ بھی کوئی بناوٹ پھر وہی بدگمانی؟:

اچھا یہ تو بتایئے۔ کیا محترمہ حنا کی بھی خواہش نہیں ہے کہ یہ شادی ہو۔ وہ بے چاری غریب بے زبان کیا چاہے گی؟۔

ٹھیک ہے: اس نے زہریلے لہجے میں کہا: ایک زبان دراز چارہ دار تھی کیا ہو وہ کر سکتی۔ اچھا اب جایئے۔ میں بھی آرہا ہوں۔ اجازہ کب اٹھ رہا ہے؟؟۔

پھر وہی۔ ایزد پیارے بھیا۔ میرا بھرم تو رکھ لو:

اگر آپ کے فائدے کی کوئی بات ہوتی۔ بھابی۔ تو میں آپ کی خاطر آگ میں پھاند پڑتا۔ کنوئیں میں چھلانگ لگا دیتا۔ اس منزل سے نیچے سڑک پر کود جاتا۔ لیکن یہ بات آپ کے فائدے کی نہیں ہے۔ میرے نقصان کی بات ہے۔ لہٰذا مجھے منظور نہیں۔ آپ کو ہرگز برا نہیں ماننا چاہیئے کہ میں نے آپ کا بھرم نہیں رکھا!:

ناصیہ سرنگوں کر واپس چلی آئیں۔

عصر کے بعد بارات روانہ ہوئی۔

شعیب صاحب نے ایزد کا سامنا نہیں کیا۔ صالحہ بیگم بھی بارات کے ساتھ نہیں گئیں۔ گھر پر دلہن کے استقبال کے لیے بھی تو ان کا قیام ضروری تھا۔ جب سے وہ بیہوش ہو کر گری تھیں۔ خود کو نہایت شدت سے کمزور اور مضمحل محسوس کر رہی تھیں۔ رات بھر کی جگار نے انہیں مزید چار کر دیا تھا۔

ناصیہ کے دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔
ایزد: ناصیہ کے لب کپکپانے لگے

بھابی: اس نے ناصیہ کی بانہہ پہ پیشانی ٹیک دی اور کسی ناقابل فہم احساس سے مغلوب ہو کر سسکیوں سے رونے لگا!۔

"نہ رو۔ بھیا" ناصیہ کا دل پانی پانی ہوگیا: تم گھبرا گئے ہو۔ میری سنو ایزد میں جھوٹ نہیں بولتی۔ تم سچ مچ اس کا چہرہ دیکھ کر خوش ہو جاؤ گے۔ میں تو تمہارا برا نہیں چاہتی۔ میرے کہے کا یقین کرو۔ یوں دل بھاری کرنے سے کیا فائدہ:

انھوں نے اپنے آنچل سے اس کے آنسو پونچھے۔ ایزد نے چہرہ اٹھایا — ویرانی اس کی آنکھوں سے برس رہی تھی۔

"کیا کچھ سوچا تھا میں نے۔ بھابی۔ یہ تو خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ مجھے اس طرح جبر کی صلیب پر مصلوب ہونا پڑے گا:

اس وقت تمہارا دل اداس ہے۔ ایسا سوچ رہے ہو۔ لیکن کیا دنیا میں یہ ہوتا نہیں ایزد۔ خود کو ہشاش بشاش رکھنا سیکھو۔ میرے بھائی!:

ناممکن ہے: وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا: میرے دل سے یہ خیالات نہیں نکل سکتے۔

سے دیکھو گے تو پھر ایسا نہیں کہو گے!:

کیا دیکھوں گا۔ باسی حسن۔ جس کی دید سے پہلے ہی کسی کی آنکھیں سیراب ہو چکی ہیں۔ خیر۔ بھابی جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ آپ مت گھبرائیے:

امی کا خیال رکھو۔ ایزد وہ تمہاری کسی حرکت سے زندہ نہیں بچیں گی۔

ناصیہ نے خوشامد سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا: اور خدا کے واسطے کچھ زہر کھا کے سامنے کبھی نہ اگلنا۔ اس کا کچھ تصور نہیں۔ وہ خود سے اس گھر میں

بلانے گئے ہیں۔ آتے ہوں گے۔ اور آپ نے ایزد کو اتنا سنگدل، ظالم اور بے مروت کیسے سمجھ لیا ہے کہ وہ آپ کی سی شفیق ماں کا حکم نہ مانے گا۔ نہیں امی نہیں۔ آپ اپنے کو قابو میں رکھیے۔ اللہ سب ٹھیک کر دے گا:

کفیل ہانپتے کانپتے اوپر آئے۔ ان کے ساتھ خرم بھی تھے!۔

آئے ابا جان؟: چھوٹتے ہی ناصیہ نے پوچھا۔

ارے بھابھی جونک بن کر کفیل میاں چمٹ گئے ان کے: خرم نے ماحول کی سنجیدگی کو اپنی بذلہ سنجی سے گوارہ بنالیا: آپ دیکھتیں وہ کشمکش تو بے ساختہ ہنسی آجاتی۔ کفیل میاں لپٹ گئے ابا جان سے۔ ادھر وہ زور لگا رہے ہیں چھڑا کر بھاگنے کے لیے۔ ادھر یہ حضرت اپنی طاقت صرف کر رہے ہیں گھر واپس لانے کے لیے۔ واللہ سچ کہتا ہوں کہ راہگیر جمع ہوگئے اور کفیل صاحب سے پوچھنے لگے کہ کیا آپ کا کچھ ادھار ان صاحب پر نکلتا ہے جو اس طرح سر بازار آپ لوگ گتھ گئے ہیں؟:

اللہ خرم بھائی۔ یہ بتائیے ابا جان واپس بھی آئے: ناصیہ نے پوچھا۔

واپس کیسے نہ آتے۔ میں بھی تو لپٹ گیا تھا: خرم نے یوں کہا کہ کفیل وغیرہ کو بے ساختہ ہنسی آگئی:

ایزد میاں۔ اب ضد چھوڑ دو۔ پلیز: خرم نے ایزد کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا: میں نے تمہیں اس وقت تک نہیں سمجھایا۔ لیکن اب پہلی اور آخری مرتبہ سمجھاتا ہوں کہ خودسری اتنی بھی اچھی نہیں۔ تم گھر میں سب سے چھوٹے ہو تمہارے مقابلہ پر تم سے بڑے ہیں۔ ان کی عدول حکمی کرنا ویسے بھی کوئی شریفانہ فعل نہیں ہے لیکن ماں کی دل شکنی کرنا تو گناہ ہے۔ اب تو حد ہوگئی ہے کہ ماں نے اپنا مقدس آنچل جس پر فرشتے نماز پڑھتے ہیں۔ تمہارے قدموں پر

رکھ دیا۔!!

ایزد نے سر جھکا لیا۔

چلیے نیچے چلیں: خرم نے صالحہ بیگم کا بازو تھام کر محبت سے کہا: آپ سب نے بیکار بات اتنی بڑھا لی۔ معاملہ اتنا سنجیدہ نہیں تھا۔ اب چل کے تیاری کیجئے۔ وقت کچھ نہیں ہے۔!"

پہلے بتن میاں سے آخری مرتبہ اور پوچھ لیو کھرم میاں: ماعیدن بولیں۔

اب اور کیا پوچھنا ہے۔؟" خرم نے بے حد تعجب سے کہا۔

جائیے۔ آپ لوگ تیاری کیجئے۔ اب مَیں کچھ نہیں کہوں گا: ایزد نے کہا۔

اور اس طرح یہ بیل منڈھے چڑھی۔! شعیب صاحب رو ٹھے دولہا کی طرح۔۔۔ اپنے کمرے میں لیٹے تھے ان سے کسی نے کچھ کہا بھی نہیں خرم اور کفیل عورتوں کو ساتھ لیکر شاپنگ کے لیے چلے گئے!۔

ماعیدن، آپا ذاکرہ اور صالحہ بیگم باورچی خانے میں آبیٹھیں۔ ان لوگوں کی گول میز کانفرنس یہیں ہوتی تھی۔ صالحہ بیگم کے غم آلود چہرے پر فکروں کی پرچھائیاں اب لرز رہی تھیں۔

"میرا دل تو مطمئن نہیں ہے: انھوں نے کہا: باپ کی زبردستی سے اور میری التجا سے وہ راضی تو ہو گیا ہے۔ مگر بہو کو دیکھنا کر خوش نہ رہے گا۔ پرائی لڑکی کو خوش رکھ بھی نہ سکے گا:

ابھی سے کیوں ایسی بدشگونی کر رہی ہو: آپا ذاکرہ نے منہ چھیلتے چھیلتے کہا: ابھی تو تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ بہتیروں کا مجھے تجربہ ہے کہ شادی سے پہلے یونہی ریاں تڑاتے ہیں مگر جہاں بیوی کا چاند سا مکھڑا دیکھا کہ اس کے غلام ہو گئے: وہ ہنس پڑیں۔ اے ہمارے بے حیا نکٹے مار بخش کو دیکھ لیو۔ بڑی اماں: ماعیدن نے

مذاق ہو گا۔ لیکن یہاں تو پانسا ہی پلٹ گئی۔ اب سب کے سب دلگرفتہ رنجیدہ اور شرمندہ تھے!۔ ایزد گرم گرم چائے زبردستی حلق میں انڈیل کر پھر اوپر چلا گیا بے حد خوش تھا۔ اس نے ان سب کو مغموم کر دیا تھا۔ پچھتاوے میں مبتلا کر دیا تھا۔!! اس کا احساس فرحت سے لبریز تھا!

ان سب کو احساس ستانے لگا۔ حقیقت میں یہ رشتہ بے جوڑ تھا۔ بہت احمق بنے تھے یہ لوگ۔ ان کے دل خوف سے پُر تھے۔ انجام اچھا نظر نہیں آرہا تھا۔

لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا!۔

دوسرے دن شادی تھی۔ ایزد بالکل گم صم تھا۔ خدا جانے اس نے دل میں کیا سوچ رکھا تھا۔ خاموشی سے نہا دھو کر نیا لباس پہن لیا۔ جو ناصیہ لے کر گئی تھیں۔ ایزد پر جب کبھی بھوت سوار ہوتا تو وہی اس کے سامنے جاتی تھیں۔!

ایزد کے ہونٹ پر ہونٹ چپکے دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا۔ یقیناً طوفان کی آمد آمد سے پہلے کا سناٹا تھا یہ۔ انھوں نے اس کے روکھے روکھے بالوں میں اپنی انگلیاں الجھا کر اس کا چہرہ اپنی طرف پھیرا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اسے پھٹکاریں گی۔ لعنت ملامت کریں گی لیکن۔ وہ گم ہونے لگیں۔ ایزد نے پلکیں جھپکا کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ تب ناصیہ نے دیکھا کہ حسرتوں اور مجبوریوں کی خشک وادیوں میں ریت کے بگولے چکرا رہے تھے کہیں کوئی ننھی سی کونپل نئے نئے ارمان کی نہ تھی۔ دور دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا!! ناصیہ کا قلب الٹنے لگا۔ اب کیا کہنا تھا اس سے۔ وہ تو زبانِ حال سے اپنی مجبوری کا نوحہ سنا رہا تھا!۔

اپنے صاحبزادے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا: شادی سے پہلے کیسا جھگڑا کرتے تھا ہم سے۔ اب دیکھو تو یہ حال ہے کہ بے غیرت اسی موئی جُرورا کے تلوے دھو دھو کے پیا کرے ہے۔ اماں نعیبوں جلی کو الٹے کے نہیں پوچھا کہ ری ہو کہ جی ہو!:

ایزد پر مجھے بھروسہ نہیں ہوا: صالحہ بیگم نے آہ بھر کر کہا: اس کا مزاج بڑا خراب ہے۔ غصہ ناک پر دھرا رہتا ہے۔ کسی سے سیدھے منہ نہیں بولتا:

تم بھی دلھن بی! اپنے پیٹ کی اولاد کی برائی کرتی ہو: آپا ذاکرہ نے کہا۔

اس میں برائی کیا ہے۔ بس بچھوؤں کی طرح دانت نکالے نہیں رہتا:

اچھا خیر: صالحہ بیگم نے کہا: گھوڑا دور نہ میدان۔ دیکھ لیجئے گا:

ایزد نیچے نہیں اترا۔ رات کے کھانے تک اوپر ہی بیٹھا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ اس کے خیالوں کی دنیا میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔! کل پرسوں وہ بک جائے گا۔ ایک ناپسندیدہ ہستی اس پر زبردستی مسلط کر دی جائے گی۔ پھر اسے شعیب صاحب پر سخت ترین غصہ آیا۔ جنھوں نے ہر طرح کی یقینی اپنی جانی روحانی، بربادی قبول کر لی تھی۔ شکست کھا گئی تھی۔ اور پھر بھی اپنی ضد پر اڑے رہے لیکن وہ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ چار روگوں میں ناک رہنے کی بجائے ناک کٹ گئی۔ ڈر کے مارے روپیہ بھی ادا کیا اور کان دبا کے لڑکی بھی لے آئے۔ کیا آئن ہے صاحب!

اسے حماقت اور بزدلی کہتے ہیں۔

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اور سگریٹوں کے ٹکڑوں کے پھول اس کی راہ میں زیادہ سے زیادہ بکھرتے گئے۔ دن گزرا۔ رات سر پر بلائیں لائی۔ گھر میں شور برپا تھا اس رات سوتا کون؟ دالان میں قیمتی ملبوسات بکھرے پڑے تھے۔ نگار نے بہت اچھے گہنے خریدے تھے۔ ایک طرف ناصیہ ڈھولک سنبھالے بیٹھی حلق پھاڑ رہی تھیں۔ رعنا کی آرزو دل کی دل میں رہ گئی تھی کہ وہ محلہ بھر کی سہیلیوں

کو ہم کیا کیا خرید لائے ہیں!۔ سچ پوچھو تو ہمارا ہی جگر تھا کہ صرف ایک دن میں جہیز بھر کا کام سمیٹا ہے:

یہ کوئی کام آپ سے وابستہ نہیں تھا: ایزد نے بدستور سرد مہری سے کہا آپ اپنی غرض اور غلطی کا تاوان بھگت رہی ہیں۔ مجھے اس سے کیا سروکار؟

ایزد تم فضول باتیں تو کرو نہیں۔ نگار کو غصہ آنے لگا۔

معاذاللہ۔ یہ کیا جھگڑا شروع ہو گیا ہے: خرم نے گھبرا کر کہا: یہ تو گویا کسی رزمیہ شاعرے کا دور ثانی ہے۔!"

آؤ ایزد دیکھو۔ یہ لباس اور زیور کیسے ہیں: ناصیہ نے بات کا رخ موڑ دیا: سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اتنے قنوطی، بیزار اور مردہ دل کیوں ہو:

فضول سمجھتا ہوں۔ اس تمام ڈھکوسلے کو۔ بھابی: ایزد نے کہا۔

کیا مطلب؟: ناصیہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کو بھی مستعمل اترن اور سیکنڈ ہینڈ ہونا چاہئے تھا کیونکہ بنیادی چیز مستعملہ ہے: ایزد نے سفاک لہجے میں کہا۔

وہاں سناٹا چھا گیا۔

ایزد اب بے رحم انداز میں ہنس رہا تھا: لیکن اس میں ملال کرنے کی کوئی بات نہیں۔ ورنہ اظہار ملال کے ساتھ ہی میرے باپ بھی فلمی باپ کی طرح گھر چھوڑ کر بھاگ جانے اور والدہ پر غشی کا فرضی دورہ پڑ جائے گا! اس نے قہقہہ لگایا: اب تو میری خوشی کا یہ عالم ہے کہ بس آپے سے باہر ہوا جا رہا ہوں۔ کیونکہ میں تو خدا کے فضل سے ایک بچے کا باپ بھی مفت میں بن رہا ہوں:

خرم اسے اس محفل میں لاکے پچھتا رہے تھے۔ ان کا منشا تھا کہ کچھ ہنسی

کو کتھا کرے گی ۔ بہرحال ماما عیدن کے سامنے صرف دو گلوکار بیٹھے ان کی پھٹی
بانس کی سی آواز بیں مشرق اور مغرب کی طرف جاتی ہوئی آوازیں ملار سے تھو
یہ بھیے ہوئے گلوکار شارق اور رعنا تھے ۔ شارق فراخدلی سے تالیاں بھی بجاتا
جاتا تھا ۔ رعنا کے شریر قہقہے بھی رہ رہ کر گونج رہے تھے ۔ لیکن آج اسے کوئی
ٹوک نہیں رہا تھا ۔

ایزد اپنے کمرے میں چھپا اندھیرے میں بجتا ہوا ٹرانسسٹر سن رہا تھا ۔ نجانے
کس نے یہ بدعت کی تھی ۔ بہرحال گیت اس کے حسب حال تھا ۔ نور جہاں کی پرسوز
آواز اسے رلا رہی تھی ۔

آجا ۔ آجا مری برباد محبت کے سہارے
ہے کون جو بگڑی ہوئی تقدیر سنوارے

انجام محبت ہمیں معلوم ہے لیکن
لیتے ہیں ترے غم میں امیدوں کے سہارے

تھا دل کو فقط تیری محبت کا سہارا
ہم نے اسی امید پہ دن اپنے گزارے

ہے کون جو بگڑی ہوئی تقدیر سنوارے
آجا ۔ آجا — !

وقت اور ماحول انسان پر یقیناً اثر انداز ہوتے ہیں ۔ ایزد کے پتھر دل سے
چشمہ پھوٹ پڑا ۔ اور آنکھوں سے سیل اشک بہہ نکلا !
اس نے خود کو دھاڑیں دینے کی کوشش بھی نہیں کی ۔ دل بھر کر رو دیا اور
پھر وہ سیلاب اشک اسے دوسرے جہان میں بہا لے گیا ۔ !
کون اندازہ کر سکتا تھا کہ باوجود اپنی تمامتر سخت گیریوں کے مرد شمس

کہاں کا سونا سونا لگایا ہے یار ۔ اب جاگنے کی پریکٹس کرو " وہ بدمعاشی
سے مسکرائے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا " یا پھر اگر حسین خواب دیکھ رہے
اور سوتے میں شراب وصل چکھ رہے تھے تو پھر میں معذرت چاہتا ہوں "
" جی نہیں آپ کے سارے قیاسات غلط ہیں ۔ بس میں سو ہی رہا تھا ! "
" اچھا تو اب چلو میرے ساتھ "
وہ محفل میں آیا اور رنا چھا گیا ۔ رعنا اور شارق دبک گئے ۔ آپا ذاکرہ
کی چہک بند ہو گئی ۔ نگار نے برا سا منہ بنا لیا ۔ کیفی نے البتہ کہا ۔
" ارے بھئی زیتون ۔ چائے ایک مرتبہ اور بنا لاؤ ۔ لیکن وہ گھنٹہ بھر پہلے
کی سی نہ ہو جیسے تم شربت لے آئی تھیں چائے کے نام پر "
" ابھی لائی بڑے بھیا ! " وہ بولی پھر ٹھنک کر وعدہ لیا " مگر پھر آپ
ہمیں وہ گیت گانے دیجئے گا ۔ بھائی ہمارے ہو گئے بھابی کے دیوانے ۔ اللہ "
" اچھا اچھا گا لینا " کیفی نے کہا " اب ہم بھی ہونے والی ہے ۔ بھئی واہ
سوا تین ہو رہے ہیں "
" میرے لیے چائے مت بنوائیے " ایزد نے بے رخی سے کہا " میں سوؤں گا
میرے سر میں درد ہے ! "
" لیٹ جاؤ میرے گھٹنے پر ۔ میں سر دبا دوں ۔ ؟ " بوا عیدن چمکار کر
بولیں ۔
" دراصل آپ کے ڈھولک نے یہ درد پیدا کیا ہے " ایزد نے کہا " خواہ مخواہ
کیوں آپ سب کی نیندیں حرام کر رہی تھیں "
" لا حول ولا قوۃ ۔ شروع کر دیں کج بحثی کی باتیں " بوا نے جھڑک کر کہا " یہ
تو تمہیں توفیق نہیں ہوئی کہ ہماری خوشی میں شریک ہوتے ۔ یا تو آ کے دیکھتے

کی یادوں میں جوں کی توں آباد تھی۔ ہزار چاہنے پر بھی وہ اسے فراموش کر دینے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔!

مہ وش اس کی زندگی تھی۔ اس کی رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہی تھی۔ اس کی نبض حیات اس کے دم سے قائم تھی۔ اس کی حیات کی تمام دلچسپیاں اس کے وجود سے عبارت تھیں۔ وہ اسے بھلا نہ سکا تھا۔ چپکے چپکے یاد کیا کرتا تھا اور اب جبکہ وہ اس سے بالکل دور ہونے والی تھی تب اپنی تمام تر محبتوں سمیت اسے اپنی یاد شدت سے رلانے آگئی تھی۔

وہ بے قرار ہونے لگا۔ کاش ایسا ہوتا کہ وہ اس سے مل سکتا!۔ کم سے کم اسے باور تو کراتا کہ اس نے ایزد پر ہمیشہ ظلم کیے ہیں۔ لیکن وہ اپنے وجود کی گہرائیوں سے اسے چاہتا رہا ہے۔!

اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ باہر بھی اندھیرا تھا۔ فضائیں تاریک تھیں جیسے رات نے اپنی آنکھوں میں ڈھیروں کاجل لگا رکھا ہو!۔ اندھیاروں میں مجسم وہ بھی اپنی سیاہ بختی سمیت ایک داغ بن گیا تھا۔!

البتہ نیچے گھر میں چراغاں ہو رہا تھا۔ وہاں پر مسرت قہقہے تھے گیت تھے شوخ نقرے تھے۔ رات کا پتہ نہیں کون سا وقت تھا لیکن نیند کسی کی آنکھوں میں نہ تھی۔

ایزد کے سینے سے ایک گہری سانس نکلی۔

کل اسے زبردستی پھانسی دے دی جائے گی۔!

اپنے آپ پر اسے غصہ آنے لگا۔ شعیب صاحب کی تو اس نے ایک نہ سنی تھی۔ لیکن صالحہ بیگم کی اچانک بیہوشی سے بری طرح ڈر گیا تھا۔ کیا ہوتا اگر خدا نخواستہ

جز آپ کی وضاحت کی ضرورت بھی نہیں ہے" کفیل نے کچھ جھینپ کر کہا۔ "یہی تو میں کہتا ہوں کہ ایسے لوگوں کو جو ہر وقت رشتے ناطوں کا اعلان کرتے پھریں۔ شرفاء کے مجمع میں آنا ہی نہیں چاہیئے۔!"

"ایزد کو بلایئے یہاں امی" خرم نے کہا "ان سے باتیں کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ رعنا بیٹی جا کے انھیں بلا تو لاؤ۔!"

"اماں۔ میں تو نہیں جاتی" رعنا نے گال تھام لیے۔

خرم نے والان کے سرے پر آکر ایزد کو آوازیں دینی شروع کیں۔ جب وہ گونگا بنا کھڑا ہی رہا تو وہ پچھلے زینوں کی طرف۔ ایزد دبے چپکے سے بستر پر آ لیٹا۔ اور اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے بے خبر سو رہا ہو۔ لیکن خرم نے اسے جھنجھوڑ ڈالا "اٹھو۔ نہیں تو پلنگ کھڑا کر دوں گا۔ صاحب۔ ہماری شادی تھی تو آٹھ دن پہلے ہی سے ہماری نیند اڑ گئی تھی۔ تم نے کتنی افیون کھائی ہے کہ عیدن نائن کا ڈھول بھی تمہیں جگا نہ سکا۔۔۔!! اماں۔ اب اٹھتے ہو کہ کھڑا کر دوں پلنگ"

انھوں نے کمرے کی سب روشنیاں آن کر دی تھیں۔ مجبوراً ایزد کو پلکیں جھپکانی پڑیں۔

"فرمائیے:"

مجھے کچھ نہیں فرمانا۔ میاں۔ میرے ساتھ چلو اور کچھ تو اپنی ماں بہنوں کی۔۔۔ خوشیوں میں حصہ لو۔ اللہ میاں نے اپنی مخلوق کی تین چوتھائی سنجیدگی تمھارے مقدر میں لکھ دی ہے۔ کبھی ہنستے بھی ہو کہ نہیں۔ واللہ سچ کہتا ہوں کہ میں نے جب سے سسرال میں ہوش سنبھالا ہے۔ تمھارے دانت نہیں دیکھے:

کیا کروں گا نیچے چل کے" وہ ان کی بکواس کے جواب میں بولا "بہت دیر تک ڈھولک نے سر میں درد پیدا کر دیا تھا۔ مشکل سے سویا ہوں:"

انھیں کچھ ہو جاتا۔ اس وقت کیا ہوتا۔ اگر۔ وہ کسی کو صورت دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ چور بن جاتا۔ یا شاید گھر ہی سے بھاگنا پڑتا ہے۔ محض بے ہوشی ہی میں نگار کی وہ حالت تھی کہ انھوں نے اسے دنیا بھر کی لعنت ملامت کر کے رکھ دی تھی!۔ اس کا خوف اس کی کمزوری اس کی شکست بن گیا تھا۔

اس نے جالی دار منڈیر سے جھک کر دالانوں کا جائزہ لیا۔

دالان تیز روشنیوں والے بڑے بلب آن تھے۔ سفید چکتے ہوئے فرش پر ان گنت جگمگاتے ہوئے ملبوس سجے ہوئے تھے۔ تقریباً خاندان بھر یہاں اکٹھا تھا۔ البتہ نجیب صاحب نہیں تھے!۔ خرم اور کفیل کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ نگار اور ناصیہ سامنے ہی بیٹھی تھیں۔ ان کے مخلص پُر محبت چہرے قلبی مسرت کے آئینہ دار تھے۔ گاؤ تکیہ سے لگی آپا ذاکرہ بیٹھی تالیاں بجا رہی تھیں اور پوپلے منہ سے گا بھی رہی تھیں۔

حضرت بی بی کے پیارے جی۔ میرے پیر دستگیر۔

بچے ان کی آواز اٹھا رہے تھے۔ اور بوا عیدن بے تکان ڈھول پیٹ رہی تھیں۔ البتہ صالحہ بیگم کا بوڑھا چہرہ فکر و تشویش کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ویسے وہ کوشش یہی کر رہی تھیں کہ بے فکر و مسرور دکھائی دیں۔! لیکن اپنی کوشش میں وہ کامیاب نہیں تھیں!۔

بھئی کان کھا لیے بوا عیدن: کفیل نے کہا۔ اور پھر آواز بڑھا کر بولے: اب کچھ دیر کے لیے یہ گانا بند کیجئے۔ بوا جی۔ آپ بھی دیکھئے۔ یہ زیور اچھے تو ہیں نا یا پھر ایک آدھ اور خرید ا جائے کل۔

خدا خدا کر کے ڈھول کی دھڑ دھڑ ختم ہوئی۔ بوا جی اپنی انگلیاں دباتی آگے کھسکیں اور ناقدانہ انداز سے وہ زیور دیکھائیں جو کفیل دکھاتے گئے۔ ان

پر تبصرہ فرمائی گئیں۔

دلھن کا منہ دیکھ کے دولھا کا بخرانہ دے گا؟: انھوں نے پوچھا مسکرائیں۔

جی ہاں دیکھئے۔ یہ دو چیزیں بیاں تا: کفیل نے فوراً دو خوشنما کیس ان کے آگے سرکا دیے: ایک یہ کلائی گی گھڑی کا ہے اور دوسری یہ انگوٹھی ہے۔ کیا کریں نانی عیدن۔ ہم جو کچھ چاہتے تھے وہ ہو نہ سکا۔ عین وقت پر رقم کی کمی ایسی کچھ ہو گئی کہ بس۔ دلیمے کے اخراجات وضع کر کے یہی لا سکے ہیں!:

بِٹیا یہ بہت ہے۔ البتہ میاں جم جم پہننا اوڑھنا نصیب فرمائیں: انھوں نے فراغت اور قناعت سے بلکہ کفیل کو تسلی دینے کے لیے کہا: پھر اور موقع جب آئیں تب دیکھنا۔ ارے ہاں اور کا۔ اب ماشاءاللہ سے بچے بالے چل گئے اگلی ریت رسمیں۔ حقیقۃً، بسم اللہ اور ماشاءاللہ میاں تمھیں نیکی دیں:

یہ تو بعد کی چیزیں ہیں: ناصیہ ہنس کر بولیں: پہلے تو یہ کہیئے کہ چھٹی چھلا اور آنے گئے کی دعوت:

بھئی یہ کیا لغویت ہے: خرم نے صالحہ بیگم کے پہلو میں پھیل کر لیٹتے ہوئے کہا: ہم سب یہاں جمع ہیں۔ اور انہو کو تنہا چھوڑ رکھا ہے۔ انھیں بلا دیئے نا کفیل صاحب!:

یہ کیا ہر وقت آپ بھائی جان کو کفیل صاحب کہتے ہیں: نگار نے چیخ کر کہا۔ رشتہ بڑا ہے آپ بھی بھائی جان کیوں نہیں کہتے؟:

رشتہ بڑا نہیں ہے۔ خطرناک ہے: خرم نے کہا: میں تو رحم کرتا چلوں۔ کفیل صاحب ہے۔ اگر ملانہ کہتا پھر دل کہاں کا میرا کیا رشتہ ہے تو بتاؤ ان کا کیا رہے؟:

The Hareem Lucknow August. 1979 (Phones : 44559-45334) Regd. No. LW/NP 32

Sept..79
Rs. 1/-
ایڈیٹر

ٹیلی فون نمبر آفس :- ۴۴۵۵۹

ٹیلی فون نمبر رہائش :-

گزشتہ ۴۸ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اور
اردو میں ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے۔

جلد ( ) نمبر (۹)

ماہنامہ حریم لکھنؤ

اڈیٹر و نگراں
نسیم انہونوی
معاونین
شوکت جہاں بیگم غزالہ
جانی بیگم ردولوی

بیادگار
سید محمد سلیم انہونوی مرحوم
و
شفیق النساء
بیگم سلیم انہونوی مرحوم

فہرست مضامین

ماہ ستمبر ۱۹۷۹ء

قیمت سالانہ

اٹھارہ۔ منی آرڈر سے اکیس روپیہ، مخصوص خریداری۔ منی آرڈر سے۔ انیس روپیہ، معمولی خریداری۔
منی آرڈر سے سولہ روپیہ، وی، پی سے پرچہ منگانے پر تین روپیہ زائد۔ فی پرچہ۔ ایک روپیہ غیر ممالک سے بقدر ۲۲ روپیہ
یا دو پونڈ برائے سی۔ میل۔ ائیرمیل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں۔
آفس اور ترسیل زر کا پتہ :- نسیم بک ڈپو ـــــ لاٹوش روڈ ـــــ لکھنؤ
نسیم انہونوی مالک و ناشر۔ پرنٹر۔ سرفراز قومی پریس ـــــ لکھنؤ

اس ماہ اپنی علالت کے تحت لمعات نہ لکھ سکا، اس لئے مسز شمیم صادق صاحبہ لاہور کا ایک مضمون ذیل میں شائع کر رہا ہوں، جس کا عنوان "غیر ذمہ دار شوہر بیوی کے لئے سب سے بڑا عذاب ہے" مضمون یقیناً قابل توجہ ہے اور والدین کو چاہیئے کہ وہ اب صرف بیٹیوں ہی کو رفاقت، وفاداری، خدمت گذاری اور ضبط و برداشت کے سبق نہ پڑھائیں، بلکہ لڑکوں کو بھی ان کے فرائض سے آگاہ کریں۔ واقعی اسی بدلے ہوئے زمانے میں عورتوں کا گائے بنکر رہنا آسان نہیں ہے اور ازدواجی زندگی کو جنت بنانے کے لئے ضروری ہے کہ شوہر بھی بیوی کا پاس و لحاظ کرے۔ اسے کنیز سمجھ کر نہ رکھے۔ نسیم انہونوی

شادیوں کی ناکامی یا فریقین میں شکر رنجی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں مردوں کو کامیاب ازدواجی زندگی گذارنے کی تربیت نہیں دی جاتی۔ اس اہم ترین رشتے کے استحکام اور بقاء کے لئے مردوں کو اس کی تربیت دینا بہت ضروری ہے اور اس کے لئے کوئی ادارہ قائم کرنیکی ضرورت نہیں ماں اپنی ذات میں وہ موثر ترین ادارہ ہے جو مردوں کو یہ تربیت بحسن و خوبی دے سکتی ہے۔

خرابی کی جڑ یہی ایک صدیوں پرانی سوچ ہے کہ شادی کی کامیابی کی تمام تر ذمہ داری عورت پر ڈال دی جاتی ہے اور عورت سے توقع کی جاتی ہے کہ مرد چاہے کیسا ہی ہو عورت اس سے ہر حال میں نباہ کرے۔ شوہر آوارہ ہو، ادھر اُدھر تانک جھانک کرتا ہو نکما ہو یا دوسری قبیح کا مرتکب ہوتا ہو تو بزرگ کہتے ہیں "شادی کر دو راہ راست پر آجائے گا بیوی کی محبت ملے گی تو ٹھیک ہو جائے گا" گویا عورت کو آنکھوں دیکھی مکھی نگلنی پڑتی ہے بلکہ معاشرہ کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اسے خوشی خوشی ہضم بھی کرے۔ اور خدا کا شکر بجا لائے کہ وہ خیر سے سہاگن ہے۔

مرد آوارہ۔ بدچلن اور شرابی ہے تو عورت سے توقع نہیں کی جاتی بلکہ حکم صادر کیا جاتا ہے کہ اپنے اندر حوصلہ، ضبط اور شوہر کی مزید خدمت گذاری کا جذبہ پیدا کرے۔ جب عورتوں کے لئے سارے در بند ہو جائیں تو صبر کا یہ مشورہ احمقانہ، ظالمانہ یا بدنیتی پر مبنی نہیں۔ بلکہ حالات کو سدھارنے کی یہی ایک تدبیر رہ جاتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر وہ کون سے سماجی ضوابط ہیں جو صرف عورتوں میں صبر۔ حوصلہ اور درگذر کی عادت پیدا کرنے کی تعلیم کرتے ہیں اور مرد کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ کیا یہ سنہری عادات مرد کے لئے ضروری نہیں؟

کتنے فی صد مرد ایسے ہیں (فلمی کہانیوں اور سستے ناولوں سے ہٹ کر) جو جانتے بوجھتے ہوئے کسی ناشائستہ اور ناپسندیدہ عادات رکھنے والی لڑکی کو اس لئے بیاہ لائیں کہ وہ شادی کے بعد گھر کا سکون پاکر از خود ٹھیک ہو جائے گی۔ بلکہ کسی لڑکی کے متعلق بے پرکی اڑا دی جائے تو سمجھئے کہ اس کی آئندہ زندگی غارت ہو کر رہ گئی۔ بیاہ کر لانے کی بات تو دور رہی لوگ اس کا نام لینا بھی پسند نہیں کرتے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ یا تو عورتوں کو آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے پر مجبور کیا جائے یا مردوں میں بھی ایسا ظرف پیدا کیا جائے کہ وہ بھی ناپسندیدہ عادت کی مالک لڑکیوں کو نہ صرف دل سے قبول کریں۔ بلکہ بیویوں کے تمام تر عدم تعاون کے باوجود انھیں شادی کو کامیاب بنانے پر مجبور کیا جائے۔

لڑکی ذرا ہوش سنبھالتی ہے تو ماں کھیل ہی کھیل میں اسے آئندہ ازدواجی زندگی کے مشکل مرحلوں کو طے کرنے کی تربیت دیتی رہتی ہے اور جوان ہونیکے بعد تو اس کا ہر عمل ہر حرکت اس پیمانے پر ناپی جاتی ہے کہ شادی کے بعد کہیں اس کی کوئی عادت شوہر کو ناگوار نہ گذرے یا اس کی رضا اور خوشنودی کے خلاف نہ ہو۔ مگر کیا کبھی کوئی ماں اپنے بیٹے سے یہ کہتے سنی گئی ہے کہ "اگر تمہارے یہی چلن رہے تو تم اپنا گھر بسا چکے۔ سسرال میں جاکر ہماری ناک کٹواؤ گے"

یہ تصور ہی کس قدر مضحکہ خیز ہے لیکن اگر ہوش مندی اور انصاف سے کام لیا جائے تو نا قابل عمل یا ناپسندیدہ ہرگز نہیں۔ جب شادی میں دونوں افراد کا آرام و سکون شامل ہے تو اسے حاصل کرنے کے لئے

دونوں پر یکساں فرائض کیوں نہ عائد کئے جائیں۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک اگرچہ یہ سوچنا ہی قابل توہین تھا مگر اب اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ماں اپنے بیٹے کو وقتاً فوقتاً یہ احساس دلاتی رہے کہ زندگی میں پیسہ کمانے کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے کہیں اہم مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی کے لئے اپنے آپ کو سدھارے۔ ازدواجی زندگی کو مستقل طور پر خوشگوار بنانے کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی لڑکی کو بھی ذہنی طور پر . . . . . .

. . اس امر کے لئے تیار کیا جائے (جیسا کہ ۹۹ فی صد لڑکیاں ہمارے یہاں ہوتی ہیں) کہ وہ خوشگوار زندگی کے حصول کی خاطر صبر و ایثار اور محبت سے کام لے گی۔

شادیوں کی ناکامی یا عام تلخ کلامی اور نا اتفاقی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ مردوں میں اپنی بیویوں کی طرف سے غیر ذمہ داری برتنے کا رجحان پایا جاتا ہے صرف آوارہ بدچلن اور شرابی مرد ہی بیوی کے لئے زحمت ثابت نہیں ہوتا بلکہ غیر ذمہ دارانہ ذہنیت رکھنے والے شوہر لستا دیر پا اور دیرپا ثابت ہوتے ہیں۔ آوارہ شرابی بیکار اور نکمے شوہر کی عادات سے چونکہ سب لوگ واقف ہوتے ہیں۔ اسی لئے بیوی کے ساتھ دوسرے لوگوں کی ہمدردیاں شامل ہو جاتی ہیں۔ اور یہی ہمدردیاں اکثر اوقات اس میں حالات کا دلیرانہ مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کرتی ہیں۔ لیکن ایک غیر ذمہ دار اور اپنے فرائض سے پہلوتہی کرنے والا مرد دوسرے لوگوں سے ٹھیک ٹھاک رہتا ہے لیکن بیوی کی جان پر عذاب توڑتا ہے اور کسی کو کانوں کان اس سلوک کی خبر نہیں ہوتی۔ وہ جانتا ہے کہ بیوی کے ساتھ تعلقات میں جس قدر ناپسندیدہ اور غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کیا جائے . . . رہے گی۔ کیونکہ مرد اپنی عورت سے برا سلوک بھی کرے تو کہا جاتا ہے کہ مرد ذات ہی ایسی ہوتی ہے۔ عورت اگر عقل سے کام لے تو مرد کو اپنی راہ پر لا سکتی ہے:

عورت کو عقل سے ضرور کام لینا چاہئے۔ مگر اس کی تمام تر عقل صرف ایسے مواقع کے لئے مختص کر دینا سراسر زیادتی ہے زندگی میں اور بہت سے کام ہیں جو عقل سے حل کئے جانے چاہئیں۔ ایسی عورتیں تحسین کے لائق ہیں جنھیں دن میں پچاس بار عقل سے کام لینا پڑتا ہے اور ان کا ذہنی توازن پھر بھی درست رہتا ہے ہاں صرف یہ کہ جسمانی توازن بگڑ جاتا ہے۔ عورتیں جنھیں خدا نے انتہائی لچکدار اور نرم خو بنایا ہے۔ ان میں بلڈ پریشر، ہارٹ اٹیک اور سردرد کے دورے اسی عقل کو زیادہ استعمال کرنے کا نتیجہ ہیں۔

غیر ذمہ داری سرسری نظر میں ایک بہت معمولی اور نسبتاً کم ایذا دینے والی خصلت نظر آتی ہے۔ مگر اس کو پھیلا لیں تو اکثر خرابیاں اسی کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہیں ذرا اپنے گرد و پیش نظر دوڑائیے جو لوگ آپ کو پسند ہیں ان کی عادات کا تجزیہ کریں تو اور خوبیوں کے علاوہ ان میں یہ وصف ضرور ہوگا کہ وہ اپنے پیشے سے دیانت دار اور اپنے دوستوں، عزیز و اقارب یا اپنے ملک سے وفادار ہوں گے۔ یہ وفاداری اصل میں ان کو فرض شناسی اور احساس ذمہ داری کا دوسرا نام ہے۔ ایک شخص جو اپنے حقوق طلب کرنے کے ساتھ اپنے فرائض بھی ادا کرتا ہے۔ زندگی کے ہر دور کامیاب رہتا ہے۔ ایسے لوگ دوسروں سے حقوق لیتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے فرائض بھی ادا کرتے ہیں مگر ایسے مرد کتنے فی صد ہیں اور اس غیر ذمہ دارانہ ذہنیت رکھنے والی اکثریت کو پیدا کرنے اور پالنے میں کس کا ہاتھ ہے۔ ظاہر ہے کہ عورت کا ہے۔

پرانے زمانے کی نیک سیرت جنتی بیبیاں "اللہ میاں کی گائے" تھیں۔ انھیں سارے ماحول میں مرد کی جا و بیجا حکمرانی نظر آتی تھی۔ انھیں احساس ہی نہ تھا کہ کبھی حالات نہیں رہے۔ تعلیم کی روشنی پھیلی۔ نئے افکار پیدا ہوئے، فاصلے اس قدر سمٹ گئے کہ سمندر پار کی تہذیبیں ایک دوسرے کی اچھی باتیں اپنانے لگیں۔ پرانے نظریات ذہنوں میں اس قدر رچ بس گئے کہ اپنے پرائے کی حد بندی مضحکہ خیز ثابت ہونے لگی۔ تہذیب و ترقی کے اس دور میں اگر یہ توقع کی جائے کہ عورت کو پرانے دھرّے میں چلایا جاسکے گا۔ تو یہ احمقوں کی جنت میں رہنے والی بات ہے گھروں میں مٹکوں کے ٹھنڈے پانی کی جگہ فریج کی بوتلوں نے لے لی۔ دستر خوان اٹھ گئے اور ڈائننگ ٹیبل نے جگہ سنبھالی۔ پھر کم از کم اسی رہن سہن کا بھرم رکھنے کی خاطر ماؤں کو چاہئے کہ اپنے لڑکوں کو سمجھائیں کہ واقعی بہت بڑا ہو از مانہ بدل گیا۔ عورت بدل گئی۔ اس کے خیالات "باغی" ہو گئے۔ اس کی آواز گھر کی چہار دیواری سے باہر نکل گئی لیکن جب تم اس عورت ذات سے بیاہ کرنے پر مجبور ہو تو تمہیں اپنے ذہن میں یہ بات بٹھا لینا چاہئے کہ تم اسے اس کے حقوق دو گے اور اس سے عام انسانوں کی طرح سلوک کرو گے۔ تبھی تم ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے کے اہل ہو سکو گے (باقی آئندہ)

پرچہ نہ ملنے کی شکایت

حریمی بہنوں اور بھانجیوں کو نوٹ کر لینا چاہیئے کہ ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ تک پرچے کا انتظار فرمایا کریں۔ اگر ۲۰ تک حریم نہ ملے تو فوراً دفتر کو ایک کارڈ لکھکر اطلاع دیں۔ دوسرا پرچہ بھیج دیا جائے گا۔ بعض بہنیں کافی تاخیر سے اطلاع دیتی ہیں۔ پرچہ ختم ہو جاتا ہے اس لئے پھر نہیں بھیجا جاتا۔ ۲۰ تاریخ سے پہلے اور ۳۰ تاریخ کے بعد لکھے جانے والے شکایتی خطوط پر کوئی توجہ نہ دی جائے گی۔ تبدیلی پتہ کی اطلاع اسطرح روانہ کی جائے کہ دفتر میں ۳۰ تاریخ تک پہنچ جائے۔ بعض بہنیں اس وقت اطلاع کرتی ہیں جب پرچہ ۳۰ تاریخ کو روانہ ہو جاتا ہے۔

رباعیات

فیروز نظامی

لب پر عظمت سے اسکا نام آتا ہے
اس بندے کو خالق کا سلام آتا ہے
کرتا ہے زمانے کی جو خدمت فیروزؔ
آپ اپنی ہی تعمیر میں کام آتا ہے

بے ربط خزاں بہار دیتی ہے نماز
ہاں کیف ابد قرار دیتی ہے نماز
دے دے کے کلام حق کے پیہم چھینٹے
دونوں عالم نکھار دیتی ہے نماز

اشکوں نے مرا دیدۂ نم چوم لیا
ہمت نے ارادے کا قدم چوم لیا
میں نے جو کہی نعت نبیؐ نے فیروزؔ
اللہ کی رحمت نے قلم چوم لیا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

ملک کی آزادی کے لئے جن لوگوں نے قربانیاں دیں، یوم آزادی کے موقع پر اُن کی یاد آنا فطری ہے۔

عظیم انقلابی اور محب وطن شری گنیش شنکر ودیارتھی آج سے ۶۰ سال قبل کانپور میں فرقہ پرستی کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھاتے ہوئے خود بھی شہید ہو گئے تھے۔ ان کی شہادت کی خبر سن کر مہاتما گاندھی نے کہا تھا "ہمیں گنیش شنکر جی پر رشک آتا ہے۔ اس ملک میں دوسرے گنیش شنکر ودیارتھی کیوں نہیں پیدا ہوتے؟"

کاکوری کیس کے امر شہید اشفاق اللہ خاں، امر شہید رام پرشاد بسمل، روشن سنگھ اور شری راجیندر لاہری نے ملک کی آزادی کے لئے سب کچھ قربان کر دیا۔

گنیش شنکر ودیارتھی جی کی شہادت پر رشک کرنے والے مہاتما گاندھی کو خود بھی ایسی ہی شہادت کا فخر حاصل ہوا۔

یہ ملک سب کا ہے۔ سبھی مذہبوں اور فرقوں کے لوگوں کو متحد ہو کر ملک کی ترقی کے لئے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور بھائی چارے کے جذبہ کو فروغ دینا ہے۔

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

جاری کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش ——— لکھنؤ

عفت موہانی ۔ ایم ۔ اے

رات کو نازیہ پروفیسر صاحب سے ٹیوشن پڑھ کے آئی تو اماں نے چپکے سے آپا کا خط اسے پکڑا دیا۔ اس کا ماتھا تو پہلے ہی ٹھنکا تھا۔ آپا بڑی خود غرض تھیں۔ بڑی اچھی جگہ بیاہی تھیں۔ بہت آرام سے رہتی تھیں۔ ویسے کبھی انھوں نے اماں اور چھوٹی بہن کو پلٹ کے نہ پوچھا کہ کس حال میں گزر کر رہی ہیں۔ چاہتی ہوتیں تو میاں سے چرا چھپا کر کم سے کم اس کی پڑھائی کا خرچ تو بھجوا ہی سکتی تھیں۔ ابا کی ناگہانی موت نے دونوں ماں بیٹی کو مالی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ ابا کی بیماری تو بہت دن سے چل رہی تھی۔ تھوڑا بہت قرض بھی ہو گیا تھا۔ ویسے یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ بس سوتے کے سوتے رہ جائیں گے۔ اماں شکر ادا کرتیں کہ آپا تو اپنے گھر بار سے سکھی تھیں۔ انہ سہی بلا سے کبھی کو پوچھیں کہ نہ پوچھیں۔ مگر اس کے دل میں آپا کی طرف سے خاصی دشمنی تھی۔ بڑی مطلبی تھیں وہ۔ جب ان کے یہاں بچہ ہوا تب زبردستی اسے بلا بھیجا تھا۔ اور مسلسل دو مہینے تک اس سے خوب کام لئے تھے۔ اور واپسی پر اس کے ہاتھ میں فقط ریل کا کرایہ پکڑا دیا تھا۔ اب پھر وہی مصیبت تھی! ہزاروں خوشامدوں کے بعد لکھا تھا کہ جس طرح بن پڑے مہینے بھر کے لئے چلی آئے۔ انھیں ماماؤں پر اعتبار نہیں تھا۔ یا نجانے کیوں وہ مامائیں رکھتی ہی نہیں تھیں۔ نازیہ ابھی بی۔اے میں ایک پرچہ سے رہ گئی تھی۔ سو اس کا امتحان دو ماہ بعد تھا اور وہ جی جان سے پڑھنے میں جٹی تھی۔ پروفیسر صاحب نے پختہ وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ پاس ہو گئی تو اسے اپنے ہی کالج میں رکھ لیں گے۔!

اس نے جھنا کر خط میز پر پھینک دیا اور صاف بول دی "آپا کو لکھ دیجئے۔ میرا وقت فالتو نہیں ہے۔ وہ کسی نرس ورس کا انتظام کر لیں۔"

اماں داماد کی امارت سے مرعوب رہتی تھیں۔ بولیں "بیٹی سرفراز میاں کیا کہیں گے کہ بہن آڑے وقت پر کام نہ آئی۔ حرج ہی کیا ہے۔ یہاں نہ پڑھا وہاں پڑھ لیا۔ وہی پڑھا دیا کریں گے۔"

"نہیں اماں۔ میں دولہا بھائی سے ہرگز نہیں پڑھوں گی۔ ان سے مجھے بہت شرم آتی ہے۔ گھورتے بہت ہیں!"

"اے بیٹی۔ وہ تو فرشتہ ہیں۔ میں کہوں۔ اللہ جس سے خوش ہو اسے ایسا ہی داماد دے۔ اچھا تو خط میں دو سطریں لکھ کے ڈال دو کہ تم جا رہی ہو۔ معلوم نہیں وہاں رضیہ کی حالت کیسی ہو کیسی نہ ہو۔ ایک تو اس کے اللہ رکھے بھرے پرے دن اور پھر ننھے سے بچے کا ساتھ۔"

وہ تو ہرگز آمادہ نہیں تھی مگر اماں کی بات کو قرار کہاں تھا۔ زبردستی خط لکھوا دیا۔ دوسرے دن دولہا بھائی کا بھجوایا ہوا ٹکٹ بھی مل گیا۔ بڑی فراخدلی سے بھجوایا تھا۔ اماں تو داماد کی اور بھی گرویدہ ہو گئیں۔ اٹھتے بیٹھتے دعائیں دیتیں۔

"اماں۔ آپ چلی جائیے۔" اس نے چونک کر کہا۔

"توبہ کرو بی۔ میں کہاں داماد کا نمک اس کے گھر کا پانی پینے جاؤں؟"

بہرحال۔ ہزار انکار اصرار کے بعد اسے جانا ہی پڑا۔

آپا کو ٹھنا ٹھنا دشوار تھا۔ مسہری پر لیٹے لیٹے اس کا استقبال کیا۔ پھول سوج کر ڈم ہو گئی تھیں۔ ننھا شاندار جھولے میں سو رہا تھا۔ اس نے لڑکے سے منگوا کے چائے پی۔ اور پھر پرس سے ستر روپئے نکال کر انھیں دے دیئے۔

"اماں نے بھیجے ہیں۔" وہ کھل اٹھیں۔

"جی نہیں۔ دولہا بھائی نے منی آرڈر بھجوایا تھا۔ سو سو میرا کام چل گیا۔ اور جگ آباد دور ہی کتنا ہے۔ یہ باقی کے پیسے رکھ لیجئے۔"

"بھلے اس کے کرو وہ تاریک ایمانداری پر خوش ہوتیں۔ مگر اس سے منہ بنا لیا۔ اور کچھ بڑبڑانے لگیں۔ مجھ سے تو کبھی نہیں کہا اور دو سو روپئے بھجوا دئے۔ معلوم نہیں اسی طرح اور کس کس پر دولت لٹاتے پھرتے ہیں۔"

آپا آپ کو پتہ ہے کہ اماں کے پاس کرایہ نہیں تھا تو وہ ناگواری سے بولی۔

ایسا بھی کیا ہے۔ داماد کے سامنے اماں کو کچھ تو اپنی لاج رکھنی ہی تھی۔!

اماں کو کہاں الہام ہوا تھا کہ دولہا بھائی نے کیا کہہ رہے ہیں"
اسے بُرا لگا۔ آپا تو شادی کے بعد بالکل ہی بدل گئیں۔ جیسے کہ ان کی ساری خوشی ہی کافور ہو گئی تھی۔ نازیہ پچھتانے لگی!۔

شام کو دولہا بھائی آئے۔ وہ نہا دھو کر صحن میں آ بیٹھی تھی اس کی گودی میں ننھا تھا۔ وہ اسے بسکٹ کھلا رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر سلام کیا۔ دولہا بھائی کی آنکھوں میں بجلیاں سی چمک کے بجھ گئیں۔ او ہو نازیہ۔ تم آ گئیں۔ اچھی تو رہیں۔ اماں کیسی ہیں؟

اچھی ہیں۔ آپ کو دعائیں کہلا بھیجی ہیں۔!" اس نے سر جھکا لیا۔
وہ دفعتاً اپنے بیٹے کی پیشانی پر جھکے۔ اس طرح ان کے منہ سے سگریٹ کی بدبو اور نازیہ کی ناک میں گھس گئی۔ مگر انھوں نے بچے کا ماتھا چوما۔ اور اسے چائے بنانے کا حکم دے کے کپڑے بدلنے چلے گئے۔

عجیب آدمی ہیں۔" وہ چائے بناتے ہوئے مسلسل سوچے جا رہی تھی۔ کیا ضروری تھا کہ وہ بچے کی پیشانی چومتے۔ ان کی گرم گرم تند سانسیں ابھی تک اس کے چہرے پر منجمد تھیں۔ لیکن اس نے اپنے دل کو خیالات سے پاک کر لیا۔

چند ہی روز میں گھر کا سارا کام اسی پر آ گیا۔ آپا کی خدمت۔ خالہ اماں کے ساتھ مل کر ناشتہ تیار کرانا۔ بچے کو سنبھالنا۔ اور اس چپقلش میں اس کی اسٹڈی رہ گئی۔ رات گئے اگر وہ پڑھنے بیٹھتی تو آپا ٹوک دیتیں۔

"اب تم ساری رات بجلی جلاؤ گی۔ یونہی بل زیادہ آتا ہے"
اسے رونا آ جاتا۔ آپا میں اتنی بھی مروت نہیں رہی۔ وہ دن بھر ان ہی کے کاموں میں لگی رہتی تھی!۔ مجبوراً وہ بجلی گل کر دیتی۔ اور پھر اندھی لالٹین میں پڑھنے بیٹھ جاتی۔

"رضیہ۔ کیا حرج ہے اگر وہ بجلی جلا لیا کرے" ایک دن چپکے سے دولہا بھائی نے کہا۔ آپا بگڑ گئیں۔
"لیجئے ابھی بجلی چمکنے کی حد ہو۔ دن کو کمروں میں بجلی جلتی ہے۔ پنکھا چلتا ہے۔ جو یہ جلائے گی تو کتنا بل آئے گا؟"

"بجلی کا بل میں دیتا ہوں۔ تمہیں کیا فکر ہے۔ اسے پڑھنے دیا کرو۔" دولہا بھائی تو یہ کہہ کے چلے گئے مگر آپا نے زمین آسمان ایک کر دیا اس پر تہمت تک رکھ دی۔ اس دن وہ خوب روئی!۔
اب وہ اس کی کڑی نگرانی کرتیں۔ مگر کب تک۔ انہیں ہسپتال جانا پڑا۔ اور بے گنتی نصیحتیں انھوں نے اسے کر دیں۔ مگر اب وہ آپے سے باہر تھی۔
"میں گھر جا رہی ہوں۔ آپ جانیں آپ کے کام۔ یہ آپ نے سال پیچھے کیا آفت لگائی ہے؟"
وہ بچہ کراہ کے۔ کچھ شان سے کچھ ناز و ادا سے مسکرا کر بولیں:
"کیا کروں۔ لڑکی۔ وہ اتنے بے صبر ہیں۔ تیری شادی ہو گی تب تجھے پتہ چلے گا۔!
"مجھے کہاں شادی کرنا ہے۔ میں تو ملازمت کر کے ٹھاٹ دار زندگی گزاروں گی"

وہ تین دن اور تین راتیں قیامت بن گئے۔ دولہا بھائی کو جانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ دیر سے دفتر جاتے اور چلے آتے۔ زبردستی کر کے اسے اپنے ساتھ ناشتہ کروانے۔ اور جانے کیا خبط گھیرے تھا کہ کچن میں بھی پہونچ جاتے۔ تب اس کے ہاتھ سے چیزیں چھوٹی پڑتیں۔ ننھے کو دیکھنے کے بہانے وہ وقت بے وقت کمرے میں چلے آتے۔ اور اس سے باتیں کرنے کے بہانے ڈھونڈا کرتے!۔ لیکن وہ ان سے بارہ پتھر دور ہی رہتی۔
ایک دن اس نے آپا سے اڑتی اڑتی سنی تھی پہلے بچے کی پیدائش کے وقت آپا نے رو رو کے اماں سے میاں کی شکایت کی تھی۔ وہ ہسپتال میں تھیں اور تب دولہا بھائی نے اپنے یہاں کام کرنے والی خادمہ کی لڑکی ——— آگے سننے سے قبل ہی اماں نے اسے وہاں سے بھگا دیا تھا۔

اسے ان سے بڑا ڈر لگتا۔ بڑے اونچے پورے چوڑے چکلے تھے کمرے میں گھس آتے تو کمرہ بھر جاتا۔ آواز اتنی موٹی تھی جیسے مٹکے میں منہ ڈال کے بولتے ہوں۔ جانے آپا ان کو کیوں اچھے لگتے تھے!۔
وہ موقع بے موقع اس کی تعریفیں کرتے "تم بڑی اچھی ہو۔ تمہاری آپا نے تو کبھی وقت پر ناشتہ کھانا نہیں دیا۔ تم فکر مت کرو۔ میں بھی تمہارے لئے کچھ انتظام کر دوں گا۔ آگے کے [illegible] شادی کر لو گی اور پڑھو گی"

اس کے گال سرخ ہو جاتے۔ اور وہ ہنسنے لگتے۔ ایک رات وہ بچے کا دودھ بنانے کچن میں گئی تب وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آ گئے۔ وہ ڈر کے مارے کانپ گئی۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔ جائیے یہاں سے۔ جائیے"

وہ اس کے پاس کھڑے ہو گئے۔ اس کی دہشت بھانپ لی تھی۔ اور مسکرا رہے تھے۔ اس کی آوارہ لٹ کو اس کے کان کے پیچھے برابر کرتے ہوئے بولے "مجھ سے اس قدر کیوں گھبراتی ہو۔ نازیہ؟ کیا میں تمہیں کوئی نقصان پہنچاتا ہوں؟"

نہیں نہیں۔ آپ جائیے۔ ورنہ مجھ سے ننھے کا دودھ نہ بن سکے گا" اس نے ایک جھٹکا دے کر ان کا ہاتھ ہٹا دیا۔ وہ ہنسنے لگے تھے۔

اچھی بات ہے۔ میں جا رہا ہوں سوچتا ہوں۔ تم کب تک اور کہاں تک مجھ سے بھاگتی ہو"

ساری رات۔ وہ بس پڑی کانپتی رہی۔ دروازہ بند کر لیا۔ مگر اسے پل بھر کے لئے بھی نیند نہ آسکی۔ دوسرے دن وہ اس کے لئے بہت قیمتی ساڑیاں لے آئے۔

"جلدی سے رکھ لو۔ ورنہ تمہاری آپا ایک حشر مچا دیں گی"

مجھے نہیں چاہئیں۔ لے جائیے۔ آپ کو کچھ دینا ہو تو آپا کے سامنے دیجئے" لال پیلی ہو گئی۔ بہت حسین ہو۔ غصے میں زیادہ پیاری لگتی ہو"! انھوں نے اس کے گال پر ہلکا سا تھپڑ مارا۔

دولہا بھائی؟" وہ غصے سے چیخی۔ اور ان کے سینے پر اس طرح دو ہتھڑ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گئے۔ غصے کے مارے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"آپ بدمعاش ہیں۔ کمینے ہیں۔ ذلیل ہیں۔۔۔ میں چلی جاؤں گی"

وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ شام کو آپا ننھے کو لیکر آ گئیں۔ دوسرا بچہ تھا۔ مارے غرور کے وہ زمین پر پاؤں نہیں رکھ رہی تھیں۔ ان کے پیچھے دولہا بھائی بھی تھے۔ اس نے چاہا تھا کہ آپا کے سامنے ان کی شکایتیں کر دے۔ مگر آپا اس سے پوچھنے لگیں۔

"اکیلے گھبرائیں تو نہیں۔ ننھے نے تو پریشان نہیں کیا؟"

میں بھی چلا گیا تھا۔ چار روز کے لئے باہر" دولہا بھائی بولے۔ "بس آج دوسرے پہر کے وقت آیا تو تمہارے پاس ہی آیا"

وہ سفید جھوٹ پر دنگ رہ گئی۔ آپا نے بڑے پیار سے اپنے میاں کو دیکھا۔ وہ جل کے کباب ہو گئی۔ اور خاموش اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب ہرگز ہرگز یہاں نہیں رہے گی!۔

اس نے اٹھ کر اپنا سوٹ کیس درست کیا۔ ننھے کو آپا کے کمرے میں لٹا آئی اور خود لالٹین جلا کے پڑھنے بیٹھ گئی۔!

کچھ دیر تک وہ آپا اور دولہا بھائی کی باہر سے آتی ہوئی آوازیں سنتی رہی۔ پھر شاید اسے ایک جھپکی سی آ گئی۔ چونک کر وہ سیدھی ہوئی تو اسے ایسا لگا قندیل کی لو دھیمی ہو گئی تھی۔ اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ لیکن دولہا بھائی کی آواز سن کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

رہنے دو" وہ آہستہ سے بولے۔

آپ۔ اس کا دل منہ میں آ رہا تھا" آپ کیوں آئے ابھی یہاں؟ آہستہ بولو۔ میں تو یہ دیکھنے آگیا تھا کہ۔ کہ۔ تم بے آرام سو رہی ہو" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

آپ یہاں سے جائیے۔ خدا کے لئے جائیے" وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگی۔

"مجھ سے اتنا کیوں ڈرتی ہو۔ نازیہ۔" وہ سرگوشی میں بولے "میرے قریب آؤ۔ سنو تو۔ میں تم سے کیا کہنا چاہتا ہوں"

نہیں نہیں۔ نہیں۔ آپ جائیے یہاں سے۔ خدا کے واسطے جائیے" وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سارے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا اور ہاتھ پاؤں سرد ہو رہے تھے۔ یہ چلے کیوں نہیں جاتے۔ کچھ سننے کے لئے کیا ابھی وقت رہ گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں تاریکی گہری ہو رہی تھی۔

"نازیہ۔ کیا تم ابھی مجھ سے ڈرتی ہو؟۔ کیوں۔ نازیہ سنو۔ قریب آؤ۔ انھیں پتہ تک نہیں چلے گا۔

میں۔ تمہارے قدموں پر اپنی ساری دولت ڈھیر کر دوں گا۔ نازیہ سنو۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ تم تو پڑھی لکھی سمجھدار ہو" وہ اس طرح ہانپ رہے تھے جیسے میلوں دوڑ لگا کے آئے ہوں۔ ان کی سانسیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔!

نازیہ فرط خوف و دہشت سے بولی "اگر آپ یہاں سے نہیں جاتے تو میں آپا کو آواز دیتی ہوں" اس کی عقل گم تھی۔ ہوش کھو بیٹھے تھے؟

اچھی بات ہے" انھوں نے کہا "میں جا رہا ہوں۔

اور یہ کہہ کر دروازے تک بڑھ گئے۔ نازیہ پر خوف غالب تھا وہ کانپتی لرزتی ان کے پیچھے چلی کہ ان کے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کر لے گی۔ مگر — دروازہ بند ہو گیا — اور ایک مضبوط ہاتھ نے اس کا منہ بند کر دیا۔ دوسرے ہاتھ نے دروازہ بولٹ کر دیا —!!

نازیہ کے بے کہے سنے چلے جانے سے آپا بڑی پریشان تھیں۔ تیسرے دن اماں کے پاس سے تار آیا۔ نازیہ گھر کے کنوئیں میں گر کے ختم ہو گئی۔

"معلوم نہیں۔ کیا گل کھلائے تھے۔ آج کل کی لڑکیاں۔ لاحول ولا قوۃ۔۔۔" دولہا بھائی نے حقارت اور نفرت سے کہا۔

"ایسے۔ آپ بھی گھر سے باہر رہے۔ کم سے کم اس کی نگرانی تو کرتے" آپا نے دہائی ڈال دی۔

"ہاں۔ اتفاق کی بات ہے" دولہا بھائی نے کہا۔ اور آپا کی چیخ پکار سے لا پرواہ اخبار اپنے چہرے کے برابر اٹھا لیا —!!

ڈاکٹر گنگولی صاحب مجھے دیکھنے تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ باہر کوئی شخص کھڑا ہے۔ وہ اندر نہیں آیا۔ میں نے سمجھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کا ڈرائیور ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی وہ نہیں گیا۔ اس نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ میں نے اُسے بلا لیا۔

میں نے سمجھا وہ کوئی پاگل ہے، لیکن وہ پاگل نہ تھا۔ اسے میرا نام معلوم تھا اور اس کے پاس میرا ایک خط تھا، جسے اس نے احتیاط کے ساتھ رکھ چھوڑا تھا۔

یہ خط وہ مجھے نہ دکھاتا تو شاید میں اسے پاگل ہی سمجھتا رہتا۔

کئی سال قبل اس نے مجھے لکھا تھا کہ میں اس کی داستانِ حیات ناول کی شکل میں لکھ دوں، لیکن میں نے اپنی معذوری کا اظہار کر دیا تھا۔ واقعی میں اب ناول نہیں لکھتا۔ حسرت میرا آخری ناول تھا جو میں نے ۶۳ء میں لکھا تھا۔ لیکن شرافت کی باتوں نے مجھے مجبور کر دیا۔ مجھے اس سے ہمدردی ہوئی اور میں نے اس کی کہانی بسترِ علالت ہی پر لیٹے لیٹے سنی اور پھر اسے اپنے ۲۱ روزہ قیام نینی تال ہی میں ناول کی شکل لکھ ڈالا۔ جس کا نام ہے۔

آخری تمنّا

شرافت اپنی کہانی کو کتابی شکل میں دیکھ کر اتنا خوش ہوگا کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اسے شادی مرگ نہ ہو جائے۔ وہ بڑی بے چینی سے اس ناول کا انتظار کر رہا ہے جو اس کی تمنا پوری کرنے کے ساتھ ہی میرے ناولوں میں ایک کا اضافہ کر دے گا۔

اس ناولٹ کے دونوں کردار یعنی زبیدہ اور شرافت ایسے پاکباز ہیں کہ شاید آپ جو کچھ ہوا اس کا یقین نہ کر سکیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ شرافت کا ایک ایک لفظ سچا تھا۔ اور ایسا نہ ہوتا تو میں اس کی تمنا پوری کرنے کے لئے یہ ناول نہ لکھتا۔

آخری تمنّا

اگر کاغذ مل سکا تو امید ہے آخر ستمبر تک آپ پڑھ سکیں گے

(نسیم انہونوی)

از ڈاکٹر مہرالنساء

بچّے کو حادثات سے بچانا ماں کا فرض ہے

اکثر ماؤں کو یہ اندیشہ ستاتا رہتا ہے کہ کہیں ان کا بچّہ اسٹوو نہ چھولے۔ کھولتے ہوئے گرم پانی کے پاس نہ چلا جائے۔ بجلی کا پنکھا، ٹوسٹر، استری اور اس کے پلگ کو ہاتھ نہ لگا دے جب بچہ گھٹنوں چلنا شروع کر دیتا ہے تو مائیں ہر خطرناک چیز کو بچے کی پہنچ سے دور رکھنے لگتی ہیں لیکن پھر بھی یہ سننے اور دیکھنے میں آتا ہے کہ ۲ سالہ بچے نے میز پوش کو اس طرح کھینچا کہ چائے دانی الٹ گئی یا تصویریں اٹھانے کی کوشش میں فریم کا شیشہ توڑ دیا۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ معصوم کم سن بچے کو یہ سکھانا کہ وہ خطرے سے دور رہے کوئی آسان بات نہیں ہے۔ یہ ذمے داری بڑوں ہی کی ہے کیونکہ ایک ڈیڑھ یا دو سالہ بچے میں خطرے کو بھانپ لینے کی اہلیت ہی نہیں ہوتی۔ وہ نہیں جانتا کہ خطرے سے کیا مراد ہے۔ بالفرض آج وہ سمجھ بھی لے کہ اس بات میں خطرہ ہے تو کل تک وہ خیال اس کے ذہن میں باقی نہیں رہے گا۔ بچہ کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ خطرے اور نقصان سے متعلق پیچیدہ خیالات کو بچہ زیادہ دیر کے لئے اپنے ذہن میں نہیں رکھ سکتا۔

بچّہ میں تجسس کا جذبہ فطری ہے

بچہ اپنے تجسس کے جذبے کی تسکین میں اکثر خطرات سے دوچار ہوتا ہے۔ چیزوں کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے بچہ فطری طور سے انھیں چھوتا، ہاتھ میں لیتا اور پھر زبان سے چکھنا چاہتا ہے، ارد گرد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے اس کا ذوق و شوق بے انتہا ہوتا ہے اس لئے گھر میں بچے کی حفاظت اور سلامتی کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر بڑے یہ چاہتے ہیں کہ بچہ بعض چیزوں کو نہ چھوئے تو وہ اسے اس کی پہنچ سے باہر رکھیں اگر اس سلسلے میں کچھ دشواریاں ہوں تو بچے کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنی ضروری ہے۔ خطرے کی جگہ تک بچے کو نہ پہنچنے دیا جائے۔

شیرخوار بچہ بھی ہر چیز کو منھ میں رکھنا چاہتا ہے

شیرخوار بچہ کا چیزوں کو منھ میں لے جانا اس کی نشوونما کے معمولات کا ایک لازمی جزو ہے۔ ماحول سے واقفیت حاصل کرنے اور سیکھنے کے بے شمار طریقوں میں سے یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

اس کے علاوہ شیرخوار بچہ ایک اور وجہ سے بھی چیزوں کو منھ میں رکھتا ہے اسے چوسنے کی فطری طلب ہوتی ہے اگر دودھ چوسنے سے یہ طلب پوری نہیں ہوتی تو وہ اکثر ہر وہ چیز چوسنے کی خاطر منھ میں دبا لیتا جس تک اس کی رسائی ہے دانتوں کے نکلتے وقت یہ خواہش اور شدید ہو جاتی ہے اور اس کو چیزوں کے چوسنے اور چبانے میں بڑا لطف آتا ہے۔ یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ ماں جس قدر زیادہ دباؤ اس بات پر ڈالتی ہے کہ شیرخوار منھ میں چیزیں نہ لے جائے اسی قدر اور زیادہ چیزیں، بچہ اپنے منھ میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح روکنے والا بچہ اپنی بے چینی کے اظہار کے لئے نئے راستے نکالتا ہے۔ کبھی انگوٹھا منھ میں ڈالتا ہے کبھی بستر پر پیشاب کر لیتا ہے۔ اس لئے اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ بچہ چیزوں کو منھ میں نہ رکھے بلکہ یہ ہے کہ اس کو کن چیزوں کو منھ میں رکھنے اور چوسنے کی اجازت دی جائے۔

۱۔ بچے کی دسترس میں ایسی بے ضرر چیزیں ہوں جو آسانی سے چوسی اور چبائی جا سکیں۔ ایسے کھلونے ہوں جن کو صابن اور پانی سے صاف کیا جا سکے۔ دھار والی اور نکیلی چیزوں کو شیرخوار کی پہنچ سے دور رکھا جائے۔ کھلونے بڑے سائز کے ہوں تاکہ نگلے نہ جا سکیں۔ وہ ایسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بھی نہ بنے ہوں کہ ڈھیلے ہونے پر حلق میں اٹک جائیں۔ کھلونوں میں ایسا روغن، رنگ اور وارنش استعمال نہ کی گئی ہو، جو چبانے اور چوسنے سے بچوں کو ضرر پہنچائے۔ بڑے کھلونے بھی بے خطر اور خوشنما ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے استعمال کے دوران ماں کو

بچہ پلنگر بھی چاہئیے کہ کہیں وہ دانتوں سے ربڑ کاٹ کر چبا تا تو نہیں ہے اس لئے سخت ربڑ کے کھلونوں کا استعمال بہتر ہے۔

۲، بچے کے کھلونوں کو الٹتے بدلتے رہنا چاہئیے بچے کا دل بڑوں کی طرح ایک ہی قسم کی چیزوں سے بھر جاتا ہے۔ وہ رنگا رنگی پسند کرتا ہے۔ پھر کھلونے بدلتے رہتے ہیں یہ آسانی بھی ہوتی ہے کہ ان کو اچھی طرح صاف کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

۳، بچے میں جیسے جیسے اشیاء کو دیکھنے، سننے اور چھونے کی لیاقت بڑھے گی۔ ویسے ہی ان اشیاء کو منھ میں رکھنے کی خواہش دھیمی اور کمزور ہوتی جائے گی نشو و نما کے ساتھ ساتھ بچے کو چیزیں منھ میں رکھنے چبانے اور چوسنے میں، اتنی لذت نہیں ملے گی۔ جتنی لوگوں سے باتیں کرنے یا خود اپنے ہاتھوں کی مدد سے کھلونوں کو ہلانے، پھینکنے اور پٹخنے میں ملے گی۔ ماں کو یاد رکھنا چاہئیے کہ بچے کی فطری حرکتوں میں مخل ہونے سے اس کی نشو و نما پر منفی اثر ہوتا ہے بچہ کا چیزوں کا منھ میں رکھنا۔ اس کی نشو و نما کے مراحل کا ایک ایسا ضروری حصہ ہے جو ہر حالت میں اس کے لئے اچھا ہے۔

۱۔ یہ ضروری ہے کہ بچے کو گھر میں کھیلنے کے لئے ایک ایسی جگہ دی جائے جو کھلی ہوئی ہو اور جہاں کوئی خطرناک چیز نہ ہو، بچہ لازماً چیزوں کو کھینچے گا، ہلائے گا اور اٹھا کر ادھر سے ادھر رکھے گا۔ اب اگر ایسا کرنے سے چیزیں گر گئیں یا ٹوٹ گئیں تو بچہ کو ضرور چوٹ لگے گی اور بعض اوقات یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ چوٹ بیحد خطرناک ثابت ہو۔ اس لئے اگر ممکن ہو تو بچے کے لئے ایک کونے کو بے خطر بنا دیا جائے بے خطر کرنے سے مراد ایسی چیز نہ ہو۔ جس سے بچے کو نقصان پہنچے۔ بجلی کے لیمپ، شیشے کے برتن، مٹی کے کھلونے، میزیں یا کرسیاں اس جگہ سے نکال دی جائیں۔ تاکہ بچہ بلا رکاوٹ گھومتا، کودتا اور دوڑتا پھرے۔ یہ کونہ گھر کے ایسے حصے میں ہو جہاں سے بچہ ماں کے آنے جانے کو ہر وقت دیکھ سکے اور اس سے بات کر سکے۔ اس انتظام سے ماں کے بہت سے اندیشے کم ہو جائیں گے اور بچے کو بھی سہولت ہو جائے گی۔

گھر میں چھوٹے بچے کے لئے سب سے خطرناک جگہ باورچی خانہ ہے۔ ضروری ہے کہ باورچی خانے میں جتنی ہو جے بچہ کھول نہ سکے اور ماں کی غیر موجودگی میں باورچی خانہ میں آ جا نہ سکے۔

۲۔ دھار دار اسلحہ کی قسم چاقو، کانٹے، سوئی، قینچی اور سلائی کی دوسری چیزیں بچے کی پہنچ سے باہر ہوں۔ ہر قسم کی دواؤں کو بچے سے دور رکھا جائے۔ خواہ یہ دوائیں کھانے کی ہوں یا لگانے کی، برتن صاف کرنے کا پاؤڈر یا پالش کرنے کا تیل۔ کیڑے مکوڑے مارنے والی دوا یا کپڑوں میں رکھنے والی گولیاں غرضیکہ ہر قسم کی زہریلی چیزیں تالے میں بند ہونی چاہیں۔ بچہ اپنی کم سنی اور ناتجربہ کاری کی بنا پر ہر چیز کو منھ میں رکھ کر آزمانا چاہتا ہے۔ اسی لئے اس قسم کے حادثات اکثر سننے میں آتے ہیں کہ بچے نے خود کو یا کسی دوسرے بچے کو ان چیزوں سے نقصان پہنچا دیا ہے۔

۳۔ جس جگہ بچہ کھیلے وہ ہمیشہ صاف ہونی چاہئیے اکثر اوقات راستے میں چیزوں کے پڑے ہونے سے بچہ ٹھوکر کھا کر گر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ فرش چکنا نہ ہو۔ پالش کے بعد فرش عام طور سے پھسلنا ہو جاتا ہے بچے بھاگ دوڑ کے شوقین ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اکثر بری طرح پھسل کر گر جاتے ہیں۔

۴۔ بچوں کو بلا وجہ زینے چڑھنے اترنے، بالکنی میں کھڑے ہو کر باہر جھانکنے یا میزوں اور کرسیوں پر کودنے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔ بچے کی تربیت کا ایک زریں اصول ہے کہ اس کو بار بار کسی کام سے روکنے کی بجائے دوسرے مناسب کاموں میں لگا دینا چاہیئے ماں اگر مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کرے تو بہت سے خطرات سے بچے کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

۱۔ گھر میں ہر طرف چیزوں کو پھیلانا نہیں چاہیئے۔ اکثر بے خیالی میں یا سستی اور کاہلی میں ماں یا گھر کے دوسرے افراد کام کرنے کے بعد چیزوں کو اٹھا کر ان کی جگہ نہیں رکھتے بلکہ وہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ اس سے گھر گندا لگتا ہے اور بچے کے لئے خطرے بھی پیدا ہوتے ہیں اس لئے ایک جگہ مقرر کر لینی چاہیئے اور وہ چیز استعمال کے بعد ایسی جگہ رکھ دینی چاہیئے یہ احتیاط خاص طور سے پن۔ بلیڈ، سوئی، قینچی اور چاقو یا دوسری دھار والی چیزوں کے لئے کرنی چاہیئے۔ ورنہ امکان ہے کہ چھوٹا بچہ خود کو زخمی کرے۔

۲۔ الماری اور کمروں کے دروازوں کو بند رکھنا چاہیئے۔ اکثر کھلے ہوئے دروازوں سے شدید چوٹیں آجاتی ہیں۔ دروازہ بند کرتے وقت بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔ جلدی میں بے دیکھے بھالے دروازے بند کرنے سے چھوٹے بچوں کی انگلیاں پچک سکتے ہیں۔

کرسی میز یا دوسرے فرنیچر کو اچھی طرح سے وقتاً فوقتاً جانچ کرتے رہنا چاہیئے۔ کمزور پائے اکثر بڑے حادثہ کا باعث ہو سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ برآمدوں گیلریوں وغیرہ میں فرنیچر اس طرح لگایا جائے کہ بچے کو آنے جانے اور دوڑنے بھاگنے میں رکاوٹ نہ ہو۔ یہ بچے کی فطرت ہے کہ وہ دوڑے اور کودے اس لئے اس کو روکنے کے بجائے ماں کا فرض ہے کہ بلاوجہ اس کے راستے میں رکاوٹیں نہ پیدا کرے جن سے ٹکرا کر وہ گر جائے۔

۲۔ غسل خانے اور باورچی خانے کے فرش کو صاف اور خشک رکھا جائے۔ صابن کے ٹکڑے اٹھا لئے جائیں۔ زیادہ تر چوٹیں غسل خانے کے فرش پر گرنے سے لگتی ہیں۔ اندھیرے سے بھی بچے کو بچایا جائے۔ جن گھروں میں چھوٹے بچے ہوں وہاں خاص طور سے رات بھر ایک ہلکا بلب جلتا رہے یہ مدھم روشنی بہت سے خطروں سے نجات دلا دے گی۔

ہمارے سوال کرنے پر چند ماؤں نے ہم کو بتلایا کہ اپنے بچوں کے بارے میں ان کو خاص طور سے یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ:۔

۱۔ کہیں بچہ کوئی خطرناک چیز منھ میں نہ رکھ لے۔ ایک صاحب کے بچے نے لوڈو کی گوٹ منھ میں ڈال لی تھی جس سے کافی پریشانی ہوئی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ بٹن پھول یا ایسی ہی دوسری چیزوں کو بچے سے بچانا ضروری ہے۔

۲۔ دوسرا ڈر جو زیادہ تر ماؤں نے بیان کیا۔ وہ زینے سے چڑھنے اور اترنے سے متعلق تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ چلنا سیکھ کر بچہ مسلسل چلنا چاہتا ہے۔ ذرا آنکھ بچی اور وہ غائب اور اس کا ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں گرنہ پڑے کھڑکی سے جھکنا۔ بستر پر چڑھنا کرسی پر کودنا، پلنگ پر چڑھ کر نیچے آنا اور اسی قسم کی دوسری حرکتوں کا بھی ذکر کیا۔ بعض ماؤں نے یہ خدشہ بھی اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں بیان کیا کہ صدر دروازے کو کھلا پا کر اکثر دو سالہ بچہ سڑک پر نکل گیا اور خطرے کے منھ سے بال بال بچا۔

۳۔ تیسرا ڈر جس کا ذکر اکثر ماؤں نے کیا وہ یہ تھا کہ بغیر جھجک بچہ اچانک گرم پانی میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ باورچی خانے کا دروازہ کھلا پاتے ہی وہ دوڑ کر گرم دیگچی وغیرہ چھونے کی کوشش کرتا ہے۔ ویسے یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ ہر بچہ کسی نہ کسی وقت کسی چیز سے تھوڑا بہت ضرور جل جاتا ہے۔ خواہ یہ گرم استری کو چھونا ہو۔۔۔ یا گرم پانی میں ہاتھ ڈالنا یا گرم چپاتی کو توڑ لینا ہو۔

بہرکیف بچوں کی زندگی میں خطرات ہوتے ہی ہیں۔ ان سے بالکل بچ جانا قریب قریب ناممکن ہے۔ ضروری اس بات کی ہے کہ ماں یہ یاد رکھے کہ حادثات خود بخود نہیں ہو جاتے بلکہ جب وہ حادثات کو روکنے کے لئے کچھ طریقے استعمال نہیں کرتی تو بچہ خطرناک چیزوں کے ساتھ تجربات کرکے حادثات کا شکار ہوتا ہے۔ اس ضمن میں علاج سے زیادہ ضروری حفاظتی اقدام ہیں۔

کیسے والدین؟

ڈاکٹر جیمس ڈوبس

ذیل کا مقالہ ڈاکٹر جیمس ڈوبس کی مقبول عام کتاب کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ اس اقتباس کا موضوع یہ ہے کہ سوسائٹی کی تیزی سے بدلتی ہوئی اقدار کے درمیان عورت کی جذباتی کیفیات و ضروریات کا تقاضا کیا ہونا چاہیئے۔

ہم آج کل تجارتی دنیا میں عورتوں کی ہل چل اور سرگرم شمولیت کا مشاہدہ کر رہے ہیں جس کا امور خانہ داری اور خاندان پر گہرا اثر مرتب ہو رہا ہے۔ ہر اس عورت کو جو امور خانہ داری کے جھنجھٹ سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ عزت نفس اور نسوانی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ کوئی ملازمت تلاش کر کے اپنی حیثیت کو بڑھا لے اور اپنی راہ پر آزادانہ گامزن ہو کر اپنی جڑیں مضبوط کرے۔ امریکہ کی آبادی کی آدھی عورتیں ملازمت کر رہی ہیں اور حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق ... ۵۵۳،۳۳ عورتیں برسر روزگار ہیں اور یہ تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس قوی رجحان کو کم از کم میں پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتا ہوں اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ بہت بڑی اکثریت میرے اس نظریے سے متفق نہیں ہوگی یا پھر میں اہم مسئلے پر لب کشائی سے باز نہیں رہ سکتا۔ مختصر یہ ہے کہ گھریلو زندگی سے یہ گریز و مفارقت انتہائی اندوہناک ہے اور قوم کو اسکا عبرت ناک خمیازہ لازماً بھگتنا پڑے گا!

یقیناً اقتصادی طور پر ایسے الم ناک حالات پیش آسکتے ہیں جن کا تقاضا یہ ہو سکتا ہے کہ عورت گھر سے باہر نکل کر کام کرے تاکہ اپنے خاندان کے لئے ضروری آسائش اور معاشی فراخی کا بندوبست کر سکے۔ ازدواجی تفرقہ اور نااتفاقی کا معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شوہر کسی قسم کا کام کرنے سے معذور ہو جاتا ہے یا کسی وجہ سے گھر کو چھوڑ دیتا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ عورت کو ہر ممکن اور شریفانہ کام کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے تاکہ گھر کا کام چل سکے، لیکن اس کے معنی ہرگز نہیں ہیں کہ عورتوں میں اس نظریہ کو پھیلایا جائے کہ ہر عورت جو گھر سے باہر کام نہیں کرتی وہ فریب خوردہ ہے اور اس کا استحصال کیا جا رہا ہے اور اس کو دھوکے میں رکھا جا رہا ہے۔

اس کذب کی دو اور فریبوں اور فرضی خرافات سے تائید کی جاتی ہے جو حماقت میں مذکورہ بالا تصورات کے ہم پلہ ہیں۔ پہلا کاذب مفروضہ یہ ہے کہ چھوٹے بچوں کی مائیں بھی تمام دن گھر سے باہر مشقت کا کام کرنے کے بعد بھی اس قابل رہتی ہیں کہ گھر اور خاندان کی ذمہ داریوں کو پورا کر سکیں، اور شاید گھر میں دن بھر دھرنا دے کر بیٹھے رہنے سے اتنا کام نہیں کر سکتیں جتنا وہ چابک دست عورتیں کر سکتی ہیں جو گھر سے باہر بھی کام کرتی ہیں۔ اس سے زیادہ واہیات بات اور کوئی نہیں ہو سکتی! انسان کا جسم آرام کا بھی محتاج ہوتا ہے۔ اس میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ دن بھر کام کرنے کے باوجود رات گئے تک کام کر سکے۔

یہ بالکل ناممکن ہے کہ ایک اوسط درجے کی عورت علی الصباح بیدار ہو کر اپنے خاندان کے لئے کھانا تیار کر کے سارے گھر والوں کو کھلا پلا دے اور پھر گھر سے باہر کام کے لئے چل پڑے اور اچھی خاصی مسافت طے کرنے کے بعد ۹ بجے تک اپنے کام کے مقام تک جا پہنچے اور ۹ بجے سے پانچ بجے تک [illegible] کام کرے۔ ساڑھے پانچ یا پھر ساڑھے چھ بجے گھر پہنچے اور گھر پہنچ کر آدھی رات تک گھر کا کام کرتی رہے۔

ذرا اس کے ضروری کاموں کی تفصیل پر غور تو کیجئے۔ مثلاً وہ عورت سارے گھر کے لئے دن میں تین وقت کھانا پکاتی ہے۔ گھر کو صاف کرتی، برتن اور کھانا [illegible] بچوں کے کپڑے دھوتی [illegible] کپڑے بدلتی، خود بھی غسل کرتی اور اپنے بال درست کرتی ہے۔ بچوں کے [illegible]

ضروریات سے متعلق، ان کو ہدایت دیتی، ادب و تمیز سکھاتی اور ان میں خودداری
اور ضمیر کے خیالات کی تخم ریزی کرتی ہے۔ مذہب کی بنیادی باتوں کی تلقین
کرتی اور ان تمام کاموں کو انجام دینے کے ساتھ صحت مند ازدواجی تعلقات
کو بھی برقرار رکھتی ہے۔ یہ اور ان کے علاوہ اور بہت سے کام ہیں جن کا
تعلق صرف گھر اور خاندان کی ضروریات اور حقوق و فرائض سے ہے۔
کیا ایک عورت مدت العمر اتنے کاموں کو مسلسل انجام دیتی رہ سکتی ہے۔
بعض عورتوں کو گھر کا سامان خریدنے کے لئے بازار بھی جانا پڑتا ہے۔
یومیہ اور ماہانہ بجٹ کو متوازن رکھنے کا دردِ سر بھی اسی کو برداشت
کرنا پڑتا ہے۔

ہنگامی حالات میں ایک ماہ یا ایک موسم میں ممکن ہے کہ
اتنا کام کیا جا سکے لیکن مسلسل اتنا کام کرتے رہنے کی صورت میں
کوئی عورت اپنی تن درستی کو برقرار رکھ سکتی اور جس عورت کو
صرف گھر کا اتنا کام کرنا پڑے گا وہ لازماً چڑچڑی ہو جائے گی۔ ان
تمام کاموں کے علاوہ اس کو حمل، زچگی اور رضاعت اور ایام حیض
کے مرحلوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اس قدرتی نظام سے معلوم ہوتا
ہے کہ وہ سخت جسمانی محنت اور گھر سے باہر کے کاموں کے لئے وضع
نہیں کی گئی ہے۔ عورت کی خانگی اور ازدواجی ذمہ داریوں کی کثرت
اور مردوں کی اس پر اس بارے بے اعتنائی اکثر عورت کی صحت اور
مزاج پر اثر انداز ہوتی ہے۔

دوسری ہٹ دھرمی اور فریب خوردگی یہ ہے کہ چھوٹے بچے
(۵ سال سے کم عمر کے) ماں کی نگہداشت اور مادرانہ شفقت
کے محتاج نہیں ہوتے۔ لیکن یہ کاذب ادّعا اگر درست ہوتا تو بچوں
کی حالت اس قدر زبوں اور ان کا اخلاق اس قدر دگرگوں نہ
ہوتا جتنا ہم دیکھتے ہیں۔ سائنسی مطالعہ درحقیقت اس خیال
کی مؤید نہیں ہے۔ بار بار کی تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ
چکی ہے کہ کم سنی میں ماں اور بچے کا گہرا ربط بچے کی نفسیاتی اور جسمانی
صحت کے لئے از حد ضروری ہے اور اس خدمت کو ماں کے علاوہ کوئی اور
خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام نہیں دے سکتا۔

سائنسی شواہد کے علاوہ اسکول کی عمر سے پہلے ان کی تربیت کی
اہمیت کا تجربہ خود مجھ کو بھی ہے کیونکہ میرا پیشہ ہی بچوں کی تربیت اور
ان کا علاج ہے۔ خود میرے اپنے دو بچے ہیں اور ان کی پرورش
اور تربیت کے ذاتی تجربے سے جو کچھ میں نے سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ
اس عمر میں والدین کی ذاتی توجہ بچوں کی آئندہ زندگی کو بنانے اور
سنوارنے میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔

ہمارے دونوں بچے، جیسا کہ ہر بچہ ہوتا ہے بہت عقدۂ مشکل
ہیں میری بیوی اور میں دونوں یہ چاہتے ہیں کہ اپنی ذاتی نگرانی میں ان کو پروان
چڑھائیں کیوں کہ یہ وہ عمر ہوتی ہے جس میں بچے کی سیرت، خو اور
عادات کی بنیاد پڑتی ہے۔ زندگی کی تعمیر کی ابتدائی اینٹیں اسی عمر میں
رکھی جاتی ہیں۔ ان ہی ابتدائی اینٹوں پر پوری عمارت کی کجی و راستی
اور موزونیت موقوف ہوتی ہے۔ ایک لڑکی ہے جس کی عمر دس سال
کی ہے۔ تین سال کے بعد وہ جوان ہونی شروع ہو جائے گی۔ مجھ کو
اس بات کا اقرار ہے کہ اپنی بیٹی کی محبت اور اولاد سے ربط کو جو تسکین
ہوتی ہے اس میں خلل پڑے اور اس کے بچپن کے بقیہ قیمتی ایام کسی صورت
سے بھی ضائع ہوں۔ مجھے یہ بالکل گوارا نہیں ہے۔ لڑکے کی عمر پانچ سال
ہے۔ یہ بہت چلبلا ہے اس پر ہر وقت نگاہ رکھنی پڑتی ہے اور نہایت
سرعت کے ساتھ جسمانی اور جذباتی لحاظ سے منقلب ہوتا جا رہا ہے اور
بعض اوقات اس کی یہ سریع تبدیلی میرے لئے اندیشے کا باعث ہو جاتی
ہے۔

ان دونوں کی جسمانی اور جذباتی عمارت میں اینٹ پر اینٹ
رکھی جا رہی ہے اور ہر اینٹ کو دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی صحیح جگہ
پر اور صحیح رکھی گئی ہے یا نہیں۔ وہ لوگ جو مجھ سے اتفاق نہیں رکھتے
میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہستی کی اس نمو کی نگرانی کے کام کو
کس پر چھوڑا جا سکتا ہے اور نگرانی کے بغیر ہستی کی پروئیدگی کی
کی یہ خود رو نمو بے ڈھنگا پن بھی اختیار کر سکتی ہے جو پختگی کے بعد
ناقابل اصلاح ہو جائے گا۔ اگر خود میں اور میری بیوی اس کام کو
انجام نہ دیں تو کون اس کام کو اس محبت، اس لگن اور اس خوبصورتی
و نرمی کے ساتھ سر انجام دے سکتا ہے اور جس انفرادی توجہ کی بچوں کو
اس عمر میں ضرورت ہوتی ہے اس کو ماں باپ کے علاوہ کون فراہم
کر سکتا ہے؟

میرے بیٹے اور بیٹی کو ان اقدار و عقائد سے کون آشنا کر سکتا
ہے جو مجھے اس قدر عزیز ہیں۔ اس عمر کے بچے ماحول اور گرد و پیش کو سمجھنے
کے لئے سوالات کی بوچھار کرتے رہتے ہیں، کون ہے جو پوری توجہ اور شفقت

سے ان کے وہ جوابات دے سکتا ہے جو والدین کے نقطۂ نظر سے دبے جانے چاہئیں۔ بچوں کی بیش بہا اور دل آویز امانت جو قسمت کی طرف سے والدین کو ودیعت کی جاتی ہے دنیا کے سارے کاروبار کی اساس اور انسانیت کی ہر طرح کی ترقی کی بنیاد ہے۔

ضروری ہے کہ بچوں کی تربیت کے موقع کو کسی صورت سے ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے اور ان کی جسمانی پرورش کے ساتھ ان کی ذہنی، روحانی، اخلاقی، جبلی اور انسانی خصائص کا نشو و نما اور اصلاح و انضباط کو مدنظر رکھا جائے کہ زندگی کا یہ پہلو اس کے مادی پہلو سے کم اہم نہیں ہے۔

مجھ کو اس قوم پر تعجب ہوتا اور اس کی بدبختی پر افسوس بھی، جو اس کام کو بے سود سمجھتی اور انسان کی بہبود سے اس کا گہرا اور لازمی علاقہ تصور نہیں کرتی۔

میں جانتا ہوں کہ بسا اوقات والدین بچوں کے شور و غوغا اور ان کی شرارت سے عاجز آجاتے ہیں لیکن ان کو ڈھنگ سے پالنے کے جو انعامات دنیا و آخرت میں ملتے ہیں وہ آگے چل کر کوفت کے مقابلے میں کہیں زیادہ راحت و نشاط کا باعث ہوتے ہیں۔ کوئی رفاہی اور اصلاحی تحریک کم سنی میں۔ بچوں کی معقول تربیت سے زیادہ بنیادی، ضروری اور منفعت بخش نہیں۔ (بشکریہ ہمدرد صحت)

لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ

اس گرانی کے زمانے میں غریب لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بڑا ہی دشوار ہو گیا ہے۔ شادیاں شادیوں ہی کی طرح ہوتی ہیں۔ لچکے پٹھے سے کپڑوں کو چمکانے اور بھڑکانے والی چیزیں بھی اتنی گراں ہو گئی ہیں کہ ان کا خریدنا آسان نہیں رہا۔ ایک دوپٹہ کے لئے معمولی سا لچکا بھی لیا جائے تو بیس پچیس روپیہ سے کم میں نہ آئے گا۔

پتلی سی کرن کبھی آنچل میں لگائیے تو بیس روپیہ میں آئے گی۔ شادیوں کے دسیوں جوڑوں کے لئے۔ یہ سب لیا جائے تو سینکڑوں روپیہ صرف ہو جاتا ہے پھر شادی بیاہ پر ہی منحصر نہیں ——— خواتین اور لڑکیاں عام دنوں میں لچکے لگے دوپٹے استعمال کرتی ہیں۔ سورتی بیلیں اور چمپا جھلکی وغیرہ لگا کر دوپٹے اور ساریاں پہنتی ہیں

ان مشکلات کا حل سائنسدانوں نے یوں نکالا ہے کہ اسٹیل کا سامان تیار کر دیا اور ایسا کہ چاندی سے زیادہ دلکش اور بھڑکیلا یہ بھی نہیں کہ استعمال سے کالا پڑ جائے یا خراب ہو جائے اور دام نسبتاً بہت ہی کم نائلون کے ستارے سنہرے ستاروں کو مات کرتے ہیں۔ یہ اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ ایک تولے میں لاتعداد چڑھتے ہیں ان کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اس طرح کا تمام سامان .. .. .. آپ کو

ڈاکیہ

(رفیعہ بٹ)

کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے پٹ سے ڈھیر ساری روشنی کمرے میں در آئی تھی۔ سورج کب سے نکلا ہوا تھا۔ کمرے میں خاصا حبس ہو رہا تھا۔

ماں کے بار بار جگانے پر بھی وہ ابھی تک پڑا سو رہا تھا۔ باہر سے اٹھ کر اندر آ لیٹا تھا۔ اور جوانی کی نیند اس جھلنگا سی چارپائی پر بھی بسیرا کئے ہوئے تھی۔

ماں نے کمرے کی صفائی بھی کر لی تھی۔ ٹوٹے پھوٹے فرش پر اس کی دس سالہ بہن نے گیلا کپڑا بھی پھیر دیا تھا۔ میلے برتن بھی باہر نل کے نیچے دھو ڈالے تھے۔ اور باہر سے بستر لا کر بھی ایک کونے میں تہہ کر کے رکھ دیئے تھے۔

ماں ناشتہ بنانے بیٹھ گئی۔ دو پراٹھے پکائے۔ اور سلور کی دیگچی میں چائے اُبال لی۔ اپنے اور سکینہ کے لئے اس نے سوکھی گیلی دو چپاتیاں بھی اتار لیں۔

مٹی کی ہنڈیا میں رات کا تھوڑا سا بچا سالن اس نے ناک کے قریب کرتے ہوئے سونگھا۔ گرم کرنے سے پہلے اندازہ کیا۔ کہ خراب تو نہیں ہو گیا۔ گرمی بھی تو رات بہت تھی۔ لیکن سکینہ خاصی سمجھدار تھی۔ ہنڈیا گھڑوں کے قریب رکھ دی تھی۔ بار بار یہاں پانی گرتا تھا۔ اور مٹی ٹھنڈی رہتی تھی۔

سالن گرم کرتے ہوئے اس نے بیٹے کو دو تین کراری سی آوازیں دیں۔

"ابھی بڑا وقت ہے ماں۔ کیوں لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئی ہو" وہ آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔ اور پھر ایک زوردار جماہی لی۔ کروٹ بدلی اور تکیے کے نیچے سے بیڑی نکال ہونٹوں میں دبائی۔

"ماچس۔ ماچس۔" وہ زور سے چلایا۔ سکینہ دوڑی دوڑی ماچس لے آئی۔

"پھر نکال لی تم نے میری ماچس۔ ہزار دفعہ کہا ہے چولہے کے لئے الگ ماچس رکھا کرو۔" بڑبڑاتے ہوئے اس نے بیڑی سلگائی۔ جھٹک کر جلتی تیلی بجھائی اور پھر کمرے کے ٹوٹے پھوٹے فرش پر پھینک دی۔ ماچس تکیے کے نیچے سرہانے رکھ دی۔ چارپائی پر پورا جسم پھیلائے ہوئے وہ مزے سے کش لینے لگا۔

کئی لمحے وہ یونہی پڑا رہا۔ پھر بیڑی پھینکتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک بھرپور انگڑائی لی۔ اور چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ سکینہ نے جلدی سے اس کا بوسیدہ ربڑ کا چپل اس کے پاؤں کے قریب رکھ دیا۔

اس نے چپل پاؤں میں اڑسے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ تازہ دم تھا۔ اور روزمرہ کی ڈیوٹی دینے پر ذہنی اور جسمانی طور پر آمادہ۔ اس نے سامنے دیوار سے لگی کھونٹی پر اپنی وردی پر نگاہ ڈالی۔ پتلون کے پائنچے ادھڑے ہوئے تھے۔ اور بش شرٹ بھی خاصی بوسیدہ ہو رہی تھی۔ وہ کتنے عرصے سے نئی وردی کے لئے سوچ رہا تھا۔ لیکن گھر کے حالات۔!

اس کی نظریں وردی کے برابر میں ٹنگے ماں کے پیوند لگے کرتے پر پڑیں۔ اور ساتھ ہی سکینہ کی میلی کچیلی شلوار قمیض دیکھی۔ یہ جوڑا جانے کس رنگ کا تھا۔ اب تو بد رنگ اس ذہن کی طرح لگ رہا تھا۔ اپنی وردی کا خیال دل سے پھر نکل گیا۔ اس تنخواہ پر اس نے سکینہ کے لئے نئے کپڑے بنوانے کا پکا ارادہ کر لیا۔ تنخواہ تو مہینہ کاٹنے کے اک آزمائش تھی لیکن پھر بھی۔ اس نے سکینہ کے لئے کپڑے ضرور خریدنا تھے۔ خریدنا تو خدا جانے وہ کیا کیا چاہتا تھا۔ لیکن استطاعت ہی نہ تھی وہ اکثر سوچا کرتا۔ کہ جب زندگی اتنی بدصورتی سے گذرنا تھی۔ تو خدا نے ذہن میں اتنی خوبصورتیاں کس لئے بھر دی تھیں۔

ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہ باہر نکلا اور نل کے نیچے بیٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔

وہ ایک مقامی ڈاک خانے میں چٹھی رساں تھا۔

اس نوکری کے متعلق تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ بچپن ہی سے اس کے ذہن میں بڑے خوش کن ارمان تھے۔ لیکن باپ کی بے وقت موت نے سب کچھ ختم کر دیا۔ باپ نچلے طبقے کا آدمی تھا۔ جس کے پاس ورثے میں آئے ہوئے اس چھوٹے سے کمرے اور کچے صحن کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ تھوڑی بہت پونجی تھی بھی تو وہ بیماری میں لگ گئی۔ دور کے رشتہ دار بروقت نہ پہنچتے تو شاید کفن دفن کے لئے بھی قرضہ

والوں کو چندہ جمع کرنا پڑتا۔

پھر انہی رشتہ داروں کے اثر و رسوخ سے اسے چٹھی رسانی کی ملازمت مل گئی تھی۔ بس ضرورت کا منہ کھلا تھا۔ اسے بند کرنے کو اس نے یہ ملازمت اختیار کرلی۔ ورنہ دل سے اسے کام پسند تھا ہی نہیں۔ اس کے خواب تو بڑے سہانے تھے۔

وہ وردی پہن کر تیار ہو گیا۔ بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ کہ ماں نے ناشتے کے لئے پکارا۔

"آ گیا ماں"

"دیر ہو رہی ہے بیٹے"

"ہونے دو"

"بُری بات ہے۔"

وہ ماں کے قریب آ کر اونچی چوکی پر بیٹھ گیا۔ ماں نے پُرانی سی چنگیر میں رکھے دونوں پراٹھے اس کے آگے کر دیئے۔ رات کا بچا سالن بھی ایک پراٹھے پر ڈال دیا۔

سامنے ہی بوری بچھائے سکینہ بیٹھی اپنی سوکھی گیلی روٹی چائے میں ڈبو ڈبو کر نگل رہی تھی۔

"ماں"

"ہاں"

"یہ پراٹھا سکینہ کو دیدو۔"

"کھا جو رہی ہے"

"میں دیکھ رہا ہوں جو وہ کھا رہی ہے"

ماں نے سکینہ سے روٹی لے لی اور دوسرا پراٹھا اسے دیدیا۔ وہ بیچاری ہراساں سی ماں اور بھائی کا منہ تکنے لگی۔

"کھاؤ کھاؤ" اس نے پیار سے کہا۔ اور پھر ماں سے بولا "ماں سب کے لئے ایک جیسی روٹی پکایا کرو"

ماں ہنس پڑی — اور پھر آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے بولی "تجھے تو سارا دن ڈیوٹی دینی ہوتی ہے بیٹے"

"تو کیا ہوا — تم دونوں کو سارا دن گدیلوں میں پڑی آرام کرتی رہتی ہو"

ماں گیلی گیلی مسکراہٹ سے اُسے دیکھنے لگی۔ اور وہ چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے بولا "میرا بس چلے ماں تو میں۔ میں۔

جانے کیا کیا کروں تمہارے لئے"

"جیتے رہو بیٹا۔ اب بھی کیا کم کر رہے ہو — خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اس نے کسی کا محتاج نہیں کیا۔ عزت کی روٹی مل رہی ہے"

وہ کچھ نہیں بولا — بیزار بیزار سا اٹھا۔ اور کام پر چل دیا۔ اس کام سے اس کی ذہنی مطابقت کبھی نہ ہو ئی تھی۔ ڈاک خانے جاتا — تھیلا ڈاک سے بھرتا۔ منی آرڈر کی رقم جیب میں ڈالتا۔ پارسل اٹھاتا اور محلے محلے تقسیم کے لئے مشینی انداز میں چل دیتا۔ کوئی خوشی کا جذبہ ابھرتا نہ غم کا — بس میکانکی انداز میں ساری ڈاک تقسیم کر کے لوٹ آتا۔

معمول کی طرح آج بھی وہ اپنے تھیلے میں اپنے حلقے کی ڈاک بھر رہا تھا۔ کہ فضلے نے اسے خوشخبری سنائی۔

کل سے تیری ڈیوٹی کا حلقہ بدل گیا ہے۔"

حلقہ ہی بدلا ہے ڈیوٹی تو نہیں بدلی"

تجھے بڑی بڑی کوٹھیوں میں ڈاک تقسیم کرنا اچھا لگتا ہے نا"

وہ ہنس پڑا۔ فضلے سے اکثر وہ ایسی باتیں کیا کرتا تھا۔ بڑی بڑی جہازی سائز کوٹھیوں کے جھم جھم کرتے برآمدوں میں جب وہ خط پھینکتا تو صفائی اور آرائش اس کے حواس پر بڑا جاندار اثر چھوڑتے۔ بھاری بھرکم بیگمات۔ صحت مند بچے۔ رنگین ٹیلیویژن۔ ایسی جامہ زیب جوان لڑکیاں یہاں نگاہوں کی تسکین کے کچھ تو سامان تھے۔ ان بنگلوں اور کوٹھیوں کی تو دنیا ہی نرالی تھی۔

اور یہ نرالی دنیا اسے بہت ہی اچھی لگتی تھی۔

وہ اکثر اس دنیا کا اپنی دنیا سے موازنہ کیا کرتا تھا۔ ایک بات اس کی سمجھ میں کبھی بھی نہ آئی۔

اس نے ہمیشہ سنا تھا کہ جوانی بذات خود حسن ہے۔ لیکن اس کا مشاہدہ اس بات کے برعکس جاتا تھا۔ نذیراں بھی تو جوان تھی لیکن اس کی جوانی میں اسے کبھی حسن نظر نہ آیا تھا۔ میلی کچیلی سی لڑکی۔ جس کا ایک ہاتھ ہمیشہ اُلجھے بالوں میں کھجلی کرتا رہتا۔ جس کے قریب سے گذرتے ہوئے کھٹی لسی کی بدبو آتی تھی۔ اس کے برعکس انجینئر صاحب کی وہ موٹی سی صاحبزادی — شمیم صاحب کی نرم و گداز قسم والی شاداب شاداب بیٹی۔ خط تھیلے میں سے نکالنے کے بہانے وہ کئی بار حسن کے قریب سے محظوظ ہوا کرتا تھا۔ نذیراں کا اس سے موازنہ کرتے ہوئے وہ لاشعوری طور پر کراہت محسوس کرتا رہتا تھا۔ بھی

لئے جب جاگتی ہونٹوں اور گدلی گدلی آنکھوں والی نذیراں کے متعلق ماں نے دبے دبے لفظوں میں رشتے کے لئے کہا تھا۔ تو وہ آتش زیرپا سے اُبھر پڑا تھا۔ پھر اس بری طرح کہ ماں پریشان ہو گئی تھی اور جب ذرا خود بھی ذہن کو ٹھکانے پر لانے پر کامیاب ہوا تھا۔ تو شرمندہ سا ہو گیا تھا۔ لیکن نذیراں! اسے برداشت کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

نیا حلقہ اسے پسند آیا۔ وسیع و عریض کوٹھیوں کے مشرقی سمت پھیلے دو محلوں اور بڑی مارکیٹ سے لیکر مین بازار تک اسے ڈاک تقسیم کرنا ہوتی۔ قلقل قہقہے لگتی عورتیں گل رنگ لڑکیاں اور گول مٹول اجلے لباسوں والے بچے دیکھنا اب روز کا معمول ہی تھا۔

جوانی غریب کی ہو یا امیر کی۔ سوچیں یکساں ہی ہوتی ہیں۔ وہ بھی ان دنوں جاگتے میں بڑے زعفرانی خواب دیکھنے لگا تھا۔ کئی دفعہ تو یوں بھی ہونے لگا کہ وہ اپنے خوابوں میں کھویا چلا جا رہا تھا اور کئی مکانوں اور دکانوں کی ڈاک تھیلے ہی میں پڑی یا ہاتھ میں پکڑی رہ گئی ہے۔ احساس ہونے پر اسے واپس چلنا پڑتا۔ اس کے ہونٹ متبسم ہو جاتے۔ جیسے حماقتوں پر اُسے کبھی افسوس نہ ہوا۔

روز کا معمول اور راستہ ایک ہی تھا۔ بڑی مارکیٹ سے مین بازار وہاں سے کشادہ گلیوں والے دونوں محلے اور پھر جہازی سائز کوٹھیاں۔ وہ خراماں خراماں ڈاک بانٹتا۔ فاصلے نپٹاتے چلا جاتا۔

لیکن چند دنوں سے وہ ایک عجیب و غریب بات نوٹ کر رہا تھا۔ اتنی عجیب کہ اس کی صداقت پر اسے یقین ہی نہ آتا تھا۔

مین بازار سے جب وہ گلی نمبر ایک سے ہوتا دوسری گلی میں مڑتا۔ تو سبز کھڑکیوں دروازوں والا ایک دو منزلہ مکان دائیں ہاتھ پڑتا۔ اس کے بیرونی دروازے پر موٹے کپڑے کا بے رنگ سا پردہ ہمیشہ لٹکا رہتا تھا۔

پہلے تو اس نے کبھی خیال نہیں کیا تھا۔ لیکن چند دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ پردے کی اوٹ سے ایک چہرہ جھانکتا ہے۔ آدھا کھلا چہرہ جس پر دو خوبصورت آنکھیں سجی ہیں۔

کئی دن وہ دیکھتا رہا۔ واقعی ایک خوبصورت چہرہ ہر روز پردے کی اوٹ میں ہوتا۔ پہلے جیسے سراپا انتظار کی سی کیفیت اس نے ان خوبصورت آنکھوں میں جھلکتی محسوس کی۔

ایک حسین چہرہ اور وہ بھی سراپا انتظار۔ کئی دن تو اسے اس حقیقت کا یقین ہی نہیں آیا۔ لیکن حقیقت اپنی جگہ تھی۔

اب وہ خوب چوکنا ہو گیا۔ گلی میں داخل ہونے سے پہلے وہ اپنے سراپا پر نگاہ ضرور ڈالتا۔ ہاتھ آپ ہی آپ بالوں کو درست کرنے کے لئے سر تک پہنچ جاتے۔ بس شرٹ کے بٹن بند کر لیتا۔ تھیلا کندھے پر خوبصورتی سے لٹکاتا۔ اور ہاتھوں میں خط لفافے رجسٹریاں بڑے اسٹائل سے پکڑتا۔ ان دنوں اسے اپنی بوسیدہ وردی کا بُری طرح احساس ہونے لگا تھا۔ سکینہ کے کپڑوں سے پہلے اب وہ اپنی وردی بنوانے کا سوچ رہا تھا۔ ویسے ماں سے پتلون کے پائنچوں کی مرمت اس نے کروا لی تھی۔ اور روزانہ استری کرکے وردی پہننا بھی معمول بنا لیا تھا۔ نکڑ والے مکان سے سکینہ لوہے کی استری مانگ لایا کرتی تھی۔ ہلکا پھلکا تھا ہی اس پر سج دھج۔ ان دنوں اس پر خوب نکھار آیا ہوا تھا۔ آنکھوں میں چمکتی شوخیاں۔ ہونٹوں پر مچلتا تبسم آسودگی کس طرح رنگ رنگ میں رچ بس گئی تھی۔

دن ہوتا یا رات اس کے ذہن میں دو خوبصورت آنکھیں انتظار کی کیفیت لئے ابھرتی رہتیں۔

شک کی گنجائش تھی نہ شبہے کی۔ وہ آنکھیں ہمہ انتظار تھیں۔ وہ خاموشی سے اس دروازے کے قریب سے گزر جاتا۔ دل بے اختیار دھڑکنے لگتا۔ اس بت ہوشربا سے چند لمحے باتیں کرنے کی فطری خواہش بھی بیدار ہوتی۔ لیکن وہ ایسی جرأت کیونکر کر لیتا۔ ہاں تقریب ملاقات کے متعلق وہ ضرور سوچتا رہتا۔

"کاش اس گھر کا کوئی خط آ جائے ___" وہ دل میں سوچتا۔ پھر تو بات کرنے کا موقع نکل سکتا ہے۔ اس گھر کا اس نے نمبر نوٹ کیا ہوا تھا۔ اور صبح جب وہ ڈاک تھیلے میں ڈالتا۔ تو تجسس سے لفافوں پر لکھے پتے پڑھنے لگتا۔

اس گھر کا کوئی خط نہ ہوتا۔ مایوسی چبھن بن جاتی۔ اور اس کا ذہن کوئی اور ترکیب سوچنے میں مصروف ہو جاتا۔

پندرہ بیس دن گزر گئے۔ ان پندرہ بیس دنوں میں ایک دن بھی ایسا نہ گیا جو پس پردہ چھپی شگفتہ اور شاداب سی لڑکی کی آنکھوں میں اس نے انتظار کی لوٹتی کیفیت محسوس نہ کی ہو۔ اس کے گھر کے آگے سے خاموشی سے گزر جانے کے بعد کبھی کبھی وہ دل کے ہاتھوں بے چین ہو کر مڑ کر دیکھتا۔ تو وہ حیران آنکھیں اسے ہی دیکھتے ہوتیں۔ ان آنکھوں میں اب انتظار میں مایوسی بھی گھلی ہوتی۔

اس دن اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ ڈاک تھیلے میں ڈالتے ہوئے اس کی نظریں ایک بیرونی ملک سے آنے والے نیلے لفافے پر اٹک گئیں۔ بے تابی سے اس نے لفافہ الٹا پلٹا۔ اسی گھر کا خط تھا۔ مکان نمبر اسے ازبر یاد تھا۔ اور گلی بھی ذہن میں نقش تھی۔

کتنی دیر وہ نیلا لفافہ ہاتھ میں لئے بے پایاں خوشیوں کے سمندر میں ڈوبتا ابھرتا رہا ۔۔ اس کا دل بے اختیارانہ دھڑک رہا تھا۔ کچھ پا لینے کی طمانیت کا احساس رگ و پے میں بھر رہا تھا۔

یہ نیلا لفافہ اس نے ساری ڈاک سے الگ کر لیا۔ بڑی احتیاط سے اسے جیب میں ڈالا۔ اور باقی دستور کے مطابق کچھ تھیلے میں ڈالی کچھ ہاتھ میں پکڑی اور روزمرہ کی ڈیوٹی پر چل دیا۔

آج اس کے قدم کسی بدمست شرابی کی طرح بہک رہے تھے۔ بازار کی کتنی دکانوں پر اس نے غلط خط دے دیئے۔ خط الٹ پلٹ ہوئے۔ واپس مانگ کر جگہ پہنچائے اپنی حماقت پر شرمندگی بھی ہوئی۔

لیکن یہ شرمندگی بھی گنگنا رہی تھی۔

جب وہ ایک گلی سے ہوتا ہوا اس گلی میں آیا۔ تو اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ دل جانو حلق میں آکر اٹک گیا تھا۔ جیب سے لفافہ نکالتے اس کے مضبوط ہاتھوں میں خفیف سی کپکپاہٹ تھی۔

گلی مڑتے ہی اسے معمول کی طرح سراپا انتظار آنکھیں نظر آگئیں۔ اُف اس کا دل کس وحشیانہ بے تابی سے دھڑکنے لگا تھا۔ جانے کیسے قدم اٹھاتے وہ اس گھر کے سامنے آگیا۔ رکا اور نیلا لفافہ بڑی عقیدت بڑی محبت اور بڑے اشتیاق سے پس پردہ چہرے کی طرف بڑھا دیا۔

"ہائے! ایک چیخ تھا جو شیلی مسرت بھری آواز اس لڑکی کے حلق سے نکلی۔ انتہائی بے صبری بے تابی سے وہ پردے کی اوٹ توڑ کر سامنے آگئی۔

گلابی گلابی شاداب شاداب سی لڑکی۔!

وہ بھونچکا سا اسے تکتا رہ گیا۔

اور وہ ایک جھپٹے سے خط اس کے ہاتھ سے لیتی دور مسرت سے چلائی۔ "امی! امی! بھائی کا خط آیا ہے"

پاگل کر دینے والی خوشیوں کا احساس اس کے سراپا پر چھایا تھا۔ [illegible] اندر بھاگی۔

"بھائی کا خط آگیا ماں" خط کو سینے سے لگائے ہوئے وہ خوشی سے رو دینے کو تھی۔ "اللہ کتنے انتظار کے بعد آیا یہ خط۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں راہ تکتے" وہ بہکتے بہکتے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ اس کی ادھیڑ عمر ماں سفید ململ کا دوپٹہ سر پر ٹھیک سے جماتے اس کے قریب آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

"پگلی پڑھ تو سہی کیا لکھا ہے اس نے"

وہ لرزتے ہاتھوں سے خط کھول کر پڑھنے لگی۔

ایک بار بھی تو اس نے پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

اسے یوں لگا جیسے انتہائی بلندیوں سے وہ چکراتا ہوا نیچے کی طرف آ رہا ہے۔ دھم سے وہ نیچے گرے گا۔ اور اس کے وجود کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کی بھی کرچیاں بکھر جائیں گی۔

جب سامنے منزل آجائے

(ناجیہ شمس)

مانی بوجھل دل کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ جی چاہ رہا تھا ساری دنیا کو تہس نہس کر دے۔ بھلا ایسی دنیا میں رہنے کا کیا فائدہ کہ جس میں سکون و اطمینان ہی نہ ہو۔ وہ ٹھہرا ایک سیدھا سادا انسان جو ہر ایک کا دکھ بانٹ لینے کو ہمہ وقت تیار رہتا ہو۔ لان میں سلمان کو دیکھا تو ادھر ہی چلا آیا سلمان اس کا چار سالہ بھتیجا جس سے وہ بے انتہا محبت کرتا تھا اسے دیکھ کر کھل اٹھا۔

"مانی چچا آ گئے" وہ اچھل کر مانی کی گود میں چڑھ گیا۔

"گدھے! اعلان تو ساری دنیا کو بتانے کے لئے کرتے ہو اور گود میں خود چڑھ جاتے ہو" مانی نے اسے گود سے اتار دینا چاہا۔

"ساری دنیا آپ کی گود میں تو آ ہی نہیں سکتی" مانی کو ایک دم ہنسی آ گئی۔

"چلو کھیلو میں کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں" اس نے سلمان کو اُتار کر اندر کا رخ کیا۔

"مانی چچا۔ میری ٹافیاں" سلمان اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"سلمان پلیز، تنگ نہیں کرو میرا موڈ سخت آف ہے" اس نے سلمان کے ہاتھ جھٹک دیئے۔

"جھوٹ! آپ کہتے ہیں آپ کا موڈ کبھی آف نہیں ہوتا" سلمان پیچھے پیچھے چلا آیا۔

"تم میری جان چھوڑو گے نہیں؟"

"نہیں" سلمان نے رعب جمایا۔

بھابھی بڑی دیر سے دونوں کو الجھتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ مانی کا موڈ آف تھا۔ بہت ممکن تھا کہ وہ سلمان کو مارنے لگتا کہ بھابی کو مداخلت کرنا ہی پڑی۔

"سلمان"

"جی امی"

"چچا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں تنگ کر رہے۔ ادھر آؤ میرے پاس"

"تنگ تو نہیں کرتا۔ چچا نے خود ہی کہا تھا کہ"

"چلو ادھر آؤ نا" بھابھی نے سلمان کی بات بھی نہیں سنی کیونکہ وہ مانی کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ رہی تھیں۔ ناچار سلمان کو آنا ہی پڑا۔

"چچا جلدی آیئے گا ورنہ ـــ یاری ختم" سلمان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مانی نے بھی دیکھے تو تھے مگر اس وقت وہ اتنا الجھا ہوا تھا کہ ننھے سلمان سے اپنی دوستی کے ختم ہو جانے کا بھی دکھ نہ ہوا۔

اپنے ہی خیالوں میں گم وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ خلاف معمول کمرے میں کوئی چیز بھی ترتیب سے نہیں رکھی ہوئی تھی۔ لگتا تھا آج کسی نے صفائی ہی نہیں کروائی صبح جیسے وہ کپڑے پھینک کر گیا تھا وہ وہیں پڑے تھے۔ جرابیں صوفے کی پشت پر، بوٹ پلنگ کے پاس اور تکیہ قالین پر پڑا تھا ـــ کوئی اور دن ہوتا تو وہ قہقہے برساتا ہوا خود ہی چیزیں سمیٹنے لگتا لیکن آج تو وہ خواہ مخواہ ہی بگڑ رہا تھا، اسے رات بھر امی کی باتوں نے سونے نہیں دیا تھا۔ بچپن سے وہ خوش مزاج مشہور تھا۔ خاندان والوں کا ہر دلعزیز تھا۔ ہر خوشی، ہر راحت، ہر چیز مل گئی تو زندگی کی ساتھی بھی وہی ملنی چاہیئے تھی جو اس کے دل کی دھڑکن تھی۔ مگر یہاں تو پتہ چلا کہ بچپن میں ہی اس کی منگنی ہو چکی ہے، جسے نہ جانے کیوں چھپایا گیا اور شادی بھی اسی سے کرنا پڑے گی مگر وہ تو بس بلقیس سے ہی شادی کرے گا۔ یہ اس کا فیصلہ تھا۔ سوچوں میں گم اس کی نظر میز پر پڑی۔ پیپر ویٹ کے نیچے ایک لفافہ پڑا تھا۔ مانی نے انتہائی بے ڈھنگے پن سے اسے گھسیٹ لیا اور اوندھے منہ قالین پر لیٹ کر پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

مانی!

تمہارے نام پہلا خط ہے۔ آداب تخاطب سے ناواقف ہوں اسی لئے صرف نام لکھ دیا ہے جس سے تم مشہور ہو۔ سلام یا آداب کہنے کی عادت تو ویسے بھی نہیں ہے۔ بہرحال میں خوش ہوں کہ ان تکلفات کے استعمال نہ کرنے سے دو یا تین لائنیں زیادہ مل جائیں گی۔ تم سے باتیں کرنے کو

مجھے پہچاننے میں تمہیں دیر نہیں لگے گی۔ میں بہت دور نہیں رہتی۔ میں تمہیں اس وقت سے جانتی ہوں جب تم دس سال کے گل زمان تھے۔ پھر مانی ہوئے اور پھر دل کی دھڑکن بن گئے۔ ہر شخص نے تمہیں ٹوٹ کر چاہا ہر دل نے تمہارا پیار پایا۔ مگر ایک میں تھی کہ ہمیشہ تشنہ ہی رہی۔ تم یقیناً یہ سوچو گے کہ کوئی لڑکی تم سے اظہار محبت کر رہی ہے۔ بات تو یہی ہے لیکن اس بات کے پس منظر میں بہت سے واقعات بہت سی دلچسپیاں اور پتہ نہیں کیا کچھ ہے۔ سنو گے؟ لو سنو۔

جب تم گل زمان تھے نا سفید نیکر اور سفید بش شرٹ پہنے تم ایک گیند سے کھیلا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے وہ سرخ اور سفید رنگ کا گیند ایک دن ہمارے گھر آ گیا، اسے لینے تم ہمارے گھر آئے تھے مجھے گیند بھی اچھی لگی تھی اور تم بھی۔ میں خوامخواہ ہی ضد کر بیٹھی سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا لینا چاہتی ہوں گیند یا تم۔ پھر میں نے تمہیں تب دیکھا جب تم کالج جاتے تھے۔ شام کو کرکٹ کھیلنے گھر سے نکلے تو میں اپنی کھڑکی میں کھڑی تمہیں دیکھ رہی تھی۔ سفید کٹ میں تمہیں دیکھا تو وہی سرخ و سفید گیند بھی یاد آئی مگر اس بار دل نے کہا نہیں کھلونا نہیں چاہیئے۔ تمہیں کیسے پاتی۔ تم چلے گئے تو کھڑکی بند کر کے واپس چلی آئی۔ اس رات مجھے نیند ہی نہیں آئی۔ شاید تم بھی نہ سوئے تھے۔ کیونکہ تم نے بھی کھڑکی کی جانب دیکھا تو تھا اور پھر تمام رات تمہارے کمرے کی بتی بھی جلتی رہی تھی۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟

تمہارے بھیا کی شادی ہوئی تو میں تمہارے ہاں آئی تھی۔ تمہارے سفید بے داغ کپڑے جو میرے لئے چاہت کا نشان بن گئے تھے۔ اس موقع پر نظر نہ آئے تو مجھے سخت جھنجھلاہٹ ہوئی۔ میرا جی چاہا تم سے کہوں کہ وہی سراپا اختیار کرو جو مجھے اچھا لگتا ہے۔ مگر پھر سوچا کہ تم میرے کون ہو بھلا جو میرا کہا مانو گے۔ تمہیں بڑی تیزی سے ایک کمرے سے دوسرے میں گھومتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یقین مانو تم بڑے اچھے لگ رہے تھے مجھے۔ امی نے مجھے باہر جانے کو کہا تو میں اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ اسی لمحے تم سامنے کے کمرے سے نکلے ذرا ما ٹھٹھکے تو تھے۔ شاید یہ میری نظر کا دھوکا تھا کیونکہ اسی لمحے تم واپس مڑ گئے تھے۔

"مانی بھیا! بات تو سنیئے تمہاری کسی کزن نے کہا تھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ تم کتنے بدل چکے ہو۔ اچھے خاصے گل زمان ہوا کرتے تھے۔ اب تو بالکل ہی مانی ہو گئے ہو۔

"مانی بیٹا! ذرا اِنھیں کو تو بھیلا دو" تمہاری خالہ جان کہہ رہی تھیں۔

"مانی بھائی جان! ذرا کرسیاں تو اندر بھجوا دیں۔"

"مانی باہر آؤ" تمہارے دوستوں نے کہا۔

"ارے یار! سانس تو لینے دو" تم پھر بھی ہنس رہے تھے۔

"مانی چچا" ایک چھوٹا سا بچہ تمہاری ٹانگوں سے لپٹ گیا اور تم نے اسے گود میں اٹھا لیا۔

مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ ہر کونے سے لوگ تمہیں پکار رہے تھے اور تم ہنستے مسکراتے ہر کام کھارہے تھے مگر تمہیں پتہ ہی نہ چلا کہ دونوں آستینیں چڑھائے تم جو بھاگ بھاگ کر کام کر رہے تھے اور تمہارے بال بکھر کر تمہارے چہرے پر آ گئے تھے تو تم کس قدر اچھے لگ رہے تھے۔

"حد ہو گئی بھئی" تمہاری خالہ جان اندر آ گئیں "یہ مانی ہے یا طوفان باتیں بھی کئے جا رہا ہے اور کام بھی اور میں خوامخواہ ہی خوش ہو رہی تھی کہ تمہارے لوگ تمہیں کتنا پسند کرتے ہیں تمہارے بھیا جن کی شادی ہوئی تھی اندر چلے گئے۔

"مانی ڈیئر!"

"مانی ڈیئر!" میں نے زیر لب دہرایا تھا "اچھا لگتا ہے" میں نے سوچا تھا مگر اسی لمحے تم اندر چلے آئے تو سوچیں منقطع ہو گئیں۔

"جی! حکم سرکار!" تم میرے بالکل سامنے تھے۔

"یار تم تو بالکل ہی سوشل ورکر ہو گئے" تمہارے بھیا نے تمہارے گلے میں باہیں ڈال کر تمہیں باہر لے جانا چاہا تھا۔ مگر تم ٹھہر گئے تھے۔ مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ تم میری طرف دیکھ رہے ہو مگر۔

"چلیئے صاحب اب تو آپ ہر لحاظ سے سینئر ہو گئے حکم ماننا ہی پڑے گا" تم کمال بے نیازی سے آگے بڑھ گئے تھے اور میں خوامخواہ شرمندہ سی ہو گئی۔

پھر میں نے دور ہی سے دیکھا تم اپنی بھابھی سے چھیڑ خانی میں مصروف ہو۔ وہ بے چاری سمٹ سمٹ کر قہقہے ضبط کر رہی تھیں اور اس کی سہیلیاں دانتوں میں دوپٹوں کے پلو دبائے ہنس رہی تھیں۔ اللہ مانی! میرا جی چاہا تھا کہ اتنی ساری لڑکیوں کے جھرمٹ میں کاش میں بھی ہوتی۔ تم ملتے یا نہ ملتے تمہارا قرب تو ہوتا مگر مجبور تھی۔ چل کر تمہارے قریب نہیں آ سکتی تھی نا۔

میں نے ایک عرصہ تک خود کو بالکل چھپائے رکھا۔ تم یاد آئے تو چیخ چیخ کر رونے کو دل چاہتا۔ میں جو دل و جان سے تمہیں چاہتی تھی تم پر اظہار نہیں کر سکتی تھی اور پھر ہر روز تمہارے ہاں جانا بھی تو

نہیں سکتی تھی نا! حالانکہ دو قدم پر تو تمہارا گھر تھا۔ پھر یہ بھی تو ہوسکتا تھا نا کہ تم مجھے دیکھ کر مجھ سے نفرت کرنے لگتے ہے نا؟

ہمارے ہاں مٹھائی آئی تو پتہ چلا کہ خیر سے تم پجاری گئے ہو مگر تمہارا بھتیجا میں دیکھنے خود تمہارے ہاں نہ گئی اور ایک عرصہ کے بعد میں نے اسے دیکھا۔ ساتھ میں تم بھی تھے۔ میں کھڑکی کے قریب بیٹھی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ کھڑکی پر کسی نے دستک دی۔ ہاتھ بڑھا کر کھولی تو وہ تم تھے مانی۔ تھوڑی دور تمہارا دو سالہ بھتیجا ننھے ننھے قدموں سے چلتا ہوا تمہاری جانب آرہا تھا۔ میں تو بس تمہیں دیکھتی ہی رہ گئی۔ انہی سفید کپڑوں میں تھے۔ اور تمہارا بھتیجا بھی سفید شرٹ میں ملبوس تھا۔ تم میری بیوقوفی پر ضرور ہنسو گے مگر یقین کرو مجھے پاکیزگی کی حد تک سفید چیزیں دیکھنے اور چاہنے کا خبط تھا اور ہے بھی۔ چند لمحے تو تم نے بھی دیکھا پھر سر جھکا دیا تھا۔

"آپ کے صحن میں ہماری گیند گر گئی ہے" تم مجھ سے مخاطب تھے۔ میں کتنی نروس ہو رہی تھی۔

"لے لیجئے۔ دروازہ کھلا ہی ہوگا" میں نے بمشکل کہا تھا اور تم واپس چلے گئے۔ میں خوش تھی کہ تم آج میرے گھر کے صحن میں آئے۔ میرے گھر کی مٹی تمہارے قدموں میں گلزار ہوگئی ہوگی۔ ایمان سے کہنا ذرا کہ اس رات بھی تمہارے کمرے کی بتی کیوں جلتی رہی تھی۔

تمہارے گھر میں کوئی فنکشن تھا۔ امی مجھے بھی ساتھ لے گئی تھیں۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ تم کسی امتحان میں کامیاب ہوئے ہو۔ تمہاری کوئی عزیزہ کہہ رہی تھی کہ مانی ایک ایسا نگینہ ہے جو ہر جگہ اور ہر چیز پر فٹ ہوجاتا ہے۔

"اچھا؟" میں نے سوچا تھا۔

تمہاری ایک کزن نے کمال بے اعتنائی سے کہا تھا "مانی بھیا تو اوتار معلوم ہوتے ہیں"۔

"کمال ہے" میں نے پھر سوچا۔ اسی لمحے میں نے غور کیا کوئی دروازے میں کھڑا بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا وہ تم تھے اور ساتھ تمہاری بھابھی بھی تھیں۔ مگر میری خوش فہمی کو تم نے اسی وقت ختم کردیا اور اپنی کزن سے مخاطب ہوگئے۔

"فوزیہ! تم ڈائیلاگ نہ بولا کرو"۔

"میں نے کیا کہا ہے"۔

"یہی اوتار والی بات"۔

"میں نے جھوٹ کہا؟ کیوں بھابی؟" وہ بے چاری حیران تھی"۔

"ہوسکتا ہے یہاں سچ مچ کوئی اوتار موجود ہو۔ وہ خوامخواہ برا مان جائے گا" تم ہنستے ہوئے باہر چلے گئے۔ اور میں خوش فہمی میں مبتلا ہوگئی

میں ہر شام تمہیں تمہارے گھر کے سامنے سلمان سے کھیلتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ مانی! میرے اتنے لمبے خط سے تم یقیناً بور ہو رہے ہوگے کیونکہ تمہارے لئے میں اجنبی ہوں۔ لیکن مجھے وہ بات کہہ لینے دو جس کے اظہار کے لئے میں نے تمہیں اتنا ڈسٹرب کیا۔ گھر میں میرے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ میں نے سنا تھا بہت شیطانی بھی تھی۔ مگر خاموش رہی۔ تم نے تو کبھی اظہار ہی نہیں کیا۔ پھر کس لئے تمہارے لئے تڑپوں۔ تم ٹھہرے ہر دل کی دھڑکن اور خوش شکل، وجیہ نوجوان اور میں — ایک معذور لڑکی جو بیساکھیوں کے سہارے چلتی ہے۔ کل رات تک میں یہی سوچتی رہی تھی مگر آج صبح مجھے پتہ چلا کہ تم میرے منگیتر ہو۔ میں بچپن میں تمہارے نام منسوب کردی گئی تھی۔ مجھے پتہ ہے کہ تم وہ نگینہ ہو جو ہر جگہ فٹ ہوجاتا ہے۔ مجھے یقین ہے تم اپنی والدہ اور بھابی کے کہنے پر مجھ سے شادی پر رضامند ہوجاؤ گے۔ تم مجھے اپنا لوگے مگر — مانی! میں تو معذور ہوں چلنے سے میں جو خود بیساکھیوں کے سہارے چلتی ہوں تمہاری ہمسفر بننے کے لائق نہیں ہوں۔

میں آج خود تمہارے کمرے میں گئی تھی۔ ہر چیز بکھری ہوئی تھی تمہاری لاپروائی اور بے ڈھنگے پن پر ہنسی آئی تھی میں تمہارے کمرے کی ہر چیز کو ترتیب دینا چاہتی تھی مگر یہ تو ٹین ایجرز والی بات ہوتی نا کہ اپنے محبوب کے کمرے کی صفائی کرکے گلدان میں پھول سجا دیئے جائیں۔

تمہاری زندگی کی خوشیوں کے لئے میری اتنی دعائیں ہیں کہ جتنے گگن کے تارے اور جتنے سمندر میں موتی۔ ان سب باتوں پر ناراض نہ ہونا کیونکہ تمہاری بھابی سے سنا ہے تم اپنی پسند کی شادی کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ اسی لیے سب لکھنا پڑا۔ مجھ پر رحم نہ کرنا۔ ہاں کبھی کبھار پاکیزگی اور محبت کی علامت بن کر میری کھڑکی کے سامنے کھیلتے رہنا۔ میں کھڑکی کھلی رکھوں گی تاکہ تمہیں دیکھ سکوں۔

بلقیس

مارے حیرت کے مانی کی چیخ ہی تو نکل گئی "بلقیس! تم ہی تو میری محبت ہو۔ میں جانتا ہوں دوست کہ تم چل نہیں سکتیں۔ مگر سہارے صرف دو ٹانگوں کے تو بنائے نہیں جاتے نا! مجھے تم سے محبت ہے" اس نے دل ہی

دل میں سوچا۔ خط کو تہہ کر کے لفافے میں ڈالا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے بال سہلانے لگا۔

مانی بچیا! دروازے میں سلمان کھڑا تھا۔

"آؤ یار! کیسے ہو؟ ٹھیک ٹھاک تو ہو نا؟" مانی بلاوجہ ہنس دیا۔

"کپڑے تو بدلے ہی نہیں آپ نے؟"

"ز پھر؟" مانی نے اسے اٹھانے کے لئے دونوں بازو پھیلا دیئے۔

"پھر یاری ختم" سلمان نے کٹی کر دی۔

"ارے یار ختم کہاں! اب تو۔

کیا؟

کٹ پیس تو دوست اور ہاں! آج گینہ کو صالحہ آنٹی کے صحن میں ضرور پھینکنا"! مانی نے اسے اٹھا لیا تھا۔

"سلمان! وہ جانتی ہی نہیں کہ وہ اگلے ماہ میری دلہن بن کر آرہی ہے۔ وہ مجھے تب سے اچھی لگتی تھی جب بلی "بھی۔ اور اب بھی اچھی لگتی ہے۔ جب وہ بلقیس ہو گئی۔"

"کیا؟"

"ہٹ احمق کہیں کے" مانی نے وہیں کھڑے کھڑے قہقہہ لگا دیا۔

"وہ بھی تیری طرح ہے؛ توف ہے۔ جس نے ناوابستگی میں اظہار محبت میں پہل کر کے میری شرط بھی پوری کر دی۔"

"کون؟" سلمان کو کچھ بھی نہیں آرہی تھی۔

"تمہاری بلی پھوپھو۔"

"اچھا! وہ تو ہمارے گھر آئی ہوئی ہیں" سلمان نے پلکیں جھپکا جھپکا کر مانی کو بتایا۔

"کیا کہا؟" مانی سلمان کو وہیں چھوڑ کر باہر لپکا۔ اسی لمحے بلقیس پر وہ چھوڑ کر بھاگنے لگی۔ اسی تیزی میں بیساکھیاں پھسل گئیں اور قریب تھا کہ گر پڑتی کہ مانی کی مضبوط بانہوں کے حصار نے اسے سنبھال لیا۔

"پگلی! میرا انتظار کیا ہوتا۔ خود ہی چلی آئیں" اور بلقیس نے مارے شرم کے مانی کے چوڑے سینے میں منہ چھپا لیا۔

جواہر پارے

سب سے روح افزا ــــــ خدا کا نام

سب سے پیارے ــــــ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

سب سے اچھا ناصح ــــــ اپنا ضمیر

سب سے اچھی دوا ــــــ امید

سب سے بڑی زحمت ــــــ قرض

سب سے بڑی نعمت ــــــ تندرستی

سب سے بڑا خزانہ ــــــ قناعت

سب سے بڑا حرام ــــــ غصہ

سب سے بڑی نیک نامی ــــــ سخاوت

سب سے بڑی دولت ــــــ علم

سب سے بڑا پاپی ــــــ قرآن و حدیث کا منکر

سب سے بڑا بہادر ــــــ غصہ درگزر کرنے والا

سب سے بڑا جادو ــــــ خوش بیانی اور راگ

سب سے بڑا دشمن ــــــ خوشامد کرنے والا

سب سے بڑا کمینہ ــــــ احسان جتانے والا

سب سے بڑا رذیل ــــــ احسان فراموش

مرسلہ۔ رعنا کوثر (جن پلی)

خط و کتابت کرتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیں۔ اور جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ فرمائیں۔

تبصرا

(ہر کتاب کی تبصرہ کے لئے دو جلدیں آنا ضروری)

زرگذشت (سوانح نوعمری) سائز ۳۰×۲۰/۱۶ صفحات ۲۳۰۔ کتابت طباعت اور کاغذ معیاری۔
قیمت پندرہ روپیہ۔ ناشر ادبی دنیا۔ اردو بازار دہلی نمبر ۶۔

زرگذشت کا دوسرا نام (سوانح نوعمری) ہی ہنسانے کے لئے کم نہیں اور اسی سے اس کتاب کے مصنف مشتاق احمد یوسفی کی مزاح نگاری کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ اس وقت اردو میں چند مشہور اور ہردل عزیز مزاحیہ و طنزیہ لکھنے والوں میں مشتاق احمد یوسفی کا نام بھی شامل ہے۔

یوسفی صاحب کے دو مجموعے چراغ تلے اور خاکم بدہن میں نے کچھ کچھ وقفے سے دو دو بار پڑھے۔ پھر بھی سیری نہ ہوئی۔ افسوس کہ وقت ملتا اور نہ ایک بار پھر پڑھتا شوکت تھانوی مرحوم اور برق آشیانوی صاحب (خدا انہیں پچاسوں سال زندہ رکھے) کے بعد مجھے یوسفی ہی کی مزاحیہ تحریریں پسند آئیں۔

زرگذشت یوسفی صاحب نے اپنی سوانح حیات کے طور پر لکھی ہے اس لئے اس میں ان سے تعلق رکھنے والے ہر طرح کے افراد کا ذکر ہے بطور نمونہ چند سطریں ملاحظہ فرمائیں۔

"مادام بولسٹے کی پونی ٹیل"

سب حیران کہ یہ دم بھر میں کیا ماجرا ہو گیا کہ جنگل کو جنگل ہرا ہو گیا۔ بلکہ راتوں رات اس میں منگل بھی ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس جان حیا کا کایا پلٹ گئی۔ سچ گرم، نگہ گرم، ہنسی گرم اور گرم۔ انگلیوں کو تو ڈانسنگ نہ کرد اس کی لیکن [illegible] اتنے بڑھا لئے کہ اب منہ نوچنے کے علاوہ [illegible] کوئی اور کام نہیں کر سکتی تھی۔ [illegible] کے بجائے پیروں سے ننگا ہوا اسکرٹ پہننے لگی۔ [illegible] کی جگہ بھی [illegible]۔ آنکھوں پر سبز [illegible] سے [illegible] ہوئے [illegible] بھی بھاری [illegible] دل پر [illegible] نہ تھا۔ چاند کی [illegible] کے [illegible] کی جگہ ایک سنہری جالی [illegible] ہے۔ اس [illegible] کہاں آ یہ حال تھا

پر کبھی کبھار بالوں میں فریر گاہٹی سے چوا یا ہوا پھول لگا کر آ جاتی، یا اب یہ نقشہ کہ پرانگلا اٹھائے پھرتی ہے۔"

یوسفی صاحب کے مزاج میں جو برجستگی ہے وہ لاجواب ہے۔ ان کا ادب میں ڈوبا ہوا طنز پڑھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

حریمی دسترخوان

کھانا پکانے کے فن پر ادارہ حریم کی مرتب کردہ یہ کتاب بہت عرصہ قبل سالنامہ حریم کی شکل میں شائع ہوئی تھی اور اتنی پسند کی گئی تھی کہ اس وقت سے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

حریمی دسترخوان میں ہر طرح کے معمولی اور دعوتی کھانے وغیرہ پکانے کی ترکیبیں پوری تفصیل کے ساتھ سمجھا کر لکھی گئی ہیں اور اسی وجہ سے یہ کتاب اکثر لڑکیوں کو جہیز میں دی جاتی رہی ہے۔

ہر گھر میں حریمی دسترخوان ہو تو بڑی آسانیاں ہوتی ہیں۔ کچھ نہ جاننے والیوں اور سب کچھ جاننے والیوں کی ہمدرد و مشیر

قیمت مجلد چھ روپیہ پچھتر پیسے

کارٹون

اخبارات میں چھپتے ہیں اور ہم انہیں دیکھ کر ہنس پڑتے رہے۔

شوکت تھانوی

نے اسی طرح کا ایک ناول لکھا ہے جو کارٹون سے بھی زیادہ ہنسانے والا ہے۔

کارٹون

عرصے کے بعد کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔
طلب فرمائیے۔
قیمت ـ 7/50

لطیفے

• ایک فرم کے منیجر نے اپنی لیڈی سکریٹری سے کہا۔ دیکھو پیاری ہمارے معاشقہ کی خبر میری بیوی کو نہ ہونے پائے، وہ بڑی بد دماغ ہے۔ اسے معلوم ہو گیا تو ہماری زندگی دشوار ہو جائے گی۔

لیڈی سکریٹری نے مسکرا کر کہا "اور ذرا آپ بھی خیال رکھیئے گا کہ میرے شوہر کو بھنک نہ ملے۔ وہ بات بات پر پستول نکال لینے کا عادی ہے۔

• پولیس مین۔ کیا تم وجہ بتا سکتے ہو کہ اتنی رات گئے یہاں کیوں چکر کاٹ رہے ہو۔

آدمی نے جواب دیا "وجہ ہی تو سمجھ میں نہیں آ رہی ہے، ورنہ اب تک میں نے گھر جا کر بیوی کو بتا دیا ہوتا کہ کس وجہ سے آنے میں تاخیر ہوئی۔

• ایک خوبصورت سی لڑکی سڑک پہ چلی جا رہی تھی۔ اس نے اپنے گلے میں بہت پیارا سا خاص قسم کا لاکٹ پہنا ہوا تھا لاکٹ کے درمیان میں ایک ہوائی جہاز بھی لٹکا ہوا تھا۔ لڑکی کے حسن کو دیکھ کر آس پاس کے لوگ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہے تھے۔ لڑکی کو بہت غصہ آیا آخر اس نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کیوں بھئی آپ اتنا گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ لوگوں نے ہوائی جہاز کبھی پہلے دیکھا نہیں" ایک نوجوان آگے بڑھا اور کہنے لگا میڈیم "ہوائی جہاز تو ہم نے بہت سے دیکھے ہیں لیکن اتنا خوبصورت ایروڈرم کبھی نہیں دیکھا"

میاں نے جب آفس جانے کے لئے تیاری شروع کی تو میاں نے دیکھا کہ اس سے پہلے اس کی بیوی بن سنور کے بیٹھی ہے۔ بیوی کو یوں بنا ٹھنا دیکھا تو میاں نے آفس جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور بیوی سے گپ مارنے بیٹھ گیا اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی اس سے قبل کہ بیوی فون اٹھاتی میاں نے فون اٹھا لیا اور اور کہا۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو۔

بیوی کہنے لگی۔ مجھ میں کچھ بات آئی۔

میاں نے فون پہ کہا۔ رانگ نمبر۔۔۔ رانگ نمبر۔۔۔ آپ میونسپلٹی فون کیجئے اور یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

بیوی نے پوچھا کس کا فون تھا، کون تھا یہ۔ میونسپلٹی کا کیا چکر تھا میاں بولا۔ چھوڑو نا کسی پاگل کا فون تھا کسی میونسپلٹی میں فون لگا رہا تھا کہ یہاں کچرا گند

بیوی نے دوبارہ تجسس سے پوچھا۔ اچھا تو کیا کہہ رہا تھا وہ"

میاں نے جواب دیا۔ پوچھ رہا تھا کہ راستہ صاف ہے کیا"

ایک عورت نے اپنی سہیلی کو بتا دیا "شادی کے بعد" مجھے شوہر کی کی ہر بات زہر لگتی ہے۔ جبکہ شادی سے پہلے ان کی ہر بات بڑی پیاری معلوم ہوتی تھی"

سہیلی نے افسوس کرتے کہا "یہ مرد کتنی جلدی بدل جاتے ہیں۔

محبوب کے انتظار میں لذت زیادہ ہے یا اس کی ملاقات میں "لڑکے نے اپنی فلسفی محبوبہ سے پوچھا۔

محبوبہ "انتظار زیادہ لذت انگیز ہے" محبوبہ نے جواب دیا۔

اچھا! تو تم زندگی بھر یہ لذت لیتی رہو۔ میں نے طاہرہ سے شادی کر لی ہے۔

ایک شخص نے شادی کی بیوی ذرا کاہل تھی اور جھاڑو دینے اور صفائی کے کاموں سے جان بچاتی تھی۔ اس شخص نے اپنی ماں سے کہا "اماں تم جھاڑو دو میں تمہارے ہاتھ سے یہ کہہ کر جھاڑو لے لوں گا کہ میرے ہوتے ہوئے آپ کیوں زحمت کرتی ہیں لائیے میں جھاڑو دیتا ہوں شاید اس بہانے سے آپ کی بہو راہ راست پہ آ جائے۔

اماں نے جھاڑو ہاتھ میں لی اور بیٹے نے منصوبے کے مطابق عمل کیا بیوی چالاک تھی، وہ اپنے شوہر کو جھاڑو دیتے دیکھ کر بولی۔ کوئی حرج نہیں ایک روز اماں جھاڑو دے دیا کریں ایک روز تم جھاڑو دے دیا کرو۔

ایک صاحب نے اپنے دفتر کے ساتھی کو بتایا۔ پانچ سال تک میرے اور میری بیوی کے دن خوشیوں کا جھولا جھولتے گزرے۔ مگر اب سے ہمارے درمیان پھر روز روز جھگڑے شروع ہو گئے ہیں۔

دوست نے پوچھا: اس اچانک تبدیلی کا کیا سبب ہے؟

ان صاحب نے جواب دیا: پانچ سال بعد وہ آج میکے سے آئی ہے۔

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں وغیرہ کی مرسلہ ایک ایسی خبر شائع کی جاتی ہے، جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر سے مختصر الفاظ میں لکھی جائے اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ و نمبر خریداری کے ساتھ اس طرح بھیجی جائے کہ ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے، ورنہ ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوگی خبر کے دفتر تک دیر پہنچنے پر دفتر ذمہ دار نہ ہوگا کتابت کی کوئی غلطی ہو جائے پر دفتر کو لکھا جائے تو دوسری اشاعت میں اس کی تلافی کر دی جائیگی۔

ولادت اطفال کی خبریں

- رضوانہ نسرین (ارنگکو و منیرے ماجد ایاسدابی۔ کام دایکس پرلیسڈنٹ بی۔ ایم۔ سی) اور ماہی رحمت النساء کے گلستان حیات میں ۱۰ جولائی ۹۰ء کی شام کو ایک کلی مسکرائی۔ نام دیبا رکھا گیا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- رخشاں تنویر و حمیدہ عشرت (مرزا دازی۔ اجین) ہماری بہن نشاط اختر اور بہنوئی نواب مرزا اختر علی بیگ کے گلشن حیات میں ایک پیاری سی گڑیا کے بعد ۳ جولائی بروز منگل بوقت شب ۹ بجکر ۱۰ منٹ پر اللہ تعالیٰ نے ایک پھول کھلایا۔ پیار کا نام عرشی قرار پایا۔ دعا ہے کہ نومولود والدین اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- حریم کی خصوصی سرپرست بہن فاطمہ ملک صاحبہ (برمنگھم انگلینڈ) کی صاحبزادی عزیزی عذرا آوان سلمہا اور داماد خلیق زماں سلمہ (لندن) کے چمن حیات کو پر بہار بنانے کے لئے اللہ پاک نے ۱۶ جولائی ۹۰ء کو ایک پیاری سی بچی عطا فرمائی۔ دعا ہے کہ خدائے پاک اسے عمر طویل عطا فرمائے صاحب نصیب بنائے اور وہ اپنے والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے (آمین) بہن فاطمہ ملک صاحبہ کو نواسی کی ولادت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

(نسیم اٹھولوی)

پیغامات نشاط

- خیر النساء سید قاسم الحداد (مروڈ جنجیرہ) میری بہن انوری سید قاسم الحداد کی شادی، سید یوسف عرف صابر قادری کے ساتھ ۲۰ مئی ۹۰ء کی شام کو ۵ بجے سہ پہر بمقام راجپوری بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک دلہا دلہن کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔
- مسز امینہ عزیز سیٹھ (میسور) تحریر فرماتی ہیں کہ میرے بڑے بھائی حاجی محمد عثمان سیٹھ کی بڑی صاحبزادی فوزیہ بانو کی شادی، جناب محمد معز حاجی موسیٰ سیٹھ صاحب کے ساتھ بمقام بنگلور، ۳ جون ۹۰ء بعد نماز عصر عمل میں آئی۔ اللہ سے دعا ہے کہ اس جوڑی کو دین و دنیا کی سعادتیں نصیب فرمائے۔ آمین
- ڈگن رضوی (حسن پورہ۔ سیوان) میری پھوپھی زاد بہن ذاکرہ بانو عرف اقبالی کی شادی بشیر علی صاحب (ابن جناب فرمان علی صاحب) بستی کے ساتھ ۱۰ جون ۱۹۹۰ء بروز جمعہ بحسن و خوبی انجام پائی۔ بارگاہ الٰہی میں دست بستہ عرض ہے کہ دلہا دلہن ہمیشہ شاد و خرم رہیں اور دلہن کی گود بچوں سے بھری رہے
- ثریا پروین۔ شائستہ پروین (کلکتہ) ہماری بہن شگفتہ نسیم کی شادی ہمارے پھوپھی زاد بھائی ڈاکٹر جاوید شمسی کے ساتھ ۵ جولائی ۹۰ء کو بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ ہماری بہن و بہنوئی کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔
- سید فیاض حسین جعفری کی دختر نیک اختر رضیہ شاداں جعفری کی شادی سید عسکری رضا جعفری (فرزند سید لائق حسین جعفری صاحب مرحوم) کے ساتھ ۲ جولائی ۹۰ء بمقام خورشید گنج لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم اٹھولوی)

انتقال پُرملال کی خبریں

- سید افتخار حسین رضوی (انسپکٹر ٹیلیفون کلکتہ ریٹائرڈ) افسوس صد افسوس کہ میرے ہم زلف اور سمدھی جناب سید شمس الحسن رضوی (افتخار آباد۔ کانپور) ۴ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ مطابق ۱ اگست ۹۰ء بروز چہارشنبہ بوقت تین بجکر ۲۰ منٹ پر عالمِ

اجل کو لبیک کہا۔ خداوند عالم مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

- عالیہ شاداں (برہان پور) بڑے ہی افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میری خلیق اماں جان کو اللہ پاک نے ۲۱ رجولائی ۹۹ء مطابق ۸ رمضان المبارک بروز منگل ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔ مرحومہ بڑی خوبیوں کی مالک تھیں۔ گذشتہ ۱۰ سال سے بیوگی کی زندگی گذار رہی تھیں۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔
- عطیہ جمال احمد (پونا) انتہائی رنج و غم کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ ۱۶ رجولائی ۹۹ء کو میری عزیز بہن ام کلثوم بی بی بعارضہ کینسر بمبئی کے ٹاٹا ہسپتال میں انتقال کر گئیں۔ اللہ پاک مرحومہ کو بخشے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)
- نسرین صادق (میسور) بہت افسوس کے ساتھ تحریر کر رہی ہوں کہ میرے خسر الحاج خلیل الرحمٰن صاحب مختصر سی علالت کے بعد ۸ رجولائی ۹۹ء مطابق ۲۴ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ انتقال فرما گئے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ دعا ہے کہ خدا انھیں جنت نصیب کرے۔ اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔
- مس نسرین سلطانہ (دھلور۔ میسور) نہایت رنج و غم کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے بڑے بہنوئی ڈاکٹر محبوب علی صاحب حیدرآباد (پیرانہ سالی) و ناتوانی کے باعث ایک سال سے پریشان تھے اور ۸ جولائی ۹۹ء بروز جمعرات ہم سب کو روتا چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوئے۔ مرحوم بڑے پابند صوم و صلوٰۃ اور متقی پرہیزگار تھے۔ انتقال کے روز بھی نماز مغرب ادا کی اور وظائف کی تیاری کر رہے تھے کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے اس کا موقع نہ دیا۔ اللہ پاک مرحوم کو غریق رحمت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

کیا آپ کسی بات کا جواب چاہتی ہیں
اگر ہاں ہے تو آپ کے جواب کا مرڈ یا ٹکٹ بھیجنا چاہیئے۔ ورنہ بغیر ٹکٹ کے آپ کو جواب نہ مل سکیگا
(ادارہ حریم)

بقیہ صفحہ (۳۲) سے آگے

کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہہ پوچھا "محترمہ! ہماری شاپنگ کا کیا ہے گا؟"

کہنے لگیں "یہ سب اہتمام آپ ہی کے لئے تو کیا جا رہا ہے"

"یہ پرس ہمارے لئے خرید رہی ہیں؟"

خفا ہوتے ہوئے بولیں "شادی ہوئے کتنے برس گزر گئے لیکن ابھی تک اجنبیت برتتے ہیں۔ حالانکہ میں آپ کے گھر کو اپنا گھر اور آپ کی چیزوں کو اپنی چیزیں سمجھتی ہوں۔ اگر آپ کا دل صاف ہوتا تو آپ کبھی یہ نہ پوچھتے کہ میں یہ پرس کس کے لیے خرید رہی ہوں۔ اگر میں اپنے لئے بھی خریدوں تو وہ اصولاً آپ ہی کا ہوگا۔ کیونکہ اس میں آپ ہی کی تنخواہ رکھی جائے گی۔

دریافت کیا "محترمہ وہ کون سی جگہ ہے جہاں کوئی چیز رکھ دی جائے تو وہ دوبارہ نہیں ملتی"

برجستہ بولیں "میری الماری"

عرض کیا "پھر ہمارا وہ الاؤنس جو جلوں کی صورت میں آپ نے عطا فرمایا ہے اسے بھی اس الماری میں رکھ دیجئے کیونکہ ہم اس سے دست بردار ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔"

(بقیہ حریم کا دسترخوان صفحہ ۳۰ کا)

پر رکھیں تو چاندی کا ورق بھی لگا دیں۔

خیال رہے کہ قوام نہ زیادہ پتلا رہے نہ زیادہ گاڑھا۔ اگر قوام پتلا رہا یعنی کم پکا تو سوئیوں کے پھول جانے کا ڈر ہے۔ اگر قوام سخت یعنی گاڑھا ہوا تو سوئیوں کے اینٹھ جانے کا امکان ہے۔ درمیانی قوام بہتر رہتا ہے۔

سوئیوں کے زردے کی خوبی یہ ہے کہ سوئیاں زیادہ گلیں نہ ٹوٹیں بلکہ سخت رہیں۔ تیاری پر معلوم ہو کہ یہ سوئیوں کا زردہ ہے۔

مرسلہ۔ شہزادہ بیگم نسیم [illegible]

پھول یا کانٹا

عورت پھول بھی ہے اور کانٹا بھی۔ حیا اسکا زیور ہے تو وہ پھول ہے۔ اگر وہ اس جوہر سے خالی ہے تو ایک کانٹا ہے۔

مرسلہ۔ شاہدہ تبسم [illegible]

حریمی دسترخوان

دم کیا ہوا مرغ

یہ مرغ صرف پندرہ منٹ میں تیار ہوجاتا ہے۔

اشیاء: مرغ ایک عدد، نہ بچہ ہو نہ بوڑھا۔ جوان پٹھا ہو جس کا وزن ۵۰۰ گرام کے لگ بھگ ہو۔ پیاز ۲ آنڈی۔ دہی ۱۰۰ گرام۔ گھی ۱۰۰ گرام کچا پپیتا پسا ہوا چار کا ایک چمچہ سُرخ مرچ پسی ہوئی چار کا ایک چمچہ یا کم و بیش حسب خواہش۔ ادرک پسی ہوئی چار کا ایک چمچہ۔ ہلدی پسی ہوئی چار کا نصف چمچہ گرم مسالہ پسا ہوا چار کا ایک چمچہ۔ لہسن پسا ہوا چار کا ایک چمچہ۔ نمک حسب ضرورت۔ ہرا دھنیا اور ہری مرچ کٹا ہوا حسب خواہش۔

ترکیب:۔ مرغ کو صاف کرکے اچھی طرح دو تین بار دھولیں۔ پیاز کو باریک لمبے کاٹ کر پورے گھی میں تل کر گلابی کرکے گھی سے نکال کر کسی پلیٹ میں پھیلادیں۔ تھوڑی دیر بعد اسے مسل کر تمام پسے ہوئے مسالے اور دہی ملاکر مرغ پر اندر باہر لگائیں اور پریشر ککر میں رکھکر گھی اور چار کی ایک پیالی یا ڈیڑھ پیالی پانی ڈال کر پریشر ککر بند کرکے گیس یا چولھے پر چڑھادیں۔ تیز آنچ ہو تو پندرہ منٹ میں مرغ بالکل تیار ہوجائے گا۔ تیاری کے بعد اسے کسی ڈش میں نکال کر ہری مرچ اور ہرا دھنیا کاٹ کر چھڑک دیں۔

گلاوٹ کے کوفتے

سامان:۔ قیمہ ۵۰۰ گرام۔ سُرخ مرچ پسی ہوئی چار کا ایک چمچہ۔ نمک اندازسے۔ ہلدی پسی ہوئی چار کا آدھا چمچہ۔ پیاز ایک بڑی گٹھی۔ لونگ ۵۔ چھوٹی الائچی ۵۔ بڑی الائچی دو۔ دال چینی بہت ذرا سی۔ ناریل کا برادہ چار کے چار چمچے۔ بادام کی گری ۱۰ عدد۔ کباب چینی چار کا چوتھائی چمچہ دہی ۲۵۰ گرام۔ زعفران اگر ڈال سکیں تو ½ ماشہ گھی ۱۰۰ گرام۔ بھنے ہوئے چھلے چنے ۱۰ گرام۔

ترکیب:۔ قیمہ چکنا نہ ہو اور خیال رہے کہ قصائی اس میں چھیچھڑے نہ کوٹ دے۔ قیمہ کو دھو کر اچھی طرح نچوڑلیں پھر اسے سل پر باریک پیس لیں۔ آدھے سے تمام [illegible] کرکے دہی میں ملائیں اور اسے قیمہ میں ملادیں۔ دہی کے بعد نصف چنے پیس کر دہی میں ملائیں۔ اگر زعفران ہے تو اسے بھی کھرل کرکے باریک پیس کر اس میں شامل کردیں۔ اب [illegible] پیاز باریک کاٹ کر پریشر ککر میں گھی گرم کرکے پیاز کو گلابی کرلیں۔ پھر کوفتوں کو نصف چنے اور نصف دہی والے آمیزے میں لگا لگاکر ککر میں رکھیں اور ککر کو بند کردیں۔ دس پندرہ منٹ میں کوفتے تیار ہوجائیں گے۔ پانی قطعی نہ ملائیں۔ اگر زعفران نہ ڈال سکیں تو تیاری کے بعد عمدہ قسم کا عرق کیوڑہ ہی چھڑک دیں۔

اگر آپ کے پاس پریشر ککر نہیں ہے تو کوفتوں کو قلعی دار بھگونے یا پتیلی میں رکھکر سرپوش (ڈھکن) کو آٹے سے اس طرح بند کردیں کہ بھاپ نہ نکلنے پائے۔ پندرہ منٹ بعد سرپوش کھول کر دیکھیں۔ اگر تیاری میں کسر ہو تو کچھ دیر اور دم پر لگادیں۔ دم دینے کا طریقہ یہ ہے کہ دو اینٹوں پر بھگونے یا پتیلی کو رکھکر نیچے انگارے رکھیں اور تھوڑے انگارے سرپوش پر رکھدیں۔

مرسلہ: شاہدہ خاں۔ بنارس

سوئیوں کا مزعفر

یہ زیادہ تر عید میں پکتا ہے، اس کی ترکیب عید سے پہلے چھپتی تو بہتر تھا لیکن اسے دعوتی کھانوں کا بھی جزو بنایا جاسکتا ہے۔

سامان۔ سوئیاں نہ زیادہ موٹی نہ [illegible] ۲۵۰ گرام شکر ۵۰۰ گرام۔ گھی ۱۲۵ گرام زعفران ممکن ہوسکے تو ½ ماشہ۔ رنگ جہاز مارکہ چار کا ایک چمچہ۔ عرق کیوڑہ عمدہ ۵۰ گرام پستے ۲۰ گرام بادام کی گری ۱۵ عدد۔ کھویا ۱۰۰ گرام۔ دودھ حسب ضرورت۔

ترکیب:۔ سوئیوں کو بھون کر گلابی کرلیں۔ پھٹکیاں چن کر نکال دیں۔ شکر اور رنگ کو چار کی تین پیالی پانی میں تیز آنچ پر اتنا پکائیں کہ تقریباً ½ پانی کم ہوجائے یعنی قوام زیادہ گاڑھا نہ ہونے پائے۔ شکر جوش کھانے لگے تو اس میں چند چمچے دودھ ڈالدیں۔ اس سے شکر کا میل علیحدہ ہوجائے گا۔ اسے چمچے سے نکال دیں یا قوام کو دوسری پتیلی میں چھان لیں۔ اس کے بعد قوام میں سوئیاں ڈال کر پکائیں۔ چند منٹ بعد نصف گھی ڈالدیں۔ اس کے بعد دیکھیں کہ سوئیاں سخت تو نہیں ہیں۔ اگر سخت ہوں تو دودھ کا ایک چھینٹا اور دیں اور بقیہ گھی میں ڈالدیں۔ کھویا ڈالنا ضروری نہیں، لیکن ڈالنا چاہیں تو کھوئے کو تھوڑے دودھ میں اچھی طرح مسل کر کسی باریک لیکن مضبوط کپڑے میں رکھکر دبا دبا کر اسے کسی برتن میں نکالیں۔ پھر کسی چمچ سے اور نکلا ہوا گاڑھا کھویا ملاکر تھوڑی دیر اور دم کریں۔ اس کے بعد زعفران عرق کیوڑہ میں پیس کر چھڑکیں زعفران نہ ہو تو صرف کیوڑہ ہی چھڑک دیں۔ بادام اور پستے کو کھولتے پانی میں ڈال کر نکالیں ان کے چھلکے علیحدہ کرکے ہوائیاں تراش لیں اور سوئیوں پر چھڑک دیں۔ [illegible]

بقیہ صفحہ ۴۸ پر

دہرائے انجانے تحت الثریٰ میں کھینچ لے گئے تھے۔!!

"کیا ہوتا اگر حنا کی جگہ سدرہ دلہن ہوتی۔" اس نے جی ہی جی میں سسک کہا۔

"انوار صاحب کہاں گم ہیں!" خرم نے ایزد کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "اس لمحے سے سب گزر چکے ہیں!" شکیل کو ہنسی آ گئی۔ "انھیں گم رہنے دو۔ تم چلو میرے ساتھ۔ امی کی ٹانک لیے لیتے ہیں۔ مجھے بچوں کے بچھونے کیا کرنے ہیں!"

"بھئی آپ لوگ اب اٹھئے۔" نگار نے ان دونوں سے کہا۔ "یہاں اب حنا آئے گی امی کو دیکھئے۔"

"ٹھیک ہے انھیں لے آؤ۔ ہم جا رہے ہیں۔" خرم نے کہا اور اٹھ گئے ان کے پیچھے شکیل بھی چلے گئے۔ ناصیہ نے زیتون کو اوپر بھیج کر حنا کو لے آئے پھر ایزد سے بولیں۔

"تم ساری رات جاگے ہو۔ جاکے کچھ دیر کے لیے سو رہو۔"

لیکن وہ دماغی طور پر وہاں موجود ہوتا تو کچھ سنتا بھی۔ جیسا کا تیسا کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ ناصیہ یہ سمجھیں کہ وہ بیٹھے آرام سے سو رہا ہے۔ پاس آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ایزد نے چونک کر آنکھیں کھول لیں اور ایک گہری سانس لے کر سیدھا ہو بیٹھا۔

ابھی اس کی نگاہیں سیدھا ہو نہ پائیں۔ وہ زیتون کا ہاتھ تھامے جھکے جھکے قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ گلابی رنگ کی چمکدار ساری میں ملبوس۔ آنچل پیشانی تک ڈھکا ہوا اس کے چہرے کو زیادہ معصوم بنا رہا تھا!۔ ناصیہ اور نگار نے بڑھ کر اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ (باقی آئندہ)

اور ان سے نفرت محسوس کر کے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا۔!

رخصتی کے وقت خان صاحب نے ایزد اور شعیب صاحب کو اپنے کمرے میں بلایا ان سے دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ پھر وہ ساری رقم جو شعیب صاحب سے لی تھی۔ واپس کر دی۔! انھوں نے بڑے اخلاق سے ایزد کو رخصت کیا اور شعیب صاحب سے بولے۔

"تم انسان کی جگہ فرشتہ ہو شعیب بھائی۔ جو کچھ میں نے خواب میں سوچا تھا تم نے اصل میں کر دکھایا۔ میں نے تم پر زیادتی روا رکھی خود غرضی آدمی کو منصب سے گرا دیتی ہے۔ شعیب بھائی تم حنا کی زندگی کے المیے سے واقف ہو۔ وہ ننھا سا بچہ لے کر گھر بیٹھ گئی۔ میں اپنی بیماری کے سبب تولہ ماشہ ہوتا رہتا ہوں۔ بھائی بھاوج اس کے خیرخواہ نہیں ہیں میرے مرنے کے بعد حنا کا کیا حشر ہوتا! بس یہ جان لیوا خیال مجھے کھائے لیتا ہے۔ میں نے ہر ممکن جگہ خود سے کوششیں کیں۔ لیکن یقین کرو یہاں سے وہاں سے۔ ہر طرف سے۔ حنا کو بد قدم، منحوس، نامبارک لڑکی کے خطاب ملے۔! مجھے معلوم تھا کہ اس بھری پری دنیا میں تم صرف تم ایک ایسے ہو۔ جو اسے اپنے سائے میں پناہ دے سکتے ہو۔ بس میں نے تم سے ایسی سختی سے قرض کا مطالبہ کیا کہ شاید تم روپیہ لوٹا نہ سکو گے حنا کو اپنا لو۔ مجھے معاف کر دو شعیب بھائی خدا کا واسطہ تمھیں میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔!"

"بہت انتہا پسند ہو۔ حمید بھائی!" شعیب نے کہا۔ "تمھاری لڑکی اب میری بچی ہے لیکن یہ رقم میں ہرگز نہیں لوں گا۔ مجبور کرو گے تو خدا کی قسم سارے تعلقات ختم ہو جائیں گے!" انھوں نے روپیہ پھر واپس کر دیا۔

موسم گرما کی رات تھی۔ لیکن بڑی خوشگوار اور معطر رات تھی۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ جو جو نکا باغ سے آتا وہ ایک تیز مہک چھوڑ جاتا۔ دلہن کی خوابگاہ میں سناٹا تھا۔ گلدانوں میں رکھے ہوئے پھول مرجھا گئے تھے کمرے میں خوابیدہ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹینڈ پر رکھی ہوئی ٹائم پیس کا ننھا سا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

حنا کمرے میں تنہا تھی۔! اندر باہر گہرا سکوت طاری تھا۔ وہ شب زندہ جاگے ہوئے لوگ کچھ سو چکے تھے کچھ صائمہ بیگم کے کمرے میں تھے جن کی تکلیف کچھ بڑھ گئی تھی۔!

ایک پہلو پر بیٹھے بیٹھے جب اس کا جسم سُن ہونے لگا تب اس نے ہلکی سی انگڑائی لے کر سر اٹھایا۔! کمرہ دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔!

اس نے نظریں اٹھائیں۔ سامنے کارنس پر ایک تصویر رکھی دکھائی دی حنا نے مسہری سے قدم اتارا۔ اور پھر اس طرح وحشی انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے اسے گمان ہو۔ اس کی نقل و حرکت کو کوئی مسلسل دیکھ رہا ہو۔ چپکے چپکے کارنس کے پاس آئی اور ہاتھ بڑھا کر تصویر اٹھا لی۔ اس کی ہتھیلیاں پسیجنے لگیں۔!

یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ تصویر اس کی زندگی کے سفینے کے نئے ناخدا کی ہے۔ اس نے تصویر کے نیچے لکھا ہوا نام پڑھ لیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک رگ میں بجنے لگی!۔

کیونکہ مجبور ہے۔ اسے بھی شوہر سمجھنے پر۔ اس کی رفاقت میں کیا اسے پہلا شوہر یاد نہ آئے گا۔! جب وہ اس کے پہلو میں ہوگی کیا یہ احساس اسے نہ ہوگا کہ اس سے قبل وہ کسی اور کی آغوش میں رہ چکی ہے!

اور پھر بڑی تکلیف دہ سچائی اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ اس کے سامنے آجاتی!۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ حنا کے سامنے محض ناتجربہ کار اور بے وقوف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی جذباتی رفاقت پر دل ہی دل میں ہنس پڑے۔! اور ایسا کیوں لگتا کہ اس کا جسم کھوکھلا ہو چکا ہے۔ وہ محض گوشت و پوست کا پُرکشش پیکر ہے۔ اس کے اندر خلا ہے۔ وہ اسے کچھ بھی نہ دے سکے گا۔!

آہستہ آہستہ اس کے خیالات بھیانک ہوتے گئے۔ اکیا وہ ایسا ذرا سا کا جیا کر دہ ہے۔ اپنی الناک تشویش کا اظہار وہ کسی کے سامنے کر بھی نہیں سکتا تھا۔ لوگ اس پر ہنستے اسے بے وقوف بناتے اور شاید یہ بھی الزام دیتے کہ وہ اپنی کسی گزری کہانی کا بدلہ لے رہا ہے۔

اس کی نظریں اخبار کی سطروں پر تھیں اور دماغ بالکل گم۔ وہ اصل اور حالات سے بڑی دور پہنچ گیا تھا!۔ اسے یہ تک خبر نہ ہوئی کہ کب لوگ معائنہ کر کے جا چکے تھے۔ دالان میں اب بھی سب ہنس بول رہے تھے۔ کمرے سے باورچیوں کی موٹی موٹی آوازیں آرہی تھیں۔ برتن کھنک رہے تھے۔ ذاکرہ اور امیدیں شعیب صاحب کی ... ہنس رہی تھیں۔ بچے شور مچا رہے تھے ... دوائد بڑی سرگرمی سے بحث کر رہے تھے!۔

وہ ایک بلیغ سناٹے میں کھو گیا تھا۔ بے چین خیالات اور ...

کیا دلکش چہرہ تھا۔ سنجیدہ، پر وقار، بریم۔ ! گہری گہری آنکھیں اسے مسلسل گھور رہی تھیں۔ حنا کی پلکیں جھپک گئیں۔ اسے محسوس ہوا۔ ابھی وہ چہرہ فریم کی قید سے آزاد ہو جائے گا ! ۔ گھبرا کر اس نے تصویر واپس کارنس پر رکھ دی۔ ! ۔

اور پلنگ کے نیچے آکھڑی ہوئی۔ اس کے خیالوں میں محشر بپا تھا۔ ! وہ کون سا نذرانہ اپنے شوہر کو پیش کر سکے گی؟ یہ اس کی سہاگ رات ہے۔ کیا سوچیں گے وہ؟ ۔ لوگ کہتے ہیں کہ بہت خصہ ور ہیں۔ ! لیکن میں خود سے اس کی زندگی میں نہیں آئی۔

اس نے دل تھام لیا۔ یا خدا عجیب لمحے ہیں۔ جو ایک کے پیچھے ایک بھاگے جا رہے ہیں۔ لمبی سی کالی رات عروس سحر سے گلے ملنے کو بے تاب بھاگی جا رہی ہے۔ لیکن۔ وہ کہاں ہیں۔ ؟

وہ مضطرب ہونے لگی۔

کیا وہ اس کے پاس آنا پسند نہیں کرتے؟ ۔

اس خیال نے اسے سوگوار کر دیا۔ !

وہ آہستہ چلتی برآمدے میں آئی۔ افق پر نند اسی نگاہیں جما دیں مرجھائے ہوئے تاروں کے درمیان زرد زرد چاند گم صم اسے تک رہا تھا درختوں میں ہوائیں سسک رہی تھیں۔ اس نے جلتی ہوئی آنکھیں بند کیں اور دو گرم گرم آنسو مرجھائے ہوئے گالوں پر بہہ نکلے۔

بڑی اداس صبح ہوئی۔ !

اندر گھر میں چہل پہل ہونے لگی تھی۔ حنا اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گئی تھکن سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا ! ۔ کچھ ہی دیر بعد پردے سے رضا کی

کی فرشتہ داری کی اور تعریف نہ کریں۔ انہیں معاف نہیں کروں گا۔"

ارے تم یہ رضا کی اماں ایسے۔ نگار نے بدحواس ہو کر کہا کہ کوئی ایزد کی قسم خاک بگاڑ اس کا مٹی ڈالے۔ پھر جلدی سے شیشہ لے کر چلی گئیں۔ وہ بیٹھے لگا۔

تب سے اس کا ذہن تہہ و بالا تھا۔ اور اسے خوف تھا کہ کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے۔ رضا کی سوگوار شکل اس کے لوح دل پر نقش تھی۔ ! اور وہ مہوش کے تصور سے بھی دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا۔ اب اس پر واقعی خدا کی مار پڑی تھی کہ اس کے دماغ میں دونوں کی شکلیں موجود تھیں۔ ! ایک کی مظلوم اور معصوم۔ دوسری کی ظالم و متکبر۔ اسے فیصلہ کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ ! اسے کون سا چہرہ پسند تھا۔ وہ اب آخر اسے مہوش سے کیا سروکار تھا ! ۔ وہ پھر اس سے متنفر ہو رہی تھی۔ کبھی سیدھے منہ اس سے بولی نہیں تھی۔ اسے اس زمانے سے نفرت تھی ! ۔ پھر وہ سب کچھ جانتے بوجھتے کیوں الجھا جا رہا تھا۔

کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنے پاگل پن سے ہاتھ اٹھالے۔ اور ایک نارمل زندگی گزارے۔ حنا بہت حسین تھی۔ اس کی ہو چکی تھی۔ زبردستی ہی سہی۔ لیکن پھر اس کے دماغ میں کیڑے رینگنے لگے کہ وہ کنواری نہیں۔ ایک بیوہ لڑکی ہے۔ بیوہ بچے والی۔ وہ اس کے لیے سچا عیش و لذت فراہم نہیں کر سکتی۔ جو کچھ اس کے پاس تھا وہ پہلے ہی کسی کو دے چکی تھی۔ عورت اپنے پہلے شوہر کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ معلوم نہیں۔ کتنی پُر محبت ساعتیں ان دونوں نے ایک دوسرے کی رفاقت میں بسر کی ہوں گی۔ ہی اصلی اور گہری تھیں۔ اب تو وہ محض روایتی محبت کی ریہرسل کرے گی۔

ہمارے گھر میں کوئی بچہ اس کے ساتھ کا کھیلنے والا نہیں تھا۔ آپا کے
بچوں میں خوش رہتا ہے۔
اچھا بھئی انکے ساتھ کھیلنے کیلئے میرے دو بچے ہیں شکیل اور جمیل حسن۔ آپ کا کیا نام ہے؟
محمد کاشف!
بڑا پیارا نام ہے۔ اسے بلوائیے تو ہم سب سے بھی تو وہ مانوس ہو
جائے گا جب تک آمنہ کے پاس رہے گا۔
آمنہ آپا آئیں گی۔ آپ ہی ان سے کہہ دیجئے بھابی۔ میں اسے یاد
کرتی ہوں آپا کہتی ہیں کہ اماں جان کو ناشتا بہت پھر پڑ راتی ہے۔
ناصرہ کو ہنسی آگئی۔ اپنے بچوں سے آمنہ کا جی نہیں بھرا۔ بہن کا بچہ بھی
سمیٹ لیا ہے۔ اچھا میں کہہ دوں گی۔ اب میں چلتی ہوں... تم کنگھی کر
لو۔ بس زیتون کو بھی بھجوائے دیتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔
صالحہ بیگم اب قدرے ٹھیک تھیں۔ انہیں کنیز اور خرم پکڑ کر دالان
میں لے آئے تھے۔ گھر میں تھوڑے بہت مہمان اب بھی تھے۔ صحن میں باورچی
دیگیں کھڑکا رہے تھے۔ شام کو دعوت ولیمہ تھی۔ عجیب سی چہل پہل اداسی
میں مدغم محسوس ہو رہی ہے! جیسے مسرت اور افسردگی متوازی چل رہی
ہوں! صالحہ بیگم کے مغموم چہرے پر رونق سی آگئی۔ بڑی دلچسپی سے
صحن کا نظارہ کرنے لگیں۔ شعیب صاحب اندر آئے۔ اور بالواسطہ بیوی
کی خیریت آپا ذاکرہ سے پوچھی! کچھ دیر بیٹھے رہے! آپا ذاکرہ نے خوشی
کے مارے سہرے نکال کر شعیب صاحب سے دریافت کیا۔
میاں دیکھی اپنی بہو کی صورت۔ پسند آئی؟ مجھے زورات کو ڈھنگ سے
سمجھا نہیں۔ اب دیکھوں گی۔

رعنا بولی اور شارق کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔
اچانک شارق نے پوچھا: حنا باجی! آپ پہننے کے کو نہیں لائیں؟
نہیں۔ بھیا! حنا نے سر جھکا لیا۔ رعنا اسے گھسیٹ لے گئی۔
میرا بچہ۔ میرا کاشف۔! حنا نے دل تھام لیا! کیا میں اسے اب
دیکھ بھی سکوں گی؟ یہ لوگ اسے قبول کریں گے کہ نہیں... یا اللہ! اسے دیکھے
بغیر میں کیسے زندہ رہوں گی؟
بوجھل قدموں سے وہ سامان والے کمرے میں آگئی۔ اس کا سارا سامان
یہاں نہایت قرینے سے سجا دیا گیا تھا۔ اس نے الماری کھول کر سادہ کپڑے
نکالے۔ اچانک اسے برآمدے میں بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی۔
بانہہ پر کپڑے رکھے وہ دروازے تک آئی! اور جہاں کی تہاں کھڑی ہو گئی۔
ایزد کے قدم رک گئے! وہ حیرت اور منافرت سے اس ہستی کو دیکھ
رہا تھا۔ جس کے متعلق اسے پتہ تھا کہ وہ سوائے حنا کے اور کوئی نہیں ہو
سکتی! سرخ درسرخ لباس میں اس کا نازک نازک سا سراپا بدن دمک
رہا تھا! سرخ رنگ کا لباس مہندی سے سرخ ہاتھ پاؤں۔ زیورات میں
گندھی ہوئی عطر سہاگ کی ہیجان خیز جذبات انگیز خوشبو میں لپٹی
ہوئی کوئی ساحر کی ہستی لگ رہی تھی!
بس ایک ساعت کے لیے اس کی کالی کالی متوالی اور سہمی ہوئی نظریں
ایزد کی نظروں سے ٹکرائی تھیں۔ پھر اس کے پھول سے عارضوں کا رنگ اڑنے
لگا۔ اس کا بدن یوں کانپا جیسے ہوا کے تیز جھونکے سے کلیوں بھری ٹہنی
لرز جاتی ہے۔ پھر ایک ایک کر کے کپڑے اس کے ہاتھ سے زمین پر گرتے
نظریں جھکی گئیں۔ سر سے آنچل سرکا اور شانوں پر بھری مانگ جھلکنے لگی!

لیکن اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ ہاتھ اٹھا کر پھر سر پر آنچل
اوڑھ لیتی۔ یوں اس کا حسین پیکر دروازے میں ایستادہ تھا جیسے کسی
ماہر مصور کا شاہکار سونے فریم میں مقید ہو گیا ہو۔!

ایزد کی پیشانی پر گھنڈ سے پسینے کی لکیریں بہہ رہی تھیں! دل کسی نوگرفتار
طائر کی طرح پسلیوں کے قفس میں پھڑپھڑا رہا تھا! ہاتھ پاؤں سرد اور ہوش
گم تھے۔!

اسے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس کی تنہائیاں جس ہستی سے آباد
ہوں گی۔ وہ اس قدر حسین و دلفریب ہوگی! اس کے تصور سے بڑھ کر
ایک نازک خیال رفعت پسند شاعر کی امید سے بڑھ کر۔!

لیکن آناً فاناً اس کے دماغ میں ایک تلخ حقیقت کا سنگریزہ چبھنے لگا
یہ ہستی اس کے پاس اچھوتی نہیں آئی۔ اس حسن و خوشنمائی سے کوئی
اور بھی محظوظ ہو چکا تھا! یہ ایک بچے کی ماں بھی ہے۔ اور میں۔ اسکے
مقابلہ میں نیا انجان اور بیوقوف ہوں ... اس کے بدن میں انگارے
بھرنے لگے۔!

کہاں گئی وہ رات۔ جس کی عیش کوشیاں اچھوتا سہرتیں آدمی عمر بھر
یاد رکھتا ہے۔؟

اور آہستہ آہستہ اس کے لطیف جذبات پر ہوا سے دیکھ کر اس کے دل
میں موجزن ہوئے تھے۔ پھر غصے اور نفرت کی آگ میں جھلسنے لگے!۔ اور
پھر وہ پہلے کا سا کھردرا تلخ اور غصیلا ایزد بن چکا تھا! اس کی حیرانہ نگاہ
اولیں اب پُرتنفر ہو گئی تھیں۔!

دونوں اپنے اپنے چکر میں گم یوں آمنے سامنے کھڑے تھے گویا آئینہ بن

"آپ ساتھ رہیں تو جانوں گی بھائی۔" اب اس کو ماں سے ایزد کے
خلاف شکایت نہ رہی تھی۔

"اچھا میں چاہے رعنا یا زینت کو بھیج دوں گی ان کے ساتھ [illegible]
میں تو یہ دیکھنے آگئی تھی کہ تم نے ڈھنگ سے کھایا پیا بھی ہے کہ نہیں
میں امی کے کمرے میں دیکھو ملا کون کہاں ہے۔ ڈاکٹر صاحب آکے چلے گئے
تب بلواؤں گی۔ اب بھی شرم اور تکلف کو اٹھا رکھو۔ میں بھی [illegible]
ادل بہت شرمائی تھی پھر سمانے سوچا کتنا شرماؤں گی آخر۔ مجھے یہیں
رہنا بسنا ہے۔ یہی لوگ میرے اپنے ہو گئے ہیں۔ یہیں مجھے جینا
مرنا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے گھر اور گھر والوں کو بالکل اپنا سمجھا [illegible]
وہ پہلے بعد سب میں گھل مل گئی۔ گھر کی بہو باورچی خانے کی ملکہ
ہوتی ہے نا۔ جس میں پہلے ناک کی سیدھ میں باورچی خانے ہی جا
گھسی تھی۔!

حنا ہنسنے لگی۔ ناصرہ بھی ہنس دی ان کا لب و لہجہ آواز اتنا دلکش و
دلفریب تھا جتنا ان کا چہرہ۔ حنا انہیں چاہنے لگی۔

شام کو جان چچا، آمنہ، نوید صاحب۔ اور تمام [illegible]
گئے۔ اگر ایزد کی مرضی ہو تو ان کے ساتھ چلی جانا۔ لیکن [illegible] کی
طبیعت اچھی نہیں ہے۔ کل سویرے [illegible] آؤ۔ اور [illegible]
پوچھتے رہ جاتی ہوں۔ تمہارا بچہ کس کے پاس ہے۔ آج تک [illegible]
رابعہ بھابی کے؟

وہ کہا ہے بہت مانوس ہے۔ [illegible] دل دھڑک اٹھا۔
اسے اپنے پاس رکھو۔ واں کیسا [illegible] رکھا ہے۔

رعنا: زینے سے نانی نے آواز دی۔

حنا نے آنچل سر پر اوڑھ لیا اور آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

آئیے بھابی! رعنا بولی۔

ناشتہ کر کے آئیں۔ زیتون نے شکایت کی کہ حنا نے اچھی طرح ناشتہ نہیں کیا۔

[illegible]: نانی اس کے پاس آئیں اور پیار سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا: کیا سوچ رہی ہو: انھوں نے مڑ کر لڑکیوں سے کہا۔ کشتیاں اٹھا کر لے جاؤ۔ لڑکیاں ان کے حکم سے سرتابی نہیں کرتی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد نانی نے حنا کا ہاتھ تھام کر مسہری پر آ بیٹھیں ان کا چہرہ سنجیدہ تھا [illegible] سنجیدہ ہو گئی: تم نے ساری رات ایزد کا انتظار کیا ہو گا۔ میں [illegible] سکی۔ حنا، امی کی [illegible] کے پاس بیٹھے رہے تھے [illegible] ملی۔ ساحل پر سب [illegible] پڑ گئے [illegible] پریشان ہیں کیسے سب انتظام ہو گا؟:

[illegible] کہا: [illegible] لے چلیے۔ امی [illegible] تو پھر [illegible] یہاں کیوں رہوں؟:

[illegible] کا صدر ہو جائے [illegible] سب کو [illegible] سے یہاں آنا [illegible] جان: وہ ہنسنے لگیں: چلو بھی [illegible] گی اتنے [illegible]:

گئی تھی یکجائی۔

حنا کا یہ حال تھا کہ اب اس کے دل کی دھڑکن معدوم ہونے کے قریب تھی۔ وہ ایک نگاہ جو ایزد کی اس کی نگاہ سے ملی تھی اس نے اسے ایزد کی لازوال محبت میں گرفتار کر دیا تھا۔ وہ اپنی بارعب تصویر سے زیادہ وہ پروقار اور سنجیدہ نکلا۔ وہ منتظر تھی کہ شاید وہ کچھ کہے گا۔ پیار بھری کوئی بات۔ وہ ادھر ادھر دیکھ کے آگے بڑھے گا۔ اور پھر اس کی سانسیں سینے میں مچلنے لگیں۔ ایزد آگے نہیں بڑھا۔ وہ پیچھے ہٹا اور نذیر سے مل گیا اور اتنے میں زیتون اور رعنا ناشتہ لیے آ پہنچیں۔ سارا طلسم درہم برہم ہو گیا۔

خالہ بی: رعنا بھولپن سے بولی: میں ناشتہ لے بھی آئی۔ مگر آپ نہائیں نہ کپڑے بدلے:

حنا باجی نہیں رہیں بی بی اب انھیں بھابی کہیے: زیتون نے اس قابلیت سے تصحیح کی!۔

شٹ اپ: دفعتاً ایزد نے ڈانٹ دیا۔ بچیاں سہم گئیں۔ اور چپ چاپ اندر کشتیاں رکھنے لگیں۔

رعنا: اس نے پھر گرج کر کہا: اندر سے میرے کپڑے لے آؤ۔ جس نے میرے کمرے میں یہ کاٹ کباڑ بھر رکھا ہے:

اچھے۔ بھیا: رعنا ہکلائی: یہ تو۔ یہ تو۔ حنا باجی کے۔ جہیز کا سامان ہے:

بکواس۔ اندر سے کپڑے نکال دو: ایزد نے اسے خونخوار انداز میں گھورتے ہوئے کہا۔ زیتون نے کھونٹی پر کپڑے جو ٹنگے پڑے تھے

اٹھا کر اسٹینڈ پر رکھ دیے تھے۔ رعنا نے ایزد کا لباس ہینگر سے نکالا اور
اسے تھما دیا۔ وہ غسل خانہ میں گھسا اور دھڑاک سے دروازہ بند کر لیا۔
لڑکیوں نے معنی خیز طریق سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر رعنا حنا کا
ہاتھ تھام کر کمرے میں لے آئی۔ پھر دھیمے سے بولی۔
"بیٹھئے حنا باجی! پہلے ناشتہ کر لیجئے"۔
لیکن حنا گم صم بیٹھی رہی! دس منٹ بعد ایزد لباس تبدیل کر کے حمام
سے نکلا اور بھاری قدم رکھتا ہوا زینے سے اترتا چلا گیا۔ تب حنا نے
رکی ہوئی سانس چھوڑی۔ لڑکیوں نے بھی اطمینان کی آہیں بھریں۔ اور حنا
کی طرف متوجہ ہو گئیں۔
"آپ کچھ کھا لیجئے تو پھر نیچے چلئے"۔ رعنا بولی۔ "میں آپ کو اپنا گھر
دکھاؤں گی"۔
"مجھے بالکل بھوک نہیں لگی"۔ رعنا۔ حنا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا
"مجھے صرف ایک پیالی چائے دے دو بس۔ اور تم بیٹھ کے کھاؤ"۔
"وہ حنا باجی۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ باجی نے اتنی محنت سے یہ سب
چیزیں تیار کر کے بھیجی ہیں آپ یونہی واپس کر دیں۔ دودھ میں انڈا گھونٹ
کے پراٹھے پکائے ہیں، آملیٹ، بالائی۔ جیلی یہ سب چیزیں بہت
مزے کی ہیں۔ حنا باجی کچھ تو چکھ لیجئے"۔
"اسے بھابھی باجی کے پاس ناشتہ کر لیا ہے"۔ زیتون مذاق سے
بولی۔ "آپ ان کی فکر مت کیجئے"۔
"رعنا۔ تمہارے بھیا۔ کچھ خفا ہیں۔ مجھ سے؟" حنا نے رکتے رکتے
پوچھا۔

رعنا کو اس کے جذبات کا کیا پتہ تھا! اس نے منہ بنا کر کہا! "اپنے ان
کی نہ پوچھیے۔ حنا باجی۔ وہ آپ ہی سے نہیں خدا معلوم کیوں ساری دنیا سے
خفا رہتے ہیں۔ نہ ان کی ابا جان سے بنتی ہے نہ امی سے۔ ہم لوگوں کو تو
کبھی نہیں لگاتے اس کے سوا"۔
"حنا باجی۔ ایک دن تو غصے کے مارے انھوں نے رعنا اپی کے سر پر ریڈیو
پٹختے پٹختے چھوڑ دیا"۔ زیتون نے کہا: "اس میں کشور کمار گانے گاتا تھا"۔
دونوں لڑکیوں کا منشا یہ نہیں تھا کہ وہ ایزد کی برائی کرتیں۔ بلکہ
وہ حنا کو تسلی دے رہی تھیں کہ ایزد کا مزاج ہی ایسا ہے۔ لہٰذا وہ کچھ دل
پر اثر نہ لے انھیں احساس ہی نہیں ہوا کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک
لفظ حنا کے دل و دماغ پر انگارے بن کر گر رہا تھا۔!
"بہت غصہ کرتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔
"بہت کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ ڈریئے"۔ رعنا پیار سے بولی "آپ سے
غصہ نہیں کریں گے آپ تو ان کی دلہن ہیں نا!"
پھر بڑے اصرار سے دونوں لڑکیوں نے حنا کو ناشتہ کرایا۔ اس کے
بعد اسے سادہ سا لیکن قیمتی لباس تبدیل کرایا۔ بال درست کر کے جب حنا
ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے کے سامنے آئی تو اپنا عکس دیکھ کر ششدر
رہ گئی تقریباً دو سال سے وہ سفید لباس ہی پہنتی آ رہی تھی۔ لیکن اب
رنگین لباس، زیور، چوڑیاں اور مہندی لگے ہاتھ [illegible]
آپ ابھی بنا رہے تھے!
"میں اتنی بری تو نہیں"۔ حنا نے سوچا۔ پھر "وہ آئے کیوں نہیں
میرے پاس۔ کیوں؟"

اوہ — یہ کیل مہاسے!

صافی استعمال کیجیے۔ کیل مہاسوں اور جلد کی دوسری تکلیفوں سے چھٹکارا پائیے۔ صافی خون کو صاف کرتی ہے اور جلد کو نکھارتی ہے۔ صافی میں شامل ۴۴ جڑی بوٹیاں اور دوسرے اہم اجزا تیزی سے دکھاتے ہیں اور آپ کی جلد کو صاف اور خوب صورت بناتے ہیں۔

ان کا علاج

صافی

خون کو صاف کرتی ہے
جلد کو نکھارتی ہے

ہمدرد

THE HAREEM

Oct..79

Rs. 1/-

ایڈیٹر

تجمہ یار ترقی

ٹیلیفون نمبر آفس: ۲۲۵۵۹

گزشتہ ۴۸ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے — اور
اردو میں ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے

ٹیلیفون نمبر رہائش: ۲۵۳۳۴

جلد (۵۷)

نمبر ۱۰

ماہنامہ حریم لکھنؤ

اڈیٹر و نگراں
نسیم انہونوی
معاونین
شوکت جہاں بیگم غزالہ
جانی بیگم ردولوی

بیادگار
سید محمد سلیم انہونوی مرحوم
و
شفیق النساء
بیگم سلیم انہونوی مرحوم

فہرست مضامین

ماہ اکتوبر ۱۹۷۹ء

قیمت سالانہ

۶۱ء انکا منی آرڈر سے اکیس روپیہ ۔ مخصوص خریداری منی آرڈر سے ۱۱ بیس روپیہ ۔
سعی خریداری منی آرڈر سے سولہ روپیہ وی پی سے پرچہ منگانے پر تین روپیہ زائد ۔ فی پرچہ ایک روپیہ ۔ غیر ممالک سے بقدر ۳۲ روپیہ یا
دو پونڈ ہوائی میل ۔ ایرمیل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں ۔

آفس اور ترسیل زر کا پتہ : نسیم بک ڈپو ۔ لاٹوش روڈ ۔ لکھنؤ

نسیم انہونوی ۔ مالک و ناشر ۔ پرنٹر سرفراز قومی پریس ۔ لکھنؤ

مغربی ممالک میں جو آزادی خواتین کو بخشی گئی تھی اس کے تحت وہاں یہ کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی ہے کہ عورت مرد، خواہ ان کا رشتہ کچھ بھی ہو جہاں چاہیں سیر و تفریح کے لئے جا سکتے ہیں۔ ان پر نہ انگلیاں اٹھتی ہیں نہ ان کے اس فعل سے خاندان والوں کی ناکیں کٹتی ہیں۔ ایک زمانہ میں لندن کا ہائیڈ پارک ایسے منچلے نوجوان جوڑوں کی ایسی تفریح گاہ تھی جہاں دل کھول کر حوصلے نکالے جاتے تھے۔ ساحل بحر پر تعطیلات میں ہزاروں افراد ایسے لباسوں میں خوش فعلیاں کرتے نظر آتے ہیں جنھیں لباس کہنا بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا اور بعض ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں لباس نام کا کوئی تار بھی لوگوں کے جسموں پر نہیں ہوتا۔ گویا اس حمام میں سب ننگے ہوتے ہیں۔

بد قسمتی سے سیتا اور ساوتری کے اس دیش میں بھی مغربی نقالی انگریزی عہد حکومت میں شروع ہو گئی تھی اس میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا گیا ——

انگریزی حکومت کا ہندوستان میں خاتمہ ہو گیا لیکن انگریزی لباس اور انگریزی تہذیب و تمدن کو اس طرح گلے لگا لیا گیا کہ آج ایسے مناظر بھی نظر آ جاتے ہیں، جیسے شاید مغربی ممالک میں بھی وہ دیکھے جا سکتے ہوں گے۔ اس لئے کہ آزادی نسواں کا ڈھول پیٹ کر وہاں لوگوں نے تلخ تجربات حاصل کئے اور تمام سنجیدہ لوگوں کی جانب سے اس طرح کی آزادی کی مذمت ہونے لگی اور اب پچاس سال پہلے والے تمدن میں کافی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ کہاوت ہے کہ انتہائی بلندی پر جانے کے بعد پھر اترنا ہوتا ہے۔ اس مدت میں لوگوں نے محسوس کر لیا کہ آزادی نسواں کے پس پشت کون سا جذبہ کارفرما تھا اور کس طرح خواتین کو مکمل آزادی کا سبق پڑھا کر لوٹا جانے لگا تھا۔ لیکن ہندوستان میں حالات ابھی انتہا کو نہیں پہنچے ہیں۔ یہاں ایک طرف لڑکیوں کو مکمل آزادی عطا کر دی جاتی ہے۔ اور دوسری طرف ناک کٹنے کا بھی احساس رہتا ہے۔ یہاں کسی لڑکی کو ایک یا مختلف نوجوان دوستوں کے ساتھ گھومتے پھرتے اور سیر و تفریح کرتے دیکھ لیا جائے تو پھر اس لڑکی سے کوئی بھی شادی کرنے کے لئے تیار نہ ہو گا، چاہے وہ کتنی پارسا کیوں نہ ہو اور اس نے دوستوں کے ساتھ گھومنا پھرنا ایک سوشل معاملہ ہی کیوں نہ سمجھا ہو آزاد ہو جانے کے بعد لڑکیاں بھی مخالف جنسوں کے ساتھ گھومنے اور سیر و تفریح کرنے میں کوئی عیب محسوس نہیں کرتیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح جوان مرد عورتوں میں کشش محسوس کرتے ہیں لڑکیاں بھی جوانوں کے ساتھ گھومنے پھرنے میں ایک طرح کا لطف محسوس کرتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس سیر و تفریح کے سلسلے میں وہ گناہ کرنا چاہتی ہیں۔ میرا خیال ہے بیشتر لڑکیاں اپنے کردار کی پختہ ہوتی ہیں اور بغیر سوچے سمجھے ہی لڑکوں کی صحبت اختیار کر لیتی ہیں۔ لیکن ان کے برخلاف لڑکوں اور مردوں کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ ان میں ۹۰ فیصد اس لئے لڑکیوں سے تعلق پیدا کرتے ہیں کہ انھیں لوٹ لیں۔

بہرحال یہ تو ایک دوسری بات ہے۔ میں نے یہ مضمون اس لئے لکھنا شروع کیا تھا کہ ہماری پولیس ایسے لڑکوں اور لڑکیوں کو بے حد پریشان کرتی ہے جو تفریحاً کسی باغ، پارک یا کنج میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں یا محبت کے پینگ جھولتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے اور حکومت پولیس کو ہدایت کیوں نہیں کرتی کہ جب حکومت کی خود یہی پالیسی ہے کہ لڑکیوں کو مکمل آزادی دی جائے۔ انھیں لڑکوں کے ساتھ کالجوں اور یونیورسٹیز میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہے۔ خود والدین بھی حکومت کی اس پالیسی سے اختلاف نہیں کرتے۔ وہ آنکھیں بند کر کے لڑکیوں کو حصول تعلیم کے لئے ایسے تعلیمی اداروں میں بھیجتے ہیں۔ جہاں جوان لڑکے بھی ہوتے ہیں اور اکثر جوان لڑکے اور لڑکیاں لکچرر بھی ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد یہ سراسر زیادتی اور ناانصافی ہے کہ انھیں آپس میں دوستی نہ کرنے دی جائے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ دو مختلف جنس کے افراد ایک ساتھ پڑھیں لکھیں۔ اٹھیں بیٹھیں اور ان میں تعلقات دوستی استوار نہ ہوں۔ جنسی کشش سے اس جہان میں کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اور اس کشش سے محبت کے واقعات ہوتے رہتے ہیں ایسے گھرانوں میں بھی جہاں لڑکیوں کو آزادی نہیں ہے اور ایسے گھرانوں میں بھی جہاں مکمل آزادی ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ جہاں پابندیاں ہیں وہاں محبت کے ڈرامے آسانی نہیں کھیلے جا سکتے،

اس لئے واقعات کم ہوتے ہیں........ اور جہاں یکسر آزادی ہوتی ہے وہاں امکانات زیادہ ہوتے ہیں اس لئے واقعات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

بہرحال ان حالات میں پولیس کو یہ اختیار کیسے دیا گیا ہے کہ وہ کباب میں ہڈی ثابت ہو کر شریف لڑکیوں اور لڑکوں کو گرفتار کر کے رسوا و بدنام کرے۔ حکومت کو چاہیئے کہ یا تو اختلاط مرد و زن پر پابندی عائد کرے یا پھر ان کی آزادی میں پولیس کو خلل انداز ہونے سے روک دے۔ ذرا سوچئے تو کہ ایک ہی آفس میں عورتیں اور مرد کام کرتے ہیں۔ ہمہ وقت ان میں گفتگو ہوتی ہے۔ ہنسی مذاق ہوتا ہے۔ چار پانی میں ساتھ رہتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ آفس کی قید سے نکلیں تو سیر و تفریح کو نہ جائیں۔ محبت کی گھاتیں تو آفس میں ہو سکتی ہیں، لیکن محبت کی باتوں کے لئے سکون اور تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی بات پولیس کی نظروں میں کھٹکتی ہے اور وہ انھیں پریشان کرتی ہے جو نہایت ہی نامناسب ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم مغربی تہذیب کی پیروی کرنے والے والدین سے بھی یہ درخواست کریں گے کہ ناک کٹنے والی بات کا تصور ذہنوں سے نکال کر وہی طریقہ اختیار کریں جو مغربی ممالک میں کیا گیا۔ وہاں ایسی باتوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ لڑکیاں اپنے دوستوں کے ساتھ اور بیویاں اپنے دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے آنے جانے میں بالکل آزاد ہوتی ہیں۔ نہ والدین اس کی پروا کرتے ہیں نہ شوہر کو کوئی خیال آتا ہے۔

جن لڑکوں اور ان کے والدین سے بھی کہوں گا جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور آزاد خیال لڑکیوں سے شادی کرنے یا انھیں بہو بنانے کے خواہش مند رہتے ہیں انھیں لڑکیوں کا ماضی نہ دیکھنا چاہیئے۔ یہ سراسر بے انصافی کی بات ہوگی کہ لڑکے آزاد رہ کر جو چاہیں کرتے پھریں، بیچاری لڑکیاں آزاد ہو کر کیوں مجبور رہیں۔ کیا ان کے پاس دل نہیں ہوتا۔ کیا ان کے پاس نفس نہیں ہوتا۔

حریم کی خریدار بہنوں اور بھانجیوں سے

ڈاک کی بدنظمی کے باعث رسائل نہ صرف دیر سے خریداروں تک پہنچتے ہیں بلکہ کافی تعداد میں غائب بھی ہو جاتے ہیں اس لئے ہر خریدار کو ۰۰ تاریخ تک اگر پرچہ نہ ملے تو دفتر کو آگاہ کریں۔ اور یہ آگاہی ہر تاریخ سے پہلے ہی کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد شکایت آنے پر دفتر پرچہ دوبارہ روانہ کرنے کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

میری صحت

دفتر میں روزانہ متعدد خطوط آتے رہتے ہیں جن میں میری صحت کے متعلق استفسار ہوتا ہے۔ — ان تمام ہمدرد بہنوں اور بھانجیوں کا شکرگزار ہوں کہ انھیں میرا اتنا خیال رہتا ہے۔ افسوس کہ میری صحت دن بدن گرتی ہی جاتی ہے۔ کمزوری بہت بڑھ گئی ہے اس لئے مرض غالب رہتا ہے۔ بہرحال حتی الامکان دفتر کی حاضری دیتا ہوں اور جو کچھ ممکن ہو سکتا ہے کام بھی کرتا ہوں۔

نسیم انہونوی

عید مبارک

صدہا بہنوں اور بھانجیوں نے عید مبارک کے کارڈ مجھے روانہ کئے۔ افسوس کہ میں اس مرتبہ حریم کے ذریعہ بھی عید کی مبارک باد نہ دے سکا، اس لئے کہ پرچہ عید کے کافی دنوں بعد پہنچا ہوگا۔ بہرحال اب اس تحریر کے ذریعہ سب ہی بہنوں اور بھانجیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

نسیم انہونوی

کا ہر مرد اپنی بیوی سے ڈرتا ہے" ملا صاحب نے کہا۔

"میاں کم از کم ہم تو اپنی بیوی سے نہیں ڈرتے۔ یہ سن کر ہماری زبان سے بے ساختہ بلند آواز میں نکل گیا "آپ ہیراتی مال" "یہ نہیں ڈرتے" ملا صاحب نے گھبرا کر کہا "میاں ذرا آہستہ بولو۔ کہیں وہ اس گفتگو کو نہ سن لیں" اتنے میں پردے کے پیچھے سے آواز آئی "میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ اب آپ کے اندر آنے کا انتظار ہے" اب ملا صاحب کی گھبراہٹ کا عالم دیکھنے کے قابل تھا بلکہ حق تو یہ ہے کہ ہم دونوں کی حالت قابل رحم تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میں نے دبی زبان سے ملا صاحب کو رائے دی کہ ہم دونوں کی خیریت اسی میں ہے کہ ہم یہاں سے بھاگ چلیں۔ ملا صاحب نے الماری میں سے ایک کثیر رقم لے لی اور ہم دونوں بھاگ نکلے ایک آٹو رکشا میں سوار ہو کر شہر کے ایک ہوٹل میں جا پہنچے۔ دو سنگل روم کرایہ پر لے کر قیام کر لیا۔ سوچا سوچتے رہے کہ گھر واپس جانے کی کیا ترکیب نکالیں لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ روزانہ صبح ناشتہ کے بعد اخبار دیکھا کرتے کہ کہیں ہمارے بارے میں کوئی خبر "تلاش گمشدہ" کے عنوان سے تو نہیں شائع ہوئی۔ ایک ہفتہ اسی طرح گذر گیا۔ ایک روز ناشتے کے بعد ہوٹل کے باغیچے میں جا بیٹھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا ——— قبلہ آپ کے چہرے کی تو رنگت ہی بدل گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہ سکون بعد صحت کامل نصیب ہوئی ہے اور جسم میں نیا خون آ گیا ہے" ملا مجرا بھود نے ہم سے بھی زیادہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ——— "میاں۔ مجھے بھی تمہاری صورت پر کچھ ایسے ہی آثار نظر آ رہے ہیں۔ تمہارا چہرہ تو کچھ بھرا بھرا بھی دکھائی دے رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوانی لوٹ آئی ہے" میں نے کہا ——— قبلہ اسی بات پر اپنا وزن بھی دیکھ لیا جائے۔ مشین تو ہوٹل کے نچلے برآمدے ہی میں ہے" ہم دونوں اٹھے اور نیچے جا کر مشین [illegible] وزن دیکھ کر حیران رہ گئے کیونکہ ایک ہفتے میں آٹھ آٹھ پونڈ وزن [illegible] تھا۔ پھر باغیچے میں واپس آ کر بیٹھتے ہی ملا صاحب نے کہا۔ میاں سچ پوچھو تو ساری زندگی میں ایسا سکون اور اطمینان نصیب [illegible] تھا جو اس ایک ہفتے میں ملا ہے کہو تو اب زندگی کے باقی ماندہ ایام بھی اسی ہوٹل میں آرام کے ساتھ گذار دیں" میں نے عرض کیا "حضور آپ کی جائداد ہے۔ آپ کی زمینیں ہیں اور منقولہ و غیر منقولہ جائداد ہے۔ اس کے علاوہ چھو منتر سے بھی ہزاروں روپے مہینے کی آمدنی ہے۔ آپ آسانی سے گذار سکتے ہیں۔ لیکن اس خادم کے پاس رہنے کو ایک جھونپڑا تک نہیں اور نہ آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ ہے۔ پھر کس طرح آپ کی تجویز پر غور کر سکتا ہوں" ملا صاحب نے اطمینان دلایا کہ وہ ہماری گذر بسر کا بھی ساتھ ہی انتظام کر دیں گے" جس طرح قدیم زمانے میں بادشاہوں کے مصاحبوں میں ایک آدھ مسخرا اُن کی دل بہلائی کے لئے رکھا جاتا تھا (مثال کے طور پر اکبر بادشاہ کے دربار میں بیربل) اسی طرح ملا صاحب نے بھی ہمیں اپنی مصاحبی میں ایک رتن کی حیثیت سے سنبھال رکھا تھا۔ ایک بار انھوں نے ہمیں اپنی مریدی میں لے لینے کی کوشش کی لیکن ہم ان کے جال میں نہ پھنسے البتہ دوستی کا حق ضرور ادا کر دیا کرتے تھے۔

غرض ہم دونوں خوش خوش اپنے اپنے کمروں میں پہنچے ہی تھے کہ ہوٹل کے ملازم نے ہمیں ایک لفافہ لا کر دیا۔ ہم نے کھولا تو بیگم کا خط تھا۔ جس پر نظر پڑتے ہی ہمارے ہوش و حواس اڑ گئے کہ ہائے اب پکڑے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم نے اپنی طبیعت پر قابو پا لیا اور خط کو پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں شروع ہوا تھا "میرے سرتاج" ہم نے القاب پڑھا تو خوشی اور سرور میں ڈوب گئے کیونکہ زندگی میں پہلی بار اس لقب سے نوازا گیا تھا۔ پورے خط کا مضمون تو ہم نقل نہیں کر سکتے اس لئے کہ خط ایک بیوی کا ایک شوہر کے نام تھا البتہ کچھ اقتباسات درج کئے دیتے ہیں۔ لکھا تھا۔

میرے سرتاج۔

آپ جب سے گئے ہیں گھر ایک ویرانہ معلوم ہو رہا ہے۔ ایک ہفتے سے گھر میں چولھا نہیں جلا ہے۔ مجھے آپ سے گلا ہے کہ اس طویل ازدواجی زندگی میں آپ نے مجھے پکوان تک نہیں سکھایا۔ میں نے بارہا کہا کہ مجھے پکوان سکھا دیجئے تو آپ نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ——— جب تک میں زندہ ہوں تمہیں پکوان سیکھنے کی کیا ضرورت ہے" روزانہ ہوٹل سے منگوا کر کھا رہی ہوں لیکن ہوٹل کے کھانوں میں وہ لذت کہاں جو آپ کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں میں ہوتی تھی۔ ایسا بدمزہ کھانوں کی وجہ سے کبھی پیٹ بھر کر کھا نہ سکی۔ پھر جس دن سے آپ گئے ہیں گھر کی صفائی نہیں ہوئی ڈھیروں کوڑا کرکٹ سے گھر بھرا پڑا ہے۔ آپ کے کپڑوں کی تو ذرا بھی فکر نہیں میرے اپنے کپڑے نہ دھلنے کا رنج ہے۔ کپڑے سب میلے ہو چکے ہیں۔ روزانہ دو تین جوڑوں کے بجائے صرف ایک جوڑا بدلتی

ہوں۔ اب تھوڑے ہی کپڑے بچے ہیں جو چند روز میں میلے ہو جائیں گے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں ایک جوڑا صرف ایک ہی بار پہنتی ہوں ایک بار خود میں نے دھونے کی کوشش کی لیکن کپڑے صاف نہیں دُھلے۔ آپ کے ہاتھ کے دُھلے ہوئے کپڑوں کی بات ہی اور ہوتی تھی۔ دھوبی بھی دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔ مجبوراً کل دھوبی کو بلوا کر کپڑے دیئے لیکن اس نے اتنی زیادہ اجرت بتلائی ہے کہ دل دہل گیا۔ اس لئے میں نے پورے کپڑے نہیں دیئے۔ بلکہ کفایت شعاری کے پیش نظر تھوڑے ہی دیئے ہیں۔ کہاں تو ہفتہ میں چار مرتبہ پکچر دیکھا کرتی تھی اور کہاں یہ عالم کہ اب تک ایک بھی پکچر بھی نہیں دیکھی۔ سب سے اہم مسئلہ ٹکٹ کی خریداری کا ہے۔ آپ ٹکٹ لا دیا کرتے تھے تو اطمینان کے ساتھ دیکھ لیا کرتی تھی۔ بہرحال آپ کے جانے کے بعد زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ اب آپ کی جدائی برداشت نہیں کی جاتی۔ کل ارادہ کر ہی لیا تھا کہ خودکشی کر لوں لیکن گھر کے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا تو اس کی گہرائی دیکھ کر ہی دل اس کی تہہ تک بیٹھ گیا۔ گھبرا کر واپس آگئی۔ عجب نہیں کہ ایک دن ہمت کر کے چھلانگ ہی لگا دوں آج خیال آیا کہ ایک خط آپ کو لکھ کر دیکھوں کیونکہ پرسوں ہی ملا حجرالیھود کے ایک مرید خاص کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ اور ملّا صاحب فلاں ہوٹل میں ہیں۔ پتہ نہیں آپ اپنے مرشد کی صحبت کے بجائے ملّا صاحب کے چکر میں کیوں پڑے ہیں۔ اس خط کو دیکھتے ہی فوراً تشریف لائیے اور میری جان بچائیے۔ اگر چار دن کے اندر آپ تشریف نہیں لائے تو میں اپنی جان آپ کی نذر کر دوں گی۔ یاد رکھئے میرا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔ فقط

آپ کی وفادار کنیز
....

خط ختم کرتے ہی ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دل نے کہا کہ ہائے ہم نے ایسی وفادار بیوی کے ساتھ ایسی بے وفائی کی۔ ایسی حالت میں ہم ملّا صاحب کے کمرے میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اُن کے ہاتھ میں بھی ایک خط ہے اور اُن کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اُٹھے اور خط بلا تکلف ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ جو ان کی اہلیہ محترمہ نے لکھا تھا۔ ہم نے پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

پیر و مرشد۔

اگر اپنی خادمہ کی آخری سانس دیکھنا ہو تو جلد تشریف لائیے اس لئے کہ آپ کی جدائی میں یہ کنیز قریب المرگ ہے۔ اور دو چار دن کی مہمان ہے۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد سے حالات نہایت ابتر ہو گئے ہیں۔ کسی دوسرے محلہ کا ایک ملّا ہر جمعہ کو ہمارے محلے میں آنے لگا ہے اس نے ایک مسجد میں اپنا اڈہ جما لیا ہے۔ تعویذوں اور گنڈوں کا کاروبار زور شور سے چلا رہا ہے۔ سنتے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے اس کے تعویذ سے نامرادوں کی مرادیں پوری ہوتا تو کجا الٹے کئی نئی آفتوں میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ لیکن جب سے وہ ہمارے محلے میں آیا ہے اس کے تعویذوں کا اثر ایسا ہو رہا ہے کہ کاندھوں پر اٹھا کر لایا ہوا مریض جھاڑ پھونک اور تعویذ کے بعد اپنے پاؤں پر چل کر جانے لگا ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ سب آپ کی روحانی قوت کا نتیجہ ہے کہ آپ کے محلے میں آتے ہی اس نئے ملّا کے تعویذوں کے کامیاب نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ نئے نئے شکاروں کو چھوڑیئے خود آپ کے جال میں پھنسے ہوئے کئی شکاری اس کے جال میں پھنس رہے ہیں۔ اگر کچھ دن اور یہی حال رہا تو آمدنی کا دروازہ بند ہو جائے گا اور ہر سال آپ جو ملک اور بیرون ملک کے تفریحی مقامات کا دورہ کرتے ہیں وہ بند ہو جائے گا۔ پھر جو آپ اپنی مصنوعی داڑھی اتار کر ہر ہفتہ اور اتوار کو ریس .... کھیلنے کے لئے جاتے ہیں اس کے اخراجات نکلنا بھی مشکل ہو گا کیونکہ آپ ہر ریس میں ہزاروں کی رقم ہارا کرتے ہیں۔ موئے مردار ریس والوں کو بھی کیا سوجھی کہ جو ریس کورس ہمارے محلے سے میلوں دور تھا وہ ختم کر کے ہمارے محلے کے قریب ہی ریس کورس بنا دیا ہے۔ اس سے پہلے آپ کو یہ عادت نہ تھی۔

اس کے علاوہ جب سے آپ گئے ہیں ایک رات بھی نیند بھر کر نہ سو سکی۔ آپ جانتے ہیں کہ پاؤں دبوائے بغیر مجھے نیند نہیں آتی۔ دو ایک مرتبہ خادمہ سے پاؤں دبوائے لیکن اس مردار کے ہاتھوں میں جیسے دم ہی نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھوں کا آرام شاید جنت میں بھی نہ ملے۔ آپ نے اِدھر پاؤں پر ہاتھ رکھا اور اُدھر آنکھیں بند ہونا شروع ہوئیں۔ پھر کونسی ایسی خادمہ ہے۔ جو آدھی آدھی رات تک پاؤں دابے۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے اُدھر مریدوں کے پاس سے میوے مٹھائیاں اور نذرانے آنا بھی ہو گئے ہیں۔ مریدوں میں یہ افواہ پھیل گئی ہے کہ آپ مجھ سے لڑ کر چلے گئے ہیں اور ایک نوجوان خوبصورت لڑکی سے نکاح کر لیا ہے یہ خبر سن کر بھی آدھا دم نکل گیا ہے۔ ویسے آپ مرید خاتون سے دل بہلا لیا کرتے تھے تو وہ بات اور تھی۔ اس پر مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ گھر کے اندر کا معاملہ تھا۔ کسی کو خبر تک نہ ہوتی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کوئی آپ کی زوجگی میں نہ آتی

تھی۔ اب یہ بناشاخسانہ مریدوں میں عام ہوگیا ہے جو خود میرے لئے بھی سوہانِ روح بن گیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو اس مقالہ قبر کی خاک کو دگو مریدکے عقیدے قبر کی مجاوری ہی، لہٰذا طلاق دے کر سیدھے گھر آجائیے کیونکہ اب میرا آخری وقت آگیا ہے۔ جان بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ آپ آکر مجھے اپنا دیدار دکھائیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے آتے ہی وہ ملا جو دوسرے محلے سے آکر یہاں اپنا اثر بڑھا رہا ہے خود ہی بوریہ بستر باندھ کر بھاگ جائے گا۔

ایک بار تو میں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا۔ چھری کو تیز کر کے سنگوا بھی لیا تھا لیکن جب اپنا گلا کاٹ لینا چاہا تو چھری کی تیز دھار دیکھ کر آنکھوں کا دم آنکھوں میں اور حلق کا دم حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ اس لئے ارادہ ملتوی کر کے کسی اور وقت پر اس کام کو اٹھا رکھا۔ اگر اس خط کو دیکھتے ہی آپ نہ آگئے تو پھر میرا گلا ہوگا اور چھری کی دھار۔ آخر میں عرض اتنا عرض کرتی ہوں کہ مجھ پر رحم کیجئے اور فوراً آجائیے۔ فقط

آپ کے دیدار کی طالب

ہم نے خط پڑھ کر ملا صاحب کو واپس کیا اور اپنا خط ملا صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ملا صاحب نے ہمارا خط پڑھ کر واپس کیا۔ جب ہم دونوں کی نظریں ملیں تو آنسوؤں کا ایک تازہ سیلاب امڈ پڑا اور ہم دونوں گلے مل کر خوب روئے۔ جب ذرا غم ہلکا ہوا تو طے کیا کہ اب اپنے اپنے گھروں کو واپس چلیں اور اپنی بیویوں کو ملک الموت کے پنجے سے بچالیں۔ چنانچہ فوراً اپنا اپنا بیگ سنبھالا۔ ملا صاحب نے ہوٹل کا بل ادا کیا۔ جب اپنے گھر کو پہنچے تو بیوی سے مل کر ایسا محسوس ہوا کہ آج ہی ہماری شادی ہوئی ہے اور نئے سرے سے زندگی کا آغاز ہوا ہے۔ فقط (باقی آئندہ)

پتے کی بات

اردو کے پہاڑ جیسے عظیم اور دیوار قہقہہ سے زیادہ ہنسانے کی طاقت رکھنے والے طنز و مزاح نگار

جرت آشیانوی

کے ایک کم بیس ایسے مضامین کا مجموعہ جو ملک کے متعدد رسائل میں چھپ کر لاکھوں کی داد تحسین لوٹ چکے ہیں۔

قیمت چھ روپیہ

رباعیات

فیروز نظامی

مومن ہے اگر تو، تری ہستی ہے نماز
روحِ عشق و جانِ ہستی ہے نماز
اور اس پہ مشیت کی نوازش کو تو دیکھ
ہنگی ہے ہر ایک چیز ہستی ہے نماز

پانے نہیں کھونے کے لئے جاتے ہیں
قسمت کو ڈبونے کے لئے جاتے ہیں
کل جاگ کے کرتے تھے حرم میں سجدے
اب حج کو بھی سونے کے لئے جاتے ہیں

یہ جرم یہ جرأت یہ جسارت اپنی ہے
یہ جور یہ جدت یہ جفا اپنی ہے
خود جادۂ حق چھوڑ کے رسوا ہوئے ہم
الزام کسے دیں کہ خطا اپنی ہے

رکھنا تھا جسے یاد وہی بھول گئے
دنیا کے جھمیلوں میں سبھی بھول گئے
مے نوشی، جوا، فلم، فریب و غیبت
سب یاد ہے تعلیم اپنی بھول گئے

آستینوں میں کتنا فتنوں کے ڈھالے ہوئے ہیں
ڈسنے کو جو پھن اپنا نکالے ہوئے ہیں
محشر میں نگاہوں سے پریشان ہیں کیوں
یہ سانپ تو آپ ہی کے پالے ہوئے ہیں

"صلح ہو جائے جنگ ہو کر"

(عفت موہانی)

"ارے بھئی۔ میں نے کہا سنتی ہو۔ کہاں ہو؟"

"کہاں ہوتی؟ ۔ چولھے کے پاس کے سوا میرا مردہ اور ہوگا بھی کہاں" سریلی تیز آواز غصے میں الٹ پلٹ دور سے آئی۔

"سنو۔ تھوڑی دیر کے لئے یہاں آؤ گی؟"

آنے کی فرصت نہیں ہے۔ جو کچھ کہنا ہو وہیں سے کہہ دیجئے "

یہاں سے کہہ دوں؟ ۔ کچھ عقل ٹھکانے ہے کہ نہیں۔ یہاں سے کہوں گا تو محلے بھر میں آواز جائے گی "

تو پھر صبر کیجئے ۔ ہانڈی چولھے پر چڑھا رکھی ہے۔ چھوڑ کر چلی آؤں گی تو لگ جائے گی "

" وہ مجھے کبھی سرخ ٹائی نہیں مل رہی ہے "

سرخ ٹائی؟

ہاں ۔ مجھے یاد ہے ۔ میں نے اسی سوٹ کے ساتھ رکھدی تھی۔

تو میں نے کیا کی آپ کی ٹائی ۔ ڈھونڈیئے وہیں کہیں ہوگی۔

نہیں مل رہی ہے بھائی۔ سب جگہ ڈھونڈلی۔

میں کیا کروں۔ میں نے تو نہیں لگائی آپ کی ٹائی ۔!

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ ذرا آکے تلاش کر دو۔ سب کے ہاتھ میری الماری میں لگتے ہیں۔ کوئی چیز قرینے سے اپنی جگہ پر نہیں ملتی۔ خدا کی مار ہے کہ جب باہر جانا ہو ایک دو گھنٹے اسی کم بختی میں لگ جاتے ہیں"

"آپ کے اور میرے ہی تو ہاتھ ہیں۔ اور کون سے پچاس آدمی گھر میں رہتے ہیں جن کے ہاتھ آپ کی الماری میں لگتے ہیں۔ واہ۔ اچھا طعنہ ہے۔ مجھ نامراد ہی کی ایک آدھ ساڑی پڑی ہوگی۔ اب نکال لوں گی وہ بھی۔ اپنی چیزیں خود ڈھنگ سے نہیں رکھتے۔ جہاں دیکھو ایک آدھ ٹائی۔ بنیائن اور قمیض بکھری رہتی ہے۔ انھیں سینت سینت کے رکھنے کا نام تو نہیں۔ الٹا یہ الزام ہے کہ دس ہاتھ لگتے ہیں الماری میں"

"اچھا بس بک بک بند کرو۔ میں نے لعنت بھیجدی سرخ ٹائی پر ۔ یہ کالی پھولدار لگائے لیتا ہوں"

میں پوچھتی ہوں۔ یہ شام شام کو آپ لال ٹول ایسی ٹائی باندھ کے جا کہاں رہے ہیں؟"

لاحول ولاقوہ۔ تمہاری شک کرنے کی عادت نہیں گئی۔ ارے بھئی جب خریدی ہی ہے تو کیوں نہ باندھوں"

"وہ نہ ملی تو آپ نے پھولدار باندھ لی۔ کسے دکھانا ہے؟"

پھر وہی۔ کسے دکھاؤں گا۔ ریاض صاحب سے ملنے جا رہا ہوں۔!

جھاڑو پھرے ریاض صاحب پر۔ بڈھے گھوڑے ۔ چھٹے چھاٹ ۔ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناطہ۔ خود تو گھر گھاٹ سے گئے ہیں۔ گھر بار بیوی بچے والوں کو بھی بہکاتے پھرتے ہیں۔ میں کہتی ہوں۔ ان سے دوستی کر کے آپ کو آخر ایسی کیا دولت ملی ہے کہ جب دیکھو تب لال کالی ٹائی باندھے بھاگے جا رہے ہیں ان سے ملنے؟"

نیک بخت ۔ وہ میرا تبادلہ رکوا دیں گے ۔ نہیں کہو اگر مجھے اٹھا کے کسی دور دراز ضلع پر پھنکوا دیا گیا تو پھر یہ اپنا کاٹ کباڑ سمیٹ کے چلو گی میرے ساتھ!۔

"ہاں ہاں میں یہ الٹے سیدھے بہانے خوب سمجھتی ہوں۔ وہ نامراد ریاض صاحب اللہ میاں کے ایجنٹ ہیں ان کے ایک فرمان صادر کر دینے سے آپ کا تبادلہ رک جائے گا۔ آپ خود ہی کیوں نہیں رکوا دیتے۔ وہ کہاں کے لاٹ گورنر ہیں؟ ۔

کچھ سمجھتی بوجھتی ہو نہیں۔ بس ٹائیں ٹائیں کرنے کو دے دو۔

اچھا سمجھائیے۔ چولھا گیا جہنم میں۔ بیٹھی جاتی ہوں یہیں اچھی طرح سمجھا دیجئے۔

بھائی بات یہ ہے کہ وہ جو بڑے افسر صاحب ہیں۔ وہ کسی رشتے سے ریاض صاحب کے کوئی سے رشتے میں عزیز لگتے ہیں۔ ریاض صاحب کی حقیقی بہن ان کے گھر والے میں بیاہی ہیں۔ اثر و رسوخ بھی کوئی چیز ہے۔"

تو آپ سے انھوں نے وعدہ کیا ہے تبادلہ کرا دینے کا؟۔

میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہاری کیسی مہمل عادت ہے۔ جہاں میں باہر جانے لگتا ہوں۔ بس پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑ جاتی ہو۔ تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں سب سے ملنا جلنا چھوڑ کے گھر میں بیٹھا رہوں؟"

ایسی میری قسمت ہوتی کہ آپ مجھ سے چپکے بیٹھے رہتے تو آج رونا کاہے کا ہوتا؟۔

کس بات کا رونا ہے آخر۔ مزے میں کھا رہی ہو۔ پہن رہی ہو۔ ہر ہفتہ بیگم جمیل کے ساتھ سیر سپاٹے بھی کر آتی ہو۔ تب تو میں کچھ نہیں کہتا۔ جب تک تم واپس آ نہیں جاتیں۔ دم مارے بیٹھا رہتا ہوں۔"

بس مہینے میں ایک مرتبہ کیا گھر میں رہ گئے کہ طعنے دینے شروع کر دیے۔ آپ تو روز روز باہر گھومیں پھریں اور میں مہینے میں ایک دفعہ بھی نہ جاؤں۔ یہ بھی زبردستی ہے۔"

"جھوٹ مت بولو کہ میں باہر گھومتا پھرتا ہوں۔ میرے یہ اعمال ہی اپنے پیچھے لیٹے ہیں کہ گھومنا پھرنا سیر سپاٹے دوستوں کے ساتھ مل کے ہو حق تو خواب و خیال ہو گئے۔ اب تو میں ہوں اور یہ گھر گرہستی کے جنجال ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ اماں کو بھی نجانے ایسی کون سی جلدی تھی۔ بس یہ سمجھی تھیں کہ میں کہیں بھاگا جا رہا ہوں۔ بیڑیاں ڈال دیں۔ نہ مارے مریں نہ کاٹے کٹیں۔"

اسے تو کوس کیوں رہے ہیں۔ زہر لا کے کھلا دیجئے۔ ننھے کو بھی اور مجھے بھی۔ بیڑیاں کٹ جائیں تو اپنی من چاہی کوئی لے آئیے گا۔ اماں بے چاری کو کیوں قبر سے اکھاڑ رہے ہیں۔ وہ تو میری امی کی آنکھوں پر جانے کون سی پٹی بندھی تھی کہ مجھے اندھے کنوئیں میں دھکا دے دیا۔ ایک بیگم جمیل ہیں۔ نجانے کیسی قسمت لکھا کے لائی ہیں۔ ایسے اچھے میاں ملے ہیں۔ گھر دیکھو تو جنت سا۔ آرام کی ہر چیز موجود۔ اور وہ خود اللہ میاں کی گائے ایسے ہیں کہ بس بیوی کہیں اٹھو تو اٹھ جاتے ہیں۔ بیوی کہیں کھڑے ہو جاؤ تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔

بیوی کہیں کہ لیٹ جاؤ تو لیٹ جاتے ہیں۔ استغفر اللہ۔ وہ ہلا کے تسمے شوہر ہیں کہ بیوی کے زر خرید۔ شرم بھی نہیں آتی بیوی کی انگلیوں پر ناچتے ہوئے۔"

"شریف اتنے ہیں کہ منہ سے بولنا نہ جانیں۔ بیوی سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ بیوی کا آدھا کام کر ڈالتے ہیں۔ بچے کو رات کو دودھ بنا کے پلاتے ہیں۔ نہلاتے دھلاتے ہیں۔ آپ سے تو اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میں اگر کبھی میں مرتی ہوا کروں تو ذرا کی ذرا ننھے ہی کو سنبھال لیں۔ حد ہے۔ ایک دفعہ اسے گود میں لیا تو گرا دیا۔ وہ تو خدا دیکھ رہا تھا کہ اس کا سر نہیں پھوٹا۔ لینے کے دینے پڑ جاتے۔"

جی میں ایسا مردنا عورت نہیں کہ آپ کے بچے سنبھالوں۔ انھیں دودھ پلاؤں اور گودی میں لے کے لوری دوں۔ مجھے نہیں آتا سب کچھ۔ اور وہ گدھا بدمعاش تمہارا ننھا بھی اس قدر واہیات ہے کہ بس میری ہی گود میں آ کے ہاتھ پاؤں چلاتا ہے۔ گود سے اچھل کے خود ہی نیچے جا پڑا تھا۔ تم سمجھتی ہو میں نے جان بوجھ کے گرا دیا۔"

گرا بھی دیں تو آپ سے کیا شکوہ۔ کبھی باپ کی سی محبت نہیں کی اس سے۔ بے چارہ چھٹے مہینے کا بھی پورا نہیں ہوا۔ مگر اس کے سر گرم ہو گئے۔ گالیاں۔ بددعائیں۔ کل کو ماریئے گا بھی۔"

بددعائیں۔ کیوں بکواس کرتی ہو۔ میں نے کب بددعائیں دیں۔

رات ہی کو دی۔؟

کب؟۔

دودھ کے لئے رو رہا تھا۔ آپ نے نہیں کہا تھا کہ سالے مردود کو ابھی اتنی جلدی پیدا ہونا تھا۔

تو پھر کیا کرتا۔ دفتر سے مر کھپ کے آتا ہوں۔ سر میں درد ہوتا ہے۔ نیند نہیں آتی۔ مزید برآں اس پاجی کا رونا۔ الو کا پٹھا چیختا ہے تو تالو سے زبان ہی نہیں لگاتا۔ دل چاہ رہا تھا کہ بس گلا دبا دوں۔"

گلا دبا کے مار ڈالنا تھا تو باپ کیوں بنے؟۔ پہلے ہی نہیں سوچ لیا تھا۔!

دماغ خراب کر کے رکھ دیا۔ جاؤ تم کچن میں جاؤ۔ مانی کو کیا پوچھا کر عذاب مول لے لیا۔ خدا غارت کرے۔"

ماما رکھئے — میں اب کھانا وانا نہیں پکاؤں گی۔ سمجھے!"

تمہاری ہانڈی جل رہی تھی۔

جلے بلا سے۔ خاک ہو جائے۔!

رات کو کیا کھاؤ گی؟۔

بڑا خیال ہے نا میرا ۔ خون پیوں گی ۔ کلیجہ کھاؤں گی ۔

اپنا کہ میرا ۔

" بس بہت ہو گیا ۔ اس گھر میں رہ کے میں نے دیکھ لیا ۔ آپ جلا جلا کے مجھے ختم کر دیں گے ۔ میں گھر جاؤں گی اور بڑے بھیا سے سب کچھ کہہ دوں گی ۔!"

بڑے بھیا بے چارے خود بھابی سے عاجز رہتے ہیں ۔ اس دن راستے میں مل گئے تھے ۔ کہہ رہے تھے کہ میاں کیا دو رخی عورت نصیب میں لکھی ہے کہ زندگی حرام ہو کر رہ گئی ہے ۔ بڑے بھیا سے انصاف کی توقع مت رکھو ۔"

" ایسی عورت آپ کو بھی ملتی تو پھر ناچتے تکنی کا ناچ ۔ میں ایسی بھلی مانس ملی ہوں تو مار کے میرا کلیجہ چھلنی کر کے رکھ دیا ہے ۔ نہ مجھے چین ہے نہ ننھے کو ۔"

" ارے بھئی ۔ خدا کے واسطے رو دھو مت ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ واہیات جھگڑا آخر نکلا کس بات پر ہے ۔ تم سے میں نے سرخ ٹائی مانگی تھی ۔ تم چپکے سے آ کے دے دیتیں تو یہ کچھ نہ ہوتا ۔ خواہ مخواہ رو دھو رہی ہو ۔ ابھی لڑکا آتا ہوگا ۔ وہ کیا کہے گا ۔ سنو تو ۔ تم آخر کیوں رو رہی ہو ۔ کیا کہا ہے میں نے ۔ ؟ میں تو ہر وقت تمہاری خواہشوں کا خیال رکھتا ہوں ۔ تم نے جو چیز منگوائی ۔ میں لے آیا ۔ سیلنگ فین کو کہا ۔ لگوا دیا ۔ ریفریجریٹر کی فرمائش کی ۔ وہ قرض ادھار کر کے لے آیا ۔ ابھی ہفتہ بھر قبل دو ہزار روپئے تمہارے اور بچے کے ملبوسات کے لئے دیئے ۔ ننھے کے لئے پرمبلیٹر خریدا ۔ کون سی بات تمہاری ٹالی ہے کون سا دکھ تم کو دیا ہے کہ ہر وقت کہتی ہو کہ میں تمہارا کلیجہ چبا تا ہوں ۔ ستاتا ہوں ۔ آرام سے نہیں رکھتا ۔ بات بات پر گھر بھاگنے کی دھمکی الگ ہے ۔ یہ آخر ہے کیا مصیبت ؟"

" مصیبت ہے تو مجھے پھنکوا دیجئے میکے میں ۔ لے آیئے کوئی اور جو راحت معلوم ہو ۔!"

اچھا اب میں جاؤں کہ ابھی تمہارا لیکچر کچھ اور باقی ہے ۔

جایئے ۔ آپ کو ضرورت کیا ہے ۔ میرا لیکچر سننے کی ۔ سمجھتے کہ میں اکیلی بس ہوں ۔ اس دن کا خدا ناس مارے جب آپ سے نکاح کی حامی بھری تھی ۔

اب کیا دشواری ہے ۔ تم اگر پابندی سے گھبرا گئی ہو تو اس ناس مارے کا شکنجہ میں توڑ سکتا ہوں ۔

ہاں ہاں آ گئی نا لب پر وہی بات .... جایئے لے آیئے ان بزرگوں کو جنھوں نے میری قسمت پھوڑی تھی ۔ اور سب کے سامنے توڑ دیجئے وہ شکنجہ ۔!

تم صرف اتنا بتا دو کہ میرا سرخ ٹائی کا پوچھنا آخر کون سا گناہ ہو گیا تھا ۔ جس پر یہ ہیجان کا طوفان میل چل پڑا ہے ۔ خواہ مخواہ کی حجت بازی / بحث و تکرار زباں طراریاں اور رونا دھونا ۔ خدا کی قسم ۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں ۔

تنگ آ گئے ہوں یا کچھ اور ۔ سنبھالئے اپنے بچے کو ۔ میں جا رہی ہوں ۔

کہاں جا رہی ہو ۔

چولھے پر جو اپنا کلیجہ چڑھا آئی ہوں ۔ جل بھن گیا ہوگا ۔!

لاحول ولا قوۃ ۔

کیوں اب کون سا شیطان دکھائی دیا ہے ۔

مجھ سے تمہاری اولاد نہیں سنبھالی جاتی ۔

بس جی ۔ ٹوکیئے مت ۔ ایسی کون سی دس اولادیں ہیں ۔ لے دے کے چھ مہینے کا بچہ نہیں سنبھالا جاتا ۔

ہاتھ پاؤں چلاتا ہے ۔ یکبارگی اکڑ جاتا ہے ۔ پیچھے الٹ جائے تو ۔

تو کیا ۔ آپ اس سے بڑھے ہیں کہ وہ آپ سے بڑا ہے ۔ دودھ کی شیشی بھر لایئے ۔ رونے لگا ہے ۔ میں چلا ریاض صاحب سے ملنے ۔ تم جانو تمہارا بچہ جانے ۔

اچھا اچھا ۔ دیکھتی ہوں ۔ رات کا کھانا کیا کھاتے ہیں ۔ ایک دانہ جو پکاؤں ۔ ؟ " تم سمجھتی ہو کہ دنیا بھر کے ہوٹل بند ہو گئے ہیں ۔!"

رات کے گیارہ بجے دروازے پر دستک ہوئی ۔ بڑی مدھم سی ۔

کون ہے " اندر سے کسی نے جھنجھوڑ کھایا ۔

دروازہ کھولو بیگم ۔!

پیٹ بھر کھا کے آ گئے نا ۔ جھوٹوں نہ پوچھا کہ تو نے کیا کھایا ۔

دیکھو تو کیا لایا ہوں تمہارے لئے ۔!

کیا لائے ہیں ۔

وہی پھولدار ساڑی اور نیلا بلاؤز ہے ۔ جسے تم مولچند کی دوکان پر دیکھ آئی تھیں ۔

سچی !۔

ہاں !۔

اللہ قسم آپ کتنے اچھے ہیں ۔ میں سرخ لال ٹائی الماری کے کونے میں پڑی مل گئی ۔

اچھا !۔

ہاں آئیے۔ میں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ آپ کے لئے پلاؤ اور پڈنگ پکائی ہے۔!!" طبنزادہ۔

اچھی اچھی باتیں

- سب سے بڑا کام اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت ہے۔
- کامیابی کے لئے سب سے زیادہ محنت اور استقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔
- عاقل پہلے اپنے دل سے پوچھتا ہے اس کے بعد منھ سے بولتا ہے
- جب لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ زندگی کیا ہے تو زندگی تقریباً ختم ہو چکی ہوتی ہے۔
- وہی شخص دنیا میں اہم کام سرانجام دے سکتا ہے جو زیادہ مصائب جھیل سکتا ہے۔
- جو بلند عمارتیں بناتے ہیں، وہ بنیادیں بہت گہری رکھتے ہیں۔ عظیم بننا چاہتے ہو تو اپنی بنیاد مضبوط کرو۔ تقدیر کا محل انسان خود تعمیر کرتا ہے۔
- ہر شخص میں فہم و فراست کسی نہ کسی حد تک موجود ہوتی ہے لیکن ہر شخص فہم و فراست سے کام لینا نہیں چاہتا۔

مرسلہ:۔ سلمہ ذیشانہ

"کانٹے"

کانٹے بھی ہم سمیٹیں گے گلشن کے باغباں
ہم وہ نہیں کہ پھول چنے اور نکل گئے

ظرف کی بات ہے کانٹوں کی خلش دل میں لئے
لوگ ملتے ہیں تر و تازہ گلابوں کی طرح

زندگی کی راہ میں کانٹے بھی ہیں پتھر بھی ہیں
ان ہی میں سے تم گذر جاؤ تو کوئی بات ہو

مرسلہ:۔ عطیہ مرد دتی فاطمی دینا اجبار ختر

لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ

اس گرانی کے زمانے میں غریب لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بڑا ہی دشوار ہو گیا ہے۔ شادیاں شادیوں ہی کی طرح ہوتی ہیں۔ لچکے پٹھے سے کپڑوں کو چمکانے اور بھڑکانے والی چیزیں بھی اتنی گراں ہو گئی ہیں کہ ان کا خریدنا آسان نہیں رہا۔ ایک دوپٹہ کے لئے معمولی سا لچکا بھی لیا جائے تو بیس پچیس، روپیہ سے کم میں نہ آئے گا۔

پتلی سی کرن بھی آنچل میں لگائیے تو بیس روپیہ میں آئے گی۔ شادیوں کے دسیوں جوڑوں کے لئے یہ سب لیا جائے تو سینکڑوں روپیہ صرف ہو جاتا ہے پھر شادی بیاہ پر ہی منحصر نہیں۔ خواتین اور لڑکیاں عام دنوں میں لچکے گلے دوپٹے استعمال کرتی ہیں۔ سورتی بیلیں اور چمپا چنگی وغیرہ لگا کر دوپٹے اور ساریاں پہنتی ہیں۔

ان مشکلات کا حل سائنسدانوں نے یوں نکالا ہے کہ اسٹیل کا سامان تیار کر لیا اور ایسا کہ چاندی سے زیادہ دلکش اور بھڑکیلا یہ بھی نہیں کہ استعمال سے کالا پڑ جائے یا خراب ہو جائے اور دام نسبتاً بہت ہی کم۔ نائلون کے تارے سنہرے ستاروں کو ماند کرتے ہیں۔ یہ اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ ایک تولہ میں لاتعداد چڑھتے ہیں ان کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اس طرح کا تمام سامان .. .. .. آپ کو

"وہ ایک سفر میرا....."

(عطیہ پروین)

یہ کوئی ۵۔۶ برس پہلے کا قصہ ہے۔
آج بھی مجھے اپنا یہ سفر یاد آتا ہے تو روح کانپ جاتی ہے۔
خدایا!
کیا دن تھا وہ جب میں نے اپنی محبت کرنے والی نانی کے انتقال کی خبر سنی تھی۔ دل و دماغ بیکار سے ہو کر رہ گئے تھے
آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے سامنے نانی صاحبہ کی شفیق صورت لرز رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا پر لگا کے اڑوں اور لکھنؤ پہونچ جاؤں اور ماموں کے ساتھ مل کر نانی کا غم مناؤں۔!
دوسرے ہی روز میں گونڈہ سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہوگئی۔ گونڈہ سے ایک ٹرین چار بجے لکھنؤ جاتی ہے۔ ہم لوگ تین بجے ہی اسٹیشن پہونچ گئے کہ گاڑی میں آسانی سے جگہ مل جائے اس گاڑی میں رش بہت ہوتا ہے۔
میرے ساتھ دو بچے تھے۔ باقی بچوں کو ان کے والد کے ساتھ گھر پر چھوڑ دیا تھا میرے ساتھ ایک رشتہ دار تھے ———
ٹرین نہ اب آتی ہے نہ تب آتی ہے انتظار کرتے کرتے تھک گئی ——
بچے دوڑتے بھاگتے کھاتے پیتے اوبھ گئے اور لگے میرے کان کھانے۔ پتہ چلا ٹرین دو گھنٹہ لیٹ ہے یا اللہ کیسی کوفت ہوئی نہیں کہہ سکتی گھر لوٹ کے بھی جانا نہیں چاہتی تھی کہ وہاں گئی اور پھر پھنس گئی نکلنا مشکل ہوجائے گا۔ خیر جناب پورے ڈھائی گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد عید کے چاند کے مانند سیکڑوں اٹھی انگلیوں مشتاق و منتظر نگاہوں اور "وہ آگئی وہ آگئی" کے نعروں کے ساتھ ٹرین صاحبہ بصد ناز اٹھلاتی بل کھاتی لہراتی سیٹیاں بجاتی دل ہلاتی دل کھاتی آخر پلیٹ فارم پر آگئیں اور ایک لمبی آہ کے بعد بے حس و حرکت ہوگئیں۔ وہ دھکم پیل، وہ چیخ پکار وہ نفسی نفسی کا عالم کہ الاماں والحفیظ۔ بقول ظریف لکھنوی۔
"گونڈہ مسافروں کی عجب یادگار تھی"
میں بھی کسی نہ کسی طرح بچوں کو کھینچتی ان کی چیخوں اور آہ و بکا کو نظر انداز کرتی ایک سکنڈ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں گھس گئی۔ میرے ساتھ کے صاحب ارشاد صاحب بھی اپنے قلی کو دھکے دیتے اندر آگئے۔ کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ بیٹھے، لیٹے، کھڑے آڑے ترچھے مسافروں نے ہم کو کھا لے والی نظروں سے دیکھا۔ جو لیٹے تھے وہ مزید پھیل گئے جو بیٹھے تھے وہ زبردستی نیم دراز ہوگئے اور جو کھڑے تھے وہ لوہے کی دیوار بن گئے۔ مگر میں بھی نہ مانی سیٹ نہیں ملی کوئی پرواہ نہیں دو سیٹوں کی درمیانی جگہ میں مسافروں کے جوتوں چپلوں اور پیروں کے اوپر تولیہ بچھا دیا بچوں کو بٹھایا خود بیٹھی اور ارشاد کو دعوت دی " آپ بھی آیئے!"
انھوں نے ادھر ادھر دیکھا اپنے سفید پتلون کو دیکھا بے داغ قمیص کو دیکھا اور رومال سے چہرے کی خیالی گرد صاف کرتے ہوئے کہا۔ "جی نہیں میں ایسے ہی ٹھیک ہوں!"
لوگوں کی آمد و رفت اب بھی جاری تھی۔ بہرحال، ٹرین نے ایک چنگھاڑ ماری اور چل پڑی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب بچے بضد تھے ان کو کھانا دیا جائے کسی طرح روکا تھا کہ تھوڑی دیر اور رکو ابھی دیتی ہوں۔ یہاں سانس لینا بھی دوبھر تھی کھانا کہاں کھایا جاتا۔ ستم یہ کہ گھر سے کچھ لے کر بھی نہیں چلی تھی۔ ۷ بجے تک لکھنؤ پہونچ جانے کا خیال تھا یہاں ۷ بجنے والے تھے۔ کرنل گنج نکل گیا اب ادھر ادھر گھور اندھیرا تھا اور سناٹا ——: کہ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ میں نے کہا یہ کیا ارشاد بولے کوئی بات ہوگی کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ گاڑی نہ اب چلتی ہے نہ تب۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ اب تشویش کی لہر پورے کمپارٹمنٹ میں دوڑ گئی بھانت بھانت کی بولیاں گونجنے لگیں ——— ! ایک گھنٹہ ہوگیا۔ بچے رونے لگے۔ میرا دل پریشان تھا۔ لوگ اندھیرے میں ٹارچ اور لالٹینیں لئے دوڑ رہے تھے۔ معلوم ہوا ٹرین کا انجن خراب ہوگیا ہے۔ کیا؟؟؟ کا ایک بم تھا جس نے پوری ٹرین کے پرخچے اڑا دیئے۔
" اب کیا ہوگا؟" میں روہانسی ہوکر بولی۔
" وہی جو منظور خدا ہوگا!" ارشاد میری پریشانی دور کرنے کے لئے مسکرائے۔ پریشانی کیا دور ہوتی یہاں جان پر بنی تھی رات کا وقت، شدید سردی نہ کھانا نہ بستر۔ ایک رات کا رہنا تھا کہاں لد پھند کے جاتی۔ گھر سے بچوں کو خوب

کھلا پلا کے چلی تھی کہ تھوڑی دیر کا سفر ہے۔ کیا خبر تھی وہ سفر میری اب تک کی زندگی کا ایک طویل اور تکلیف دہ یادگار سفر ہوگا۔ اس زمانے میں ادھر ادھر ڈاکے خوب پڑ رہے تھے۔ میرا دل ڈر رہا تھا۔ بار بار اپنی اکلوتی سونے کی چین کو جو بڑے ارمانوں سے منگائی ہوئی گھڑی کو دیکھتی اپنے کان کے بالوں کو جنبش دیتی چپکے پرس ٹٹولتی اور سوچتی ...... اگر ڈاکو آئے تو ان کے مانگنے سے پہلے ہی ساری چیزیں ان کے حوالے کر دوں گی۔ اور بچوں کو کلیجے سے چمٹا کے بیٹھ جاؤں گی۔ لوگ باتیں بھی خوب کر رہے تھے۔ کوئی کہتا ڈاکو چلتی ٹرین روک لیتے ہیں تو اسی جنگل میں رکی ٹرین کو کیسے چھوڑ دیں گے۔ کوئی کہتا پولیس کی وردی میں رہتے ہیں کوئی کہتا ارے میرے ساتھ ایسا واقعہ ہو چکا ہے۔ اب ایک نے سنایا قصہ تو دوسرا کیوں پیچھے رہتا اور تیسرے کا خاموش رہنا ناممکن سی بات تھی اور چوتھے کا ...... مت پوچھئے ڈاکوؤں کے قصے جو چھڑے تو رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ ادھر دونوں بچے ایک سُر تال میں "امی کھانا۔ امی کھانا" چلا رہے تھے۔ آسمان دور تھا زمین سخت جاتی تو کدھر جاتی ــــ

دو گھنٹے گزر گئے نہیں دو صدیاں گزر گئیں۔ پھر پوچھا تو معلوم ہوا لکھنؤ سے انجن آئے گا جوڑا جائیگا تب یہ ٹرین کھسکے گی۔ میں نے شال بچوں کو اڑھا دی تھی اور خود کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سردی کو بھگانے کی کوشش کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بچوں کو کیا کھلایا جائے۔ اتنے میں غیبی امداد ہوئی جانے کہاں سے ایک ٹوٹا مارا چنے والا گرم چنا کی آواز لگاتا ڈبے میں آگیا۔ میں تو بھئی اس کو رحمت کا فرشتہ کہوں گی بچے رونا بھول کے خوشی سے چلائے امی چنے والا! کسی اور وقت ان کی یہ ضد کا ہے کو پوری ہوتی اس وقت میں نے جھٹ پیسے نکالے اور ایک روپے کے چنے خرید لیے۔ نہ گرم تھے نہ خستہ کرارے۔ جانے کہاں کے پالے کے مارے پڑے تھے پرانے پن کی بھبھک آگئی تھی۔ پھر بھی اسی وقت جنت سے آیا میوہ محسوس ہو رہے تھے۔ بچوں نے خاموشی اختیار کی تو ذرا دل ٹھہرا اور خدا سے دعائیں مانگنا شروع کر دیں ایسی کہاں کی پہونچی ہوئی تھی کہ ٹرین بغیر انجن کے چل پڑتی اور دعا قبول ہو جاتی۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا تھا کہ دعا کر رہی تھی۔

ایک دم میرے بڑے بچے نے سہم کر کہا "امی۔ ڈاکو!"

میں نے گھبرا کے دیکھا خاکی وردی ہاتھ میں بیت یہ بڑی بڑی چھپر مارکہ مونچھیں۔ لمبا چوڑا وہ آدمی بیت ہلاتا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ڈر کے مارے اس ٹھنڈک میں بھی پسینے آنے لگے۔ سب مسافر خاموشی سے اس شخص کو دیکھ رہے تھے۔ آخر وہ کھنکارا اور میں سمجھی نکالا اس نے پستول۔ کھٹ سے زنجیر گلے سے اتاری، ہاتھ سے گھڑی کھولی کان سے رنگ نکالے اور رحم طلب نظروں سے اس کو دیکھا۔

"بہن جی۔ آپ کو زیور الگ رکھ لینا چاہئے ــــ" میں نے چھپر مارکہ مونچھوں والے سے یہ نرم نرم آواز سنی تو حیرت سے اس کو تکنے لگی۔ "آج کل کسی کا کوئی اعتبار نہیں ہے گاڑی جنگل میں کھڑی ہے۔ ہم کچھ سپاہی ہیں جو دیکھ بھال کر رہے ہیں مگر پھر بھی ......" اتنا کہکر وہ آگے بڑھ گیا تو میرے ہاتھ بے اختیار خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے اٹھ گئے ــــ! تین گھنٹے گزر چکے تھے ــــ! اب تو دعا بھی نہیں مانگی جا رہی تھی۔ بچے سوگئے تھے ان کو گود میں دبائے صبر و شکر کی مورت بنی بیٹھی تھی۔ سچ کہتی ہوں ایسا وقت کبھی نہ آیا تھا۔ چار گھنٹے گزرے ــــ! جسم پتھر بن گیا تھا گردن کڑی ہو گئی تھی سر میں وہ درد کہ اللہ اللہ! گرم گرم چائے کی ایک پیالی مل جاتی تو خدا کی قسم اسی وقت اسی کے مقابلے میں پوری دنیا کی سلطنت کو ٹھوکر مار دیتی۔ خیر صاحب، ہر ہر سکنڈ پر مرتی اور جیتی رہی۔

جب کبھی قریب سے کوئی ٹرین دھڑ دھڑاتی گزرے یہ جی چاہے اسی پر بیٹھ لو چاہے کہیں بھی لے جائے بلا سے چل تو رہی ہے۔ ۵ بجے کسی نے مژدہ سنایا انجن آرہا ہے۔

مُردوں میں جان پڑ گئی۔ انجن کی دھڑ دھڑاہٹ سنی تو جی چاہا چیخ مار کر روؤں پھر دیوانوں کی طرح ہنسوں پھر پاگلوں کی طرح نیچے اتر کر چلتی ٹرین سے بھی آگے دوڑتی لکھنؤ پہونچ جاؤں۔ ٹرین میں دھکے لگ رہے تھے۔ بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ خدا خدا کر کے جنبش ہوئی۔ پہلے دھیرے دھیرے چلی پھر تیز ہو گئی میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ایک اطمینان کی سانس لی۔ خوف اور اندیشے کا یہ عالم تھا کہ ٹرین اب کسی اسٹیشن پر رکتی تو دل دھڑکنے لگتا کہیں پھر نہ کوئی خرابی آگئی ہو۔ زیادہ دیر ہوتی تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگتے۔ اُف۔! وہ وقت گھڑی، جب لکھنؤ کی صورت نظر آئی ــــ بے اختیار لبوں پر یہ الفاظ آگئے۔

"لکھنؤ میں تیرے صدقے کہ مجھے لینے کو ......"

"چلئے بھابھی!" ارشاد نے خوشی سے چقندر ہوتے ہوئے کہا۔ کیا بتاؤں کیسے اٹھی۔ یقین نہیں آرہا تھا۔ اپنے کو گھسیٹ کے اتارا بچوں کو سنبھالا مارے غصے اور کھسیاہٹ کے معصوم بنی کھڑی ٹرین کو نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا بلکہ چپکے سے ایک گھونسہ بھی لگا دیا کہ گھاٹے میں رہی مجھ کو کہ

اتہ دیکھنے لگا تھا ـــ اب جس رکشے والے سے کہو "بھیا یحییٰ گنج چلتے ہو؟" وہ کہتا ہے "خدا گنج لے جا سکتا ہوں یحییٰ گنج نہیں لے جا سکتا" کسی طرح ایک بڑے میاں ملے ہوئے۔ جانے کہاں کا مریل گھوڑا اور جانے کس صدی کا تانگہ لے آئے۔ اب جو قدم رکھا تو تانگہ بولا چوں۔ چرچرـ اور گھوڑا ایسی دلدوز آواز میں ہنہنایا کہ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ گھبرا کے بڑے میاں سے پوچھا۔

"چچا۔ زندہ تو پہونچا دو گے نا؟"

وہ اپنے چند دانت نمایاں کر کے بولے۔

"اجی بٹیا صاحب۔ آپ اطمینان رکھئے میرا گھوڑا کوئی معمولی گھوڑا نہیں ہے صبح و شام جناب آدھ آدھ پاؤ ڈھیلا افیون کا نوش فرماتے ہیں اور ایک گلاس روح افزا شربت کا دودھ ملا کر پیتے ہیں ایسے خراماں لے چلیں گے کہ مادر گرامی کی آغوش کی جنبشیں یاد آ جائیں گی۔"

واقعی، مادر گرامی کی آغوش بھی یاد آ گئی اور چھٹی کے دودھ کا ذائقہ بھی۔

۴ بجے کے اسٹیشن سے چلے تھے، ساڑھے چھ بجے یحییٰ گنج کے چوراہے پر پہونچے۔ ڈاکٹر جیسوال کا مطب جیسے ہی نظر آیا میں نے تانگہ رکوا دیا۔ ان بزرگ کو مع ان کے افیونی گھوڑے کے وداع کیا اور گھر کا راستہ لیا۔ صبح ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا ابھی ابھی نیا جنم لیا ہے یا ابھی ابھی ایک بھیانک خواب دیکھ کے آنکھ کھلی ہے اور نانی صاحبہ پکار رہی ہیں۔

"اے ہے عطیہ اٹھو کب تک سوتی رہو گی!"

لکھنؤ اپنی تہذیب و تمدن

کے لئے سارے ہندوستان ہی میں نہیں ساری دنیا میں مشہور تھا لیکن افسوس کہ انقلابات زمانہ نے لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کو خاک میں ملا دیا۔ آج اس تہذیب کا ذکر صرف کتابوں میں ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ لوگ آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس تہذیب و تمدن کو دیکھیں اور لکھنوی لوگوں کی شیریں زبانی سے لطف اندوز ہوں۔ لیکن اب اس زبان کے بولنے والے بھی نظر نہیں آتے جو حضرت پہلے آپ "پہلے آپ" کہا کرتے تھے اور اس مٹی ہوئی تہذیب و تمدن کے علمبردار کچھ رہ بھی گئے ہیں تو وہ گوشہ نشین ہیں اور ان تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ اپنا سب کچھ کھو کر اب وہ باہر نکلتے بھی شرماتے ہیں۔ کیا عروج اور اب کیا زوال ہے۔

لیکن لکھنؤ میں جو چیزیں فنا نہ ہو سکیں وہ ہیں شاہی امام باڑے اور وہ کاریگر اور ہنرمند جو آج بھی اپنی کاریگری اور سبک دستی کے ایسے شاہکار پیش کر رہے ہیں جو آپ اپنی مثال ہیں۔

چکن، زردوزی، کامدانی اور بادلے وغیرہ کے کام یہاں کے کاریگر ایسا کرتے ہیں کہ دیکھنے والے محو حیرت رہ جاتے ہیں۔ لچکہ، گوٹا، پٹھا، کرن اور ستارے وغیرہ کا کام بھی بیحد نفیس بنتا ہے۔

غیر متوقع

(رضیہ بٹ)

صرف دو ہی ٹوکلیاں پڑتی تھیں۔ پھر بازار آجاتا تھا۔ اسی بازار کے آخری سرے سے بس مل جاتی تھی۔

لیکن وہ کبھی اس راستے دفتر نہیں گیا تھا۔ اپنی تنگ اور حبس زدہ گلی سے نکل کر وہ دائیں ہاتھ والی پتلی سی سیلن والی گلی میں مڑ جاتا ——— نالی کے سلیٹی ملغوبے سے اپنے جوتے اور پتلون کے پائنچے بچاتا۔ وہ گلی میں وسط میں چلتا۔ اس کی نظریں دو رویہ پرانی طرز کے اونچے اونچے مکانوں کے پرنالوں پر ہوتیں۔ ان ڈھکے پرنالوں سے موت کے وقت کی طرح گندے پانی اور کوڑے کرکٹ کے گرنے کا کوئی وقت معین نہیں تھا ——— یہ گلی اس کی اپنی گلی سے بھی زیادہ گندی تھی۔ جگہ جگہ غلاظت کی ڈھیریاں ہوتیں۔ کوڑے کباڑے کے ڈھیر۔ موسمی پھلوں کے چھلکے سبھی کچھ ہوتا۔ سات سات آٹھ آٹھ سال تک کی عمر کے بچے نالیوں پر بیٹھے رفع حاجت میں مصروف ہوتے۔ سڑاند بعض اوقات ناقابل برداشت ہوتی۔ لیکن وہ اسی گلی سے گزرتا۔ یہ گلی جس دیوار کے ساتھ ختم ہوتی۔ وہاں اینٹیں گرا گرا کر نکال نکال کر اچھی خاصی کھڑکی بنا دی گئی تھی۔ اسی کھڑکی کے راستے وہ مال گودام کی پشت پر آنکلتا۔ اور پھر دائیں ہاتھ کے چھوٹے سے میدان کو عبور کرتا۔ جہاں لوہے کی کترنوں کے ڈھیر ہوتے۔ ان کترنوں سے دامن بچاتا نوکیلی تاروں کو پھلانگتا وہ اس سرمئی سڑک پر آنکلتا۔ جو کشادہ اور صاف ستھری تھی۔ دو رویہ گھنے درخت تھے۔ اور ان درختوں کے عقب میں بڑی بڑی محل نما کوٹھیاں تھیں سرمئی سڑک ان کوٹھیوں کے قدموں میں مچلتی دو تین فرلانگ تک جاکر بڑی سڑک سے جا ملتی۔ وہیں بس اسٹاپ تھا۔

یہ راستہ کافی لمبا تھا۔ لیکن روز وہ اسی راستے سے دفتر جاتا۔ اس سرمئی کشادہ اور صاف و شفاف سڑک پر تقریباً ٹہلتے ہوئے وہ بس اسٹاپ تک جاتا گلیوں کی گھٹن حبس اور سیلن کا احساس اس خوبصورت سڑک پر اپنے آپ مٹ جاتا ——— مہک سے لدی ہوائیں جب اس کے نتھنوں میں گھستیں تو اس پر مستی سی چھا جاتی۔ دائیں بائیں پھیلے کوٹھیوں کے وسیع و عریض چمن دیکھ کر اسے بڑی تسکین ملتی ——— شاید یہ تسکین جھوٹی ہوتی۔ لیکن اس نے اپنے گرد اگرد جھوٹ ہی کا تانا بانا تو بن رکھا تھا۔ شخصیت کے گرد جھوٹ ہی کا سنہری خول تو چڑھا رکھا تھا۔ اتنا لمبا راستہ اختیار کرنے میں بھی تو اسی جھوٹ کا دخل تھا۔ کوٹھیوں کے سامنے سے وہ جس شان جس ادا سے گزرتا ——— دیکھنے والے کو یہی محسوس ہوتا۔ کہ وہ انہی میں سے کسی کوٹھی کا مکین ہے۔ کتنا لذت بخش سرور ملتا تھا اسے جب کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اس سے بات کرتا۔

اس کا تعلق تو نچلے متوسط طبقے سے تھا۔ بند بند تاریک گلی میں دو کوٹھری نما کمروں اور نا پختہ چھوٹے سے صحن والے گھر میں اپنے والدین ڈھلتی عمروں کی کنواری بہنوں۔ دو چھوٹے بھائیوں ——— اور ایک بیوہ پھوپھی کے تین چار نواسے نواسیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ باپ معمولی کاروبار کرتا تھا۔ بڑی ہمت اور محنت سے اس نے اسے ایف اے تک تعلیم دلوائی تھی۔ اور پھر بڑی دوڑ دھوپ ——— بڑے بڑے لوگوں کی غلامی کرکے انکم ٹیکس آفس میں بطور کلرک بھرتی کروا دیا تھا۔ اڑھائی تین سو کی آمدنی اس کنبے کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھی۔ لیکن وہ اس آمدنی کا بیشتر حصہ اپنی ذات کے رکھ رکھاؤ اور بنانے سنوارنے پر خرچ کر دیتا تھا۔ غربت زدہ والدین کبھی صدائے احتجاج بلند بھی کرتے۔ تو وہ جواباً

"جوتا کپڑا ابھی نہ خریدوں ——— مجھے اچھے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے دفتر جاتا ہوں کسی دوکان پر تو نہیں جاتا"

وہ چپ ہو جاتے ——— بیٹا دفتر کا بابو تھا۔ کہہ بھی کیا سکتے تھے۔ جو کچھ دیدیتا اسے ہی غنیمت سمجھ لیتے۔

وہ اپنے لئے ہر ماہ کوئی نہ کوئی نئے فیشن کا کپڑا بنواتا۔ قیمتی جوتے خریدتا غیر ملکی پرفیوم لاتا۔ سگریٹوں پر بھی ایک معقول رقم خرچ ہو جاتی۔ اس سلسلے میں اس نے بچت کی ایک ترکیب سوچی تھی۔ خاصی کامیاب ترکیب تھی۔ وہ کے ٹو کے سگریٹ لیتا۔ اور کریون اے کی ڈبی میں ڈال لیتا۔ اس کے ساتھی اس سے مرعوب تھے۔ ایسا لباس ان کے پاس کے پاس بھی نہیں تھا۔ اور کریون اے۔ بھلا کون

پی سکتا تھا۔

اپنے کولیگز میں اپنے آپ کو نمایاں و ممتاز کر کے اسے ذہنی تسکین ملتی تھی لوگوں کو تو اس نے تاثر بھی یہی دیا تھا۔ کہ وہ ایک امیر باپ کا بیٹا ہے۔ نوکری محض وقت گذاری کے لئے کر رہا ہے۔

اس کے دو ایک ساتھی جو بس میں اس کے ساتھ آتے تھے۔ اسے اکثر صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ اُسے سرمئی سڑک سے آتے کئی بار دیکھ چکے تھے۔ اس کی شخصیت اس کے لباس اور اس کی باتوں سے خاصے مرعوب تھے۔

انہی ساتھیوں میں سے ایک ساتھی نے اس دن کہا تھا: صاحب آپ گاڑی وغیرہ پر کیوں نہیں آتے ــــ"

اس نے ہنس کر جلدی سے کہا تھا "جب تک میرا باپ زندہ ہے۔ گاڑی کی حسرت ہی رہے گی"

دوسرا ساتھی بولا تھا "سکوٹر وغیرہ ہی خرید لیں"

وہ بڑے بے ساختہ انداز میں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا تھا "میری ماں کو تم نہیں جانتے ــــ وہ سکوٹر کو خطرناک سواری کہتی ہیں۔ سکوٹر خود چلانا تو ایک طرف وہ تو مجھے کسی کے پیچھے بیٹھنے کی بھی اجازت نہیں دیتیں"

بھرم رکھنے کا اسے کسی خوبصورتی سے سلیقہ آ گیا تھا۔ جھوٹ اپنی جگہ قبیح سہی لیکن اس کے ردِعمل سے جو سکون و ذہنی آسائش اسے میسر آتی تھی۔ وہ اپنی جگہ حسین تھی۔

چھٹی کے بعد بھی وہ زیادہ وقت گھر سے باہر گذارتا۔ کبھی کسی ریسٹورنٹ میں۔ کبھی لائبریری میں اور کبھی دوستوں کے ساتھ سڑکوں کے تفریحی چکر میں۔ گھریلو حالات کی گھٹن سے فرار کا یہ بہترین طریقہ تھا۔ گھر تھا بھی کیا۔ کبھی کبھی تو اسے یہ ڈربہ سا لگتا۔ جس میں چھوٹے بڑے مرغیاں مرغے بند ہیں۔ جنھیں صرف دانہ دنکا چگنے پانی پینے اور گھڑی دو گھڑی آنکھیں بند کر کے پڑ رہنے کے سوا دنیا جہان کی کوئی خبر نہیں۔ ایک مجہول قسم کی یکسانیت گھر کے ماحول پر چھائی رہتی۔ اور یکسانیت تو خوشی و مسرت کی بھی اکتا ڈالتی ہے۔ چہ جائیکہ گھٹن مایوسی اور بیزاری کی یکسانیت سے اکتایا ہوا تھا۔

لیکن اکتاہٹ کو مایوسی میں بدلنے کی بجائے اس نے اپنی ذات کے گرد مصنوعی حصار وضع کر لئے تھے۔ وہ خوش تھا اور یوں زندگی رواں دواں تھی۔

سرمئی صاف اور کشادہ ٹھنڈے ٹھنڈے سایوں والی سڑک اس کی زندگی میں بڑی اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ وہ اس سڑک کے دورویہ کوٹھیوں میں بسنے والوں کو خاصہ جان گیا تھا۔ وال کوٹھی میں نیلی مزدہ تھی۔ سفید گیٹ والی کوٹھی سے تین بچے ماڈل سکول میں جاتے تھے۔ گارڈینا کی باڑ والی کوٹھی کے کتے بڑے خونخوار تھے۔ برج نما چھت والی کوٹھی میں کئی لڑکے اور لڑکیاں تھے۔ جس کوٹھی کے گیٹ پر بوتل برش کی پھولوں سے لدی جھالریں لٹکتی رہتی تھیں ــــ اس میں کوئی امریکن جوڑا رہتا تھا۔ اور انہی پھاٹک والی بیلوں سے گھری کوٹھی سے کالی موٹر میں ادھیڑ عمر عورت اکثر باہر جایا کرتی تھی۔ دو بچے ساتھ ہوتے۔ غالباً انھیں اسکول چھوڑنے جاتی تھی۔

یہ معلومات اسے حاصل تھیں۔ اس کے علاوہ اب وہ مختلف کوٹھیوں کے بیروں خانساموں اور جمعدارنیوں کو بھی پہچاننے لگا تھا۔ سائیکلوں پر ٹین بیپوں میں دودھ ڈالے گوالے بھی اس کے علم میں تھے۔ کہ فلاں گوالہ فلاں کوٹھی میں دودھ دیتا ہے۔

اس سڑک کی اہمیت تو اسے اس دن معلوم ہوئی۔ جس دن وہ سانولی سلونی سی لڑکی اس کے ذہن کی سکرین پر منعکس ہوئی۔ شاید وہ روز ہی اس راستے سے جایا کرتی تھی۔ یا ہو سکتا ہے اب ہی دونوں کے راستے ایک ہوئے ہوں۔ بہرحال وہ کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ کہ انہی پھاٹک والی بیلوں سے گھری کوٹھی سے وہ نکلتی اور بس سٹاپ کی طرف اپنی مخصوص رفتار سے چل دیتی۔ اس کے ہاتھ میں کبھی دو ایک کتابیں ہوتیں۔ کبھی بیگ اور کبھی فائل۔

وہ معمولی نقش و نگار کی عام سی لڑکی تھی۔ لیکن اس کے سانولے رنگ میں جوانی کی ایسی تپش تھی۔ کہ دیکھنے والا دیکھے جانے پر مجبور ہو جاتا۔

اس کی دلچسپی اس اجنبی وجود میں بڑھنے لگی۔ وہ بھی روز کی راہی تھی۔ بس سے یونیورسٹی جاتی تھی۔ اس کا سٹاپ پہلے پڑتا تھا۔ یونیورسٹی کے سٹاپ پر اترنے سے اس نے قیافہ لگایا تھا۔ کہ وہ یقیناً وہاں پڑھتی ہے۔ پڑھاتی اس لئے نہیں کہ اس کی عمر ابھی اس حد تک نہیں پہنچی تھی۔ اکیس بیس سال سے یقیناً زیادہ نہ تھی۔

اب تو اس راستے سے دفتر جانا اس پر گویا فرض ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی روز ہی اُسے نظر آتی۔ کبھی وہ پہلے پہنچ جاتا اور لڑکی بعد

میں کوٹھی سے نکلتی اور کبھی لڑکی پھاٹک سے نکلتی جا رہی ہوتی ـــ اور وہ پیچھے پیچھے چل پڑتا۔

لڑکی بھی شاید اس کے غیر محسوس تعاقب سے آشنا ہو گئی تھی۔ اس لئے کوئی دن بھی ایسا نہ ہوتا ـــ جو وہ اس کی راہ میں نہ آتی ـــ لیکن مسلسل خاموش تعاقب اور غیر محسوس ٹکراؤ کے سوا دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی تھی۔

اس دن لڑکی کے بیگ سے کاغذوں کے پلندے کا گرنا تقریب بہر ملاقات والی بات ہو گئی۔

لپک کر اس نے کاغذ اٹھائے۔ اور مسکراتے ہوئے لڑکی کی طرف بڑھا دئیے

"شکریہ" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ یوں جیسے وہ اجنبی نہ ہو ـــ جواباً وہ بھی مسکرایا اور یوں سلسلۂ گفتگو کا آغاز ہو گیا۔

بس اسٹاپ تک دونوں ساتھ ساتھ گئے۔ رسمی سی چند باتیں ہوئیں۔ دونوں بس میں اکٹھے سوار ہوئے۔ یونی ورسٹی کے اسٹاپ پر وہ اتر گئی اس مسکراتی الوداعی نظروں میں بڑے خوبصورت پیغام تھے۔

پھر دونوں راستے میں روزانہ ملنے لگے۔ باتیں ہونے لگیں اور تکلف مٹنے لگا۔

ایک دن اس لڑکی نے پوچھا۔ "آپ روز کہاں جاتے ہیں"

"آپ کہاں جاتی ہیں" وہ مسکرایا۔

لڑکی بھی مسکرا دی ـــ پھر اس نے بتایا "میں دفتر جاتا ہوں۔ آپ یقیناً یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں ـــ؟"

اس کا سوال ان سنا کر کے لڑکی نے پوچھا "کس دفتر میں ملازم ہیں ـ؟ کیا کام کرتے ہیں"

وہ ایک لمحہ کو سوچ میں ڈوبا ـــ انکم ٹیکس آفس کا کلرک کہہ کر تعارف کرانے میں سبکی سی محسوس ہوئی۔ اتنی جہازی سائز کوٹھی میں رہنے والی لڑکی کی نظروں میں ایک کلرک کی کیا وقعت ہو سکتی ہے ـــ لڑکی نے منتظرانہ اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا "میں انکم ٹیکس آفیسر ہوں"

اس نے دیکھا لڑکی بیحد مرعوب ہو گئی تھی۔ خوشی کی ایک چھوٹی لہر اسے چھو گئی۔

پھر کئی ملاقاتوں میں اس نے لڑکی کو اپنے باپ کے دولت مند اور گھرانے کے ... ہونے کا تاثر دیا۔ لڑکی بھی خاصی گھل مل گئی تھی۔ اس کے بارے میں وہ بہت کچھ جان گیا۔ لڑکی اس وسیع و عریض کوٹھی میں اپنی ماں اور بھتیجوں کے ساتھ رہتی تھی۔ بھائی اور بھابی دو سال کے لئے امریکہ گئے تھے۔ بچے پڑھائی کی وجہ سے یہیں تھے۔ وہ ایم اے پریویس کی طالبہ تھی۔

ملاقات اب تک صرف راستے تک ہی محدود تھی۔ وہ اسے آگے بڑھانے پر اپنے دل کو مجبور پا رہا تھا۔ ایک دن ڈرتے ڈرتے بولا "مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر آپ آج شام چائے میرے ساتھ پئیں ـ"

لڑکی شش و پنج میں پڑ گئی ـ

"شاید یہ میری گستاخانہ جرأت ہے" وہ عاجزی سے بولا۔

"نہیں ـ نہیں تو ـــ" وہ کچھ گھبرا رہی تھی۔

"تو سمجھ لوں کہ آپ نے میری استدعا کو ٹھکرایا نہیں" وہ خوشی سے بہکتے ہوئے بولا۔

"لیکن ـــ"

"کیا"

آپ کے گھر والے کیا کہیں گے"

وہ سٹپٹا گیا ـ پھر مسکراتے ہوئے بولا "میں فی الحال آپ کو اپنے گھر مدعو نہیں کر سکتا۔ کسی کیفے یا ہوٹل یا ریسٹورانٹ میں چلنے کی دعوت دے رہا ہوں"

لڑکی نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے دعوت قبول کر لی۔

دعوت پر دعوت دی جانے لگی۔ اکثر شامیں اکٹھی گزرنے لگیں کبھی ہوٹل کبھی شہر سے دور کبھی دریا کنارے۔ قربتیں بڑھ گئیں۔ لیکن جوں جوں وہ ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔ کچھ پریشان رہنے لگے تھے۔ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے۔ کچھ کہنا چاہتے تو رک جاتے۔ ایک دوسرے کی امارت کے تذکروں سے پریشان ہو جاتے۔ اپنی جذباتی کیفیت سے تو وہ آگاہ تھا۔ اس سانولی سلونی سی لڑکی کو وہ واقعی پیار کرنے لگا۔ جوں جوں پیار شدت اختیار کر رہا تھا تو ں توں اپنے ارد گرد پھیلائے جھوٹ کے حصار سے پریشان ہو رہا تھا ـ کبھی کبھی تو جی چاہتا۔ کہ جرأت سے کام لیکر اس لڑکی کو سب کچھ بتا دے۔ لیکن اس کی کیا ضمانت کہ وہ لڑکی اس کی غربت کو قبول کرتے ہوئے اس کے جھوٹ کو معاف کر دے گی۔

لیکن

یہ لڑکی کیوں ڈانوا ڈول ہو جاتی تھی۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ الفاظ زبان پر آتے آتے رک جاتے تھے۔ وہ اُسے کرید بھی تو نہیں سکتا تھا۔ یہی باتیں وہ اس سے بھی پوچھ سکتی تھی ـــ پھر کیا جتا۔

دن یونہی گزر رہے تھے۔ دونوں اکثر خاموش سوچوں میں

ڈوبے ڈوبے رہتے۔ وہ اکتا کر کہتا۔ "باتیں کرو۔ ہنسو۔ مسکراؤ"
وہ ہنس پڑتی۔ باتیں کرنے لگتی۔ مسکرا دیتی۔ لیکن وقفوں کے بعد خاموش اور عجیب حجاب مسلط ہوتی۔

اس دن بھی وہ کچھ ایسے گم صم رہی تھی۔ اور پھر اچانک اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولی تھی: "آپ مجھے چھوڑ تو نہ دیں گے۔؟"

یہ اتنا غیر متوقع اور ایسا بھاری سوال تھا۔ کہ وہ بے طرح بوکھلا گیا۔ لیکن ایک ہی کائیاں تھا۔ گھبراہٹ اس پر ظاہر نہیں ہونے دی ہنس کر بولا — "یہ تمہیں کیا سوجھی؟"

وہ اُداس نظر آنے لگی۔ آج بھی اس کی زبان پر کوئی اَن کہی بات آکر رک گئی۔ بے چین نظروں سے اسے دیکھا۔ اور صرف اتنا بولی "آپ نے مجھے چھوڑ دیا تو میں — میں"

"ایسی باتیں نہیں کیا کرتے" اس نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ دبایا۔ "مجھ پر اعتماد کرو"

"سچ —" وہ خوش ہوگئی۔ وفورِ مسرت سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"ہاں" وہ سوچوں میں ڈوبتے ہوئے بولا۔

اور پھر سوچیں طوفانی سمندر کی طرح اس پر ٹوٹ پڑیں۔ دن رات وہ سوچوں میں گم رہنے لگا۔ معاملہ سنجیدگی کی یہ صورت اختیار کرے گا۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

اتنی امیر کبیر لڑکی اور وہ — اپنے ڈربہ نما گھر کے مقابل اس کی طویل و عریض کوٹھی۔ اس کا خاندان — اُف کیا ہوگا — وہ گھبرا کر رہ جاتا۔ کبھی جی چاہتا۔ کہ خاموشی سے وہ راستہ چھوڑ دے۔ اس سے قطع تعلق کرلے لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا — یہ لڑکی حقیقتاً اس کی نس نس میں بس چکی تھی۔

پھر انہی دنوں گھر میں کچھ مدھم مدھم سرگوشیاں ہونے لگیں۔ شاید کسی نے اسے اس لڑکی کے ساتھ دیکھ کر ماں کو خبردار کر دیا تھا۔ یا وہ خود ہی نظر شناس تھی جوان بیٹے کی آنکھوں میں ڈھلنے والی آرزوؤں کا اسے علم ہوگیا تھا۔ شادی اس کا واحد علاج تھا۔ اس کی سمجھ میں یہی آیا تھا۔

وہ ان دنوں بہت ہی پریشان رہنے لگا تھا۔ اس دن جانے کس بات پر اس کی بہن نے اُسے چھیڑا تھا۔ تو وہ چڑ گیا۔

ادھر ابھی سے یہ حال ہے۔ شادی کے بعد تو پوچھو گے بھی نہیں۔ شادی جو ہو رہی ہے نا —"

"کیسی شادی کس کی شادی۔؟"

"تمہاری اور کس کی"

وہ حیران و پریشان ہو کر بہن کا منہ دیکھنے لگا: "تو یہ سر جوڑ جوڑ کر صلاح و مشورے اسی سلسلے میں ہوتے ہیں"

"اور کیا —"

"لیکن میں شادی نہیں کروں گا"

وہ ہنس پڑی — پھیکی بے کیف سی ہنسی۔ اور پھر دکھ بھرا سانس لیتے ہوئے بولی "پھیمو کی ماں روز تقاضہ کرتی ہے۔ کب تک بیٹی کو گھر بٹھائے رکھیں۔

پھیمو!

اس نے دونوں ہاتھوں پر اپنا سر گرا لیا۔

اور ڈھلتی عمر والی کنواری بہن اپنا دکھ چھپاتے ہوئے ہنس کر بولی "آخر تو شادی کرنا ہی ہے — تم نے بھی تو حد ہی ختم کردی۔ کئی ماہ سے گھر پیسہ دیتے ہو نہ دھیلہ۔ سارا سارا دن باہر ہی رہتے ہو — سونے کے لئے گھر آتے ہو — یہ بُری بات ہے۔ اماں باوا ٹھیک ہی سوچتے ہیں۔ شادی ہو جائے گی۔ تو آپ ہی ٹھیک ہو جاؤگے۔ پھیمو تمہیں تیر کی طرح سیدھا کرلے گی"

وہ جیسے کچھ سُن ہی نہیں رہا تھا۔ اس کا دل و دماغ جھٹکے کھا رہا تھا۔

پھیمو! بڑ بڑائے ڈربہ نما مکان میں ماں باپ بھائیوں، بھابیوں اور ان کے بچوں کے ساتھ رہنے والی پھیمو پر اماں کی کب سے نظر تھی۔ مٹیالے رنگ بھینی سی ناک اور کھچی کھچی آنکھوں والی پھیمو میں اماں کو جہاں بھر کی خوبیاں نظر آتی تھیں — وہ ہنڈیا مزے کی پکاتی تھی۔ ڈھیروں برتن چٹکی بجاتے مانجھ دھو ڈالتی تھی۔ کپڑے دھونے میں تو اس کا جواب نہ تھا۔ قمیص دریاں اور چادریں تک منٹوں میں دھو کر تہا کر دیتی تھی۔ وہ سوئی کی کڑھائی بھی جانتی تھی۔ اور رنگین دھاگوں سے تکیے کی چادروں پر بیل بوٹے بھی خوب بناتی تھی۔ گھر میں کہیں کچھ صفائی یا کسی طرح پوش ایسا دیتا تھا۔ جب بھی اس نے کاڑھے کاڑھے رنگوں کے لمبے بڑے بیل نہ کاڑھے ہوں۔ یک جھٹک ہر کام کر ڈالتی تھی۔ ان خوبیوں کے علاوہ سب سے بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ نویں جماعت تک پڑھی ہوئی بھی تھی۔

اپنے نام کے ساتھ وہ جمیو کا نام عرصے سے سُن رہا تھا۔ یہ بات اسے کبھی بُری بھی نہ لگی تھی۔ جمیو بھی باخبر تھی۔ دروازے کے ٹاٹ کے پردے کی اوٹ سے اسے گھر سے باہر آتے جاتے دیکھ لیا کرتی تھی۔ وہ بھی چھپی دلچسپی لیتا تھا۔ دزدیدہ نظروں سے ٹاٹ کی اوٹ سے چھپتا نکلتا چہرہ دیکھ ہی لیا کرتا تھا۔ لبوں پر آپوں آپ ہی مسکراہٹ آجاتی تھی۔

لیکن جب سے اس سانولی لڑکی سے ناطہ جوڑا تھا۔ وہ جمیو کو یکسر نظر انداز کر بیٹھا تھا۔ کوٹھریوں میں رہنے والی لڑکی کوٹھی میں رہنے والی دوشیزہ سے نسبت ہی کیا رکھ سکتی تھی۔ جمیو کو تو بات کرنے کا سلیقہ تھا نہ اوڑھنے پہننے کا ڈھب۔ باتیں کرتی تو آواز اپنے گھر میں بیٹھے سن لی جاتی۔ رنگین کپڑے ہمیشہ ہی بے ڈھنگے ہوتے۔ گو وہ بھی لڑکی سادہ ہی تھی۔ ہمیشہ ہی لٹھے کی سفید شلوار پہنتی۔ ساتھ رنگ برنگی پھولوں والی قمیضیں ہوتیں۔ لیکن رنگوں اور پھولوں کا تناسب اس کے وجود اور رنگ کے ساتھ اتنا متناسب ہوتا کہ سادگی بھی پرکاری لگتی۔

وہ پہلے ہی پریشان کیا کم تھا۔ جو اس نئی بات نے ذہنی کوفت دی۔ لیکن وہ تذبذب میں تھا۔ چاروں طرف سے کچھ یوں جکڑا گیا تھا۔ کہ ہلنے کی بھی گنجائش نہ رہی تھی۔ جمیو سے شادی سے انکار کرکے بھی اسے وہ لڑکی نہ مل سکتی تھی۔

وہ لڑکی — جسے اس نے اپنے متعلق اتنا بڑا فریب دے رکھا۔

ماں بہنوں اور جمیو کی اماں کا اصرار بڑھنے لگا۔

کئی دن گذر گئے۔

وہ سوچوں میں گم رہا — اسے ایک فیصلہ کرنا تھا۔ کہ اپنے جھوٹ کی قلعی کھول دے۔ یا اس لڑکی سے کنارہ کشی کرلے۔

بڑا جان لیوا مرحلہ تھا۔ کئی دفعہ دکھ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ رات رات بھر وہ بےچین کروٹیں بدلتا رہا — اپنے آپ کو کوستا رہا۔

اور شاید ہوشمندی کی کوئی رمق اس میں باقی تھی۔ عقل رسوا نہ ہوئی تھی۔ جذباتیت سے ہٹ کر سوچنے کا شعور تھا۔ جو چیز اس کی دسترس سے چاند ستاروں کی طرح دور تھی۔ اسے حاصل کرنے کی لگن حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا اپنا بھرم کھو کر بھی اسے پانے کی آس و امید بے بنیاد تھی — اس لئے — اس لئے اس نے فیصلہ کرلیا۔ کہ وہ اس لڑکی کی راہ سے خاموشی سے ہٹ جائے گا۔ یوں اس کی زندگی سے نکل جائے گا۔

جیسے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ اسے اک دکھ بھری یاد بنا کر سینے میں محفوظ کر لے گا۔ اور بس —

اس فیصلے سے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ دل بےبس ہو کر پھڑکا۔ لیکن اس نے اس فیصلے پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کرلیا۔

اور جب دل کی دنیا اجڑ ہی گئی تھی۔ تو یہ دنیا ماں باپ جس کے بھی حوالے کر دیتے ہیں کیا فرق پڑے گا — جمیو ہوتی یا کوئی اور — اس کے لئے معاملہ یکساں ہی تھا۔

اس نے وہ راستہ چھوڑ دیا — دوسرے راستے سے دفتر آنے جانے لگا۔ ہوٹل ریسٹورانٹ اور کیفے بھی تیاگ دیئے۔ ڈرتا تھا۔ کہیں اس سے سامنا ہی نہ ہو جائے۔ زیادہ وقت وہ گھر ہی پہ گذارنے لگا۔ گھر — چھوٹا سا ڈربہ — جس میں ایک نئی مرغی لانے کا بندوبست بڑی تیزی اور بڑی خوشی سے اہل خانہ کر رہے تھے۔

ایک مہینے کے اندر ہی اس کی انگلی میں نکاح کی لال موٹے نگینے والی انگوٹھی پہنادی گئی۔ رخصتی سردیوں میں طے پائی۔

اداسیوں کی کاٹ کلیجے میں اترتی رہی۔ لیکن اپنے کئے کی سزا سمجھ کر وہ اسے برداشت کرتا رہا۔

بڑے ہی دنوں بعد وہ اس شام اس کیفے کی طرف گیا۔ جہاں وہ دونوں کیبن میں آمنے سامنے خاموشیوں کی زبان میں حال دل کہا سنا کرتے تھے۔ اتفاق ہی تھا۔ جو وہ بھی اپنی ماں اور بھتیجوں کے ساتھ سڑک پار والی جوتوں کی دوکان میں آئی تھی۔ اس کی موٹر باہر کھڑی تھی۔ اس نے اسے کیفے میں آتے دیکھ لیا تھا۔ ماں سے جانے کیا کہہ کر وہ ادھر آگئی تھی۔ وہ ملنے سے کترا رہا تھا۔ اسی لئے اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اٹھ کر چل دینا چاہتا تھا۔ لیکن وہ پہلے ہی پہنچ گئی۔

وہ بھی اپنے حواس مجتمع کر کے بیٹھ گیا۔ اب باقی کیا رہ گیا تھا۔ پھر بھی اس نے بے لوث پیار پر کوئی آنچ نہ آنے دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے ارادہ کرلیا۔ کہ اپنے متعلق آج اسے سب کچھ بتادے گا۔

دونوں کیبن میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ ایک ہی سانس میں اس کے یوں ایکا ایکی غائب ہونے کا گلہ کر رہی تھی۔ بہت بےچین بہت افسردہ ہو رہی تھی وہ۔ وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اور بڑے گمبھیر لہجے میں بولا۔ "مجھے احساس ہو گیا تھا۔ کہ ہمارے راستے جدا جدا ہیں۔ اس لئے میں نے راہ بدل ڈالی — !

وہ بے چین ہو کر روہانسی آواز میں بولی "آپ کا مطلب کیا ہے"
اور اس نے سارا مطلب اسے سمجھا دیا۔ بڑے اعتماد سے اپنے جھوٹ کا پردہ تار تار کر دیا۔

اس کے سر سے اس کے دل سے اور اس کی روح سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے اپنی پشت، کرسی کی پشت سے ٹکرا کر گردن پیچھے ڈال دی۔

متوقع انجام کی کوفت برداشت کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس میں لیکن جب کئی لمحے خاموشی طاری رہی۔ تو اس نے دھیرے دھیرے گردن اٹھائی۔ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور اُسے دیکھا۔

وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔
اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

تو کیا اس کی غربت اور اس کا جھوٹ دونوں اس کے لئے قابل قبول ہیں — بے اختیارانہ اس نے ہاتھ میز پر اُلٹے رکھتے ہوئے گھبرا کر اسے دیکھا۔

"مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے — ڈر لگتا ہے کہیں پاگل ہی نہ ہو جاؤں" اس لڑکی نے دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔

"جی۔!؟—" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگا۔

وہ بڑے حسین انداز سے مسکرائی "کتنی مدت سے میں بھی یہی بات آپ سے کہنا چاہ رہی تھی — کہ — میں —"

"جی"

"کہ میں وہ نہیں ہوں۔ جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں بھی آپ ہی کی طرح ایک غریب لڑکی ہوں — یہ کوٹھی میری نہیں ہے۔ اس کے سرونٹ کوارٹر میں میں اپنے مفلوج باپ ضعیف ماں اور بیوہ بہن کے ساتھ رہتی ہوں۔ کوٹھی کی مالکہ کا بیٹا اور بہو امریکہ گئے ہوئے ہیں۔ وہ اکیلی تھیں۔ اس لئے ازراہ مہربانی ہمیں سرونٹ کوارٹر میں جگہ دے دی ہے۔ میں یونیورسٹی میں بھی پڑھتی نہیں ہوں۔ یونیورسٹی کے پیچھے عزیز بھٹی روڈ پر جو اسکول ہے وہاں لائبریرین ہوں۔ آپ کی باتوں سے مرعوب ہو کر میں نے بھی اپنے گرد یہ خول چڑھا لیا تھا"

وہ خوشدلی سے ہنسی۔ اور ننھا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ "چلیے حساب برابر ہو گیا"

وہ ٹھگ سا اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا —

تاسف اور بے بسی کے ملے جلے احساس سے اس نے اپنا سر میز پر پھیلے ہاتھوں پر ٹیک دیا —

لال نگینے والی انگوٹھی موٹی سی اس کے ہاتھ میں بُری طرح چبھ رہی تھی۔

آئیڈیل کا جواب

عالیہ نشاط (برہانپور)

ندیم ایک آئل کمپنی کے آفس میں کلرک تھا۔ خاندانی نجابت و شرافت کے ساتھ ہی وہ خوبرو بھی تھا اور اس لئے اس کی تمنا تھی کہ اسے بیوی بھی ایسی حسین ملے جو اس کے لئے موزوں ہو۔

ندیم کے والد کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ انتقال سے پہلے ہی انھوں نے ندیم کی ماں سے وصیت کی تھی کہ ندیم کی شادی ان کی بہن کی بیٹی درخشاں کے ساتھ کی جائے۔ مرحوم نے اپنی بہن کو اطمینان بھی دلادیا تھا کہ وہ درخشاں کی طرف سے پریشان نہ ہوں۔ وہ میرے گھر کا اُجالا بنے گی۔ اسی لئے بیچاری درخشاں کی ماں مطمئن تھیں۔ انھیں دنیا میں اس کے سوا کوئی فکر ہی نہ تھی کہ ان کی درخشاں کے ہاتھ پیلے ہوجائیں۔ درخشاں ہی تنہا ان کا سب کچھ تھی انھوں نے اسے نہ صرف یہ کہ دسویں تک تعلیم دلائی تھی، امورِ خانہ داری میں بھی ماہر بنا دیا تھا۔ سلائی کڑھائی اور بُنائی میں درخشاں کا جواب نہ تھا۔ اس کے بنے ہوئے سوئٹر اور شال اتنے دلکش ہوتے کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے۔ اس کے تیار کردہ کھانے اور پکوان جو کھاتا تعریف کے پل باندھ دیتا۔

شریف گھرانے کی لڑکیوں کی طرح وہ شرم و حیا کی پتلی تھی۔ کبھی دوپٹہ سر یا سینے سے نہ ڈھلکتا۔ ادب و لحاظ ایسا کرتی کہ سب کے دل خوش ہوجاتے۔ صورت شکل کے اعتبار سے درخشاں اوسط درجہ رکھتی تھی، لیکن چہرے پر ایسا تقدس تھا کہ حوریں بھی دیکھ سکتیں تو شرما جاتیں۔

ندیم کی ماں اپنے بیٹے کے کردار پر فخر کرتی تھیں۔ وہ بھی باسلیقہ اور فرمانبردار تھا۔ وہ صرف خود حسین تھا، اس کا ذوق بھی حسین تھا۔ اس کے کمرے میں جو چیز بھی تھی حسین اور دیدہ زیب تھی۔ اسے علم و ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ جب بھی وقت ملتا افسانے لکھتا اور وہ رسائل میں شائع بھی ہوجاتے۔ [illegible] لڑکیاں اسے خط لکھا کرتیں اسے کبھی کبھی کے خطوط بھیلا کے زجواب ہوا کرتیں۔ سب سے زیادہ اس کے افسانوں کے سراہنے والی ناہیدہ تھی جو اس کے باس کی سکریٹری تھی اور اس سے برابر ملتی رہتی تھی۔ ناہیدہ بیحد حسین اور فیشن پرست لڑکی تھی جیسی کہ عام طور پر سکریٹری کی جگہ پر کام کرنے والی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ وہ آفس میں آتی تو مرکزِ نگاہ بن جاتی، اس لئے کہ سونے پر سہاگہ اس کا میک اپ اور نیم عریاں لباس ہوتا جو قیمتی سینٹ بکھیرتا پھرتا۔

ندیم سے وہ جب بھی ملتی اس کے کسی نہ کسی افسانے کی تعریف کرتی اور ایسی بے تکلفی کا اظہار کرتی کہ ندیم رفتہ رفتہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتا گیا کہ ناہیدہ، اس سے محبت کرتی ہے۔ دونوں ساتھ ہی میں لنچ لیتے اور چائے پیتے۔ بل ندیم ادا کرتا۔ کبھی کبھی ناہیدہ فلم دیکھنے کی دعوت دیتی اور ندیم بہ فخر اسے قبول کرکے ٹکٹ لاتا اور اس کے ساتھ فلم دیکھتا۔

ان باتوں کے بعد ندیم نے طے کر لیا تھا کہ وہ ناہیدہ سے ہی شادی کرے گا جو اس کی آئیڈیل ہے۔ درخشاں کو وہ بالکل پسند نہ کرتا تھا اس لئے کہ وہ سراپا حجاب بن کر اس کے سامنے آتی تھی اور اس کے برخلاف ناہیدہ مکمل قیامت بنی نظر آتی تھی۔ اس کے ذوقِ سلیم کے لئے واقعی درخشاں کی کوئی حقیقت ناہیدہ کے مقابل نہ تھی۔

ایک روز ندیم کی ماں نے اپنی تمنا کا اظہار کیا تو ندیم نے صاف صاف کہدیا کہ وہ درخشاں سے شادی نہیں کرسکتا۔ ماں بیٹے کا جواب سنکر حیران رہ گئیں۔ انھوں نے کہا "بیٹے! یہ تمہارے مرحوم باپ کی وصیت تھی۔"

ندیم نے کہا "امی جان وصیت ایسی باتوں کے لئے نہیں کی جاتی۔ آپ جانتی ہیں کہ میں حسن پرست ہوں۔ میرے ذوق کے مطابق ہی شریکِ زندگی ہو سکتی ہے۔"

ماں نے کہا "اپنے ابا جان مرحوم کا، خدا انھیں غریقِ رحمت کرے، ذوق کیا تو نہیں دیکھا۔ وہ تجھ سے بھی زیادہ حسین تھے اور میں ـــ میں جیسی تھی، تو دیکھ ہی رہا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ وہ ہمیشہ مجھ سے خوش رہے۔ میری قدر کرتے رہے۔ بیٹے بیوی کا حسن صورت ہی نہیں دیکھا جاتا وہ کلنڈر کی تصویر نہیں ہوتی کہ اسے ٹانگ کر دیکھا جائے۔ درخشاں جیسی بیوی چراغ لے کر ڈھونڈھنے پر بھی نہ ملے گی۔ میرا کہا مان اور تعلیم کے پیچھے نہ دوڑ

جو آفسوں میں کام کرنے لگی ہیں۔

ندیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اٹھ کر باہر چلا گیا اور ماں ہکا بکا اسے جاتے دیکھتی رہ گئیں۔

اور اسی روز ایک ریسٹوران کے کیبن میں چا پیتے ہوئے ندیم نے نائیدہ سے کہا۔

بہت دنوں سے تم سے ایک بات کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہ سکا لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ میں وہ بات تم سے کہہ دوں۔

نائیدہ نے ہنس کر کہا۔ کہیں تم میری بے تکلفی سے اس غلط فہمی میں تو مبتلا نہیں ہو گئے ہو کہ میں تم سے ایسی محبت کرتی ہوں کہ تم سے شادی کروں۔

نائیدہ کا جواب ندیم پر بم بن کر گرا۔ پھر بھی اس نے کہا۔ کیا میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔ نائیدہ! میں تو تم پر فدا ہوں۔ تم تو میری آئیڈیل ہو۔"

نائیدہ نے تمسخر آمیز ہنسی کے ساتھ کہا۔ حد کر دی تم نے نعیم — تم نے یہ تو سوچا ہوتا کہ تم سات سو روپیہ تنخواہ پاتے ہو۔ یہ تم تو میرے لباس اور میک اپ کے سامان کے لئے بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ شادی کے سلسلہ میں میرا معیار بہت بلند ہے۔ بنگلہ، کار اور کافی بینک بیلنس رکھنے والے ہی کے ساتھ میری گزر ہو سکتی ہے۔ تم میری دوستی سے غلط فہمی میں مبتلا رہے۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ کیا دوستی صرف شادی ہی کے لئے کی جاتی ہے ندیم۔

ندیم نائیدہ کے خلاف توقع جواب کو سنکر سناٹے میں آ گیا۔ کوئی جواب اس سے بن نہ پڑا۔ کیبن سے نکل کر وہ سیدھا گھر پہنچا۔ اور ماں سے لپٹ کر بولا امی جان۔ صبح میں نے اپنی حماقت سے آپ کو جو دکھ پہنچایا تھا اس کے لئے معافی مانگتا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے — اور ابا جان مرحوم کی وصیت پر عمل کیجئے۔ ماں نے اس کا منہ چوم لیا۔ فرط مسرت سے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

یہ لاش میری ہے

شمیم اختر

جس علاقے میں نچلے درجے کے ملازمین رہتے ہیں، وہاں دن تھکا تھکا سا چڑھتا ہے۔ فضا کا رنگ کہتا ہے کہ ابھی بدن پر کسلمندی طاری ہے مگر رات تمام ہو گئی۔ صبح کی انہی ساعتوں میں نیند ٹوٹ کر آتی ہے لیکن میٹھی نیند کو چھوڑ کر اٹھنا پڑتا ہے۔ آنکھیں کھولنے کے لئے قوت صرف کرنی پڑتی ہے ہاتھوں میں گلاس اٹھائے دودھ والے کی دکان کی طرف جانے والے کئی بابوؤں چلتے ہیں۔ جیسے خواب میں چل رہے ہوں۔ بعض کی نیند تو پراٹھا کھانے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے اور بس میں سواری کے لئے دھکم پیل کرنے سے بھی نہیں ٹوٹتی۔ کچھ دفتر میں ٹائپ رائٹروں کی کھٹ کھٹ سے جاگتے ہیں۔ کسی کی آنکھ افسر کی ڈانٹ سن کر کھلتی ہے۔ اور قرض خواہ جگاتا ہے۔

میں ایسے ہی ایک علاقے میں رہتا تھا۔ میری زندگی کی ہر صبح کا یہی رنگ تھا۔ اس یکسانیت میں، اس وقت کچھ ہلچل مچی تھی جب محلے میں اکبر کی بیٹی بھاگ گئی تھی اور عبدل نے اپنے بیٹے کو گھر سے نکالنے کی دھمکی دی تو بیٹے نے باپ کے دو دانت توڑ دیئے تھے۔ اس قسم کی خبر رسانی کا کام میری بیوی انجام دیتی تھی۔ وہ صبح مجھے بستر میں جھنجھوڑ کر اٹھاتے ہوئے خوشی اور ہیجان کے ساتھ یہ خبریں سناتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ مجھے جگانے کے لئے ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے۔ کیونکہ مجھے عبدل کے ٹوٹے ہوئے دانت نظر نہیں آتے تھے۔ اور اکبر کی بیٹی بھی ہر دروازے کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی نظر آتی تھی۔ ایک روز جب میری بیوی نے مجھے جگانے کے لئے یہ خبریں سنائیں تو نیند کے غلبے سے چور ہو کر میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا تھا کہ اکبر کی بیٹی اپنے گھر میں موجود ہے اور عبدل کے دونوں دانت سلامت ہیں۔ وہ کہنے لگی "بات کو دبانے کے لئے عبدل نے مصنوعی دانت لگائے ہیں اور اکبر کی بیٹی کو اس کے آشنا نے ٹھکرا دیا اس لئے وہ لوٹ آئی ہے۔"

مجھے یہ جواب دینے کے بعد میری بیوی رنجیدہ ہو گئی تھی۔ میرے خیال میں اس رنج کی وجہ یہ تھی کہ مجھے جگانے کے لئے اس نے جو کہانیاں گھڑی تھیں، ان کا پول کھل گیا تھا۔ میں خوش تھا کہ اب یہ [illegible] مجھے صبح جگا سکے گی اور میں مزے سے سوتا رہوں گا۔

وہ مجھے جگانے کے لئے آتی۔ مگر میں مزے سے سوتا رہا۔ اس نیند میں بڑا لطف اور چین تھا۔ مجھے یہ غم نہیں تھا کہ دفتر دیر سے پہنچا تو ڈانٹ پڑے گی۔ جواب طلبی کی دھمکیاں دی جائیں گی۔ میرے رویے سے تنگ آکر مجھے نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ مجھے اس بات کی قطعاً پریشانی نہ تھی کہ اگر مجھے نوکری سے نکال دیا گیا تو مجھے بھوکا سونا پڑے گا۔ میں اپنی بھوک سے خوفزدہ نہیں تھا۔ مجھے اپنی بیوی بچوں کے پیٹ کی فکر خوفزدہ کرتی تھی۔ یہ ایک ایسی مصیبت تھی جو رسم و رواج، روایت اور ضرورت نے میرے سر منڈھ دی تھی۔ مگر اپنی نیند کے نشے میں میں ان سب مصیبتوں کو بھولے بیٹھا تھا۔ یہ وہی مصیبتیں تھیں جن کو گوارہ بنانے کے لئے میں نے انھیں ذمہ داریوں کا نام دے رکھا تھا۔

جب میری بیوی مجھے جگانے میں ناکام ہو گئی تو اس نے ایک نیا حربہ استعمال کیا۔ وہ "لاش، لاش" چلانے لگی۔ اس کی چیخیں سن کر سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔ لاش گلی کے نکڑ پر پڑی تھی۔ لاش کو دیکھ کر میری بیوی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی، اس کی چیخوں سے میرے بچوں کی نیند اڑ گئی۔ وہ اپنی ماں کو روتا دیکھ کر چلانے لگے۔ میری بیوی لاش سے یوں لپٹی پڑی تھی جیسے یہ اس کی ملکیت ہو۔ مجمع کو چیرتی ہوئی میری ماں آگے بڑھی۔ اس نے میری بیوی کو ایک طرف دھکیلا اور رونے بیٹھ گئی۔ اتنے میں میری بہنیں آگئیں۔ ایک کی گود میں نومولود تھا۔ وہ بمشکل چل سکتی تھی۔ اس کا چہرہ کہنے لگا "اس لاش کو بھی آج ہی ملنا تھا۔ میری بھاوج کو چین نہیں ہے۔ جب دیکھو دروازے کی اوٹ سے لگی کھڑی رہتی ہے۔ صبح کے وقت ہر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد کسی کام سے باہر نکلتا ہے۔ انہی میں سے کوئی لاش کو دیکھ لیتا تو یہ مصیبت ہمارے گلے کیوں پڑتی۔ اُف اللہ، میں زیادہ بول بھی نہیں سکتی۔ ڈاکٹر کے پاس دوا لینے جاتی ہوں۔ اسے بتاتی ہوں کہ مجھے چکر آتے ہیں۔ کام کرنے سے تھکن ہو جاتی ہے۔ مگر اس کی سمجھ میں میری بیماری نہیں آتی۔ وہ مجھے دوا نہیں دیتی۔ کہتی ہے کہ پھل کھاؤ۔ گوشت کھاؤ۔ دودھ پیو۔ آدمی کے سامنے لاش رکھی ہو تو کوئی کیسے پھل اور گوشت کھا سکتا ہے اور دودھ پی سکتا ہے۔"

اپنی حالت زار کے بارے میں سوچ سوچ کر میری بہن نے رونا شروع کر دیا۔ ایک بہن روئی تو اس کے ساتھ باقی پانچوں بہنیں بھی رونے لگیں۔ اتنے میں میرے کچھ پڑوسی آگے بڑھے۔ انھوں نے میری بہنوں کو ایک طرف ہٹایا اور لاش کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد کہنے لگے "یہ تو قتل کا کیس ہے۔ کسی ظالم نے خنجر کے پے در پے وار کر کے اسے تمام کر دیا۔ کیا قاتل کوئی چور تھا یا کوئی پرانا دشمن۔ اس کی تلاشی لے کر دیکھو کہ کیا کھویا ہے"

سب لاش کی تلاشی لینے لگے۔ جیبیں بالکل خالی تھیں۔ جیبوں کو خالی پاکر وہ کہنے لگے، یقیناً کوئی چور تھا۔ جیب میں ایک پھوٹی کوڑی نہیں ہے صرف راشن کارڈ رکھا ہے چلو غنیمت ہے کہ اس نے راشن کارڈ نہیں لیا ورنہ نیا راشن کارڈ بنانے کے لئے مقتول کے لواحقین رُل رُل کر خاک ہو جاتے۔ لعنت ہے ایسے چور پر۔ مال لے جاتا جان چھوڑ جاتا"

پڑوسیوں کی یہ بات سن کر میری بیوی نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی کسی نے اس کے رونے پر توجہ نہ دی۔ کیونکہ اس وقت سبھی لاش کی تلاشی لینے میں مصروف تھے۔ ان کی نظر لاش کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر پڑی۔ گھڑی دیکھ کر وہ کہنے لگے، "اس کی گھڑی شاید ہمیشہ خراب رہتی تھی اور سبھی اس بات سے واقف تھے" ان میں سے چھوٹے قد کا آدمی کہنے لگا "یہ بھی ممکن ہے کہ مقتول کا کوئی بھائی نہ ہو۔ اس لئے گھڑی بچ گئی"

چھوٹے قد والے آدمی کی بات کا جواب کوئی دینے نہ پایا تھا کہ میری عمر اور میری ہی وضع قطع کے مردوں کا ایک ٹولہ ہجوم کو چیر کر لاش کے پاس پہنچا۔ وہ پوچھنے لگے "یہ کون ہے؟ یہ کس کی لاش ہے؟ آج دفتر کے حاضری رجسٹر پر ایک نام کے سامنے غیر حاضری کا نشان تھا۔ کسی کو یاد ہے کہ وہ کس کا نام تھا؟"

ان میں سے کچھ وہ نام یاد کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ چند ایک نے اپنے خشک آنسو پونچھنے کے لئے آنکھوں کے آگے رومال رکھ دیا اور بعض ایک سرد آہ بھر کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے جیسے اپنے انجام سے نظریں چرا رہے ہوں۔

"سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو بھاگ جاؤ۔ صرف عینی شاہد یہاں رک جائیں آج اپنے دفتر کوئی نہیں جائے گا۔ ہم ملزم کی گرفتاری کے لئے آئے ہیں اور ہاں ہمارے بیٹھنے کے لئے چارپائیاں لے آؤ" میں لب و لہجہ سے پہچان گیا کہ پولیس جائے واردات پر پہنچ گئی ہے۔ مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ میں ہجوم سے کہنا چاہتا تھا کہ اس حادثے کی اطلاع کسی طرح پولیس تک نہ پہنچ پائے۔ مگر وہ سب چپ ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ایک دو دفعہ میں نے بولنے کی کوشش کی تھی لیکن کسی نے میری طرف توجہ نہ دی۔ اب میرا بولنا قطعاً بے سود تھا۔

پولیس نے تفتیش کا آغاز کر دیا۔ باری باری عینی شاہدوں کو بلا کر ان کا بیان لیا جاتا۔ پھر سوال پوچھے جاتے۔ چند سوال اور ان کے جواب مجھے اب تک یاد ہیں

"یہ کس کی لاش ہے؟"

"معلوم نہیں"

"گویا لکھا جائے کہ لاش کی شناخت نہ ہو سکی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اسے کس آلے سے قتل کیا گیا ہے؟"

"ہر قسم کا آلہ استعمال ہوا ہے۔ سبزی کاٹنے کی چھری، ناخن کاٹنے کی قینچی، کپڑا سینے کی سوئی لیکن سب سے زیادہ کاری وار زبان کے ہیں"

"تمہیں کس پر شبہ ہے؟"

"شبہ کسی ایک شخص پر نہیں کیا جا سکتا"

"تمہارے خیال میں یہ قتل کتنے اشخاص نے کیا ہے؟"

"اس کے لئے مقتول کے رشتہ داروں کی گنتی کرنی پڑے گی"

"گنو"

"ایک ماں۔ ایک باپ۔ چھ بہنیں۔ بھائی کوئی نہیں ہے۔ ایک بیوی۔ پانچ بچے......"

"رک کیوں گئے؟ گنتی پوری کرو"

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہم پڑوسیوں اور دفتر کے ساتھیوں کو رشتہ داروں میں شمار کر سکتے ہیں؟"

"ضرورت کے تحت ایسا کیا جا سکتا ہے"

"چار پڑوسی۔ پندرہ دفتر کے ساتھی۔ اس طرح کل وار تینتیس ہوئے آپ زخم گن کر میرے بیان کی تصدیق کر سکتے ہیں"

"تمہارے خیال میں قتل کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

"ہر قاتل کے وار کی وجہ مختلف ہے۔ ماں نے اسے یہ کہہ کر قتل کیا کہ تم سب سے بڑے بیٹے ہو، اس جرم کی پاداش میں چھ بہنوں کو جہیز کے ساتھ بیاہو۔ ان کا جہیز ہماری حیثیت سے ہر حالت میں اونچا ہونا چاہئے۔ باپ نے یہ کہہ کر اس پر وار کیا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں میں نے تمہیں اس لئے پڑھایا لکھایا اور کلرک بنایا تھا کہ تم میری ذمہ داری سنبھالو۔ بہنیں ناخن کاٹنے کی قینچی سے

اسے کچھ کے لگتی تھیں کہ فلاں کا بھائی بہنوں کو چاہتا ہے۔ ان کے لئے ہر ماہ نئے کپڑے بنا تا ہے۔ ان کی قلمیں دکھاتا ہے۔ ہم کسی کو کیا بتائیں کہ بھیا نے ہمارے لئے کیا کیا۔ بیوی نے اس کو اپنے آنسوؤں سے زخمی کیا اور جب اس کے بچے ہو گئے تو بیوی ہر وقت اسے بچوں کے پیٹ کا واسطہ دینے لگی۔ بچوں کے آنسوؤں نے اسے چھلنی کر کے رکھ دیا۔ پڑوسیوں نے اس پر جو وار کئے وہ تمام پشت کی جانب ہیں۔ اگر پڑوسی اپنی بیویوں کو اچھا پہنا دیتے۔ یا بچوں کے لئے کوئی چیز اٹھا لاتے تو بیوی اسے ان کی مثالیں دے کر طعنے مارتی تھی۔ دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ اس کی کوئی دشمنی نہ تھی۔ مگر دوستی میں وہ اکثر ایک دوسرے کو ایسی باتیں کہہ جاتے تھے۔ جس سے جگر چھلنی ہو جاتا ہے۔"

"تمہیں اور کچھ کہنا ہے؟"

"نہیں جناب۔"

"لکھو کہ لاش کی شناخت نہ ہو سکی۔ اس کا قاتل لاپتہ ہے۔ اس نے یہ قتل چوری کی غرض سے کیا تھا۔ وہ جیبوں سے سارا اثاثہ نکال لے گیا۔ کسی گھڑی ساز پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ مقتول کی کلائی پر بند ھی گھڑی چھوڑ گیا جو کہ خراب ہے۔ شہادتوں سے پتہ چلا ہے کہ اس گھڑی نے کبھی ٹھیک وقت نہیں بتایا۔"

پولیس اپنی تفتیش مکمل کر کے جانے کے لئے اٹھی تو اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے بڑھ کر مجھے گردن سے پکڑا اور کہا۔ "چوروں کی طرح خاموش کھڑے ہو۔ یہاں آؤ۔ قتل کر کے چھپ گئے۔ چلو بیان دو۔ اور بتاؤ کہ یہ لاش کس کی ہے؟"

میں نے کہا: "یہ لاش میری ہے۔"

"قاتلوں سے واقف ہو؟"

"میں قاتل سے واقف ہوں۔"

"قاتل کون ہے؟"

"قاتل میں خود ہوں۔"

"قتل کی وجہ بتا سکتے ہو؟"

"مجھے نیند آتی ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔"

"تم نے قتل کے لئے کون سا آلہ استعمال کیا ہے۔؟"

"مجھے کسی آلہ استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔"

"پھر یہ واردات کیوں کر ہوئی؟"

"میرے اعضائے رئیسہ میں سے کسی ایک نے کام کرنا چھوڑ دیا۔"

"تمہارا شبہ کس عضو رئیسہ پر ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ دل ہے۔"

"قتل کی کوئی اور وجہ تمہاری سمجھ میں آتی ہے؟"

"میرے خیال میں یہ قتل کا کیس نہیں ہے۔"

"اگر یہ قتل نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟"

"یہ خودکشی کا کیس ہے۔"

"کیا تم کوئی عینی شاہد پیش کر سکتے ہو؟"

"میں حاضر ہوں۔"

"اسے گرفتار کر لو۔ اس نے خودکشی کی کوشش کی اور کامیاب ہوا۔"

میری بیوی، میرے بچے، ماں باپ، میرے پڑوسی، میرے دفتر کے ساتھی روتے رہ گئے اور وہ میری لاش کو گرفتار کر کے لے گئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جس کسی نے مجھے قتل کرنے کے لئے کاری وار لگائے تھے وہ سب سے زیادہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ میں خوش تھا کہ میں نے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر کے اپنے قاتلوں کی جان بچا لی تھی۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیں اور جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ فرمائیں۔

ایک جنتی خاتون

مولانا ابوالکلام آزاد کی اہلیہ کا نام زلیخا بیگم تھا۔ ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک اچھی خاتون میں ہونا چاہیئے۔ وہ امور خانہ داری سے بھی پوری طرح واقف تھیں۔ اور مہمان نواز بھی تھیں۔ ایک دن کوئی خاتون اُن سے ملنے گئیں جو خلاف عادت دس پندرہ منٹ کے بعد مسکراتی ہوئی آئیں۔ اور معانقہ کرتے ہوئے کہا معاف کیجئے گا بہن آپ کو اتنی دیر میرا انتظار کرنا پڑا۔ میں مولانا کو کھانا کھلا رہی تھی۔

وہی خاتون بیان کرتی ہیں کہ ایک دن صبح جب میں پہونچی تو بیگم آزاد کی نرگسی آنکھوں میں سُرخ ڈورے دیکھ کر میں نے مسکرا کر پوچھا کیا رت جگا ہوا ہے بھاوج آنکھیں خمار نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں وہ ہنس کر بولیں آپ کی عادت تو بنانے کی ہے آج کل مولانا تفسیر لکھ رہے ہیں رات کے دو بجے کے بعد اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جتنی دیر وہ لکھتے ہیں میں پنکھا جھلتی ہوں موسم بہت گرم ہے باہر بھی حبس ہی رہتا ہے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جاگیں اور محنت کرتے رہیں اور میں آرام سے سوتی رہوں۔ اس پر مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی لکھتے ہیں اور کیا خوب قیمتی نوٹ ہے: اللہ اللہ ایک اتنے بڑے پبلک لیڈر کی بیوی کے لئے اس بیسویں صدی میں پردہ نشین رہنا ہی بڑی بات تھی چہ جائیکہ اگلی جنتی بیویوں کی طرح شوہر کو کھانا بھی کھلائیں ان کو پنکھا بھی جھلیں اور شوہر کے آرام و راحت رسانی میں راتوں کو خود نیند بھی خراب کریں۔

(اخبار صدق جدید ۳ / اکتوبر ۱۹۵۸ء)

علم اور دولت

حضرت علیؓ سے دس آدمیوں کی ایک جماعت نے سوال کیا علم اور دولت میں سے کسے برتری حاصل ہے" حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے فرمایا۔

دولت فرعون کا ورثہ ہے اور علم انبیاء کا عطیہ جس کے پاس دولت و ثروت ہو اس کے بہت سے دشمن ہوتے ہیں جس کے پاس علم ہو اس کے بہت سے دوست ہوتے ہیں۔

دولت تقسیم ہو جائے تو کم ہو جاتی ہے علم تقسیم کیا جائے تو بڑھ جاتا ہے۔

دولت مند کنجوسی کی طرف مائل رہتا ہے اور عالم فیاضی کی طرف۔

دولت چرائی جا سکتی ہے لیکن علم چرایا نہیں جا سکتا۔

دولت وقت کے ساتھ گھٹتی رہتی ہے علم کبھی نہیں گھٹتا۔

دولت محدود ہے اس کا حساب رکھا جا سکتا ہے علم لا محدود ہے اس کی کوئی انتہا نہیں۔

دولت سے اکثر دل و دماغ پر سیاہی چھا جاتی ہے علم سے دل و دماغ جِلا پاتے ہیں۔

دولت نے فرعون اور نمرود سے خدائی کا دعوا کرایا۔

علم نے انسان کو معبود حقیقی سے متعارف کرایا ہے۔

مرسلہ:۔ شاذیہ بخاری (حیدرآباد)

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریم کے سالانہ خریدار ہر ماہ صرف ایک ایسی خبر شائع کرا سکتے ہیں جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر الفاظ میں صاف صاف لکھی جائے۔

ساتھ ہی پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ روانہ کریں اور نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ کتابت کی غلطی کا ذمہ دار ادارۂ حریم نہ ہوگا لیکن اطلاع ملنے پر اس کی تردید شائع کرنا ہمارا فرض ہوگا۔

(معذرت)

ستمبر ۷۹ء کے حریم میں انتقال پر ملال کی خبروں میں جو خبر عالیہ نشاط صاحبہ بریلی نور کی جانب سے صفحہ ۶۰ پر شائع ہوئی تھی اس میں کتابت کی غلطی سے نانی جان کے بجائے اماں جان شائع ہوگیا۔ اس غلطی کے علم پر سخت ندامت ہوئی۔ اللہ پاک کے فضل و کرم سے عالیہ نشاط صاحبہ کی والدہ محترمہ بقیہ حیات ہیں۔ اللہ پاک انھیں عمر خضر عطا کرے اور وہ مجھے اس غلطی کے لئے صدق دل سے معاف فرمائیں۔

شرمسار۔ نسیم اکہونوی

ولادت اطفال کی خبریں

- ناصرہ جمیل (آنبور) میری پیاری نند چیا امیر النساء صاحبہ اور نندوئی والم فرید احمد صاحب کے گلشن حیات کو پر بہار بناتے ہوئے ۱۲ اگست ۷۹ء بوقت ۲ بجے دن پہلی بار ایک ننھی سی کلی مسکرائی۔ نام سعدیہ تسنیم قرار پایا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک ننھی کی عمر دراز کرے اور اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- کہکشاں جمال رخشندہ جمال شمسی (آکولہ) میری پیاری خالہ باجی عفت آرا بیگم اور خالو عبدالشاہد صاحب کے باغ دلکشا میں خداوند تعالیٰ نے پہلی بار ۱۹ اگست ۷۹ء بروز اتوار بوقت ۲ بجے دن ایک پیاری سی کلی کھلائی۔ نام تہمینہ شاہد قرار پایا۔ دعا ہے کہ میری گڑیا والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور عمر دراز پائے۔
- [illegible] نام بث (میرے چھوٹے ماموں جی [illegible] کے گلشن حیات میں [illegible] ستمبر ۷۹ء

بروز جمعہ بوقت ایک بجے شب ایک کلی مسکرائی نام محسنہ عرف نازیہ کوثر قرار پایا۔ اللہ نصیبہ ور کرے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

- عذرا مزمل (کانپور) میری پیاری باجی پروین جہاں اور دولہا بھائی ارشاد عالم (کانپور) کے گلشن حیات میں اللہ تعالیٰ نے ایک گڑیا کے ۶ سال بعد دوسری گڑیا ۸ اگست ۷۹ء بروز بدھ بوقت پونے سات بجے شام عطا فرمائی۔ پیار کا نام بے بی قرار پایا۔ دعا ہے کہ اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- تابندہ مصباح (حاجمئو۔ کانپور) میری بڑی آپا کشو مصباح اور بہنوئی ناظر عالم کے گلشن حیات میں ۱۲ ستمبر ۷۹ء بروز بدھ بوقت ۹ بجے صبح ایک کلی کھلی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ نصیبہ ور ہو اور اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- فریدہ سید علی سقاف (شہر پور دکن) میری پیاری اپی قمر النساء اور بہنوئی سید عبد الرحیم کے چمن حیات کو پر بہار بناتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ۸ اگست ۷۹ء کی شب میں ۹ بجے دو کلیوں کے بعد ایک پھول کھلایا۔ نام سید متین قرار پایا۔ اللہ پاک سے ملتجی ہوں کہ یہ گلشن خزاؤں سے محفوظ رہ کر سدا بہار رہے اور فخر خاندان ہو۔
- رفعت سیفی (مظفر نگر) میری بہن نکہت آرا بی۔ اے اور بہنوئی سید محمد کفیل صاحب ایم، اے (علیا) کو اللہ پاک نے پہلی بار ۱۵ اگست ۷۹ء بروز بدھ مطابق ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ بوقت شام ۷ بجکر ۲۲ منٹ پر ایک خوبصورت فرزند سے نوازا۔ نام عروج رکھا گیا۔ خدا سے دعا ہے کہ سہرا چاند کو برکا لل بنائے رکھے۔
- نوگن رضوی صاحبہ۔ آپ کی خبروں کے ساتھ ٹکٹ نہیں ملے۔

پیغامات نشاط کی خبریں

- زبیدہ بتول (آمبور) میرے بھانجے شفیق احمد ابن جناب پی عبد الرحمٰن (کروی۔ ایل عالیہ بانو (بنت جناب وی۔ ایل۔ عبد الباسط) سے ۲ ستمبر ۷۹ء بروز اتوار رشتۂ ازدواج میں منسلک کردیا گیا۔ اللہ سے دعا ہے کہ دولہا دلہن تا حیات ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار رہیں اور خوشحالی ان کے قدم چومے۔

انتقال پر ملال کی خبریں

گذشتہ ماہ کے حریم میں انتقال پر ملال کی ایک خبر [illegible]

(ہنسور میسور) کے نام سے چھپ گئی تھی۔ دراصل یہ خبر بشریٰ کلیم قادری صاحبہ بھاری کی جانب سے روانہ کی گئی تھی۔ براہ کرم حریمی بہنیں نوٹ فرمالیں۔ ادارہ اس غلطی کے لئے معذرت خواہ ہے۔

- نجم الحسن صاحب انجم ادیب ایم۔ اے اردو وقادری (کولار کرناٹکا) کی پارۂ جگر نور نظر عائشہ اسما ۱۲ اگست ۱۹۷۹ء کو اللہ کو پیاری ہوگئی۔ یہ خبر میں نے بڑے افسوس کے ساتھ پڑھی۔ بیٹیاں سب ہی کی چہیتی ہوا کرتی ہیں، ننھی عائشہ اسما اپنے والدین کو کچھ زیادہ ہی عزیز تھی اس لئے اس کی دائمی جدائی ان کے لئے جیسی کربناک ہوگی۔ اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک مرحومہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور والدین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(نسیم انہونوی)

اسما کی موت سے متاثر ہو کر

از شاہدا بیگم صاحبہ

موت سے اسما کی آتا ہے نظر سناٹا
کاٹے کھاتا ہے مجھے شام و سحر سناٹا
تو ابھی اور اگر جیتی تو کیا جاتا تھا
اب تو گھر میں ہے مرے آٹھ پہر سناٹا
کیسے دیکھوں میں تجھے اور کہاں پاؤں تجھے
جس طرف آنکھ اٹھاتی ہوں اُدھر سناٹا
شمع کے بجھنے سے ہے چاروں طرف تاریکی
جس طرف ڈھونڈھنے جاتی ہوں اُدھر سناٹا
لوگ چپ چاپ لئے جاتے تھے ہاتھوں پہ تجھے
کس قیامت کا تھا ہنگام سفر سناٹا
آکے جس گود میں تم چہلیں کیا کرتی تھیں
اب اسی گود میں ہے آٹھ پہر سناٹا
مامتا کتنی بڑی چیز ہے دیکھو بیگم
گھر میں چاروں طرف آتا ہے نظر سناٹا

- وسیم جویریہ خانم بنگلور بہت افسوس کے ساتھ تحریر کر رہی ہوں کہ میری مشفق خالہ نور النسا بیگم [illegible] جناب [illegible] صاحب کا ۲۴ شعبان [illegible] بمقام [illegible] انتقال ہوگیا۔ خدائے تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ

دے اور تمام پس ماندگان و اعزہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مرحومہ ۲ رمضان کو بالکل تندرست حالت میں ہم سے جدا ہوگئیں۔ ۲ جولائی کو جہاز پر بمبئی سے سوار ہوئیں اور ۸ ارکو مکہ معظمہ پہنچیں۔ دوسرے روز میں مدینے مالک حقیقی سے جا ملیں۔

- فضل امام ملک صاحب (جیوارہ ۔ مونگیر) میری خالہ زاد بہن زرینہ کمال جنھوں نے زندگی کی صرف ستیرہ ہی بہاریں دیکھی تھیں، ۷ رمضان المبارک کو اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ مرحومہ پاکستان میں تھیں اور میں نے انھیں کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ اللہ پاک انھیں غریق رحمت کرے۔

- قمر جہاں خانم انور خان (قلابہ) نہایت رنج و افسوس سے لکھ رہی ہوں کہ میرے رشتے کی طرح چاہنے والے ماموں جان سید عبداللہ قادری ۹ اگست جمعرات کی شب میں ۳ بجے مختصر علالت کے بعد حبیب اسپتال بمبئی میں انتقال فرماگئے۔ مرحوم بڑے مخلص اور ملنسار تھے۔ اللہ پاک انھیں بخشے اور پس ماندگان کو صبر عطا فرمائے۔

- بشیر احمد قادری (نیروبی۔ کینیا) میرے پھوپی زاد بھائی عبداللہ عرف بابا میاں (اقبال بک ڈپو بمبئی) ۱۰ اگست ۱۹۷۹ء کو اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ اللہ پاک انھیں بخشے۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔

تصحیح ستمبر کے حریم میں ایک خبر بسلسلہ شادی بہن شائستہ پروین و ثریا پروین کی جانب سے شائع ہوئی تھی جس میں تاریخ ۱۰ رجولائی ۱۹۷۹ء بروز اتوار کے بجائے ۵ رجولائی ۱۹۷۹ء شائع ہوگئی صحیح تاریخ ۱۰ جولائی ۱۹۷۹ء ہے حریمی بہنیں تصحیح فرمالیں (ادارہ)

نسیم صاحب کی علالت کی اطلاع

جناب نسیم انہونوی صاحب کا مزاج ناساز ہے دفتر تشریف نہیں لا سکتے ہیں اس لئے اگر کسی بہن کو کوئی ضروری جواب [illegible] [illegible]

(ادارہ)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں وغیرہ کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ چھپ سکتا ہے۔ بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان پر ہو۔ سنجیدہ، معیاری اور موزوں ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری بھی لکھا گیا ہو۔ جو اشعار ۲۰ تاریخ تک دفتر میں وصول ہو جاتے ہیں وہی شائع کئے جاتے ہیں۔ نومبر کے لئے عنوان ہے "کعبہ" اور دسمبر کے لئے "پردہ"۔ (ادارہ)

وقتِ رخصت چار آنسو آہ فانی کیا کروں
ترے جیب سے میرا دامن آج تک سوکھا نہیں

مرسلہ:۔ مس فرزانہ انوری (باندا کستی پور)

عمر بھر کا ساتھ رنج و غم میں دے سکتا ہے کون
شمع بھی رخصت ہوئی میری مصیبت دیکھ کر

مرسلہ:۔ وی۔ آر۔ تبسم (دانم باڈی)

کس دل سے کریں دل کے جہاں سے اسے رخصت
اک عمر سے سینے میں جسے پال رہے ہیں

ایس ادیب شمسی۔ کلکتہ

آپ رخصت ہوئے، ضبط رخصت ہوا
دل تڑپنے لگا، آنکھ رونے لگی

مرسلہ:۔ شاذیہ بخاری (حیدرآباد)

کتنی مایوس ہیں یوں راہیں دل کی
بعدِ رخصت کوئی خاموش کھڑا ہو جیسے

مرسلہ:۔ منصور احمد نیازی (کلکتہ)

وقتِ رخصت آنسوؤں نے لاج رکھ لی عشق کی
چشمِ نم کو بے سر و ساماں سمجھ بیٹھے تھے ہم

مرسلہ:۔ زبید فضلی (رامپور)

ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا، ہوئی توحید سے خالی دنیا

مرسلہ:۔ دلشاد ریحانہ (چرکھاری)

وقتِ رخصت وہ چپ رہے لیکن
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

مرسلہ:۔ مسز نسیمہ عزیز (برہ پورہ۔ بھاگلپور)

وقتِ رخصت ترے محسوس یہ ہوتا ہے مجھے
تو نہیں دل مرے سینے سے جدا ہوتا ہے

مرسلہ:۔ نیلو فر گورے (بدلاپور)

دل سے رخصت ہر اک امید ہوئی
آج ہم غم زدوں کی عید ہوئی

مرسلہ:۔ نگہت مسعود فرید (کلیان)

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں، دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

مرسلہ:۔ ورسلا احمدی عظمت (آمبور)

کر کے رخصت تم کو تا حدِ نظر دیکھا کئے
جس طرف دیکھا نہ جاتا تھا اُدھر دیکھا کئے

مرسلہ:۔ عذرا فریدی (امروہہ)

رخصت کے واقعات کا اتنا تو ہوش ہے
دیکھا کئے ہم ان کو جہاں تک نظر گئی

مرسلہ:۔ زبیدہ بتول (آمبور)

ترے آنسوؤں نے ہمدم، تری چشمِ تر سے ڈھل کر
جو کیا تھا وقتِ رخصت، وہ سلام یاد آیا

مرسلہ:۔ صورتی صبیحہ عاشی (آمبور)
مرسلہ:۔ شاہدہ تبسم و صبیحہ تسنیم (کبی پور)

رخصت ہے اب رسول کے یوسف جمال کی
صدقے گئی، بلائیں تو لوں اپنے لال کی

مرسلہ:۔ شہناز مجاہد (دارہ)

رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے
وسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے

مرسلہ:۔ سرمدی خانم (میسور)

جنھیں ذوقِ نظر بخشا گیا تھا ہو چکے رخصت
ہم اب تارے فلک سے توڑ لائیں بھی تو کیا ہوگا

مرسلہ:۔ قمر لطیف نگار سلطانہ جلیلی (آمبور)

کس دل سے تری یاد کو دل سے کروں رخصت
یہ دل تو ہمیشہ تجھے پوجا ہی کیا ہے

مرسلہ: خالدہ نعیم شمسی (پیلی بھیت)

ہوئی سلطنت جن کی دنیا سے رخصت
نہ علم ان میں باقی رہا اور نہ حکمت

مرسلہ: آفتاب سفیر (جون پور)

سچے موتی

۱۔ سب سے اچھا توشہ خدا کا ڈر ہے۔
۲۔ تمام کاموں میں میانہ روی بہتر ہے۔
۳۔ طہارت ایمان کا ایک حصّہ ہے۔
۴۔ بات شروع کرنے سے پہلے سلام کرنا چاہئے۔
۵۔ قرآن سب سے بہتر دوا ہے۔
۶۔ علم دین کا حاصل کرنا فرض ہے۔
۷۔ امانت داری میں عزت ہے۔
۸۔ شرم و حیا بھی ایمان کی علامت ہے۔
۹۔ ہر بھلی بات صدقہ ہے۔
۱۰۔ مذہب میں ہر نئی بات گمراہی ہے۔
۱۱۔ پرہیزگاری میں ہی بزرگی ہے۔

مرسلہ: شاہدہ تبسم، صبیحہ تسنیم، کبھی اور، نیز فیلڈ ۱۹۹۲

عمل کرنے والے اقوال

چار چیزیں اچھی ہیں۔ لیکن چار چیزیں ان سے کہیں بہت اچھی ہیں۔

۱۔ مردوں کی حیا اچھی خصلت ہے لیکن عورتوں کی حیا اس سے زیادہ اچھی خصلت ہے۔
۲۔ ہر آدمی کی طرف سے عدل و انصاف کا ہونا اچھا ہے لیکن امیروں اور حاکموں کی طرف سے عدل و انصاف ہونا بہت اچھا ہے۔
۳۔ بڈھے آدمی کا توبہ کرنا اچھا ہے۔ لیکن جوانوں کی توبہ بہت زیادہ اچھی ہے۔
۴۔ مالداروں کی سخاوت اور بخشش اچھی چیز ہے۔ لیکن فقیروں اور محتاجوں کی بخشش بہت اچھی ہے۔

مرسلہ: قمر لطیف، نگار سلطانہ جلیلی۔ آنبور

حریمی دسترخوان

آلو ٹماٹر کے رول

سامان:۔ آلو ۵۰۰ گرام ٹماٹر ۲۵۰ گرام۔ ہری مرچ ایک [illegible]۔ ہری دھنیا کا پکوڑا ایک ٹیبل اسپون یعنی بڑا چمچہ۔ پیاز کٹا ہوا ۲ ٹیبل اسپون۔ انڈا ایک، گھی حسب ضرورت۔ نمک اندازے سے۔ سوکھی ڈبل روٹی کے کرم یعنی ڈبل روٹی کے خشک سلائس کو دردرا کر لیں۔ لیمو ۲ عدد۔

بنانے کی ترکیب

آلو اُبال لیں (آلو ایسے ہوں تو بہتر ہے) ابلنے کے بعد آلوؤں کو چھیل کر سلیں یا سل پر پیس کر باریک کر لیں۔ اس کے بعد ٹماٹروں کا گودا نکال کر ہری مرچ۔ ہرا دھنیا، نمک اور پیاز سب کو ملا کر آلوؤں میں اچھی طرح ملا لیں۔ نمک چکھ کر اندازہ کر لیں کہ کم تو نہیں ہے۔ پہلے نمک کم ہی ملانا چاہئے تاکہ مزید ملایا جا سکے۔

انڈے کو توڑ کر اس کی زردی اور سفیدی میں دو چمچے پانی ملا کر خوب پھینٹ کر رکھ لیں۔

آلو کے ۲ انچ لمبے اور ایک انچ یا اس سے کم پتلے رول بنا لیں پھر کڑھائی میں گھی یا ڈالڈا ڈال کر رول کو انڈے میں لت پت کر کے ڈبل روٹی کے چورے پر اس طرح رکھ کر گھمائیں کہ سب طرف چورا لگ جائے۔ اس کے بعد انھیں تل کر گلابی کر لیں۔ آنچ نہ بہت تیز ہو نہ کم۔

ٹماٹر ساس یا ہرے دھنیے کھٹائی اور ہری مرچ کی چٹنی کے ساتھ نوش فرمائیں۔

مرسلہ: شمیم فاطمہ۔ کانپور

قطار کے آخری شخص کی دست گیری کرنے والے ہاتھ

"میرا پختہ یقین ہے کہ ہندوستان اُسی وقت حقیقی آزادی حاصل کرسکتا ہے اور دنیا کے دوسرے حصّوں کو آزادی دلانے میں معاون و محرک ہوسکتا ہے جب ہم یہ فیصلہ کرلیں کہ ہمیں آج نہیں تو کل دیہاتوں میں ہی ——— محلوں میں نہیں ——— جھونپڑوں میں ہی رہنا ہوگا۔ کئی ارب افراد شہروں اور محلّوں میں آرام اور سکون سے کبھی نہیں رہ سکتے اور نہ وہ ایک دوسرے کا خون کرکے یعنی تشدد کے ذریعہ اور نہ جھوٹ کے ذریعہ اپنا وجود برقرار رکھ سکتے ہیں۔ مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ سچّائی اور عدم تشدد کے اصولوں کے بغیر نسل انسانی فنا ہوجائے گی۔ اس سچائی اور عدم تشدد کو ہم دیہاتوں میں ہی دیکھ سکتے ہیں۔"

——— مہاتما گاندھی

جیتو دیہ ——— مہاتما گاندھی کے خوابوں کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ریاست کا عزم مصمم۔

جاری کردہ ——— محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

وحشیانہ جذبات کی آسودگی کا سامان کیا جائے۔ توبہ توبہ کتنی گھناؤنی گندگی کا مکروہ نظریہ ہوتی آپ لوگوں کی۔"

ایزد نے اب بھی برا نہیں مانا۔ بلکہ کچھ خوشامد سے بولا ۔"لیکن میری فطرت ایسی نہیں ہے مہ وش۔ میں تو کچھ چاہتا ہوں آپ سے۔ آپ نے کبھی مجھے منہ کھولنے کا موقعہ ہی عطا نہیں کیا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" مہ وش نے پرتحقیر قہقہہ لگایا۔ "آپ منہ کھولتے تو مجھے اپنی پاک و بے لوث محبت کی رنگینیاں سناتے۔ اشعار پڑھتے۔ درد دل کے نوحے گاتے۔ یہی نا۔ یا پھر اپنا دل چیر کے دکھانے کی کوشش کرتے ایزد صاحب۔ میں اس جذبے ہی کو نہیں مانتی جسے آپ جیسے والے خود غرضوں نے محبت کا نام دے رکھا ہے۔ مجھے آپ مجھے اس شکل سے بھی نفرت ہو جاتی ہے جس میں اپنی طرف دیکھنا محسوس کر لیتی ہوں۔ اور اب جو لن ترانی آپ نے چھیڑ رکھی ہے یہ تو محض بے ہودہ بکواس ہے۔ جسے سننے کے لیے میرے پاس وقت ہے نہ دماغ۔۔!"

"معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کا کوئی تلخ تجربہ آپ کو ہو چکا ہے" مہ وش کی آنکھوں سے چنگاریاں سی برس گئیں۔ "اور اگر آپ یہاں سے چلے نہ گئے تو عورتوں کا تلخ ترین تجربہ آپ کو ابھی اور اسی وقت ہو جائے گا۔!"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اور تنہا سائے میں جاکے بے تحاشہ سگریٹ پھونکنے لگا۔! غریب مہ وش صاحبہ ابھی تک اپنے زعم باطل میں گرفتار ہیں۔!

(باقی آئندہ)

جاؤ ایزد۔ تم اوپر جاکے سو جاؤ" ناصیہ نے پھر کہا۔ "ابھی بڑے بے آرام سو رہے تھے۔"

ایزد کو کسی نے بڑی اونچی دلکش دنیا سے اس نیچی کثیف دنیا میں پھینک دیا۔ وہ اخبار ایک طرف رکھ کر اٹھتا ہوا بولا۔

"اوپر ہی جاکے سونا کیا ضروری ہے۔ میں سب سے الگ تھلگ سکون سے رہتا تھا۔ آپ نے وہ جگہ بھی مجھ سے چھین لی۔" یہ کہہ کر اس نے دزدیدہ نظر حنا پر ڈالی کہ اس پر کیا اثر ہوا ہے۔ لیکن حنا کا سر جھکا ہوا تھا۔ ناصیہ نے سر ہلا کر اور نچلا لب دانتوں میں دبا کر اسے تنبیہہ کی۔ لیکن وہ حقارت سے مسکرایا۔ اور ادھر حنا نے دالان میں قدم رکھا تھا کہ وہ دالان سے نکل کر دوسری طرف چلا گیا۔

صالحہ بیگم کو اس کی بات سے تکلیف پہونچی۔ کمزور آواز میں بولیں "جب تک یہ آدمی نہیں بنے گا۔ میں بھی اچھی نہیں ہوں گی۔ لاکھ تم لوگ دوائیں کیے جاؤ۔ میری جان ہی جلا دے گا۔ دیکھ لینا۔"

حنا نے سب کچھ سن لیا تھا۔! اور اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ یا میرے نصیب۔ کیا میں کنوئیں سے نکلی۔ کھائی میں گر پڑی۔!

"ماشاء اللہ سے۔ لڑکی چاند کا ٹکڑا ہے۔" ٹھیک کہ سب سے پہلے امیدن نے کہا۔

"میں کہوں" آپا ذاکرہ نے جھوم کر ٹکڑا لگایا۔ "چاند میں داغ ہے دلھن میں داغ نہیں۔ بیٹھو بی بی۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔! ہم سے نہ شرماؤ۔ نگوڑی پھونس بڑھیاں۔ اور یہ تو تمھاری ساس نہیں۔ ماں ہیں ماں۔" انھوں نے صالحہ بیگم کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ اللہ رکھے نند اور جٹھانی ہیں

زمین پر بسنے والی حور ہیں۔ یہ بھی کبھی تم سے رشتے کا جھگڑا کریں گی۔ اللہ جم جم رہنا نصیب کرے۔ اب یہ گھر تمہارا۔ سب لوگ تمہارے ہیں۔ کیوں بوا عیدن۔ میں نے غلط تو نہیں کہا۔؟"

"غلط؟" بوا عیدن نے آنکھیں نکالیں۔ "ارے ایک ایک لفظ سچ کہے ہو۔ بڑی آپا۔ کل ایک بات ہو کہیں کی نوا گھر ہے۔ نوا لوگاں ہیں دلھن کچھ تو جرو رسرم کرے گی۔ بعد کو سب اسی کا ہے۔ یکبارگی سے سب تئیں من بیٹھنا بھی کچھ اچھا نہیں لگے ہے۔"

حنا صالحہ بیگم کے پہلو میں بیٹھی تھی انھوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے پاس کھینچا اور سینے سے لگالیا۔ کچھ دیر بے ضبط ہو کر روتی رہیں پھر آہستہ آہستہ بولیں۔

"میری بچی۔ کسی بات کا غم نہ کرو۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ سب دن یکساں نہیں رہتے۔ بیٹی۔ تم اس گھر کے لیے اجنبی نہیں۔ ہمیشہ ہمارا تمہارا ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا لگا رہا ہے۔ مجھے تم اپنی ماں سمجھو کوئی تکلیف ہو مجھ سے کہو۔ میری زندگی تک تم متفکر نہ ہونا بعد کو اللہ مالک ہے۔"

حنا کا دل پگھلنے لگا۔ اس نے بہت دنوں بعد ماں کی ممتا پائی تھی صالحہ بیگم کے سینے سے ویسی ہی خوشبو آرہی تھی۔ جیسی اس کی ماں کے سینے سے آتی تھی۔!

"امی اس کی شرط نہیں ہے۔" ناصیہ نے بچوں کے انداز میں کہا: "آپ حنا کو ہم سے زیادہ چاہیں گی تو پھر ہم میں لڑائی ہو جائے گی۔"

صالحہ بیگم کا تاثر ختم ہو گیا۔ حنا سیدھی ہو بیٹھی۔

کیوں نہیں ملیں گی؟"

"کوئی وجہ۔ کوئی کام میرا آپ سے اٹکا ہوا نہیں ہے۔"

مہوش۔ خدارا ایسا نہ کہیے۔ آپ کو علم نہیں کہ میں آپ سے باتیں کرنے اور آپ سے مل بیٹھنے کا کتنا متمنی ہوں۔ کبھی آپ نے بہتر سلوک سے مجھے پہچاننے کی کوشش نہیں کی۔؟"

ایزد صاحب۔ تعجب ہے۔ آپ کی شادی ہو چکی ہے اور آپ پھر بھی تشنہ ہیں" وہ استہزائیہ انداز میں ہنس پڑی: "اگر میں یہ کہوں کہ آپ بھی روایتی مردوں میں سے ایک مرد ہیں تو آپ فوراً برا مان جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ مجھے خوامخواہ مردوں کی صورت و فطرت سے نفرت ہے۔"

"اگر آپ نے شروع ہی سے مجھے سمجھنے کی کوشش کی ہوتی تو آج میری پوزیشن یہ نہ ہوتی۔ جو ہے۔"

"مجھے کیا پڑی تھی آپ کو سمجھنے کی۔ آپ نہ کوئی خاص شخصیت تھے نہ کوئی ولی اللہ تھے۔ جیسے دنیا میں بہت سے مرد گھورے کچرے کی طرح پڑے ہیں اسی طرح ایک آپ بھی تھے۔"

"کیا؟" مہوش کی دلشکن صاف گوئی سے متحیر ہو کر ایزد نے کہا۔

"اور کیا" مہوش نے بے اعتنائی اور لاپرواہی سے جواب دیا۔ "ٹھیک مردوں کی فضول رغبت تو ہے ہی۔ جناب شادی ہو چکی ہے۔ بیوی موجود ہے۔ پھر بھی دوسروں پہ رال ٹپکاتے پھر رہے ہیں ہوس نفسانیت کو گہری محبت کا نام دے رہے ہیں مطلب یہ کہ بس کسی طرح من پسند چیز ہاتھ آجائے جسے توڑ پھوڑ کر اپنے

امی سے مجھے بھی شکایت ہے۔" نگار نے منہ پھلا کر کہا: "آپ آئیں آپ سے محبت کرنے لگیں مجھے گھر سے بھگا دیا۔ اب حنا آئی ہیں تو آپ سے محبت ختم کردی...!"

"تم سب میرے بدن کے حصے ہو" صالحہ بیگم نے کہا: "مجھے سب سے محبت ہے۔"

"بڑی اماں۔ باورچی کھویا مانگ رہے ہیں" زیتون نے آکر آپا ذاکرہ سے کہا۔

"میری بھول پر پتھر پڑیں" آپا ذاکرہ یہ کہتی ہوئی اٹھ گئیں۔ "میں خواب طاق پر بٹھا لینے کے قابل رہ گئی ہوں۔ اے تو تماشہ دیکھو۔ واہ میٹھے کے لیے کھویا دینا ہی بھول گئی۔ چل لڑکی آ میرے ساتھ۔"

"آیئے حنا باجی۔ آپ کو میں گھر کی سیر کرالاؤں" رعنا بولی۔

"پھر وہی حنا باجی" نگار نے کہا: "اب چھوٹی بھابی کہا کرو۔!"

"اچھا" رعنا ہنسنے لگی: "چلیئے چھوٹی بھابی"

اور حنا کا ہاتھ پکڑ کر چلی گئی۔

اور سب کے رہائشی کمرے، کچن، برآمدے سب کچھ حنا کو دکھاتی ہوئی وہ انیکسی میں گئی۔ ایزد آرام کرسی میں دراز سامنے کرسی پر پاؤں پھیلائے ہوئے تھکن اتار رہا تھا۔ آہٹ سن کر اس نے رخ موڑا۔ حنا اور رعنا گڑبڑا گئیں ایزد کے چہرے پر بھی ناگواری مسلط ہو گئی۔

"یہاں بھی چین نہیں" وہ ناخوشگوار آواز میں بڑبڑایا۔ اور پھر سر کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک کر کہنی آنکھوں پر ڈھک لی۔

ہوں میں آپ کا" وہ برہم ہو کر بولا: "ہمیشہ آپ نے میری دل شکنی کی ہے۔ کسی تعلیم یافتہ لڑکی کے لیے یہ اخلاق سخت معیوب ہے۔"

"آپ کی فضول باتیں مجھے ہمیشہ ناپسند رہی ہیں" مہ وش بولی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے صرف میرا ہی پیچھا لینے رکھنے کی کون سی قسم کھائی ہے۔ جہاں جاتی ہوں آپ وہیں چلے آتے ہیں کیا یہ آپ کو پسند ہے کہ ہم لوگ اوروں کی انگشت نمائی کا نشانہ بنیں؟!"

"کیا آپ سے باتیں کرنا بھی انگشت نمائی کا سبب بن جائے گا خدارا آپ بیٹھ تو جائیے۔ اچھا لیجئے میں ادھر بیٹھا جاتا ہوں۔ آپ سے بڑی دور۔ اب تو آئیے۔ بیٹھئے" وہ اٹھ کر ریڈیو کی خالی چھوٹی میز پر ٹک گیا۔ اور بڑے استکراہ کے ساتھ مہ وش بھی پچھلی جگہ آ بیٹھی۔

"سنیئے مسٹر ایزد" اس نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر بات کاٹ دی۔

"مہ وش میں آپ کے منہ سے اپنائیت کی میٹھی میٹھی باتیں سننا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ لب ولہجہ یہ احترام و تعظیم بالکل پسند نہیں مسٹر ایزد۔ ایزد صاحب اس تخاطب سے بیگانگی کی بو آتی ہے آپ مجھے صرف ایزد کہیئے۔"

"میرے کچھ کہنے کی کبھی نوبت ہی نہیں آئے گی!"

"کیوں؟"

"میں آپ سے ملوں گی کیوں؟"

چلو رعنا۔ چلیں"۔ حنا نے اس کا ہاتھ دبا کر بے حد چپکے سے کہا۔
دونوں ادھر سے واپس آگئیں۔ اب حنا کا دل بجھا ہوا تھا۔ وہ پھر آکر
صالحہ بیگم کے پاس بیٹھ گئی۔

موقعہ تلاش کر کے ناصیہ باہر پہونچیں۔ ایزد کے لیے چائے اور نمکین
کاجو لیتی گئی تھیں

اب مجھے کہیں آرام سے مرنے دیجئے بھابی: وہ خفا ہو کر بولا۔
ناصیہ ہنسنے لگیں۔

"آرام انسان کو مرنے کے بعد بھی نہیں ملتا دیور جی۔ تم کس دھن
میں ہو۔ خیر سنو۔ میں ایک بے حد خاص بات کہنے آئی ہوں!"
کہہ دیجئے۔ مجھے نیند آرہی ہے: ایزد بولا اور کاجو کھانے لگا۔
تم آخر اپنے کمرے میں کیوں نہیں جاتے؟" ناصیہ بگڑ کر بولیں۔
اب وہ میرا نہیں رہا۔!

"سنو ایزد۔ جو کچھ ہو چکا ہے: وہ ہو چکا۔ ناصیہ نے ناصحانہ پیرایہ میں کہا
"اب اس کا نبھانا تمہارا فرض ہے۔ امی محض تمہاری اور ابا جان کی
چپقلش کا اثر لے کے اس نوبت پر پہونچی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے
تھے کہ کسی دماغی صدمہ نے ان کا بلڈ پریشر بہت بڑھا دیا ہے۔
یہ صورت حال خطرناک ہے۔ تمہارے بھائی جان نے یہ بات ابا جان
سے نہیں کہی ہے۔ لیکن ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ امی کو اگر یہ معلوم
ہو گیا کہ تم شادی کے بعد حنا سے بولتے تک نہیں۔ اس سے ناراض ہو
اس سے بھاگے بھاگے پھرتے ہو تو ان کا صدمہ بدرجہا بڑھ جائے گا۔
ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ خدانخواستہ اچانک حرکت قلب

حواس گم قیاس گم
نظر کے آس پاس گم

اب بھی مہ وش کا حسن جوں کا توں تھا۔ بلکہ کسی غم پنہاں نے
اس کے حسن کو جلا بخش دی تھی۔ چہرہ اتنا گلابی تھا جیسے اس
نے غازۂ سرخ مل رکھا ہو۔ شاخ گل کا سا لچکتا جسم۔ پنکھڑیاں جیسے
لب! سیاہ گہری آنکھیں جو مہ وش کا سرمایۂ خوبی تھیں۔ وہ آنکھیں
ہی تو تھیں۔ جنھوں نے ایزد کو پاگل کر دیا تھا۔!

جب باہر شب نغمہ آراستہ ہوئی۔ اور سب لوگ اٹھ کے
چلے گئے۔ تب ایزد اس کے پاس آیا۔

آپ نے مجھے پہچانا؟: ایزد نے سرگوشی کی!۔
مرجھائی ہوئی مسکراہٹ مہ وش کے لبوں کو چومنے لگی: کیوں
ایزد صاحب۔ آپ کچھ بدل گئے ہیں کیا؟:
زہے نصیب۔ آپ نے مجھے فراموش نہیں کیا: ایزد خوش ہو گیا۔
میں نے آپ کو یاد بھی نہیں رکھا: معاً اس پر پرانی خشونت
چھا گئی۔ لیکن ایزد نے اس کی پرواہ نہ کی۔ وہ تو تھی ہی اکل کھری سا
اجازت ہو تو میں بھی بیٹھ جاؤں: اس نے کہا۔
گھر آپ کا ہے جناب۔ جہاں جی چاہے تشریف رکھیئے: وہ
تلخی سے بولی۔ لیکن جب ایزد اس کے پہلو میں بیٹھ گیا تب وہ
اس طرح بھڑک کر اٹھ کھڑی ہوئی جیسے ایزد نے اسے سوئی چبھو
دی ہو۔

میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ مجھ سے بھاگتی کیوں ہیں؟ کیا بگاڑا

نہیں آتی تھی۔ اگر وہ ہنسنا چاہتا تو غیب سے اس کے گریہ کے سامان پیدا ہو جاتے تھے۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ سب کچھ بھول بھال کر۔ حتیٰ کہ یہ بھی فراموش کر کے از سرِ نو زندگی گذارے گا۔ کہ حنا اس کے پاس اچھوتی نہیں آئی تھی۔ اپنی ماں کی خاطر اس نے ہر قسم کا زہر پینا گوارہ کر لیا تھا۔!!

لیکن اسے یہ عہد بھی راس نہ آیا۔ اور پھر اس کی زندگی طوفانوں سے آشنا ہو گئی۔ ولیمہ کی دعوت کے بعد دو چیزوں نے اس کا ذہنی سکون پھر سے درہم برہم کر دیا۔!

مہمانوں میں اس نے عرصہ دراز کے بعد پھر مہ وش کو دیکھ لیا وہ اشرف اور ثریا کے ساتھ آئی تھی۔ ناصیہ نے اسے شبِ نغمہ میں شرکت کرنے کی غرض سے ٹھہرا لیا تھا۔! وہ سب سے الگ تھلگ بھابی کے پاس بیٹھی اکتائی ہوئی نظروں سے آس پاس دیکھ رہی تھی۔ زرد رنگ کے سادہ لباس میں لپٹی وہ بے حد پژمردہ تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

ایزد کی نظریں ایک بار اس کی نظروں سے ملیں۔ اور ایزد کو ایسا لگا۔ جیسے وہ شوخی، چمک، تیزی جوان آنکھوں کا حسن تھی اب کہیں نہیں تھی اب تو ایسا لگ رہا تھا جیسے گورِ غریباں پر دو چراغ ٹمٹما رہے ہوں۔ حسرت، یاس، حرماں کیا کچھ نہ تھا ان آنکھوں میں۔ مہ وش نے جلدی سے رخ پھیر لیا لیکن ایزد کے ہوش و حواس پر بجلی سی گری۔

اس کا یہ حال تھا کہ گویا سے

رک جائے گی :

خدا کی پناہ :ایزد کے ہاتھ میں چائے کی پیالی کانپ گئی: یہ آپ نے مجھے کن عذابوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ آپ نے شادی کر دی میں نے کر لی۔ اب بات کی باتوں میں بھی مجھے مجبور کیا جا رہا ہے :

ناصیہ بے ساختہ ہنس پڑیں: بے شرم ہو تم :

بھابی۔ میں جس کرب میں مبتلا ہوں۔ آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتیں :ایزد نے آہ بھر کر کہا: اگر میں اپنے خیالات کی ترجمانی کرنے لگوں گا تو آپ مجھے بے شرمی سے بڑھ کر کسی چیز کا فتویٰ دے دیں گی۔ لیکن یہ میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں محترمہ حنا کی شکل تک سے بیزار ہوں۔ ان سے بات چیت مجھے پسند نہیں۔ ان کا قرب مجھے پسند نہیں۔! لہٰذا آپ لوگ مجھے مجبور مت کیجئے :

تم اتنے پتھر ہو :ناصیہ نے حیرت سے کہا: امی کی سنجیدہ اور پریشان کن علامت کی تفصیل میں سن چکی ہوں۔ اب ان کی زندگی چاہے جتنی بھی ہو۔ وہ سب تمہارے اچھے سلوک پر منحصر ہے۔ یقیناً تم نہ چاہو گے کہ امی تمہاری وجہ سے خدانخواستہ۔

ہائے ہائے۔ بھابی۔ تو پھر کیا کرنا چاہئے مجھے؟ :اس نے درد و کرب سے کراہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے سر جکڑ لیا۔

وہی کرنا چاہیئے جو تم نہیں کر رہے ہو۔ ہنسی مذاق۔ دل لگی۔ ہنسنا بولنا۔ خوش مزاجی۔ اب بھی سمجھے کہ بالکل ہی دماغ پھر رہے ہے: ناصیہ نے جھلا کر کہا۔ پھر خوشامد سے بولیں: بس بھیا۔ میں تم سے امی کی زندگی کی بھیک مانگتی ہوں۔ ان کا دم ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔ تم ان

کے بیٹھے ہو۔ اس کا خیال زیادہ سے زیادہ تمھیں کو کرنا چاہیئے۔ امی
کو تم سے بہت محبت ہے۔ ایزد۔ تمھیں خدا کا واسطہ ان کا دل نہ
دکھانا۔ آخر تم حنا سے اتنے خفا کیوں ہو۔؟"

"ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

"معقول ہو مگر۔"

"بالکل معقول ہے۔" ایزد نے سر جھکا کر فرش کو تکتے ہوئے کہا۔ "فرض
کیجئے کہ بھائی جان سے آپ کو جدا کر کے کسی دوسرے شخص سے آپ کی
شادی کر دی جائے تو سچ سچ بتائیے کہ بھائی جان کی محبت ان کی یاد
ان کا خیال آپ کے دل سے کیا بالکل نکل جائے گی؟"

"تم مرد ہو ایزد۔ اور تمھارے بھی وہی خیالات ہیں جو اس
سلسلے میں تمام مردوں کے ہوتے ہیں۔ تم لوگ اپنے سلسلے میں ہر
قسم کے جواز تلاش کر لیتے ہو۔ اور عورت کے لیے یہ چاہتے ہو کہ وہ
بالکل تمھاری مطیع فرمانبردار اور تابع ہو۔ تمھارا بس چلتا تو تم عورت
کے قلبی احساسات و جذبات پر بھی اپنی مرضی کے پہرے بٹھا
دیتے اور اسے حکم دیتے کہ وہ جو کچھ سوچے سمجھے تمھاری اجازت اور
پسند سے سوچے سمجھے۔ یہ تو ظلم ہے۔ مرد بیوی کی موجودگی میں
بازاری عورتوں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ سوکن کا بوجھ بیوی کی
چھاتی پر لا دھرتے ہیں۔ بیوی سے سوکن کی خدمت لیتے ہیں۔ بہرحال
مرد اپنی حکومت میں مطلق العنان ہوتے ہیں۔ ان پر کسی کا زور نہیں چلتا
وہ اپنے کردار و گفتار و اعمال و افعال میں آزاد ہوتے ہیں۔ اور
ظلم و ستم خود غرضی و سنگدلی کی حد ہوتی ہے کہ وہ بیوی کے متعلق

حنا ہنس پڑی اس کا سر کچھ اور جھک گیا۔ "آپ باتیں کیجئے میں
سنتی ہوں۔"

ابر رت سا برس گیا ایزد کے کانوں میں۔ کیسی مدھر آواز تھی۔
جیسے ننھے ننھے نقرئی موتی کانچ کی تھالی میں ٹوٹ گرے تھے
اس نے چپکے سے اپنے ہاتھ چھڑا لیئے۔

"میری طرف دیکھیے۔" ایزد نے کہا اور اس کی ٹھوڑی ایک انگلی
سے اپنی طرف پھیر لی۔

"سبحان اللہ۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔ پھر وہ چونک
پڑا۔ "میں بھی عجیب بھلکڑ ہوں۔ آپ کی خدمت میں نذرانہ دونما
تو میں نے پیش ہی نہیں کیا۔ ٹھہریئے۔ ابھی لایا۔" اور بجلی کی سی
اچپلاہٹ سے اٹھ کر اس نے الماری سے دو کیس نکالے جو ناصیہ
نے اسے یہ کہہ کر تھما دیئے تھے کہ دلہن کا منہ دیکھ کر اسے دے
دینا۔ اور پھر ایزد نے دونوں کیس کھول کر حنا کی گود میں رکھ دیئے
اس نے بھی پہلی بار دیکھا کہ ان میں کلائی کی گھڑی اور انگشتری
تھی۔ بھابی کے بلند انتخاب پر اس نے دل ہی دل میں سراہا۔
حنا نے لرزتے ہاتھوں سے کیس اٹھا کے اپنے سینے سے لگا لیے
ایزد نے بے قابو ہو کر حنا کو اپنی طرف سمیٹ لیا۔

تقدیر نے ہمیشہ اس کا راستہ کاٹا تھا۔ کوئی خوشی اسے راس

کے لب خشک ہونے لگے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا کہنا چاہیے پھر اس نے اپنی بھرائی ہوئی آواز کو سنبھال کر کہا: "میں شاید سو گیا تھا۔ مجھے آپ کے آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔"

وہ چپ رہی۔ ایزد ہولے سے ہنسا: "دراصل میں اتنا تھک گیا تھا کہ... مجھے محسوس ہی نہیں ہوا۔ لیکن آپ کے ہاتھ اتنے ٹھنڈے کیوں ہیں۔ جون کے مہینے میں انگلیاں برف کی قاشیں ہیں آپ کے ہاتھ گرم کر دوں؟" اس نے بڑے جذباتی انداز میں اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لیے۔

"آپ کچھ بولیں گی نہیں مجھ سے۔؟" ایزد نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا: "ٹھیک کہتی تھیں۔ بھابی اور باجی۔ آپ بہت حسین ہیں۔ سنگ مرمر کا پیکر۔" پھر اس نے سفید کھاک جھوٹ بک دیا: "ان سے آپ کی تعریفیں سن سن کر میں آپ کی دید کا مشتاق ہو گیا تھا۔ آپ کچھ نہیں سوچتی تھیں میرے متعلق۔ سچ سچ بتائیے گا۔"

ایزد کو سختی سے احساس ہوا اس کی باتیں بچکانی اور سطحی ہیں اس کے دل سے آہ نکلی۔ ہائے میری مجبوریاں۔ امی کی زندگی کی خاطر میں اسی طرح قسطوں میں پھانسی پر چڑھتا رہوں گا۔ ان تک یہ خبر تو ضرور پہونچے گی کہ میں حنا سے بہت عمدہ پر محبت سلوک کر رہا ہوں۔!

"آپ چپ ہیں۔" اب کی وہ کچھ کھسیا کر بولا: "سنیے محترمہ۔ مجھے زبان کھلوانے کی بھی ترکیبیں معلوم ہیں... ابھی آپ کے گدگدیاں شروع کر دوں گا۔ سمجھیں آپ۔؟"

یہ تک گوارہ نہیں کرتے کہ وہ بے چاری اپنے ماضی کے ساتھ کو دل ہی دل میں یاد کر سکے۔ جبکہ تم خود غرض مطلبی مردوں کو اس بات کا کبھی قطعی پتہ نہیں ہوتا کہ عورت واقعی پچھلی محبت کو یاد رکھتی ہے کہ دراصل اسے موجودہ شوہر ہی سے محبت ہے۔ بس تم لوگ ہوا میں تیر چلاتے ہو۔ مفروضے گڑھتے ہو۔ عورت کی طرف سے سوچتے اور اس بیچاری پر خواہ مخواہ ظلم توڑتے ہو۔"

"اُف فوہ۔ بھابی آپ نے تو پورا لیکچر ہی دے ڈالا۔" وہ کچھ کھسیانا ہو گیا۔ ناصیہ کو اب سچ مچ غصہ آ گیا تھا انھوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تمھاری ماں کی زندگی کی خاطر میں تمھارے پاؤں پڑنے آ گئی تھی ورنہ مجھے کیا۔ جو تمھارا جی چاہے وہ کرو۔ مجھ سے کیا مطلب۔" اور یہ کہہ کر وہ بے حد طیش میں اٹھ کر چلی گئیں۔ ایزد دم بخود رہ گیا تھا! پھر رفتہ رفتہ اس پر ناصیہ کی تقریر کی معقولیت واضح ہوتی گئی۔ اس نے سوچا وہ کیوں بے کار یہ سوچ سوچ کر اپنا خون جلا رہا ہے کہ حنا کے دل میں پہلے شوہر کی یا د محبت موجود ہو گی۔ اگر ہو بھی تو اسے کیا اب وہی اس کا شوہر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی محبت حنا کے دل میں جنم لے چکی ہو۔ خواہ مخواہ کی پیش بینیاں کر کے خود کو اور سب کو دکھی کرنے سے کیا فائدہ۔ جبکہ اس کی ماں کی زندگی ایک خطرناک لمحہ پر ٹکی ہوئی ہے!!۔

پھر وہ اٹھا اور چپکے سے اپنے کمرے کے زینے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرہ اب بھی مہک رہا تھا عجیب سی مہک تھی جس نے اس کے جسم میں آگ سی بھر دی! اس نے وسط میں کھڑے ہو کر چاروں

طرف نظریں دوڑائیں۔ اس کی تبدیلی ہیجان انگیز و جذبات خیز تھی۔!
آگے بڑھ کر اس نے مسہری سے تکیہ اٹھالیا۔ جس نے حسین سی عروسی مہک
اٹھ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔! اور وہ تکیہ گود میں
رکھ کر مسہری پر بیٹھ گیا۔

ٹھیک ہے صاحب۔ ہماری بھی شادی ہوگئی ہے۔ کیا عجیب سا لگتا
ہے کسی سے وابستگی کا احساس۔ روان انگیز۔ خوشگوار!۔ مجھے پوز کرنا
پڑے گا کہ میں والہانہ انداز میں اسے چاہتا ہوں۔! آخر میں ہار گیا۔
شکست میرے نصیب میں آئی۔!!

سوچتے سوچتے اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ دونوں
تکیے تلے اوپر رکھ کر وہ اپنی دلہن کی مسہری پر لیٹ گیا اور گھڑی بھر میں
بے خبر سو گیا۔

دوپہر کا کھانا ناصیہ نے اپنے کمرے میں لگایا تھا۔ حنا کو بھی اپنے ساتھ
شریک کرلیا۔ پھر چائے کے بعد نگار نے اس سے کہا: تم بھی کچھ دیر آرام
کرلو۔ وقت بھی کتنا رہ گیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ظہر کی نماز کے بعد ہی سے
مہمان آنے لگیں گے۔! میں کچھ دیر بعد آکے تمہیں کپڑے پہنا دوں گی۔ رات
گئے تک پھول و دل پہنانے کا ہنگامہ رہے گا۔ تھک جاؤں گی۔ میں
چھوڑ آؤں زیبوں کو؟!:

میں چلی جاؤں گی۔ نگار باجی: حنا شرما شرا بولی۔!
اور اپنے کمرے کی دہلیز پر پہونچ کر وہ ٹھٹھک گئی۔ اسے گمان بھی
نہ تھا کہ ایزد اسے سوتا ہوا ملے گا؟ یکبارگی پھر اس کے دل کی دھڑکن
بے قابو ہونے لگی۔ دبے پاؤں وہ ایزد کی [illegible] اور پھول دار پردہ برابر کر

دیا۔ چلاتی ہوئی اس کی نظریں ایزد کے پیر دل پر پڑیں۔ وہ [illegible]
نیو زے پہنے پہنے سو رہا تھا!۔ حنا دھیرے سے اس کے پاس [illegible]
گئی۔ فرط خوف و تاثر سے اس کی نظریں دھندلا گئی تھیں۔ [illegible]
حواس گم تھے! اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے کیا کرنا چاہیے
کچھ دیر گو مگو کے عالم میں رہنے کے بعد اس نے اپنے کانپتے ہوئے
ہاتھ اس کے پاؤں پر رکھ دیئے۔! بڑی مشکل سے جان سولی پر [illegible]
ایک جوتہ موزہ کسی نہ کسی طرح اتار لیا۔ دوسرا جوتہ اتارنے کے بعد [illegible]
ایڑی پر سے سرکا رہی تھی کہ دفعتاً ایزد نے کروٹ لی اور اپنے پیر
پر سرسراہٹ محسوس کیا۔ یکبارگی اٹھ کے بیٹھ گیا۔
حنا کے ہاتھ ہٹ گئے۔ سر جھکا گیا اور وہ گوشے میں سمٹ
گئی۔

ایزد کا دل شدت سے دھڑکنے لگا!۔ اس کی نگاہیں اپنی دلہن
پر پڑیں۔ اور وہیں جم گئیں۔ ایک پژمردہ گلاب تھا جس نے
نازک نازک سا نسائی چہرہ اختیار کرلیا تھا۔ سفید گلابی رنگت
تیلی سی ناک۔ جس پر پسینے کے ننھے ننھے موتی جگمگا رہے تھے۔ [illegible]
رخسار جن میں بڑے پیارے خم پڑے ہوئے تھے۔ سیاہ دراز
پلکیں ان رخساروں پر جھکی ہوئی تھیں۔ مرطوب گلابی ہونٹ۔ سانس
کا زیر و بم ہوشربا۔۔۔۔

حنا۔۔! اس کے لبوں نے گنگنانے کی آواز خود اس نے بھی نہیں [illegible]
اور وہ جذبہ بالکل غیر شعوری تھا۔ خالی الذہنی [illegible]
جب اس نے جھک کر حنا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ [illegible]

THE HAREEM

Nov. 79

Rs. 1/-

ایڈیٹر
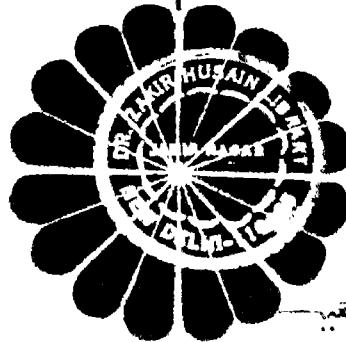
رجسٹریشن نمبر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۲۵۵۹

رجسٹریشن نمبر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۵۲۳۲

گذشتہ ۵۷ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے ۔ اور ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے

جلد (۵۷)

نمبر ۱۱

ماہنامہ

لکھنؤ

ایڈیٹر و نگراں
نسیم انہونوی
معاونین
شوکت جہاں بیگم غزالہ
جانی بیگم ردولوی

بیادگار
سید محمد سلیم انہونوی مرحوم

شفیق النساء
بیگم سلیم انہونوی مرحوم

فہرست مضامین

ماہ نومبر ۱۹۷۹ء

قیمت سالانہ ۔ اعزازی منی آرڈر سے اکیس روپیہ ۔ مخصوص خریداری منی آرڈر سے
انیس روپیہ ۔ معمولی خریداری ۔ منی آرڈر سے ۔ سولہ روپیہ ۔ دی ۔ پی سے پرچہ منگانے پر تین روپیہ زائد ۔ فی پرچہ ۔ ایک روپیہ
غیر ممالک سے بقدر ۳۲ روپیہ یا دو پونڈ برائے سی میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں ۔
آفس اور ترسیل زر کا پتہ :۔ نسیم بک ڈپو ۔ لاٹوش روڈ ۔ لکھنؤ
نسیم انہونوی ۔ مالک و ناشر ۔ پرنٹر سرفراز قومی پریس ۔ لکھنؤ

نسیم صاحب کی علالت کے باعث لمعات کے کالموں میں سید فضل الرحمٰن جعفری صاحب کا ایک مضمون دیا جا رہا ہے جو واضح کرتا ہے کہ اسلام نے عورت کو کس طرح نوازہ اور کیسے کیسے حقوق اسے عطا کیے ـــــــ ادارہ

اسلام نے مرد و عورت کے لئے تعلیم و تربیت کے یکساں مواقع فراہم کیے ہیں۔ البتہ نوعیت میں فرق رکھا ہے۔ اور یہ اس لیئے کہ اسلام نے ان دونوں کو اپنی فطری ساخت اور رجحانات اور صلاحیت کے مطابق معاشرتی اور عائلی کام تفویض کیئے ہیں تعلیم و تربیت سے مقصد انسان کی ذاتی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے جن سے وہ دنیا و آخرت کی زندگی کو بہتر بنانے کے اہل ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ ایک عورت کے لئے صحیح تعلیم و تربیت ہی ہے جس سے وہ ایک اچھی ماں بن سکے اور سلیقہ مند خاتون خانہ بن سکے۔ ان تمام خصوصیات کو اجاگر کرنے کے لیئے اسلام نے اس کا دائرہ کار محدود کر دیا ہے۔ اس کی بہترین صلاحیت کار کا مستقر اس کا گھر ہے۔ جہاں وہ بیوی اور ماں کا کردار ادا کرتی ہے۔ اگر وہ دوسرے علوم و فنون کے حصول کی استعداد بھی رکھتی ہے تو اسلام اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ بشرطیکہ وہ شریعت کے ان مسلمہ اصولوں سے تجاوز نہ کرے جو عورتوں کے لیئے مقرر کیئے گئے ہیں۔ تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں حضرت محمدؐ جس طرح مردوں کو اخلاق و دین کی تعلیم دیتے تھے۔ اسی طرح عورتوں کو بھی مواقع حاصل تھے۔ آپؐ نے ان کے لئے خاص اوقات مقرر فرمائے تھے۔ حضرت عائشہؓ نہ صرف مردوں کو بلکہ عورتوں کو بھی تعلیم دیتی تھیں۔ اور ان عورتوں میں لونڈیاں بھی شامل ہوتی تھیں۔ حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ

"جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہے اور وہ اس کو اچھی تعلیم دے اور اس سے شادی کرے تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے"

انسانی تمدن کی پوری تاریخ کھنگال ڈالو کہیں بھی عورت کے ساتھ انسانی سلوک کا کوئی شائبہ تک نہ ملے گا۔ یہ احسان صرف اسلام نے کیا ہے کہ اس کا مقام معاشرے میں بلند کیا اور اس کو مرد کے مقابلے میں مساوی حقوق عطا کیئے ہیں۔ تاریخ عالم میں ایسے بھیانک اوراق بھی ہیں جن میں عورت کے وجود کو ذلت کا سبب ٹھہرایا گیا تھا۔ اُسے گناہ کا سرچشمہ قرار دیا گیا تھا اور اسے ایک نجس اور قابل نفرت وجود سمجھا گیا تھا۔ بیٹی کی پیدائش باپ کے لئے موجب عار تھی۔ اس جاہلانہ تخیل اور سفاکانہ رجحان نے یہاں تک انسان کو آمادہ کر دیا تھا کہ وہ لڑکیوں کو قتل کرنے لگے تھے۔ کوئی مذہب ایسا نہ تھا جہاں عورت کو ذلت دینا اور اس کو ذلیل کرنے اور ایذا پہنچانے کو مذہبی فریضہ قرار دیا گیا ہو۔ ہندو مذہب ہو یا بودھ مت، یا مسیحیت یا یہودیت ہر مذہب میں عورت ذلیل اور قابل لعنت مخلوق سمجھی جاتی تھی۔ صدیوں سے عورت کے ساتھ یہ سلوک جاری تھا اس لئے عورت کے ذہن میں [illegible] کوئی عزت کا مقام نہ رہ گیا تھا۔ وہ خودداری اور عزت نفس کے مفہوم سے نا آشنا تھی۔ وہ اس سے مطلق بے خبر تھی کہ وہ دنیا میں فطرت کی طرف سے کوئی حق بھی لے کر آئی ہے۔ وہ مظلومیت کی تصویر بنی رہتی تھی۔

مرد کا تصور یہ تھا کہ وہ عورت پر ظلم کرنے کا فطری حق رکھتا ہے اور عورت مرد کی طرف ڈھائے گئے تمام ظلم و ستم کو برداشت کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ یہ پستی اور یہ بلندی جو مرد و عورت کی زندگی میں پائی جاتی تھی۔ اس کو محسوس کرنے والا اور حق انصاف کا حرف زبان پر لانے والا کوئی انسان اس تمام جاہلی عہد میں موجود نہ تھا۔ اور عورت بدستور ظلم و ستم کی بھٹی میں جلتی رہتی تھی۔ یونان اور روم کی پرشکوہ تہذیب میں ایران و چین کے عظیم الشان تمدن میں عورت کے ساتھ انسانی

سلوک کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

اس بھیانک اور انسانیت سوز ماحول میں جس مذہب نے اخلاقی اور تمدنی اور عائلی انقلاب برپا کیا وہ اسلام ہے۔ اسلام قانون لایا تو قوت عمل بھی ساتھ لایا۔ اسلام نے ذہنی تبدیلی کا پروگرام بنایا تو اسے عملی جامہ بھی پہنایا۔ آج عورت میں جتنی بھی بیداری ہے اور جس قدر بھی وہ اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرتی نظر آتی ہے وہ اسلام ہی کا بخشا ہوا شعور ہے اسے اسلام ہی کا احسان مند ہونا چاہیئے۔ یہ اسلام ہی کا اعجاز کہ اس نے حقوق کے سلسلہ میں یہ فرمان خداوندی پیش کیا کہ

"اللہ نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا۔" (النساء)

"مرد جیسا عمل کریں گے ان کا وہ پھل پائیں گے اور عورتیں جیسے عمل کریں گی ان کا وہ پھل پائیں گی۔" (النساء)

"اور جو کوئی بھی نیک عمل کرے گا۔ خواہ مرد ہو یا عورت مگر ہو ایماندار تو ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر رتی برابر ظلم نہ ہوگا۔"

"عورت پر جیسے فرائض ہیں ویسے ہی اس کے حقوق بھی ہیں۔" (البقرہ)

پھر یہ اسلام ہی ہے جس نے صدیوں کا جاہلی نظام یکسر بدل کر دنیا کا نقشہ کچھ سے کچھ کر دیا۔ اب وہی بیٹی جو باپ کے لئے موجب عار اور خاندان کی ذلت کا سبب تھی جس کے وجود کو نحس اور ناپاک قرار دیا جاتا تھا اسلامی معاشرے میں بڑے بلند مرتبہ کی مالک بن گئی۔ مصلح اعظم ہادی اکبر کا ارشاد ہے۔

"جس کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوں۔ اور وہ اچھی طرح ان کی پرورش کرے تو یہی لڑکیاں اس کے لئے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔" (مسلم)

یہ حضور اکرمؐ ہی کا ارشاد ہے کہ

"دنیا کی نعمتوں میں بہترین نعمت نیک بیوی ہے۔"

یہ حضور اکرمؐ کا فرمان ہے کہ

"اللہ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور حق تلفی حرام کر دی ہے۔"

یہ اسلام ہی کی بڑی خوبی ہے کہ اس نے "عورت" کی نفسیات کو سمجھا اور سمجھایا۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے [illegible] لوگوں کو سمجھایا کہ اللہ تعالےٰ نے عورت [illegible] کے احساسات بہت لطیف اور [illegible] معاملات میں وہ جذباتی بن جاتی ہے اور اس کی یہ

فطرت اس کے لئے عیب نہیں بلکہ ہنر ہے۔ ایسا ہنر اور ایسا حسن جس سے بہت سے فائدے اٹھائے جا سکتے ہیں۔ اسلام نے اس کی تلقین کی ہے کہ اگر عورت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا مقصود ہے تو اسے اس کی اپنی فطرت پر قائم رہنے دیا جائے اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہزاروں برس کا وہ جاہلی ذہن جس نے "عورت" کو ذلیل سمجھا تھا اور اسے معاشرے میں "ایک جانور" قرار دیا تھا اسی ذہن کو ہادی اکبر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال قیادت اور رہبرانہ رحمت و عدالت نے یکسر بدل دیا۔ اور اب مرد اور عورت دونوں کو سچا شعور عطا کیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے مقام اور اہمیت سے واقف ہو گئے۔

ذہنی اور باطنی انقلاب لانے کے بعد آپؐ نے عورتوں کے حقوق کا تعین کیا اور انھیں قانون کے ذریعہ تحفظ بھی دیا۔ جس کے نتیجے میں عورتوں پر مردوں کے ظلم و ستم کا یکسر قلع قمع ہو گیا۔ اور عورتوں کی فکری و ذہنی سطح اتنی بلند ہو گئی کہ وہ اپنے مقام کو پہچاننے لگیں انھیں اپنے جائز حقوق کو سمجھنے کا شعور حاصل ہوا۔ یہی حقوق تھے جن کی بناء پر عورت پر سختی کرنے اور اسے زد و کوب کرنے کی سخت ممانعت کر دی گئی۔

اب عورتوں کو معاشرے میں ایک بلند مقام مل گیا ایسا مقام جس کی کوئی نظیر دنیا کے کسی معاشرے میں موجود نہیں ہے۔ اب مسلمان عورت کو مردوں کے دوش بدوش عقلی اور روحانی لحاظ سے ترقی و کامرانی کے اعلیٰ مدارج حاصل کرنے کے مواقع مل گئے تھے۔ اب ان کی راہ میں کوئی چیز حائل نہ تھی اور وہ صرف صنف نازک ہونے کی وجہ سے ترقی سے محروم نہ تھیں لیکن اس باب میں اسلام نے سارے تمدن و معاشرت کے تمام گوشوں میں جو عزت و کامرانی عطا کی ہے وہ سب اس کے فطری مقام پر رکھ کر کی ہے۔ اس کے نسوانی وقار کو تحفظ عطا کیا ہے۔

اس کی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ اسے اپنے جبلی ساخت اور فطری رجحانات کے مطابق کام تفویض کئے۔ غرض اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ "عورت" کی عزت و شادمانی کا راز صرف عورت بنے رہنے میں ہے اور اس کی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے دائرہ عمل میں رہ کر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے یہی خالق کائنات کا مقصد و منشاء ہے اور اسی میں اس کی بہترین صلاحیتوں اور شادمانیوں کا راز مضمر ہے۔

حریم کی سالانہ قیمت میں اضافہ

چند ماہ کے اندر کاغذ کی قیمتیں دو چند ہوگئی ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں ابھی اور کتنا اضافہ ہوگا اس لئے کہ ایک طرف [illegible] اور ڈیزل وغیرہ کی کمی کے باعث مل پوری پیداوار نہیں کر پا رہے دوسری طرف اسمگلنگ کے لئے لاکھوں ریم کاغذ محفوظ کیا جا رہا ہے۔ اس لئے قیمتیں بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں۔ ایک ماہ بعد حریم کا سالنامہ شائع ہوگا۔ جس میں مختصر سے مختصر ناول بھی پیش کیا جائے گا تو بھی کافی کاغذ صرف ہوگا۔ پھر یہی نہیں کہ کاغذ ہی گراں ہوگیا ہو، دوسری اشیا مثلاً طباعت کی روشنائی، طباعت اور کتابت وغیرہ کے نرخ بھی بڑھ گئے ہیں۔ تار جس سے پرچہ سلتا ہے مہنگا ہوگیا ہے۔ بانس کا کاغذ جس میں لپیٹ کر حریم روانہ کیا جاتا ہے، گراں ہوگیا ہے۔ اس لئے مجبوراً ہمیں سالانہ قیمت میں اضافہ کرنا پڑ رہا ہے۔ اور جنوری سے سالانہ قیمت منی آرڈر سے اٹھارہ روپیہ اور وی۔ پی سے اکیس روپیہ ہوگی۔ اعزازی اور مخصوص خریدار بہنوں کو تیئیس اور اکیس روپیہ منی آرڈر سے اور چھبیس و چوبیس وی پی سے روانہ کرنا ہوں گے۔ غیر ممالک سے سی میل کی سالانہ قیمت چالیس روپیہ یا اس کے بقدر دوسرے سکے میں ادا کرنا ہوگی۔

جن بہنوں کی خریداری دسمبر ۱۹۸۰ء میں ختم ہوگی اور وہ آئندہ خریدار رہنا پسند فرمائیں گی انھیں نئی مقررہ قیمت ادا کرنا ہوگی۔ جو بہنیں سالانہ قیمت منی آرڈر سے روانہ کرنا چاہیں، انھیں ۱۵ سے ۲۰ دسمبر ۱۹۸۰ء تک منی آرڈر روانہ کر دینا چاہیئے تاکہ وہ دفتر میں ۲۵ دسمبر تک وصول ہوجائے۔ جو بہنیں سالانہ قیمت کے اضافہ یا کسی اور سبب سے آئندہ خریدار رہنا پسند نہ فرمائیں ان سے درخواست ہے کہ وہ اس کی اطلاع ایک کارڈ لکھ کر دفتر کو ۱۵ سے ۲۰ دسمبر تک بھیج دیں۔ ادارہ اس کے لئے ان کا شکر گذار ہوگا۔ اگر کارڈ کا صرف برداشت نہ کرنا چاہیں تو بیرنگ خط تحریر فرمائیں۔ جن بہنوں کا منشا رکی خریداری کے لئے منی آرڈر یا خریداری ختم کر دینے کی اطلاع دفتر میں ۲۵ دسمبر تک نہ پہنچے گی۔ انھیں [illegible] کے دو ایک روز بعد وی پی بھیج [illegible]

[illegible] سالانہ قیمت [illegible] نکال جائے گی۔

جہیز کی بھینٹ

ایک قدیم حریمی بہن نے اپنی ایک عزیزہ کی المناک موت کی اطلاع دی ہے۔ تفصیل پڑھ کر دل بھر آیا۔ اللہ پاک ہر ہونہ کو غریبی [illegible] اور بے بس و بیکس غریب عورتوں کو مردوں کے مظالم سے بچائے۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایک نئی شادی شدہ دلہن کو ایک ماہ پانچ روز بعد ایک دن جبکہ وہ کچن میں اسٹوو جلا رہی تھی اس کی ساس نے مٹی کے تیل کا ڈبہ اس کے اوپر چھڑک کر دروازہ بند کر دیا۔ اسٹوو کی آگ اس کے کپڑوں میں لگ کر اسے جلانے لگی تو ساس نے دروازہ بند کر لیا پھر تھوڑی دیر بعد جب کہ معصوم عورت شعلوں کی لپیٹ میں آکر گر گئی تو ساس نے شور مچا کر دوسروں کو مدد کے لئے بلایا اور واقعہ کو حادثہ بنا کر ہمدردی کی طالب ہوئی۔ مظلوم عورت کے والدین کو [illegible] ہوئی۔ پولیس آئی۔ عورت کو اسپتال میں داخل کر کے بیان [illegible] لیا گیا لیکن رشوت کے سہارے غلط بیان درج کرایا گیا۔ اور یہ بات ثابت کر دی گئی کہ لڑکی نے خودکشی کر لی ہے یا پھر کپڑوں میں اچانک آگ لگ گئی۔ یہ واقعہ گذشتہ ماہ رمضان المبارک میں پیش آیا تھا۔ مرحومہ بھی روزے سے تھی اور اسی حالت میں اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اپنے ماموں زاد بھائی کو اصل واقعہ بتا کر درخواست کی کہ اس کا اظہار نہ کرے اور دنیا والوں کو یہی سمجھنے دے کہ واقعہ خودکشی کا ہے۔

دراصل ظالم ساس کو جہیز کم ملنے کی شکایت تھی اس کا اظہار وہ شادی کے بعد سے برابر کرتی رہتی تھی۔ معصوم عورت صبر و شکر سے ساس کی باتیں سنتی اور کڑھتی رہتی۔

واضح ثبوت نہ ہونے کے باعث ایسا بھی سوچا جاسکتا ہے کہ [illegible] نے عاجز و پریشان ہو کر خودکشی ہی کر لی ہو اس لئے کہ مصائب [illegible] اپنے والدین کا سکون غارت کرنے کے بجائے اکثر خود کشی کا [illegible] کر لیا کرتی ہیں۔ تاکہ قصہ ختم ہو جائے۔ بہرحال اس غریب کی موت خواہ ساس کے تیل ڈال کر جلانے سے ہوئی ہو یا خود اس نے [illegible] اور تیل چھڑک کر اپنے نفس کو جلا ڈالا ہو بات ایک ہی ہے [illegible] [illegible] جہیز کم لانے کا نتیجہ ہے مرحومہ کے والدین [illegible] [illegible] کے سب شادی کے [illegible] سے بھی مختلف طریقوں سے کیا جاتا رہا ہے۔

خدا جانے کب عورت کو اس لعنت سے چھٹکارا مل سکے گا اور کب ان لڑکوں اور ان کے والدین کو اللہ پاک ایسی توفیق دے گا کہ وہ عورتوں کی عزیز زندگیوں سے کھیلنا چھوڑ سکیں گے۔ ہندوستان میں اس طرح کی وارداتیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ ایسے ظالموں کے لئے عبرت انگیز سزائیں تجویز کی جائیں اور ایسے طریقے اختیار کیے جائیں کہ اس طرح کی اموات کا سد باب ہو سکے۔

حریمی بہنوں اور بھانجیوں کے نام

جو بھی عالم وجود میں آیا ہے فنا ضرور ہوگا۔ مدت کتنی ہی کیوں نہ ہو، لیکن کوئی شئے بھی فنا ہونے سے بچ نہیں سکتی۔ پہاڑ ہوں یا ذرے، سمندر ہوں یا چشمے، تناور درخت ہوں یا نازک پودے حیوان ہوں یا انسان، چرند ہوں یا پرند، شہنشاہ رعیت، قارون ہو یا فرعون، طبیب ہو یا مریض۔ پہلوان ہو یا کمزور۔ بچہ ہو یا جوان، کون ہے جسے فنا نہیں۔ کوئی آج، کوئی کل مٹ کر ضرور رہے گا البتہ ہم یہ ضرور سوچتے ہیں کہ ایک ضعیف کے مقابلے بچے کے مرنے کا امکان کم ہوتا ہے، ایک لاغر مریض کے مقابل ایک تندرست کے زندہ رہنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ جوان کے مقابلے میں ضعیف اپنے تئیں موت سے بہت قریب پاتا ہے۔ فنا کا کھٹکا اسے ہر آن لگا رہتا ہے۔ حالانکہ کبھی کبھی بچے مر جاتے ہیں اور بوڑھے انھیں دفن کرنے کے لیے زندہ رہتے ہیں جوان ختم ہو جاتے ہیں اور دادا ان کا غم اٹھانے کے لیے موجود رہتے ہیں لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کھٹکا بوڑھوں کو اوروں سے زیادہ لگا رہتا ہے۔ میں بھی بوڑھا ہو چکا ہوں، عمر طبعی کو پہنچ چکا ہوں، خدا چاہے تو دس بیس سال اور زندہ رہ سکتا ہوں، لیکن اس کی ایسی کریمی پر بھروسہ کم ہی کیا جاتا ہے میں بھی یہی سوچا کرتا ہوں کہ نہ جانے کس گھڑی بلاوا آ جائے چار تو سات سال سے ہوں، ایک بار پہلے بھی زندگی سے مایوس اور ناامیدی سے دوچار ہوا تھا، لیکن خدا نے صحت بخشی۔ اب کمزوری دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ دفتر کے سوا کہیں آنا جانا تقریباً بند ہو گیا تھا۔ یکایک ۲۰ ستمبر کو دفتر ہی میں نروس بریک ڈاؤن ہوا۔ یاس کا عالم طاری ہو گیا۔ دفتر میں سب سے کہا سنا معاف کرایا اور گھر گیا تو گھر والوں کو دیکھ کر رونے لگا۔ پھر تو ایسی حالت ہوئی کہ معالج بھی گھبرا گئے۔ بہرحال علاج معالجہ اور دعاؤں سے کچھ حالت سنبھلی اور ۱۱ اکتوبر کو جب میری پارہ جگر نجم السحر سلمہا اپنے بچوں اور قاسم بھائی و ساجدہ بہن کے ساتھ آ گئیں تو میں اپنے کو بالکل تندرست محسوس کرنے لگا۔ میرے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ آخر وقت اسے نہ دیکھ سکوں گا، اسے دیکھا تو چہرے پر بحالی آ گئی اور پھر کمزوری رفتہ رفتہ ایسی دور ہونے لگی کہ میں کچھ روز بعد دفتر آ گیا اور اب کام کر رہا ہوں۔ لیکن اب اس دور سے گزر رہا ہوں، جب زندگی کی امید موہوم ہو جاتی ہے۔ نہ جانے کس وقت بلاوا آ جائے اس لیے حریمی بہنوں اور بھانجیوں سے میری درخواست ہے کہ اب وہ جو سالانہ قیمت روانہ فرمائیں، اسے قرض حسنہ سمجھ کر بھیجیں۔ خدا معلوم میرے بعد حریم کی اشاعت قائم رہ سکے یا نہیں۔ نہ رہ سکی تو سالانہ قیمتوں کی بقیہ ادائگی ہو سکے یا نہیں۔ نہ جانے حالات کیسے ہوں، اس لیے اول تو انشاء اللہ تعالیٰ رقم نہ واپس ہو سکی تو کتابیں اس رقم کی مل جائیں گی، لیکن اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو مجھ سے بروز حشر اس کا مواخذہ نہ کیا جائے گا۔

صدہا حریمی بہنوں اور بھانجیوں نے میری صحت کے لیے دعائیں کیں خطوط لکھے۔ میں تہ دل سے ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور معذرت خواہ ہوں کہ انھیں ان کے خطوط کے جوابات نہ دے سکا۔ ساتھ ہی اللہ پاک کی کبریائی کا معترف ہوں کہ قطعی ناامیدی کے بعد بھی اس نے صحت بخشی۔ واقعی وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ کریم و رحیم ہے۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی اسے واپس لے لیتا ہے۔ نسیم انہونوی

سالنامہ حریم ۱۹۸۳ء

حسب سابق جنوری ۱۹۸۳ء میں ہم جنوری کا پرچہ سالنامہ کی شکل میں پیش کریں گے جو بہن عفت موہانی کے ناول خلش پر مشتمل ہوگا بہن عفت موہانی کے ناول نہ صرف دلچسپ بلکہ پاکیزہ بھی ہوتے ہیں اور حریمی بہنیں ان کے ناولوں کو برابر پسند کرتی آ رہی ہیں اور ان کے ناولوں کے جو اقتباسات حریم میں شائع ہوتے ہیں بے چین رہا کرتی ہیں۔

حبیبِ خدا

عبدالغنی شمس

محمدؐ، حبیبِ خدا بن کے آئے
ہر اک درد کی دوا بن کے آئے
دھڑکتے دلوں کی صدا بن کے آئے
وہ سب کے لئے آسرا بن کے آئے

محمدؐ، حبیبِ خدا بن کے آئے

سبھی سے وہ اخلاق سے پیش آتے
بڑے پیار سے دیکھ کر مسکراتے
وہ دشمن کو اپنے گلے سے لگاتے
چمن کی وہ تازہ ہوا بن کے آئے

محمدؐ، حبیبِ خدا بن کے آئے

بڑوں کو بھی اچھا بنایا انھوں نے
چلن نیکیوں کا بتایا انھوں نے
دلوں کا اندھیرا اٹھایا انھوں نے
وہ سوکھے لبوں کی دعا بن کے آئے

محمدؐ، حبیبِ خدا بن کے آئے

محبت سے مل جل کے رہنا سکھایا
خوشی سے مصیبت کو سہنا سکھایا
بلا خوف، حق بات کہنا سکھایا
مریضوں کے حق میں شفا بن کے آئے

محمدؐ، حبیبِ خدا بن کے آئے

ملیں سب سے جھک کر ملنسار ایسے
عبا بھی پھٹی ہو وہ سردار ایسے
غریبوں میں جا بیٹھیں، غمخوار ایسے
کرم کی برستی گھٹا بن کے آئے

محمدؐ، حبیبِ خدا بن کے آئے

وہ بچوں سے رکھتے تھے بے حد محبت
نئی پود پر ان کی تھی خاص شفقت
سراپا محبت سراپا مروّت
اندھیرے میں وہ ضیا بن کے آئے

محمدؐ، حبیبِ خدا بن کے آئے

ڈاکٹر گنگولی صاحب مجھے دیکھنے تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ باہر کوئی شخص کھڑا ہے وہ اندر نہیں آیا۔ میں نے سمجھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کا نوکر ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی وہ نہیں گیا۔ اس نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ میں نے اسے بلا لیا۔

میں نے سمجھا وہ کوئی پاگل ہے، لیکن وہ پاگل نہ تھا۔ اسکے پاس میرا ایک خط تھا جسے اس نے احتیاط کے ساتھ رکھ چھوڑا تھا۔

یہ خط وہ مجھے نہ دکھاتا تو شاید میں اسے پاگل ہی سمجھتا رہتا کئی سال قبل اس نے مجھے لکھا تھا کہ میں اس کی داستان حیات، ناول کی شکل میں لکھ دوں، لیکن میں نے اپنی معذوری کا اظہار کر دیا تھا۔ واقعی میں اب ناول نہیں لکھتا۔ حسرت میرا آخری ناول تھا جو میں نے ۱۹۶۳ء میں لکھا تھا۔ لیکن شرافت کی باتوں نے مجھے مجبور کر دیا مجھے اس سے ہمدردی ہوئی اور میں نے اسکی کہانی بستر علالت ہی پر لیٹے لیٹے سنی اور پھر اسے اپنے ۱۲ روزہ قیام نینی تال ہی میں ناول کی شکل میں لکھ ڈالا جس کا نام ہے . . .

آخری تمنا

شرافت اپنی کہانی کو کتابی شکل میں دیکھ کر اتنا خوش ہوگا کہ اسے ڈر ہے کہ کہیں اسے شادی مرگ نہ ہو جائے۔ وہ بڑی بے چینی سے اس ناول کا انتظار کر رہا ہے جو اس کی تمنا پوری کرنے کے ساتھ ہی میرے ناولوں میں ایک کا اضافہ ہے۔

اس ناولٹ کے دونوں کردار یعنی زبیدہ اور شرافت ایسے پاکباز ہیں کہ شاید آپ، جو کچھ ہوا اس پر یقین نہ کر سکیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ شرافت کا ایک ایک لفظ سچا تھا۔ اور ایسا نہ ہوتا تو میں اس کی تمنا پوری کرنے کے لیے یہ ناول نہ لکھتا۔ نسیم انہونوی

آخری تمنا اب شائع ہو گئی ہے طلب فرما سکتی ہیں۔ کاغذ کی گرانی اور کمیابی کے باعث مختصر تعداد میں... چھپی ہے اس لیے آج ہی طلب فرمائیں تاکہ ایک دوسرے اڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

قیمت ——— سات روپیہ

درونِ خانہ سے بیرونِ خانہ تک

"خواتین کا ادبی اجلاس"

برق آشیانوی

مثل مشہور ہے کہ

مزا اس طاپ میں ہے جو صلح ہوجائے جنگ ہوکر

چنانچہ ہم اور حاجر البیعد نے اپنی بیوی سے جو سرد جنگ لڑی تھی
اس کے بہت مفید نتائج برآمد ہوئے۔ اگر اس کی بات کا اندازہ پہلے ہوتا
تو کافی عرصہ قبل ہم یہ اقدام کرتے۔ خیر دیر آید درست آید۔ بہرحال اب ہمیں
شاعری مضمون نگاری وغیرہ کی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ جس
وقت چاہیں اور جو چاہیں لکھ سکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ کارہائے مقبوضہ
متاثر نہ ہونے پائیں۔ البتہ مشاعروں میں شرکت پر اب بھی پابندی ہے۔
سوچ رہے ہیں کہ یہ پابندی کس طرح برخاست ہو۔ اللہ کارساز ہے ضرور
کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔ ادبی اجلاسوں میں شرکت کی اس لئے اجازت
مل گئی ہے کہ وہ مشاعروں کی طرح طویل نہیں ہوتے اور پھر اس بات کا
بھی اندیشہ نہیں رہتا کہ مشاعرے کے بہانے آدھی رات سے زیادہ
نہ جانے اور کہاں جاتے ہیں۔

ایک روز اخبار میں اطلاع شائع ہوئی کہ خواتین کا ادبی اجلاس"
کسی مقام پر مقرر ہے اس اطلاع کو پڑھتے ہی ہم نے ایک مضمون لکھ
ڈالا جس کا عنوان تھا۔ ہدایت نامہ بیویاں"

ہم نے سوچا کہ یہ مضمون خواتین کے حق میں نہایت مفید ہوگا کیونکہ
اس مضمون میں ہم نے بیویوں کے لئے چند نہایت کارآمد باتیں لکھی تھیں۔
ہمارا یہ مضمون "ہدایت نامہ بیویاں" ایک مشہور زمانہ کتاب "ہدایت نامہ خاوند"
کا جواب تھی۔ جس کو خاوند اپنی بیوی سے چھپا کر پڑھتا ہے اور بیوی اپنے
خاوند سے چھپا کر پڑھتی ہے۔ اس مضمون کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ میاں
بیوی ایک دوسرے سے چھپائے بغیر پڑھ سکتے تھے اور بچے اپنے ماں باپ کی
موجودگی میں پڑھنے میں کوئی حرج نہ تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر موسم
میں پڑھی جا سکتی تھی موسم سرما کی قید نہ تھی۔

مضمون لکھ لینے کے بعد ہم خواتین کے ادبی اجلاس میں سنانے
کے لئے بڑی خوشی کے ساتھ پہنچے۔ لیکن گیٹ پر ایک خاتون نے ہمیں یہ
کہہ کر روک دیا کہ "جناب یہ خواتین کا ادبی اجلاس" ہے اس میں مردوں کو
داخلہ کی اجازت نہیں ہے۔ ہم نے کہا۔ صاحبزادی ہماری عمر ساٹھ سال سے
سے زیادہ ہو چکی ہے اب ہمارا شمار مردوں میں نہیں بلکہ مردوں میں کیا
جا سکتا ہے۔ چنانچہ ساٹھ سال کے ایک بوڑھے آدمی کو خواتین کے اجلاس
میں شرکت کی اجازت دینے میں کوئی حرج نہیں ہے" یہ سنتے ہی خاتون
نے فوراً جواب دیا" زندہ دلانِ حیدرآباد کے بوڑھے ——؟ اللہ
کی پناہ —— آج کل کے نوجوانوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔
اس لئے ہم ایسا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے" ہم نے کہا ——
صاحبزادی آدمی بچپن میں اپنی شرارتوں کی وجہ سے بالکل بندر
کی مانند ہوتا ہے، جوانی میں طاقت و توانائی کی وجہ سے شیر کی مانند
ہوتا ہے اور بڑھاپے میں اپنی کم عقلی اور بدحواسی کی وجہ سے بالکل گدھا
ہو جاتا ہے۔ چونکہ ہم بوڑھے ہیں اس لئے ہمیں کم از کم گدھا سمجھ کر
اجلاس میں شرکت کی اجازت دیدو —" اس پر وہ خاتون کچھ دیر
سوچنے کے بعد اندر گئیں اور دوسری خاتون کے ساتھ واپس آئیں۔ دوسری
خاتون ذرا تیز و طرار معلوم ہوتی تھیں انھوں نے آتے ہی ساتھی
خاتون سے دریافت کیا —" کہاں ہیں وہ گدھے صاحب جو خواتین
کے ادبی اجلاس میں مضمون سنانا چاہتے ہیں" پہلی خاتون نے
ہماری طرف اشارہ کرکے کہا —" یہی ہیں وہ صاحب جو ....."
ابھی جملہ مکمل نہ ہونے پایا تھا کہ دوسری خاتون جو آئی تھیں اور جو اپنے
رویہ سے اجلاس کی کنوینر یا منتظم معلوم ہوتی تھیں ہمیں سر سے پیر
تک غور سے دیکھنے کے بعد کہا جناب آپ کو گدھا مان لینے میں
ہمیں کوئی عذر تو نہیں ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ "ادبی اجلاس" گدھوں
کے لئے نہیں ہوتے۔ کل آپ کے "زندہ دلانِ حیدرآباد" کا مشاعرہ ہے
اس میں آپ کلام سنا سکتے ہیں"

اتنے میں ایک نہایت شاندار کار آکر رکی۔ اور اس میں سے ایک نہایت ہی خوبرو، جوان سال، اور ہنس مکھ صاحب کار سے اترے تو کنوینر صاحبہ کار کی طرف دوڑیں اور کار کا دروازہ کھول کر انھیں سہارا دے کر اتارا۔ (حالانکہ سہارا دینے کی ہمارے خیال میں کوئی ضرورت نہ تھی) وہ صاحب ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق سہارے سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے گیٹ کے اندر داخل ہو گئے۔ تب ہم نے گیٹ پر کھڑی ہوئی پہلی خاتون سے دریافت کیا صاحبزادی یہ کون صاحب ہیں جنھیں خواتین کے "اجلاس" میں داخلے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ شاندار استقبال کے ساتھ انھیں اندر لے جایا گیا۔ خاتون نے جواب دیا کہ "یہ صاحب ریاست کے مشہور سیاسی و سماجی لیڈر ہیں۔"

ہم نے دریافت کیا۔ "صاحبزادی کیا یہ صاحب مرد نہیں ہیں؟" اس پر وہ خاتون غصے کے مارے لال پیلی ہو گئیں اور بپھرتے ہوئے انداز میں کہا: "دیکھئے جناب اگر آپ زیادہ بدتمیزی کریں گے تو آپ کو بے عزتی کے ساتھ یہاں سے نکال دیا جائے گا۔" ہم نے کہا "صاحبزادی۔ بے عزتی کے ساتھ تو ہم روز ازل ہی نکالے جا چکے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ روز ازل جنت کے اندر سے نکالے گئے تھے اور آج جنت کے باہر سے نکالے جا رہے ہیں۔"

یہ سن کر وہ خاتون کچھ بڑبڑا رہی تھیں کہ ہم تیزی سے واپس آ گئے۔ اور بے نیل و مرام گھر لوٹے تو بیگم نے دریافت کیا "کیوں؟ سنا آئے مضمون ادبی اجلاس میں ——؟" ہم نے جواب دیا "کیا خاک سناتے۔ وہ خواتین کا ادبی اجلاس تھا۔ انھوں نے ہمیں یہ کہہ کر واپس کر دیا۔ کہ خواتین کے اجلاس میں مردوں کو مضمون سنانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی ——" بیگم نے کہا "ذرا سی ہماری بات مان جاتے تو اطمینان کے ساتھ مضمون سنا سکتے ——" ہم نے کہا "کونسی بات؟" کہنے لگیں: "وہی جو میں نے کہا تھا کہ داڑھی مونچھ مونڈ کر میری ساری اور بلاؤز پہن لیتے تو میں ویسا میک اپ کر دیتی کہ آپ ایک معتبر خاتون نظر آتے۔ پھر میں اپنے ساتھ اجلاس میں لے جاتی اور خواتین سے تعارف کرواتی کہ یہ بیگم برق آشیانوی ہیں اور مضمون سنانے آئی ہیں۔ آپ آواز کو ذرا سا نسوانی بنا لیتے جس میں آپ کو خاصی مہارت ہے۔ پھر ٹھاٹ سے آپ سناتے مضمون۔ رہا میرا معاملہ تو میں آج تک کسی مشاعرے یا ادبی اجلاس میں شریک نہیں ہوئی تو پھر اصل بیگم برق آشیانوی کو کون جانتا ہے ——" ہم نے کہا "بیگم اس میں بہت بڑا خطرہ تھا۔ اگر ذرا سا بھی کسی کو شبہ ہو جاتا تو تلبیس شخصی کے الزام میں دھر لیے جاتے اور جہاں پہلے تیس سال چکی پیستے رہے ہیں خود ہمیں چکی پیسنی پڑتی ——"

اگر یہ بات مسٹر کلیشو جی کو معلوم ہو جاتی تو وہ یہ مشورہ ضرور دیتے کہ —— "برق صاحب آپ ناحق پریشان ہیں۔ جو مضمون آپ نے اردو میں "خواتین کے ادبی اجلاس" کے لئے لکھا ہے اس کو ہندی میں لکھ لیجئے تو "مردوں کے ادبی اجلاس" کے کام آ جائے گا۔ فقط

تشنہ لب

سعیدہ پرویز

اسے گلوکوز دیا جا رہا تھا وہ پچھلے چار گھنٹوں سے بے ہوش تھی۔ عامر اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا اس کے الجھے بالوں کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا نگاہیں اسی کے چہرے پر مرکوز تھیں اچانک اس نے محسوس کیا کہ نشی کی آنکھوں میں ہلکی سی جنبش ہو رہی ہے شاید اسے ہوش آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نصرت نے کہہ رکھا تھا کہ اگر ہوش میں آنے کے آثار نظر آئیں تو فوراً اسے بلوا لیا جائے عامر تیز تیز قدموں سے ڈاکٹر نصرت کے روم کی طرف گیا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا نشی کے ہاتھوں اور پپوٹوں میں بھی حرکت ہو رہی تھی جنھیں دونوں نے اپنی مضبوط گرفت میں لے رکھا تھا۔ عامر نے اپنی آنکھوں پر دستی رکھ لی۔ ڈاکٹر نصرت نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"آپ اس طرح پریشان نہ ہوں یہ تو بہت معمولی کیس ہے صبح تک حالت سنبھل جائے گی دراصل ایسے حساس افراد ہر طرح کی بات کا اثر بہت جلد قبول کر لیتے ہیں شدید جذباتی گھٹن اور کسی خاص وجہ سے اپنی سوچوں پر پابندیاں عائد کرنے والے اکثر ایسی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں اگر ایسے لوگ کچھ لکھ کر یا بول کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں تو اعصاب پر خوشگوار اثر پڑ سکتا ہے۔"

"ڈاکٹر یہ تو ہر وقت بجھی بجھی اور خاموش رہتی ہیں"

"آپ ان سے ان کے دل کی بات اگلوانے کی کوشش کیجیے کیونکہ یہ گھٹن اور خاموشی ان کے لیے تشویشناک بھی ہو سکتی ہے۔"

"یہ ہمیشہ المیہ افسانے لکھتی ہیں اور قلبی واردات کے تذکرے ایسے دلگیر اور پر اثر انداز میں کرتی ہیں کہ بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔"

"آپ نے بڑی خاص بات بتائی ہے ان کی کچھ مخصوص سوچیں ہی ان کی بیماری کی بنیاد ہیں فی الوقت انھیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔"

نشی نے ایک دم آنکھیں کھول دیں وحشتناک نظروں سے چاروں طرف دیکھا جیسے ہی اس کی نظر عامر پر پڑی اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے وہ زار و قطار رونے لگی۔ ڈاکٹر نصرت کی ہمدردی اور محبت آمیز سلوک سے بے حد متاثر تھی اس لئے ...... وہ ان سے کچھ بے تکلف بھی ہو گئی تھی اور پھر جو تھے دن والدہ اور بہن کے ساتھ گھر جاتے ہوئے اس نے نصرت سے وعدہ لیا کہ وہ بہت جلد ان کے گھر آئیں گی اور انھوں نے اپنا وعدہ جلد ہی پورا کر دکھایا۔

انھیں نشی سے دلی لگاؤ تھا اور وہ اپنی تشخیص کے سلسلے میں نشی کے دل کو کریدنا بھی چاہتی تھی۔ انھوں نے پچھلی ملاقاتوں میں اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ ہو گیا ہے جس نے اس کے دل و دماغ کو بے حد متاثر کیا ہے۔ ڈاکٹر نصرت نے اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل کر لی اور ایک دن باتوں ہی باتوں میں نشی پھٹ پڑی۔

"ڈاکٹر میں نے بڑی جتن سے اپنے لہو لہو وجود کو سنبھالا تھا کس قدر حوصلے سے میں نے در دل پر دستک دینے والے محبت کے مقدس فرشتے کو لوٹا دیا تھا۔ میں صبر و ضبط کو چٹان کی طرح مضبوط سمجھتی تھی لیکن یہ سب کچے دھاگے ثابت ہوئے ڈاکٹر کیا یہ سچ ہے کہ وقت کی آندھی دکھ کے ہر بگولے کو اپنے ساتھ اڑا لے جاتی ہے پھر یہ کیسی ویرانی میری روح پر مسلط ہے جو میری زندگی کا جزو لازم بن گئی ہے آنکھوں میں جذب ہونے والے آنسوؤں نے میرے دل میں شگاف ڈال دیے ہیں۔ ڈاکٹر میں اپنے خوابوں کی بھیانک تعبیر سے بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی ہوں نشی خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہتی رہی۔

"نصرت میں نے عامر کو بچپن ہی سے اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا وہ میرا چچا زاد بھائی تھا جوانی میں قدم رکھتے

رکھتے میں نے اس کی مورت اپنے من مندر میں سجا کر اس کی پوجا کرتی رہی لیکن اپنی محبت اور جذبات کے بڑھتے ہوئے طوفان کے آگے فرض بند باندھ رکھا تھا کیونکہ میرے والد گزر چکے تھے اور ہمارے کنبے کی تمام ذمہ داری میرے کندھوں پر تھی بی اے پاس کرنے کے بعد مجھے ایک بڑی فرم میں ملازمت مل گئی تھی۔ عامر کے بار بار زور دینے پر میں نے اسے ایک دن اپنا دو ٹوک فیصلہ سنا دیا کہ آپی کی شادی اور ساجد کی تعلیم مکمل ہونے تک شادی نہیں کروں گی اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میرا انتظار کرے گا اور اسی دوران اس کے والدین نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ بھیج دیا۔ آپی کے لئے کئی پیغام آئے جن میں ایک لڑکا والدہ کو بہت مناسب معلوم ہوا لیکن ان لوگوں کے ایسے مطالبات تھے جنہیں پورا کرنا ہماری سکت سے باہر تھا اسی کے اور میرے غور و فکر کے بعد یہ طے پایا کہ میں اپنے باس سے کچھ رقم قرض لے لوں اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جب میں باس کے مکان پہنچی تو ان کی محل نما کوٹھی کو دیکھ کر دنگ رہ گئی جس میں ان گنت سجے سجائے کمرے وسیع و عریض چمن زار اور کئی خدمت گار تھے۔ وہ سب مجھے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور میں پسینے میں نہائی جا رہی تھی۔ مجھے ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ جب باس آئے تو رسمی سی گفتگو کے بعد میں نے اپنی عرضی ان کے سامنے رکھ دی اور انھوں نے کچھ جھجکتے ہوئے پر اخلاق انداز اور سنبھلے تلے الفاظ میں اپنے آپ کو میرے لئے پیش کر دیا مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر کہیں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر رہا ہے۔ اذیت ناک لمحوں سے گزرنے کے بعد میں نے باس کی پیش کش کو قبول کر لیا۔ اور دوسرے دن پچیس ہزار کا چیک میرے ہاتھ میں دیدیا گیا آپی کی شادی ہو گئی اور چند دن بعد میں بھی سادہ طریقہ سے باس کے حوالے کر دی گئی۔

میری وہ سہاگ رات ان تمام سہاگ راتوں سے بالکل مختلف تھی جس کے بارے میں میری سہیلیوں نے بڑی دلفریب باتیں بتائی تھیں میرے شوہر کبھی میرے قریب نہیں آئے۔ لیکن وہ مجھے بے حد چاہتے تھے میری ہر ضرورت کا پورا لحاظ رکھا کرتے مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے لیکن ایک سوال جو میری رگ رگ میں انگارے بھرتا رہتا میں ان سے کبھی نہ پوچھ سکی نہ ہی کسی کو بتا سکی میں نے اپنا زیادہ سے زیادہ وقت کچھ نہ کچھ لکھنے پڑھنے میں گزارنا شروع کیا۔

دو سال بعد وہ مجھ سے اتنی دور چلے گئے جہاں سے کبھی واپس نہیں آ سکتے میں والدہ کے ہاں منتقل ہو گئی۔ عامر کی واپسی کے دن قریب آ رہے تھے میرے دل میں ایک طوفان سا مچا ہوا تھا راتوں کی نیند اور دن کا چین جیسے مجھ سے روٹھ گئے تھے آخر وہ گھڑی بھی آ پہنچی جس دن میں نے عامر کا سامنا کرنا تھا اس دن میری نند ہما آئی ہوئی تھی جو خوبصورت اور ماڈرن زمانہ کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔

ہم سب عامر کو لینے کے لئے ایئر پورٹ پہنچے وہ طیارے سے اترتا ہوا کس قدر سمارٹ لگ رہا تھا انتہائی قیمتی لباس اس کے جسم پر خوب جچ رہا تھا وہ مردانہ وجاہت کا دلنواز پیکر تھا ہم اس کے قریب پہنچے وہ سب سے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملا رہا تھا ہمارے تعارف کے لئے مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ بالکل غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا کہ وہ میری عزیز ترین سہیلی ہے ہما نے عامر کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی تھی۔ عامر بھی اس کے حسن و ادا دیدہ زیب فیشن ایبل لباس سے کافی متاثر معلوم ہو رہا تھا۔ ہمارا چھوٹا سا قافلہ عامر کے ساتھ گھر آیا۔ اس کے آنے سے مجھے خوشی کے ساتھ ساتھ ایک کرب انگیز الجھن بھی ملی تھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گزشتہ تین سال کے واقعات کس طرح اس کے آگے دہراؤں پتہ نہیں وہ ان مجبوریوں کی زبان سمجھ سکے گا یا نہیں اسی کشمکش میں کئی دن گزر گئے میں اس سے دور دور رہتی اور ہما اس کے آگے پیچھے نظر آتی۔ دونوں کی یہ قربت میرے دل میں پھانس بن کر چبھتی رہی جس کی کسک مجھے تڑپاتی رہی۔

گرمیوں کی تپتی دوپہر تھی میں عفت موہانی کا ناول "وفا کا دکھ" لینے کے لئے ہما کے کمرے میں گئی اسے وہاں نہ پا کر ڈھونڈتی ہوئی عامر کے کمرے کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ اس مانوس آواز نے میرے قدم روک لئے جو میری

نس نس میں سمائی ہوئی تھی وہ کہہ رہا تھا۔

ہماہے بہت اچھا ہوا اگر تم نے بروقت میری آنکھیں کھولدیں اصل میں اسے دولت کی طمع نے سب کچھ بھلا دیا تھا اس نے محبت کو دولت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہما مجھے تم اپنی خوبصورت بانہوں کا سہارا دو میں وعدہ کرتا ہوں ورنہ یہ زندگی مجھ پر بوجھ بن جائیگی وعدہ کرو کہ زندگی بھر میرا ساتھ نبھاؤگی۔ وعدہ کرو ہما۔"

میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اترتا چلا گیا کس قدر کرب انگیز تھا وہ لمحہ۔ سینے میں جیسے دہکتا ہوا نیزہ آ لگا ہو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا حواس ساتھ چھوڑنے لگے اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔۔۔ میں اپنی مجبوریوں اور بے بسی کی داستان اسے سنا بھی نہ سکی اور سنانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ پھر ایک بار میں نے سینے پر صبر کی سل رکھ لی اور حالات کے پیش نظر خاموشی اختیار کر لی ہما اور عامر ایک دوسرے کے ہوگئے!!۔ اور میں ناکام و نامراد اپنی کوٹھی کو منتقل ہوگئی۔ اب اداسیاں اور تنہائیاں میری ساتھی تھیں ویرانی اور خاموشی میری ذیست تھی۔

آج سے ایک ماہ قبل عامر میری کوٹھی پر آیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میرے زخموں کی جمی ہوئی کھرنڈ کسی نے بیدردی کے ساتھ ادھیڑ دی ہو اور تازہ تازہ زخموں سے خون ٹپک رہا ہو۔ مجھے عامر پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ لیکن مجھے یہ جان کر تعجب ہوا کہ وہ مجھ سے معافی مانگنے اور اپنے کئے پر ندامت ظاہر کرنے آیا تھا شاید وہ حقیقتوں کی گہرائی ناپ چکا تھا۔ میں ابھی اپنے آپ کو سنبھال نہ پائی تھی کہ کال بیل کا بزر چیخ اٹھا میرے شوہر کے قانونی مشیر احمد بیگ آئے تھے انھوں نے ایک وصیت نامہ پڑھکر سنایا جس میں لکھا تھا میں ان کی تمام جائداد، ملس اور بینک بیلنس کی اس وقت تک مالک نہیں بن سکتی جبتک کہ میں کسی مناسب شخص سے شادی نہ کرلوں اور اس بات کا صاف الفاظ میں اظہار کیا گیا تھا کہ وہ مجھے کبھی ازدواجی خوشی نہیں دے سکتے تھے

وصیت نامہ ختم ہونے تک میں بے حس و حرکت بیٹھی رہی عامر [illegible] رہا تھا اس کے بعد مجھے کچھ نہیں معلوم کیا ہوا جب [illegible] تو میں ہاسپٹل میں تھی۔ اب تم ہی بتاؤ نصرت میں کیا کروں [illegible] میرے سینے میں جذبات کا الاؤ سلگ رہا ہے یہ زندگی اب میرے لئے پل صراط پر سے گزرنے کے برابر ہے میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا پھر قسمت نے میرے ساتھ یہ مذاق کیوں کیا میری اس الجھن کا حل کیا ہوگا نصرت ؟" اور نشاط پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بشکریہ حیدرآباد آل انڈیا ریڈیو

بدمعاش شریف

(از آفریں اطاری)

"عاشی بی بی! بیگم صاحبہ یاد فرما رہی ہیں۔ ناشتہ لگ چکا ہے" خادمہ نے ادب سے قریب آکر کہا تو عاشی چونک پڑی۔ اس لئے کہ وہ اب تک سامنے والی بلڈنگ کی بالکنی میں کھڑا تھا۔

عاشی نے دل ہی دل میں سوچا کہیں شکورن نے امی سے کچھ کہہ دیا تو کیا ہوگا۔ وہ تو میرا لان میں بیٹھ کر پڑھنا بھی بند کر دیں گی۔ انھیں یہ کیسے یقین آئے گا میں اس ندیدے کو نگاہ بھر کر دیکھتی بھی نہیں۔ اور کبھی کبھی اس کی طرف دیکھتی بھی ہوں تو صرف اس لئے کہ دیکھوں دفعان ہوا یا نہیں۔ انداز سے اسٹوڈنٹ ہی معلوم ہوتا ہے، لیکن ہوسٹل کے بجائے یہاں رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ شاید چال چلن اچھا نہ ہوگا۔ ہوسٹل سے نکال دیا گیا ہوگا۔ کمبخت مصیبت بن گیا ہے میرے لئے۔ پڑھنے کو تو میں اندر بھی پڑھ سکتی ہوں لیکن یہاں لان پر بیٹھ کر جس طرح مضامین یاد ہو جاتے ہیں، اندر نہ ہو سکیں گے۔ کیا حسین اور پرکیف ماحول ہوتا ہے۔ نسیم سحری کے جھونکے، پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اور چڑیوں کے دل کو چھو لینے والے چہچہے۔ ایک بار جو چیز پڑھی دل پر نقش ہو کر رہ گئی۔ لیکن اس بدتمیزی کو میں گوارا نہیں کر سکتی۔ کوئی دیکھ لے تو نہ جانے کیا سوچے، کیا سمجھے۔

شکورن نے پھر کہا "ارے عاشی بی بی چلئے نا، بیگم صاحبہ ناراض ہوں گی، ناشتہ ٹھنڈا ہو جائے گا"

عاشی نے جیسے چونکتے ہوئے کہا۔ "ارے بوا تم ابھی تک کھڑی ہو۔ میں ایک تھیوری سالو کر رہی تھی۔ چلو چلتی ہوں۔"

بوا نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا "بڑی محنت کرتی ہے میری بیٹی پڑھنے میں۔ اس سال بھی فرسٹ آئے گی"

عاشی نے بوا کی مسکراہٹ پر غور نہیں کیا۔ کتابیں سمیٹ کر اندر چلی گئی، کھانے کی میز پر پہنچتے ہی ماں نے کہا "بیٹی! ایسا بھی کیا پڑھنا کہ کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہے۔"

عاشی نے کہا "امی جان امتحان سر پر آگیا ہے۔ پڑھوں گی نہیں تو اچھے نمبر کیسے لا سکوں گی۔"

انجینیر صاحب نے مسکرا کر کہا "بیگم یہ علم حاصل کرنے کا دور ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ لڑکیوں میں حصول علم کا جذبہ شدت سے پیدا ہو گیا ہے"

عاشی کی ماں نے کہا "بہت تو پڑھ لیا ہے عشو نے، اور زیادہ پڑھ کر کیا کرے گی، اسے ملازمت تو کرنا نہیں ہے۔"

انجینیر صاحب نے کہا "بیگم علم صرف ملازمت حاصل کرنے ہی کے لئے نہیں حاصل کیا جاتا اور جو لوگ صرف اس نقطۂ نظر سے علم حاصل کرتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں۔ تم زیور کیوں بنواتی ہو؟"

بیگم۔ یہ تو میرا شوق ہے۔ ہر عورت زیور پسند کرتی ہے۔

انجینیر صاحب۔ ٹھیک ہے، لیکن یہی زیور کبھی کبھی آرائش و زیبائش کے علاوہ اور کسی طرح بھی کام آتے ہیں۔ کبھی کبھی انسان پر بیا وقت بھی آپڑتا ہے کہ یہی زیور اس کی مشکلات کو آسان کر دیتے ہیں۔ زیور خریدتے وقت عورتیں یہ نہیں سوچتیں کہ زیور ان کے آڑے وقت میں کام آئیں گے۔ بالکل اسی طرح علم حاصل کرتے وقت خواتین کو یہ نہ سوچنا چاہئے کہ وہ اس لئے پڑھ رہی ہیں کہ اسے حاصل کر کے کہیں ملازمت کریں گی۔ علم انسانی ذہن، دماغ اور جسم پر پالش کر کے انسان کو ذہین، عقلمند اور وسیع بناتا ہے بیگم مستقبل کے متعلق کبھی کچھ سوچا نہیں جا سکتا۔ انقلابات آتے ہی رہتے ہیں اچھے وقت برے وقتوں میں تبدیل ہو جاتے اور ایسے ہی وقتوں میں اگر عورت تعلیم یافتہ ہے تو علم کے سہارے باعزت زندگی گذار سکتی ہے۔

عاشی باپ کی باتیں غور سے سنتی رہی، اس کی ماں بھی شوہر کی باتوں سے متاثر ہوئیں۔ اسی ماحول میں ناشتہ ہوتا رہا۔ اور پھر عاشی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اسی رات جب شکورن اوولٹین کا گلاس لے کر عاشی کے کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا کہ عاشی کتاب پڑھنے کے بجائے چھت کی طرف دیکھ رہی تھی اور محویت ایسی تھی کہ اسے شکورن کے آنے کا علم بھی اس وقت تک نہ ہو سکا جب تک کہ اس نے گلاس میز پر نہیں رکھا ـــ

عاشی پھر چونک پڑی۔

"کیا سوچ رہی ہو بٹیا" شکورن نے کہا

عاشی کچھ پریشان سی ہوگئی اور گھبرا کر اٹھتے ہوئے بولی "کچھ بھی تو نہیں بوا۔ یوں ہی بس پڑھتے پڑھتے تھک گئی تھی۔

"ایک بات پوچھوں بٹیا" شکورن نے فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا عاشی نے اوشین کا گلاس اٹھاتے ہوئے بظاہر سکون کے ساتھ، لیکن بہ باطن گھبرا کر کہا "کیا پوچھنا چاہتی ہو بوا۔ پوچھو۔

شکورن ایک جہاں دیدہ عورت تھی۔ اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا دو لڑکیاں تھیں، انھیں بیاہ چکی تھی۔ انجنیر صاحب کے پاس اس نے تقریباً ۲۰ سال گذارے تھے۔ جب وہ آئی تھی تو عاشی کی ولادت بھی نہ ہوئی تھی، اس لئے اس نے ہی عاشی کو پروان چڑھایا تھا۔ تیل کی مالش کرنا نہلانا کپڑے پہنانا، پرامبولیٹر میں بٹھا کر سیر کرانے کے لئے گارڈن لے جانا۔ سب کچھ اسی کے فرائض میں شامل تھا۔ اس لئے وہ عاشی کو اس کی ماں سے بھی زیادہ چاہتی تھی۔ اور خود عاشی بھی اس سے بے حد پیار کرتی تھی اور بے تکلف بھی تھی۔

شکورن نے کہا "بٹیا! یہ لان کے سامنے جو کوٹھی ہے، اس میں کوئی نیا کرائے دار آیا ——

عاشی نے اس کی بات کاٹ کر کہا "ہوگا کوئی، تجھے کیا مطلب"

شکورن نے کہا۔ بٹیا ناراض کیوں ہوتی ہو، میں نے یوں ہی پوچھ لیا تھا۔ کوئی بہت بھلا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ میں جب بازار جاتی ہوں تو وہ ——

"تو وہ۔ کیا" عاشی نے قدرے تیز لہجہ میں کہا۔

"بٹیا وہ تو تمہاری تعریف کیا کرتا ہے"

"اور تم سنتی ہو بوا۔ وہ تو کوئی لفنگا معلوم ہوتا ہے جہاں میں لان میں گئی۔ گھورنے لگتا ہے —— کیا بھلے آدمی ایسے ہی ہوتے ہیں —— خبردار آئندہ اس کا ذکر مجھ سے نہ کرنا، ورنہ امی سے کہدوں گی۔

نہیں۔ نہیں۔ بٹیا، میں ابھی کچھ نہیں کہوں گی —— میں نے تو سمجھا تھا کہ تم کو بھی وہ پسند ہوگا ——"

کیا کہا تم نے بوا۔ میں اور ایسے شریف بدمعاش کو پسند کروں گی۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ جاؤ۔ چلی جاؤ، یہاں سے۔ اب میں لان پر جاؤں گی ہی نہیں۔

شکورن سہم کر چلی گئی۔

دوسرے دن سے عاشی کمرے کے اندر ہی بیٹھ کر اسٹڈی کرنے لگی۔ اس کے دو ہی دن۔ وہ بعد شکورن بوا نے پھر کہا۔ "بٹیا اب تم لان پر ہی جاکر پڑھا کرو۔

"کیوں" عاشی نے ترش لہجہ میں پوچھا۔

"وہ تو چلا گیا بیچارہ۔ کوٹھی اب خالی ہے۔ اسی کی وجہ سے تو تم لان پر نہیں جاتی تھیں۔

"تو وہ تمہاری نظر میں بیچارہ تھا" عاشی نے منھ بنا کر کہا "میرا بس چلتا تو میں اسے گولی مار دیتی"

شکورن کو بیساختہ ہنسی آگئی "رہنے بھی دو بٹیا، ایک چڑیا تو مار نہیں سکتی ہو۔ اتنے بڑے آدمی کو کیسے گولی مار سکتیں۔ خیر اب تو چلا ہی گیا۔ جاتے وقت اتفاق سے میرا سامنا ہوگیا تو کہنے لگا اپنی بٹیا سے میرا سلام کہدینا۔

"اچھا۔ یہ مجال اس کی۔ اور تم نے کچھ کہا بھی نہیں اسے"

سلام ہی تو کہلایا تھا، کوئی بری بات کہتا تو میں اسے کچا چبا جاتی سچ پوچھو بٹیا تو مجھے اس کے جانے کا دکھ ہوا۔

"دکھ کیوں ہوا"

"بہت پسند تھا مجھکو۔ کیسی اچھی جوڑی ہوتی ——"

عاشی نے پوچھا" کس کی جوڑی —— کیا بک رہی ہو بوا۔

شکورن نے ایک آہ سرد بھر کر کہا "اگر تم واقعی میری بٹیا ہوتیں۔

عاشی نے بات کاٹ کر پوچھا "تو کیا کرتیں تم"

بوا نے مسکرا کر کہا "اپنی بٹیا کو اس سے بیاہ دیتی۔ کوئی بہت ہی بھلا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ موٹر بھی ہے اس کے پاس۔

"اور وہ کرلیتا تمہاری بٹیا سے شادی"

کیوں نہ کرتا، میری بٹیا تو لاکھوں میں ایک ہے۔

کہاں ہے تمہاری بٹیا۔

"تو کیا تم میری بٹیا نہیں ہو"

عاشی ہنس دی "کیوں نہیں ہوں" کہکر اس نے بوا کے گلے میں اپنی باہیں حمائل کردیں۔ اور اسکی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ جنھیں عاشی نے دیکھ لیا اور اپنے آنچل میں انھیں جذب کرتے ہوئے کہا "بوا تم رونے کیوں لگیں ——

"خوشی سے"

کچھ عرصہ بعد ایک روز انجینیر صاحب نے بیوی سے رات میں کہا خالد تو تمہیں یاد ہی ہوگا بیگم۔ ایک عرصہ ہوگیا ملاقات نہ ہوسکی۔ میں بخاری میں ہوں اور وہ حیدر آباد میں۔

"اچھی طرح یاد ہے مجھے، تم دونوں تو ایک جان دو قالب تھے۔ آج ان کی یاد کیسے آگئی آپ کو۔

وہ آرہے ہیں کل میرے یہاں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ دوستی استوار کرنے کے لئے خالد نے اپنے جاوید کے لئے عاشی کو مانگ لیا تھا۔ ہماری دوستی ایسی تھی کہ انکار کرنا ممکن نہ تھا، اس لئے میں نے وعدہ کر لیا تھا ——

"کیا کرتا ہے۔ جاوید اور ہے کیسا" عاشی کی ماں نے سوال کیا۔

انجینیر صاحب نے جیب سے جاوید کا فوٹو نکال کر بیوی کو دے دیا۔ جسے دیکھتے ہی وہ بولیں۔

"بڑا ہی خوبرو ہے جاوید"

"اور اسی سال اس نے ڈاکٹری کا امتحان بھی پاس کر لیا ہے"

رشتہ تو بہت اچھا ہے۔ لیکن میری عاشی کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔

انجینیر صاحب نے کہا "صرف ۱۲ سال — یاد ہے جب تم بیاہ کر آئی تھیں تو تمہاری عمر کیا تھی —— صرف ۱۵ سال۔

عاشی کی ماں نے کہا وہ زمانہ اور تھا۔ خیر مجھے لڑکا پسند ہے۔ کیا اسی لئے خالد بھائی آرہے ہیں۔

"ہاں بیگم صرف اسی لئے" انجینیر صاحب نے کہا۔

"عاشی کی رائے لینا بھی ضروری ہے۔ اب زمانہ بدل چکا ہے"

ہاں ہاں اسے بھی دکھا دو یہ فوٹو — ضرور پسند کرے گی وہ"

"میں بوا کے ذریعہ رائے لوں گی"

دوسرے ہی دن خالد صاحب آگئے۔ کافی مدت کے بعد دونوں دوست ملے تھے بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ ان سے بھلا پردہ کون کرتا۔ عاشی کو دیکھکر وہ بہت خوش ہوئے تنہائی میں انھوں نے عاشی کے باپ سے کہا "عاشی تو میرے تصور سے بھی زیادہ حسین ہے، پھر بھلا جاوید کیسے ناپسند کر سکتے تھے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا خالد" عاشی کے والد نے پوچھا

"بھئی کیا بتاؤں" خالد نے کہا "شادی کے سلسلہ میں، اس سے میں نے تذکرہ کیا تو بھڑک اٹھا، کہنے لگا یہ گڑیا گڈے کی شادی نہیں۔ میں لڑکی کو دیکھے بغیر ہرگز شادی نہ کروں گا۔ میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ تمہارے علم میں آئے اور اسے دیکھے۔ پھر پسند کرے۔ اس لئے میں نے اسے تمہارا پتہ بتا کر یہاں بھیجا تھا۔ اس کا کوئی کلاس فیلو یہیں رہتا ہے۔ وہ یہاں آیا اور اس نے عاشی کو اچھی طرح دیکھا بہت پسند کیا اس نے اسے

لیکن یہ کیسے ہوا، میں نے تو جاوید کی شکل تک نہیں دیکھی۔ کیسے اس نے عاشی کو دیکھا اور پسند کر لیا۔

خالد نے کہا "کہتا تھا کہ آپ کی لان کے سامنے ہی کسی کوٹھی میں وہ آکر ٹھہرا تھا"

بھئی کمال کر دیا۔ یہ آجکل کے لڑکے۔

خالد نے کہا۔ لڑکیوں کو بھی شامل کیجئے۔

دونوں نے قہقہہ لگایا۔

اچھا تو اب تم اسے اپنی غلامی میں لے لو" خالد نے کہا

کیوں" عاشی کے والد نے کہا۔ میں کیوں جاوید کو اپنی غلامی میں لوں، کیا عاشی تمہاری بیٹی نہیں ہے۔ اسے بیٹی سمجھو اور میں خالد کو اپنا بیٹا سمجھکر اسے تمہاری غلامی میں دیتا ہوں"

پھر دونوں ہنس پڑے۔ خالد نے کہا "بات بہت معقول اور دل لگتی ہے۔ اطمینان رکھیں جاوید میرا ہی غلام بنے گا۔

اس رات عاشی کی ماں نے جاوید کا فوٹو شکورن کو دے کر کہا "بٹیا سے یہ فوٹو دکھا کر معلوم کرو کہ اسے پسند ہے یا نہیں۔ نہ جانے کس طرح یہ عاشی کو دیکھ گیا ہے۔ دیکھو بوا کتنا شکیل ہے یہ۔ وہ جو انجینیر صاحب آئے ہیں، انھیں کا بیٹا ہے۔ ڈاکٹر ہوگیا ہے۔

شکورن نے فوٹو لفافے سے نکال کر دیکھا تو اسے ہنسی آگئی۔

عاشی کی ماں نے پوچھا "بیگی! یہ ہنسی کا کون سا موقع ہے"

شکورن نے کہا "اے بیگم! میں واری جاؤں۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ کتنا پیارا دولہا ہوگا میری بٹیا کا۔ میں تو خوشی سے پاگل ہوتی جارہی ہوں۔

پھر رات کو اوولٹین کا گلاس لے کر شکورن عاشی کے پاس گئی تو اس کی ہنسی روکے نہ رک رہی تھی۔ عاشی نے پوچھا "کیا بات ہے بوا۔ خیر تو ہے۔ یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔

"کیا بتاؤں بٹیا کہ کیا ہوگیا ہے، یہ دیکھو" کہکر شکورن نے جاوید کا فوٹو نکال کر عاشی کے سامنے رکھدیا۔

پہلی ہی نظر میں وہ پہچان نہ سکی کہ یہ اسی نذیمے کا فوٹو ہے جس کے

باعث اس نے وہاں میں آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ کس کا فوٹو ہے یہ بوا' بہانے اپنی ہنسی چھپانے کے لئے دوپٹے کا آنچل منہ پر رکھتے ہوئے کہا میں قربان جاؤں بٹیا۔ آپ نے پہچانا نہیں ـــ ارے یہ اس ندیمے کا فوٹو ہے جو سامنے کی کوٹھی میں آکر ٹھہرا تھا۔

عاشی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اسے غصہ آگیا تھا مگر اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی۔ شگوفن نے کہا ارے بٹیا غصہ نہ کرو یہ تمہارے انجنیئر چاچا کا بیٹا ہے ڈاکٹر جاوید۔ تمہیں دیکھنے اور پسند کرنے کے لئے یہاں آکر ٹھہرا تھا اور اب تمہارے چاچا اس لئے آئے ہیں کہ ـــ

عاشی یہ سنکر سناٹے میں آگئی ـ اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر تکیئے پر گر پڑی۔

"شرما گئی میری لاڈلی ـــ میں نہ کہتی تھی کہ کوئی بہت ہی بھلا آدمی ہے" میں جا کے دیتی ہوں کہ بٹیا نے بھی پسند کر لیا ہے"

اتنا کہکر شگوفن جانے لگی تو عاشی نے اس کا آنچل پکڑ لیا "میری بوا۔ یہ دکہنا" تو کیا یہ کہدوں کہ بٹیا کو پسند نہیں' پگلی کہیں کی"

اور عاشی خاموش رہی۔

لغزش

حنا بدر

شمع کی تھرتھراتی ہوئی لو بھڑکی اور لامتناہی ظلمتوں میں گم ہو گئی۔ اس نے ایک جھرجھری سے لی اور ناتواں جسم کو سمیٹ لیا۔ کیا وہ بھی اس شمع ہی کی مانند نہیں ہے۔ جو ایک دن ہمیشہ کے لئے گل ہونے والی ہے۔

چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے کہیں اجالے کی ننھی سی رمق بھی نہیں۔ اس نے چاروں طرف آنکھیں پھیلا پھیلا کر دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ اس نے تھک کر آنکھیں موند لیں اور گودڑ نما تکیے کو بھینچ لیا جیسے۔ جیسے وہ اس کا بچہ ہو اس کا اپنا جگر کا ٹکڑا۔

میرا بچہ۔ میرا بچہ ایک سسکاری اس کے خشک لبوں سے پھسل گئی اور وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بدبدانے لگی۔

کہاں گیا میرا لال۔ آجا۔ آجا تو بھوکا ہوگا۔

اف رازی تم نے مجھے کتنا زبردست دھوکا دیا میں تمہارے فریب میں آ گئی کتنی بے وقوف تھی میں تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ کہ کبھی میرا دامن نہ چھوڑو گے۔ ساری زندگی ساتھ نبھاؤ گے۔ اور میں نے آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا تھا۔ لیکن تم نے مجھے اپنے ذہن سے اپنے دل سے حرف غلط کی طرح مٹا ڈالا

مگر میں وہ سب کچھ کیسے بھول جاؤں، میری تو ساری زندگی برباد ہو گئی۔

اس کا ذمہ دار کون ہے؟

تم اور تم ... مگر اس میں قصور میرا بھی تھا جس کی سزا پا رہی ہوں۔

ایک بار صرف ایک بار آ کے مجھ سے کہہ دو کہ تم اس معصوم کو بھان چڑھاؤ گے اسے اپنی بیٹی سمجھ کر رکھو گے آ ؤ رازی آ جاؤ اور میری یہ تمنا پوری کر دو میں تو برباد ہو گئی ہوں۔ لیکن اس کی بربادی میں برداشت نہ کر سکوں گی

سسکیاں ہچکیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ پھر ایسا لگا۔ وہ جیسے کسی نے دروازے پر دستک دی ہو۔ مگر یہ اس کا وہم تھا۔

اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا۔ وہ بے آواز رو پڑی۔ اف یہ مرد کوئی نہیں پہچان سکا۔ انھیں کتنے ظالم کتنے بے وفا وہ ماضی کے دھندلکوں میں کھونے لگی کتنے پیارے تھے وہ دن چھوٹا سا کچا مکان جس میں بابا اماں اور ننھے منے بھائی بہنوں کے ساتھ وہ رہتی تھی۔ نہ کوئی غم نہ فکر۔ زندگی بہت خوبصورت تھی۔ وہ خوش رنگ تتلی کی مانند دن بھر اڑتی پھرتی تھی۔ بہن بھائیوں میں بڑی ہونے کے ناطے ماں باپ اسے سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ لیکن اس نے انھیں کیا دیا۔

جدائی، بدنامی، تڑپ۔ رسوائی۔

کیا اب بھی وہ اسے اتنا ہی چاہتے ہوں گے؟

دل میں ابھرنے والے اس سوال پر وہ خود ہی شرمندہ ہو گئی اس نے ان مشفق ماں باپ کو بدنامی کے گہرے غار میں ڈھکیل دیا تھا۔ اور خود موت و زیست کی کشمکش میں پڑی تھی۔

کاش میں نے اپنی عقل کو دل کے ہاتھوں نہ گنوایا ہوتا یہی پچھتاوا اس کی جان کا دشمن بن گیا تھا۔

ریاض ایک کھیتی باپ کا اوباش بیٹا تھا مگر پیسے نے ساری عیاشیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ گاؤں کی کئی سو بیگھے زمینوں کے مالک تھے مگر رہائش شہر ہی میں اختیار کی ہوئی تھی۔

باپ کے بیمار پڑ جانے پر ریاض کو گاؤں جانا پڑا۔ جہاں اس کی ملاقات بھولی بھالی حسین رشیما سے ہوئی۔ ریاض نے گاؤں کی الھڑ حسینہ کو اپنے شکار کا نشانہ بنایا اور اپنی میٹھی میٹھی باتوں کے فریب میں پھنسا کر اس کا دل موہ لیا۔ شہر کے خوبصورت سپنے دکھا کے اپنی امارت کا رعب ڈالا اور شہر بھگا لایا۔ شہر میں لا کر ایک نچلے طبقے کے ہوٹل میں ٹھہرا لیا اور اسے یقین دلایا کہ پہلے وہ اپنے ماں باپ کو ہموار کر کے جو جاہل بدنو قبول کرنے کے لئے

شاید تمہارا دل میں

بھر اپنی کوکھ میں لے جائے گا۔

گاؤں کی کھلی فضا میں کھلی ہوئی شگفتہ اور زرخیز کلی شہر کے گھٹن زدہ ماحول اور وہ بھی نچلے طبقے کے ہوٹل میں کمھلا کر رہ گئی۔ اور کچھ دن بعد رامن کو بھی اس میں کوئی کشش نظر نہ آئی۔ اور وہ اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ کس سے فریاد کرتی کون تھا سننے والا اس نے اپنے ہاتھوں اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔

ہوٹل کے مالک نے بھی اسے دھتکار کر ہوٹل سے باہر نکال دیا۔ اب وہ بھری پڑی دنیا میں اکیلی اور بے سہارا تھی۔ جیسے سمندر کی طوفانی لہروں کے بیچ ایک چھوٹی سی کشتی۔ وہ فٹ پاتھ پر لوگوں کے پیروں کی دھول میں پڑی رہتی۔ کوئی ترس کھا کر اسے کچھ دے دیتا۔ اور اسی طرح پیٹ بھرنے کے وسیلہ ہو جاتا۔ ایک دن کمزوری کے سبب وہ فٹ پاتھ پر بے ہوش ہو کر گر پڑی ادھر ادھر سے لوگ اکٹھے ہونے لگے اور تب کسی نے ہوا لگنے کے لئے اس کے چادر میں چھپے ہوئے چہرے اور جسم کو کھولا۔ سبنوں کی آنکھیں کھلی رہ گئیں وہ گود سے لالا تھی۔ تب ایک بوڑھے نے اسے سہارا دیا اور اپنے آپ کو اس کا باپ بتایا۔ ہوش آنے پر اسے اپنے جھونپڑے میں لے گیا۔ وہ جھونپڑے میں پڑی پڑی زمانے کی گردش کے بارے میں سوچا کرتی۔ بوڑھا جو کچھ کما کر لاتا ریشما کی جھولی میں ڈال دیتا۔ وہ اپنی زندگی سے عاجز آ گئی تھی۔ بس اگر زندگی میں کوئی خواہش تھی تو وہ تھی موت اور موت کو بھی نہ جانے کیوں اس سے بیر تھا کہ اتنے اصرار کے باوجود بھی گریزاں تھی۔

ریشما نے اس جھونپڑے ہی میں ایک بچی کو جنم دیا۔ بچی اس ذلیل باپ کی جس نے اسے اس دوزخ میں جلنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اور خود عیش کر رہا تھا۔ ریشما سوچتی کہ کیا واقعی سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں اور سب کچھ کر کے باوجود بھی فرشتے کی طرح معصوم۔ اور عورت ذرا سی غلطی کی کتنی بھیانک سزا بھگتتی ہے۔ اسے سماج میں کوئی قبول نہیں کرتا۔ اور مرد ویسے ہی سماج میں مقبول رہتا ہے۔ اور پھر وہ مایوسیوں کے اتھاہ سمندر میں ڈوبنے لگی۔ اب تک امید کی ہلکی سی کرن نا امیدی کی سیاہ گھٹاؤں میں کہیں چھپی تھی کہ اگر وہ بچی لڑکا ہوتی تو شاید ماں باپ اسے گلے سے لگاتیں مگر اب ایک بچی کو لیکر وہ کہاں جائے بچے کی پیدائش کے بعد اسے ایسا لگا جیسے اس کی دلی آرزو یعنی موت اب اس کے قریب آنے والی ہے۔ لیکن اس معصوم کا کیا ہوگا۔ اسے کون پروان چڑھائے گا اور یہ سوچ کر اس نے اپنے لخت جگر کو سینے سے لگا لیا۔ جو تیز آواز سے رو رو کر شاید کہہ رہی تھی۔ کہ ماں میرے لئے جیو۔ میرا تمہارے سوا اور کون ہے پھر یکایک اسے خیال آیا یہ بھی زندہ رہ کر لڑکی بن جائے گی۔ ایسی لڑکی جس کے باپ کا کسی کو علم نہ ہوگا اور یہ شکاری مرد اس کا بھی پیچھا کریں گے اور اسے بھی میری ہی طرح دھوکا دیں گے۔ اسے تباہ و برباد کر کے میری ہی طرح اس بھیانک دنیا میں چھوڑ دیں گے۔ اسے کوئی سہارا نہ دے گا کوئی اسے نہ اپنائے گا اس لئے کہ اس کے باپ کا کسی کو علم نہ ہوگا کیا ایک فرط غم و الم سے وہ پاگل ہو گئی۔ اور اس نے کہا نہیں۔ نہیں۔ میں تجھے اس دنیا میں تنہا نہ چھوڑوں گی۔ اپنے ساتھ لے چلوں گی۔ اپنے ساتھ اور اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں اس کا گلا دبا کر اس کی جان لے لی۔ اور پھر خود بھی ابدی نیند سو گئی۔ صبح محلے والوں نے ان کو دیکھا اور انھیں سپرد خاک کر دیا یہ تھا اس لغزش کا انجام جو جوانی میں اس سے سرزد ہو گئی تھی۔

افسانہ

چاند تارا

مضیرا اعظم

"ابھی میں لوں گی چاند تارہ" یاسمین ضد کرتی ہوئی بولی۔

"نہیں چاند تارہ میرا ہے" طاہر زور سے چیخا۔

اس کی آواز سے وہ کچھ سہم سی گئی۔ پھر زور زور سے رونے لگی۔ "پھوپھی اماں طاہر مجھے چاند تارہ نہیں دے رہا" اس نے روتے ہوئے پھوپھی سے شکایت کی۔

"اے بیٹا تجھ سے چھوٹی ہے، کیوں اسے ستاتا ہے۔ چل اسی کو دے دے" پھوپھی اماں نے بیٹے کو سمجھایا۔

"ٹھیک ہے!..... وہ اسے گھورتا ہوا بولا "یہ لو" کہہ کر اس نے سکہ تھامیں اچھالا "دیکھ لینا تمہارا نام لیا ہے کبھی بھی چاند تارہ نہیں گرے گا۔ خالی" گرے گا خالی" ذرا غصہ میں بولا۔

"ٹن"

"دیکھا" خالی گرا چاند تارہ میرا ہے۔ وہ خوشی سے جھوم کر بولا۔ اسی طرح کی معصوم حرکتوں میں ان کا بچپن بیت گیا۔

اب دونوں جوان ہو چکے تھے۔ دونوں کا لگاؤ دیکھتے ہوئے ان کی شادی کر دی گئی۔

ایک سال گزرا۔ پتہ نہیں چلا۔

دو سال بیتے۔ یاسمین کو کسی تیسرے کا انتظار رہنے لگا۔

پانچ سال ختم ہو گئے۔ یاسمین کے ساتھ ساتھ طاہر بھی بے چین رہنے لگا۔

دنیا بھر کے علاج کر ڈالے مگر ان کے آنگن میں نہ کوئی چاند اترا اور نہ ہی کوئی تارہ چمکا۔ وہ واقعی اس بھری پڑی دنیا میں خالی کی خالی رہی۔

طاہر سمجھاتا۔ مگر بے سود۔ پھوپھی اماں بہلاوا دیتیں لیکن بے کار۔ ماں باپ تسلی دیتے۔ لیکن کوئی بات کارگر نہ ہوتی۔ پھر اس نے بھائی کو گود لے لیا اور اس کی آمد سے وہ کسی حد تک بہل گئی تھی اور اس وقت

وہ تہی دست بیٹھی تھی۔ زندگی کے تیس سال ایسے گزرے کہ طاہر نے ہر آرام ہر آسائش اسے دیا۔ ہر چیز مہیا کی سوائے اولاد کے لیکن اس کا مداوا بھی تارہ کی شکل میں ہو چکا تھا۔ تارہ بائیسویں سال میں قدم رکھ چکی تھی اور یاسمین کا محبوب شوہر اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر جا چکا تھا۔

"ممی..... ممی....." تارہ پکارتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔

"کیا ہے بیٹے۔ کیوں شور کر رہی ہو" یاسمین نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔ تارہ اس کے کمرے میں آ چکی تھی "ممی وہ زاہد آئے ہیں" اس نے یاسمین کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"کون زاہد"؟ وہ ذرا حیرانی سے بولی۔

"وہی، جو مجھے کلب میں ملے تھے" تارہ نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلو..... میں آتی ہوں" وہ مسکراتے ہوئے بولی

پھر جیسے ہی ڈرائنگ روم میں قدم رکھا۔ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ ہو بہو طاہر..... ایسا لگتا تھا کہ آج سے پچیس سال پہلے کے طاہر کو لا کر کھڑا کر دیا ہے۔

"ممی یہ زاہد علی ہیں ـــ اور زاہد یہ ہیں میری پیاری ممی" تارہ کی آواز سے وہ جیسے ہوش کی دنیا میں آ گئی۔

"جاؤ بیٹے چائے لاؤ" وہ ایک طرف صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"بیٹے تمہارے والد کا کیا نام ہے"؟ اس نے اپنے ڈولتے ہوئے وجود کو سنبھالا۔

"جی..... ہے نہیں تھا" وہ افسردگی سے بولا "میرے والد کا نام طاہر علی تھا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل ان کے انتقال کی خبر ملی ہے۔ میں اس وقت باہر تھا۔ افسوس والدہ تو بچپن ہی میں انتقال کر چکی تھیں اور ڈیڈی کا بھی آخری دیدار نصیب نہ ہوا۔"

"اور بہت افسوس ہوا" وہ ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔

یقین ... ۔ وہ بے حد عمدہ انسان تھے ۔ کاش کہ آج زندہ ہوتے تو یقیناً آپ بھی ان سے مل کر بے حد خوش ہوتیں ۔ زاہد نے کہا "اچھا بیٹا برا نہ ماننا ۔ ایک بات تو بتاؤ ۔ تمہارے والد کرتے کیا تھے ؟"

"ڈاکٹر تھے" جواب ملا ۔

"کیا" ؟ اس کا سر چکرانے لگا ۔

"آنٹی ۔ وہ واقعی میں مسیحا تھے ۔ بیحد ہمدرد اور مخلص ، ایک باپ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ میرے بہترین دوست بھی تھے ۔ مصروفیات کی وجہ سے وہ مجھ سے گو ہمیشہ دور رہے ۔ مگر جب بھی ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا انھیں بہترین انسان پایا ۔ وہ ہمیشہ ..... مجھے چاند کہہ کر پکارتے تھے ۔ مجھے نہیں یاد کہ اس عرصہ میں کبھی ، انھوں نے مجھے میرے نام سے پکارا ہو ۔

اور اچانک یاسمین کو وہ رات یاد آگئی ۔ جب طاہر نے سرگوشیوں میں اس سے کہا تھا "یمی اگر ہماری بیٹی ہوئی تو اس کا نام تارہ رکھیں گے اور اگر بیٹا ۔ تو اس کو چاند کہہ کر پکاریں گے اور اس لمحے وہ شرم سے دوہری ہوگئی تھی ۔

"...... اور آنٹی یہ دیکھئے" زاہد کی آواز اسے حال میں لے آئی ۔ آج ہی صبح میں اپنی البم دیکھ رہا تھا تو اس میں ڈیڈی کی یہ تصویر نکلی جو میں نے اپنے پرس میں لگالی مارے تجسس کے وہ اٹھ کر ایک دم اس کے قریب چلی گئی ۔ اب تو کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش ہی نہ تھی ۔ اسے ایسا لگا کہ شوہر کی محبت ، وارفتگی ، خیال ، عشق سب ایک ایک کرکے ابھرتے جا رہے ہیں اور طاہر کی عظمت کا وہ بت جو تیس سال سے اس نے دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر رکھا تھا ۔ آج یک لخت چور چور ہوگیا ۔

گڈو رانی

(رضیہ بٹ)

وہ بچپن ہی سے انتہائی شرمیلی، کم گو، اور حساس تھی۔ حویلی میں درجن بھر بچوں میں اس کا وجود الگ تھلگ تھا۔ سُرخ و سفید گول مٹول سی بچی، جس کے بالوں کی رنگت اور آنکھوں کی گہرائیوں میں ٹوٹتے اندھیروں کی سیاہیاں تھیں۔ جو عام بچوں کی طرح شوخ و شنگ نہ تھی۔ جو کبھی کبھی چیخ چیخ کر روتی نہ تھی۔ ضد نہ کرتی تھی گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختی نہیں تھی۔ کبھی ایڑیاں نہیں رگڑیں۔ کبھی زمین پر لوٹتے نہیں لئے۔ حالانکہ حویلی کے دوسرے بچوں کی یہ جانی پہچانی خاصیتیں تھیں۔ بچوں کا کیا دوش یہ تو بچپنے کے فطری تقاضے تھے لیکن گڈو رانی منفرد تھی۔ خوش ہوتی تو آنکھوں کی گہری سیاہیوں میں چاند سورج کی چمک اتر آتی۔ اور اداس ہوتی تو گھنگھور گھٹائیں آنکھوں کے اندھیروں میں سمٹ آتیں۔ لیکن یہ گھنگھور گھٹائیں کبھی برسی نہیں۔ آنکھوں میں جھلمل جھلمل کرتی رہتیں۔ اور دیکھنے والے کو اس پر بے ساختہ پیار آجاتا۔ گھنگھور گھٹائیں سمٹ آنے کے مواقع اکثر پیدا ہوتے رہتے۔ کوئی بچہ جب گڈو رانی سے زیادتی کرتا۔ اس کے حصے کی چیزیں اڑا لیتا۔ اسے کھیل سے نکال دیتا اس کی سنبھال سنبھال کر رکھی گڑیا کی چیزیں اُلٹ پلٹ کر دیتا۔ تو وہ بس آنکھوں میں آنسو بھر کر رہ جاتی۔ موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے آنسو دیکھ کر بڑوں کا دل پسیج جاتا۔

اور پھر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد ضرور پوچھتا۔

"کیا چھن گیا گڈو رانی۔ ؟"

اور گڈو رانی آنسو آنکھوں ہی آنکھوں میں پینے کی کوشش کرتے ہوئے اتنی پیاری لگتی کہ بے ساختہ اسے دل میں بٹھا لینے کی خواہش پیدا ہوتی۔ اس کی چیزیں چھیننے والے کی تو بس شامت آجاتی۔ خاص کر جب محمود بھیا گڈو رانی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیتے۔ تو بس بچوں کی خیر نہ ہوتی۔

ان دنوں محمود بھیا ایف اے میں پڑھا کرتے تھے۔ دادی اماں کے سب سے بڑے چہیتے ہونے کے ناطے یوں بھی بچوں کی فوج ظفر موج پر اُن کا بڑا رعب تھا۔ اس پر جب گڈو کی طرفداری ہوتی، تو خدا جانے انھیں اتنا غصہ کیونکر آجاتا۔ ان کی ایسی ہی حرکات سے تو بچے گڈو کے بیری سے ہوگئے تھے۔ ان کے سامنے تو گریہ مسکین بنے رہتے۔ لیکن جب وہ کالج یا کہیں باہر گئے ہوتے تو دل کی بھڑاس نکال لیتے۔

گڈو رانی بھی تو جان گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کے سامنے آنکھیں بھر لاتی وہ صرف یہی پوچھتے۔

"کیا چھن گیا گڈو رانی۔ ؟"

اور بس پھر گڈو رانی کے منہ سے الفاظ نکلنے کی دیر ہوتی کہ ڈنڈا ان کے ہاتھ میں چڑھ جاتا۔ اور اس وقت تک خلاصی نہ ہوتی، جب تک گڈو رانی کی آنکھوں کی گھنگھور گھٹائیں چھٹ نہ جاتیں۔ اور اس کی آنکھوں کے اندر چمک نہ اٹھتے۔

وہ تو بچوں نے اس دن خدا کا شکر ادا کیا، جب محمود بھیا نے بی اے کا داخلہ لاہور میں لے لیا اور پھر تعلیمی سلسلوں میں باہر ہی رہنے لگے۔

وقت گزرتا گیا۔ حویلی کی رونقیں گھٹتی گئیں۔ خالد چچا ایران چلے گئے۔ آمنہ پھوپھو کراچی میں آباد ہوگئیں۔ بڑے تایا کا کاروبار پنڈی میں شروع ہوگیا سلیمہ لاہور آ گئیں۔ دادی اماں اور بڑی چچی ہی رہ گئیں۔ گڈو رانی بھی اپنے والدین کے ساتھ نوکریوں کے سلسلے میں شہر شہر گھومتی پھری۔ کبھی کبھار چھٹیوں میں حویلی میں زندگی پیدا ہو جاتی۔ لیکن یہ کبھی نہ ہوا کہ سارا کنبہ قبیلہ پہلے کی طرح اکٹھا ہو گیا ہو۔ کبھی ایک آیا اور دوسرا چلا گیا۔ یہاں ہی ہوتا رہا۔

اور

دس سال گزر گئے۔ ننھے منے بچے جوان ہو گئے۔ چھ سات سالہ گڈو بھی سولہ سترہ سالہ دوشیزہ کا روپ دھار گئی۔ لیکن عادت اب بھی وہی تھی۔ خوشی اور غم کا تاثر اس کی آنکھوں سے مترشح ہوتا تھا۔ کبھی چاند سورج چمک جاتے اور کبھی گھنگھور گھٹائیں آ جاتیں۔

ان دنوں وہ پورے دو ماہ کے لئے دادی اماں کے پاس آئی تھی۔

چھٹیاں یہیں گزارنا تھیں۔ پہلے پہلے تو دل نہ لگا۔ لیکن جب خالہ بچی اپنے بھرے پُرے خاندان کے ساتھ آ گئے اور سلیمہ آپا بھی اپنی دو جوان بیٹیوں کے ساتھ پہنچ گئیں تو رنو اور شاداں کی قربت میں وقت خوب گذرنے لگا۔ خالہ بچا کا بیٹا عثمان اب چھ فٹ کا گرانڈیل آدمی بن گیا تھا۔ گڈو رانی کو اب بھی ویسے ہی چھیڑتا جیسے بچپن میں۔

تینوں اکثر بچپن کے ان دنوں کو یاد کیا کرتے تھے۔ عمو بھیا سے پٹائی یاد کر کے عثمان کان پکڑ لیتا۔ "میرے تو کان ہی لمبے کر دیئے عمو بھیا نے کھینچ کھینچ کر۔"

"آپ کونسا باز آ گئے۔" گڈو رانی مسکرا کر کہتی۔ "اب بھی اسی طرح ستاتے ہو۔"

"عمو بھیا جو نہیں ہیں یہاں۔ اللہ قسم بچپن کا ایسا خوف دل میں بیٹھا ہے کہ عمو بھیا اب بھی آ جائیں تو ان کے سامنے آپ کو چھیڑنا ستانا تو رہا ایک طرف میں تو آپ کی طرف دیکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکوں گا۔"

گڈو رانی بڑے فخر سے مسکرا دیتی، اور اس کی یادوں میں ننھے منے چراغ جل اٹھتے۔ دھیمی دھیمی لو میں کتنی فرحت بخش گدگداہٹیں ہوتیں۔

عمو بھیا کتنے اچھے تھے، ان کی اچھائی اس کے ذہن کے کسی گوشے میں چپک گئی تھی۔ اور لاشعوری طور پر اسے یوں لگتا۔ جیسے وہ اس کے لئے بہت بڑا سہارا ہیں۔ گو انہیں دیکھے مدتیں ہو گئیں تھیں۔ دس سالوں میں بمشکل تین چار بار دیکھا تھا۔ وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے، لیکن وقت اور فاصلے کوئی کمی نہ رکھتے تھے۔

ان دنوں اس کا جی بے طرح چاہتا کہ عمو بھیا آئیں، عثمان اسے ستائے اور وہ اسی اپنائیت سے پوچھیں "کیا ہوا گڈو رانی؟"

اور پھر ––– وہ مسکرانے لگتی۔ عثمان کے کان ویسے ہی بڑے بڑے تھے لیکن اسے یوں لگتا جیسے عمو بھیا نے واقعی اس کے کان کھینچ کھینچ کر لمبے کر دیئے ہیں۔

گڈو رانی ابھی حویلی ہی میں تھی کہ تائی اماں پنڈی سے آ گئیں۔ اور یہ سن کر بے پایاں مسرت ہوئی کہ عمو بھیا بھی آ رہے ہیں۔ یہ نوید اس نے بڑے فخر سے عثمان کو سنائی۔

"عمو بھیا آ رہے ہیں ذرا ہٹ کے رہئے گا۔ سمجھے!"

"ہوں آپ بھی سن لیجئے گا۔ ان کے سامنے بہت بننے کا نہیں۔ ورنہ عمو بھیا نے کے بعد گن گن کر بدلے اسی طرح لئے جائیں گے۔ جس طرح دس بارہ سال پہلے۔ سمجھیں۔"

عمو بھیا آ گئے۔ گڈو تو انہیں دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ کچھ یہی حال عمو بھیا کا بھی ہوا۔ چھ سات سالہ بچی۔ سولہ سترہ سال لڑکی کے پیکر میں ڈھل گئی تھی۔

گڈو رانی کا جی چاہتا، بچپن کے بیتے دن پھر سے لوٹ آئیں۔ لیکن اس نے دیکھا عمو بھیا اس سے دور دور رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور عثمان بھی اس کے قریب پھٹکتا نہیں تھا۔ وہ تو عمو بھیا سے ڈرتا تھا۔ لیکن عمو بھیا کس سے ڈرتے تھے۔

بھولی بھالی معصوم سی گڈو رانی کو بھلا کون سمجھاتا کہ عمو بھیا تو ان دنوں اپنے آپ سے ڈرنے لگے ہیں۔ اسے دیکھ کر تو وہ عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ انہیں تو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے گڈو رانی ان کی زندگی کی پہلی اور آخری خواہش ہے۔

لیکن اس خواہش کا اظہار نہ کر سکتے تھے۔ اماں اور دادی اماں نے تو ان کی نسبت صوفیہ سے ٹھہرا دی تھی۔ صوفیہ جس نے اسی سال ایم اے کیا تھا۔ اور جو چوبیس سالہ پختہ شعور والی لڑکی تھی۔ عمر، تعلیم اور ذہنی ہم آہنگی ہی کی بنا پر عمو بھیا نے چھ ماہ پہلے اس رشتے کے لئے رضامندی دے دی تھی۔ اب اماں منگنی کے لئے آئی تھیں۔ صوفیہ کے والدین نکاح کے لئے اصرار کر رہے تھے۔ اقرار اور اصرار کا سلسلہ چل رہا تھا۔

عمو بھیا کے اندر ہی اندر کوئی جذبہ چیختا تھا۔ انہیں انکار کے لئے اکساتا تھا۔

لیکن یہ جذبہ خوف کی جن تہوں میں لپٹا تھا۔ وہ اس سے چھٹکارا بھی نہ پا سکتے تھے۔ گڈو رانی ان سے دس سالہ چھوٹی تھی۔ لاشعور میں یہ چھ سات سالہ بچی کا احساس اب تک زندہ تھا۔ شعوری اور لاشعوری تقاضوں نے اتنی بے رحمی سے عمو بھیا پر وار کئے کہ وہ بوکھلا گئے۔ گڈو رانی کی معصومیت اور بھولپن نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اپنے شعوری تقاضے کا گلا گھونٹ دیں۔ یہ آسان عمل نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اس سے گذر ہی گئے۔ اس دن انھوں نے اماں سے کہہ دیا۔

"اسی ہفتے نکاح کی تاریخ رکھ لیں۔ اماں۔ میری چھٹی ختم ہو رہی ہے۔"

وقت کم تھا۔ اماں جو دھوم دھام سے بڑے بیٹے کے نکاح کی رسم کرنا چاہتی تھیں۔ مجبور ہو گئیں۔ گھر کے بڑے بڑے فرد جمع ہوئے۔ عمو بھیا دولہا بنے اور نکاح کی رسم کے لئے چھ سات مردوں اور پانچ چھ عورتوں کے ساتھ صوفیہ کے ہاں چل دیئے۔

سارا دن گہما گہمی رہی ۔ لوگوں کا شور، شہنائیوں کی گونج اور رنگ برنگے باسنوں کی چمک سے عمو بھیا گھبرا گھبرا گئے ۔ سارا وقت یہی احساس ڈستا رہا کہ کوئی غلط قدم اٹھا لیا ہے ۔ کسی غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں ۔

شام گہری ہو رہی تھی ۔ جب شادیاں قافلہ لئے بیٹے عمو بھیا کے ساتھ حویلی واپس آیا مبارک سلامت سے فضا گونج اٹھی ، حویلی کی نوکرانیوں نے گرا ڈالا ۔ رفوا درشادیاں نے ڈھولک بجائی گیت گائے ۔ اماں اور دادی اماں خوشی سے جھوم جھوم گئیں ۔

عمو بھیا سارے ہنگامے سے دامن چھڑا کر تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف آئے ۔ طلے اور پھولوں کے ہار گلے سے بیزاری سے اتارتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آئے ۔ لیکن دروازے ہی میں ٹھٹک گئے ۔

کمرہ برقی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا ۔ اور گڈو رانی ان کی تصویر کے سامنے کھڑی تھی ۔ شاید آہٹ ہوئی ۔ وہ ایک دم پلٹی ۔ عمو بھیا کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر جانے کیا ہوا ۔ ایک دم گھنگھور گھٹائیں سمٹ آئیں ۔ اور حسین آنکھوں کے سیاہ اندھیرے جل تھل ہو گئے ۔ لمحے کے کوئی ہزارویں حصے میں دس سال سمٹ گئے ۔ عمو بھیا جلدی سے آگے بڑھے اور بے ساختہ بولے ۔

"کیا چھن ــــ"

لیکن وہ اس سے آگے نہ بول سکے ۔ گھنگھور گھٹائیں پھٹ کر برسنے لگیں ۔ بھیگا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے گڈو رانی کمرے سے باہر بھاگ گئی تھی ۔

"کیا چھن گیا گڈو رانی" عمو بھیا کیسے فقرہ مکمل کرتے ، وہاں تو کچھ بچا ہی نہیں تھا ۔

عمو بھیا نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دونوں ہاتھ سختی سے اپنے کانوں پر رکھ لیے مبادا اپنی چیخ سے کانوں کے پردے نہ پھٹ جائیں ۔

لکھنؤ اپنی تہذیب و تمدن

کے لئے سارے ہندوستان ہی میں نہیں ساری دنیا میں مشہور تھا لیکن افسوس کہ انقلابات زمانہ نے لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کو خاک میں ملا دیا ۔ آج اس تہذیب کا ذکر صرف کتابوں میں ہی پڑھا جا سکتا ہے ۔ لوگ آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس تہذیب و تمدن کو دیکھیں اور لکھنوی لوگوں کی شیریں زبانی سے لطف اندوز ہوں ۔ لیکن اب اس زبان کے بولنے والے بھی نظر نہیں آتے جو حضرت "پہلے آپ پہلے آپ" کہا کرتے تھے ۔ اور اس مٹی ہوئی تہذیب و تمدن کے علمبردار کچھ رہ بھی گئے ہیں تو وہ گوشہ نشین ہیں اور ان تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا ۔ اپنا سب کچھ کھو کر اب وہ باہر نکلتے بھی شرماتے ہیں ۔ کیا عروج اور اب کیسا زوال ہے ۔

لیکن لکھنؤ میں جو چیزیں فنا نہ ہو سکیں وہ ہیں شاہی امام باڑے اور وہ کاریگر اور ہنرمند جو آج بھی اپنی کاریگری اور سبک دستی کے ایسے شاہکار پیش کر رہے ہیں جو آپ اپنی مثال ہیں ۔

چکن ، زردوزی ، کامدانی اور بادلے وغیرہ کے کام یہاں کے کاریگر ایسا کرتے ہیں کہ دیکھنے والے محو حیرت رہ جاتے ہیں ۔ لچکا ، گوٹہ ، پٹھا کرن اور ستارے وغیرہ کا کام بھی بیحد نفیس بنتا ہے ۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے

فرخندہ شمیم

کچھ عرصہ قبل جب مراد بھائی کی شادی شافعیہ سے ہوئی تو خاندان
بھر کے بزرگوں کا خیال تھا کہ نڈر بے باک اور چھیلا سا یہ لڑکا اپنی بیوی
کے پاؤں دھو دھو پیئے گا اور اس کے گرد یوں منڈلائے گا جیسے شہد
کے گرد مکھیاں... لیکن ہوا یوں کہ مراد بھائی اور شافعیہ بیگم پنچایت کی
امیدوں کے برعکس زیادہ میل جول نہ رکھ سکے۔ بزرگوں کو تشویش
ہوئی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ ایک کا خیال یہ تھا کہ قصور مراد کی بدمزاجی
کا ہے ورنہ شافعی بڑی ہموار سی لڑکی ہے جبکہ ایک کا قیاس تھا کہ شافعی
کا غرور حسن اسے کسی کو اپنے مدمقابل کھڑا نہیں ہونے دیتا تاہم کہنے
والے یک لخت چپ ہو رہے جب دونوں میاں بیوی یکا یک ایک دوسرے
کے اتنے قریب آگئے جیسے شیر شاہ اور شیر شاہ کا پل خوشی کے ساتھ حیرت
اور حیرت کے ساتھ فکرمندی بھی پیدا ہوئی کہ دونوں کی یہ اچانک الفت
کہیں پانی کا بلبلا ثابت نہ ہو لیکن سب وسوسے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے
جب چشم بینا نے مراد بھائی میں بے شمار خوبصورت تبدیلیاں ہوتی دیکھیں
ان کی تندی بدمزاجی ہولے ہولے محو ہونے لگی تھی تکبر سرنگوں ہو کر سعادتمندی
میں بدل گیا تھا وہ مراد بھائی جو راہ میں پڑی چیزوں کو ایک ٹھوکر سے توڑ
دیا کرتے تھے اب معمولی چمچے بھی فرش سے چننے لگے تھے وہ بڑے
[illegible] صورت اور فرشتہ سیرت ہو گئے تھے ہر بات پر دوسروں کا خیال کر
[illegible] والے وہ ہٹ دھرم سے مراد بھائی کچھ ایسے بدل گئے کہ گمان
[illegible] کسی بات پر رو دیئے گئے، ان کا غرور تکبر بے اعتنائی اور طنطنہ
سب ختم ہو گئے تھے۔

یہ کون کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا
یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آٹھ نو بجے صبح بستر سے اٹھنے والے
[illegible] منہ اندھیرے اٹھ بیٹھتے۔ غسل سے فارغ ہو کر باورچی خانے
[illegible] بنا کر شافعیہ بھابھی کی مسہری کے قریب
[illegible] پھر دوبارہ کچن میں گھس کر اپنا، بیگم اور بچوں کا ناشتہ
تیار کرتے اس کے بعد اپنے کپڑے استری کرتے اور ناشتہ کر کے دفتر
کی راہ لیتے۔ ہما نے بتایا بھابھی جان ہر دوسرے تیسرے روز ان سے کہتیں
کہ دفتر سے جلد لوٹ آنا۔ میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے جاؤں گی چنانچہ
بھیا ہاف ٹائم میں ہی گھر آجاتے اور بھابھی ان کے ہمراہ سیر کے لیے نکل جاتیں

ہما نے یہ انکشاف بھی کیا کہ بھابھی جان ہر ماہ اپنے اور بچوں کے
لئے ایک نیا سوٹ بنواتی ہیں جبکہ مراد بھائی کے پاس گنتی کے چار جوڑے
ہیں۔ کہنے والوں کی زبانی ہم نے یہ بھی سنا کہ دفتر سے آنے کے بعد مراد
بھائی رات کے کھانے اور پھر برتنوں کی صفائی میں بھی شافعیہ کا کام
ہلکا کرتے ہیں۔ وہ اگر برتن دھوئیں تو یہ فرش صاف کرتے ہیں وہ اگر
کپڑے دھوئیں تو یہ چھت پر پھیلا کر آتے ہیں وہ غسل کریں تو یہ ان کے
کپڑے استری کرتے ہیں۔ بلکہ اکثر تو بچوں کے پوتڑے بھی دھونے
بیٹھ جاتے ہیں کچن میں شافعیہ بیگم کا کام صرف اس قدر ہے کہ دیگچی میں
کفگیر چلاتی رہتی ہیں۔ ورنہ پیاز لہسن دھنیا اور سبزی وغیرہ کاٹنے
اور دیگچی میں ڈالنے کا کام مراد بھائی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود
غریب تھکاوٹ کا اظہار نہیں کر سکتے بلکہ رات کو سونے سے پیشتر
شافعی کو دودھ انڈا پھینٹ کر پلاتے ہیں کہ دن بھر کام کاج اور بچوں
کے جھنجھٹ سے تھک جاتی ہے آخر انسان ہے کوئی مشین نہیں

یہ سب باتیں سن کر ہمیں چند سال پہلے کے وہ مراد بھائی یاد
آگئے جو گھریلو کام کاج میں حصہ لینا مردانگی کے خلاف سمجھتے تھے
اور اس موضوع پر دھواں دھار تقریریں بھی کیا کرتے تھے۔ ہمیں
یاد ہے نغمہ نے ایک بار ان سے کہا کہ بھائی جان پلیز ایک گلاس
پانی دے دیجئے۔ ہانڈی میں مصالحہ جلا جاتا ہے لیکن مراد بھائی
ٹس سے مس نہ ہوئے اور چیخ کر بولے کہ یہ کام عورتوں کا ہے —
اٹھ کر خود پانی لے لو۔ ناچار نغمہ خود اٹھی اور پانی لے کر آئی یہ وہ
مراد بھائی تھے جو رفیع بھائی کا تمسخر اڑاتے تھے کہ مرد ہو کر عورتوں
کے کام کاج میں جتے رہتے ہو۔ یاد تم میں مردانگی بلکہ میں کہوں گا کہ

عزت کی کمی ہے۔ مانا کہ شیخ بھائی کی تمھاری نصیحت بہتر ہیں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم ان کے غلام بن جاؤ۔ اور پھر اس کے بعد انھوں نے رفیع بھائی کے سامنے مرد و زن کے حقوق و فرائض پر ایک لمبی چوڑی تقریر ہانک ڈالی جواب میں رفیع بھائی مسکرا کر صرف اس قدر بولے کہ "مراد شادی ہو لینے دو پھر پوچھوں گا۔

اور آج مراد بھائی کا حلیہ زبان حال سے رفیع بھائی کے الفاظ کی تصدیق کر رہا ہے آج ان کی حالت رفیع بھائی سے بھی بدتر ہے۔ رفیع بھائی نے کم از کم بچوں کے پوتڑے تو نہیں دھوئے تھے مراد بھائی سوئی ہوئی بیگم کا لحاف درست کر کے جب کپڑے پھیلانے چھت پر جاتے ہیں تو محلے کی عورتیں ناک پر انگلی دھرے انھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں۔

ایک شام مراد بھائی کی چھوٹی بہن ثمینہ سے تفصیل سے بات چیت ہوئی تو اس نے ان تمام تبدیلیوں کا پس منظر یوں بتایا کہ ایک صبح مراد بھائی کو دفتر سے دیر ہو گئی بھابی بہت دیر سے سو کر اٹھی تھیں اور ناشتہ تیار نہیں تھا مراد بھائی عادت کے مطابق جھنجھلائے تو بھابی نے فرائی پین تڑ سے زمین پر دے مارا اور بولیں" زیادہ غصہ دکھانے کی ضرورت نہیں تم اور میں اکٹھے پکچر سے لوٹے تھے۔ صبح اگر دیر ہو گئی تو قصور وار میں ہی نہیں تم بھی ہو۔

مراد بھائی بھلا اتنی باتیں سننے والے کہاں تھے۔ انھوں نے غصہ میں آ کر ناشتہ خود تیار کرنا شروع کر دیا۔ بھابی بھی تنکتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں مراد بھائی کا خیال تھا کہ احساس ہونے پر وہ دوبارہ کچن میں چلی آئیں گی لیکن بھابی تو اوڑھ لپیٹ کے سو چکی تھیں۔ اس کے بعد مراد بھائی کا یہ معمول ہو گیا کہ ہر صبح اپنا اور بیوی بچوں کا ناشتہ خود تیار کرتے بھابی نے صاف کہہ دیا تھا کہ صبح سویرے تمھاری یہ ڈانٹ پھٹکار مجھ سے نہیں سنی جاتی۔ ثمینہ تفصیلات بتاتی رہی اور ہم ہنستے رہے کچھ دیر بعد وہ پھر بولی۔

"ایک رات ہم سیر سپاٹے کے بعد تھکے ہارے گھر لوٹے تو جی چاہتا تھا کہ بستروں میں دبک جائیں اور گرما گرم کھانا سامنے پیش ہو جائے لیکن یہ فقط تصور تک محدود تھا کچھ دیر بعد میں اٹھی اور کھانے کی تیاری میں لگ گئی مراد بھائی نے دھیرے سے بھابی سے کہا کہ ثمینہ اکیلی کام کر رہی ہے کچھ تم بھی ہاتھ بٹا دو لیکن بھابی نے بڑے ناصحانہ انداز میں مراد بھائی کو سمجھایا

کہ لڑکی پرایا دھن ہے اسے بہرحال دوسرے گھر جانا ہوتا ہے، ثمینہ بھی اللہ رکھے پرائے گھر جائے گی، کام کاج یا گھرداری میں طاق نہ ہوئی تو لوگ طعنے مار مار کر تمھارا سینہ چھلنی کر دیں گے۔

ثمینہ نے کہا بھابی کی یہ بات سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی کہ ذرا بتائیں تو وہ خود گھرداری میں کتنی طاق ہیں؟ کتنے سگھڑاپے کا ثبوت دے رہی ہیں وہ پرائے گھر میں آ کر؟ ہم نے تو فقط ان کا اس قدر سلیقہ دیکھا ہے کہ سارا دن شور مچایا کرتی ہیں کہ "مراد ذرا منے کا پاجامہ بدل دو پلیز جلدی سے ننھی کا دودھ گرم کر لاؤ۔ بھوک سے بلک رہی ہے بھی ذرا ایک منٹ میں میری ساری استری کر دو دیر ہو رہی ہے مراد خدا جلدی سے یہ چیز کا سینڈوچ بنا دو، فنکشن لیٹ ہو رہا ہے اور سنو میرے آنے سے پہلے دال چاول پکا لینا۔ اللہ مراد جلدی سے انڈا بوائل کر دو گڈو کو اسکول کی دیر ہو رہی ہے" وغیرہ وغیرہ۔ ان حالات میں بھلا وہ دوسروں کو کیوں کر نصیحت کر سکتی ہیں اور پھر نکتہ یہ ہے کہ مراد بھائی نے ان کی یہ نصیحت ایسی گرہ میں باندھی کہ ہر کام مجھ سے کرانے لگے خواہ بڑے سے بڑا ہو یا معمولی سے معمولی ان کے خیال میں یہ تربیت نہ ہونے کی صورت میں میں سب کی ناک نیچی کرانے کا سبب بن جاؤں گی حالانکہ مقصود فقط یہ تھا کہ کسی طرح بھابی کو زیادہ سے زیادہ آرام ملے۔

ثمینہ نے قدرے توقف کیا تو ہم نے پوچھا کہ کیا بھابی والدین کے گھر بھی اتنی ہی کام چور تھیں۔ ثمینہ مسکرا دی اور بولی نہیں، وہاں وہ ہر ایک کا کام کرتی تھیں۔ والدین سے لے کر بہن بھائی پھر بھاوجوں کا بھی... لیکن یہاں وہ اس تمام مشقت کا خراج وصول کر رہی ہیں اور خراج دینے میں مراد بھائی پیش پیش ہیں۔ انھوں نے مراد بھائی میں ایک کمزوری دیکھ لی ہے اور وہ یہ کہ وہ انھیں بے حد چاہتے ہیں۔ اسی چاہت کو آزما کر وہ انھیں خوب تگنی کا ناچ نچا رہی ہیں

ثمینہ کی بات تو تمام ہو گئی لیکن ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اگر محبت میں شخصیتیں بدل ڈالنے کی قوت ہے تو پھر مراد بھائی کے والدین اور بہن بھائی ان کی لڑکیلی شخصیت بدلنے میں کیوں کامیاب نہ ہو سکے کیا وہ ان سے بے لوث محبت نہیں کرتے تھے۔ کیا ان کی چاہت میں کوئی کھوٹ تھا۔ کیا ان کا پیار اخلاص سے خالی تھا؟ ان تمام سوالات کے جواب نفی میں مل رہے تھے۔ آخر یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ بیوی

یہ یقینا کوئی [illegible] جو اپنے طلسم میں شوہر کو محصور کر دیتا ہے
دوسرا سوال یہ کہ بعض شوہر کے معنی سعادت کے ہیں یا حاکم کے؟
واقعہ یہ ہے کہ میاں بیوی میں سے کوئی ایک دوسرے کا غلام نہیں ہوتا۔
بلکہ دونوں ایک دوسرے کے مددگار ہیں راہ حیات میں ساتھ ساتھ چلنے والے دو ہم سفر۔

ضروری باتیں

(۱) ۲۰ تاریخ تک پرچہ حریم کا انتظار کرنے کے بعد ہی شکایت لکھیے لیکن ۳۰ سے پہلے ہی لکھ دیجیے اس کے بعد کی گئی شکایتوں پر دوبارہ پرچہ ملنا یقینی نہیں ہوتا۔

(۲) جہاں تک ہو سالانہ قیمت منی آرڈر سے روانہ فرمائیں اس میں آپ کو تین روپیہ سے زیادہ کا فائدہ ہوگا۔

لڑکیاں

"الٰہی قہر" یا "رحمت ایزدی"

انیس حسنین

ابھی ابھی ایک تعزیت سے لوٹی ہوں اور کپڑے وغیرہ بدل کر سونے کے لیے لیٹ گئی ہوں لیکن نیند آنکھوں سے غائب ہے محفل میں موجود ایک محترمہ کا یہ جملہ بار بار کانوں میں گونج رہا ہے .... اس کو تو بہت چھوٹا دیکھا تھا۔ لڑکیاں کچھ جلدی سے بڑی ہو بھی جاتی ہیں۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ لڑکیاں جلدی سے بڑی ہو جاتی ہیں؟ میرے خیال سے تو میڈیکل سائنس بھی اس بات کا نفی میں ہی جواب دے گی۔ یہ سچ ہے کہ عمر کے ابتدائی دور میں لڑکیوں کی باڑھ اپنے ہم عمر لڑکوں کے مقابلے میں جلدی ہوتی ہے مگر ایک خاص عمر تک پہونچنے کے بعد رک بھی جاتی ہے اور بعد میں لڑکے ہی زیادہ بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر اسی قسم کے جملے سننے کو ملتے ہیں؟ دراصل یہ ایک نفسیاتی نظریہ ہے جو لڑکی جلدی سے بڑی لگنے لگتی ہے۔ اور لڑکیوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی لمبائی کو دیکھ کر والدین کی آنکھوں میں ٹھنڈک پڑنے کے بجائے ماتھے پر فکر و تشویش کی لکیریں پڑ جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا بوجھ ہوتا ہے جو وقت بڑھنے کے ساتھ ساتھ بھاری ہوتا جاتا ہے۔ کوئی اس بوجھ کو ہنستے ہوئے اٹھاتا ہے اور کوئی گالی کوسنوں کے ساتھ۔ مگر اس بوجھ کے اتر جانے کے بعد سکون کی ٹھنڈی سانس ہر شخص لیتا ہے۔

دنیا کی ہر چیز خلق ہونے کے بعد اپنے خالق کے لیے خوشی کا باعث ہوتی ہے مگر "لڑکی" دنیا کی وہ واحد مخلوق ہے جس کے بارے میں بزرگوں کا قول ہے کہ یہ اپنے [illegible] کا قرض سے اٹھا ہوا سر جھکا دیتی ہے۔ ولادت کا فرشتہ بھی خوش

سے دو چار ہوتے لوگوں میں سے جب کوئی شخص پوچھتا ہے کہ بھئی کیا ہوا اور جواب میں "لڑکی" کا لفظ سنتا ہے تو اس ایک لفظ کی نہ جانے کیا تاثیر ہوتی ہے کہ اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ دل میں مبارکباد کے جملے گھٹنے لگتے ہیں اور "لڑکے" کا لفظ سننے کو بے چین کان میں لڑکی پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو اپنی سماعت پر بھی شک ہونے لگتا ہے اور ایک دفعہ پھر سے تصدیق کرنے کے لیے پوچھا جاتا ہے "کیا کہا لڑکی ہوئی ہے؟" اور پھر ماں کے سامنے ہمدردی کے چند الفاظ کہنا بھی اپنا فرض اولیں سمجھا جاتا ہے: "ارے تو کیا ہوا لڑکی لڑکے سے کچھ نہیں ہوتا اور پھر لڑکیاں تو خدا کی رحمت ہوتی ہیں ..." مگر چہرے کے پل پل بدلتے ہوئے تاثرات چیخ چیخ کر بولنے لگتے ہیں: "تم بڑی بدقسمت ہو جو لڑکی پیدا ہوئی ہے، ارے اسے خدا کی رحمت نہ سمجھنا۔ یہ الٰہی قہر ہے۔"

کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ یہ افسوس، یہ ہمدردیاں اس لیے نہیں کہ لڑکی سے کوئی بغض للٰہی ہے بلکہ اس کے پیچھے اس دن کا تصور ہوتا ہے جب لڑکی بڑی ہو جائے گی اور ہر طرف سے آوازیں آنا شروع ہو جائیں گی: "اب اس کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں؟ ارے جوان لڑکی کو کب تک گھر میں بٹھائے رکھو گی؟ کیا لڑکی کو بڑھا کرکے شادی کرو گی؟"

لیکن اس قسم کی باتیں کرنے والوں سے کوئی یہ کہے کہ تمہارے بھی تو ماشاءاللہ لڑکے ہیں۔ اس غریب کی مشکل آسان کر دو تو بڑھ بڑھ کر بولیاں بولنے والوں کے منہ پر تالا پڑ جائے گا چہرے پر ناگواری کے تاثرات گویا اس بات کا اعلان کر دیں گے کہ اس کا ہمارے لڑکے کے ساتھ کیا جوڑ ہے، یہ اس کے قابل نہیں ہے۔ آج آٹھواں دسواں پاس لڑکوں کے والدین سے اگر کوئی پوچھے کہ یہ جو تم بی، اے، ایم، اے پاس بہو ڈھونڈ کر لائی ہو تو کیا تمہارا لڑکا اس کے قابل تھا؟ کیا یہ لڑکی کے والدین کی انتہا درجہ کی مجبوری نہیں ہے جو وہ یہ سب کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں؟ کیا لڑکی کی صورت میں خدا اپنے بندوں کا ایک سخت امتحان نہیں لے رہا ہے؟ آج کتنے فیصد والدین اپنے اس امتحان میں بخیر و خوبی کامیاب

ہو پا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ سب کچھ سمجھتے ہوئے، سب کچھ دیکھتے ہوئے اور کبھی کبھی تو اپنی ہی لڑکی کی دفعہ انتہائی تلخ تجربے ہو جانے کے بعد بھی جب اپنے لڑکے کی شادی کا وقت آتا ہو تو پچھلی تمام تلخیاں فراموش کرکے نئے سرے سے سازشیں مرتب کی جانے لگتی ہیں۔

آج ہر لڑکی کے والدین کو لڑکوں کی قلت کا شکوہ ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ ہو پھر اس قلت کا شکوہ کیوں؟ کیا کبھی آپ نے گہرائی سے اس بات پر سوچا ہے؟ حقیقتاً لڑکوں کی کمی نہیں ہے بلکہ والدین کی وہ تربیت ہے جو وہ اپنے لڑکوں کو دیتے ہیں۔ ان کے پیدا ہوتے ہی بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر لی جاتی ہیں، لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی ناقدری ہوتی ہے۔ موقع بے موقع لڑکوں کی غلط طرفداری کرکے لڑکیاں پیچھے تک جاتی ہیں۔ یہ سبھی باتیں تھوڑے ہی عرصہ میں اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ لڑکے اپنی غلطیاں بھی بہن پر تھوپنے لگتے ہیں اور بہن کی فریاد سنے بغیر اس کی پٹائی ہوتے دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نو۔ نو۔ دس۔ دس سال کے لڑکے اپنے سے دس بارہ سال بڑی بہنوں سے کہتے سنے جاتے ہیں کہ "تم کیا کرو گی؟ میں تو بڑا ہو کر امی ابا کو کما کر کھلاؤں گا۔ تم تو گھر کا بھی سب سامان سمیٹ لے جاؤ گی۔" اور بڑی بہنوں کی شان میں گستاخی کرنے کی سزا ملنے کے بجائے والدین کے چہرے پر فخر کی مسکراہٹ ناچنے لگتی ہے۔ "کتنا ذہین ہے ان کا بیٹا، کتنی صحیح بات کہہ رہا ہے۔"

بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات ہے لیکن اگر اس کا نفسیاتی پہلو دیکھئے تو اس سے لڑکی کے دل میں شروع سے ہی ایک احساس گھر کر لیتا ہے کہ میں اپنے والدین کے لیے کچھ نہیں کر سکتی، میں ان کے لیے پریشانیوں کا باعث ہوں۔ اور یہی محرومی کا خیال لڑکی کو کسی خود سری پر آمادہ نہیں کر پاتا اور وہ چپ چاپ سر جھکائے رخصتی چلی جاتی ہے۔ شاید اسی طرح وہ اپنے والدین کے گھر یا معاشرے میں کوئی مقام حاصل کرکے ہر کامیابی کے بعد کچھ دیر ہی کے لیے سہی لوگوں کی نظروں کی

سرزنش سے محفوظ ہو کے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ لڑکے اور لڑکیوں کے امتحانات کے نتیجوں پر نگاہ ڈالیے تو ہر دفعہ پاس ہونے والوں میں لڑکیوں کا ہی نمبر بڑھا ہوا نظر آئے گا لڑکیاں تو بقول بزرگوں کے بلا ضرورت پڑھے جاتی ہیں اور لڑکے ۔ کوئی انٹر پاس تو کوئی بی ۔ اے نہیں ۔ ایسی حالت میں وہ ۔ جو بہت اچھے نکل جاتے ہیں ، جو ذہین ہوتے ہیں ۔ جو سندیں حاصل کر لیتے ہیں ان کی قیمتیں بھی اس حساب سے بڑھ جاتی ہیں ۔ اگر لڑکا ... ڈاکٹر ہے تو ضروری ہے کہ لڑکی تعلیم یافتہ بھی ہو ۔ خوبصورت بھی ہو اور ساتھ میں خاندان بھی شریف اور معقول ہو ۔ ایسی حالت میں چند خوش قسمت لڑکیوں کے علاوہ سبھی کا جرمول کے بھاؤ بکتی ہیں ۔

ایک دوسرا حربہ بھی والدین کے پاس محفوظ ہے اور یہ کہ لڑکیوں کو زیادہ نہ پڑھاؤ تاکہ ان سے زیادہ پڑھے شوہر آسانی سے مل سکیں ۔ یعنی یہاں بھی لڑکی پر ہی ظلم ۔ لڑکوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیوں نہ کرو جو وہ زیادہ پڑھیں اس سلسلہ میں تو دوسری ہی بات سننے کو ملتی ہے کہ پڑھائی میں دل نہیں لگا تو فلاں کام سے لگا دیا ۔ اگر آج لڑکے تعداد میں لڑکیوں کے برابر ہی پڑھ جائیں تو بہت حد تک یہ مسئلہ سلجھ سکتا ہے ۔

آج سب سے بڑی اور سب سے اہم لعنت جہیز کی ہے ۔ گو ہر طرف اس کے خلاف آوازیں اٹھائی جا رہی ہیں ۔ نت نئے نئے مضامین نکل رہے ہیں قانون بنائے جا رہے ہیں ، اسکولوں کالجوں میں باقاعدہ طور پر طلبا سے لکھوایا جا رہا ہے لیکن یہ پہاڑ نہ تو ہزاروں ٹھوکروں کے باوجود ٹوٹا ہے نہ اس میں ذرہ برابر جنبش ہی ہوئی ہے ۔ بلکہ مہنگائی کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے ۔ اس کو دلہن کے ساتھ نہ دے کر پہلے سے ہی روانہ کر دیا جاتا ہے ، سجے سجائے گھر مع دنیا کے لوازمات کے دولہن کے لیے پہلے سے ہی تیار کر دیئے جاتے ہیں اور بھری برادری کے بیچ دلہن خالی ہاتھ رخصت کر دی جاتی ہے ۔ لوگوں میں واہ واہ بھی ہو جاتی ہے اور ساتھ میں بظاہر کانوں کی پذیرائی بھی ۔ مگر اس کا سارا الزام لڑکیوں کے والدین کو ہی دیا جائے گا ؟ لڑکے اس معاملے میں کیا بالکل بے قصور ہیں ؟ میرے خیال میں تو بغیر لڑکوں کے اس سازش میں شریک ہوئے ، یہ بزنس چل ہی نہیں سکتا ۔ آجکل اکثر لڑکے شادی سے پہلے کہتے سنے جاتے ہیں کہ انہیں جہیز نہیں چاہیئے مگر بہت سی بہنیں جانتی ہوں گی کہ شادی کے بعد کس طرح ایک ایک چیز کا مذاق اڑایا جاتا ہے زیورات کو ہاتھوں پر تول تول کر وزن کا اندازہ کیا جاتا ہے مختلف چیزوں کے داموں کا اندازہ لگانے کے لیے کیسی کیسی چالیں چلی جاتی ہیں ۔ اور کتنی ہی چیزوں کے متعلق سنایا جاتا ہے کہ فلاں چیز کے بجائے فلاں چیز زیادہ مفید و موزوں رہتی ہے ۔ ایسی حالت میں کیا یہ دل نہیں چاہتا کہ لڑکوں سے سوال کیا جائے کہ تمہیں تو جہیز نہیں چاہیئے تھا پھر جہیز کے سلسلہ میں یہ نکتہ چینیاں کیوں ؟ اچھا یا برا جو کچھ بھی ہے لڑکی کے والدین نے اپنی بیٹی کو دیا ہے اس میں تمہارا دخل کیوں ؟ اگر پہلے یہ کہنے کی ہمت کی تھی کہ جہیز نہیں چاہیئے تو آج ان نکتہ چینی کرنے والوں کا منھ توڑ جواب کیوں نہیں دیتے ؟ کیا تم نے دوسروں کے کندھوں پر رکھ کر بندوق چلائی تھی ؟ میرے خیال میں تو اگر لڑکے چاہیں تو ضد کر کے غصہ کر کے ، یا خوشامد کر کے ، اپنے گھر کو جہیز جیسی لعنت سے پاک رکھ سکتے ہیں ۔ اس کے لیے صرف تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے ۔ چند ایسے سورماؤں کی ضرورت ہے جو اس راہ پر آگے بڑھیں پھر پیچھے مڑ کر دیکھیں گے تو اک جہاں ان کی تقلید میں گامزن نظر آئے گا ۔

حریمی دسترخوان

رس ملائی

آپ گھر میں بھی رس ملائی بنا سکتی ہیں اور اس کے لئے آپ کو زیادہ محنت بھی نہ کرنا پڑے گی۔ کھانے کے بعد کوئی نہ کوئی میٹھی چیز ہر گھر میں پسند کی جاتی ہے۔ کسی دن رس ملائی بنا کر نوش فرمائیں۔

سامان

پاؤڈر کا دودھ (لیکٹوجن ہو تو زیادہ بہتر ہے) چائے کی ایک پیالی بھر۔ انڈا ایک۔ میدہ چائے کے دو چمچے۔ تازہ دودھ تقریباً ۷۵۰ گرام۔ شکر ۵۰۰ گرام۔ روح کیوڑہ چائے کا ایک چمچہ۔ اگر روح کیوڑہ نہ ہو، معمولی کیوڑہ ہو تو زیادہ۔ بیکنگ پوڈر (تمام بڑے اسٹورس میں ملتا ہے۔) چائے کا ایک چمچہ۔

ترکیب :-

میدہ، پوڈر ملک اور بیکنگ پوڈر کو ملا کر ایک جان کرلیں۔ انڈے کو توڑ کر پھینٹیں اور میدے وغیرہ کے سفوف میں ڈال کر گوندھیں اور چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر رکھ لیں۔ اب دودھ کو ہلکی آنچ پر اس طرح پکائیں کہ نصف رہ جائے۔ اس کے بعد شکر میں چند چمچے پانی ڈال کر تیز آنچ پر پکائیں۔ شکر صاف کرنے کے لئے دو چمچے دودھ ڈالدیں۔ میل کٹ جائے گا جب شکر کے قوام میں بلبلے چھوٹنے لگیں تو اسے چھلنے سے چھان کر دودھ میں ملالیں اور پھر تھوڑی دیر پکا کر میدے اور پوڈر ملک کی گولیوں کو ہتھیلی پر رکھ کر چپٹا کریں اور آنچ ہلکی کر کے دودھ میں ڈالتی جائیں۔ ٹکیاں پھول جائیں تو آگ سے اتار کر رکھ لیں۔ ٹھنڈی ہو جانے پر روح کیوڑہ چھڑک کر ریفریجریٹر میں نیچے رکھدیں تاکہ خوب ٹھنڈی ہو جائیں۔ اس کے بعد نوش فرمائیں۔

اگر ریفریجریٹر آپ کے گھر میں نہیں ہے تو آپ کسی بھگونے یا تھالی میں رکھ کر ڈھنک دیں۔ اور دو کلو برف منگا کر تھالی کو اس پر رکھدیں تاکہ ٹھنڈی ہو جائے۔ ٹھنڈے ہو جانے سے رس ملائی زیادہ لذیذ معلوم ہوتی ہے۔ ویسے بغیر سرد کے بھی نوش فرما سکتی ہیں۔

جواب طلب امور کے لئے لفافہ یا جوابی پوسٹ کارڈ روانہ کیجئے۔

اقوال زریں

۱۔ چار نیکیاں افضل ترین ہیں۔

۱۔ غصے کی حالت میں درگذر کرنا۔ ۲۔ تنہائی میں پارسا رہنا۔ ۳۔ تنگدستی میں سخاوت کرنا۔ ۴۔ طاقت رکھنے پر بھی انکساری کرنا۔

(لقمان)

۲۔ زندگی بہت مختصر ہوتی ہے، لیکن تنگدستی اور مصیبت میں بہت طویل بن جاتی ہے۔ (افلاطون)

۳۔ لگن اور اعتماد انسان کو کامیابی سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔

۴۔ زیادہ بولنے سے انسان اپنی قدر کھو دیتا ہے اور زیادہ خاموشی سے گمراہی کا احتمال ہوتا ہے۔

۵۔ دولت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس سے عزت و آبرو کو قائم رکھا جائے۔ (امام حسینؓ)

۶۔ عقلمند کا منہ اس کے رازوں کی بہترین تجوری ہے۔ (ٹیپو سلطان)

۷۔ دنیا میں سب سے بڑا گناہ کسی کا دل دکھانا ہے۔ (برنارڈ شا)

مرسلہ:۔ فرزین صادق کاظمی

۱۔ اپنے عیبوں کی فہرست اپنے دشمنوں سے حاصل کرو اور انہیں ترک کرنے کی کوشش کرو۔

۲۔ سب سے قیمتی جائداد اچھا چال چلن ہے۔

۳۔ اپنے امکان بھر ایسی کوئی صورت پیدا نہ کرو جس سے دلوں میں فرق پیدا ہو سکے۔

۴۔ عورت کا اصلی گھر اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔ ماں باپ کا گھر ایک درسگاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۵۔ شوہر پر بیوی کے یقیناً بہت سے حقوق ہوتے ہیں، لیکن ان کا طلب کرنا خاوند کی زندگی سے اپنے کو جدا کرنا ہے۔

۶۔ خاوند یا اس کے گھر والوں کی خدمت کر کے احسان نہ جتاؤ۔ اس لئے کہ تمہارا خاوند بھی تمہارے لئے سخت محنت کرتا ہے۔

مرسلہ:۔ صواتی صبیحہ ہاشمی (آمبور)

نمبر خریداری۔ ہر اس کاغذ پر پتہ کے ساتھ لکھا جاتا ہے جس میں لپیٹ کر حریم روانہ کیا جاتا ہے۔ اس نمبر کو احتیاط سے نوٹ کر کے اپنے پاس رکھ لیں وہ ہر طرح کی خط و کتابت میں اسے لکھنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ شعر پہلے سے مقررہ عنوان کے تحت ہو، موزوں، معیاری اور سنجیدہ ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ ۱۵ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے۔ اس سلسلہ میں کوئی خط و کتابت نہیں کی جاتی۔ ——— (ادارہ)

"دسمبر کے لئے عنوان "بے پردہ" اور جنوری سنہ ۸۱ء کے لئے "دشمن"

بت کو تہذیب سے ہر بند سے آزاد کیا
کعبے کے صنم خانے میں آباد کیا

مرسلہ:- صوفی صبیحہ ہاشمی (آمبور)

فرائض آشنا کر دے الٰہی اہل ملت کو
الٰہی دید کعبہ کا عطا کر شوق امت کو

مرسلہ:- ناہید مرزا صبیحہ مرزا (سیہور)

میں لے کے کعبہ تک کے جھکائی جبیں
وہ ترا سنگ در ہو تو میں کیا کروں

مرسلہ:- مس وحیدہ فضلی (رامپور)

اللہ رے گمرہی، بت و بتخانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

مرسلہ:- فصیحہ جنید (سگولی)

ایک جلوہ دیر و کعبہ میں نظر آیا مجھے
ناز جب حسن بتاں کا آشکارا ہو چکا

مرسلہ:- مس کہکشاں اختر (چمپارن)

کعبہ ہے یہاں دیوانگی تو حسن ایماں ہے
کربلا میں دامن ہوش کا چھوٹا تو سب چھوٹا

مرسلہ:- صبیحہ سلطانہ صبا (چھپرہ)

خدا جانے کہاں ہے اصغر دیوانہ برسوں سے
[illegible] کعبہ [illegible] سے

مرسلہ:- شہناز مجاہد (دائرہ)

سدھارے شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

مرسلہ:- وی۔ آر تسنیم بیگم (وانمباڑی)

کعبہ میں دررد آپ کو لایا ہوں کھینچ کر
دل سے گیا نہیں ہے خیال بتاں ہنوز

مرسلہ:- سروری خانم (میسور)

مجبوری میں ہم افسردہ دل، آنسو بہاتے ہیں
دطن سے سوئے کعبہ قافلے جب حج کو جاتے ہیں

مرسلہ:- قمر لطیف نگار سلطانہ جلیلی (آمبور)

مری مانو کسی کا دل نہ توڑو
یہ کعبہ ہے، صنم خانہ نہیں ہے

مرسلہ:- مس نکہت مسعود فریدہ (کلیان)

مرسلہ:- پی۔ آر تسنیم بیگم۔ (وانمباڑی)

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

مرسلہ:- فیروزہ یوسف (بیمادہ)

حاجیو آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے کعبے کا کعبہ دیکھو

مرسلہ:- صوفیہ مظفر (جمشید پور)

کعبہ اگر چہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

مرسلہ:- فرح دیبا شاہین (امروہہ)

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

مرسلہ:- ممتاز بانو (یادگیر)

چند زیرِ طبع ناول

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کی مرسلہ صرف ایک خبر ہر ماہ شائع کی جاتی ہے۔ خبر ولادت، شادی اور انتقال کے متعلق ہو۔ مختصر الفاظ میں صاف صاف لکھی گئی ہو اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ، نمبر خریداری کے ساتھ بھیجی گئی ہو۔ ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہونے والی خبریں ایک ماہ تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔ خبروں کی کتابت کی کسی غلطی کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔ البتہ اطلاع ملنے پر دوسرے پرچے میں صحت شائع کر دی جائے گی۔

ولادت اطفال کی خبریں

• وائی سعیدہ، پے زین، ساجدہ و یاسمین (آمبور) ہماری پیاری پھوپھی دلشاد سلیم و پھوپھا محمد سلیم کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے ۱۳ ستمبر ۷۹ء بروز جمعرات بوقت صبح ½ ۸ بجے ایک پیاری سی گڑیا عطا فرمائی نام سعدیہ تسنیم رکھا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔

• میرے محترم دوست مختار احمد صاحب ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پی ایم جی آفس یو۔پی لکھنؤ کے فرزند دلبند شکیل احمد سلمہ اور نسرین شکیل سلمہا (کراچی) کے گلشن حیات میں ۲۸ ستمبر ۷۹ء کو اللہ پاک نے ایک کلی کھلائی۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب کرے۔

نسیم اسہونوی

• کوثر خانم کلکتہ، میری پیاری بہن کشور ابیب اور بہنوئی ابیب کے گلستان حیات میں پہلی بار ستمبر ۷۹ء کو بوقت صبح ۱ بج کر ۲۲ منٹ پر ایک معصوم کلی مسکرائی۔ نام عز الہ ابیب اور پیار کا نام صبا رکھا گیا۔ دعا ہے کہ ... کے زیر سایہ پروان چڑھے اور صاحب نصیب ہو۔

• مس ایم فرح بی اے (آگرہ) میری پیاری باجی فردوس شاہین ایم اے اور بہنوئی ... صاحب ... ایم اے کو اللہ تعالیٰ نے ۲۷ ستمبر ۷۹ء کو بوقت ۹ بجے شب ایک حسین فرزند عطا فرمایا پیار

کا نام فیضی قرار پایا۔ دعا ہے کہ نومولود اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• فرخندہ قاضی۔ آپ کے حریم کی خریدار آپا آصفہ اور بہنوئی بھائی احمد فنکاری کے گلشن حیات میں اللہ تعالیٰ نے پہلی بار ۲۲ ستمبر ۷۹ء بوقت ½ ۲ بجے دن ایک کلی کھلائی (نام پڑھا نہ جا سکا) اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسے اپنے والدین کے سایہ عاطفت میں پروان چڑھائے۔

• محترم بھائی عطاء الرحمٰن صاحب ریٹائرڈ ایگزیکیٹو افسر (پٹنہ) کی صاحبزادی عزیزی فرزانہ سلمہ کو اللہ پاک نے ۱۴ اکتوبر کی شب میں ۳ بج کر ۲۳ منٹ پر ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ مبارک کرے اور نومولود اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔ نسیم اسہونوی

پیغامات نشاط

• شاہدہ پروین (چکولیہ) میرے چچا ڈاکٹر مصباح الرحمٰن کی دونوں صاحبزادیوں زیبا رحمٰن اور سیما رحمٰن کے عقد نکاح میرے سگے بھائی... مقصود الرحمٰن اور میرے چچا زاد بھائی ڈاکٹر جمیل الرحمٰن کے ساتھ ۱۲ ستمبر ۷۹ء کی شب میں بمقام رانچی، بخیر و خوبی انجام پائے اللہ پاک دونوں جوڑیوں کو سدا شاد و خرم رکھے۔ آمین۔

• والدہ صاحبہ شرف جہاں (محی الدین پور) نے اپنی دختر نیک اختر شرف جہاں سلمہا کی شادی کے سلسلے میں خصوصی دعوت نامہ بھیجا۔ لیکن افسوس کہ میں آخری ہفتہ ستمبر سے اپنی شدید علالت کے باعث دفتر تک نہیں جا سکتا۔ کافی دنوں حالت نازک رہی۔ بہرحال میں... مبارکباد پیش کرتا ہوں شرف سلمہا کی شادی شوکت محمود کان پوری کے ساتھ۔ ۲ اکتوبر ۷۹ء کو بخیر و خوبی بمقام محی الدین پور عمل میں آگئی ہوگی۔ (نسیم اسہونوی)

• عزیزی محمد ذکی سلمہ (فرزند محمد عاقل صاحب خلد آشیاں) کی شادی سائرہ بانو سلمہا بنت جناب حمید الرحمٰن (پیلی بھیت) کے ساتھ ۲۵ اکتوبر ۷۹ء بمقام پیلی بھیت، بحسن و خوبی انجام پائی ۲۷ اکتوبر کو اسی سلسلہ میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی گئی۔ اللہ مبارک کرے

نسیم اسہونوی

• جمیل احمد صاحب شمسی (کانپور) کی دختر نیک اختر عزیزہ رضوانہ جمیل سلمہا کی شادی عارف نشور سلمہ (فرزند جناب محمد سعید) کے

مرحوم) کے ساتھ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۷۹ء کی شام کو حلیم ڈگری کالج کانپور میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اس شادی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ لڑکے والوں نے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ باارات کو صرف ایک ایک پیالی چائے یا کافی یا شربت ہی دیا جائے۔ کاش تمام لڑکے والے اسی پر عمل کریں تو لڑکی والوں کے لیے بڑی آسانی ہو جائے۔ میں اس سلسلہ میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ افسوس ہے کہ اپنی شدید علالت کے باعث شرکت نہ کر سکا۔ نسیم انہونوی

• میرے دیرینہ کرم فرما جناب مستقیم احمد صاحب سینیئر ٹکٹ کلکٹر ہلدوانی نینی تال کی دختر عشرت پروین سلمہا کی شادی محمد طارق سلمہ (فرزند جناب حاجی محمد نذیر مرحوم ریلوے بھیت) کے ساتھ ۱۳ر اکتوبر بروز سنیچر بوقت شب بمقام ہلدوانی بحسن و خوبی انجام پائی اللہ پاک دولہا دلہن کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے آمین بڑا افسوس ہے کہ میں اپنی شدید علالت کے باعث دفتر تک نہیں جا سکتا، اس لیے شریک مسرت نہ ہو سکا۔ بہر حال دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ نسیم انہونوی

• نورالدین صاحب مرحوم (مغفور (لکھنؤ) کے فرزند شادی نور سلمہ اور صبیحہ نور سلمہا کی شادیاں رعنا سلطانہ سلمہا (دختر سلطان احمد صاحب کانپور) اور سرور عالم سلمہ (فرزند ڈاکٹر شان الٰہی صاحب کانپور) کے ساتھ ۵ر اکتوبر ۱۹۷۹ء اور ۷ر اکتوبر بحسب ترتیب عمل میں آئیں اللہ مبارک کرے۔ چودھری احسان کریم، رئیس الدین اور بیگم نورالدین (مرحوم) کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ (نسیم انہونوی)

• روانہ تبسم (ریکا مون) میری پیاری آپی نزہت یاسمین کی شادی اختر حسین (ابن ڈاکٹر وجاہت حسین) سیتا مڑھی کے ساتھ ۲۴ر ستمبر مطابق ۳ر شوال بروز دوشنبہ بمقام ڈالٹن گنج بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ تعالیٰ آپی اور نوشے بھائی کو تاحیات شاد و خرم رکھے۔

• محترم اسلام احمد شمسی صاحب کی پارۂ جگر عزیزی عرد سہ نازیلہا کی شادی عزیزی ارشد سعید سلمہ (فرزند جناب سعید احمد کانپور) کے ساتھ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۷۹ء بوقت ۱۱ بجے دن بمقام حلیم ڈگری کالج کانپور بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم انہونوی۔

• نکہت ناز (پرنام پٹ) "میری باجی سلطانہ شہانہ دختر ملک اختر جیلانی ایم تعشق الرحمان صاحب ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول پرنام پٹ) کی شادی وی آر مشتاق احمد (فرزند جناب بادشاہ حبیب اللہ مرحوم سابق ایم۔ پی) کے ساتھ ۷ر اکتوبر ۱۹۷۹ء بروز اتوار پرنام پٹ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک ان کی ازدواجی زندگی کو ہمیشہ شادمانیوں سے دوچار رکھے۔

• ماجرہ و ابراہیم سیٹھ حاجی صالح محمد (مدراس) کی صاحبزادی افشاں بانو کی شادی جناب احمد عمر گلبرگہ (ساکن براکر) کے فرزند ارجمند محمد سلیم احمد گلبرگہ کے ساتھ بروز اتوار ۷ر اکتوبر ۱۹۷۹ء بمقام کیونٹی سروس سنٹر سانتھوم بوقت ۷ بجے شام بحسن و خوبی انجام پائی اللہ مبارک کرے

(نسیم انہونوی)

• شفیق احمد بیگ کے فرزند طارق سلمہ کی شادی شاہدہ سلمہا (دختر ایم، اے۔ آر خالد صاحب) ۷ر اکتوبر ۱۹۷۹ء بوقت ۱۲ بجے بمقام داؤد پور سلطانپور بحسن و خوبی انجام پائی اللہ مبارک کرے۔ نسیم انہونوی

• ایم اقبال بانو۔ خدیجہ ناز (آمبور) ہماری پیاری بہن کی شہناز یاسمین دختر ای ایم رحمت اللہ کی شادی محترم فیاض احمد صاحب کے ساتھ بروز اتوار ۱۴ر اکتوبر ۱۹۷۹ء بحسن و خوبی انجام پائی۔ ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ پاک دولہا دلہن کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔

• شہناز لطیف، افتخار الدین و انسر خاں (ارکل گڈ) ہماری خالہ زاد بہن سراج النسا (دختر نیک اختر جناب محمد حیات ڈرائیور) کا عقد جناب ایم ایم عظیم (فرزند دلبند جناب سید محمود خاں۔ مرکیرہ۔ کورگ) کے ساتھ ۲۵ر جولائی ۱۹۷۹ء بروز جمعرات بحسن و خوبی انجام پائی۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اس جوڑی کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• اصغر بانو (چن پٹن) میری چھوٹی بہن سیدہ رعنا کو ثروت رضیہ بانو خریدار حریم کا عقد سعید میرے ماموں زاد بھائی سید اختر بی۔ اے (مقیم پاکستان) سے ۲۰ر اکتوبر ۱۹۷۹ء کو بمقام چن پٹن بحسن و خوبی انجام پایا دعا ہے کہ دولہا دلہن ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

انتقال پر ملال کی خبریں

• طلعت جہاں دین (امروہہ) "میرے بھائی شفیق علی خاں ۲۰ر ستمبر ۱۹۷۹ء بروز جمعرات بوقت صبح ۷ بجے دہلی کے پنت اسپتال میں بعارضۂ دل اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم نے اپنی یادگار ایک جوان بیوہ اور چار بچے چھوڑے ہیں۔ مرحوم بڑے خلیق ملنسار اور بہت خلاق تھے۔ آبائی قبرستان محلہ افغانان امروہہ میں سپرد خاک کیے گئے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

[illegible] والا نہیں ہے۔ وہ کانپ رہی تھیں۔ ان کے جسم میں لرزہ پڑا تھا۔
[illegible] صاحب کی دنیا اندھیر تھی۔ اب ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ انھوں نے [illegible] کیا۔ ان کا دل قابو سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا دھاڑیں مار مار کر روئیں۔ ان کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی! بس وہ سارے بدن کی طاقت آنکھوں میں سموئے اسے دیکھے جا رہے تھے جو لاش کی طرح چھوڑ پڑا تھا۔ سوائے سانس کی آمد و شد کے آثارِ حیات جس میں مفقود تھے!
حنا بھی نیچے آ گئی تھی۔ نمو، لیکن تو ملتی ہی نہ تھی۔ سب کی نگاہیں اس پر تھیں۔ اور وہ دیوانوں کی طرح ایک ایک کو تک رہی تھی۔! یوں چور سی بنی تھی جیسے سچ مچ اس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں! اس کا دل بھی چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد اسے موت اپنی پناہ میں لے لے۔ سچے دل سے مرنے کی دعا بھی مانگ رہی تھی۔!
اور پھر ایسے عظیم الشان شور کے بعد جو ہولناک سناٹا چھا گیا تو ایسا لگا۔ جیسے ابھی کسی کا جنازہ اٹھ چکا ہو۔ مرد الگ بیٹھے کسی فیصلے کے منتظر تھے۔ عورتیں رہ رہ کر باہر دیکھتیں کہ کیا ہو رہا ہے! ایزد بدستور بے خبر سوتا رہا۔!!
حنا چپکے سے آمنہ کے پاس پہونچی۔ آمنہ کا رنگ پریدہ، حواس پراگندہ تھے یہی سوچ رہی تھی کہ باپ کی خود غرضی کا بدلہ کہیں بیٹی کو نہ ملے کہ وہ پھر سے ایک بار سہاگ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔
ایزد صاحب نے یہ اپنا کیا حال کیا ہے؟ آمنہ نے خوفزدہ لہجے میں حنا سے پوچھا۔ دونوں ایک طرف کونے میں بیٹھی تھیں۔ کیا تم نے کسی بات پر انہیں خفا کیا تھا؟
ان کو بات پھر بڑھ گیا۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ سب نے مل کر کتنی باتیں [illegible] کہ کیا [illegible] کا [illegible] نہ ہے کتنا بڑا ہے —

غالباً آئینہ انھیں باور کراتا ہوگا کہ ان کا حسن و شباب تر و تازہ اور محفوظ ہے! اس نے اس کی امانت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی!۔
فرطِ غضب میں اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ اپنی بوٹیاں آپ نوچنے لگے آخر کیوں سمجھ لیا تھا میں نے ایسا۔ وہ بدل گئی ہوگی۔ لعنت ہے ماں کی طینت نہیں بدل سکتی۔ حد ہو چکی ایسی صاف صاف توہین کسی مرد نے کی ہوتی تو وہ اس ناشدنی کو اب تک خاک چٹا چکا ہوتا!۔
ابے بھیا: اس نے اپنے پیچھے شارق کی سہمی ہوئی آواز سنی!۔ اور مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔
آپ کو خرم بھائی باہر بلا رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں آ کے قوالی سنیئے: شارق بولا۔
"میں اب سونے جا رہا ہوں۔ کہہ دینا خرم بھائی سے۔ نیند آ رہی مجھے۔" ایزد نے کہا اور سگریٹ برآمدے کے پیچھے پھینک کر بھاری بھاری قدموں سے اوپر چلا گیا۔
زینوں کے سرے تک پہونچا کہ قدم من من بھر کے ہو گئے۔ اس کے کمرے سے ایک ننھے بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی حنا اسے چمکار رہی تھی۔ اس کی آواز سہمی ہوئی تھی۔
"چپ ہو جاؤ بیٹے۔ سو جاؤ۔ روتے نہیں۔ ہائے اللہ میں کیا کروں۔ وہ آتے ہوں گے۔ آپا کو بھی ایسی جلدی مچی تھی۔ ابھی کچھ دنوں اور نہ بھجواتیں:"
بچہ روتا اور تتلاتا ہوا بولا: امی۔ نانا کے یاں چلے جاتے ہم... امی نانا کے یہاں چلے جانا بیٹے۔ صبح ہو جانے تو نانا آ کے تمہیں لے جائیں گے۔ ابھی تو رات ہے۔ دیکھو آسمان پر اتنے بہت سے تارے ہیں۔ وہ سو رہے ہیں تم بھی سو جاؤ۔

اچھے بچے راتوں کو اٹھ اٹھ کے روتے نہیں : حنا نے سمجھایا۔

امی یہ کس کا گھر ہے۔ تم کہاں آئی ہو۔ امی : بچہ بولا۔

کاشی۔ یہ اب اپنا گھر ہے بیٹے : حنا کی خوفزدہ آواز آئی جس نے ایزد کے تن بدن میں غصے و نفرت کی جوالا بھڑکا دی۔ سہ وش کی جلی کٹی بکواس پر بچے کی گریہ اور حنا کے بہلانے نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ ایزد اب آپے سے باہر تھا۔!

اس کے عہد باطل ہوگئے کہ اس نے سوچا تھا اب اپنی ماں کی خوشنودی کی خاطر وہ اپنے سلوک میں مناسب ترمیم کرے گا۔ ! وحشی بگولے کی طرح وہ کمرے میں داخل ہوا۔ ہاتھ بڑھا کر تیز روشنی جلائی۔ اور آندھی کے تند جھکڑ کی طرح دونوں کی طرف مڑا۔

حنا کا خوفزدہ چہرہ اس کے سامنے تھا اور ایک پھول سا خوبصورت بچہ پتلی کالی کالی آنکھیں پھیلائے حیرت و خوف سے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا تھا سہم کر وہ رونا بھی بھول گیا تھا۔!

حنا : وہ سخت آواز میں بولا۔

جی : بے چاری کی گھگھی بندھ گئی تھی۔

اس ناہنجار کو کون لایا ہے ؟ : غصے کے مارے وہ پاگل ہوا جا رہا تھا۔ تمہاری شادی کی یہ شرط کب تھی کہ مجھے تمہارے ساتھ ساتھ اس بدبخت کو بھی برداشت کرنا پڑے گا۔ تمہارے باپ نے بڑا عمدہ جوا کھیلا ہے۔ رقم کی رقم ہتھیائی اور تم دونوں بلاؤں کو بھی اپنے سر سے اتار پھینکا۔ ماننا پڑے گا کہ واقعی گہری دوستی اسی کا نام ہے جو تمہارے خاطر باپ نے میرے احمق باپ سے نبھائی ہے وہ بکتا چلا گیا۔ حالانکہ حنا تمام واقعات سے سراسر لاعلم تھی۔ اسے دو نوجوان خانصاحب

ایک دفعہ پھر خرم نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ لیکن بے سود۔ انھیں اس کی کیا خبر تھی کہ ایزد پر گہری سے گہری نیند طاری تھی۔!

بہ ہزار خرابی دونوں نے مل کر اسے اٹھایا۔ نیچے لائے۔ خرم ڈاکٹر کو لینے بھاگے۔ اور گھر میں کہرام سا بپا ہو گیا۔ شادی کا گھر ماتم خانہ ہوگیا۔ سب کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ ایزد نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔

شعیب صاحب ہاتھ مل رہے تھے ! خان صاحب، رحمٰن، نوید وغیرہ ابھی موجود ہی تھے۔ وہ بھی نہایت متوحش اور پریشان ایزد کے پلنگ کے پاس گم صم کھڑے تھے۔ عورتیں اندر تھیں۔ ان میں کھلبلی مچی تھی۔

خدا خدا کرکے خرم ڈاکٹر کو لائے۔ اس نے دیکھا بھالا۔ کوئی انجکشن لگایا دوا منہ میں انڈیلی اور نبض پکڑ کر کسی بات کے منتظر ہو بیٹھے۔!

کچھ زہر وغیرہ کا اندیشہ تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب : کفیل نے پوچھا۔

تیل سا اثر ہے جناب... اسی کے نتیجہ میں یہ غشی طاری ہے : ڈاکٹر نے کہا : لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ کم از کم پانچ چھ گھنٹوں بعد ہوش آجائے گا اس سے قبل نہیں یا پھر ہوسکتا ہے کہ آج کا سارا دن بے ہوشی ہی میں گزر جائے۔ میں پھر آؤں گا۔ انجکشن دوں گا۔ آپ لوگ ان کے پاس رہیئے اور نہایت پابندی سے دوا ان کے منہ میں انڈیلتے رہیئے۔!"

خدانخواستہ زندگی کی طرف سے کوئی خطرہ تو نہیں ہے : خان صاحب نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

ایسی کوئی بات نہیں : ڈاکٹر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اطمینان دلا کے رخصت ہوگئے۔

صالحہ بیگم کے دل میں پنکھے لگے تھے۔! انھیں [illegible]

حنا غسل خانہ میں گئی اور نامیہ نے کمرے میں قدم رکھے۔ انھوں نے جھک
کر ایزد کو دیکھا اور انھیں شبہ ہوا کہ وہ طبعی نیند نہیں سو رہا تھا۔ اس کی
سانسیں غیر معمولی تند تھیں۔ اور وہ عجیب طرح بے خبر سویا ہوا تھا۔
نامیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے جھنجوڑا ساتھ ہی آوازیں بھی
دیں۔ اس کا کندھا پکڑ کر اپنی طرف پھیرنا چاہا لیکن وہ بالکل مردہ کی مانند ہو رہا تھا
نامیہ نے اس کا ہاتھ تھام کر چھوڑ دیا اور وہ بے جان چیز کی طرح اس کے پہلو میں
گر پڑا۔ نامیہ کے جسم میں سردی سمانے لگی۔ کہیں اس نے زندگی سے بیزار ہو کر
کوئی غلط حرکت تو نہیں کر ڈالی۔ کانپتے ہوئے قدموں سے وہ زینہ طے کر کے
نیچے آئیں۔ کفیل صحن میں ملے۔ خرم بھی تھے۔ دونوں زینے کی ریلنگ کی پیٹھ
ٹیکے چائے پی رہے تھے نامیہ کو بدحواس دیکھ کر پریشان ہو گئے۔
جلدی اوپر چلئے۔ ایزد نے خود کو کچھ کر لیا ہے: انھوں نے دل تھام کر کہا۔
کیا کر لیا ہے: کفیل کے ہاتھ میں پیالی جلترنگ بجانے لگی پھر ہاتھ سے
چھوٹ گئی۔
کیا کر رہے ہیں!: خرم نے اپنی پیالی بھی جلدی سے نیچے رکھ دی۔
اور پھر دونوں دیوانوں کی طرح بھاگے۔ پیچھے پیچھے نامیہ بھی گئیں۔
انھوں نے دیکھا کفیل اور خرم نے مل کر ایزد کو سیدھا کر دیا تھا۔ اس
پر جھکے آوازیں دے رہے تھے لیکن ایزد نے نہ تو آنکھیں کھولیں نہ آواز دی۔
بالکل بے ہوش ہے: خرم نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا: کفیل بھائی۔ میں
جا کر ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔!
خرم: کفیل کی آواز میں ارتعاش تھا آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے:
خدا نخواستہ اس نے کوئی زہر وغیرہ تو نہیں کھا لیا۔ ایسا اداس تھا اس دن پھر

نے کچھ بتایا تھا نہ آمنہ نے۔ وہ افسوسناک طریقے سے سوچتی رہ گئی کہ ایزد آخر
کون سے واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا تھا! اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ویسے
وہ اتنی بھولی اور مخلص بلکہ ناسمجھ تھی کہ اپنی اس نئی زندگی کا پرتپاک استقبال
کرنے کے لیے خود کو آمادہ کر لیا تھا۔ پچھلی ناپائیدار ازدواجی زندگی اس کے
نزدیک ایک خواب پریشاں کا درجہ رکھتی تھی! اس نے سوچ لیا تھا کہ اپنے شوہر
کو اپنا تمام خلوص محبت اور خدمت دے دے گی۔ لیکن ایزد کے اس بار دو علحدگی
اور فوری اشتعال نے اسے ناقابل برداشت صدمہ پہونچایا۔ دل میں ایک
درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے سر جھکا لیا۔ شاید اس کے آنسو
ایزد کے اشتعال کو زیادہ ہوا دے دیتے۔ وہ سمجھ گئی اس کی قسمت دوسری
دفعہ پھوٹی ہے اور اب وہ موت تک بدلنے والی نہیں۔!
ایزد کا عجیب حال تھا۔ چند گھنٹے قبل اس نے ماضی کو فراموش کر کے یہ تہیہ
کر لیا تھا کہ از سر نو خوشگوار زندگی گزارے گا۔ لیکن مہ وش کو دیکھنے اس سے گفتگو
کرنے کے بعد پھر سے اس کے مزاج میں کڑواہٹ بھر گئی۔ رہی سہی کسر کاشف
کی موجودگی نے پوری کر دی۔ اب وہ اچھی یا بری کوئی بات سمجھنے سے قاصر تھا۔
اسے تو یہ بھی ہوش نہ تھا کہ اس کے منہ سے کیا نکل رہا تھا اور دوسروں پر اس کا
کیا اثر ہو رہا تھا! بچہ اس کی گرج دھمک سے سہم کر ماں کی گود میں منہ چھپائے
تھا۔ حنا بھی چپ تھی۔! اسے خاموش پا کر ایزد کا غصہ بھڑکا۔ اس نے بڑے
جاہلانہ انداز میں کہا۔
"میں تم سے پہلی اور آخری بار کہہ رہا ہوں کہ اگر تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے
تو پھر اس بچے کو اپنے گھر واپس بھجوا دو یا تم بھی چلی جاؤ یہیں!:
اور وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ کر سیڑھی چڑھ گیا۔ حنا تنہا کمرے میں

اچھالے۔ اور پھر بستر پر گر کر دیوار کی طرف کروٹ بدل لی۔

کیسی انوکھی تقدیر ہے: اس کا دماغ پک رہا تھا: مجھے وہ مسرتیں بھی نصیب نہیں جو ہر لڑکی کا حق ہوتی ہیں۔ آج کتنے لوگ ایسے ہیں جو اپنی شادی شدہ زندگی میں ہر طرح کامیاب ہیں۔ بیوی، بچے، خوشیاں۔ ایک میں ہوں مجھے کبھی وہ حقیقی خوشیاں نصیب نہ ہوں گی کبھی نہیں:

اس کے جسم میں خون کی بجائے پگھلی ہوئی آگ دوڑ رہی تھی! کنپٹیاں سنسنا رہی تھیں! اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کے لیے اسے جدوجہد کرنی پڑی! حنا نے اونگھتے ہوئے بچے کو کندھے سے لگایا۔ چپکے سے مسہری سے اتری اور نیچے چلی گئی۔ شہ نشین کے پاس اسے نگار ملیں۔ بے حد تعجب سے انھوں نے حنا کو دیکھا۔

کیا بات ہے: انھوں نے پوچھا: تمھارا چہرہ فق ہو رہا ہے۔ بچہ تو اچھا ہے نا۔!؟

باجی: اس کی آواز گلے میں پھنسنے لگی: شارق سے کہیئے۔ اسے آپا باجی کے پاس پہونچا دے:

کیا!: نگار نے حیرت سے کہا۔

باجی۔ اس کی موجودگی انھیں پسند نہیں ہے: حنا نے کہا اور ٹپ ٹپ آنسو اس کے رخساروں پر ٹپکنے لگے: وہ بہت خفا ہو رہے ہیں۔ باجی۔ مجھ پر رحم کیجئے بھجوا دیجئے اسے آپا جی کے یہاں:

اچھا میں خود لیتی ہوں۔ ایزد کی۔ لاکھ اسے سمجھایا مگر خدا جانے کیسا پتھر دماغ ہے: نگار نے کہا پھر نامیہ کو آواز دی۔ وہ کچن میں تھیں پہلے ہی آ گئیں [illegible] نگار نے یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا۔

نامیہ نے حیرت سے اس کے سراپا پر نگاہیں ڈالیں اور [illegible] پر رکھ دیا۔

یہ۔ یہ کیا حالت بنائی ہے: نامیہ نے [illegible] کہا اور [illegible] دانتوں میں جکڑ لیا۔ پھر ایک خلاف توقع بات ہوئی۔ حنا آگے بڑھ کر ان سے چمٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔!

نامیہ ایسی مبہوت تھیں کہ وہ اسے تسلی بھی نہ دے سکیں۔ بڑی مشکل سے جب ان کے حواس درست ہوئے تب انھوں نے حال پوچھا اور حنا نے سب کچھ بتا دیا۔! کوئی بات ان سے نہیں چھپائی۔ حیرت و خوف سے نامیہ کا دل سرد ہوتا محسوس ہوا: بمشکل تمام انھوں نے کہا: ایزد نے شراب پی ہے؟ یقین نہیں آتا۔ اب وہ کیا کر رہے ہیں؟:

نشے میں بے ہوش پڑے ہیں: حنا نے سسک کر کہا پھر بولی: وہ مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ بھابی۔ آپ نے انھیں مجبور کیوں کیا۔ میری ہی وجہ سے ان کی یہ نوبت آئی ہے:

اس بات کا چرچا نہ کرو۔ حنا: نامیہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا: تم جاؤ حمام میں اپنی حالت درست کرو۔ آہ بہن یہ ہم بدنصیبوں کا ازل سے مقدر ہے۔ جن کے دامن سے بندھ گئے۔ اس کا ہر ظلم و ستم ہمارا نصیب بن جاتا ہے اب کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ خاموشی سے انگیز کرو۔

بھابی مجھے گھر بھجوا دیجئے۔ وہ مجھ سے اور بچے سے نفرت کرتے ہیں میں نہیں چاہتی کہ میں عذاب بن کر ان پر مسلط رہوں:

نہیں حنا۔ [illegible] نامیہ نے اسے چمکارا۔ ابھی بات ایسی بڑی [illegible] اچھا نہیں۔ چھا میں [illegible]:

عذاب: حنا غائب حال نار پر سسکیاں بھرتے ہوئے سوچا: اب اس کے شوہر نے یہ کیا گل کھلایا ہے کہ وہ پورے واقعات سمجھنے سے بھی قاصر رہی ہے قدرے ستم۔ اس کا شوہر اسے اپنی بیوی کہہ کر نہیں بلکہ بدنام کوچے کی رہنے والی عورت کہہ کر اس کے پاس آتا ہے۔ شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر۔ تاکہ وہ اپنی رسوائی اور اس کی بے آبروئی کا صحیح ادراک نہ کر سکے۔

بڑی دیر تک روتے رہنے سے اس پر خود کشی کی سی حالت طاری ہونے لگی۔ احساس غم نے اس کی جسمانی طاقت بھی زائل کر دی تھی۔!

بالآخر شب نغمہ اختتام کو پہونچی۔ مہمان بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوئے صبح قریب تھی! ناصیہ نے کچن سے سب کے لیے چائے کافی اور لوازمات بھجوانے شروع کر دیئے۔ پھر چھوٹی سی ٹرے میں چائے بہت سے لوازمات رکھ کر خود اوپر پہونچیں۔ ان کا خیال تھا کہ ایزد باہر مردانہ محفل میں ہوگا۔ لہذا انھوں نے سوچا کہ آج صبح کی چائے وہ حنا کے ساتھ پئیں گی۔

صبح صادق کا سحر کن اُجالا پھیلنے لگا تھا۔ لیکن ابھی ماحول پر سرمئی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مسجدوں میں اذانیں ہو چکی تھیں۔!

ایزد کے کمرے میں بدستور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔!

ناصیہ نے پردے کے پیچھے سے پکارا: حنا کیا سو رہی ہو؟ میں چائے لاتی ہوں:

اور وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ اپنا بے ترتیب لباس برابر کیا۔ مڑ کر ایزد کو دیکھا جو اوندھا لیٹا بے خبر سو رہا تھا اس کی گہری گہری سانسیں کمرے میں گونج رہی تھیں اس کے لبوں سے ایک ٹھنڈی سی سانس نکلی۔ روشنی کیے بغیر وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔

ہوش کی دوا کر دیجئے: ناصیہ نے کہا: رات کے بارہ ایک بجنے والے ہیں۔ شارق تو شاید سو بھی گیا ہے۔ اس وقت اسے بھجوانا مناسب نہیں ہے۔ اور ہم اسے کبھی بھجوائیں گے بھی نہیں۔ اگر سو گیا ہے تو اسے میرے کمرے میں لٹا دو اور تم بے فکری سے جاؤ۔ ہاں۔ یہ راتوں کو اٹھ کے دودھ اگر پیتا ہو تو کہہ دو۔ میں پلا دوں گی:

بچہ سو چکا تھا۔ ناصیہ نے اسے اپنی گود میں لے لیا۔

آپ نے سنا بھابی۔ ایزد نے حنا سے کیسی بکواس کی تھی؟ نگار نے کہا۔

اس کی باتوں پر دھیان نہ دو نگار: ناصیہ نے کہا: وہ تو نا سمجھ ہے کو دا مزاج رکھتا ہے۔ کیا حرج ہے کہ اس کی بکواس سن کر بھلا دی جائے۔!

ہاں بھابی آپ فرشتہ ہوں گی۔ مگر مجھے بے حد غصہ آجاتا ہے: نگار نے جھلا کر کہا۔

ہونا اسی کی بہن: ناصیہ بولیں۔ پھر حنا سے کہا: جاؤ حنا۔ تم اطمینان سے جاؤ۔ ساری رات یہاں سوئے گا کون۔!

بھابی: سسک کر حنا بولی: ایک بات اور پوچھتی ہوں آپ سے۔

پوچھو: وہ ہنسنے لگیں۔

بھابی۔ کون سی رقم تھی جو آپا جی نے ہتھیالی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ ہمارا [illegible] کیا بات ہے:

ناصیہ اور نگار نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ انھیں یہ گمان نہیں تھا کہ حنا اس بڑے معاملے سے بے خبر ہوگی۔ لہذا ناصیہ نے جلدی سے کہا: ہمیں بھی نہیں معلوم۔ کل فرصت سے آپا سے پوچھیں گے۔ اب تم خوا مخواہ کی فکروں میں خود کو ہلکان مت کرو۔ جاؤ۔ میں بھی جا رہی ہوں:

حنا کو اپنے سامنے واپس بھجوا کر ناصیہ نے نگار سے کہا: "میں کہتی ہوں نگار یہ ایزد کیوں اچھے بھلے دیوانے ہوتے جا رہے ہیں؟"

"دیکھ لیجئے گا بھابی آپ کبھی میرا کہا پورا ہو گا۔ یہ ایزد بابی بدمعاش نہ خود سکھ سے رہے گا نہ بے چاری کو رکھے گا۔ بھائی جان بھی کہتے تھے کہ ابا جان کی طفولہ نہ ہٹ کا پورا پورا بدلہ وہ بیوی سے لے گا۔ سو ابتدا ہو چکی ہے۔"

"اللہ رحم کرے۔" ناصیہ نے کہا پھر دونوں سوچتی ہوئی چلی گئیں۔

حنا کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ کمرے میں قدم بھی رکھے۔ لیکن نہ جانے ماندن نہ پائے رفتن کا معاملہ تھا۔

ایسی سخت بے چینی اس نے عمر بھر محسوس نہیں کی تھی۔ خدا ہی جانے کب کون سی بات ایزد کی مرضی کے خلاف ہو جائے۔ وہ پتھر کی بت کی طرح کرسی پر بیٹھی رہی۔ نیچے سے گانے بجانے کی آوازیں واہ واہ کی صدائیں اور سبحان اللہ کے نعرے سنائی دے رہے تھے!۔ رات کے سناٹے میں ساز کا سوز زیادہ دلکش اور موثر ہو گیا تھا۔

میرے اللہ۔ وہ سب کتنے خوش ہیں۔ اور ایک میں ہوں۔ مجھے اگر خوشیاں راس نہ آئیں تو مجھے اور میرے بچے کو موت ہی دیدے پروردگار۔ حنا کے آنسو بہنے لگے۔

اسے کیا خبر تھی کہ اس کی تقدیر نے سخت آزمائشوں کے لیے اسے منتخب کر لیا تھا۔ شاید اس کی ایک آدھ سسکی ایزد نے سن لی تھی۔ دفعتاً اس نے کروٹ بدلی۔ حنا کو روتے دیکھ کر اس کا پارہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔

"یہ خوب انصاف ہے۔" اس نے استہزائیہ انداز میں ہنس کر کہا: "مجھے اپنی قسمت پر رونا چاہیئے۔ مگر تم بیچاری بہا رہی ہو۔ حنا۔ سن لے [illegible]"

حنا کبھی ایسی ناگہانی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو ایک عذاب سا اس پر مسلط تھا۔ فرط خوف و دہشت سے اس کا نطق سلب ہو چکا تھا۔ اب وہ مکمل طور پر انسان نما درندے کے قبضہ میں تھی!۔ لیکن اتنا ادراک کرنے میں اسے دیر نہیں لگی کہ وہ کس چیز کے نشے کے اثر میں یہ اخلاق سوز حرکتیں کر رہا تھا۔ جیسے وقت اور جگہ کا کبھی ہوش نہ تھا۔ اور جو خود سے اور اس سے بیگانہ محض تھا!۔

اپنی دانست میں جب وہ انتقام لے چکا تو بیہوش سی آواز میں بے ربط الفاظ میں بولا۔

"اب۔ میں گھر جا رہا ہوں۔ اچھا۔ تم۔ لوگ۔ جی بھر کے ناچو گاؤ۔ لیکن۔ ہم مجھے پھر کہیں۔ نہ بہکانا۔ آج تو میں۔ اس لڑکی۔ سے۔ بدلہ لینے چلا آیا تھا۔ نہیں جانتیں تم اسے۔ ارے واہ۔ وہ سوتے سوتے ہنس پڑا اس کی آنکھیں۔ اب بھی بند تھیں۔ اس نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔ حنا۔ نام ہے اس کا۔ کیا خبر۔ اچھا نام ہے کہ برا۔ اے بائی جی۔ تمھارے رام ادھار رہے۔ اب ہم جا رہے ہیں۔"

اور یہ کہتے ہی کہتے اس پر گہری نیند طاری ہو گئی!۔

حنا دیر تک سکتہ کی حالت میں پڑی رہی۔ اس کے ہوش و حواس گم تھے۔ پہلی ہی بار یہ عقدہ اس پر کھلا تھا کہ ایزد کو شراب کی بھی لت پڑی تھی۔ اپنی بدقسمتی پر وہ آنسو بہانے لگی۔ کیا مرضی تھی اس کے پیدا کرنے والے کی۔ شروع سے اسے بدنصیب سوختہ سامان رکھا تھا۔ کیا بگاڑا تھا اس نے کسی کا۔ کیا خدا نہیں چاہتا کہ وہ دوسری عورتوں کی طرح پرسکون زندگی گزارے۔ پہلے بھی اس کی مرضی نہیں تھی کہ وہ [illegible] کے ساتھ [illegible]۔ اس نے تب بھی صبر کر لیا!۔

سے نفرت ہے۔ اگر تم نے آنسو بہائے تو پھر مجھے تمہاری شکل سے بھی نفرت ہو جائے گی!۔

حنا نے آنسو پونچھ لیے۔

ایزد ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ یکبارگی اس کے سینے میں جوالا سی بھڑکنے لگی۔ بیاہی اور کنوارے جذبات میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس کی سانسیں کھچنے لگیں۔ وحشیانہ انداز میں اس نے جھک کر حنا کا بازو جکڑا اور اپنے پاس کھینچا۔ بڑے رحم طلب انداز سے حنا نے اسے دیکھا تھا۔ اس کی یہ ادا ایزد کو حیوان بنا گئی۔ اس نے اتنے بے رحم طریقے سے اسے اپنی بانہوں میں جکڑا کہ حنا کی گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ اس نے بے چین ہو کر ایزد کے بازو پر سر رکھ دیا۔

دلکش، نازک۔ ایزد نے اس کی گردن میں اپنے لب چھپا لیے! اور تبھی دفعتاً اس کے ذہن میں بجلی سی کوندی۔

اس گلستان حسن و شباب کا خوشہ چیں وہ پہلا فرد نہیں ہے۔ کیا حنا اس کی جذباتی رفاقت پہ دل ہی دل میں اسے احمق تو نہیں سمجھے گی۔

ہو سکتا ہے کہ اسے اپنا پہلا شوہر یاد آ گیا ہو۔ یہ رات اس نے کسی کے ساتھ اور بھی گزاری ہے۔ اف خدا وند۔ میں اپنی ساری توانائی کھو بیٹھا ہوں۔ یہ خیال ناگ کی طرح ڈس رہا ہے مجھے۔

اس نے دیوانوں کی طرح حنا کو پانتی دھکیل دیا اور خود زینے سے اتر کر چلا گیا۔ سارا گھر باہر ڈھل گیا تھا۔ صالحہ بیگم سو چکی تھیں۔ شعیب صاحب باہر تھے وہ ان کے کمرے میں گھسا۔ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ شعیب صاحب بے خوابی کے مریض تھے بہت سی گولیاں استعمال کیا کرتے تھے۔ اب

سبحان اللہ۔ ارے صاحب لگائے جائیے۔

کیا بکواس ہے... آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔ ایزد نے پلکیں جھپکا کر کہا۔ اس کی نظریں حنا پر پڑیں اور پھر شدید غصے کا طوفان اس پر چڑھ دوڑا۔ رہی سہی عقل خبط ہوئی۔ آنکھوں کے آگے دھند گہری ہو گئی۔

میں پھر تمہارے کوٹھے پر آ پہنچا۔ اس پر غنودگی چھانے لگی۔ اور دل میں جیسے شیطان کھوپڑی میں ادھم مچانے لگے۔ ہونٹ بھینچ کر وہ آگے بڑھا مٹھیاں کس لیں۔

مجرا ہو رہا ہے۔ ناچ رہے ہیں گا رہے ہیں تمہارے بھائی بند۔ اچھا اچھا۔ مجھے کوئی یہاں لے آیا ہے۔ اس سے میں بعد کو سمجھ لوں گا۔ اور تم۔ تم سے تو ابھی نمٹ لیتا ہوں۔ وہ طوفان جو میرے دماغ میں حشر برپا کر رہا ہے۔ سو جائے گا۔ وہ جہنم جو میرے سینے میں دہک رہا ہے۔ سرد ہو جائے گا۔ وہ آسیب جو بھوت بن کر میرے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ تھم جائے گا۔ سمجھیں تم؟

اس نے آگے بڑھ کر روشنی گل کر دی۔

اندر درندگی پر اتر آیا۔

اس کے منہ سے خطرناک باتیں نکل رہی تھیں۔

"رنڈیکے کی طوائف ہو تم۔ میں اس کی بھی کچھ حقیقت نہیں سمجھتا جو میری زندگی میں زبردستی داخل کر دی گئی ہے۔ وہ تو۔ وہ جھوٹا گلاس ہے۔ میں ہرگز اس کے لمس سے اپنے لب آلودہ نہیں کروں گا۔ اور تم۔ تم تو ایک گزرگاہ ہو۔ تم نے مجھے یہاں اس لیے کھینچ بلایا ہے کہ تم۔ میرا امتحان لو۔ میں اس کے بعد سے میں تمہارے کوچے میں لعنت بھیجنے بھی نہیں آؤں گا۔ اچھی طرح سمجھ لو۔ بند کر دو یہ سسکیاں۔ یہ نازو نخرے۔ بیزار۔ مجھے کر رہا ہے۔

بھی پیک کی چھوٹی شیشی ان کے تکیئے کے پاس موجود تھی۔ جھٹ کر ایزد نے
شیشی اٹھالی۔ کارک کھولا اور کئی ایک گولیاں ہتھیلی پر الٹ لیں۔

میں سو جاؤں گا بے خبر! اس نے ہانپتے ہوئے کہا: اس رات کا عذاب
تو نازل نہیں ہوگا مجھ پر۔ اے خدا مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ میں
اپنی توانائی کھو چکا ہوں۔ کیوں مجھے رہ رہ کر اس شخص کا خیال آرہا ہے۔ جو
مر چکا۔ اُف اُف۔ وہ میرے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔ کیا کروں۔ میں کیا
کروں۔ بس۔ نجات کا ایک راستہ ہے کہ میں بے ہوش ہو کر سو جاؤں۔ میرے
سارے پھنکارتے ہوئے جذبات بھی سو جائیں گے:

اس نے تمام گولیاں ایک ساتھ منہ میں ڈال لیں۔! دالان میں آکے
پانی پیا۔ اور ٹھنڈی دیوار سے پیٹھ ٹیکے ہانپتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں رنگ
برنگی لہریے ناچنے لگے تھے ہاتھوں پیروں میں سنسناہٹ شروع ہو چکی
تھی۔ اور دماغ میں بے چین خیالات یوں چکرا رہے تھے جیسے طوفانی سمندر
میں بھنور پڑتے ہیں۔ اپنی کیفیت کو وہ اب بخوبی سمجھنے سے قاصر تھا۔!
نیم بے ہوشی کی کیفیت میں اس کے دماغ نے ایک ہیولانی ماحول پیدا
کر دیا!

میں کہاں آگیا ہوں۔ اس نے باآواز بلند کہا۔ یہ کوئی اچھی جگہ نہیں معلوم
ہوتی۔ استغفر اللہ کون شیطان کا بچہ اس کوچے میں لے آیا ہے۔ جہاں
بانکے کھڑے ہیں۔ طبلے ٹھنک رہے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ میں ایسی
غلط جگہ پر کس طرح چلا آیا ہوں۔ کوئی شناسا مجھے اس کوچے میں دیکھے
گا تو کیا سوچے گا؟

اس نے نہایت تیزی سے [illegible] دالان طے کرنا شروع کر دیا۔

نجانے کہاں سے اس کے دماغ میں یہ تصور چلا آیا کہ [illegible]
محلے میں آنکلا ہے۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ شعیب صاحب کے کمرے سے نکلا
اور چاہنے لگا کہ جلد از جلد اس گلی سے نکل جائے جہاں ہر بے چارے [illegible]
کی دھن دھن اس کے سر پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ لڑکھڑاتے ہوئے [illegible]
مشکل سنبھالے وہ دالان سے گزرا۔ اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اپنے گھر میں
ہے کہ کہیں دور بازاروں میں۔ بہرحال دالان برآمدے اور رخشندہ بھی
سمجھ کر اس نے عبور کیے کہ وہ اس بدنام بازار سے دور نکل آیا ہے اور [illegible]
کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

برآمدے میں کا بلب کھلا ہوا تھا۔ کمرے سے خوابگیں روشنی کی ایک لکیر
دروازے کے باہر رینگ آئی تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا [illegible]
ہوئی آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا کر کے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ وہ کس جگہ
آپہنچا ہے۔

حنا کا پیکر اسے نظر آیا۔

لیکن اس کے ذہن نے یہ حقیقت باور کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ اس
کی بیوی ہے۔

دفعتاً اس کے جبڑے بھنچ گئے۔

اچانک نیچے ہال سے داد و تحسین کا بے پناہ غلغلہ اٹھا اس کے کانوں سے
ٹکرایا۔

"واہ واہ۔ مرحبا۔ سبحان اللہ۔ کیا بات ہے"

پھر گانے والے نے نہایت [illegible]
[illegible]

The Hareem Lucknow November 1979 (Phones : 44559-45354) Regd. No. LW/NP

Dec..79

Rs. 1/-

ایڈیٹر

ٹیلیفون نمبر آفس:۔ ۴۴۵۵۹

ٹیلیفون نمبر رہائش:۔ ۴۵۳۳۴

گزشتہ ۵۰ سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے — اور اردو میں ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے۔

(جلد ۵۷) نمبر (۱۲)

ماہنامہ حریم لکھنؤ

اڈیٹر و نگراں
نسیم انہونوی

معاونین
شوکت جہاں بیگم خسرالہ
جانی بیگم ردولوی

بیادگار
سید محمد سلیم انہونوی مرحوم
و
شفیق النساء
بیگم سلیم انہونوی مرحوم

فہرست مضامین
ماہ دسمبر ۱۹۷۹ء

قیمت سالانہ

اعزازی۔ منی آرڈر سے اکیس روپیہ۔ مخصوص خریداری۔ منی آرڈر سے۔ انیس روپیہ۔ معمولی خریداری منی آرڈر سے۔ سولہ روپیہ۔ وی۔ پی سے پرچہ منگانے پر تین روپیہ زائد۔ فی پرچہ۔ ایک روپیہ۔ غیر ممالک سے بقدر ۳۲ روپیہ یا دو پونڈ برائے سی۔ میل۔ ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

نسیم انہونوی۔ مالک و ناشر نے [illegible] قومی پریس۔ لکھنؤ

لمعات

جیسا کہ حریم بہنوں کو علم ہے، میں ۷ ستمبر سے شدید علیل رہا، یہاں تک کہ زندگی کی آس ٹوٹ گئی تھی، لیکن حریم کی بہنوں اور بھانجیوں اور شفیقوں کی دعاؤں سے گویا دوبارہ زندگی پائی۔ کمزوری اب بھی بہت ہے اور کام بھی بہت اکٹھا ہے۔ اسی بیچ ۷ نومبر کو اپنے مرحوم دوست منظور الزمان جملانی کی پوتی اور مناظر الزمان جملانی کی بیٹی عزیزہ شگفتہ سلمیٰ کی شادی میں شرکت کے لئے بھی جانا ہے۔ اس لئے کہ منظور صاحب کے بچے مجھے ہی اپنے خاندان کا بزرگ سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں اس تقریب سعید میں ضرور شریک ہوں اس لئے میں وقت نہ نکال سکا کہ لمعات لکھ سکوں اس لئے وحید الزمان صاحب کا ایک مضمون لمعاتِ خواتین سے نقل کر رہا ہوں جو اس قابل ہے کہ اسے پڑھا جائے۔

(نسیم انہونوی)

اسلام نے حقوق کے معاملہ میں مرد و عورت کے لیے برابر کا درجہ تسلیم کیا ہے اور فرمایا کہ

لھن مثل الذی علیھن

یعنی مردوں کے ذمے عورتوں کے اسی طرح کے حقوق ہیں جس طرح کے عورتوں کے ذمہ مردوں کے حقوق ہیں۔ لیکن حقوق کے معاملہ کو چھوڑ کر جہاں تک اولاد کی ابتدائی تربیت کا سوال ہے عورت کو اپنے فطری قویٰ اور اپنے جنسی حالات کی وجہ سے مرد کی نسبت بہت زیادہ ذمہ داری کا مقام حاصل ہے۔ بیشک کہا جاتا ہے کہ مرد کی ذمہ داریاں عورت کی ذمہ داریوں سے بہت زیادہ بھاری ہیں لیکن بچوں کی تربیت کا پہلو اتنا نازک اور اتنا اہم ہے اور اس کا اثر بھی اتنا گہرا اور اتنا وسیع ہے کہ جو عورت اس ذمہ داری کو کامیابی کے ساتھ ادا کرتی ہے۔ اس کا وجود یقیناً قوم کے لیے بہت عزت اور بہت فخر کا موجب ہے جس کے اسی خصوصی حیثیت کی وجہ سے ہمارے آقا نے فرمایا:

حبب الی من دنیاکم النساء والطیب

جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ:

"یعنی اے لوگو! تمہاری دنیا کی چیزوں میں سے دو چیزیں مجھے بہت محبوب ہیں۔ ایک عورت اور دوسری خوشبو۔ مگر میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔"

اپنے آقا کے ان الفاظ پر عورت جس قدر بھی فخر کرے اس کا حق ہے مگر ظاہر ہے کہ خدا کی ہر نعمت اپنے ساتھ مخصوص ذمہ داریاں بھی لاتی ہے اور جو عورت ان سے غافل رہتا ہے وہ خدا کے حضور ہرگز مقبول نہیں ہو سکتی اور نہ ملک و قوم کی خدمت کر سکتی ہے۔ چنانچہ چاہیے کہ ملک کی سب [illegible] کو چاہیے کہ وہ ان ذمہ داریوں کی طرف توجہ دیں [illegible] تربیت کے متعلق ہیں ان پر بات [illegible] تاکہ وہ ایک طرف خدا کی نعمت کا [illegible] اور دوسری طرف قوم کی آئندہ نسل کو ترقی کے رستے پر ڈال کر ملک و قوم کی [illegible]

اس تعلق میں سب سے پہلے بیوی کے انتخاب کا مسئلہ ہے اور اس سلسلہ میں آنحضرتؐ کا مبارک ارشاد ہے کہ۔

"بیوی کا انتخاب چار باتوں کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ مال و دولت کی بنا پر بیوی کا انتخاب کرتے ہیں۔ بعض حسب و نسب پر اس کی بنیاد رکھتے ہیں۔ بعض عورت کے حسن کو دیکھتے ہیں۔ بعض دین اور اخلاق کے پہلو کو مقدم کرتے ہیں۔ مگر اے مرد مومن تو اخلاق اور دین کے پہلو کو مقدم کیا کر۔ ورنہ تیرے ہاتھ ہمیشہ خاک آلود رہیں گے۔"

اس حدیث میں نہ صرف مسلمانوں کے گھروں کی موجودہ خانگی خوشی کی بنیاد قائم فرمادی گئی ہے بلکہ ان کی آئندہ نسلیں کی بہتری اور بہبودی کے سوال کو بھی ایک ایسے مضبوط اور دائمی کڑی کے ساتھ باندھ دیا ہے جو ٹوٹنے کا نام نہیں جانتا۔ ایک اچھی بیوی جو نیک، دیندار اور خوش اخلاق ہو صرف اپنے خاوند ہی کے لئے خوشی اور راحت کا موجب نہیں ہوگی۔ بلکہ اپنی اولاد کی تربیت کے حق میں بھی بہت مبارک ثابت ہوگی اور اس طرح حال اور مستقبل دونوں کی خوشیوں کے مکمل ہونے سے ایسا گھر حقیقتاً جنت کا نمونہ بن جائے گا۔ اگر یہاں ایک مرد کو حکم ہے کہ دین دار عورت سے شادی کرے تو اس حکم میں تمام مسلمان عورتوں کے لئے بھی یہ ضمنی حکم شامل ہے کہ وہ نیک اور دیندار بنیں کیونکہ اگر دنیا میں نیک اور باحیا عورتیں ہوں گی نہیں تو مردوں کو دیندار بیویاں میسر کیسے آئیں گی۔ چنانچہ اس حدیث میں یہ دوہرا حکم شامل ہے کہ۔

۱۔ مسلمان عورتیں دیندار اور بااخلاق بنیں ورنہ کوئی دیندار مرد ان کے رشتہ پر راضی نہیں ہوگا اور نہ ان کی آئندہ نسل نیک بن سکے گی۔

۲۔ مسلمان مرد دیندار، بااخلاق اور باحیا عورتوں کے ساتھ شادی کریں تاکہ نہ صرف ان کا اپنا گھر جنت کا نمونہ بنے بلکہ ان کی اولاد کے واسطے بھی دائمی جنت کے دروازے کھل جائیں۔

اسی دوہری غرض کے تحت ہمارے آقا نے یہ زریں ارشاد جاری فرمایا ہے۔ لہٰذا مردوں اور عورتوں دونوں کو چاہیئے کہ اس مبارک ارشاد کو اپنے لئے شمع ہدایت بنا کر دائمی راحت اور دائمی سرور اور دائمی برکت کا ورثہ پانے کی کوشش کریں۔

اولاد کی تربیت کے تعلق میں پہلی ہدایت اسلام کی یہ ہے کہ مرد دیندار عورتوں کے ساتھ شادی کریں اور ہر ماں خود دیندار بننے کی کوشش کرے کیونکہ بے دین ماں دینی تربیت کی اہلیت نہیں رکھتی۔ بیشک بعض اوقات بُرے ماں باپ کے بچے نیک ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات اچھے ماں باپ کے گھر میں برے بچے بھی جنم لے لیتے ہیں مگر عام قاعدہ یہی ہے کہ نیک اولاد پیدا کرنے اور اولاد کو اچھی تربیت دینے کی جو اہلیت ایک نیک ماں رکھتی ہے وہ ہرگز ایک بے دین ماں کو حاصل نہیں ہوتی۔ نیک اولاد پیدا کرنے اور نیک بچے بنانے میں ظاہری اسباب کے ماتحت نوے فیصد حصہ دیندار ماؤں کا ہوتا ہے۔ اچھی ماؤں کی نگرانی میں پرورش پانے والے بچے نہ صرف دن رات اپنی ماں کے نیک اعمال یعنی نماز روزہ تلاوتِ قرآن، صدقہ و خیرات، خدا رسول کی محبت، دینی غیرت وغیرہ کے نظارے دیکھتے ہیں اسی طرح ان کی ماں بھی شب و روز ان کے اعمال کو دیکھتی ہے اور ہر خلاف اخلاق بات اور ہر خلاف شریعت حرکت پر ان کو ٹوکتی اور شفقت و محبت کے الفاظ میں انہیں نصیحت کرتی رہتی ہے۔

ماں کا ہر اچھا فعل اولاد کے لئے ایک دلکش و حسین اور شیریں اسوہ ہوتا ہے اور ماں کا ہر قول جو اس کے کانوں میں شہد اور تریاق کے قطرے بن کر اترتا چلا جاتا ہے ان کے گوشت پوست اور ہڈیوں تک میں سرایت کر کے اور ان کے خون کا حصہ بن کر انہیں گویا ایک نیا جنم دے دیتا ہے۔ کاش دنیا اس نکتے کو سمجھ لے۔ گھر کا آقا اس نکتے کو سمجھ لے۔ بچوں کی ماں اس نکتے کو سمجھ لے اور کاش بچے بھی اس نکتے کو سمجھ لیں کہ بچوں کی تربیت کا فطری گہوارہ ماں کی گود ہے۔ نیک بہنو اور بیٹیو آج کی ماں اور کل کی ماں بننے والی لڑکیو! اگر قوم کو تباہی کے گڑھے سے بچا کر ترقی کی شاہراہ کی طرف لے جانا ہے تو سنو اور یاد رکھو کہ اس نسخہ سے بڑھ کر کوئی نسخہ نہیں کہ اپنی گودیوں کو نیکی کا گہوارہ بناؤ۔ اپنی گودوں میں وہ جوہر پیدا کرو جو ہری

کو ہٹاتا اور نیکی کو پروان چڑھاتا ہے جو شیطان کو دور بھگاتا اور انسان کو رحمان کی طرف کھینچ لاتا ہے۔

ماں کی نیکی کے بعد خود اولاد کی تربیت کا سوال پیدا ہوتا ہے اس ضمن میں سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ بچے کی تعلیم و تربیت کا زمانہ کس وقت سے شروع ہونا چاہیئے اس معاملہ میں اکثر ماں باپ اس خطرناک غلطی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ بچپن تو کھیل کود اور آزادی اور بے قیدی کا زمانہ ہے، جب بچہ ذرا بڑا ہونے لگا تو پھر اس کی تربیت کا وقت آئے گا یہ نظریہ سخت مہلک اور اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔ آنحضرت نے تاکیداً ارشاد فرمایا کہ ایک بچہ کے پیدا ہوتے ہی اس کے کان میں سب سے پہلی آواز اذان کی پہنچاؤ کیونکہ اذان کے الفاظ میں نہ صرف اسلام کی تعلیم کا خلاصہ آجاتا ہے بلکہ اس میں ایک زبردست دعوت کا رنگ بھی جس میں گویا مخاطب کو آواز دے کر بلایا جاتا ہے کہ اے سننے والے ادھر کان دھر اور صلوٰۃ اور فلاح کے رستے پر قدم زن ہوتا ہوا اس طرف چلا آ۔

رسول اکرمؐ کے اس مبارک ارشاد میں یہ صریح اشارہ ہے کہ بچہ کی تربیت اس کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جانی چاہیئے۔ یہ خیال کہ شروع میں تو بچہ کچھ سمجھتا ہی نہیں بالکل غلط اور باطل ہے کیونکہ اول تو خواہ وہ الفاظ کو سمجھے یا نہ سمجھے بہرحال کسی نہ کسی رنگ میں اس کی ولادت کے ساتھ ہی اس کے تاثر و تاثیر کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور دماغ کے غیر شعوری حصہ میں کچھ نہ کچھ نقش جمنے لگ جاتے ہیں۔

سو اسلامی تعلیم کے مطابق بچوں کی تربیت کا زمانہ ان کی ولادت کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے اور وہ ماں باپ بڑے ہی بدقسمت ہیں جو اپنے بچے کے چند ابتدائی سال اس غفلت میں گزار دیتے ہیں کہ ابھی وہ تربیت کے قابل نہیں۔ بچے کی آنکھوں کے سامنے زہر آلود نظارے آتے ہیں اور یہ دانی سے خیال کیا جاتا ہے کہ ابھی بچہ ان باتوں کا شعور نہیں رکھتا۔ بچے کے کانوں میں خلاف اخلاق اور خلاف شریعت باتیں پہنچتی ہیں اور یہ تسلی سے فرض کر لیا جاتا ہے کہ بچہ ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھتا اور نہیں جانتا اور اس سارے عرصہ میں ایک زہریلی فصل کا بیج بچہ کے دل و دماغ میں بویا جا رہا ہوتا ہے بیشک بچہ بسا اوقات اس کے زہریلے پن کو نہیں پہچانتا مگر زہر بہرحال زہر ہے اور اندر ہی اندر اپنا کام کرتا چلا جاتا ہے پس اولاد کی ولادت کے ساتھ ہی ان کی تربیت کا خیال شروع کر دینا چاہیئے کہ وہ ہمارے ہر فعل کو دیکھ رہے اور ہر قول کو سن رہے ہیں۔ یہ ایک نہایت لطیف نفسیاتی نکتہ ہے جو ہماری شریعت نے ہمیں سکھایا ہے اور ہر مسلمان باپ اور خاص طور پر ہر مسلمان ماں کا فرض ہے کہ وہ بچوں کے متعلق اپنے تربیتی پروگرام کو اس نکتے کی روشنی میں مرتب کرے جب اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ خاوند اور بیوی بچہ کی ولادت سے بھی پہلے آپس میں ملتے ہوئے اپنے ہونے والے بچہ کے متعلق شیطان سے دور رہنے اور خدا کی پناہ میں آنے کی دعا مانگیں کیا وہ بچہ کی ولادت کے بعد کئی سال تک تربیت اور اخلاقی نگرانی کے بغیر رہنے دے گا؟۔

اس کے بعد بچہ کی بلاواسطہ تربیت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ ہماری ساری تربیت اخلاقی اور روحانی بلکہ ایک حد تک جسمانی کا بھی مکمل ضابطہ قرآن موجود ہے جس کی عملی تفسیر سنّتِ رسول اور قولی تشریح احادیث صحیحہ ہیں۔ سو ہمارے لائحہ عمل کا تو کوئی سوال نہیں اور اپنے ساتھ ابدی زندگی کی اجارہ داری لے کر آیا ہے۔ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ بچوں کی تربیت سے تعلق رکھنے والی بہت سی باتوں میں سے کن باتوں کو مقدم کیا جائے سو اس کے متعلق قرآن مجید کے بالکل شروع میں ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ"

"یہ قرآن متقیوں کے لئے ہدایت نامہ بن کر آیا ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور

نماز کی پابندی سے ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے (ہمارے راستہ میں) خرچ کرتے ہیں:

یہ لطیف قرآنی آیت اسلامی تعلیم کا ایک ایسا خلاصہ ہے جس سے بہتر خلاصہ تصور میں نہیں آسکتا۔ دین تین حصوں میں تقسیم شدہ ہے اول ایمان کا حصہ جو زبان کی شہادت اور دل کی تصدیق سے تعلق رکھتا ہے اور پھر عمل کے حقوق حقوق اللہ اور حقوق العباد پر مشتمل ہیں یعنی بعض حقوق تو خدا کے متعلق ہیں اور بعض بندوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ یہ قرآنی آیت ان تینوں حصوں یعنی ایمان باللہ، حقوق اللہ اور حقوق العباد کے متعلق آیت جاتی ہے کہ ایمانیات کی بنیاد غیب پر ہے یعنی ایسی نظر آنے والی چیزوں پر ایمان لانا جو انسان کے اخلاق اور روحانیت کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں یہ چیزیں اسلام کی تعلیم کے مطابق خدا، اس کے فرشتے، اس کی کتابیں، اس کے رسول اور یوم جزا و سزا نیز تقدیر خیر و شر ہیں۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ان سب چیزوں پر جو آنکھوں سے تو نظر نہیں آتیں مگر دل اور دماغ کی روشنی سے دیکھی جاتی ہیں ایمان لائے کیونکہ بغیر ایمان لائے کسی انسان کے دین کی عمارت اور انسان کے عمل صالح کی بنیاد مکمل نہیں ہو سکتی۔

مسلمان ماؤں کا پہلا فرض اپنی اولاد کو اپنی بنیادی ایمان پر قائم کرنا ہے ہر مسلمان بچے کے دل میں یہ بات راسخ ہو کر میرا ایک خدا ہے۔ پھر اس کا ایمان فرشتوں کے وجود پر ہو۔ خدا کی نازل کردہ کتابوں پر اس کا ایمان . . . .

. . اس کے دل میں یہ بات بھی راسخ ہو کر خدا تو دنیا کی اصلاح کے لیے وقتاً فوقتاً اپنے رسول بھیجتا رہا ہے اور ان میں سے سب سے افضل اور آخری محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو خاتم النبیین ہیں۔ ہر مسلمان بچے کے دل میں حسن قول اور حسن فعل کے ذریعہ یہ ایمان پیدا کرنا مسلمان ماؤں کا فرض ہے۔

ایمان کے بعد عمل کا مرحلہ ہے۔ ایمان قائم کرنے کے بعد ماؤں کا اولین فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں میں دو بنیادی نیکیاں راسخ کرنے کی کوشش کریں ایک ان کے دل میں بچپن سے ہی نماز کا شوق پیدا کریں اور اس کا عادی بنائیں اور دوسرے بچوں میں خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت پیدا کریں نماز پڑھتے ہوئے وہ سوچیں کہ ہم خدا کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں وہ ہمیں اور ہم اسے دیکھ رہے ہیں اور مال خرچ کرتے ہوئے انہیں احساس ہو کہ ہم اپنا فرض نبھا رہے ہیں۔

اسلام کی بیٹیوں کو آج سے اس بات کا عہد کرنا چاہیئے کہ انہیں اپنے بچوں میں یہ دو نیکیاں بہرحال پیدا کرنی ہیں اور اس کے علاوہ اپنے بچوں کو بزرگوں کا ادب کرنا اور سچ بولنا سکھانا ہے۔ وہ مرتے مر جائیں مگر ان کی زبان سے جھوٹ نہ نکلے۔ اس کے بعد ان کی بہتری کے لیے ہر وقت دعا بھی کرتی رہا کریں۔ اگر پانی جیسی سیال چیز قطرہ قطرہ گر کر پتھر جیسی سخت چیز میں دائمی نقش پیدا کر سکتی ہے تو ماں کی شب و روز کی نصیحت بچوں کو ان چیزوں کی طرف کیوں مائل نہیں کر سکتی مگر وہی بات کہ ماں خود نیک اور دیندار ہو۔ ورنہ پھر :۔

"اے مسلمان مرد تیرا فرض ہے کہ دیندار اور با اخلاق بیوی سے شادی کر ورنہ تیرے ہاتھ ہمیشہ خاک آلود رہیں گے"

(حدیث)

نوٹ :۔

اس مضمون کے سلسلہ میں مجھے اپنی بہنوں اور بھائیوں سے یہ بھی کہنا ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بلا ضرورت اور بلا کسی مجبوری کے ملازمت کرنے سے گریز کریں ورنہ ان حالات کی جو ہمارے رسول اکرم صلعم نے فرمائی ہیں تکمیل نہیں ہو سکتی۔ ملازمت کرنے کے بعد تو انہی کے پاس اتنا وقت ہی کہاں رہتا ہے کہ وہ بچوں کی اس طرح کی تعلیم و تربیت دے سکیں جیسی اسلام چاہتا ہے۔ (نسیم انجولوی)

ضرورت رشتہ

ایک کاروباری سنی المذہب نوجوان عمر تقریباً ۳۰ سال آمدنی ماہانہ تقریباً ڈھائی ہزار روپیہ کے لئے رشتہ مطلوب ہے لڑکی امور خانہ داری سے واقف اور دینی تعلیم یافتہ اور خوبصورت ہو۔ صرف وہی والدین خط و کتابت کریں جو کاروباری ہوں۔ خط و کتابت صیغہ راز میں رکھی جائے گی بمعرفت مدیر حریم لکھنؤ

تفسیر سورۂ رحمٰن منظوم

— جوش ملیح آبادی

فَبِاَیِّ آلَاۗءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

اے فنا انجام انساں کب تجھے ہوش آئے گا — تیرگی میں ٹھوکریں آخر کہاں تک کھائے گا
اس تمرّد کی روش سے بھی کبھی شرمائے گا — کیا کرے گا سامنے سے جب حجاب اٹھ جائے گا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

یہ سحر کا حسن، یہ روشن ستارے، یہ فضا — یہ معطر باغ، یہ سبزہ، یہ کلیاں دل رُبا
یہ بیاباں یہ کھلے میدان کی ٹھنڈی ہوا — سوچ تو کیا کیا کیا ہے تجھ کو قدرت نے عطا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

خلد میں حوریں تری مشتاق ہیں آنکھیں اٹھا — نیچی نظریں جن کا زیور جن کی آرائش حیا
جن و انساں میں کسی نے بھی نہیں جن کو چھوا — جن کی باتیں عطر میں ڈوبی ہوئی جیسے صبا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

اپنے مرکز سے نہ چل منہ پھیر کر بہرِ خدا — بھولتا ہے کوئی اپنی ابتداء و انتہا
یاد ہے وہ دور بھی تجھ کو جب تو خاک تھا — کس نے اپنی سانس سے تجھ کو منور کر دیا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

سبز گہرے رنگ کی بیلیں چڑھی ہیں جا بجا — نرم شاخیں جھولتی ہیں رقص کرتی ہے صبا
پھل وہ شاخوں میں لگے ہیں دلفریب و خوشنما — جن کا ہر ریشہ ہے قند و شہد میں ڈوبا ہوا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

پھول میں خوشبو بھری جنگل کی بوٹی میں دوا — بحر سے موتی ابھارے صاف روشن خوشنما
آگ سے شعلہ نکالا ابر سے آبِ صفا — کس سے ہو سکتا ہے اس کی بخششوں کا حق ادا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

ہر نفس طوفان ہے ہر سانس ہے اک زلزلہ — موت کی جانب رواں ہے زندگی کا قافلہ
مضطرب ہر چیز ہے جنبش میں ہیں ارض و سما — ان میں قائم ہے تو تیرے رب کے چہرے کی فضا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

صبح کے شفاف تارے سے برستی ہے ضیا — شام کو رنگ شفق کرتا ہے اک محشر بپا
چودھویں کے چاند سے بہتا ہے دریا نور کا — جھوم کر برسات میں اٹھتی ہے متوالی گھٹا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

حریمی دسترخوان

آج ہم آپ کو شاہی کھیر بنانے کی ترکیب بتائیں گے یہ حیدر آباد دکن کی مشہور میٹھی ڈش ہے۔

اشیاء۔ پچاس گرام چاول۔ دودھ ایک کیلو لوکی ۲۵۰ گرام۔ ساگو دانہ۔ چاول پسے ہوئے پچاس گرام پستہ و بادام ۲۵-۲۵ گرام۔ شکر ۲۵۰ گرام یا کچھ زائد۔ جتنی آپ پسند کریں زعفران اگر ممکن ہو تو ½ گرام ورنہ روح کیوڑہ ۲۵ گرام۔

ترکیب:۔ ۱۔ چاول چن کر دھوئیں پھر انھیں باریک کپڑے میں باندھ کر لٹکا دیں پندرہ بیس منٹ بعد انھیں صاف سل پر باریک پیس لیں۔

۲۔ لوکی چھیل لیں کدوکش کر لیں۔ درمیان کا سفید گودا اور بیج پھینک دیں۔

۳۔ بادام بھگو کر نرم کر لیں۔ پھر اس کے چھلکے اتار لیں۔ بادام اور پستہ کی باریک ہوائیاں کتر لیں۔

۴۔ دودھ کو ابالیں اور پندرہ بیس منٹ تک دھیمی آنچ پر پکائیں۔

۵۔ کدوکش کی ہوئی لوکی دودھ میں ڈال کر پکائیں۔

۶۔ دس پندرہ منٹ بعد اس میں ساگو دانہ بھی شامل کر دیں۔

۷۔ جب لوکی بالکل گل جائے تو دودھ میں پسے ہوئے چاول ڈال کر پکائیں۔ چمچہ ہلاتی رہیں تاکہ گٹھلیاں نہ بنیں۔

۸۔ گاڑھی ہو جانے کے بعد دودھ میں چینی شامل کر دیں اور چند منٹ پکا کر اتار لیں۔

۹۔ بادام پستے بھی ڈال دیجئے۔ زعفران یا روح کیوڑہ بھی شامل کر کے اتار لیجئے۔ ڈش میں اور ممکن ہو تو مٹی کی سکوریوں میں نکال کر چاندی کا ورق لگا دیں۔

مرسلہ
زاہدہ خاتون
گلبرگہ

لکھنؤ اپنی تہذیب و تمدن

کے لئے سارے ہندوستان ہی میں نہیں ساری دنیا میں مشہور تھا لیکن افسوس کہ انقلابات زمانہ نے لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کو خاک میں ملا دیا ـــــــ آج اس تہذیب کا ذکر صرف کتابوں میں ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ لوگ آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس تہذیب و تمدن کو دیکھیں اور لکھنوی لوگوں کی شیریں زبانی سے لطف اندوز ہوں۔ لیکن اب اس زبان کے بولنے والے بھی نظر نہیں آتے جو "حضرت پہلے آپ" "پہلے آپ" کہا کرتے تھے۔ اور اس مٹی ہوئی تہذیب و تمدن کے علمبردار کچھ رہ بھی گئے ہیں تو وہ گوشہ نشین ہیں اور ان تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ اپنا سب کچھ کھو کر اب وہ باہر نکلتے بھی شرماتے ہیں۔ کیسا عروج اور اب وہ کیسا زوال ہے۔

لیکن لکھنؤ میں جو چیزیں فنا نہ ہو سکیں وہ ہیں شاہی امام باڑے اور وہ کاریگر اور ہنرمند جو آج بھی اپنی کاریگری اور سبک دستی کے ایسے شاہکار پیش کر رہے ہیں جو آپ اپنی مثال ہیں۔

چکن، زردوزی، کامدانی اور بادلے وغیرہ کے کام یہاں کے کاریگر ایسا کرتے ہیں کہ دیکھنے والے محو حیرت رہ جاتے ہیں۔ لچکہ، گوٹہ، پٹھا، کرن اور ستارے وغیرہ کا کام بھی بیحد نفیس بنتا ہے۔

آئیڈیل — ایک لاعلاج بیماری

(رضوانہ قادر)

تصور میں چلے آؤ کہ ہم دید ہی کر لیں
تمنا تم سے ملنے کی تو پوری ہو نہیں سکتی

آپ حیران ہوں گے کہ یہ کسی ذاتِ شریف کو دعوت دی جا رہی ہے۔ جی یہ وہی آئیڈیل صاحب ہیں جو آج کل ہر ایک کے اعصاب اور دل و دماغ پر ہر وقت چھایا رہتا ہے اور جو کبھی نہیں مل سکتا اور جسے حقیقت میں نہیں بلکہ خوابوں اور خیالوں میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

میں ایک ایسی لڑکی ہوں جسے آئیڈیل سوچنے والوں سے چڑ ہے۔ دراصل چھوٹی سی عمر میں ہی کچھ ایسے واقعات سنے، پڑھے کہ آئیڈیل کے نام سے ہی خوف آنے لگا۔ حال ہی میں نے ایک اور گفتگو اس بارے میں سنی۔ شاید یہی گفتگو میری زندگی کا ایسا حادثہ تھا۔ جس نے مجھے یہ الفاظ لکھنے پر مجبور کر دیا۔

ہوا یوں کہ ایک روز میں کالج میں ایک دیوار کے سائے میں بیٹھی اپنی کتاب پڑھ رہی تھی کہ قریب سے ایک لڑکی ہنستی قہقہے لگاتی میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ پہلے تو میں نے توجہ نہ دی مگر جب یہ الفاظ میرے کانوں میں پڑے کہ۔

"سیما تمہارا آئیڈیل تو تمہیں مل چکا ہے۔ پھر تم اتنی افسردہ سی کیوں رہتی ہو" تو میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور ان کی باتیں سننے لگی کیونکہ یہ موضوع میری کمزوری تھا۔ میں سیما صاحبہ کے جواب کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی کہ ایک آواز ابھری۔

"ہاں۔ تم ٹھیک کہتی ہو کہ مجھے میرا آئیڈیل مل گیا ہے۔ اب میں اسے چھوڑ رہی ہوں"

"کیوں؟ وہ تو اب تمہارا منگیتر بن چکا ہے"

"ہاں لیکن۔ دنیا بھر کی دولت پاکر بھی میں خوش نہیں ہوں۔ سہیل خوبصورت بھی ہے اور دولت مند بھی ہے۔ اس کے پاس کسی شے کی کمی نہیں۔ لیکن۔ کل شام مجھے پتہ چلا ہے کہ اس کا ایک پاؤں کسی حادثے میں ٹوٹ چکا ہے اس لئے میں اسے چھوڑ دوں گی۔ میں شادی سے صاف انکار کر دوں گی۔ کیونکہ میرا آئیڈیل یہ بھی تھا کہ میرے شوہر کے ہاتھ پاؤں سلامت ہوں۔ اس لئے میں نے آخری فیصلہ کر لیا ہے"

اتنے میں بیل ہوئی اور میں اپنی کلاس میں بھاگ گئی۔ لیکن سیما صاحبہ کے الفاظ ذہن میں کانٹوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ میں سوچتی ہوں کیا واقعی یہ آئیڈیل ہی نہیں جو ہلتے گھروں کو اجاڑ دیتا ہے اور سرسبز باغ کو ویران کر دیتا ہے۔ اگر سیما نے ایسا فضول قسم کا آئیڈیل نہ سوچا ہوتا تو شاید یہ وقت دو آتما جوان کی خوشیوں کو پامال کر کے آگے نکل گیا۔

انسان دنیا میں تنہا آتا ہے اور تنہا واپس لوٹ جاتا ہے شاید اسی بناء پر وہ دنیا میں تنہا رہنا پسند نہیں کرتا۔ یہاں رہنے کے لیے وہ مختلف سہارے ڈھونڈتا ہے جن سہاروں کی مدد سے وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ انہی میں سے ایک سہارا آئیڈیل بھی ہے۔ اس کی تمام عمر آئیڈیل تلاش کرتے بیت جاتی ہے

ہر انسان کے دل میں ایک شیشہ ہوتا ہے اور ہر شیشے میں ایک تصویر ہوتی ہے جو اس کا آئیڈیل کہلاتی ہے لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ اگر تصویر بیک اینڈ وائٹ ہو تو وہ اسے کلرڈ بنانے کی کوشش کرے گا۔ چاہے اس کوشش میں اس کے آئیڈیل کا چہرہ دھندلا ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اس طرح جب وہ کسی دوسرے شخص کا آئیڈیل بنے گا تو اپنا اچھا بھلا آئیڈیل چھوڑ کر اس میں نئی نئی تبدیلیاں پیدا کرے گا۔

زندگی کے سفر میں ہر شخص بہترین شریک سفر کی تمنا کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے خیال کے مطابق زندگی کا ساتھی مل جائے۔ لیکن اس کے لئے خود کو یہ کہنا بھی ضروری ہے۔

دوسروں کے بارے میں سوچنے سے پہلے اپنے آپ کو پہچاننا پڑتا ہے۔ آئیڈیل اپنے مطابق بنایا جائے تو زندگی سنور سکتی ہے
آئیڈیل بنانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب کسی اچھی چیز کو دیکھا تو بے ساختہ پکار اٹھے۔ او ہو۔ یہی تو میرا آئیڈیل ہے
آئیڈیل کھلونا نہیں ہوتا کہ ذہن میں ایک پیکر تراشا، اپنایا کچھ دیر کھیلا اور توڑ کر پھینک دیا اور نئے کھلونے کی تلاش میں چل دیئے۔ یہ تو خود اپنے آپ کو گمراہ کرنے والی بات ہے اور جو اپنے آپ کو خود گمراہ کرلے اسے کوئی دوسرا کیسے راہ پر لاسکتا ہے۔ آئیڈیل سوچ کر ان کی تلاش کرنا خود کو دوسروں کا محتاج بنا دیتا ہے اور جو شخص خواہ مخواہ اپنے آپ کو محتاج بنالیتا ہے وہ ہمیشہ محتاج ہی رہتا ہے۔

جانے کیوں بعض اوقات لوگ اپنی خوبصورت دنیا کو چھوڑ کر اس دنیا کی طرف چل دیتے ہیں جہاں بناوٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اور جب اپنے کیئے پر پچھتاتے ہیں تو اچانک قدم رک جاتے ہیں۔ پھر وہ اپنی اسی حسین دنیا میں لوٹ جانا چاہتے ہیں۔ مگر وہ دنیا تو اب ویران ہو چکی۔ وہ مکان اجڑ چکا۔

——— وہاں دستک دینا فضول ہوتا ہے۔ وہ باغ تو اب باغ نہیں رہا۔ وہاں کی سبز ڈالیوں کو دیمک چاٹ چکی ہے۔ جو اب کبھی ہری نہیں ہوسکتی۔

آئیڈیل کے چکر میں اچھا بھلا آدمی پھنس جائے تو دوبارہ باہر نہیں نکل سکتا۔ یہ ایک اندھا کنواں ہوتا ہے یہاں گرنے والے باہر نہیں نکل سکتے۔ کوشش کریں تو اور بھی اندر دھنستے جاتے ہیں۔ کتنا اچھا ہو اگر انسان اس دلدل میں پاؤں ہی نہ ڈالے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ریت پر تصویر چند منٹوں کے لیے بنتی ہے پھر ہوا، بارش یا آندھی اسے ایک پل میں مٹا کر رکھ دیتی ہے، وہ تصویر ضرور بناتا ہے۔ جب تصویر مٹ جاتی ہے تو اپنی حالت پر افسوس کرتا ہے۔

میری دور کی رشتے دار کی ایک لڑکی جو مجھ سے بھی چار سال چھوٹی ہے۔ ایک روز آئی اور مجھے کہنے لگی۔ رضوانہ تمہارا کوئی آئیڈیل ہے؟

میں نے جواب دیا: ہاں! تو وہ بڑی خوش ہوکر بولی میرا بھی آئیڈیل ہے۔ میں نے پوچھا کیا؟ تو وہ کہنے لگی: میرا آئیڈیل وہ شخص ہے جو بہت دولت مند ہو۔ جو میری منگنی پر دس تولے اور دس ہزار روپے تحفے میں دے۔ ٹیپ ریکارڈ ساتھ لائے۔ جو نہایت خوبصورت ہو۔ یعنی سبز آنکھوں والا رنگ بہت گورا سینہ بہت چوڑا اور لڑکیوں کی طرح پتلی ہو اور قد چھ فٹ سے ذرا نکلتا ہوا ہو، مونچھیں بالکل نہ ہوں۔ وہ سگریٹ ضرور پیتا ہو۔ یہ لڑکی معلوم نہیں کب تک اپنے پری پیکر آئیڈیل کا انتظار کرتی رہے گی۔

یہ آئیڈیل ہی بلائے ناگہانی ہے۔ جس کی وجہ سے گھر اجڑتے ہیں۔ دراصل وقت کے ساتھ لوگوں کے خیالات بھی بدل گئے ہیں جوں جوں وقت آگے جارہا ہے۔ آئیڈیل بھی ترقی پا رہے ہیں بعض لوگ تو آئیڈیل پا کر بھی خوش نہیں رہتے۔ پھر اسکی وجہ کیا ہے؟ اگر سب کچھ آئیڈیل ہی ہوتا ہے۔ تو دنیا اتنی افسردہ اور غمگین کیوں دکھائی دیتی ہے۔ یہ پھر بھی خوش نہیں رہتی ویسے تو آئیڈیل جیسی لاعلاج بیماری میں آج کل سبھی مبتلا ہیں۔ ہوسکتا ہے اسکے جراثیم مجھ میں بھی ہوں۔ کیونکہ مرد ہو یا عورت دونوں ہی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ جب انہیں کوئی کام نہیں ملتا تو بھاگتے ہیں آئیڈیل کی طرف۔

اب مردوں کو ہی لیجیے۔ اگر کسی مرد نے اپنا آئیڈیل تلاش کرلیا تو اسے یقین ہوجاتا ہے کہ یہی ہے وہ ہستی جو صدیوں سے میرے ذہن میں تھی۔ اور جس کے لیے میں نے دربدر کی ٹھوکریں کھائیں۔ چنانچہ وہ اسے اپنا لیتا ہے اور شادی رچالیتا ہے چار دن تو ہنستے کھیلتے گزر جاتے ہیں۔ مگر جب تم اس میں اچھے آئیڈیل کی خوبیاں تلاش کرتے ہو۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمارے خوابوں کی شہزادی تو نہیں بلکہ ایک عام سی لڑکی ہے۔ پھر تم اپنی محبت کو ناکام سمجھنے لگتے ہو۔ اور ایک بار پھر اپنے آئیڈیل کو ذہن میں سجا کر اس کی تلاش میں چل نکلتے ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ زندگی اجیرن ہوتی ہے تو آئیڈیل کی وجہ سے آئیڈیل اپنی منزل سے دور لے جاتے ہیں اور ہنستی مسکراتی دنیا کو ویران کردیتے ہیں۔ ہم آئیڈیل کو پانے میں فکر اس کی اہمیت کھودیتے

ہو۔کوئی پسند ہے تو اس سے شادی کرو اور نبھاؤ۔ یہ مت کہو کہ فلاں میرا آئیڈیل ہے۔ اب تو آئیڈیل بیچارہ تنگ آکر خود بھی پکار اٹھا ہے۔

میرے پیچھے نہ چلو میری تمنا نہ کرو
سائے پھر سائے ہیں کچھ دیر میں ڈھل جائیں گے

اکثر سوچتی ہوں کہ یہ لوگ ہمیشہ خوبصورت آئیڈیل کیوں بناتے ہیں۔ آج کسی زبان سے یہ نہیں سنا کہ مجھے تو وہ پسند ہے "جس کا رنگ کالا ہو۔ جس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہوں۔ عام سے نقوش کی مالک ہو۔" لڑکا ہو یا لڑکی دونوں کا خیال ہمیشہ یہی کیوں ہوتا ہے کہ "ہماری پسند تو نشیلی آنکھوں والا لڑکا یا لڑکی ہے۔ اس کا رنگ گورا ہو۔ اس کی چال ایسی ہو۔ اس کے ہاتھ اس کے بال ایسے ہوں۔" کیا آئیڈیل صرف یہی ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو آئینے میں جھانک کر یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ "خود تم میں کسی کا آئیڈیل بننے کی صلاحیت ہے؟"

اکثر یہی ہوتا ہے کہ آئیڈیل تلاش کرنے والوں کو ان کا آئیڈیل تو مل جاتا ہے۔ مگر چلنے والا خود اپنے آئیڈیل کی تلاش میں آجاتا ہے۔

یہاں کسی کو بھی کچھ حسب آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

آئیڈیل پا کر کھو دینے سے کہیں بہتر ہے کہ فالتو خیالات کو ذہن میں جگہ ہی نہ دی جائے۔ ایسے لوگوں کی زندگی ہمیشہ ویرانوں میں گم ہو جاتی ہے۔ ایسی خواہشوں کے مکمل ہونے کی جتنی امید رکھی جائے اتنی ہی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ ایسے خیالات شروع میں تو شہد کی طرح شیریں مگر انجام کار زہر کی طرح کڑوے ہوتے ہیں اور تم تو اپنے آئیڈیل کو پا لینے کے بعد بھی خوش نہیں رہتے۔ یہی تمہاری زندگی کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے اور یہ بدقسمتی تم خود اپنے دامن میں ڈالتے ہو۔ تم آئیڈیل کو پا لینے کے بعد اسے بیچ منجدھار میں کیوں لے جاتے ہو اور پھر پوچھتے ہو کنارہ پسند ہے یا نہیں۔؟

انسانوں کے ساتھ سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ وہ زندگی کی بساط پر محبت کی بازی ہار جاتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف ان کا آئیڈیل ہے۔ تلاش کرنے سے وہ مل جائے تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ مگر رفتہ رفتہ جب پرانی ڈگر پر آ نکلے تو باہم اختلافات شروع ہو جاتے ہیں۔ دونوں برابر کی چوٹ کرتے ہیں۔ اس کے بعد علیحدگی، طلاق اور پھر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے ہر خوشی لٹ جاتی ہے اور اپنی گذری ہوئی دنیا اور بیتی ہوئی گھڑیاں یاد آتی ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہو تو محرومیاں اور اداسیاں منہ چڑاتی نظر آتی ہیں۔ سکون تلاش کرتے ہو۔ مگر سکون ختم ہو چکا ہے پہلے سکون تمہارے قریب تھا تو تم نے اسے پوچھا بھی نہیں۔ اب وہ چل بھی دیا اور تم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

تم خود تو ایک خوبصورت لڑکی کو تلاش کر لیتے ہو۔ مگر یہ نہیں سوچتے کہ ہو سکتا ہے کہ اسے بھی ایک خوبصورت مرد کی تلاش ہو اور سب بچھڑ جہیں اسی موڑ پر برسوں کی بندھی ہوئی زنجیر۔ جو سوچ کی سلاخوں سے باندھی گئی تھی، چھناکوں کے ساتھ ہی ٹوٹ کر بکھر گئی۔ اسے محبت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو انسان کا دھوکا ہوا۔ محبت تو اندھی ہوتی ہے۔ اس میں چہروں کی تمیز نہیں ہوتی آج کل تو یہی سننے میں آتا ہے کہ اگر دولت نہیں تو لڑکی حسین ضرور ہو۔ اور اگر لڑکی بدصورت ہے تو دولت بے پناہ ہو۔ ایسا سوچنے والے لوگ ضرور کسی نہ کسی موڑ پر ٹھوکر کھا کر گرتے ہیں۔

زندگی آخر ہے کیا؟ کیا آئیڈیل بنانا ہی زندگی ہے۔؟ شاید زندگی تلخ تجربات کے ایک لامتناہی سلسلے کا نام ہے۔ بعض تجربے تو ایسے ہوتے ہیں کہ انسان ان کو بیان بھی نہیں کر سکتا۔ سنتا ہے چپ رہتا ہے۔ دنیا تو کانٹوں کی سیج ہے۔ عقلمند ان سے نہیں الجھتے۔ وہ الجھتے وہ الجھے ہوئے دامن کو جھٹکا دے کر چھڑانے کی بجائے آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں جو کم حوصلہ ہیں وہ اتنی زور سے جھٹکا دیتے ہیں کہ دامن چاک ہو جاتا ہے۔ اس دھرتی پر کیا کچھ نہیں ہوتا۔ ہر شخص اپنی جگہ ایک کھلونا ہے اور خود ہی کھیلنے والا بھی ہے۔ میں تو جب اس بارے میں سوچتی ہوں تو میرا دم گھٹتا ہے

نہ پوچھو عالم کسی کی اداس چہرے کا + ہر ایک شخص کو یہاں اک تماشا کا

کاغذ کا ایک حقیر ٹکڑا؟

شمیم اختر

سڑک کے کنارے لگے ہوئے دو رویہ درختوں میں ایک
آدھ درخت ایسا ضرور ملتا ہے جس میں کبھی کوئی پھول پھل نہیں
لگتا۔ اس کے پتے ہمیشہ سرخ رہتے ہیں۔ وہ خزاں کے درد اور
بہار کی خوش رنگی سے ناآشنا رہتا ہے۔ کوئی گھن اس کے تنے
کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے لیکن باہر سے تنے کا خول جوں کا
توں رہتا ہے۔ کسی روز آندھی کا ایک ہی بگولا اسے زمین بوس کر دیتا
ہے۔ مگر کبھی اسے آندھی کے بگولے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی
اور وہ دن یا رات کے کسی پہر زمین پر آن رہتا ہے۔ بے اولاد
عورت کو دیکھ کر مجھے ایسے ہی کسی ایک درخت کا خیال آتا ہے۔

ریل کے ڈبے میں میرے سامنے جو عورت بیٹھی تھی اس کی آنکھوں میں عجیب ویرانی
تھی۔ اس کی عمر ۳۰ سال کے قریب تھی اس کا رنگ صاف تھا مگر رنگت میں تازگی نہ تھی۔ چہرے پر
پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ ریل کے ہچکولوں سے دوپٹہ اس کے سر سے ڈھلک جاتا تو
اس کے ہاتھ مشینی انداز میں اٹھتے اور وہ پلے کو بالوں پر کھینچ
لیتے۔ وہ بڑے محتاط انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے گھٹنے
جڑے ہوئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر تلے گود میں رکھے
ہوئے تھے۔ لگتا ہے کہ وہ اپنی قمیص کا دامن یا شلوار کی کنی
درست کر رہی تھی۔ یوں تو وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر بھاگتے
ہوئے درختوں کو دیکھتی رہی۔ لیکن جونہی کوئی اسٹیشن آتا وہ فوراً
اپنی کھڑکی کی جانب پیٹھ کر لیتی اور نگاہیں جھکا لیتی۔ میں نے
اس سے بات کرنے کی خاطر کئی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کر دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ بڑی مہارت سے نگاہیں چرا
لیتی تھی۔ اس کے جسم کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے اسے کسی شکنجے
میں کس دیا گیا ہو تاکہ وہ پھلنے پھولنے نہ پائے۔

عورت کے سراپا کا جائزہ لینے کے بعد میں سمجھ گئی کہ وہ ایک
بے اولاد عورت ہے بے اولادی نے اسے ایک عجیب سے
خوف میں جکڑ رکھا ہے۔ شاید یہی وہ شکنجہ ہے جس میں اس
کا بدن کس کر رہ گیا ہے۔ اس کی خاموشی نے اس کے ذہن میں [illegible]
کا انبار لگا رکھا ہے۔ اس کے دن اور راتیں ہراس میں گزرتی
ہیں۔ شوہر کے وجود نے اسے تحفظ کے بجائے بے یقینی کے احساس
میں مبتلا کر رکھا ہے۔

ریل کے ڈبے میں بھیڑ نہیں تھی۔ ایک معمر عورت برتھ پر
لیٹی خراٹے لے رہی تھی۔ جب بھی کسی اسٹیشن پر گاڑی رکتی۔
ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلتی وہ کروٹ بدلتی اور پھر منہ
سے سو جاتی۔ جب میرا تیسرا بچہ بھی برتھ پر سو گیا تو میں نے
سوچا کہ سامنے بیٹھی ہوئی عورت نے میرے خیالات کو بڑی
دیر سے الجھا رکھا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ میں اس سے بات چیت
کر کے اپنے تجسس کی تسکین کر لوں۔ ایسا نہ ہو کہ اگلے اسٹیشن
پر اتر جائے اور میرے دل کی باتیں دل ہی میں رہ جائیں۔
میں بال بچے دار عورت ہوں۔ میرا دل ایک لمحہ مصروفیت میں
کٹتا ہے۔ چند گھنٹوں بعد مجھے یاد بھی نہ رہے گا کہ ٹرین کے
سفر میں کون میرے سامنے بیٹھا تھا اور کون نچلی برتھ پر
محو خواب تھا لیکن جب تک میرے بچے نیند سے بیدار نہیں
ہوتے، سامنے بیٹھی ہوئی عورت کے بارے میں میری خیال
آرائیاں تمام نہ ہوں گی۔

میں نے اپنی ٹوکری سے دو کیلے نکالے ایک خود کھایا اور
دوسرا اس کی جانب بڑھاتے ہوئے میں نے کہا "تم کئی
گھنٹوں سے بھوکی پیاسی بیٹھی ہو۔ لو یہ کیلا کھا لو۔ اکیلی سفر کر رہی
ہو۔ مجھے یاد آ رہا ہے [illegible]
باہر قدم نہیں نکالا۔ ساتھ ہوتے ہیں تو تمام [illegible]

ہے لیکن جب ساتھ نہیں ہوتے تو دل کا سکون برباد ہوتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ ایک دفعہ کسی عورت کے بچے ہو جائیں تو اسے اپنا آرام بھول جانا چاہیئے۔ اس وقت اس کی زندگی کا یہی مقصد رہ جاتا ہے کہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرے۔ لیکن تمہیں ضرور کوئی مجبوری درپیش ہوگی کہ بچوں کو گھر چھوڑ کر آئی ہو۔"

اس نے سراسیمہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ کیلے کی جانب اس کا بڑھتا ہوا ہاتھ وہیں رک گیا۔ وہ بڑی سپاٹ آواز میں کہنے لگی "آپ کا بہت شکریہ۔ مجھے قطعاً بھوک نہیں ہے۔ یہ کیلا بھی آپ ہی کھا لیں آپ نے بھی تو دیر سے کچھ نہیں کھایا۔"

میں نے دوسرا کیلا کھاتے ہوئے کہا "تمہاری مرضی۔ میں تمہیں کیلا کھانے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ میرے خیال میں ایک عام آدمی کو بھوک نہ سہی پیاس تو ضرور لگنی چاہیئے۔ تم کہو تو میں تمہیں اپنے تھرماس میں سے برف کا ٹھنڈا پانی پینے کے لئے دے سکتی ہوں؟"

وہ کہنے لگی "میں کئی گھنٹوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ سے پانی کس طرح مانگوں؟"

مجھے اس کی بات نے حیرت میں مبتلا کر دیا۔ ایک پیاسے شخص کو پانی مانگنے کے لئے سوچ بچار کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن میں نے اس سے کچھ نہ کہا۔ مجھے یہ خیال تھا کہ کہیں میرے کچھ کہنے سننے سے وہ پانی پینے سے بھی انکار نہ کر دے۔ جب وہ پانی پی چکی تو میں نے کہا "تم نے اپنے بچوں کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔؟"

میرا سوال سن کر اس کی نظریں جھک گئیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ رہی۔ میں اس کے جواب کی منتظر تھی۔ پھر اس نے یوں نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا جیسے اسے اپنی کسی کوتاہی کا احساس ہو۔ میرے سوالیہ چہرے کو دیکھ کر اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "میں غیر شادی شدہ ہوں؟"

اس کا یہ انکشاف میرے لئے عجب خیز تھا۔ وہ کسی چھوٹے قصبے کے [illegible] سے تعلق رکھتی تھی عام طور پر چھوٹے شہروں میں لڑکیوں کی شادی [illegible] کر دی جاتی ہے [illegible] اس کی [illegible] بیس کا [illegible] کہ مجھے اپنی قیاس آرائی [illegible] اس لڑکی پر [illegible] ترس آیا۔ میں نے [illegible] ایسی لڑکیوں کو دیکھا تھا جو کسی قصبے میں پیدا ہوئیں۔ ان کو زندگی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع میسر آئے۔ جب وہ تعلیم حاصل کر کے اپنے قصبے میں واپس آئیں تو وہ نہ صرف اپنے گھر والوں کے لئے وبال بن گئیں بلکہ انہوں نے اپنے لئے بھی زندگی کو ایک مصیبت بنا لیا۔ ان میں سے بیشتر نے شادی نہ کی کیونکہ قصبے میں کوئی ایسا لڑکا نہ تھا جو ان کے قابل ہوتا۔ انہی کا حشر دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنی لڑکیوں کو دس جماعتوں سے زیادہ نہیں پڑھاؤں گی۔

اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد میں نے اس عورت سے پوچھا "یہ تو بتاؤ کہ تم نے کتنی جماعتیں پڑھ لی تھیں۔؟"

میرے لہجے کی کاٹ کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے وہ بولی "میں تو دس جماعتیں بھی پاس نہ کر سکی؟" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

میں خود بیٹیوں کی ماں ہوں۔ کسی پر تہمت لگاتے ہوئے خوف آتا ہے۔ اس لئے میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے سوچا کہ یقیناً اس کے کردار میں کوئی خرابی ہوگی جبھی اس کی شادی نہ ہو سکی۔ یہ سوچ کر میں نے اس کے ناک نقشے کو غور سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ اٹھارہ بیس سال کی عمر میں وہ خاصی حسین رہی ہوگی۔ میں اس کے بارے میں مزید جاننا چاہتی تھی۔ میں نے اپنی برتھ پر جگہ بناتے ہوئے اس سے کہا "آؤ یہاں آ کر میرے پاس بیٹھو۔ یہ تو بتاؤ کہ تم نے شادی کیوں نہ کی؟"

وہ بڑی سعادت مندی سے میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگی "میری بات پر کوئی بھی یقین نہیں کرتا۔ لیکن آپ مجھے ایک ہمدرد خاتون نظر آتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری بات کی سچائی پر یقین کر لیں گی۔ شادی کرنے یا نہ کرنے کے معاملے میں میرا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ میری شادی نہ ہو سکی۔ کیونکہ کوئی میرا رشتہ لے [illegible]"

[illegible] کے لئے میں نے بات بناتے ہوئے کہا "تم ایک شریف سلجھی ہوئی لڑکی دکھائی دیتی ہو [illegible] کہ کوئی تمہارا رشتہ لے [illegible]؟"

اب اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔ میں سمجھی کہ وہ آنسو پونچھنے کے لئے رومال نکالنا چاہتی ہے لیکن اس نے ایک لفافہ نکالا۔ لفافہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ اس میں کسی کا محبت نامہ اور تصویر ہوگی۔ اس کے بعد وہ مجھے ایک محبت بھری کہانی سنائے گی۔ جس میں اس نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا عہد کیا ہوگا اور لڑکے نے ناکامی سے دل برداشتہ ہوکر خودکشی کر لی ہوگی۔ لیکن جب اس نے لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک بوسیدہ چکنے کاغذ کی پٹی نکلی۔ اس پٹی کو میں نے فوراً ہی پہچان لیا کسی زمانے میں اون کے گولوں پر یہ پٹی لپٹی ہوئی آتی تھی۔ پٹی بالکل سادہ تھی۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا وہ کہنے لگی "اس کاغذ کا پرزہ آپ دیکھ رہی ہیں۔ اس نے میری زندگی ویران کردی۔ یہی میری شادی نہ ہونے کا ذمہ دار ہے۔

اس کی گفتگو پر اسرار ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ اب اس سے کوئی سوال پوچھنا بے کار ہے۔ اس وقت وہ خود ہی سبھی کچھ اگل دینا چاہتی ہے۔ میں کچھ نہ بولی، میں نے گلاس میں ٹھنڈا پانی ڈالا اور گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گئی وہ کہنے لگی: سردی کے دن تھے، میں دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ آدھی چھٹی کے وقت لڑکیاں اپنی سلائیاں اور اون کے گولے ہاتھوں میں لے کر اسکول کے میدان میں دھوپ سینکنے کے لیے بیٹھ جاتی تھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھی رہتی تھی۔ جونہی آدھی چھٹی ختم ہونے کا گھنٹہ بجتا۔ ہم سب اپنی اپنی سلائیاں سمیٹ کر کلاس روم کی طرف بھاگتے تھے۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ جیسے پرانی یادوں کو اپنے ذہن میں ترتیب دے رہی ہو۔ میں نے اس کے خیالات میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے اپنے دل میں کہا کہ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ جب میں بھی پڑھتی تھی تو سردی کے دنوں میں دھوپ سینکنے کے لئے اسکول کے میدان میں بیٹھتی تھی۔

ایک گہرا سانس لے کر وہ کہنے لگی، "ایک دن ہم میدان میں بیٹھے تھے کہ ایک لڑکی نے کہا "دیکھو، وہ سامنے والا مکان ڈھا رہے ہیں۔" ہم سب نے سامنے دیکھا تو واقعی بہت سے مزدور ایک مکان ڈھانے میں مصروف تھے۔ سامنے مزدوروں کی موجودگی سے ہمارے وہاں بیٹھنے کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا

ایک روز ہم نے دیکھا کہ پرانے مکان کی جگہ نئی دیواریں تعمیر ہو رہی تھیں۔ وہاں ایک لڑکا بھی تھا۔ لڑکے نے کوٹ پتلون پہن رکھا تھا۔ ہم ایک قصبے میں رہتے ہیں۔ اس قصبے میں کسی کے لیے کوٹ پتلون پہننا بہت بڑی بات ہے۔ آج سے بائیس تیئس سال قبل تو کسی امیر کا بیٹا ہی ایسا لباس پہن سکتا تھا۔ آپ خود سوچئے کہ میں بائیس، تیئس سال پرانی بات آپ کو سنا رہی ہوں۔ اس لڑکے کو دیکھ کر ہم سب لڑکیاں خاموش سی ہوگئیں فضا کچھ ایسی ہوگئی کہ گویا اب ہمارا وہاں بیٹھنا مناسب نہ تھا۔ لیکن کوئی لڑکی غیر شعوری طور پر اس بات پر آمادہ نہ تھی کہ وہ وہاں سے اٹھنے میں پہل کرے۔ اس پہل سے یہ اندازہ ہو جاتا کہ اس لڑکی نے وہاں لڑکے کی موجودگی کا نوٹس لیا ہے۔ اسی لئے سبھی لڑکیاں چھٹی کا گھنٹہ تمام ہونے پر ہی وہاں سے اٹھیں۔

دوسرے روز میں اس لڑکے کے بارے میں بالکل بھول چکی تھی۔ اگر مجھے یاد ہوتا کہ آدھی چھٹی کے وقت میدان میں بیٹھنے پر وہ لڑکا سامنے نظر آئے گا تو میں ہرگز میدان میں قدم نہ رکھتی میری طرح دوسری لڑکیاں بھی اس لڑکے کے بارے میں بھول چکی تھیں۔ اس لیے ہم سب معمول کے مطابق میدان میں پہنچے۔ جونہی ہم اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے تو ہماری نگاہیں اس لڑکے پر پڑیں۔ اب ہم اس کی موجودگی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی لئے ہم میں سے ہر لڑکی بڑھ بڑھ کر بول رہی تھی۔ ہم ساتھ ساتھ بنائی بھی کر رہی تھیں۔ پھر یہ ہوا کہ میری اون کا گولا تمام ہوگیا میں نے نیا گولا نکالا۔ اس کا سرا بنائی کے ساتھ جوڑا اور سلائی بننے لگی۔ میری سلائی کے چند خانے باقی تھے کہ آدھی چھٹی تمام ہونے کا گھنٹہ بج گیا۔ لڑکیاں کلاس روم کی طرف بھاگیں میں نے سوچا کہ چند خانے بن کر سلائی تمام کرلوں تو اچھا ہے۔ اس طرح مجھے میدان سے اٹھنے میں کچھ وقت لگا۔ میری گود میں اون کے گولے پر لپٹا کاغذ کا یہ ٹکڑا پڑا تھا۔ جب میں اٹھ

سلائیاں سمیٹ کر اٹھی تو میں نے کاغذ کی یہ چٹی وہیں میدان میں پھینک دی اور کلاس روم میں چلی آئی؛

"چھٹی کے وقت میں گھر جانے لگی تو گیٹ پر کھڑی لڑکیاں مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ لیکن ان کی نگاہوں کا مفہوم نہ سمجھ سکی۔ جب میں دوسرے دن اسکول پہنچی تو لڑکیاں میری جانب دیکھ کر ایک دوسرے کو کہنیوں سے ٹھوکے دینے لگیں میں اپنے کپڑوں کا جائزہ لینے لگی کہ آج کیا بات ہو گئی ہے۔ آخر ایک لڑکی میرے پاس آئی۔ اس نے جو کچھ مجھ سے کہا، اسے سن کر میری نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ سب کیسے ہوا اور اب میں اپنی بے گناہی کس طرح ثابت کروں۔ اس الزام کو سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے روتے ہوئے کہا "یہ جھوٹ ہے۔ قطعاً جھوٹ ہے۔ تم اسی وقت میرے ساتھ میدان میں چلو۔ ممکن ہے کہ اون کے گولے کا کاغذ میدان میں وہیں پڑا ہو۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں، اون کے گولے پر لپٹی ہوئی کاغذ کی چٹی میدان میں، میں نے پھینکی تھی"

وہ لڑکی میرے ساتھ میدان میں گئی۔ کاغذ کی یہ چٹی وہاں موجود تھی۔ میں نے کاغذ کی چٹی اٹھا کر اسے دکھائی۔ لیکن اس کی نظروں سے بے یقینی جھلک رہی تھی۔ وہ کہنے لگی "مجھے کیا کہتی ہو۔ جا کر ہیڈ مسٹریس کو بتاؤ۔ وہی تم سے سچ جھوٹ معلوم کریں گی۔"

اب وہ زار زار رونے لگی تھی۔ ہچکیوں میں ڈوبی ہوئی آواز میں وہ کہنے لگی "میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ اسکول کی ہر لڑکی کی زبان پہ یہ بات تھی کہ میں نے میدان میں ایک خط اس لڑکے کے نام پھینکا تھا۔ اور یہ کہ میں شام کو اس سے ملی تھی۔ یہ باتیں سننے کے بعد میرا دل غم میں ڈوب گیا۔ میں نے اسکول جانا بند کر دیا۔ یہ بات سارے قصبے میں پھیل گئی۔ گھر والے بھی مجھے شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ میں ہر وقت گھر میں رہنے لگی۔ ہنستے ہوئے ڈرتی تھی۔ مجھے اپنے بھائیوں اور بہنوں سے بات کرتے ہوئے خوف آنے لگا۔ میں چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ اس طرح بیٹھے بیٹھے میری زندگی کے بائیس سال گزر گئے۔ آج بائیس سال بعد میں اپنی کہانی آپ کو سنا رہی ہوں"

میں نے اس کی کہانی بڑی خاموشی سے سنی تھی۔ میں نے اسے اتنا بھی نہ کہا کہ کوئی بات نہیں۔ ایسی غلطیاں انسان سے زندگی میں ہوتی رہتی ہیں۔ اس قصے کو ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ میں اسے کچھ کہتی کیونکہ روتے روتے وہ نڈھال ہو گئی تھی اس پر غشی کی کیفیت طاری تھی۔ میں اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگی۔ اس کیفیت میں وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی، وہ شاید کہہ رہی تھی "بس کاغذ کا اتنا سا ٹکڑا!" میں نے غور سے سننے کی کوشش نہ کی۔ کیونکہ میرا اسٹیشن آ گیا تھا۔ تین بچوں اور پانچ صندوقچوں کے ساتھ سفر کرنا آسان نہیں"

لطیفے

ایک ان پڑھ لڑکی کی شادی ایک پڑھے لکھے ماڈرن لڑکے سے ہو گئی۔ شادی کے بعد شوہر جب رات گئے گھر آتا تو بیوی دیر سے آنے کی وجہ پوچھتی۔ خاوند جواب دیتا۔ بیگم بزنس کا بھی تو حال پوچھنا ہوتا ہے۔

ایک دن حسب معمول خاوند دیر سے گھر آیا تو بیوی نے حسب عادت دیر سے آنے کی وجہ پوچھی۔ خاوند بولا "بیگم بزنس آجکل کچھ خراب ہے"

بیوی بولی "اب اگر تم اس کمبخت بجنس (بزنس) سے ملنے گئے تو میں میکے چلی جاؤں گی۔ اسی لونڈیا سے شادی رچا لینا جس کے پاس روز جاتے ہو۔"

ایک بیوقوف شوہر اپنی بیوی سے بولا۔ "بیگم کل میرا دوست کہہ رہا تھا کہ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیئے ہوتے ہیں۔ مگر میں سوچ رہا ہوں۔ اپنا منا کدھر جائے گا۔

بیگم جلدی سے بولی "تب ہم ٹرائیکل کے تین پہیئے بن جائیں گے"

طلاق کے مقدمے میں جج نے خاوند سے پوچھا "تم نے پانچ سال اپنی بیوی سے بات نہیں کی کیوں؟"

جناب! خاوند نے جواب دیا "اس نے قطع کلام کرنے کی مہلت ہی نہیں دی۔

نئے کرایہ دار نے نئے مالک مکان سے کہا: "میں اتنا اچھا کرایہ دار ہوں کہ جو مکان چھوڑ کر آیا ہوں اس کا مالک رو رہا ہے"

نئے مالک مکان نے کہا "مجھے رونے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں تین ماہ کا کرایہ پیشگی لے لیا کرتا ہوں"

ایک شخص ہوٹل کے بیرونی ہال میں، باہر نکلنے سے پہلے اوورکوٹ پہن رہا تھا۔ دوسرے نے اس کے قریب آکر کہا "معاف کیجئے گا کیا آپ کا نام اسمتھ جورڈن ہے؟"

اس نے پلٹ کر کہا "جی نہیں!"

"مگر کیوں؟"

"یونہی۔ دراصل میں خود اسمتھ جورڈن ہوں اور آپ میرا اوورکوٹ پہن رہے ہیں"

شوہر نہایت غصے کی حالت میں بیوی کو ڈانٹ رہا تھا اسی وقت سسر صاحب پہنچ گئے اور سخت لہجے میں کہنے لگے "تم بہت ہی ناشکرے ہو۔ اتنی اچھی بیوی کی قدر نہیں کرتے۔ میرے دل سے پوچھو، میری بیٹی لاکھ روپے کی ہے، لاکھ روپے کی۔

شوہر فوراً بولا۔ "میں پچاس ہزار کا گھاٹا سہنے کو تیار ہوں آپ مجھے پچاس ہزار دے دیں اور اپنے ایک لاکھ واپس لے جائیں"

اجی صاحب! کیا آپ معالج ہیں؟

"اگر میں معالج نہیں تو یہ سامنے والا قبرستان کیا تمہارے باپ نے آباد کیا ہے!"

ایک عورت اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی۔ دیکھو پیارے، ہماری پڑوسن نے بالکل میری طرح کی ساڑھی خرید لی ہے۔

تو تمہیں دوسری ساڑھی چاہیئے؟ شوہر بولا۔

ہاں، بیوی بولی: ویسے مکان تبدیل کرنے سے تو یہ سستی پڑے گی۔

ننھے بچے نے ماں سے کہا: "دیکھو امی اگر تم نے مجھے نیا بستہ لا کر نہ دیا تو پھر میں..."

"ہاں ہاں، پھر تم کیا کرو گے؟"

"میں سکے ساتھ [illegible] کیا کروں گا۔ یہ [illegible] بستہ لا دیا۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیں اور جواب طلب امور کے لیے جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ فرمائیں۔

عجیب موڑ

فہمیدہ نسرین

جب تک انور کی سیڑھیاں اترنے کی آواز آتی رہی وہ فتح مندی کے احساس کے تحت مسکراتی رہی۔ ایسے موقعوں میں اس کے چہرے پر ہمیشہ ایسے ہی تاثرات ابھرا کرتے تھے لیکن جیسے ہی انور نے تمام سیڑھیاں طے کرلیں ایک انجانے احساس کے تحت وہ بستر سے اٹھ بیٹھی سر درد کا احساس بالکل ہی مٹ گیا تھا اور دل ایک عجیب خوف کے تحت دھڑک رہا تھا "کیا میں نے کوئی بھاری غلطی کر دی ہے" وہ اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی۔ اضطراری کیفیت سے وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور کھڑکی سے نیچے کی جانب دیکھا انور کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں تھا اس کی نظریں سڑک پر دور تک انور کو تلاش کرتی رہیں مگر انور کو شاید جلد ہی کوئی سواری مل گئی تھی۔

اگر انور سواری کے انتظار میں سڑک پر کھڑا ہوتا تو کیا اسے آواز دے کر واپس بلا لیتی؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا تو اس کا وجود عجیب انداز سے کانپ اٹھا۔

اب وہ پہلے والی انجم نہیں ہے اور انور اس کا شوہر ہے اسے انور کو اس طرح نہیں جانے دینا تھا۔ آخر کار اس کے خوفزدہ وجود نے ایک فیصلہ کرلیا اور تھکے ہوئے جواری کی طرح دوبارہ بستر پر بیٹھ گئی۔

اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا صرف ایک ہفتہ پہلے ان ہاتھوں پر مہندی لگائی گئی تھی ابھی تو مہندی کے نقش و نگار بالکل واضح تھے اور اس نے ابھی سے یہ بات بھلا دی اور انور کو وہاں اکیلا ہی بھیج دیا۔

"آخر اتنے دنوں کی عادت آہستہ آہستہ چھوٹے گی۔

اس نے خود کو مطمئن کرنا چاہا مگر پچھلے چند لمحوں میں اس کا اطمینان بالکل ختم ہو چکا تھا

دس سال پہلے وہ بالکل انہیں کیفیات سے گزری تھی معمولی شکل وصورت کی انجم نے دس سال پہلے بی اے کیا تو غریب والدین نے اطمینان کا سانس لیا کہ انجم کی نوکری سے چھوٹی آٹھ بہنوں کا کچھ تو بوجھ ہلکا ہوگا مگر انھیں خبر نہ تھی کہ نوکری کے لئے صرف بی اے پاس ہونا ہی کافی نہیں نہ تو اس کی جان پہچان تھی اور نہ ہی کوئی بڑی سفارش وہ مہینوں مختلف کمپنیوں میں چکر لگاتی رہی اسی دوران اس کی ملاقات نجمہ سے ہوئی نجمہ متوسط گھرانہ کی خوبصورت لڑکی تھی اور یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ انجم کی یونیورسٹی میں پڑھنے کی خواہش اپنی مفلسی کے آگے دب گئی تھی مگر نجمہ سے مل کر پھر شدید ہوگئی اور وہ اس کے ساتھ کئی بار یونیورسٹی گھومنے گئی۔ وہ دونوں یونیورسٹی کی بس سے یونیورسٹی جاتیں۔ نجمہ تو اپنی کلاس لینے چلی جاتی مگر انجم مختلف شعبوں میں گھوم گھوم کر اپنے شوق کی تسکین کرتی۔ انجم کی ماں یہی سمجھتی کہ بیٹی نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ نجمہ کو انجم سے ایک لگاؤ ہو گیا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح انجم کو یونیورسٹی میں داخل کرا دے بہت سوچ بچار کے بعد اس نے اپنی چھوٹی بہنوں کے لئے انجم کو ٹیوٹر رکھ لیا اور اس کی فیس سے انجم کو یونیورسٹی میں داخلہ کا مشورہ دے دیا انجم اس لمحے اپنے گھر کی مفلسی کو بھی فراموش کر گئی اور بغیر کچھ سوچے سمجھے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

جب انجم کے گھر میں اس کے داخلہ کا پتہ چلا تو اس کا باپ چیخ اٹھا۔ بی اے کر کے کون کمال کر لیا ہے جو ایم اے کرنے چلی ہو۔

انجم کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا اس نے دبے لہجے میں باپ کو یہ کہہ کر مطمئن کرنا چاہا کہ وہ اپنی پڑھائی کا خرچ ٹیوشن کر کے پورا کرے گی۔ تو بپھری ہوئی ماں نے تیر چلا دیا۔

"ٹیوشن کے پیسے گھر میں دے تو کچھ حالات بہتر ہوں صرف اپنی فکر ہے کچھ گھر کا بھی خیال ہے۔

انجم ماں کی یہ بات سن کر حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی۔ ماں بھی غلط نہیں کہتی۔ بی اے کر کے اسے کون سی نوکری مل گئی جو ایم۔ اے کر کے مل جائے گی ٹیوشن کے پیسوں کی گھر میں ضرورت ہے مگر یونیورسٹی میں پڑھنے کی خواہش میری ذاتی خوشی ہے۔

ٹھیک ہے جب کوئی نوکری ملے گی میں یونیورسٹی چھوڑ دوں گی۔"
اس نے ماں باپ کو مطمئن کرنا چاہا مگر اس کا اپنا اطمینان ختم ہو گیا تھا
اس نے نئے سرے سے نوکری کے لئے کوشش شروع کر دی۔ اور
ڈھیروں درخواستیں پوسٹ کرتی رہی۔

ایک دن اچانک ہی اسے انٹرویو کے لئے بلایا گیا۔ اس کی زندگی
کا پہلا انٹرویو ۔۔۔ وہ عجیب کیفیت سے دوچار تھی خوشی اور خوف کی
ملی جلی کیفیت کے تحت وہ اسٹاپ تک آئی۔ اور ذہن میں مستقل
انٹرویو کے سوال و جواب ترتیب دیتی رہی۔ بس دور دور تک
پتہ نہیں تھا انٹرویو کا وقت قریب آ گیا تھا۔ بدحواسی میں ہر آنے
والی بس کا نمبر دیکھ رہی تھی کہ ایک کار قریب آ کر رک گئی۔ کار اتنے
قریب رکی تھی کہ وہ چونک پڑی۔ کار میں بیٹھا ہوا لڑکا اس کے لئے نیا
نہیں تھا اس نے کئی بار اسی اسٹاپ پر اس کو دیکھا تھا۔ ایک دو دفعہ
یونیورسٹی میں بھی یہ لڑکا نظر آیا تھا اس نے آج تک اسے اتفاق سمجھا
تھا مگر آج کار اس کے بالکل قریب رکی تھی۔ اس نے کن انکھیوں
سے لڑکے کے جانب دیکھا وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آیئے میں چھوڑ دوں"۔ نوجوان نے مہذب انداز میں کہا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" وہ گھبرا کر بولی

"جہاں آپ کہیں گی"۔ نوجوان نے نرمی سے کہا

جی"۔ وہ گڑبڑا گئی۔

آپ یونیورسٹی جا رہی ہیں نا؟

نہیں میں تو ملازمت کے لئے انٹرویو دینے جا رہی ہوں مگر
بس ہے کہ اب تک آئی نہیں"۔ اس نے پریشان ہو کر کہا تو لڑکے
نے کار کا دروازہ کھول دیا۔

تب تو آپ تکلف برطرف کر کے آ جایئے میں آپ کو چھوڑ
دیتا ہوں"۔ اور انجم نے غنیمت جانتے ہوئے جانے کا ارادہ
کر لیا۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے اس نے اسٹاپ پر کھڑے
لوگوں کا جائزہ لے لیا۔ کوئی اس کا جاننے والا نہیں تھا بچہ
بھی ابھی تک اسٹاپ پر نہیں آئی تھی۔ کار میں بیٹھ کر اس
نے دروازہ بند کر لیا اور نوجوان کو کمپنی کا پتہ بتا دیا۔

"او ہو آپ کمپنی میں آپ کا انٹرویو ہے۔

"جی"۔ اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"یہ تو میرے دوست کی کمپنی ہے"۔ نوجوان نے کہا۔
پھر تو آپ مجھے وہاں رکھوا سکتے ہیں"۔ اس نے کہا عیزارا دی
طور پر کہا۔

"ہاں۔ مگر ایک شرط ہے"۔ نوجوان نے کہا

"وہ کیا"؟ اس نے پہلی بار نوجوان کا جائزہ لیا۔ اسمارٹ نوجوان
شرارت سے اسے دیکھ رہا تھا ۔۔۔ ایک عجیب احساس اس کے
وجود میں تیر گیا۔

کیا آپ کو ملازمت کی سخت ضرورت ہے؟" اس نے ایک
نیا سوال کر دیا۔

"جی! وہ شرمندہ ہو گئی پتہ نہیں اپنی مفلسی کا یا سامنے والے
نوجوان کی امارت کا خیال کر کے۔

آپ تو یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں"۔ نوجوان نے کہا تو اس نے
حیرت سے دیکھا اس کے بارے میں یہ کافی معلومات رکھتا ہے اسے
یاد آیا یونیورسٹی میں بھی اس نے بارہا اس نوجوان کو کار میں بیٹھے
ہوئے دیکھا تھا تو کیا یہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے یونیورسٹی تک آیا
تھا۔ محض اتفاقاً نہیں۔

"آپ کیا سوچنے لگیں؟" نوجوان کی آواز سن کر وہ چونکی۔

"جی کچھ نہیں ۔۔۔ دراصل میرے حالات ایسے نہیں ہیں اور
ہم آٹھ بہن بھائی ہیں اب میں نوکری کر لوں تو گھر کی تھوڑی بہت
ذمہ داری تو اٹھا لوں گی۔

اس نے صاف صاف بتا دیا۔

نوکری تو آپ کی پکی ہے۔ اس نے کمپنی کے سامنے گاڑی
روکتے ہوئے کہا انجم نے اپنی ڈگریوں اور سرٹیفکیٹ کا پیکٹ
سنبھالا اور گاڑی سے نیچے اتر آئی۔

اپنا نام تو بتا دیجئے"۔ اس نے گاڑی لاک کرتے ہوئے
پوچھا۔

"انجم"۔ اس نے نام دہرایا اور اسے ساتھ آنے کا اشارہ
کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ انجم بھی اس کے پیچھے چلتی ہوئی اندر داخل
ہو گئی۔ ایم۔ اے شہزاد کے کمرے میں جاتے ہوئے وہ رکا اور
انجم کی طرف پلٹ کر بولا۔ تم یہیں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔
صاحب ۔۔۔ چپراسی نے اسے روکنا چاہا۔ صاحب تو

ملے رہے ہیں :

"ان کو بولو ۔۔۔ نوید صاحب آئے ہیں" اس نے کرختگی سے کہا۔

"نوید" انجم نے زیرلب دہرایا۔ لہجہ میں تبدیلی محسوس کر کے اسے دکھ ہوا اگلے لمحے

اگلے لمحے نوید شہزاد کے کمرے میں بیٹھا تھا اور کچھ دیر بعد انجم کو بھی چپراسی بلا کر لے گیا۔ انجم جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئی تو نوید بولا:

"شہزاد یہ میری دوست ہیں انجم اور یہ ہیں میرے دوست شہزاد ۔۔۔ اب باقی تفصیلات آپ لوگ آپس میں طے کر لیں۔"

شہزاد نے کھڑے ہو کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سرسری انداز میں اس کی درخواست پر نظر ڈالی۔

"کل سے آپ اپنی ڈیوٹی جوائن کر لیں" شہزاد نے کہا تو وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"کل سے۔"

"کیوں ۔۔۔ کل سے آپ جوائن نہیں کر سکیں گی" شہزاد نے پوچھا۔

"نہیں نہیں ۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل مجھے۔ ٹھیک ہے میں کل سے آجاؤں گی" اس کی عجیب کیفیت تھی کہ الفاظ بھی ٹھیک سے ادا نہیں ہو رہے تھے

"چائے چلے گی یا کافی" شہزاد نے نوید سے پوچھا۔

"کافی" نوید نے بے تکلفی سے کہا۔

"اور آپ" شہزاد نے انجم سے پوچھا۔

"جی شکریہ" اس نے تکلف کیا۔

"دیکھیے آج تو آپ نوید کی دوست کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کل سے آپ تکلف کیجیے گا"

شہزاد خاصہ خوش مذاق تھا۔ پھر جتنی دیر کافی آنے اور پینے میں وقت لگا اسے نوید کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہو گئیں۔ اس کا کاٹن کا کاروبار تھا۔ اکلوتا بیٹا جسے باپ کے کاروبار سے کوئی لگاؤ نہیں تھا مگر باپ زبردستی اپنے ساتھ کاروبار میں لگانا چاہتا تھا۔

انجم نوید کی امارت کے ساتھ ساتھ اس کی شرافت سے بھی مرعوب ہو گئی واپسی میں اس سلسلے سے گھر جانا چاہا

تو نوید نے اصرار کر کے اسے گاڑی میں بٹھا لیا

"اب میں اتنا بداخلاق نہیں ہوں کہ آپ کو اس طرح یہاں چھوڑ دوں"

"آپ کی یہی بہت مہربانی ہے کہ آپ نے مجھے سروس دلائی اور ......"

"بس بس مجھے یہ رسمی گفتگو قطعی پسند نہیں ہے۔ اچھا ٹائم کیا ہوا ہے"

نوید نے اچانک پوچھ لیا۔

"ٹائم ۔۔۔ میرا خیال ہے ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے" انجم نے کہا۔

"گھڑی نہیں ہے کیا" نوید نے بڑی اپنائیت سے پوچھا ۔۔۔ جواب میں انجم خاموش رہی تو نوید نے گاڑی گھڑی والے کی دکان کے باہر روکتے ہوئے کہا۔

"گھڑی تمہارے لیے اس لیے ضروری ہے کہ کیونکہ شہزاد دیر سے آنے والوں کو معاف نہیں کرتا"

"مگر میں ابھی گھڑی نہیں لے سکتی۔ اگلے مہینے لوں گی" انجم نے کہا

"اگلے مہینے مجھے گھڑی کی قیمت دے دینا۔ چلو اترو" اس نے حکم دیا اور انجم کو مجبوراً اترنا پڑا۔

نوید نے ایک دن اس کے ساتھ جو رویہ رکھا تھا۔ اس سے احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ان کی ایک دن کی ملاقات ہے۔ اور اسے بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ وہ سحر زدہ سی اس کے پیچھے پیچھے دکان میں داخل ہوئی نوید نے خود ہی گھڑی پسند کی اور قیمت ادا کر کے اس کی جانب بڑھا دی۔ انجم سے شکریہ بھی ادا نہ ہو سکا اور اس نے گھڑی لے کر پرس میں ڈالنا چاہی تو نوید نے چونکایا۔

"جناب اس کی جگہ پرس نہیں یہاں ہے" اس نے اس کی کلائی کی طرف اشارہ کیا اور انجم نے چپ چاپ گھڑی اپنی کلائی پر باندھ لی۔

"شاباش" نوید نے اس کی پیٹھ تھپکی۔

وہ سارے راستے خاموش رہی۔ خالی الذہنی میں سارے راستے دوڑتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھتی رہی۔ نوید نے بھی اس کی خاموشی کو توڑنا مناسب نہیں سمجھا جب وہ اپنے اسٹاپ پر پہنچی

تو نوید کو گاڑی روکنے کو کہا۔

"کیا گھر نہیں جاؤ گی۔" نوید نے کہا دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ گھر نہیں دکھاؤ گی۔

"نہیں۔ یہیں ٹھیک ہے۔" اس نے دروازہ کھول دیا تو نوید نے گاڑی روک لی۔

"ٹھیک ہے پھر ملاقات ہوگی۔ کل صبح وقت پر آفس پہنچ جانا اچھا خدا حافظ۔" نوید نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی

اس نے خدا حافظ کہا اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف پلٹ آئی آج کا دن عجیب دن تھا نوکری اور نوید اسے ساتھ ساتھ ملے تھے اور یہ گھڑی وہ چلتے چلتے رک گئی کلائی پر سے گھڑی کھولی اور پرس کے اندر والے خانہ میں چھپا دی۔ گھر والوں کو صرف نوکری ملنے کی نوید سنائی ہے باقی باتیں تو گھر والوں کی سمجھ میں نہیں آئیں گی اور گھر والے اس کی نوکری کا سن کر اتنے خوش ہوئے جتنی وہ آج کی تمام خوشیوں پر خوش تھی۔ دوسرے دن وہ صبح سویرے ہی بیدار ہو کر تیاری میں مشغول ہوگئی اور وقت سے پہلے ہی اسٹاپ پر پہنچ گئی اسٹاپ پر پہنچ کر اس نے پرس میں سے گھڑی نکالی اور کلائی پر باندھ لی دوسری بس آئی تو وہ بس کی طرف لپکی مگر پھر وہ بس پر سوار نہیں ہوئی۔ "کیا پتہ نوید آجائے۔" اس نے کئی بسیں نوید کے انتظار میں گزار دیں مگر نوید نہیں آیا وہ مایوس ہو کر بس میں سوار ہوگئی۔

"واپسی میں وہ بس سے اتری تو نوید گاڑی لئے کھڑا تھا۔ کیسا رہا آج کا دن۔" اس نے ابتدا اس جملہ سے کی۔

وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی ۔۔۔ سارے دن کی کوفت دور ہوگئی

"بہت اچھا۔" اس نے مسرت سے کہا۔

"چلو کہیں چائے پیتے ہیں۔" نوید نے کہا تو وہ گھبرا گئی۔

"نہیں آج نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" نوید نے اصرار نہیں کیا اور خدا حافظ کہتا ہوا چلا گیا ۔۔۔

کہیں وہ ناراض نہ ہو گیا ہو۔ انجم ڈر گئی۔

اور پھر ان کی گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہی کبھی وہ صبح کے وقت اسٹاپ پر مل جاتا کبھی اسے آفس چھوڑ دیتا کبھی واپسی میں ۔۔۔ پہلی تنخواہ پر جب انجم نے اسے گھڑی کی قیمت دینی چاہی تو نوید نے بڑی اپنائیت سے ڈانٹ کر روپے اس کے پرس میں ڈال دیئے۔ انجم کو اس کی ڈانٹ بہت اچھی لگی اور وہ سہانے سپنوں میں گم گھر آئی پہلی تنخواہ ماں کے ہاتھ میں رکھی تو ماں نے خوش ہو کر اسے چوم لیا۔ گھر سے مفلسی کے بادل ذرا سے چھٹے مگر تیسرے چوتھے مہینے پھر یہ رقم بھی ناکافی ہوگئی اور گھر میں وہی چخ چخ شروع ہوگئی تو انجم نے آفس میں اوور ٹائم شروع کر دیا۔

نوید نے اب کی بار اسے چائے پینے کی دعوت دی تو رات زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ تیار نہ ہوئی۔ مگر انکار کر کے وہ نوید کو ناراض بھی نہ کرنا چاہتی تھی اس لئے اس نے دوسرے دن کا وعدہ کر لیا۔ مگر دوسرے دن نوید نہیں آیا ایک ہفتہ یونہی گزر گیا تو اسے احساس ہوا کہ نوید اس سے ناراض ہو گیا ہے نوید کو وہ کہاں تلاش کرے اس نے کبھی نوید کا فون نمبر بھی نہیں لیا تھا شہزاد سے نوید کا نمبر لینے کی اس میں ہمت نہیں تھی ایک دن وہ اسٹاپ پر کھڑی نوید کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ نجمہ نظر آئی۔

نجمہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔

"کہاں تھیں بھئی اتنے دن سے۔" نجمہ نے شکایت کی

"میں نے جاب کر لی ہے۔" انجم نے بتایا۔

"اور مجھے بتایا بھی نہیں، ٹیوشن بھی چھوڑ دی سب انتظار کرتے ہیں۔" نجمہ نے کہا۔

"وقت ہی نہیں ملا۔ اب آؤں گی۔" انجم نے وعدہ کیا۔

"شام کے وقت بچیوں کو پڑھا دیا کرو۔ امتحان سر پر ہیں۔" نجمہ نے کہا۔

"شام کو ذرا ......" انجم نے ابھی جملہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ نوید کی گاڑی رک گئی۔

"اچھا نجمہ پھر ملاقات ہوگی۔" انجم نے کہا اور نجمہ کو حیرت زدہ چھوڑ کر کار کی طرف بڑھ گئی۔

"یہ تمھاری دوست ہیں نا۔؟" نوید نے بغیر سلام دعا کے پوچھا۔

"ہاں۔" انجم نے جواب دیا۔

"اسے بھی ڈراپ کر دیتے۔" نوید نے کہا تو انجم نے حیرت سے کہا۔

"مگر اسے تو یونیورسٹی جانا ہے۔"

"مجھے بھی وہاں تھوڑے کام ہے۔ اسے چھوڑ دیں گے
تمھیں زیادہ دیر تو نہیں ہوئی نا۔ نہیں تو" انجم نے بے دلی سے کہا
اور نجمہ کو اشارے سے بلایا نجمہ کار کے قریب آئی تو انجم نے دروازہ
کھول دیا

یہ نوید ہیں انھیں یونیورسٹی میں کچھ کام ہے تو تمھیں بھی ڈراپ کر دینگے
اور تم" نجمہ گھبرا گئی۔
مجھے واپسی میں اتار دیں گے دراصل یہ ہماری کمپنی کے قریب ہی
جاتے ہیں" اس نے جھوٹ کا سہارا لیا اور نجمہ نے اطمینان کا سانس
لے کر گاڑی کا دروازہ بند کر لیا۔ سارے راستے انجم اور نجمہ باتیں
کرتی رہیں اور نوید خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ یونیورسٹی میں نجمہ کو
ڈراپ کر کے وہ رجسٹریشن آفس کی طرف گیا اور جلد ہی اپنا کام مکمل
کر کے واپس آ گیا۔
"تمھیں دیر تو نہیں ہوئی نا۔
"نہیں کوئی ایسی خاص نہیں" انجم نے کہا" مگر آپ اتنے دن سے
کہاں تھے۔
ذرا مصروف تھا" اس نے لاپرواہی سے کہا۔
میں سمجھی آپ ناراض ہو گئے" انجم نے کہہ دیا۔
" وہ کیوں ؟ وہ پھر لاپرواہی سے بولا۔
"میں چائے پینے نہیں گئی تھی نا" انجم کھل کے بات کر رہی تھی
"ظاہر ہے کوئی کسی کے ساتھ زبردستی تو نہیں کر سکتا۔ نوید نے
کہا۔
"اور ہو تو ابھی تک ناراضگی" انجم ہنس دی جواب میں وہ خاموش
ہی رہا" چلیں ابھی چلتے ہیں"
نوید نے گردن موڑ کے اسے دیکھا" دراصل میں ایک اہم
بات تم سے کرنا چاہتا ہوں وہ گاڑی میں تو ہو نہیں سکتی اگر تم مجھے
کہیں ٹائم دو تو تفصیل سے گفتگو ہو۔
اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اہم بات اسے بخوبی علم تھا کہ وہ
اہم بات کیا ہے — وہ تو بہت دنوں سے اہم بات کو سننا چاہتی
تھی — وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی
پھر آج تم" اوہ نائم نہیں کر دگی میں تمھارا انتظار کروں گا" اس
نے فیصلہ صادر کر دیا اور انجم نے گردن ہلا کر اقرار کر لیا۔ پھر وہ سارا

دن اس نے عجیب کیفیات میں گزارا۔ نوید کی اہم بات کا جواب
اسے اقرار میں دینا چاہئے یا ابھی سوچنا چاہئے سارا دن وہ اپنے
آپ سے یہی سوال کرتی رہی پھر اس نے سوچ لیا کہ نوید اس کے لئے بہترین
ساتھی ہے۔ نوید کی شرافت وہ اتنے دن میں پرکھ چکی ہے۔ اس نے
انجم کو تحفوں کی شکل میں اس طرح کے کپڑے دے رکھے کہ اس کی سفید
پوشی برقرار تھی اور بدلے میں اس سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا یہاں تک کہ
اسے کہیں لے جانے کے لئے کبھی زبردستی بھی نہیں کی تھی
اگر نوید اس سے شادی کرے گا تو اس کے خاندان کے حالات
بھی سدھر جائیں گے۔ وہ اس رخ سے بھی سوچ رہی تھی۔ انھیں خیالات
میں گھری ہوئی وہ آفس سے نکل کر اسٹاپ آ گئی نوید نے آنے میں دیر
نہیں لگائی مگر اسے یہ وقت صدیوں کی طرح لگا۔ اس کا وجود سراپا
چھوئی موئی بنا ہوا تھا وہ نوید کی جانب دیکھ کر بات نہیں کر رہی تھی۔
"یہ دیکھو — یہ ہماری فیکٹری کی ہی تیار ہوئی ہے۔ نوید نے
ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا — اس نے پیکٹ کے ایک
سرے کو ہٹا کر دیکھا خوبصورت ساڑی نظر آئی۔
"کیسی ہے" نوید بولا۔
"خوبصورت ہے" اس نے پیکٹ نوید کی طرف بڑھا دیا۔
تمھارے لئے" نوید نے کہا۔
"شکریہ" وہ زیادہ کچھ کہہ نہ سکی — گاڑی ایک ہوٹل کے
سامنے پارک کر کے نوید نے اسے اترنے کا اشارہ کیا۔ اس نے
ساڑی کے پیکٹ کو سیٹ پر رکھ کر دروازہ بند کیا اور ہوٹل میں
آ گئی تھی اور زندگی کی اہم بات ان کے درمیان ہونے والی تھی وہ
اپنی کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پائی تھی فیملی روم میں داخل ہو کر
نوید نے پردے برابر کئے اور انجم کو سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا
اور خود اس کے مقابل بیٹھ گیا۔
"کیا پیو گی ۔؟"
"جو آپ کی مرضی"
"کافی پیتے ہیں" اس نے کہا اور بیرے کو بلا کر آرڈر دے دیا
کچھ دیر میں بیرا کافی لے آیا اور انجم اہم بات سننے کا انتظار کرتی رہی"
"کافی بناؤ بھئی" نوید اہم بات کو بالکل نظر انداز کئے ہوئے
تھا۔ انجم نے کافی بنانا شروع کی تو نوید نے بہت آہستگی سے بات

شروع کیا: میں کئی دن سے تم سے یہ بات کرنا چاہتا تھا کہ تم مجھے اچھی طرح سمجھ لو اور تب وضاحت کرتے کرتے رک گیا اور انجم کافی پیالہ اور چمچ ہاتھ میں لئے اس کی جانب دیکھتی رہی وہ کافی بنانا بھی بھول گئی تھی جب وہ خاموش ہوا تو اس نے کافی میں چمچہ ہلانا شروع کر دیا میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ تم مجھے فضول آدمی سمجھ کر میری بات کو ٹال دو ـــــ اس لئے میں نے اتنے دن انتظار کیا ـــ اب تم میرے بارے میں کیا رائے رکھتی ہو؟" اس نے سوال کیا تو انجم نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے یقین ہے کہ رائے بری نہیں ہوگی۔ دراصل میں نے تم لوگوں کو بس اسٹاپ پر اکثر دیکھا پھر یونیورسٹی تک بھی گیا مگر میری ہمت نہ پڑی کہ تم لوگوں سے گفتگو کروں اتفاق سے تمہاری سروس کی وجہ سے تمہارے قریب ہوا اور اب تم ہی میرے کام آسکتی ہو۔"

"کام؟" انجم نے کافی کی پیالی اس کے سامنے رکھتے ہوئے دہرا دیا۔

"تمہاری دوست نجمہ ۔۔" نوید نے جملہ مکمل نہیں کیا۔

"ہاں ہاں کیا ہوا اسے" انجم کا دل خوف سے دھڑک اٹھا۔

"وہ مجھے پسند آگئی ہے اور اس کے قریب ہونے کے میں نے مواقع تلاش کیے مگر مجھے موقع نہیں ملا اب تمہارے ذریعے میں اس کے قریب ہوسکتا ہوں" نوید نے تمام بات کہہ کر اطمینان کا سانس لیا اور انجم کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے آخری بار دھڑک رہا ہو اس نے اپنی کیفیت کو چھپانے کیلئے گرم گرم پیالی اٹھائی اور منہ سے لگالی اس کا حلق تک جل گیا اور اف کے ساتھ اس نے پیالی رکھ دی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے گر پڑے۔

"کیا ہوا؟" نوید نے اسے دیکھا۔

"کافی بہت گرم تھی۔" اس نے اپنے جذبات چھپاتے ہوئے کہا۔

"صبر کرو" نوید ہنسا۔

"صبر ہی کروں گی" اس نے پیالی سامنے سے ہٹا دی۔

"پھر میری مدد کی کوئی صورت ہے" نوید نے کہا۔

"سوچوں گی" اس نے کافی کی پیالی اٹھالی۔ اور چپ چاپ کافی ختم کی اور پھر وہ ایسی اٹھ کھڑی ہوئی جیسے یہاں آنے کا مقصد

صرف کافی پینا ہی تھا۔ اس کی خود اعتمادی ریزہ ریزہ ہو گئی تھی ان چند لمحوں میں نجمہ کی خوبصورتی اپنی پوری قوتوں کے ساتھ اس کے سامنے تھی اور اپنی کم مائیگی کا احساس اتنی شدت سے تھا کہ اگر نوید سامنے نہ ہوتا تو چیخ چیخ کر رو دیتی۔ مگر جانے صبر کا اتنا ڈھیر سارا خزانہ اسکے پاس کہاں سے آگیا تھا کہ وجود کے ٹوٹنے کی آواز تک اس نے اندر ہی بند کر لی تھی وہ اسی اعتماد سے چلتی ہوئی گاڑی تک آئی اور ساڑھی کے پیکٹ کو گود میں رکھتے ہوئے بولی۔

"میں کل نجمہ کی طرف جاؤں گی۔"

نوید نے تشکر کی نگاہ سے اسے دیکھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی وہ چپ چاپ ساڑھی کا پیکٹ پکڑے ہوئے اسٹاپ پر اتر گئی ــــ مگر گھر آکر ضبط کے بندھن جواب دے گئے۔ اور کمرہ بند کر کے وہ دیر تک روتی رہی ماں اور بہنوں کے اصرار پر بھی اس نے کھانا نہیں کھایا وہ رات اس کے لئے قیامت کی رات تھی۔ چھوٹے سے آئینے میں اس نے بار بار اپنا چہرہ دیکھا اور صاف گوئی سے فیصلہ کر لیا کہ وہ نوید کے قابل نہیں تھی نوید کے لئے اگر لڑکی دولت مند نہیں تو خوبصورت تو ہونی چاہئے اور نجمہ اس کے لئے موزوں ہے مگر میں ۔۔۔۔ اسکے اندر کی عورت پھنکاری۔

"نہیں اس کا معاوضہ ملتا رہا ہے" اس کی نظروں میں گھڑی سے لے کر ساڑھی تک تمام تحائف گھوم گئے "تم بے وقوف تھیں کس جذبہ کو دل میں بٹھا لیا اپنی حیثیت کو بھی دیکھا ہوتا" دوسرے دن وہ آفس بھی نہ جاسکی ـــ دل و دماغ کی جنگ نے اسے ادھ موا کر دیا تھا مگر شام تک دماغ جیت چکا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو نجمہ کے گھر جانے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ ماں نے ایک دو بار کھانے کے لئے پوچھا مگر پھر اپنے گھر کے دھندوں میں لگ کر بھول گئی کہ بیٹی گھر پر ہے۔ اور اس طرح بیٹی کو ایک شاک اور پہنچا۔

جب وہ شام کو تیار ہو کر جانے لگی تو ماں نے پوچھا۔ کہاں جا رہی ہو؟"

"شام کو ایک ٹیوشن کر لی ہے" اس کا خیال تھا کہ ماں اتنی محنت کرنے کو منع کرے گی ماں خوش ہو کر بولی۔

چلو ریحانہ کے کالج کی فیس نکل آئے گی" ایک تیر اور

گا اور وہ زخمی زخمی نجمہ کے گھر پہنچی ۔۔۔ نجمہ کے گھر والے اور خود نجمہ اسے دیکھ کر خوش ہو گئے ۔ نجمہ تو بہت بے صبری ہو رہی تھی ۔

"اسے کون تھا وہ گاڑی والا ۔؟"

"دوست ہے میرا ۔" انجم نے لاپرواہی سے کہا کل سے پہلے اگر وہ یہ سوال کرتی تو انجم کا جواب یہ نہ ہوتا ۔

"کیسا دوست ؟" نجمہ کو کرید لگی تھی ۔

"ہمارے کمپنی کے مالک کا دوست ہے اسی نے مجھے جاب دلائی ہے ۔ شریف آدمی ہے قابل اعتماد ۔" انجم نے سرسری طور پر کہا تو نجمہ چپ ہو گئی ۔ اسے تو کچھ اور توقع تھی ۔

انجم نے بچیوں کو پڑھایا اور واپس آتے ہوئے نجمہ سے بولی ۔

"نوید کو روز یونیورسٹی جانا ہوتا ہے تم بسوں میں دھکے کھاتی ہو اس کے ساتھ چلی جایا کرو ۔"

"نہیں بھائی اسکینڈل بن جاتے ہیں ۔" نجمہ خوفزدہ ہو گئی ۔

"ارے پگلی میں جو ساتھ ہوں گی ۔" انجم نے کہا تو نجمہ نے اطمینان کا سانس لیا ۔

"ہاں پھر کوئی حرج نہیں کتنے بجے آجاؤں اسٹاپ پر ۔"

"کل آٹھ بجے آجانا ۔" انجم نے کہا اور وہاں سے نکل آئی اسے اپنا آپ بہت اجنبی لگ رہا تھا

دوسرے دن نوید کی گاڑی رکی تو نجمہ ، انجم ایک ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئیں نوید کی حیرت ختم کرنے کے لئے انجم بول اٹھی ۔

"آپ روز یونیورسٹی جاتے ہیں میں نے نجمہ سے کہہ دیا ہے ۔ اس وقت یہاں آجائے تو اسے بسوں کے دھکے نہ کھانے پڑیں گے ۔"

"ہاں ۔ ہم تو وہاں جاتے ہی ہیں ۔" نوید نے آنکھوں آنکھوں میں انجم کی عقلمندی کی داد دی تو انجم کا ڈھیروں خون بڑھ گیا ۔۔۔ واپسی میں اس نے انجم کو خوب شاباشی دی تو انجم پھولے نہ سمائی ۔ پھر روز کا یہ معمول بن گیا ۔ نجمہ کو شک بھی نہ ہوا کہ یہ ناٹک صرف اس کے لئے کھیلا گیا ہے

پھر ایک دن اچانک ہی انجم فرمائش کر بیٹھی ۔

"نوید صاحب کل میری برتھ ڈے ہے آپ ہمیں چائنیز میں ڈنر کھلائیے ۔"

"چلو آپ کی برتھ ڈے ہے آپ کھلائیے ۔" نوید نے کہا ۔

"بس بھاگ گئے کیسے دوست ہیں آپ ۔" انجم نے کہا ۔

"دوستی کے نام پر تو ہم اپنا آپ بھی قربان کر دیں آپ تو ایک دعوت پر بھاگ رہے ہیں کہاں اتنے بڑے دعوے

نجمہ بھی نوید سے فری ہو گئی تھی ۔

"دعوت کیا چیز ہے ۔۔۔ ٹھیک ہے کل ڈنر ہم آپ دونوں دو ہیں ۔" نوید نے کہا ۔

"بھائی میں نہیں آسکتی ۔" نجمہ گھبرا کر بولی ۔

"کیوں بھئی تم کیوں نہیں آؤ گی ۔" انجم جلدی سے بولی

"رات میں آنا مشکل ہے" نجمہ نے کہا ۔

"نوید صاحب پھر لنچ رکھ لیجئے ۔ آپ نجمہ کو یونیورسٹی سے لے کر چائنیز میں پہنچیں میں آفس سے آجاؤں گی ۔" انجم نے پروگرام بنا لیا اور نجمہ انجم کے خیال سے انکار نہ کر سکی ۔

دوسرے دن نوید نجمہ کو لیکر چائنیز میں پہنچا اور آدھے گھنٹے تک انجم کا انتظار کرنے کے بعد آفس میں فون کیا تو جواب ملا کہ انجم آفس نہیں آئی ۔ وہ دن بھی انجم کے لئے قیامت سے کم نہ تھا

اس کا دل تو رو رہا تھا مگر وہ اپنی اس کامیابی پر خوش بھی تھی اس نے انجم اور نوید کو ملانے کے لئے کامیاب چال چلی تھی ۔ اس دن کے بعد وہ ٹیوشن بھی پڑھانے نہیں گئی آٹھ ماہ بعد نوید اس سے ملنے آفس آیا تو اس کے ہاتھ میں شادی کا کارڈ آیا

"میں شاید شادی میں نہ آسکوں ۔" انجم نے کہا ۔

"تم بڑی بے مروت دوست ہو بالکل ملنا جلنا چھوڑ دیا کبھی اسٹاپ پر بھی نہ ملیں ۔" نوید نے شکایت کی ۔

"میں کمپنی کی بس سے آتی ہوں ۔" انجم نے کہا ۔

"اب شادی میں نہ آنے کی وجہ ؟" نوید نے پوچھا ۔

"امیر آدمی کی شادی میں پہننے کے لئے شایان شان لباس نہیں ہے ۔" انجم نے کہا ۔

"اوہو یہ بات ہے کپڑے کل تک پہنچ جائیں گے ۔"

"میں نے اس لئے یہ بات نہیں کہی ہے جناب ۔" وہ پھیکے انداز میں مسکرائی ۔

"اچھا اگر برا نہ لگے دوست تو تم خود ہی شاپنگ کر لو میں تو شادی کی تیاریوں میں مصروف ہوں ۔" نوید نے چیک بک نکالی اور

اس پر رقم لکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"نہیں.... بھئی غلط بات نہ کرو۔" اس کا دل تو چاہ رہا تھا چیک پھاڑ دے لیکن ... نوید نے اس کا پرس پکڑا اور زبردستی چیک اس میں ڈال دیا۔ نوید کے جانے کے بعد اس نے چیک نکالا پورے دو ہزار کا چیک تھا۔ کیا اس کے کام کا معاوضہ دو ہزار ہے؟ خیر کچھ برا بھی نہیں۔ اس کی شخصیت کے عجیب و غریب پہلو سامنے آ رہے تھے وہ نوید کی شادی میں گئی تو وہاں اسے اپنی اہمیت کا خوب خوب اندازہ ہوا نوید اپنے تمام دوستوں سے اس کا تعارف کرواتا رہا۔

"بھئی انھوں نے ہمارے لئے بہت خوبصورت دلہن تلاش کی ہے۔"

"پھر تو ہم بھی آپ کی مدد چاہتے ہیں۔" نوید کے دوستوں نے کہا۔ تو اس نے اپنے آفس کا ٹیلیفون نمبر انھیں دے دیا۔ اور جب اس کے پاس نوید کے دوستوں کے فون آنے لگے تو اس نے اپنی زندگی کا ایک مشن بنا لیا خوبصورت لڑکیوں سے دوستی کرنا اور کسی لڑکے سے انھیں ملوا دینا ——— اس کے معاوضے کے طور پر اسے کبھی نقد تحفے ملتے اور کبھی زیورات اور ساڑھیوں کی شکل میں۔ ماں باپ کا خیال تھا کہ ان کی بیٹی کی ترقی تیزی سے ہو رہی ہے اور اس کی تنخواہ اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کی مفلسی ختم ہو گئی ہے۔ باپ کے ریٹائر ہونے کا اثر بھی نہیں پڑا اور خوشحالی کے دن بڑھتے گئے۔ ایسے میں کسی کو اسکی شادی کا خیال نہیں آیا ——— اس کی ملوائی ہوئی لڑکیوں میں سے کسی کی اس کی شادی ہو جاتی اور کوئی صرف وقت گزار کر دوبارہ انجم کے پاس آ جاتی کہ دوسرا آسامی دکھاؤ اور وہ مرد اور عورتوں دونوں میں مقبول ہوتی رہی ——— اسی دوران اس نے اپنی چار بہنوں کی شادی کر دی ——— مگر اپنی شادی کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ——— وہ تو مردوں کے اس قسم کے جملے سنا کرتی تھی۔

"فلاں لڑکی وہ کیا جسم ہے اس کا بس دل چاہتا ہے ...."

"ٹھیک ہے ٹھیک فلاں پکچر کی بکنگ کروا لو۔" وہ اعتماد سے کہتی اور وقت مقررہ پر پکچر ہال کے دروازے پر اس دوست سے ساتھ موجود ہوتی ———

زندگی اسی ڈھب سے گزر رہی تھی اب تو اس کے ذہن سے یہ احساس بھی ختم ہو گیا تھا کہ یہ کوئی غلط کام ہے۔ ان دس سالوں میں اس نے بے حساب لڑکے لڑکیوں کو ملوایا تھا اور فیشن ایبل سوسائٹی میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھی۔

اکرم اور نبی کو جب اس نے ملوایا تو اکرم نے اپنے دوست انور کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اس کا بھی کچھ انتظام کر دو۔" اور وہ انور کی طرف لپکی "کیا سنجیدہ ہو؟"

"ہاں۔" انور نے سر ہلا دیا۔

"کیسی چاہیئے؟" انجم نے پوچھا تو انور نے اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

"کیا مطلب۔؟"

"مطلب یہ کہ تم۔" انور نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا گھاس چر گئے ہو۔" انجم مذاق سمجھ کے بولی

"مجھے تو تم سے شادی کرنی ہے۔" انور نے کہا۔

"بکواس مت کرو۔" انجم اب تک مذاق سمجھتی رہی۔ مگر جب کچھ دن بعد اکرم نے کہا کہ انور مانتا نہیں تم ہی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ کوئی جذبہ بیدار نہ ہوا ——— مگر شادی کر لینے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔" اس نے اپنی ماں سے کہا تو ماں کو یہ بات اچھی نہیں لگی کہ وہ شادی کرے۔ گھر پھر مفلسی کے ہاتھ چلا جائیگا۔

"کیا ساری عمر تم لوگوں کے جہنم بھرتی رہوں گی۔" اسے بھی غصہ آ گیا اور پھر اسے لگا جیسے یہ سارا خواب ہو انور سے اس کی شادی ہو گئی انور نے ایک فلیٹ کرایہ پر لے لیا اور وہ دونوں ایک فلیٹ میں آ گئے۔ شادی کے بعد انور نے اسے بتایا کہ اس نے اپنے گھر والوں سے چھپ کر شادی کی ہے کیونکہ گھر والے انجم سے شادی کرنے پر تیار نہ ہوتے۔ انجم نے چاہا کہ اس زندگی کو انجوائے کر سکے مگر اس کے پورے وجود میں تو دوسرے مردوں کی اور عورتوں کی تعریفیں بھری ہوئی ہوتی تھیں۔ وہ انور سے جب بھی کوئی بات کرنا چاہتی تو اس کے منہ سے اپنی ملنے والی لڑکیوں کی تعریفیں ہی نکلتیں اور انور بڑی دلچسپی سے اس کی گفتگو سنتا۔ شادی کے بعد کا پورا ایک ہفتہ اسی قسم کی گفتگو میں گزرا اور کل اس کی ایک دوست نے اسے کھانے پر بلایا تھا۔ صبح سے وہ ڈنر پر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ انور کو دن میں کہیں کام تھا۔ وہ انجم سے

کہہ گیا تھا آٹھ بجے تیار رہے تو گھر سے اسے لے جائے گا مگر اچانک ہی جب انور اسے لینے کے لئے اوپر آیا تو اس نے کہا "میرے سر میں درد ہے آپ اکیلے ہی چلے جائیے۔

دیکھو گاڑی خراب ہو گئی تھی اس لئے میں لیٹ ہو گیا ہوں نگہت ہم دونوں کا انتظار کر رہی ہوگی۔ تم نہیں جاؤگی تو مائنڈ کرے گی" انور نے سمجھانا چاہا۔

ارے میرے نہ جانے سے کوئی لڑکی مائنڈ نہیں کرتی۔ انجم نے پرانے اسٹائل میں کہا تو انور نے مزید کوئی بات نہ کہے جانے کا ارادہ کر لیا اور جب تک وہ سیڑھیاں اترتا رہا انجم فتح مندی سے مسکراتی رہی مگر جب اس کے اترنے کی آواز اس تک آنا بند ہوئی اس کا اضطراب بڑھتا گیا۔

اس نے بہت بڑی غلطی کی ہے ـــــ وہ تیزی سے اٹھی اور جلدی جلدی تیار ہو کر اس نے فلیٹ کا دروازہ بند کیا اور وحشیانہ انداز میں سیڑھیاں طے کرتی ہوئی۔ نیچے اتر آئی۔ نیچے اترتے ہی ٹیکسی مل گئی اس نے ٹیکسی کو ہوٹل کا پتہ بتایا اور ہارے ہوئے جواری کی طرح سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی ہوٹل پر ٹیکسی رکی تو اس نے بغیر گنے ہوئے نوٹ ڈرائیور کی ہتھیلی پر رکھے، اور تیزی سے ہوٹل میں داخل ہوئی۔ فیملی رومز کے سامنے سے وہ آہستگی سے گزری ایک کمرے کے اندر سے نگہت کی آواز آئی۔

"مگر میں حیران ہوں تم نے اس سے شادی کیسے کر لی؟"

اس سے شادی کرنا بہت سودمند ہے" انور کہہ رہا تھا "دیکھو اب میں تمہارے ساتھ یہاں تنہا بیٹھا ہوں اور اس نے جان بوجھ کر ہمیں یہ موقع دیا ہے وہ کبھی بھی ایک عورت اور ایک بیوی کی طرح حاسد نہیں بن سکتی۔

اور دونوں کے قہقہے ابھرے ـــ انجم نے اپنے آپ کو دیوار کے سہارے سے گرنے سے روکا ـــ اپنی پھولی ہوئی سانس کو قابو میں کیا اور ہارے ہوئے جواریوں کی طرح آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی واپس چلی گئی ـــ فلیٹ تک اسے نگہت اور انور کے قہقہے سنائی دیتے رہے اور وہ یہ فیصلہ نہ کر پائی کہ ان قہقہوں سے خوش ہے یا جل رہی ہے۔

(بشکریہ پاکیزہ۔ کراچی)

لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ

اس گرانی کے زمانے میں غریب لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بڑا ہی دشوار ہو گیا ہے۔ شادیاں شادیوں ہی کی طرح ہوتی ہیں۔ لچکے پٹھے سے کپڑوں کو چمکانے اور سجانے والی چیزیں بھی اتنی گراں ہو گئی ہیں کہ ان کا خریدنا آسان نہیں رہا۔ ایک دوپٹہ کے لئے معمولی سا لچکا بھی لیا جائے تو بیس پچیس روپیہ سے کم میں نہ آئے گا۔

پتلی سی کرن بھی آنچل میں لگائیے تو بیس روپیہ میں آئے گی۔ شادیوں کے دسیوں جوڑوں کے لئے یہ سب لیا جائے تو سینکڑوں روپیہ صرف ہو جاتا ہے پھر شادی بیاہ پر ہی منحصر نہیں۔ خواتین اور لڑکیاں عام دنوں میں لچکے لگے دوپٹے استعمال کرتی ہیں۔ سورتی بیلیں اور چپا چکی وغیرہ لگا کر دوپٹے اور ساریاں پہنتی ہیں۔

ان مشکلات کا حل سا[illegible] انوں نے یوں نکالا ہے کہ اسپیشل کا سامان تیار کر دیا اور ایسا کہ چاندی سے زیادہ دلکش اور بھڑکیلا یہ بھی نہیں کہ استعمال سے کالا پڑ جائے یا خراب ہو جائے اور دام نسبتاً بہت ہی کم۔ ٹالون کے ستارے سنہرے ستاروں کو ماند کرتے ہیں۔ یہ اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ ایک تولہ میں لاتعداد چڑھتے ہیں ان کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اس طرح کا تمام سامان آپ کو۔۔

مجرم کون؟

فضل امام ملک۔ چوارہ (مونگیر)

گاؤں کی فضا میں مولانا صاحب کی دوسری شادی نے اس طرح دھماکہ کیا مانو اسکائی لیب بحرہند میں نہیں بیچ میں گرا ہو۔ لوگوں اور خاص کر عورتوں میں طرح طرح کی چہ مگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ اس شادی پر طرح طرح کے اظہار خیال لوگوں کے لئے روز کا معمول بن گیا تھا۔

اس دن بھی زیر بحث یہی معاملہ تھا۔ عشرت نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو نچا کر زور سے کہا۔ "ارے! مولانا صاحب پورے چار سو بیس ہیں، مزید پہلے سے چکر ہوگا رابعہ کے ساتھ۔ کون سے لال جڑے ہیں اس میں؟" اس بیچ ان کا ایک ہاتھ ہمیشہ کی طرح مسلسل سر میں جوؤں کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

ایسے میں تو کہوں دونوں کے تعلقات پہلے ہی سے تھے: محلے کی چچی نے زبان ہلائی۔

جمن اپن بوا نے ناک پر چشمہ چڑھاتے ہوئے کہا: "نہ دیکھنے بھالنے میں موئی اچھی ہے نہ شکل صورت ہی بھلی ہے اوپر سے موٹی بھی ہے۔ کس آنکھ سے پسند کیا مولانا نے اس کو۔ اور تو اور ایک بچے کی ماں بھی ہے۔ مولانا کو اگر شادی ہی کرنا تھی تو اس سے اچھی لڑکیاں مل جاتیں ان کو۔"

"انکی بات کی تائید عشرت نے زور زور سے سر ہلا کر ہنستے ہوئے کی۔ اور عشرت کو اتنا ہوا انکی بات کی تائید کرتے ہوئے دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا تھا کیونکہ ان کے نظریات میں زمین و آسمان کا اختلاف ہے۔ اکثر دونوں میں ٹھن بھی جاتی تھی۔ لیکن آہ ...... تبھی ذہن کے ایک گوشے نے میرے سوال کا جواب دیا — وہ تو میں چاہے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ دوسروں کی برائی کے وقت ان کے نظریات ایک ہو جاتے ہیں۔

اسی وقت جہان آباد سے آئی منجھلی دلہن نے بھی اپنی جانکاری رابعہ کے بارے میں دی، حالانکہ پہلے انہوں نے کبھی نہ [illegible] تھا۔ "سنتے ہیں کہ اس کا چال چلن بھی خراب تھا اور ...."

انکی بات کو بیچ ہی میں جھپٹ لیا تھا چچی نے۔ "ٹھیک کہہ رہو میاں! اُن کے تعلقات کئی مردوں سے تھے ارے وہ تو ویشیا سے بھی گئی گذری ہے اور ......"

لیکن بوڑھی دادی اماں نے تسبیح پھیرتے ہوئے انہیں بیچ ہی میں ٹوک دیا۔ "نا بیٹی نا! یوں کسی پہ تہمت نہیں لگاتے اللہ سے ڈرو۔ کیا فائدہ دوسروں کی غیبت سے؟"

بوڑھی دادی کی یہ بات انہوں نے ایک کان سے سنی اور دوسرے سے اڑا دی اور پھر رائے زنی کرنے لگیں اس بے میل شادی پر۔

پھر منجھلے ابا بھی جو کافی دیر سے چپ چاپ سن رہے تھے بھڑک اٹھے: "اگر مولانا صاحب نے رابعہ سے شادی کر لی تو کون سی برائی کی۔ کیوں آپ لوگ پڑی ہیں ان کے پیچھے۔ انکی قربانی کی کیوں نہیں مدح سرائی کرتیں، جو انہوں نے رابعہ سے شادی کر کے کی ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ ایک عورت جو برائی کے راستے پر جا رہی تھی اسے نیکی کے راستے پر لے آئے۔ اگر وہ اس سے شادی نہ کرتے تو وہ بے سہارا عورت ایک دن گناہوں کے گہرے سمندر میں غرق ہو جاتی۔ اور ..... تب ..... تب پھر آپ ہی لوگ اُسے طرح طرح کے خطاب سے نوازتے۔ کیا برا کیا انہوں نے؟ کیوں طوفان اٹھا رہی ہیں آپ لوگ؟ دوسری شادی تو ہمارے مذہب میں جائز ہے ......"

"ہم لوگ یہ کہاں کہہ رہے ہیں کہ مولانا نے شادی کر کے غلط کیا ہے۔ ہم تو یہ کہہ رہے تھے کہ ان کو رابعہ سے اچھی لڑکی مل جاتی۔ آخر رابعہ میں کون سے لال جڑے ہیں؟" منجھلے ابا کی بات کاٹ کر عشرت نے کہا۔

"تو یوں کہو چڑیل تمہیں زاہدہ سے ہے۔ کیوں اسکی زندگی سدھری؟ اسلئے تم لوگ طوفان اٹھائے ہوئے ہو کہ وہ کالی ہے، موٹی ہے ایسی ہے ویسی ہے۔ کیا عورت کا کم صورت ہونا گناہ ہے؟ کیا موٹی کالی ہونا جرم ہے؟ اگر ہے تو اسمیں اسکا کیا قصور ہو سکتا ہے۔ وہ خود تو اپنی خالق نہیں ہوتی۔ آخر کس مذہب نے سکھایا ہے کہ بدصورت سے شادی کرنا گناہ ہے۔ انسان چاہے گورا ہو کالا سب کو اللہ نے بنایا ہے۔ تم لوگوں کی چڑھ کی وجہ صرف . . . . اور . . . . . صرف یہ ہے کہ وہ غریب ہے۔ ہزاروں روپے کا جہیز اپنے ساتھ نہیں لا سکی۔ وہ اگر اپنے ساتھ ہزاروں کا سامان لیکر آتی تو پھر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوتا اس لئے کہ دولت سارے عیوب کی پردہ پوش بن جاتی ہے۔

"منجھلے ابا کی بات کاٹ کر حشمت بیگم سے مخاطب ہوئی اس امید پر کہ شاید میں ان لوگوں کی حمایت کروں ... [illegible] ... آپ بولو نا ... [illegible] ... صاحب ... [illegible]

"میرا . . . . میری رائے بس اتنی ہے کہ مولانا صاحب قابل ستائش ہیں۔ کمی نہ تو زاہدہ میں ہے اور نہ مولانا صاحب نے کچھ غلطی کی ہے۔ بلکہ انکا یہ فعل قابل ستائش ہے۔ غلطی پر آپ سب ہیں حالانکہ عورتوں کو تو ایسی عورتوں سے زیادہ ہمدردی ہونی چاہیئے جنھیں قدرت نے حسن کم بخشا ہو" اتنا کہہ کر میں گھر سے باہر نکل پڑا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک آواز نے میرے پاؤں جکڑ لئے "مولانا صاحب نے دوسری شادی کر کے بہت گری ہوئی حرکت کی ہے" میں نے گھوم کر دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنکی پچھلی زندگی کی کتاب کے سارے صفحات سیاہ تھے۔

اور میں یہ سوچنے لگا تھا۔ ان سب کے سوچنے کا انداز کتنا غلط ہے۔ اور یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جو خود گرا ہوا ہے وہ دوسروں کو گرا کہہ رہا ہے اور یہ نہیں سوچ کہ ایک انسان برائی کی دلدل سے ابھر آیا ہے۔ برائی کے اندھیروں میں مولانا صاحب نے نیکی کی مشعل جلا کر کیا گری ہوئی حرکت کی ہے؟ میرے ذہن میں بار بار یہ سوال گونجنے لگا تھا: مجرم کون ہے؟ جرم کس نے کیا ہے؟ گرا ہوا کون ہے؟ یہ لوگ یا مولانا صاحب؟ جنھوں نے راستے میں گرے ایک ملے ہوئے پھول کو اٹھا کر اپنی زندگی کے گلدان میں سجا لیا ہے" اور بہت حل کرنے پر بھی اس سوال کا جواب آج تک میں نہ پا سکا۔

بقیہ بزم ہم۔ صفحہ ۳۱

تو بھی فانی، میں بھی فانی، سب ہیں فانی دہر میں
اک قیامت ہے مگر مرگ جوانی دہر میں

اللہ پاک مرحوم کو اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

آہ سہیل عظیم آبادی

میرے پرانے رفیق اور اردو کے ممتاز ادیب و افسانہ نگار جناب سہیل عظیم آبادی کا ۸ نومبر کو الہ آباد میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی عمر صرف ۷۹ سال تھی۔ وہ چنڈی گڑھ سے اردو کانفرنس میں شرکت کے بعد واپس ہوتے ہوئے آنجہانی پریم چند کے بیٹے امرت رائے صاحب کے یہاں الہ آباد میں تھے۔

مرحوم آل انڈیا ریڈیو کے اردو سکشن میں پروڈیوسر تھے۔ سری نگر، دہلی اور پٹنہ ریڈیو سے تعلق رکھتے ہوئے [illegible] میں ریٹائر ہوئے تھے۔ اردو اکیڈمی بہار کے [illegible] میں سکریٹری کی خدمات انجام دیتے رہے۔ یو۔ پی اردو اکیڈمی نے مرحوم کی کتب بے جڑ کے پودے اور چار چہرے پر انعام سے بھی نوازا تھا۔ بہار ہندی ساہتیہ سمیلن نے بھی مرحوم کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انعام سے نوازا تھا۔

مرحوم [illegible] سال قبل لکھنؤ تشریف لائے تھے تو میرے ہی یہاں قیام کیا تھا۔ مرحوم کے پس ماندگان میں دو صاحبزادے اور ان کی بیوہ ہیں۔ اللہ پاک انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

بزم حریم

(اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع ہو سکتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال کے متعلق ہو۔ خبر مختصر سے مختصر الفاظ میں لکھی جائے اور نمبر خریداری ۵۰ پیسوں کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ اس طرح روانہ کی جائے کہ ۱۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے، ورنہ اشاعت ایک ماہ بعد ہوگی۔ لکھا ہے کی غلطی کا دفتر ذمہ دار نہ ہوگا، البتہ اطلاع ملنے پر اسکی تصحیح شائع کر دی جائے گی۔

(ادارہ)

• بہن راشدہ بیگم (مدراس) سے عرض ہے کہ آپ کی خواہش پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔

• ایک حریمی بہن نے لکھا ہے کہ ان کی سولہ سالہ لڑکی کے بال جھڑنے اور ٹوٹنے لگے ہیں۔ کسی بہن کو کوئی مجرب نسخہ معلوم ہو تو لکھیں۔

ولادت اطفال کی خبریں

• میرے مرحوم دوست یوسف محمد پاریکھ کی صاحبزادی عائشہ (بیگم سلیمان برہنگم) کی بہو یاسمین سلیمان کو اللہ پاک نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۹ء بوقت ۱۱ بجے دن ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام دادا کے نام پر یوسف رکھا گیا۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک اسے اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھائے اور خاندان اور ملک اپنے دادا کے ہر دل عزیز بنے۔ آمین

(نسیم انہونوی)

• واکٹ شاہدہ جبیں و شازیہ تبسم (آسنسول) ہمارے چاچا محمد حنیف صاحب و چاچی عقیلہ بیگم کی زندگی کو پر بہار بناتے ہوئے اللہ پاک نے تیسری بار ۲۰ ستمبر ۱۹۷۹ء بروز چہارشنبہ بوقت ۱ بجے دن ایک خوبصورت پھول کھلایا۔ پیارا سا نام

نہاد احمد رکھا گیا۔ اللہ پاک نومولود کو عمر خضر بخشے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• درشہوار بیش امام (ناندیڑ) میرے دیور نثار احمد اور دیورانی فوزیہ کے گلشن حیات میں خدا کے پاک نے دوسری بار ایک پھول کھلایا۔ نام تبریز احمد قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل عطا فرمائے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور صاحب نصیب ہو۔

• فاطمہ بانو قریشی (بمبئی) میری بیٹی رخسانہ پروین (حریدار حریم) اور داماد عثمان احمد قریشی کے گلشن حیات کو رنگین بناتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یکم ستمبر ۱۹۷۹ء بروز سنیچر بوقت ۸ ½ بجے شب پہلی بار ایک کلی کھلائی۔ نام شمانہ کوثر قرار پایا۔ دعا ہے کہ والدین اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• نگار سلطانہ جلیلی (آمبور) میری باجی قمر لطیف صاحبہ اور بہنوئی عبداللطیف صاحب بی۔ اے کے گلشن حیات میں اللہ رب العزت نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۹ء بروز منگل بوقت ۹ ½ بجے شب ایک ننھی منی چاند سی گڑیا عطا فرمائی جس سے سارا گھر خوشی سے جھوم اٹھا۔ نام عطیہ مسناز (شارقہ شمین) قرار پایا۔ اللہ پاک اس گڑیا کو عکس فاطمہؓ بنائے۔

• عزت افضل (ودیم باڑی) بفضل تعالیٰ میری بہن ایمن تنویر اقبال صاحبہ اور بہنوئی ایمن اقبال احمد صاحب کے باغ حیات کو پر بہار بناتے ہوئے ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۹ء مطابق ۲۰ ذیقعدہ ۱۳۹۹ھ بروز ہفتہ بوقت ۸ بجے شب پہلی بار بمقام مدراس ایک ننھی منی گڑیا عطا ہوئی۔ نام سعدیہ تنویر عرف صائمہ تنویر رکھا گیا۔ دعا ہے کہ عمر خضر پائے اور صاحب نصیب ہو۔

• رفعت صفیہ۔ میرے بھیا محمد عمر فاروق (ایم۔ بی۔ اے) اور بھابھی نزہت صدیقی صاحبہ کو اللہ پاک نے ۲ نومبر ۱۹۷۹ء مطابق ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۹۹ھ بروز جمعہ بوقت ۴ ½ بجے شام بمقام جمشید پور ایک گڑیا

سے نوازا گیے پھوپھی جان بننے کا شرف بخشا ۔ نام نصرت حجاب رکھا گیا ۔ خدا انھیں دراز عمر بنائے ۔

● مسز حمید (جھیرا) "میری سب سے چھوٹی بیٹی حمیرہ سلطان صبا (خورشید ارحمیم) کی آغوش ناز میں پہلی بار یکم اگست ۱۹۸۹ء مطابق ۲ رمضان المبارک بروز بدھ بوقت ۱۲ بجے شب ایک ننھی سی کلی مسکرائی ۔ نام شائمہ شیریں قرار پایا ۔ اللہ پاک سے التجا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور خاندان کے لیے شیریں بنے ۔

● محمد سراج الحق (انگریکو - جمشید پور) میری ہمشیرہ اور بہنوئی ڈاکٹر سراج الحق (مقیم لندن) کو اللہ تعالے نے تیسری بار ایک پھول عطا فرمایا ۔ دعا ہے کہ خدائے پاک نومولود کو عمر طویل عطا فرمائے ۔ اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے ۔

● رخسانہ طلعت بلیاوی (بلیا) میری چھوٹی نند سلمیٰ خاتون آروی کے گلشن حیات میں ۱۰ ستمبر ۱۹۸۹ء اللہ پاک نے تین کلیوں کے بعد ایک پھول کھلایا ۔ دعا ہے کہ عمر طویل پائے تندرست رہے اور خاندان و ملت کے لیے باعث فخر بنے ۔

● فریدہ واجد (میسور) "میری دوسری بہن لبیبہ صداقت (بنگلور) کے گلشن حیات میں ۸ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ کو صبح نو بجے دوسری بار ایک ننھی کلی مسکرائی ۔ اور میری تیسری بہن راحت بعارف شاہ زمانی کے باغ ارمان میں ۷ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ بوقت ۴ بجے شام ایک کلی بہار بن کر آئی ۔ اللہ پاک دونوں کو والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے ۔

● نفیسہ کوثر (موتی پور) میری آپا سعیدہ اور بہنوئی صالح محمد کے چمن حیات میں پہلی بار ۲۰ ستمبر ۱۹۸۹ء بوقت ۹ بجے شب اللہ تعالے نے ایک پھول کھلایا ۔ نام محمد شارق قرار پایا ۔ اور میرے ماموں صدیق الیاس اور ممانی ثریا صدیق کے گلشن حیات میں پہلی بار ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۹ء بوقت ۱۰ بجے دن ایک ستارہ طلوع ہوا نام محمد عاصم قرار پایا ۔ اللہ پاک دونوں کو فخر خاندان بنائے ۔

پیغامات نشاط

● اپنی علالت کے باوجود میں نے عزیزی شگفتہ سلمہا دختر نیک اختر عزیزی مناظر الزماں جلالی سلمہ و فرزندزادی جناب منظور الزماں جلالی صاحب مرحوم ومغفور کی شادی میں شرکت کے لیے میں نے ۷ نومبر کو سفر بمبئی اختیار کیا ۔ عزالہ اور ان کی ہمشیرہ مس ناہید صاحبہ بھی میرے ساتھ تھیں ۔ ۸ نومبر کو دادر اسٹیشن پر قاسم بھائی صاحب ساجدہ بہن ۔ عزیزی مظفر میاں جلالی مناظر میاں جلالی اور بدر الزماں جلالی ، عزیزہ نازجہاں منصور سلمہ اور پیارہ جگر نجم السحر اسمی اور کاشف سلمہ اللہ تعالے کو دیکھ کر سفر کا تکان دور ہو گیا ۔

۱۰ نومبر ۱۹۸۹ء بروز اتوار نور باغ ڈونگری میں بصد شان و شوکت پیاری شگفتہ سلمہا کا عقد نکاح عزیزی امیر الدین (ابن علیم الدین صاحب مرحوم) کے ساتھ ہو گیا ۔

شام کو ۶ بجے سے ۸ بجے تک جشن استقبالیہ منایا گیا جس میں اعزہ اقربا اور چند ہا معززین کے ساتھ ہی فلمی دنیا کے شہرہ آفاق اور میرے قدیم محب صادق میوزک ڈائرکٹر جناب نوشاد نے بھی اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ محفل کی شان بڑھائی ۔ کاش میرے قوت بازو جناب منظور الزماں جلالی حیات ہوتے تو اس تقریب سعید سے انھیں کتنی مسرت ہوتی ۔ بہر حال میں اپنی بہن سلطان جہاں (بیگم منظور الزماں جلالی) کو خصوصیت سے مبارکباد دیتا ہوں ۔ اللہ پاک ان کی عمر میں برکت دے اور انھیں اپنے تمام پوتوں پوتیوں نواسوں اور نواسیوں کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے ۔

اسی سلسلہ میں ۱۹ نومبر کو مسز اشرف جہاں صاحبہ علیم الدین صاحب نے نور باغ ہال میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی ۔ نسیم انہونوی

● عزیزہ نواز جناب حاجی عارف الہی صاحب فرزند لید (اگرہ) کی صاحبزادی ہما سلمہا کا عقد نکاح بہ دین فیروز (خلف الحاج فیروز الدین صاحب) کے ساتھ ۱۰ نومبر ۱۹۸۹ء بروز اتوار بوقت ۱۱ بجے دن بعوض خوبی ہوا ۔ اللہ پاک ہما اور بہ دین کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے ۔ نسیم انہونوی

انتقالِ پُرملال کی خبریں

• میرے عزیز محترم جناب عابد حسین صاحب مرحوم کے فرزند ارجمند ڈاکٹر سید عابد حسین کا ۱۳ر نومبر ۸۹ء کو بمقام لاہور حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوگیا۔ یہ افسوسناک خبر مجھے بمبئی سے واپس ہوتے ہی ملی۔ مرحوم نہایت خوشمزاج اور تندرست جوان تھے، خیال بھی نہ ہوسکتا تھا کہ اس عمر میں وہ ہم سب سے جدا ہو جائیں گے۔ مجھے اور میرے تمام متعلقین کو مرحوم کے پس ماندگان اور متعلقین سے دلی ہمدردی ہے اور ہم سب ان کے غم میں شریک ہیں۔ اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

شریک غم نسیم انہونوی

• یہ خبر ادبی حلقہ میں رنج و افسوس کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ جناب فیروز لوکھیہ مدیر ماہنامہ رنگ سنگ کا بنور ۱۲ر اکتوبر کو حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث اچانک انتقال فرماگئے۔ مرحوم کی علمی، ادبی، صحافتی، قومی، سماجی، سیاسی اصلاحی اور تعمیری خدمات ایسی نہیں کہ انھیں فراموش کیا جاسکے۔ مجھے مرحوم کے تمام پس ماندگان اور متعلقین سے دلی ہمدردی ہے۔ اللہ پاک انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (نسیم انہونوی)

• بمبئی میں یہ افسوسناک خبر مجھے ملی کہ میرے قدیم کرمفرما اور لکھنؤ کے مشہور طبیب حاذق جناب شکیل احمد شمسی صاحب کی اہلیہ محترمہ انتقال فرماگئیں۔ مرحومہ عرصہ سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھیں، کوئی بھی چارہ گری کام نہ آسکی اور بتاریخ ۷ر نومبر ۸۹ء وہ اپنے تمام متعلقین کو روتا تڑپتا چھوڑ کر اس فانی دنیا سے کنارہ کش ہوگئیں۔ اللہ پاک انھیں غریق رحمت فرمائے اور حکیم شمسی صاحب اور تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ شریک غم نسیم انہونوی

• بمبئی ہی میں جناب شیر خان صاحب ریٹائرڈ پرسنل افیسر ویسٹرن ریلوے کی زبانی اس حادثۂ جانکاہ کی اطلاع ملی کہ محترم حبیب صاحب ڈائرکٹر رزرو بینک بمبئی کے کڑیل جوان صاحبزادے (افسوس کے نام یاد نہ رہا) سعودی عربیہ میں موٹر حادثہ میں انتقال کرگئے۔ یہ حادثہ جناب حبیب صاحب اور موصوف کی علیل اہلیہ محترمہ کے لیے کتنا صبر آزما ہوگا۔ اسکا اندازہ کرنا بھی آسان نہیں۔ خبر سنتے ہی میں قاسم بھائی کے ساتھ تعزیت کے لیے گیا۔ اللہ پاک انھیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ حادثہ ایسا ہے کہ اسے فراموش کرنا آسان نہیں اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ شریک غم نسیم انہونوی

• بہن جمیلہ فاروقی (بنگلور) نے یہ خبر دی ہے کہ موصوفہ کے شوہر محمد سراج اللہ فاروقی اکزیکٹیو سپرانٹنڈنٹ۔ این۔ جی او ایف بنگلور، ۷ر اکتوبر ۸۹ء بروز ہفتہ بوقت ۷ بجے شام اچانک ہارٹ فیل ہو جانے کے باعث انتقال فرماگئے۔ مجھے بہن موصوفہ سے دلی ہمدردی ہے۔ اللہ پاک انھیں اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ یہی خبر مرحوم محمد سراج اللہ صاحب کی ہمشیرہ قمر النساء صاحبہ نے میسور سے روانہ کی ہے۔ مضمون ایک ہی ہونے کے باعث اسے علیحدہ نہیں شائع کیا گیا۔

شریک غم۔ نسیم انہونوی

• آصفہ مختار فنگاری (کلیان) افسوس کہ میری پیاری اکلوتی بہن خیر النساء عبدالغفور ٹنگیکر ۵ر اکتوبر ۸۹ء بوقت ۱۲ بجے دن کو ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر اس دار فانی سے رحلت فرماگئیں۔ مرحومہ نے اپنی نشانی ایک تین سال کا بچہ چھوڑا ہے۔ اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

• زبیدہ بتول۔ شائستہ فاطمہ (آمبور) ہمارے تایا زاد بھائی ادوم عزیز پاشاہ بروز پیر تاریخ ۳۰ر اکتوبر بوقت چار بجے صبح اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم کی عمر صرف ۳۵ برس تھی۔ اپنی ماں کے اکلوتے تھے۔ اپنے پیچھے اپنی بیوہ اور سات ننھے منے بچوں کو چھوڑ گئے ہیں۔

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ ایک شعر شائع کیا جاتا ہے، بشرطیکہ وہ ہمارے مقررہ عنوان پر ہو، موزوں، معیاری اور سنجیدہ ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ روانہ کیا گیا ہو۔ جنوری کے لئے عنوان ہے "دشمن" اور فروری کے لئے "بہار"۔ ادارہ

حسن شگفتہ روکی، اللہ رے ادائیں
نظریں بھی جھکی پر پردہ بھی ہے جھکی ہے

مرسلہ: بی بی پرتسنیم بیگم (دائم باڑی)

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

مرسلہ: فاطمہ زہرہ (بہار شریف)

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

مرسلہ: شاہین خانم۔ فرح ناز خانم (دوجے واڑہ)

در پردہ انھیں غیر سے ہے ربط نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

مرسلہ: فی عظمت ترنم (آمبور)

پردہ جب اٹھ گیا ہے، دیکھا یہی ہے اکثر
اپنی ہی آرزو میں اپنی ہی جستجو کی

مرسلہ: زبیدہ فضلی (رامپور)

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

مرسلہ: قمر طلعت نگار سلطانہ جلیلی (آمبور)

مرسلہ: نجمہ حامد (منگلور)

• خریداری نمبر ۹۹۰ - افسوس پردہ پر بھی آپ کا شعر موزوں نہیں۔

چمن والوں نے شبنم کہہ کے پردہ رکھ لیا ورنہ
پسینہ آ گیا پھولوں کو فریادِ عنادل سے

مرسلہ: صوفیہ مظفر (جمشید پور)

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

مرسلہ: درسلا احمدی عظمت (آمبور)

دو گھڑی اپنی نگاہوں کا سہارا دیدے
سامنے آ کے ذرا پردہ اٹھا دے رخ سے

مرسلہ: محمد سراج الحق (ایگریکو جمشید پور)

• خریداری نمبر ۱۱۱۱ آپ کا شعر موزوں نہیں۔ جنوری کے لیے بھی جو شعر ہے۔ شائع نہ ہو سکے گا۔

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

مرسلہ: فیروزہ یوسف (سیماوہ)

• خریدار ۹۱۸۰ - پردہ کے بجائے پردے پر شعر تھا۔

اپنے گھر کے در و دیوار کو اونچا نہ کرو
اتنا گہرا مری آواز سے پردہ نہ کرو

مرسلہ: مس فرزانہ ارمان زیدی (کھٹ سہارنپور)

کسی کے رخ سے جو پردہ ہٹا دیا میں نے
سزا یہ پائی کہ دیوانگی کی قید میں ہوں

مرسلہ: مس نور بانو (جل گاؤں)

رخ سے پردے کو ہٹایا تو بہت خوب کیا
پردہ شرم کو لیکن نہ اٹھانا ہرگز

مرسلہ: سلمیٰ بی (رامپور)

سالانہ قیمت میں اضافہ

جیسا کہ اعلان کیا جا چکا ہے۔ یکم جنوری سے سالانہ قیمت میں دو روپیہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

اب منی آرڈر بھیجتے وقت حریم کی [illegible] روپے [illegible] اضافی خریداری [illegible] ایک روپیہ [illegible] منی آرڈر [illegible] روپیہ [illegible]

تھا کہ وہ کسی خیرات خانے کی روٹیاں کھا کر نہیں ختم ہو جانے۔ یہ پسند نہیں تھا کہ وہ شعیب صاحب پر بوجھ بن جائیں۔ ان کا قیام و طعام تو الگ رہا۔ شعیب صاحب ان کا علاج بھی کرا رہے تھے! حنا کو شرمندگی کے مارے چپ لگ گئی تھی!۔

آمنہ اور نوید روانگی سے پہلے ایک مرتبہ خان صاحب سے ملنے آئے۔ آمنہ باپ سے مل کر بہت روئی۔ خان صاحب کی حالت بھی غیر ہو گئی۔ اور تب آمنہ اپنے ساتھ حنا کو زبردستی ان کے پاس لائی تھی۔

حنا پتھر کی مورتی بن کر باپ کے پاس بیٹھی رہی۔ لیکن اس کی حالت دیکھ کر خان صاحب کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہہ نکلے۔ وہ چونکہ ان کے منہ سے بات نہیں نکلی پھر وہ اس کا ہاتھ تھام کر اور گڑگڑا کر اس سے معافی مانگنے لگے۔

"ہاں بہن" نوید نے کہا: "اباجی کے دل پر ناقابل برداشت صدموں کا بوجھ طاری ہے۔ تم اپنے سلوک سے انھیں مزید تکلیفیں دے رہی ہو۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

"نوید بھائی کوئی ان صدموں کو بھی دیکھ سکتا ہے جو میرے دل پر بوجھ بن کر پڑے ہیں!" حنا بولی۔ نوید اسے سمجھانے بجھانے لگے۔ لیکن حنا کی حسیات اتنی شل ہو چکی تھیں کہ وہ کچھ سمجھنے یا حالات کی سنگینی کو قبول کرنے سے قاصر رہی تھی!۔

ناصرہ نے ان دونوں کی دعوت کی تھی۔ وہ تو بہت خوش خوش گئے لیکن خان صاحب کو زیادہ بدحال کر گئے۔ کیونکہ وہ سمجھ چکے تھے کہ اب آمنہ کو وہ دیکھ نہ سکیں گے! تمنا کرم آمنہ نے کیا تھا کہ حنا کو باپ سے قریب کر گئی تھی۔ (باقی آئندہ)

کون سی رقم تھی جو اباجی نے ان سب سے ہتھیائی ہے؟ آپ کو خدا کا واسطہ مجھے سب بتا دیجیے۔ ورنہ میرا انجام اس لاعلمی میں بہت بھیانک ہوگا!۔

آمنہ کی ایک پیش نہ چلی انھیں سب کچھ بتانا پڑا۔

"تو یہ کہیے کہ مجھے اس طرح غلاموں کی طرح ان لوگوں کے ہاتھ فروخت کیا ہے آپ نے۔" حنا غصے کے مارے کانپنے لگی: "آج تک میرے دل میں اباجی کی بہت عزت تھی اب میں سمجھتی ہوں کہ ان سے بڑھ کر ظالم سنگدل خودغرض اور ذلیل آدمی اس دنیا میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے منہ سے کہا تھا کہ میری بیٹی سے اپنے لڑکے کا عقد کر دو۔ انھیں ذرا بھی شرم نہیں آئی اس کے بعد بھی وہ ان سب کو منہ دکھا رہے ہیں۔ اس عمر میں ان پر کیا شیطان سوار تھا کہ وہ اپنا قرض مانگ بیٹھے۔ اب ان سے کہیے کہ وہ رقم اپنی قبر میں بچھائیں۔ ان کی بیٹی زندہ درگور ہو چکی: وہ بری طرح رو پڑی۔" اب میں سمجھی کہ ایرد صاحب نے مجھے دو ٹکے کی طوائف، بے حقیقت بازاری عورت کیوں سمجھا ہے۔ ہائے میری کیا صورت رہ گئی ہے۔ میں ان سب میں کیسے اٹھوں بیٹھوں گی۔ ہائے میں تو مر جاتی آپا۔ اباجی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ میری کیا عزت رہے گی سسرال میں۔ آہ مجھ ذلیل سے پیچھا چھڑانے کے لیے انھوں نے زہر کھایا ہے۔"

آمنہ کو سکتہ ہو گیا تھا۔ حنا پر جیسے دورہ پڑ گیا تھا۔ اپنی توہین پر وہ پاگل ہو رہی تھی۔

"آپا کیا تم گوارہ کرو گی کہ تمھارا شوہر تم سے ملنے تو یہ سمجھ کر ملے کہ تم بازاری عورت ہو۔" اور وہ بس دل کا خون آنکھوں سے بہاتی رہی!

اس بے چاری کو بالکل خبر نہیں تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں خان صاحب

پر کیا گزری تھی۔ شادی کے دوسرے روز جبکہ مہمان گھر میں بھرے ہوئے تھے
اور خاں صاحب باہر مصروف تھے کسی نے ان کی الماری سے پوری رقم غائب
کر دی تھی۔ یہ کارنامہ رابعہ بیگم کا تھا۔ لیکن انھوں نے کانوں کان کسی کو ہوا
لگنے نہ دی۔ رقم چوری کی اور شوہر کو دے دی۔ خاں صاحب کا یہ حال ہوا
جیسے ابھی حرکت قلب رک جائے گی۔ کس پر الزام دھرتے۔ کسے مجرم گردانتے
رحمٰن کو بلا کر سارا ماجرا سنایا۔ وہ ابھی ابھی سارا روپیہ بھاگ کر اپنے گھر میں پوشیدہ
رکھ آئے تھے لیکن باپ کے سامنے جگر تھام کر رہ گئے۔ باپ کو طعنے دیئے۔ برا
بھلا کہا کہ وہ پیسہ سنبھال کر رکھ نہ سکے۔ خاں صاحب رونے لگے تھے اور رحمٰن
پلان بنا رہے تھے کہ اس رقم کا کون سا عمدہ مصرف ہو سکتا ہے! پھر رحمٰن
نے اپنے باپ کو دم دلاسا دیا اور سمجھایا کہ جو ہونا تھا وہ ہوا۔ وہ اس محفل میں
کسے چور کہیں گے بدنامی سر پر آجائے گی اچھے دل برے ہوں گے۔ نتیجہ
صفر۔ لہٰذا خون کا گھونٹ پی کر خاں صاحب نے خاموشی سادھ لی۔ لیکن دل
میں سوچے بغیر نہ رہ سکے کہ یہ ان کی شاطرانہ چال کا قدرتی انتقام ہے۔
انھوں نے مذہبی تاکید کے بخلاف اپنا فرض سختی سے مانگا اور ایک غیر پسندیدہ
شرط کے ساتھ مانگا تھا کہ ایک کھاتے پیتے گھر کو مبتلائے آفات کر دیا تھا لہٰذا
سخت انتقام سے وہ بھی بچ نہ سکے۔! اس وقت ان کی حالت یہ تھی کہ بس
بھیگی مٹی کی طرح بیٹھے جاتے تھے۔ نئے داماد کی یہ کیفیت بھی ان کی دانست
میں ان ہی کے اعمال کا نتیجہ تھی۔ ضمیر کا تازیانہ ان کی روح پر برس رہا تھا
سارا جسم بے چارے کا ٹھنڈے پسینے میں شرابور تھا۔ دل میں زخموں کی سی
ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور نگاہوں میں مکمل تاریکی چھا گئی تھی۔ کچھ دیر وہ
کھڑے رہے پھر باہر فرش پر آکر لیٹ گئے۔

ایزد کی بھی کوشش ہوتی کہ جہاں تک ہو سکے۔ بچے سے نفرت کر کے ماں کا دل
دکھائے۔ اس نے کبھی کاشف سے لگاؤ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس بے چارے
کو ڈانٹتا ڈپٹتا تھا۔ ایک دفعہ تو اسے مار بھی بیٹھا تھا۔ حنا سے بیٹھے جھگڑتا
تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ کیوں رکھتی ہے!
کاشف کا یہ عالم تھا کہ دن بھر نامیہ کے بچوں میں کھیلا کرتا تھا۔ ویسے
بھی وہ بہت بھولا بھالا بچہ تھا۔ کبھی اس نے ضد نہیں کی روتا دھوتا نہیں
تھا۔ اس پر بھی ایزد کو گوارہ نہ تھا کہ وہ رات کو ماں کے پاس سوتے۔
کاشف ایک مسئلہ بنا ہوا تھا حنا کے لیے۔ جب اسے پتہ چلا کہ مرد بھی اگر چاہیں تو
سوتیلی ماں سے بڑھ کر ثابت ہو سکتے ہیں! رفتہ رفتہ اس خیال نے اس کے
دماغ میں جڑ پکڑ لی کہ کاشف اس کے اور ایزد کے درمیان یوں حائل ہے
کہ انھیں ایک نہیں ہونے دیتا۔

اور یہ تینوں ایک ناقابل حل معمہ بنے ہوئے تھے سارے گھر کے لیے!
حنا کے نصیب میں آرام و عیش لکھا ہوا ہی نہ تھا۔ بقول نامیہ کے۔
اس کا گھونگھٹ الٹا تھا باورچی خانے میں! گھر میں دو بہوؤں کے ہوتے
بڑھیاں کیوں کام کرتیں۔ لہٰذا ماعیدن گودام کی انچارج بن گئیں۔ آپا ذاکرہ
نے ضعف بصارت کی وجہ سے نازک چوکی سنبھالی۔ صالحہ بیگم دائم المرض
تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا کام نامیہ اور حنا پر پڑ گیا۔ حنا کی بدبختی یہ ہوئی کہ
انھی دنوں نامیہ کے یہاں تیسرے بچے کی آمد آمد کی خبر لگی۔ حتی الامکان وہ حنا
کا ساتھ دیتی بھی تھیں۔ لیکن حنا کو فرصت نہ ملتی!۔
پر تمام مشکلیں ایک طرف۔ اپنی ندامت و احساس کمتری کی گرانباری ایک
طرف۔ میری لعنت باپ کی بیماری ان کا ایزد کے گھر میں قیام۔ اخفا کو پسند

آپ کی نظرِ التفات کو ترستی۔ کیا حقیقت رہ گئی ہے میری۔ آپ کے
دل میں میری اتنی سی جگہ بھی نہیں ہے جو شاید ماؤں کے لیے ہے۔"
"یہ بات کبھی تم نے بہت اچھا کہا ہے کہ میں اپنے دل میں ماؤں
کو جگہ دیتا پھرتا ہوں۔ میری بھی یہی اوقات ہے۔ کم ظرف۔ نیچ ذلیل۔
میں اس قابل کہاں ہوں کہ تمھارے ساتھ رہوں۔ تم۔ تم ماشاءاللہ
ایک بچے کی ماں ہو۔ میری تمھاری کیا برابری ہے۔"

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ایزد پھولا سوجا کمرے سے نکل کر چلا
گیا۔ حنا تقدیر کو رونے لگی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ ایزد کو احساس کمتری
نے زیادہ سنگدل بنا دیا تھا۔ اور یہ راز بھی تھا کہ گفتہ ناگفتہ جذبات
نے اسے آپے سے باہر کر رکھا تھا۔ حنا کے قرب سے شرم آتی تھی۔ اس
کے قرب کے لیے دل مچلتا تھا۔ گویا وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود اپنی
جائز مسرتوں سے محروم تھا۔ اس کی کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ وہ زندگی
گزارنے کا کون سا نصب العین مرتب کرے۔

دن تو کمپنی میں گزر جاتا۔ رات گئے تک کلب میں بیٹھا اخبار
رسائل پڑھتا اور تمباکو نوشی کیا کرتا۔ رات کو گھر آتا تو جیسے کوئی اس کا
گلا گھونٹنے لگتا۔ میاں بیوی میں مخلصانہ گفتگو اور مزیدار باتیں تو وہاں
ہوتی ہیں جہاں ان میں پیار و محبت ہوتی ہے۔ یہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ حنا
البتہ ایزد کی محبت کی پیاسی تھی۔ اپنی باتوں سے۔ سلوک سے عزت
سے۔ وہ ہمیشہ یہی باور کرانے کی کوشش کرتی تھی کہ وہ اس کی محبت کی
متلاشی ہے۔ لیکن ایزد کا یہ حال تھا کہ اس کی شکل سے بیزار تھا۔ اس
کے قرب سے متنفر تھا۔ اب چونکہ ان کے درمیان ایک بچہ بھی تھا۔ لہٰذا

رحمٰن نے کفیل سے اجازت لی۔ بیوی کو اندر سے بلایا اور گھر کی راہ لی۔
انسان کا جب اپنا مطلب نکل جاتا ہے تو وہ اس قدر خود غرض ہو جاتا ہے
کہ اسے خون کے رشتوں سے بھی محبت نہیں رہتی نہ ان کے دکھ سکھ سے
سروکار رہتا ہے۔ رحمٰن کے سامنے سارے حالات آئینہ تھے۔ باپ کی تباہی
ایزد کی نامعلوم ناگہانی بیماری۔ چھوٹی بہن کی جانکنی حالت۔ لیکن اپنا من
چنگا تو کٹھوتی میں گنگا۔ انھیں کسی سے کیا لینا دینا تھا۔ لوگ تو بڑھاپے
جوانی ہر عمر میں مرتے ہی رہتے ہیں۔ کوئی کسی کی موت کو روک تھوڑی
سکتا ہے۔

میاں بیوی بے انتہا خوش تھے!

انھیں مطلقاً ان میاں بیوی کا خیال نہیں آیا جو بالکل نئے تھے۔ جن
کی زندگیوں پر بن گئی تھی۔

آمنہ اور نوید البتہ کفیل اور خرم وغیرہ کی پریشانی میں شریک تھے!۔
رحمٰن کے جانے کے بعد نوید سے کسی نے پردہ ضروری نہیں سمجھا۔ سب عورتیں
دالان کے تختوں پر آ بیٹھیں۔!

نہ کسی کو کھانے پینے کا ہوش تھا۔ نہ آئے گئے کا خیال۔! ایزد جوں
کے توں سو رہے تھے۔ صالحہ بیگم انھیں دیکھ کر رونے لگیں۔ یہی حال حنا کا
ہوا۔ اس کا کلیجہ تو پہلے خون خون تھا۔

"یہ تو بد شگونی ہے۔ بیگم۔" شعیب صاحب نے گلا صاف کرکے کہا۔
"ایک کی گود پر بنی ہے ایک کی مانگ پر۔" آپا ذاکرہ نے کہا اور آنسو
پونچھنے لگیں۔

"کیا میں کسی اور ڈاکٹر کو لاؤں۔ کفیل صاحب؟" نوید نے پوچھا۔

لیکن ان میں ابھی گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایزد کی پلکیں جھپکیں اور سہ پہر ڈھلتے ڈھلتے وہ خوب گہری نیند لے کر جاگ اٹھے۔ جب ذہن صاف ہو گیا تو انھوں نے اپنے اطراف کا مجمع بڑی حیرت سے دیکھا۔ ان کے چہروں پر خوشیاں تھیں! شعیب صاحب بے ساختہ مسکرا رہے تھے! صالحہ بیگم نے خدا کا شکر ادا کیا تھا! بھائی بہنوں نے بھی یوں لپک کر خیریت پوچھی تھی جیسے وہ بستر مرگ پر صحت مند ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے ہوں!! اور تب ایزد کو ایک بڑا جانکس خیال آیا۔

کل رات کو ان سے کتنی بھیانک غلطی ہو گئی تھی! دفعتاً ان کے جسم کے ہر سام نے پسینہ اگل دیا۔ کون سی جگہ تھی وہ۔ جہاں ان کے بھٹکتے قدم پہونچ گئے تھے۔ کون تھی وہ شبیہہ جس نے انھیں انسان سے شیطان بنا دیا تھا۔ ان کا دل چاہا کہ وہ خوب چیخ چیخ کر رونے لگیں۔

اب کیسا جی ہے؟" نگار نے ان کی پیشانی چومی۔

مجھے ہوا کیا ہے باجی؟" ایزد کی ویران نگاہیں نگار کے چہرے پر پڑیں۔

نگار کیا بتاتیں۔ موضوع بدل کر پوچھا: اچھا کچھ کھاؤ گے۔؟

کفیل نے بے کہے سنے ایزد کے لبوں میں دوا کا پیالہ لگا دیا۔

پتہ نہیں کون سی چیز تھی جو سینے میں آگ سی لگا گئی۔! پھر کفیل نے جھک کر اس کی نبض دیکھی تب وہ اور پریشان ہوا۔

کوئی ایسی حرکت بھی کرتا ہے؟" ناصیہ نے کہا ان کی گول مول بات بھی ایزد کی سمجھ میں نہ آسکی۔ پھر باری باری سب نے خیریت پوچھی تھی اور ان سب کے چہروں پر اطمینان جھلک اٹھا تھا!

نہیں سمجھا؟"

دوسروں کے اعمال کا خمیازہ بھی تو بھگتنا پڑتا ہے" حنا بولی۔ حالانکہ اس کا مطلب کچھ اور ہی تھا لیکن ایزد یہ سمجھا کہ وہ اس پر چوٹ کر رہی ہے۔ فوراً اس کا دماغ گرم ہو گیا!"

معلوم ہوتا ہے کہ بھابی یا باجی نے وہ تمام واقعات تم سے کہہ دیئے ہیں جو تمھاری شادی سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اور تم۔ ان کے طعنے دینا چاہتی ہو۔ حالانکہ میں نے شاید تم سے کئی مرتبہ کہا ہے جو کچھ مجھ پر یا تم پر گزر چکا ہے۔ خواہ وہ ناگوار ہو کہ خوشگوار۔ اس کا تذکرہ ہمارے درمیان نہیں ہونا چاہئے۔

میں نے آپ کے حکم سے سرتابی کی۔؟"

طعنے دیتی ہو مجھے۔ چوٹ کرتی ہو مجھ پر۔ اور پھر میرا مذاق اڑاتی ہو کہ میں نے آپ کے حکم سے سرتابی کب کی؟ ۔ لیکن حنا۔ اچھی طرح یاد رکھو کہ دوسروں کے اعمال کا خمیازہ اگر کھینچنا ہے تو صرف مجھ کو نہیں بلکہ تم بھی اس کھینچا تانی میں برابر کی شریک ہو۔ اور یہ بھی ٹھیک ہی ہے کہ تم جو میرے سر پر مسلط کر دی گئی ہو تو فقط اپنے باپ کی وجہ سے۔! ان سے تمھاری نفرت ٹھیک ہے اور میرے باپ نے جو زیادتی مجھ پر روا رکھی ہے۔ اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ میں تم سے نفرت کرتا رہوں۔"

آپ کیوں خفا ہوتے ہیں" حنا کی پلکیں پھر بھیگنے لگیں" خدا مجھے موت دے دے جو میں نے آپ کی طرف اشارہ بھی کیا ہو۔ میں تو خود کو اور باجی کو کہہ رہی تھی۔ اگر انھوں نے ابا جان سے دوستی کا ایسا ناپاک فائدہ نہ اٹھایا ہوتا تو میں بھی آپ سے اتنی شرمندگی محسوس نہ کرتی" پھر وہ سسکنے لگی" یہ کیا ہے زندگی۔ موت سے بدتر۔ آپ کی نظروں سے گری ہوئی۔ مجبور، شرمسار

آنکھیں لگا دیں جیسے پوری امید ہو کہ اس کی چاہنے والی ماں بس اب آتی ہی ہوگی۔

حنا الماری میں کپڑے رکھ رہی تھی! ایزد نے خاں صاحب کی کیفیت سے اسے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"جذبات ہم بھول گئے ہیں۔ وہ تمہیں کبھی یاد نہیں رکھنی چاہیئے! انھوں نے جو کچھ کیا تھا وہ سب تمہاری خاطر کیا تھا۔ انھیں تم نے اس بات کی سزا دی ہے کہ صرف تمہارے مستقبل کی خاطر وہ اس نوبت پر پہونچے ہیں۔ آخر تم ان کی خدمت کیوں نہیں کرتیں۔ کیوں نہیں جاتیں ان کے پاس؟!"

"گیا کیا ہے انھوں نے میرے ساتھ؟" حنا نے پیٹھ پھیرے پھیرے اور سر جھکائے ہوئے کہا: "کون سی ایسی خیرخواہی کی ہے۔ جس کے بدلے میں مجھ سے محبت چاہتے ہیں۔ آج میری جو حالت ہے وہ سب انھی کی کرنی ہے۔ اگر انھوں نے اپنی عزت جانی ہوتی۔ دوستی کے راتب پہچانے ہوتے۔ اور چھوٹوں کے سامنے اپنا وقار بحال رکھا ہوتا تو شاید مجھے بھی اس گھر میں سر اٹھا کر چلنے کی ہمت ہوتی۔ انھوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا!"

"تمہیں میرے پاس کیا تکلیف ہے۔ حنا!": ایزد نے پوچھا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے تپائی پر اس طرح بیٹھا تھا کہ حنا کا چہرہ اس کے سامنے تھا!

اس کے یوں کہنے پر حنا نے سر اٹھایا گویا اسی سے اس کے سوال کا جواب چاہتی ہو۔ اس کے لبوں پر طنزیہ تبسم تھا اور آنکھوں میں تحیر۔ پل بھر کے لیے ان کی نگاہیں ملیں۔ حنا نے پلکیں جھکا لیں۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"کچھ نہیں۔ میں نے تکلیفوں کا تذکرہ کہاں کیا۔"

"ابھی تم نے کہا تھا کہ تم سر اٹھا کر چل نہیں سکتیں؟۔ میں تمہاری بات کا مطلب

ایزد کو ہوا ہی کیا تھا۔ اس نے بے حد گہری پینڈلی تھی! لیکن روح پر رکھا ہوا بوجھ اسے کچلے دیتا تھا۔ وہ اپنی دانست میں یہی سمجھ رہا تھا کہ رات کو اس کے قدم کسی ناپاک محلے کی جانب اٹھ گئے تھے اور اس نے اپنے تشنہ جذبات کو ناجائز طریقے سے سیراب کیا تھا:۔ کیا یہ اس نے ایسا کام نہیں کیا تھا جو اسے نادم و منفعل اور شرمسار رکھتا!۔

وہ خود کو حنا سے کمتر اور گناہ گار سمجھنے لگا!۔

اور پھر رخ پھیر کر دیکھا کہ وہ کہاں تھی۔ لاکھ ایزد نے اس سے بیگانگی اختیار کی تھی لیکن جذباتی وابستگی بہرحال ایک دوسرے کی جویا رہتی ہے۔ حنا اسے آپا ذاکرہ کے پاس بیٹھی نظر آئی عجب انداز تھا! سہمی سہمی مضمحل، اس نے نظر اٹھا کر ایزد کو دیکھا اور فوراً اس کے چہرے پر حیا کی لالی بکھر گئی۔ اس نے پلکیں چھپا لیں۔ لیکن ایزد اسے تکتا رہا۔ کیا اس نے اس کی حق تلفی نہیں کی تھی۔ آب مطہر کو چھوڑ کے اس نے گندی نالی میں منھ ڈالا تھا اور پھر اس نے بڑی شان سے دعویٰ کیا تھا کہ وہ جھوٹے برتن میں پانی نہیں پیتا

اس کا ذہن اسی نقطہ پر جم کر رہ گیا تھا کہ گویا وہ مدہوشی میں وہ گھر سے نکل کر کسی کوٹھے پر پہونچا تھا!۔ اور کسی بری عورت نے اسے راہ سے بہکا دیا تھا!۔

ایک گہری سانس ندامت سے معمور اس کے سینے سے نکلی اور اس نے مر جانے کی حد تک پچھتاتے ہوئے کہنی آنکھوں پر آڑ کر لی!۔

گھر والوں کو تشویش نہ تھی۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب بھی آگئے تھے انھوں نے اس کا معائنہ کر کے خوشخبری سنا دی کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہ گیا!!۔

وہ اس قدر شرمندہ تھا کہ یہ تک پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا کہ اس پر

کون سی ناگہانی بیماری عود کر آئی تھی ۔ !

رات کے کھانے کے بعد خاں صاحب ، نوید اور آمنہ سب سے رخصت ہوئے ۔ حنا کو باپ اور بہن پر اتنا شدید غصہ تھا کہ اس نے خاں صاحب سے ملنے سے بھی صاف انکار کر دیا ۔!!

آمنہ اور نوید جلد ہی کسی عرب ملک جانے والے تھے ۔ ان کی روانگی میں کم دن رہ گئے تھے خاں صاحب نے سوچا کہ اب انھیں اپنے مکان کو فروخت کر کے حصہ رسدی سب کو دے دینا چاہیے ۔ ان کو اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں رہ گیا تھا ۔ جب سے ان کے یہاں چوری ہوئی تھی وہ بہت کمزور ہو گئے تھے ۔ آمنہ نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ حنا ان سے ناخوش ہے ۔ خاں صاحب نے بیٹی کی خیر خواہی کرنی چاہی تھی وہ بدخواہی ہو گئی ۔ وہ تو ادھر کے رہے نہ ادھر کے ۔ روپیہ بھی گیا بیٹی بھی خفا ہو گئی ۔! ان کے ایک دوست فرنیچر کے کارخانے کے لیے کئی مرتبہ ان کا حویلی کا مکان مانگ رہے تھے لہٰذا اب کی مرتبہ ان کی طرف سے تحریک ہوئی تو خاں صاحب نے چوں چرا کیے بغیر اپنا ڈھنڈار مکان فروخت کر دیا ۔! روپیہ جو ملا تھا اس میں تین برابر کے حصے کر دیئے ۔ رحمٰن کو ان کا حصہ سونپا ۔ آمنہ کو دیا اور حنا سے ملنے کے لیے پہونچے تو اس کا روپیہ جیب میں رکھ کر لے گئے ۔!

شعیب صاحب اور ان کا پورا کنبہ بڑی خوش اخلاقی سے ان سے ملا تھا ۔! حالانکہ وہ سب جانتے تھے کہ انھوں نے شعیب صاحب کو کھو کھلا

نے ایک بازاری عورت کا قرب گوارہ کر لیا تھا ۔ اس پچھتاوے نے کسی حد تک اس کے مزاج کی کڑواہٹ اور تندی دور کر دی تھی ۔ کچھ نرم پڑ گیا تھا ۔ اور کسی سے دوران گفتگو میں چڑچڑاہٹ کا شائبہ بھی نہیں کرتا تھا ۔

"کچھ افاقہ ہے آپ کو ؟" اس نے محض نباہ شپ سے پوچھا ۔

"اب افاقے کی پرواہ کسے ہے بیٹا" وہ حسرت سے مسکرائے "شاید میری ہی تباہ حالی کو خواجہ میر درد نے دو مصرعوں میں بیان کرنے کی کوشش کی تھی ۔"

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

"آہ ۔ ایزد میاں ۔ میں نے اتنے گناہ کئے ہیں کہ اب میرے بچے بھی مجھے معاف کرنے پر آمادہ نہیں ۔ بس میں حسرتوں کا پشتارہ ہوں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گا ! وہاں بھی چین نہ ملے گا مجھے ۔"

جب وہ بڑی بے بسی سے رونے لگے تو ایزد کو کچھ ملال ہوا اس نے فوراً پوچھا : "تو وہ ابھی تک آئیں نہیں آپ کو پوچھنے کے لیے ۔"

"نہیں میاں سب سے زیادہ وہی خفا ہے ۔ پہلے اس سے کہہ دو کہ بڑی بے شرمی اختیار کر کے صرف اسی کی خاطر میں نے جو روپیہ چھپایا تھا وہ بھی اب میرے پاس نہیں رہا ۔ سزا دی ہے مجھے قدرت نے ۔ سب کچھ کھو کے اسی کے در پر آکے پڑا ہوں ۔ اب تو آجائے میرے پاس ۔ نہ ٹھکرائے اپنے بیمار بڈھے باپ کو ۔"

"بہت اچھا آپ روئیے نہیں ۔ میں انھیں ابھی جا کے بھیجتا ہوں ۔"

خاں صاحب نے اس محروم القسمت بچے کی طرح دروازے کی طرف

[illegible] سے اس کی بیوی پر کام کا زائد بوجھ پڑ رہا ہے۔ اب مجھے [illegible] کر بھی بیٹی داماد کی روٹی پر پڑا ہوا ہوں۔"

[illegible] بات شعیب صاحب ہنسے: تو ہمت کرو، اٹھو اور میرے گھر چلو۔

وہ گھر بھی تمہاری بیٹی داماد کا ہے:

وہ گھر میرا ہے۔ حیدر بھائی اور میرے بیٹے بہو بھی اس میں رہتے ہیں ان سے تمہیں کیا سروکار ہے: شعیب صاحب نے کہا۔

اور خان صاحب پر اتنی ندامت طاری تھی کہ وہ آمنہ کے گھر سے نکلنے پر تیار ہو گئے۔ دوست کے یہاں رہنے پر انھیں اعتراض نہیں تھا۔!

شعیب صاحب انھیں اپنے ساتھ لے آئے۔ ایک کمرے میں بڑے آرام سے ان کے رہنے کا بندوبست کر دیا۔ ان کا علاج کر دیا۔ لیکن غم ایسی بیماری نہیں جس کی دوا کسی معالج کے پاس ہو۔ دوائیں ان پر محض بیکار ثابت ہوئیں! اور غم انھیں یہ تھا کہ حنا اس سے خفا تھی!۔ حالانکہ وہ اسے سب سے بڑھ کر چاہتے تھے۔ لیکن اس نادان کی محبت کی قدر نہیں کی!! ۔ وہ بے چارے ہر طرف سے ایسے دل شکستہ مایوس اور ناامید ہو چکے تھے کہ اب تو بات کرتے رونے لگتے!!

اور ایک روز تو ان کے صبر کا پیمانہ یوں چھلکا کہ انھوں نے ایزد سے حنا کی شکایت کی!۔ وہ کبھی کبھی دکھاوے کو ان کے پاس آتا تھا۔ رشتہ میں خسر ہو گئے تھے!۔ اور جب سے ایزد ایک روحانی پچھتاوے میں گرفتار ہوا تھا تب سے وہ عجیب فطرت کا ہو گیا تھا۔ خاموش رہتا تھا۔ سوچا کرتا تھا۔ تنہائی میں روتا تھا اور توبہ کرتا تھا۔ اسے اپنے آپ سے شرم آتی تھی بعض اپنے خیالی وہم کے دفعیہ کے لیے وہ اپنی جسمانی توانائی کھو چکا ہے اس

کر دیا تھا۔ لیکن کبھی کسی نے بھولے سے بھی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ ایسے بلند خیال شریف اور فراخدل تھے۔!

اس وقت بھی شعیب صاحب بیٹھے ان سے باتیں کرتے رہے۔ اندر سے چائے وغیرہ آگئی تب چلتے چلتے خان صاحب نے حنا سے ملنے کی خواہش کی۔!

شارق ان کا پیغام لے کر حنا کے پاس پہونچا۔

حنا کا منہ بن گیا۔ اس نے کہا: شارق بھیا۔ تم جا کے ان سے کہہ دو کہ میں ان سے ملنا نہیں چاہتی۔ میں ان کے حق میں مر چکی ہوں۔!"

ایزد کمرے میں موجود تھا۔ غیر متعلق مبہوت سا۔ اس رات کے بعد سے وہ کچھ بدحواس ہو کر رہ گیا تھا!۔ اس نے حنا کا جواب بڑی حیرت سے سنا مگر کچھ نہ بولا اور شارق کی طرف دیکھنے لگا۔ شارق کھسیا کر ہنسا۔ بولا: ارے چھوٹی بھابی۔ بھلا ایسا کیسے کہہ سکتا ہوں۔؟"

تو پھر نہ کہو۔ وہ یوں ہی چلے جائیں گے۔

آپ ان سے نہیں ملیں گی۔

بالکل نہیں۔

شارق چلا گیا۔ اور بعینہٖ یہی بات خان صاحب کے گوش گزار کر دی۔

شعیب صاحب نے بھی بے حد تعجب سے حنا کا جواب سنا۔

آپ سے کیوں خفا ہے۔؟" شعیب صاحب نے پوچھا۔

ایک گہری سانس لے کر خان صاحب نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا جیسے اٹھنے والی ٹیس کو دبا رہے ہوں۔ پھر ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: میں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے شعیب بھائی۔ حالانکہ خدا گواہ۔ جتنا میں آپ سے

شرمندہ ہوا ہوں۔ جتنا اپنی نظروں میں گرا ہوں۔ جس قدر دل پر صدمے جھیلے ہیں اور جیسا نقصان اٹھایا ہے۔ وہ سب۔ وہ سب حنا کی خاطر لیکن وہ مجھے گناہ گار سمجھتی ہے کہ میں نے اس ذلیل طریقے پر آپ سے مطالبہ کر کے اسے آپ سب میں سبک کر دیا ہے۔ سچ ہے۔ ٹھیک کہتی ہے وہ! اچھا خیر۔ نہ ملے مجھ سے۔ میں زندگی میں ہمیشہ رو دیا ہوں۔ کچھ آنسو اپنی اس تیرہ بختی پر بھی بہاؤں گا۔ اس سے مجھے شکوہ نہیں ہے۔" وہ رونے لگے۔ "اچھا شعیب بھائی۔ میں چلتا ہوں۔" انھوں نے جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا۔ شعیب صاحب کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ "اسے سمجھا بجھا کر دے دیجئے گا۔ میرے کس کام کے۔ جب تک میری چار سانسیں باقی ہیں۔ میں رحمٰن کے یہاں پڑ رہوں گا۔ آمنہ اور نوید تو دو حقِ قطعہ جار ہے ہیں!"

"لیکن آپ کو یہ سوجھی کیا تھی؟ اتنی جلدی مکان بیچ دیا۔" شعیب صاحب بولے۔

"بس زندگی ہی میں اس الجھن سے کبھی نجات حاصل کر لی۔ ورنہ یہی چلی جاتی اتنی دور۔ میرے مرنے کے بعد مکان پر رحمٰن قبضہ کر لیتے۔ بھائی مجھے لڑکیوں کا حق بھی تو دینا تھا!"

"آپ نے اپنے لیے کچھ نہیں رکھا؟"

"کچھ نہیں۔ کیا رحمٰن میرا خرچ برداشت نہ کریں گے۔؟!"

شعیب صاحب کو علم تھا کہ رحمٰن صاحب کس فطرت کے واقع ہوئے تھے۔ وہ چپ ہو رہے۔ خان صاحب بے نیں دم رام سدھارے!"

ایزد نے بڑی تعاتنگی سے حنا سے کہا: "تم نے برا کیا۔ ان سے کیوں نہیں

ملیں؟" اس کا لہجہ رنجیدہ اور آواز ابھی بار ندامت سے بوجھل تھی؟۔ آنکھیں ملا کر حنا سے گفتگو نہیں کرتا تھا!

"کیا کرتی ان سے مل کے؟" حنا نے بھی مدھم آواز میں جواب دیا: "تم اس لیے کہ آپس میں ایک دوسرے کو دیکھ کر شرماتے اور فائدہ بھی کیا تھا!"

"کیوں شرماتے؟" ایزد نے پوچھا۔

"اس لیے کہ انھوں نے مجھے بیچ دیا۔ میں اس لیے شرمائی کہ میں بک گئی!"

ایزد کو اپنی کہی بات یاد آ گئی۔ اور وہ خاموش ہو گیا۔

لیکن جیسا کہ خان صاحب کا گمان تھا کہ وہ بیٹے اور بہو کے یہاں رہ لیں گے۔ خیال خام نکلا۔ وہ بھی تین روز کے اندر رابعہ نے اپنی تیز مزاجی سے بعض قلبی تکلیفیں پہونچانی شروع کر دیں۔ یوں بھی ان کا دل صدمات سے چور چور رہا تھا۔ وہ رابعہ کی تلخ و ترش سہ نہ سکے اور آمنہ کے یہاں چلے گئے۔ یہاں اس ندامت نے ان کی زندگی تلخ کی کہ وہ بیٹی نواسے کے گھر پڑے ہیں! خون کی فراوانی نے بالآخر خان کے قلب پر بیماری بن کر حملہ کیا۔ تب انھوں نے گھبرا کر شعیب صاحب کو بلا بھیجا!

شعیب صاحب ان کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گئے! بستر پر شکن پڑے تھے چہرہ یرقان کے بیمار دل کا سا زرد۔ آنکھوں کے نیچے سرمئی حلقے۔ ان کی شکل پر نظر پڑتے ہی شعیب صاحب کے دل میں ناامید کا نے سر اٹھایا تھا! وہ بچنے والے نہیں۔

"یہ تم نے کن بیماریوں کو دعوت دے کے خود پر مسلط کر لیا ہے۔ کیا کرتے رہتے ہو؟" شعیب صاحب نے حیرت سے کہا۔

جواب میں دہ بلے چارے پھر رونے لگے: "شعیب بھائی میں اپنے عمل کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ مجھے رحمٰن نے یہ کہہ کر گھر سے چلے جانے کا حکم دیا کہ